وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۚ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

جلد سیزدہم

سورتہائے الشمس، الیل، الضحٰی، الم نشرح،

التین، العلق، القدر، البیّنۃ

تفسیرِ کبیر

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ
(جلد سیزدہم۔ مشتمل بر سورتہائے الشمس، الیل، الضحیٰ،
الم نشرح، التین، العلق، القدر، البیّنۃ)

Tafsir-e-Kabir **(The Grand Exegesis)**
by Hazrat Mirza Bashir-ud-Deen Mahmood Ahmad,
Khalifatul-Masih II, al-Muslih al-Mauood (1889-1965),
may Allah be pleased with him.
Volume 13
(Sūrah ash-Shams, al-Lail, aḍ-Ḍuḥā, al-Inshirāḥ, at-Tīn, al-'Alaq,
al-Qadr, al-Bayyinah)

(Complete Set – Volumes 1-15)

First published in India and Pakistan between 1940-1962 (11 Volume Set)
Second edition printed in Pakistan and the UK between 1986-1994 (10 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2004 (5 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2010 (10 Volume Set)
Digitally typeset edition published in UK, 2023 (15 Volume Set)

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

Printed in the UK at:

For further information, please visit www.alislam.org

ISBN: 978-1-84880-274-2 (Set Vol. 1-15)
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم الشان رحمت کے نشان کے طور پر پسر موعود کی بشارت عطا فرمائی جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے وجود میں پوری ہوئی اور کلمات الہامیہ آپ کے وجود مسعود میں جلوہ گر ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ 'اسے علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔' قرآن مجید فرقانِ حمید کے وہ علوم و معارف بھی آپ کو سکھائے گئے جو اس سے پہلے منکشف نہ تھے۔ چنانچہ آپؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ 'اس تفسیر کا بہت سا مضمون غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔' آپؓ نے قرآن کریم کی تفسیر تحریر فرمائی اور اس کے مطالب و معانی اور نکاتِ عجیبہ کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرمادیا۔ یہ تصنیف لطیف موسوم بہ تفسیرِ کبیر اس مذکورہ بالا بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور شاہد ناطق ہے اور لاریب قرآنی علوم و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خدا تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ظاہر فرمایا ہے۔

تفسیر کبیر کی پہلی جلد ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ بعدہٗ مختلف وقتوں میں اس کی کل ۱۱ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اوائل خلافت میں ہی ارشاد فرمایا کہ تفسیر کبیر کی صد سالہ جوبلی کے تحت دوبارہ اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس کے پازیٹو بنوا کر گیارہ کی بجائے دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس علمی خزینہ کی اشاعت کا تازہ ایڈیشن طبع کروانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی طباعت کتابت ہو کر شائع ہوئی تھی اور باریک قلم سے لکھائی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ہر صفحہ پر دو کالم تھے۔ چنانچہ یہ نیا ایڈیشن حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کمپوز کروایا گیا ہے، اس کا فونٹ سائز ۱۴ مقرر کیا گیا ہے اور دو کالموں کی بجائے عبارت کو ایک ہی سطر میں مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز حضور انور کی ہدایت تھی کہ جلدوں کی ضخامت کو بھی متوازن اور ہلکا

رکھا جائے تاکہ پڑھتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ کر سنبھالنے میں دقت نہ ہو۔ اس ہدایت پر عملدرآمد کے نتیجہ میں تفسیر کبیر کی جلدوں کی تعداد دس سے بڑھ کر پندرہ ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے حلِ لغات کے مقامات میں بھی ادل بدل کرنا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت کے مطابق تفسیرِ کبیر عربی ایڈیشن کی طرز پر حوالہ جات کی تخریج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیرِ کبیر عربی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ عربی عبارات بالخصوص حلِ لغات کے مواقع پر عربی عبارات جہاں اعراب کا اہتمام نہ تھا وہاں اعراب لگائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اس تفسیر کی اشاعت کو 'دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔'

اس ترتیب وطباعت کے مختلف مراحل پر جن احباب کو خدمت قرآن کا موقع نصیب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی توفیق میں برکت بخشے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس

ایڈیشنل وکیل التصنیف

اپریل ۲۰۲۳ء

سُوْرَۃُالشَّمْسِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ الشّمس۔ یہ سورۃ مکّی ہے

وَھِیَ خَمْسَ عَشْرَۃَاٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور بسم اللہ کے سوا اس میں پندرہ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ الشّمس مکی سورۃ ہے یہ سورۃ مکی ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے نَزَلَتْ بِمَکَّۃَ کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی ایسی ہی روایت ابن الزبیرؓ سے بھی ہے۔ عقبہ ابن عامر کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ظہر کی نماز میں سُوْرَۃُ الشَّمْس اور سُوْرَۃُالضُّحٰی پڑھا کریں۔ مطلب یہ کہ اس وقت زیادہ لمبی سورتیں نہ پڑھا کریں۔ نیز ان دونوں سورتوں کو ظہر کے وقت سے مناسبت بھی ہے۔(فتح البیان زیرسورۃالشّمس ابتدائیۃ)

سورۃ الشّمس کے نزول کے متعلق پادری ویری کا خیال اور اس کا ردّ پادری ویری کے نزدیک پہلا نصف حصہ پہلے سال کا اور آخری نصف تیسرے چوتھے سال کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ آخری حصہ میں مخالفتِ انبیاء کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں چونکہ اس سورۃ کے آخری حصہ میں انبیاء کی مخالفت کا ذکر ہے اور انبیاء کی مخالفت کا ذکر اسی وقت اور اسی سلسلہ میں ہوسکتا ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری مخالفت مکہ میں شروع ہوگئی ہو اور منظم مخالفت تیسرے سال کے آخر یا چوتھے سال کے شروع میں ہوئی ہے اس لئے سورۃ کا یہ حصہ اُسی وقت کا ہے۔

یہ تو درست ہے کہ یہ سورۃ ابتدائی زمانہ کی ہے اور بالکل ممکن ہے کہ پہلے سال کی ہو یا دوسرے سال کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیسرے سال کے ساتھ اس کا تعلق ہو لیکن ویری کا یہ قیاس کرنا بالکل لغو بات ہے کہ چونکہ اس میں مخالفتِ انبیاء کا اجمالاً ذکر ہے اس لئے آدھا حصہ پہلے نازل ہو چکا تھا اور آدھا حصہ بعد میں نازل ہوا۔ پہلا حصہ پہلے سال میں نازل ہوا اور دوسرا حصہ تیسرے یا چوتھے سال میں نازل ہوا کیونکہ محض مخالفتِ انبیاء کا ذکر مخالفت کے شروع ہو جانے سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہم تو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں اور اس شک میں پڑنا بالکل خلاف

عقل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آئندہ مخالفت کا علم تھا یا نہیں لیکن پادری ویری اور ان کے ہم خیالوں کے نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھ کر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا اجمالی ذکر مخالفت کا بھی اسی وقت آ سکتا ہے۔ جب کہ مخالفت کے آثار شروع ہو چکے ہوں۔ اگر یہ لوگ قرآن کریم کو انسانی کلام سمجھتے ہیں تو بھی انہیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ ہر شخص جو ایک نئی بات دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے وہ قدرتی طور پر اُن کے انکار کی امید بھی کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ انکار کی شدت یا اس کی نوعیت کا اندازہ نہ لگا سکے مگر انکار و تردید کی امید ضرور رکھتا ہے آخر کون عقل مند یہ خیال بھی کر سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی قوم کے عقائد کے خلاف اس کے مذہب کے خلاف اور اس کے رسم و رواج کے خلاف دعویٰ کرے اور پھر وہ یہ امید رکھے کہ لوگ مجھے فوراً ماننے لگ جائیں گے۔ پس ضروری ہے کہ لوگ اس کی بات کا انکار کریں۔ ہاں اگر وہ سچا ہو تو آخر میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے قبولیت کے آثار دیکھ لے گا۔

جیسا کہ میں اوپر کئی مواقع پر بیان کر چکا ہوں یہ درست ہے کہ اگر مخالفت کی تفصیلات بیان کی جائیں تو ایک حکمت سے پُر کتاب ضرور اس امر کو ملحوظ رکھ لیتی ہے کہ وہ تفصیلات یا تو اشارے کنائے میں بیان ہوں اور یا ایسے وقت کے قریب بیان ہوں جب وہ واقعات رونما ہونے والے ہوں تا مخالف یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں انگیخت کی گئی ہے۔ مخالفت کی انگیخت کا الزام دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اگر پیشگوئی کے طور پر واقعات بیان کئے جائیں تو اس کے الفاظ چبھنے والے نہ ہوں۔ مگر یہ امر ہم صرف تفصیلات کے متعلق تسلیم کرتے ہیں۔ محض یہ بات بیان کرنا کہ سچائی کی مخالفت ہوا ہی کرتی ہے یہ کوئی ایسا مضمون نہیں جس سے لوگ چڑ جائیں۔ ہر روز ہر مجلس میں جب بھی صداقت کا ذکر ہو تو لوگ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر نئی صداقت کی مخالفت ہوتی ہے مگر اس سے نہ انگیخت ہوتی ہے نہ کسی کے دل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی فتنہ و فساد رونما ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق تو پادری ویری کو قیاس کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ کئی صدیاں اس کے نزول کے بعد پیدا ہوئے ہیں اور عقل سے اس کے نزول کی تاریخیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ چونکہ اس میں مخالفت کا ذکر ہے اور وہ بھی آپ کی مخالفت کا نہیں بلکہ ایک گذشتہ نبی کی مخالفت کا۔ اس سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ یہ آخری حصہ اس وقت کا ہے جب کہ آپؐ کی منظم مخالفت مکہ میں شروع ہو گئی تھی۔ مگر ہم یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ان کا طریق استدلال بالکل غلط ہے ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جو تاریخی واقعات پر مبنی ہے اور جس سے کسی صورت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانی سلسلہ احمدیہ جن کا سب زمانہ تاریخی ہے آپ کو براہین احمدیہ کی اشاعت

سے بھی پہلے الہام ہوا کہ ’’دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا‘‘ (تذکرہ صفحہ ۹۰ ایڈیشن ۲۰۲۲ء) اس الہام میں مخالفت کا ذکر ہے اور مخالفت کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کے زور آور حملوں کا بھی ذکر ہے لیکن ایک تو دنیا کا لفظ استعمال کر کے مفہوم کو ایسا وسیع کر دیا کہ مسلمان سمجھیں شاید عیسائیوں کا ذکر ہے اور عیسائی سمجھیں شاید مسلمانوں کا ذکر ہے۔ پھر بجائے خصوصیت سے یہ ذکر کرنے کے کہ صوفیاء بھی مخالفت کریں گے اور اکابر اور علماء بھی مخالفت کریں گے عام رنگ میں اللہ تعالیٰ نے اس مخالفت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کر دیا کہ ’’دنیا نے اُس کو قبول نہ کیا‘‘۔ مگر یہ الہام آپ کو اس وقت ہوا جب آپ براہینِ احمدیہ لکھ رہے تھے اور لوگ آپ پر بڑا اعتقاد رکھتے تھے یہاں تک کہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی جو بعد میں شدید مخالف ہو گئے اور احمدیت کی دشمنی کو انہوں نے انتہا تک پہنچا دیا اور جو اپنے تکبر اور رعونت کی وجہ سے کسی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے انہوں نے بھی براہین احمدیہ کو پڑھ کر لکھا کہ

’’ہماری رائے میں یہ کتاب اس زمانہ میں اور موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی اور آئندہ کی خبر نہیں۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا‘‘

پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق لکھا کہ

’’اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی و جانی و قلمی و لسانی و حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت ہی کم پائی گئی ہے‘‘

پھر اس خیال سے کہ کہیں لوگ مبالغہ سمجھ کر اس رائے کو غلط نہ قرار دے دیں انہوں نے زور دیتے ہوئے لکھا کہ

’’ہمارے ان الفاظ کو کوئی ایشیائی مبالغہ سمجھے تو ہم کو کم سے کم ایک ایسی کتاب بتا دے جس میں جملہ فرقہ ہائے مخالفین اسلام خصوصاً آریہ سماج و برہمو سماج سے اس زور شور سے مقابلہ پایا جاتا ہو اور دو چار ایسے اشخاص انصار اسلام کے نشان دہی کرے جنہوں نے اسلام کی نصرتِ مالی و جانی و قلمی و لسانی کے علاوہ حالی نصرت کا بھی بیڑا اٹھا لیا ہو اور مخالفینِ اسلام اور منکرینِ الہام کے مقابلہ میں مردانہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہو کہ جس کو وجود الہام کا شک ہو وہ ہمارے پاس آ کر اس کا تجربہ و مشاہدہ کر لے اور اس تجربہ و مشاہدہ کا اقوامِ غیر کو مزا بھی چکھا دیا ہو‘‘۔ (اشاعۃ السنۃ جلد ۷ صفحہ ۱۶۹ جون، جولائی، اگست ۱۸۸۴ء)

اب دیکھو جس وقت دنیا تعریف کر رہی تھی، جب بڑے بڑے رؤساء اور نواب آپ سے خط و کتابت رکھتے اور آپ کو دعا کے لئے لکھتے رہتے تھے، جب علماء اور عوام آپ سے عقیدت رکھتے تھے اور جب مخالفت کے دنیا میں

کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو الہام ہوا

’’دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اُس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دے گا‘‘۔

وہ مخالفتیں جواب ہو رہی ہیں یا گذشتہ عرصہ میں ہو چکی ہیں ان کا کیسا مختصر مگر مکمل نقشہ اوپر کے الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے آخر یہ غور کرنے والی بات ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو یہ بات کس نے بتادی تھی کہ آپ کی دنیا میں شدید مخالفت ہوگی۔ ایسی مخالفت کہ اس کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کو بھی سچائی کے اظہار کے لئے زور آور حملوں سے کام لینے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس امر کے مدعی تھے کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خادم ہوں۔ پس جس ہستی نے ایک خادم اور غلام کو ایسے زمانہ میں جبکہ مخالفت کا نام ونشان تک نہیں تھا اس امر کی اطلاع دے دی کہ تیری مخالفت ہونے والی ہے۔ ویری جیسے عقل مند کو اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ہستی آقا کو بھی قبل از وقت خبر دے سکتی تھی مگر بوجہ اُس تعصب کے جو مسیحی پادریوں میں بالعموم پایا جاتا ہے اور بوجہ اس مخالفت کے جو لوگوں کو اسلام سے ہے پادری ویری کے لئے یہ سمجھنا بڑا مشکل ہے کہ ابتدائی زمانہ میں ہی جب مخالفت کا کہیں وجود نہیں تھا آپ کو اس کا کیونکر علم ہو گیا۔ وہیری صاحب کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علم کا سوال نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے علم کا سوال ہے لیکن فرض کرو یہ سورۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی بنائی ہوئی ہے تب بھی انہیں اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ تفصیلات کا بے شک علم نہ ہو لیکن قوم کے اعتقادات اور اُس کے رسوم ورواج کے بالکل خلاف ایک نئی بات پیش کرنے والا ہر شخص سمجھتا ہے کہ قوم میری مخالفت کرے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پہلی وحی کے نزول کے بعد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور اُس نے آپ سے کہا کہ تیری قوم سخت مخالفت کرے گی یہاں تک کہ تجھے مکہ میں سے نکال دے گی۔ تو آپ نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ لوگ میری مخالفت کریں؟ اُس نے کہا آج تک کوئی ایسا رسول نہیں آیا جس کی اُس کی قوم نے مخالفت نہ کی ہو۔ (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) پس اگر یہ سورۃ پہلے سال کی سمجھو تب بھی ورقہ بن نوفل نے آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا اور بتادیا تھا کہ دنیا آپ کی مخالفت کرے گی۔ الغرض محض مخالفت کا ذکر اس امر کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ یہ سورۃ مخالفت کے قریب زمانہ کی یا خود مخالفت کے زمانہ کی ہے۔ ہاں بعض تفصیلاتِ معیّنہ اس امر کی ایک غالب دلیل ہوتی ہیں کہ وہ اس زمانہ یا اُس کے قریب کی ہیں مگر قطعی ثبوت اور حجت وہ بھی نہیں ہو سکتیں۔ بہر حال محض

سورۃ کے آخری حصہ میں مخالفتِ انبیاء کا ذکر آجانے سے یہ خیال کر لینا کہ یہ حصہ تیسرے یا چوتھے سال کا ہے بالکل بعید از قیاس امر ہے۔

ہم کُلّی طور پر انکار نہیں کرتے ممکن ہے یہ سورۃ تیسرے سال کی ہی ہو مگر اس وجہ سے اسے تیسرے یا چوتھے سال کے ابتدائی حصہ کی قرار دینا کہ اس میں مخالفتِ انبیاء کا ذکر آتا ہے محض دشمنی اور عداوت کا نتیجہ ہے۔

سورۃ الشّمس کے متعلق سر میور کا خیال اور اس کی تردید

ترتیب سر میور کہتے ہیں کہ یہ چند سورتیں یعنی سورۂ شمس اور اس سے دو پہلی اور دو بعد کی سورتیں یعنی سورۂ فجر، سورۂ بلد، سورۂ لیل اور سورۂ ضحٰی اظہار خیالات کا رنگ رکھتی ہیں اور ایسی ہی ہیں جیسے کوئی شخص اپنے نفس سے باتیں کر رہا ہو۔(A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry vol:4 p:251)

میور کے ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا میں رہ کر اپنی قوم کے حالات پر جو کچھ غور کیا اور اُس کے نتیجہ میں آپ کو جو خرابیاں اپنی قوم میں نظر آئیں اور جو کچھ فیصلے آپ کے دل نے اُن دنوں میں کئے اب ان سورتوں میں آپ ان کا اظہار کر رہے ہیں۔ یوروپین مصنفین اس قسم کے اظہارِ خیالات کو سولیلوکیز Soliloquies کہتے ہیں یعنی دل کے خیالات سے متاثر ہو کر خود اپنے آپ سے باتیں کرنا۔

گویا یوروپین مصنفین کے نزدیک یہ سورتیں کیا ہیں یہ وہ آہیں ہیں جو آپ کے تڑپتے ہوئے دل سے اُٹھیں، یہ وہ نالے ہیں جو قوم کی حالتِ زار پر آپ نے بلند کئے اور یہ وہ فغاں ہے جس نے حرا کی تاریکیوں میں ایک شور پیدا کیا۔ دنیا اپنی عیاشیوں میں مبتلا تھی، لوگ اللہ تعالیٰ سے غافل و بیگانہ ہو چکے تھے اور شیطانی افعال کو وہ اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا چکے تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی حالت پر تنہائی کی گھڑیوں میں آہیں بلند کر رہے تھے، نالہ و فریاد سے ایک شور بپا کر رہے تھے، درد و کرب اور انتہائی اضطراب کے عالم میں اپنے دن گذار رہے تھے اور آخر آپ کی آہیں، آپ کے نالے اور آپ کی فریادیں ان سورتوں کی شکل میں دنیا پر ظاہر ہو گئیں۔

دشمن نے یہ بات خواہ کسی رنگ میں کہی ہو مگر ہے ایک لطیف بات۔ دشمن کی غرض تو ان الفاظ سے یہ ہے کہ ان سورتوں میں جن جذبات کا اظہار ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے جذبات ہیں آپ اپنے دل میں جو کچھ سوچا کرتے اور جن جذبات و کیفیات سے آپ گذرا کرتے تھے اُنہی جذبات و کیفیات کا آپ نے ان سورتوں میں اظہار فرما دیا ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بھی اپنے کلام میں انسانی جذبات کو ظاہر کیا کرتا ہے۔ اگر یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات تھے تو ہم اس کے معنے یہ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت

کے لئے صحیح انتخاب کیا اور ایسے شخص کو اس عظیم الشان کام کی سرانجام دہی کے لئے چنا جس کے اپنے جذبات بھی خدا تعالیٰ کے ارادوں کے ساتھ مل گئے تھے پس ہم دشمن کی اس بات کو ردّ نہیں کرتے بلکہ ایک نئے نقطۂ نگاہ کے ماتحت تسلیم کر لیتے ہیں۔ہم کہتے ہیں اگر یہ صحیح ہے کہ ان سورتوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دکھ اور اس درد اور اس تالّم کا اظہار کیا گیا ہے جو آپ اپنی قوم کے متعلق محسوس کرتے تھے تو یہ امر بتاتا ہے کہ کس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں اور یتیموں کی حالت کو دیکھ دیکھ کر زار زار ہو رہے تھے۔کیا کیا خیالات تھے جو آپ کے دل میں پیدا ہوتے تھے اور کیا کیا جذبات تھے جو آپ کے دل میں ہیجان بپا رکھتے تھے۔آپ سمجھتے تھے کہ میری قوم جب تک اپنے ان افعال میں تبدیلی پیدا نہیں کرے گی وہ کبھی ترقی نہیں کر سکے گی۔تم اِسے انسانی کلام سمجھ لو۔تم اس کلام کو بناوٹی کلام قرار دے دو بہر حال تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس انسان کے آگے آنے کی وجہ یہ ہو کہ ظلم اور استبداد کو میں برداشت نہیں کر سکتا، یتیموں اور بیکسوں کی آہ وزاری کو میں دیکھ نہیں سکتا، غریبوں اور ناداروں کے حقوق کا اتلاف کبھی جائز نہیں سمجھا جا سکتا، غلاموں پر تشدّد کبھی روا نہیں رکھا جا سکتا اُس کی بڑائی اور اس کی نیکی اور اس کی عظمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔انہی حالات کو دیکھ دیکھ کر وہ حرا کی تاریکیوں کو پسند کرتا ہے، وہ دنیا سے ایک عرصہ تک جدا رہنا پسند کرتا ہے اور پھر جب وہ دنیا کی طرف واپس آتا ہے تو اس لئے نہیں آتا کہ وہ اپنے لیے مال چاہتا ہے اس لیے نہیں آتا کہ وہ اپنے لئے عزت چاہتا ہے، اس لئے نہیں آتا کہ وہ اپنے لئے حکومت چاہتا ہے بلکہ اس لئے آتا ہے کہ قوم کے گرے ہوئے طبقہ کو ابھارے، اس کی برائیوں کو دور کرے اور اس کی اصلاح کر کے اسے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی صف میں لا کر کھڑا کر دے۔میور کہتا ہے یہ سولیلوکیز Soliloquies ہیں یہ وہ باتیں ہیں جو انسان اپنے نفس سے کیا کرتا ہے، یہ وہ خیالات ہیں جو گہری خلوت میں انسان کے دل میں خود بخود پیدا ہو جایا کرتے ہیں لیکن اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی خیالات تھے اور اگر آپ کے قلب کی گہرائیوں میں بار بار یہی جذبات موجزن رہتے تھے کہ ان غلاموں کو کون پوچھے گا، ان یتیموں کو کون پوچھے گا، ان مساکین کو کون پوچھے گا مجھے خلوت کو چھوڑ دینا چاہیے اور اس وقت تک مجھے دم نہیں لینا چاہیے جب تک بڑے بڑے رئیس اور سردار اپنے ان مظالم سے توبہ نہیں کر لیتے۔تو میں سمجھتا ہوں یہی خیالات اپنی ذات میں اتنے پاکیزہ ہیں کہ دنیا کا کوئی ہوش مند انسان آپ کی فضیلت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بہر حال دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو قرآن مجید کو خدا تعالیٰ کا کلام قرار دیا جائے یا انسان کا۔اگر خدا تعالیٰ کا کلام مان لیا جائے تب تو کوئی اعتراض ہی نہیں رہتا لیکن اگر یہ انسان کے خیالات ہیں تو ایسے پاک نفس انسان کے

خیالات ہیں جس کی پاکیزگی اور تقدس سے کوئی شخص انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

سورۃ الشّمس کا تعلق پہلی سورتوں سے اس سورۃ کا تعلق دوسری سورتوں سے سمجھنے کے لئے اس امر کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ یہ پانچوں سورتیں جن کا ذکر سورتوں کی ترتیب کے سلسلہ میں پہلے کیا جا چکا ہے اپنے اندر یہ مضمون رکھتی ہیں کہ غرباء اور یتامیٰ و مساکین کی مدد کرنی چاہیے چنانچہ سورۃ الفجر میں آتا ہے كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ۔ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۔ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا۔ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (الفجر:۱۸ تا ۲۱) پھر سورۃ البلد میں آتا ہے وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ۔ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ۔ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد:۱۳ تا ۱۸) پھر انہی اخلاق کا سورۂ شمس میں ذکر ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس:۹ تا ۱۱) پھر سورۃ الّیل میں فرماتا ہے فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى۔ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى۔ وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى۔ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (الّیل:۶ تا ۱۱) اسی طرح آتا ہے وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى۔ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۔ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى (الّیل:۱۸ تا ۲۰) پھر سورۃ الضُّحٰی میں آتا ہے فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ۔ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضُّحٰی:۱۰ تا ۱۲) اس سے ظاہر ہے کہ یہ پانچوں سورتیں آپس میں ایک گہرا تعلق رکھتی ہیں اور ان میں زیادہ تر اخلاق فاضلہ پر زور دیا گیا ہے بالخصوص ایسے اخلاق پر جو قومی ترقی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن میں غریب، مظلوم، بے کس اور گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانے اور ان کے لئے ترقی کے وسائل اختیار کرنے کی تحریک پائی جاتی ہے۔ ان جذبات کو خواہ دشمن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے جذبات قرار دے تب بھی ظاہر ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جذبات سے متاثر ہو کر اصلاح کا بیڑا اٹھایا وہ جذبات غرباء اور یتامیٰ و مساکین کی خدمت کے تھے۔

بحر محیط کے مصنف لکھتے ہیں کہ پہلی سورۃ سے اس کا تعلق یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مکہ کی قسم کھائی تھی اب کچھ بلندیوں اور پستیوں کی قسم کھاتا ہے۔ میرے دل میں سب سے زیادہ قدر بحر محیط کے مصنف کی ہے کیونکہ تفسیر کا وہ حصہ جس سے مجھے لگاؤ ہے یعنی ترتیب سور کا مضمون۔ اس سے ان کو بھی لگاؤ ہے مگر یہاں آکر وہ بڑی پھسپھسی بات کہہ گئے ہیں۔ ان پانچ سورتوں کا مضمون (جن سورتوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) آپس میں بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اگر ہم سورۃ البلد کو سورۃ الشمس کے مضمون سے ملا دیں تو یہ سورۃ اگلی سورۃ سے جا ملتی ہے۔ پس

اس سورۃ کی ترتیب کے متعلق تو کوئی مشکل پیش ہی نہیں آسکتی۔اس سے پہلی سورۃ میں بھی غرباء کی امداد کا ذکر آتا ہے اوراس کے بعد کی سورۃ میں بھی غرباء کے لئے اموال کو خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے پس کم سے کم اِن مضامین کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سورۃ ماقبل اور مابعد کی سورتوں سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے۔اگر بحر محیط کے مصنف اتنی بات ہی بیان کر دیتے تو ایک معقول بات ہوتی مگر یہ کیا پھسپھسی بات ہے کہ پہلے چونکہ مکہ کی قسم کھائی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ آؤاب لگتے ہاتھوں ایک اونچی اور ایک نیچی چیز کی قسم بھی کھالیں یہ محض مجبوری کی بات ہے چونکہ اُن کا ذہن اصل ترتیب کی طرف نہیں گیا انہوں نے یہ تاویل کر لی۔بے شک جہاں تک ایسوسی ایشن آف آئیڈیاز ''یعنی بات سے بات پیدا ہو جانے'' کا سوال ہے یہ بات صحیح ہے کہ جب انسان کو ایک خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس قسم کا دوسرا خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے جب انسان کہتا ہے کہ مجھے فلاں شخص نہیں ملا تو اُس کی بیوی اور اس کے بچوں کا بھی خیال آجاتا ہے۔پھر اُن کے وطن کا بھی خیال آجاتا ہے اور پھر اسی طرح یہ خیالات بڑھتے بڑھتے اور کئی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔پس ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ ایک سے دوسرا خیال پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ قاعدہ انسانوں کی نسبت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت۔انسان تو چیزوں کو بھولا ہوا ہوتا ہے۔پس جب ایک چیز کا خیال کسی وجہ سے اسے آتا ہے تو اُس کے ساتھ تعلق رکھنے والی اشیاء بھی اسے یاد آنا شروع ہو جاتی ہیں مگر ہم اس جگہ کسی شاعر کے شعروں کے ربط پر غور نہیں کر رہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے کلام پر غور کر رہے ہیں جو عالم الغیب ہے اور جو ''ایسوسی ایشن آف آئیڈیاز'' یا بات سے بات یاد آجانے کے قاعدہ سے بالا اور پاک ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں خانہ کعبہ کی بنیاد کی غرض بیان کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ ہم اس شہر کی قسم کھاتے ہیں اور پھر اس شہر کو بنانے والے ابراہیمؑ کی بھی قسم کھاتے ہیں ابراہیمؑ نے یہ شہر اس لئے بنایا تھا کہ یہاں امن قائم رہے اور لوگ اللہ تعالیٰ کے نام پر اپنی زندگیاں وقف کرتے رہیں مگر مکہ اب کیا ہے اب اُس کی یہ حالت ہے کہ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ (البلد:۳) اے محمد رسول اللہ! تجھے اس میں تنگ کرنا حلال سمجھا جاتا ہے۔ابراہیمؑ نے جب مکہ بنایا تو اس وقت اس نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ:۱۲۷) یعنی اے میرے رب! میں اس بستی کو امن کے لئے بساتا ہوں۔مگر اب یہ حالت ہے کہ ابراہیمؑ کے اپنے بچہ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مکہ میں ہر قسم کی تکالیف کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔جس شخص نے دعا یہ کی تھی کہ خدایا یہاں باہر سے آنے والوں کو بھی امن میسر آجائے کیا اس کا کلیجہ یہ دیکھ کر ٹھنڈا ہو سکتا ہے کہ اُس کے اپنے بچہ کو اس شہر میں ہر قسم کے مصائب کا تختۂ مشق بنایا جارہا ہے اگر کہو کہ ابراہیمؑ نے

بے شک امن کی دعا کی تھی مگر اب ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا ہے جس نے ہمارے عقائد کے خلاف باتیں پھیلانا شروع کر دی ہیں اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا ازالہ کریں خواہ اس کے نتیجہ میں مکہ کا امن برباد ہی کیوں نہ ہو جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک یہ تمہارے عقائد کے خلاف باتیں پھیلا رہا ہے اور تمہیں ان باتوں کو سن کر اشتعال پیدا ہوتا ہے مگر کیا ابراہیمؑ کی دوسری دعا تمہیں یاد نہیں؟ اُس نے صرف یہی دعا نہیں کی تھی کہ مکہ میں امن قائم رہے بلکہ اُس نے یہ بھی دعا کی تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ (البقرة:۱۳۰) جب اُس نے یہ دعا کی تھی تو کیا اس کے مدنظر یہ بات تھی یا نہیں کہ ایک دن آئے گا جبکہ تم لوگ خراب ہو جاؤ گے۔ اگر تم نے خراب نہیں ہونا تھا تو کسی رسول کے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لیکن جب اس نے ایک رسول کے آنے کی پیشگوئی کر دی تو اس پیشگوئی کے ساتھ ہی اُس نے یہ بھی فیصلہ کر دیا کہ میرے بعد میری قوم خراب ہو جائے گی اور اُس وقت ایک ایسے رسول کی ضرورت ہو گی جو اُن کے عقائد کی اصلاح کرے اور ان کی خرابیوں کو دور کرے۔ اس قسم کی خرابیاں پیدا ہونے کے بغیر وہ رسول نہیں آ سکتا تھا جو يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ کا مصداق ہوتا۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ مکہ والے آیاتِ الٰہیہ کو بھول جائیں گے يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ مکہ والے کتاب الٰہی کو بھول جائیں گے۔ پھر کتاب کے ساتھ حکمت کے لفظ کا اضافہ بتاتا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ مکہ والوں کی عقلیں ماری جائیں گی اور وہ نہایت ہی احمقانہ عقائد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اسی طرح يُزَكِّيْهِمْ کا لفظ بتاتا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ مکہ والے تقویٰ سے دور جا پڑیں گے اور ضرورت ہو گی کہ ایک رسول ان میں مبعوث ہو جو دوبارہ ان کو ہدایت پر قائم کرے۔ پس فرمایا کہ مکہ کی بنیاد ایک وسیع نظام کے قیام کے لئے تھی جس میں روحانی، اعتقادی، سیاسی، تمدنی، عائلی، اقتصادی، علمی، بین الاقوامی، فکری اور اخلاقی تعلیمات اور ان کی حکمتوں اور ضرورتوں کا بیان ہو اور صرف خیال آرائی نہ ہو بلکہ عملی طور پر انسانی فکر اور عمل اور معاملہ کی اصلاح مدنظر ہو۔ روحانی اور اعتقادی تعلیمات کا ذکر يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ میں آتا ہے۔ سیاسی، تمدنی، عائلی، اقتصادی، علمی، بین الاقوامی فکری اور اخلاقی تعلیمات کا ذکر يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ میں آتا ہے ان تمام تعلیمات کی حکمتوں اور ضرورتوں کا بیان تعلیم الحکمۃ میں آ جاتا ہے اور یہ امر کہ صرف خیال آرائی نہ ہو بلکہ عملی طور پر انسانی فکر اور عمل اور معاملہ کی اصلاح مدنظر ہو اور یہ کام عملاً کیا جائے یہ يُزَكِّيْهِمْ میں آ جاتا ہے۔

غرض یہ ایک بہت بڑی پیشگوئی تھی اور بہت بڑا کام تھا جو دنیا میں ہونے والا تھا۔ اس بڑے کام کے لئے

ابرہیمؑ کی نسل میں ایک کامل بیٹے کی ضرورت تھی ایسے بیٹے کے بغیر یہ کام کبھی تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جب ابراہیمؑ نے یہ دعا کی تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا تو یہ امر ظاہر ہے کہ فِيْهِمْ سے مراد ان کی اپنی قوم تھی اور ان کا مطلب یہ تھا کہ تو میری قوم میں ایک کامل رسول بھیجیو۔ پس ابراہیمؑ ایک کامل بیٹے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں جس کے بغیر یہ کام تکمیل نہیں پا سکتا تھا اب اس سورۃ میں اس شخصِ کامل کی استعدادوں کا تفصیلی ذکر فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ فلاں فلاں استعدادوں والے ہی یہ کام کر سکتے ہیں دوسری استعدادوں والے یہ کام نہیں کر سکتے۔

اصل میں بحر محیط کے مصنف کو سورج اور چاند کے لفظوں سے شبہ ہوا ہے یا آسمان اور زمین کے الفاظ سے یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ شاید ان الفاظ کا تعلق پہلی سورۃ سے ہے کیونکہ اس سورۃ کے شروع میں ہی وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا۔ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا۔ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (الشمس: ۲ تا ۷) کے الفاظ آ گئے ہیں۔ چونکہ ابتداء میں ہی یہ الفاظ آ گئے ہیں انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ ان الفاظ کا پہلی سورۃ سے تعلق ہے اور چونکہ پہلی سورۃ میں مکہ کی قسم کھائی گئی تھی اور یہاں سورج اور چاند اور آسمان اور زمین کا ذکر آتا تھا انہوں نے خیال کر لیا کہ اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق یہ ہے کہ پہلے مکہ کی قسم کھائی تھی اب کچھ بلندیوں اور پستیوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ اصل مقصود اس سورۃ میں نہیں بلکہ یہ مقصود کی تفاصیل بیان کرنے کے لئے بطور امثلہ کے آئے ہیں اصل مقصود تو وہ نفسِ کاملہ ہے جو تقویٰ اور فجور کی راہوں سے کامل طور پر واقف ہوتا ہے اور پھر اسے ابھارتا چلا جاتا ہے یعنی صرف دینِ فطرت پر نہیں رہتا بلکہ دینِ شریعت کو بھی حاصل کرتا ہے اس نفسِ کاملہ اور اس کی استعدادوں کو آسانی سے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں بعض مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ مگر انہوں نے سمجھا کہ اصل مقصود سورج اور چاند ہے حالانکہ اصل مقصود سورج اور چاند نہیں بلکہ نفسِ کاملہ ہے۔

پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وَ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ہم والد کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کے ولد کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اب یہ بتانا چاہیے تھا کہ وہ ولد کیسا ہونا چاہیے چنانچہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ اس کی وضاحت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جس ولد کے متعلق ہماری طرف سے یہ خبر دی گئی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرے گا، کتاب اور حکمت سکھائے گا اور لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کرے گا وہ کن استعدادوں کا مالک ہوگا چنانچہ ان استعدادوں کی یہاں تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نفسِ کامل میں کون کون سی استعدادیں ہونی چاہئیں۔ یہ بھی بتایا ہے کہ نفسِ کامل دو قسم کے ہوتے ہیں اور پھر ان دونوں کی مثالیں بیان کر کے اس امر کو واضح کیا ہے کہ اس زمانہ میں کس قسم کے نفسِ کامل کی ضرورت ہے اور یہ کہ جب تک ایسا نفسِ کامل نہ آئے

ابراہیمؑ کی پیشگوئی پوری نہیں ہوسکتی۔ پس نفسِ کامل کی مثال میں سورج اور چاند کا ذکر کیا گیا ہے نہ کہ سورج اور چاند اصل مقصود ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

وَ الشَّمۡسِ وَ ضُحٰہَا ﴿۲﴾

(مجھے) قسم ہے سورج کی اور اس کے طلوع ہو کر اونچا ہو جانے کی۔

حلّ لُغات۔ شَمۡسٌ شَمۡسٌ کے معنے سورج کے ہوتے ہیں۔ مگر ش۔م۔س کے مادہ ترکیبی کے لحاظ سے شَمۡسٌ کے معنے ایسے وجود کے بھی ہو سکتے ہیں جو کسی کی اطاعت کا جؤا اپنی گردن پر رکھنے کے لئے تیار نہ ہو۔ بلکہ اپنی ذات میں کامل ہو۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں شَمَسَ الرَّجُلُ۔ اِمۡتَنَعَ وَ اَبٰی کہ اس نے دوسروں کو اپنے سے کم درجہ کا سمجھ کر ان کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب گھوڑے کے لئے شَمَسَ الۡفَرَسُ کہیں تو معنے یہ ہوتے ہیں کَانَ لَا یُمَکِّنُ اَحَدًا مِّنۡ ظَھۡرِہٖ وَلَا مِنَ الۡاِسۡرَاجِ وَالۡاِلۡجَامِ وَلَا یَکَادُ یَسۡتَقِرُّ۔ کہ گھوڑا کسی طرح بھی قابو نہ آسکا اور اس نے کسی کو اپنی پیٹھ پر نہ بیٹھنے دیا نہ زین ڈالنے دی اور نہ لگام ڈالنے دی (اقرب) گویا شَمۡسٌ ایسے وجود کو کہتے ہیں جس کی روشنی ذاتی ہو اور اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو دوسروں کی اطاعت برداشت نہ کرے یہ مفہوم اس سے نکلتا ہے کہ شَمۡسٌ کے معنے ہیں ایسا وجود جو اطاعت برداشت نہیں کرتا۔ اب جو شخص اطاعت برداشت نہیں کرتا بوجہ اس کے کہ اس میں تکبر پایا جاتا ہے وہ تو بُرا ہے لیکن جو شخص اس لئے اطاعت نہیں کرتا کہ خدا نے اسے پیدا ہی دوسروں کے آگے چلنے کے لئے کیا ہے وہ بُرا نہیں۔ گویا ۲ قسم کے اِبَاء ہوتے ہیں ایک اِبَاء وہ ہوتا ہے جس میں تابع یہ کہتا ہے کہ میں دوسرے کی بات نہیں مانتا۔ لیکن ایک اِبَاء اس انسان کا ہوتا ہے جسے پیدا ہی بڑا بننے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جیسے ایک عالم کا یہ کام ہے کہ وہ فتویٰ دے اب اگر کوئی جاہل شخص اسے کہے کہ اس طرح فتویٰ نہ دو بلکہ اُس طرح دو تو وہ فوراً انکار کر دے گا اور کہے گا کہ تمہارا حق نہیں کہ میرے معاملات میں دخل دو مگر اس کا انکار متکبرانہ انکار نہیں ہوگا۔ قرآن کریم میں بھی ان معنوں میں اِبَاء کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ یَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ (التوبة: ۳۲) اللہ تعالیٰ اپنے نور کے قائم ہو جانے کے سوا

ہر دوسری تحریک سے انکار کرتا ہے یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا انکار تکبر والا انکار نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح عربی کا محاورہ ہے بادشاہ سے کہتے ہیں۔ اَبَیْتَ اللَّعْنَ ۔ آپ نے لعنت کا انکار کیا ہے مطلب یہ کہ آپ ایسے شریف ہیں کہ کسی قسم کی لعنت کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے۔ اسی طرح کہتے ہیں رَجُلٌ اَبِیٌّ فلاں شخص ظلم اٹھانے سے انکاری ہے پس شَمْسٌ کے معنے گو سورج کے ہیں مگر شمس کے مادہ کے اعتبار سے اس کے معنے اِبَاء کے بھی ہیں اور ان معنوں کے لحاظ سے اس سے مراد وہ وجود ہوگا جو کسی کی ناواجب اطاعت سے انکار کرے اور مطلب یہ ہوگا کہ ایسا وجود جس کی قابلیتیں ہی ایسی ہیں کہ وہ کسی کی اطاعت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ خدا نے اسے دنیا کا لیڈر بنایا ہے اس کا کام صرف یہی ہے کہ وہ دوسروں کی راہنمائی کرے اس کا یہ کام نہیں کہ کسی کی ماتحتی اختیار کرے۔

اَلضُّحٰی ضَحَا (یَضْحُوْ ضَحْوًا) کے معنے ہوتے ہیں کوئی چیز ظاہر ہوگئی چنانچہ کہتے ہیں ضَحَا الطَّرِیْقُ بَدَا وَ ظَھَرَ کہ راستہ ظاہر ہوگیا (اقرب) اور جب سورج کی روشنی زیادہ نکل آئے تو اس وقت کو ضُحٰی کہتے ہیں (اقرب) صبح جب سورج نکلتا ہے اس وقت کو نہیں بلکہ جب سورج دو تین نیزے اوپر آ جائے اس وقت کو ضُحٰی کہتے ہیں لیکن اس سے پہلے وقت کو جو طلوع آفتاب کا ہوتا ہے اور جس میں روشنی پوری طرح ظاہر نہیں ہوتی ضَحْوَۃٌ کہتے ہیں۔ بعض نے اور زیادہ فرق کیا ہے ان کے نزدیک سورج نکلتے وقت کو ضَحْوَۃٌ کہتے ہیں۔ جب سورج کچھ بلند ہوتا ہے تو اس وقت کو ضُحٰی کہتے ہیں اور پھر نصف النہار سے زوال تک کے وقت کو ضُحَاءٌ کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں سورج کو اور اس کے ظہور اور روشنی کو۔

وَالشَّمْسِ وَ ضُحٰھَا میں دو حقیقتوں کی طرف اشارہ دنیا میں ہر چیز دو حیثیتیں رکھتی ہے ایک اس کی ذاتی حقیقت حساب اور وزن کے لحاظ سے اور ایک اس کی حقیقت دوسری چیزوں کی نسبت کے لحاظ سے۔ مثلاً فرض کرو ایک درخت دس فٹ اونچا ہے یہ دس فٹ قد اس کا اصلی قد ہوگا اور بغیر دوسری چیزوں کی نسبت کے اسے اس درخت کا اصلی قد قرار دیا جائے گا مگر ایک قد اس کا نسبتی ہوگا۔ مثلاً ایک شخص پندرہ بیس فٹ کے ٹیلے پر چڑھ جائے تو لازماً درخت کی ساری لمبائی اسے نظر نہیں آئے گی بلکہ بعض دفعہ اونچائی اور زاویہ نگاہ کے مطابق اسے وہ درخت دو فٹ کا نظر آئے گا۔ بعض دفعہ تین فٹ کا نظر آئے گا۔ بعض دفعہ چار فٹ کا نظر آئے گا۔ یا ایک شخص گڑھے میں ہے تو اسے وہ درخت بہت لمبا نظر آئے گا اور دس کی بجائے تیرہ یا چودہ فٹ کا معلوم ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دور سے درخت کو دیکھتا ہے تو وہ اسے بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ دور سے ہم پہاڑ دیکھتے ہیں تو باوجود اس کے کہ وہ بعض دفعہ دو ہزار بعض دفعہ چار ہزار اور بعض دفعہ بیس بیس ہزار فٹ اونچے ہوتے ہیں دور سے دیکھنے کی وجہ سے ایسے نظر

آتے ہیں جیسے کوئی اونچا سا خیمہ لگا ہوا ہو۔ اسی طرح اگر درخت کے نیچے لیٹ کر اوپر کی طرف دیکھا جائے تو درخت کا بالکل اور نظارہ نظر آئے گا۔ کسی مینار کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھو تو خواہ وہ ایک سو یا ڈیڑھ سو فٹ کا ہو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانچ سو یا ہزار فٹ کا ہے لیکن اگر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر مینار کو دیکھا جائے تو وہی مینار بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ غرض ہر چیز کی ایک حقیقت ذاتی حسابی ہوتی ہے جو طبعی حالات میں نظر آتی ہے اور ایک حقیقت اُس کی دوسری چیزوں کے لحاظ سے نظر آتی ہے۔ ایک شخص ساری رات سوچتا ہے بڑے بڑے اہم مسائل پر تدبر کرتا ہے فلسفہ اور ہیئت کی باریکیوں پر غور کرتا ہے، سیاست اور اقتصاد کے بڑے بڑے نکات حل کرتا ہے، قوموں کی ترقی اور ان کے تنزل کے وجوہ پر غور کرتا ہے اور اسی میں اپنی تمام رات بسر کر دیتا ہے۔ صبح اُسے کوئی شخص ملتا ہے تو وہ ان مسائل میں سے کوئی ایک بات اس کے سامنے بیان کرتا ہے۔ اب زید جس نے ساری رات سوچ کر سو اہم مسائل حل کئے تھے اُس کی نسبت کے لحاظ سے جو علم دوسرے شخص کو اس سے حاصل ہوا وہ صرف $\frac{1}{100}$ تھا۔ پھر ایک اور شخص ملتا ہے اور اس سے بھی وہ بعض مسائل کا ذکر کر دیتا ہے فرض کرو وہ اس کے سامنے دو مسئلے بیان کرتا ہے تو اب دوسرے شخص کو جو روشنی حاصل ہوئی وہ دو فیصدی ہے گویا ایک اس کی ذاتی روشنی ہے اور ایک اس کی وہ روشنی ہے جو دوسرے لوگوں کے لحاظ سے ہے اس کی ذاتی روشنی تو یہ ہے کہ اس نے ننوٰ مسئلے حل کئے ہیں لیکن اس کی نسبتی روشنی یہ ہے کہ ایک شخص ملتا ہے تو وہ اس کے سامنے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے، دوسرا شخص ملتا ہے تو اس کے سامنے دو مسئلے بیان کرتا ہے، تیسرا شخص ملتا ہے تو اس کے سامنے تین مسئلے بیان کرتا ہے اور وہ اس کی ذاتی روشنی کا اسی قدر اندازہ لگاتے ہیں جس قدر علم ان کو اس شخص سے حاصل ہو چکا ہوتا ہے پھر ایک اور شخص اسے ملتا ہے اور وہ اس کے سامنے ان مسائل کے متعلق ایک بڑی لمبی تقریر کرتا اور ننوٰ میں سے پچاس مسئلے بیان کر دیتا ہے اب اُس کے لحاظ سے اُس کی علمی روشنی کی بالکل اور کیفیت ہوگی اور وہ اس کا اندازہ ان پچاس مسائل سے لگائے گا جو اسے بتائے گئے تھے اس کے بعد اگر کوئی اور شخص اُسے ملتا ہے اور وہ اُس کے سامنے ننوٰ کے ننوٰ مسائل بیان کر دیتا ہے تو وہ اُس کے سامنے بالکل گویا عرفانی طور پر ننگا ہو جاتا ہے۔ اب وہ شخص جس کے سامنے صرف ایک مسئلہ بیان ہوا تھا وہ بھی کہتا ہے کہ فلاں نے بڑے لمبے غور کے بعد یہ بات نکالی ہے مگر وہ اس کے صرف $\frac{1}{100}$ حصہ کو جانتا ہے، جس کے سامنے دو باتیں بیان ہوئی تھیں وہ اس کے $\frac{2}{100}$ حصہ کو جانتا ہے جس کے سامنے دس باتیں بیان ہوئی تھیں وہ اس کے $\frac{1}{10}$ حصہ کو جانتا ہے اور جس کے سامنے پچاس باتیں بیان ہوئیں تھیں وہ اس کی $\frac{1}{2}$ حقیقت کو جانتا ہے اور جس کے سامنے ننوٰ باتیں بیان ہوئی تھیں وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اس کی ساری حقیقت کو جان لیا مگر واقعہ یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس سے پہلی رات بھی

غور کیا ہوتا ہے، اس سے پہلی رات بھی غور کیا ہوتا ہے اس سے پہلی رات بھی غور کیا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ خود بھی کئی باتیں بظاہر بھول گیا ہوتا ہے اور اسے اپنی حقیقت کا آپ بھی پورا علم نہیں رہتا لیکن خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ اس کے اندر کیا کیا حقیقتیں پیدا ہو چکی ہیں۔

درحقیقت ہر انسان میں ایک ملکۂ ظہور ہوتا ہے اور ایک اس کے اندر بالقوۃ طاقتیں ہوتی ہیں۔ اگر تم سے کوئی پوچھے کہ تم اردو کے کتنے الفاظ جانتے ہو اور تم گننے لگو تو تم پچاس ساٹھ یا سو سے زیادہ الفاظ شمار نہیں کر سکو گے لیکن اگر تمہارے سامنے کوئی کتاب رکھ دی جائے تو تم کہو گے کہ میں یہ الفاظ بھی جانتا ہوں اور وہ الفاظ بھی جانتا ہوں تو اپنی قابلیتوں کا انسان خود بھی اندازہ نہیں کر سکتا کجا یہ کہ وہ دوسروں کی قابلیتوں کا اندازہ لگا سکے۔ تم سورج کے سامنے مختلف درجہ کی صفائی کی چیزوں کو رکھ دو تو گو ان سب پر سورج کی پوری روشنی ہی پڑے گی مگر صفائی کے مختلف مدارج کی وجہ سے ہر چیز کے لحاظ سے اس کی روشنیاں بالکل الگ الگ ہوں گی حالانکہ سورج کی ذاتی روشنی تو ایک ہی ہے اسی طرح لیمپ کی ایک تو وہ روشنی ہے جو اس کے اندر جلنے والے تیل کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے وہ ایک ہی درجہ کی ہے لیکن ایک وہ روشنی ہے جو مختلف چیزوں پر پڑ کر اپنے حجم اور اپنی وسعت کو بدلتی چلی جاتی ہے۔ یہی مضمون اس جگہ بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالشَّمْسِ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں سورج کو وَضُحٰهَا اور اس کی اس روشنی کو جو اس کی ذاتی روشنی ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝۳

اور چاند کی جب وہ اس (یعنی سورج) کے پیچھے آتا ہے۔

حلّ لُغات۔ تَلٰهَا تَلَا فُلَانًا (تُلُوًّا) کے معنے ہیں تَبِعَهٗ اس کا پورا تابع ہو گیا (اقرب) اس آیت کی مفسرین نے مختلف تشریحات کی ہیں بعض نے کہا ہے کہ اتباع کے یہ معنے ہیں کہ جس وقت سورج ڈوبے معاً اس کی جگہ چاند روشنی دینے لگے اور یہ مہینہ کی پہلی پندرہ تاریخوں میں ہوتا ہے۔ (تفسیر زاد المسیر سورۃ الشمس زیر آیت وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا) بعض نے کہا ہے کہ تابع کے معنے یہ ہیں کہ سورج کی سب روشنی اور نور اس نے لے لیا اور یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ چاند پورا ہو جائے یعنی چودھویں پندرھویں سولھویں تاریخوں کا چاند (فتح القدیر سورۃ الشمس زیر آیت وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب سورج چڑھے اس وقت یہ ساتھ چڑھے تو یہ

تَلٰهَا ہے۔یعنی جب چاند بالکل نظر نہیں آتا۔یعنی مہینہ کی آخری دوراتیں۔قتادہ کہتے ہیں اس سے مراد وہ دن ہیں جب چاند ہلال ہوتا ہے۔فراء کہتے ہیں کہ اس کے معنے ہیں کہ چاند سورج سے روشنی لیتا ہے۔(تفسیر الرازی سورۃ الشمس زیر آیت وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا) جہاں تک ہلال کے معنوں کا سوال ہے وہ تو بالبداہت غلط ہیں کیونکہ یہاں قمر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور چاند کو قمر اس وقت کہتے ہیں جب وہ ہلال نہیں رہتا۔باقی معنوں میں سے اس کے پورا ہونے کے معنے زیادہ صحیح ہیں کیونکہ چودھویں رات کے چاند میں دونوں مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔وہ جسمانی طور پر بھی سورج کے ڈوبنے کے ساتھ ہی چڑھتا ہے اور سورج کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے اور روشنی کے لحاظ سے بھی وہی پورا تابع ہوتا ہے یعنی پوری سورج کی روشنی وہی لیتا ہے پس ان معنوں کو دوسرے معنوں پر ترجیح حاصل ہے۔

تفسیر۔فرماتا ہے ہم شہادت کے طور پر قمر کو بھی پیش کرتے ہیں یعنی ایک ایسے وجود کو جس میں روشنی اخذ کرنے اور اس کو اپنے اندر جذب کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے مثلاً شیشہ ہے اس میں روشنی جذب کرنے کا مادہ ہوتا ہے یا سفید پانی ہے اس میں بھی روشنی کو جذب کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے یا مثلاً ابرک کے ٹکڑے ہیں ان میں بھی روشنی جذب کرنے کا مادہ ہوتا ہے۔لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں روشنی جذب کرنے کا مادہ نہیں ہوتا۔ہمارے سامنے ایک شخص بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور اس پر سورج کی روشنی پڑ رہی ہوتی ہے مگر ہم اسے یہ نہیں کہتے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ ایسا نہ ہو کہ ہم اندھے ہو جائیں۔لیکن اگر وہی روشنی کسی شیشہ کے ذریعہ آنکھوں پر پڑے تو خطرناک نقصان پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ بعض دفعہ جب شیشہ کی چمک آنکھوں پر پڑتی ہے تو بینائی ضائع ہو جاتی ہے۔اسی طرح سارا دن سورج چمکتا ہے گھاس پر اس کی روشنی پڑتی ہے تو انسان اسے دیکھ دیکھ کر لطف اٹھاتا ہے لیکن مصر میں بڑے بڑے ریت کے میدان ہیں چونکہ موٹی ریت میں چمکنے کا مادہ ہے اور ہر چمکدار چیز اپنی روشنی کو اپنے مقابل کی طرف بھی پھینکتی ہے ان میدانوں میں سے گذرتے ہوئے بعض لوگ ایک منٹ میں اندھے ہو جاتے ہیں۔مصر میں ایسے سینکڑوں اندھے پائے جاتے ہیں جن کی آنکھیں بالکل اچھی تھیں مگر وہ کسی ایسے ہی ریت کے میدان میں غلطی سے چلے گئے اور اندھے ہو گئے۔یہی حال موٹر کی روشنی کا ہوتا ہے جب رات کو موٹر آ رہا ہو اور اس کے لیمپ میں سے تیز شعائیں نکل رہی ہوں تو کئی حادثے ہو جاتے ہیں۔لوگ حیران ہوتے ہیں کہ حادثہ کس طرح ہو گیا جبکہ موٹر کے سامنے لیمپ روشن تھا اور اس کی دور دور تک روشنی پھیل رہی تھی۔وہ یہ نہیں جانتے کہ دور سے اس کی روشنی اس طرح چمک کر پھیلتی ہے کہ انسان کو یہ پتہ ہی نہیں لگتا کہ موٹر یہاں ہے یا وہاں ہے اور وہ اس کی لپیٹ میں آ کر مارا جاتا ہے۔درحقیقت ایک تو لیمپ کی ذاتی روشنی ہوتی ہے اور ایک وہ ری فلیکٹر ہوتے ہیں جو اس روشنی کو

دور پھینک دیتے ہیں۔ اگر ری فلیکٹر نہ ہو تو روشنی بہت محدود جگہ میں رہتی ہے لیکن جب روشنی کے ساتھ ری فلیکٹر مل جاتا ہے تو اس کی طاقت کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور وہ دور دور تک اندھیروں کو زائل کر دیتا ہے۔ قمر کے معنے دراصل ری فلیکٹر کے ہی ہیں یعنی ایسا وجود جس میں ذاتی طور پر یہ قابلیت ہوتی ہے کہ وہ سورج سے نور لے کر اسے دوسروں کی طرف پھینک دے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اگر قمر کی جگہ کوئی سا بھی اور ستارہ رکھ دیا جائے تو وہ بھی سورج کی روشنی کو اپنے اندر جذب کر کے دوسروں کی طرف پھینک سکتا ہے ہر ستارہ یہ قابلیت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نظامِ شمسی میں صرف قمر میں ہی یہ قابلیت پیدا کی ہے کہ وہ سورج سے اس کی روشنی اخذ کرے اور پھر اسے اپنے اندر جذب کر کے دوسروں کی طرف پھینک کر ان کو منور کر دے۔ اسی لئے چاند کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کسی قسم کی آبادی کے قابل نہیں ہے اگر وہ قابل آبادی ہوتا تو اس میں درخت ہوتے، گھاس ہوتا بڑے بڑے جنگلات ہوتے۔ مگر یہ چیزیں چاند میں نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر یہ چیزیں ہوتیں تو وہ روشنی کو اپنے اندر جذب کر کے دوسروں کی طرف پھینک نہیں سکتا تھا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے چاند کو ری فلیکٹر کے طور پر بنایا ہے اس لئے اُس نے چاند میں ریت کے بڑے بڑے میدان پیدا کر دیئے ہیں جب سورج کی روشنی اُن پر پڑتی ہے تو وہ ریت کے میدان ری فلیکٹر کے طور پر اس کو دنیا پر پھینک دیتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْقَمَرِ ہم تمہارے سامنے ایک ایسے وجود کو پیش کرتے ہیں جو قمری حیثیت رکھتا ہے مگر صرف قمر کے وجود کو نہیں بلکہ قمر کی اس حالت کو جب وہ پوری طرح سورج کے سامنے آ کر اس کی ساری روشنی کو اپنے سارے وجود میں لے لیتا ہے بے شک قمر میں یہ خوبی ہے کہ وہ روشنی لے کر دوسروں کی طرف پھینک دیتا ہے لیکن روشنی اس کے سامنے نہ ہوگی تو وہ پھینکے گا کیا؟ اسی لئے صرف قمر کو شہادت کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اِذَا تَلٰهَا ہم قمر کو ایسی حالت میں شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جب وہ سورج کے بالکل سامنے آجاتا ہے۔ ذاتی خوبی تو قمر کی یہ ہے کہ وہ سورج کی روشنی کو لے سکتا ہے اور پھر دوسروں کی طرف پھینک سکتا ہے لیکن یہ اس کی ذاتی خوبی اس وقت تک ظاہر نہیں ہوسکتی جب تک وہ سورج کے سامنے نہ آجائے اگر سورج کے سامنے آجائے تو اس کی یہ خوبی ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر سورج اور چاند کے درمیان کوئی اور چیز حائل ہو جائے جیسے بعض دفعہ زمین حائل ہو جاتی ہے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے اور وہ سورج کی روشنی کو زمین کی طرف پھینکنے سے قاصر رہتا ہے یا مثلاً پہلی رات کا چاند ہے اس وقت بھی وہ سورج کے سامنے پورے طور پر نہیں ہوتا اسی لئے وہ اس وقت قمر یا بدر کی بجائے ہلال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے مگر جب چودھویں رات آجائے تو چاند مکمل طور پر سورج کے سامنے آجاتا ہے اور اس کی روشنی اپنی پوری شان کے ساتھ دنیا پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ پس

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ہم چاند کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں مگر خالی چاند کو نہیں بلکہ چاند کو اس حالت میں شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جب وہ کامل طور پر سورج کے سامنے آجاتا ہے اور اس کی روشنی کو جذب کر کے دوسری دنیا کو منور کر دیتا ہے گویا اس کا کمالِ نور اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب سورج کے عین سامنے آجاتا ہے اور یہی اس کے حسن کے کمال کا موقع ہوتا ہے کہ اس میں ذاتی طور پر یہ قابلیت بھی ہوتی ہے کہ وہ سورج کی روشنی کو اپنے اندر جذب کرے اور پھر اس کے اندر یہ قابلیت بھی ہوتی ہے کہ اس روشنی کو دوسروں کی طرف پھینک دے اور دنیا کی تاریکیوں کو دور کر دے۔ اب مکمل طور پر دونوں آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ وَالشَّمْسِ ہم سورج کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس میں ذاتی روشنی پائی جاتی ہے وَضُحٰىهَا اور اس کی ذاتی روشنی کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں وَالْقَمَرِ اور ہم چاند کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس میں روشن چیز کی روشنی کو لینے اور پھر اسے دوسرے وجودوں پر پھینک کر انہیں روشن کر دینے کی قابلیت پائی جاتی ہے اور چاند کی شہادت ہم اس حالت میں پیش کرتے ہیں جبکہ وہ عملاً سورج سے پوری روشنی لے کر دنیا کو روشن کر رہا ہوتا ہے۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ﴿۴﴾

اور دن کی جب وہ اس (یعنی سورج) کو ظاہر کر دیتا ہے۔

تفسیر۔ بظاہر تو دن کو سورج پیدا کرتا ہے نہ یہ کہ دن سورج کی روشنی کو ظاہر کرتا ہے مگر یہاں چونکہ استعارہ والا کلام ہے اور ضُحٰی سے مراد سورج کی ذاتی روشنی تھی اس نہار سے مراد زمین کا اس کے سامنے آکر سورج کو دکھا دینا ہے۔ جب ہم دن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ سورج چمکنے لگ گیا ہے کیونکہ سورج تو ہر وقت چمکتا رہتا ہے۔ دن سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ہماری زمین سورج کے سامنے آ گئی ہے۔ پس وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا کے یہ معنے ہوئے کہ جب زمین نے سورج کے سامنے آکر سورج کو دکھا دیا۔ ضُحٰىهَا کا مطلب اور تھا ضُحٰىهَا سے سورج کی ذاتی روشنی کی طرف اشارہ تھا خواہ وہ دنیا کے سامنے ہو یا نہ ہو سورج بہر حال چمک رہا ہوتا ہے اس کے سامنے بادل آجائیں یا زمین اس کی طرف سے رخ بدل لے اس کی ذاتی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن باوجود سورج کے ہر وقت چمکتے رہنے کے رات کے وقت کو نہار نہیں کہیں گے کیونکہ نہار یا دن اس وقت کو کہتے ہیں جب سورج ہمارے حصۂ ملک کے سامنے ہوتا ہے خواہ اس کے سامنے بادل ہی کیوں نہ آ گیا ہو اور جب وہ ہمارے

حصۂ ملک کے سامنے نہ ہوتو خواہ اس کے آگے بادل نہ ہو ہمارے ملک والے اس وقت کو دن نہیں کہیں گے اور یہ نہیں کہیں گے کہ سورج روشن ہے پس نَہَار اور مفہوم پیدا کرتا ہے اور ضُحٰهَا اور مفہوم پیدا کرتا ہے۔ ضُحَى الشَّمْسِ ہر وقت قائم رہتی ہے خواہ سورج کسی حصۂ دنیا کے سامنے ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ وہ سورج کی ذاتی روشنی پر دلالت کرتی ہے اور نہار دنیا کے مختلف حصوں کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے کبھی یہاں دن کبھی وہاں۔ کیونکہ دن اس وقت کو کہتے ہیں جب زمین سورج کے سامنے ہو کر لوگوں کو اپنی ضُحیٰ دکھاتی ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝۵

اور رات کی جب وہ اس کو ڈھانپ دے۔

تفسیر۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا سے مراد رات کے وقت زمین کا منہ پھیر کر سورج کو اوجھل کر دینا ہے۔ رات کیا ہوتی ہے؟ جب سورج کی طرف سے زمین اپنی پیٹھ پھیر لیتی ہے اور اندھیرا ہو جاتا ہے تو اسے رات کہتے ہیں پس چونکہ لَيْل ایک زمینی فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اس لئے یہاں لَيْل کے متعلق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہے لیکن اصل مطلب یہ ہے کہ زمین سورج کی طرف سے چکر کاٹ کر لَيْل پیدا کر دیتی ہے گویا وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا میں تو زمین کی اس حالت کا ذکر کیا تھا جب وہ سورج کے سامنے آ کر آبادی کو سورج دکھا دیتی ہے اور وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا میں زمین کی اس کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے جب وہ سورج سے اپنا منہ موڑ کر لَيْل پیدا کر دیتی اور دنیا کی نظروں سے سورج کو روپوش کر دیتی ہے۔

یہ چار چیزیں ہیں جو الگ الگ معنے رکھتی ہیں وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا سے سورج اور اس کی ذاتی روشنی مراد ہے وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا سے چاند اور اس کی عکسی روشنی مراد ہے وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا میں زمین اور اس کی انعکاسی روشنی مراد ہے وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا میں زمین اور اس کی نور سے محرومی مراد ہے۔ سورج تو اپنے اندر ذاتی طور پر یہ وصف رکھتا ہے کہ وہ دنیا کو روشن کرے لیکن چاند میں بِالْقُوَّةِ روشنی اخذ کرنے کی طاقت ہوتی ہے یعنی اس کے اندر یہ قابلیت پائی جاتی ہے کہ وہ سورج سے روشنی لے اور اپنے اندر جذب کر کے اسے دوسروں تک پہنچا دے جیسے ری فلیکٹر ہوتے ہیں کہ وہ لیمپ کی روشنی کو بہت دور تک پھیلا دیتے ہیں۔ اب خواہ چاند چمک نہ رہا ہو لیکن چمکنے کی قابلیت اس میں موجود ہوتی ہے جب وہ سورج کے سامنے آ جاتا ہے تو اس کی یہ قابلیت ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ اس کی روشنی کو دوسروں تک پھینکنے لگ جاتا ہے شمس اور قمر کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا میں دن کو بطور

مثال پیش کیا ہے جب وہ سورج کو روشن کر دیتا ہے اور وَ الَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰہَا میں رات کو بطور مثال پیش کیا ہے جب زمین کے چکر کاٹ کر جانے کے وقت سورج اوجھل ہو جاتا ہے۔

ان چار آیات میں چار الگ الگ زمانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وَ الشَّمۡسِ وَ ضُحٰہَا میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہم سورج کو تمہارے سامنے بطور مثال پیش کرتے ہیں جب تک اپنی ذات میں چمکنے والا وجود دنیا میں نہ آئے بالخصوص ایسے زمانہ میں جب نور بالکل مٹ چکا ہو اس وقت تک دنیا کبھی ترقی کی طرف اپنا قدم نہیں اٹھا سکتی جیسے بجھی ہوئی آگ ہو تو اس سے دوسری آگ روشن نہیں ہو سکتی یا بجھا ہوا دیا ہو تو اس سے دوسرا دیا روشن نہیں ہو سکتا۔ ری فلیکٹر اسی وقت فائدہ دیتا ہے جب نور موجود ہو۔ مثلاً اگر لیمپ جل رہا ہو اور اس پر ری فلیکٹر لگا دیا جائے تو بے شک اس کی روشنی دور تک پھیل جائے گی یا جیسے بیٹریوں کی روشنی بہت معمولی ہوتی ہے لیکن اوپر کا شیشہ جو ری فلیکٹر کے طور پر لگا ہوا ہوتا ہے اس کی معمولی روشنی کو بھی دور تک پھیلا دیتا ہے اگر اس شیشہ کو تم نکال دو تو بیٹری کی روشنی آدھی سے بھی کم رہ جائے گی۔ بہرحال ری فلیکٹر اسی صورت میں کام آ سکتا ہے جب نور موجود ہو، روشنی اپنی کسی نہ کسی شکل میں قائم ہو لیکن اگر نور مٹ چکا ہو، تمام روشنیاں گُل ہو چکی ہوں تو اس وقت ایسا ہی وجود کام آ سکتا ہے جو ذاتی طور پر اپنے اندر روشنی رکھتا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے سورج کو پیش کرتے ہیں جو اپنے اندر ذاتی روشنی رکھتا ہے اور جو ظلمتوں کو دور کرنے کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد روشنی کا دوسرا ذریعہ چاند ہوتا ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب وہ سورج کے سامنے آ جاتا ہے اس وقت وہ بھی دنیا کو اپنی شعاعوں سے منور کر دیتا ہے۔ یہ دو ذرائع ہیں جو دنیا میں انتشارِ نور کے لئے کام آتے ہیں اللہ تعالیٰ ان مثالوں کو کفارِ مکہ کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے تم اچھی طرح سوچ لو کیا تمہارے پاس ان دونوں ذرائع میں سے کوئی ایک بھی ذریعہ موجود ہے، کیا تمہارے پاس کوئی شمس ایسا ہے جو اپنے اندر ذاتی روشنی رکھتا ہو؟

شمس سے مراد شریعت لانے والا وجود شمس سے مراد وہ وقت ہوتا ہے جب شریعت لانے والا وجود براہ راست دنیا کو فائدہ پہنچا رہا ہو۔ پھر فرماتا ہے اگر کسی شمس کو تم پیش نہ کر سکو تو تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ گو شمس ہم میں موجود نہیں مگر اس سے اکتسابِ نور کر کے ایک چاند ہم کو منور کر رہا ہے۔ بہرحال دو ہی چیزیں دنیا کو منور کر سکتی ہیں یا تو ذاتی روشنی رکھنے والا کوئی وجود ہو اور اگر اس کی روشنی دور چلی جائے تو پھر اس کے بالمقابل آ جانے والا کوئی ری فلیکٹر جو اس کی روشنی کو جذب کر کے دوسروں تک پہنچا دے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ روشنی حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہیں۔

اسی قاعدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مکہ والو! تمہیں تو ان دونوں حالتوں میں سے کوئی حالت بھی نصیب نہیں۔ مثلاً پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ شریعت موجود ہو مگر تمہاری یہ حالت ہے کہ تمہارے پاس نہ نوحؑ کا قانون ہے نہ ابراہیمؑ کا قانون ہے نہ کسی اور نبی کا قانون ہے اور جب تمہارے پاس کوئی قانون ہی نہیں تو تم اپنے متعلق کیا امید کر سکتے ہو اور کس طرح اس غلط خیال پر قائم ہو کہ تمہارے باپ دادا کی بجھی ہوئی روشنیاں تمہارے کام آ جائیں گی۔ تمہاری حالت تو ایسی ہے کہ تمہیں لازمی طور پر ایک شارع نبی کی ضرورت ہے کیونکہ ساری شریعتیں تم میں مفقود ہیں اور جب کہ سب کی سب شرائع مفقود ہو چکی ہیں تو اب ضروری ہے کہ کوئی شمسِ ہدایت آئے جو ان تاریکیوں کو اجالے سے بدل دے۔ جب تک ایسا وجود نہیں آتا جو اپنے اندر ذاتی طور پر روشنی رکھنے والا ہو اس وقت تک پرانے لیمپ جو بجھ چکے ہیں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتے۔

روشنی کے حصول کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ قمر ظاہر ہو جائے۔ مگر قمر بھی اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب شمس تو موجود ہو مگر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اس کے بغیر وہ کسی کام نہیں آ سکتا۔ اگر تم یہ کہو کہ ہم قمر سے فائدہ اٹھا لیں گے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ تم میں کوئی شریعت موجود نہیں کہ غیر شریعت والا کوئی قمر ظاہر ہو جائے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین کی اس حالت کو پیش کیا ہے جب وہ نہار پیدا کر دیتی ہے اور آخر میں اس حالت کو رکھا گیا ہے جب زمین سورج سے پیٹھ موڑ کر لوگوں کے لئے لَیل پیدا کر دیتی ہے۔

سورۃ کی پہلی چار آیات میں اسلام کے دو اہم زمانوں کی طرف اشارہ ان آیات میں اسلام کے دو اہم زمانوں کی طرف نہایت ہی بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا میں تو اسلام کی غرض کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات میں چمکنے والے سورج ہیں جوں جوں یہ سورج طلوع کرتا جائے گا وہ نور جو ذاتی طور پر سورج کے اندر موجود ہے زمین میں پھیلتا چلا جائے گا۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نفسِ مطّہر سے ہی نکل کر آیا ہے۔ خدا نے اس عظیم الشان کلام کے نزول کے لئے آپ کو چنا اور پھر آپ کے ذریعہ یہ کلام ہمارے ہاتھوں تک پہنچا۔ وہ تفصیلات جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور وہ غیر متبدل تعلیمات جن کو اسلام نے پیش کیا ہے خواہ وہ تزکیہ نفوس سے تعلق رکھتی ہوں یا سیاسی اور تنظیمی تعلیمات ہوں یا اخلاقی اور اقتصادی تعلیمات ہوں بہر حال وہ سب کی سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے نکل کر ہم تک پہنچی ہیں۔ پس آپ وہ شمس تھے جن کی ضُحٰی اپنی ذات میں آپ کی صداقت کی ایک بہت بڑی دلیل تھی دنیا خواہ آپ کو مانے یا نہ مانے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دنیا قرآن کریم کو بند کر کے رکھ دے اور کہے کہ

قرآن کریم کے مضامین بالکل خراب ہیں پھر بھی جب تک قرآن دنیا میں موجود ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ضُحٰی دنیا میں موجود رہے گی۔ جب دن کے وقت ایک شخص اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ رہتا ہے یا جب زمین چکر کھا کر سورج کو لوگوں کی نگاہ سے اوجھل کر دیتی ہے اُس وقت سورج کا وجود تو غائب نہیں ہو جاتا۔ سورج بہرحال موجود ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ زمین اس سے اپنی پیٹھ موڑ لے یا کوئی شخص اپنے کمرہ کے دروازے بند کر کے اس کی روشنی کو اندر داخل نہ ہونے دے۔ اسی طرح وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں بتایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضُحٰی والے وجود ہیں چاہے تم اس نور سے فائدہ اٹھاؤ یا نہ اٹھاؤ ان کا نور بہرحال ظاہر ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ دنیا ایک دن تسلیم کرے گی کہ آپ حقیقت میں روحانی سورج تھے پس دنیا ان کے سامنے آئے یا نہ آئے اس کا کوئی سوال نہیں۔ دنیا اس شمس کے سامنے آئے گی تو منور ہو جائے گی اور اگر نہ آئے گی تو یہ شمس بہرحال شمس ہے اس کی ضحیٰ پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا کہ لوگوں نے اس کی طرف سے اپنی پیٹھ موڑ لی ہے۔

فرض کرو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک آدمی بھی ایمان نہ لاتا تو اس سے کیا ہو سکتا تھا جو روحانی اور اخلاقی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو سیاسی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو اقتصادی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو عائلی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو تمدنی تعلیمات آپ نے دی ہیں، جو علمی تعلیمات آپ نے دی ہیں ان سے بہرحال آپ کا شمس ہونا ظاہر ہو جاتا۔ جب ایک وجود کو خدا تعالیٰ نے شمس بنا کر بھیجا تو خواہ مکہ والے آپ پر ایمان نہ لاتے۔ اہل عرب آپ کو سچا تسلیم نہ کرتے وہ یہ تو کہہ سکتے تھے کہ اس شمس سے نہار پیدا نہیں ہوا، دنیا نے اس سورج سے روشنی اخذ نہیں کی مگر وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ شمس، شمس نہیں تھا۔ جب ایک شخص نئی شریعت لاتا ہے تو خواہ ہزار سال کے بعد لوگ اسے مانیں بہرحال اس کا شمس ہونا پہلے دن سے ہی ثابت ہوتا ہے۔ یہ تو ہم کہیں گے کہ دنیا اس کے سامنے دو سو سال کے بعد آئی یا ہزار سال کے بعد آئی مگر یہ نہیں کہیں گے کہ وہ شمس اپنی ذات میں ایک روشن وجود نہیں تھا پس وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں بتایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات میں ایسا نور رکھتے ہیں کہ تم چاہے مانو یا نہ مانو ان کا کچھ بگڑ نہیں سکتا۔

پھر فرماتا ہے وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا یعنی آپ کے بعد بعض اور وجود بھی آئیں گے جو قمر کی حیثیت رکھیں گے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف ایسے شمس ہیں جو اپنی ذات میں روشن اور پُر انوار ہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے آپ کے نور سے اکتساب کرنے کے لئے بعض قمر بھی پیدا کر دیئے ہیں جو ہر زمانہ میں اِن کے نور کو دنیا میں پھیلاتے رہیں گے گویا اوّل تو یہ اپنی ذات میں سورج ہے پھر یہ ایسا سورج ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ نے ری فلیکٹر بھی پیدا کر دیئے

ہیں۔ اگر لوگ اس سورج کی طرف سے اپنا منہ موڑ لیں گے تو خدا تعالیٰ پھر بھی انہیں بھاگنے نہ دے گا اس کے مقابل پر ایک چاند آ کھڑا ہوگا اور اس سے روشنی اخذ کر کے دنیا پر پھینکنے لگے گا اور اس طرح پھر دنیا اس کے نور سے حصہ لینے لگے گی۔

اگر تم زمین سورج اور چاند کو آدمی سمجھ لو تو تمثیلی رنگ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین جب روٹھ کر سورج سے اپنا منہ پھیر لیتی ہے تو چاند کہتا ہے تم اس سے بھاگ کر کہاں جاتی ہو میں اس سے نور حاصل کر کے تم پر ڈال دوں گا۔ غرض بتایا کہ دنیا خواہ پیٹھ پھیر لے، خواہ وہ اس شمس روحانی سے منہ موڑ لے پھر بھی اس سورج سے اکتسابِ نور کرتے ہوئے ایسے قمر دنیا میں بھیجے جائیں گے جو پھر ظلمت کدۂ عالم کو بقعۂ نور بنا دیں گے اگر کوئی قمر نہ ہوتا اور دنیا اپنی پیٹھ سورج کی طرف پھیر دیتی تو لازماً تاریکی ہی تاریکی ہو جاتی۔ اجالا ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی شارع نبی آیا دنیا نے کچھ عرصہ کے بعد اس سے اپنا منہ موڑ لیا اور تاریکی و ظلمت کے بادل اس پر چھا گئے۔ مگر فرمایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نبی نہیں یہ وہ شمس ہیں جس کے پیچھے قمر لگے ہوئے ہیں یہ وہ معشوق ہے جس کے عاشق اس کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ دنیا اگر روٹھے گی تو قمر اُس کو روشنی پہنچانے کے لئے ظاہر ہو جائیں گے۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا میں بتایا کہ ہمارا یہ سورج صرف اپنی ذات میں ہی روشنی نہیں رکھتا بلکہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ دنیا بھی اس سے روشنی لے لے گی۔ اس جگہ نہار سے مراد زمانۂ نبویؐ نہیں بلکہ نہار سے مراد بعد کا زمانہ ہے جب سورج تو نہ ہوگا مگر دن کا وقت سورج کو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لاتا رہے گا یہاں تک کہ رات آ جائے گی اور وہ اسے ڈھانپ لے گی اور ایک بار دنیا پھر معلوم کر لے گی کہ سورج کے بغیر گذارہ نہیں اور اس سے دوری خسران وتباب کا موجب ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جسمانی اور روحانی سورج میں ایک فرق بتایا ہے۔ جسمانی سورج تو جب تک موجود رہتا ہے دن چڑھا رہتا ہے اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے رات آ جاتی ہے لیکن روحانی سورج کی روشنی اس کے غائب ہونے کے بعد بڑھنی شروع ہوتی ہے گویا دنیوی دن تو سورج کے ہوتے ہوئے چڑھتا ہے لیکن روحانی دن سورج کے غائب ہونے کے بعد اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن اور احادیث نے ساری دنیا کو منور کیا مگر اس وقت جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وفات پا چکے تھے، جب روحانی سورج لوگوں کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ یہ روحانی اور جسمانی سورج میں ایک نمایاں فرق ہے۔ جسمانی سورج کا دن اس وقت چڑھتا ہے جب سورج نکلتا ہے مگر روحانی سورج کا دن اس وقت کمال کو پہنچتا ہے جب وہ غائب ہو جاتا ہے۔

جسمانی سورج کے طلوع ہونے پر لوگ خوشیاں مناتے ہیں لیکن جب روحانی سورج طلوع کرتا ہے تو لوگ

مخالفت کا ایک طوفان بپا کرتے ہیں۔کوئی گالی نہیں ہوتی جو اسے نہ دی جائے،کوئی الزام نہیں ہوتا جو اس کے متعلق تراشا نہ جائے۔ ہر کوشش کا ماحصل یہی ہوتا ہے کہ کہیں اس سورج کی ضیاء دنیا میں نہ پھیل جائے۔مگر جب وہ سورج دنیا کی جسمانی نظروں سے غائب ہوجاتا ہے تو اس کی روشنی بڑھنے لگتی ہے اور لوگ یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ بڑا اچھا آدمی تھا ہم بھی اسے مانتے ہیں،ہم بھی اس پر ایمان لاتے ہیں۔یہی اثر تھا جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک دفعہ ایسا رلایا کہ میدہ کے نرم نرم پھلکے کا ایک لقمہ تک ان کے گلے سے نیچے اترنا مشکل ہوگیا۔جب کسریٰ کو شکست ہوئی اور مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو ان میں کچھ ہوائی چکیاں بھی تھیں جن سے باریک آٹا پیسا جاتا تھا اس سے پہلے مکہ اور مدینہ کے رہنے والے سل بٹہ پر دانوں کو پیس لیا کرتے اور پھونکوں سے اس کے چھلکے اڑا کر روٹی پکا لیا کرتے تھے۔جب مدینہ میں ہوائی چکیاں آئیں اور ان سے باریک میدہ تیار کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ پہلا آٹا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پیش کیا جائے تا کہ سب سے پہلے آپ ہی اس آٹے کی نرم نرم روٹی کھائیں۔چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق وہ آٹا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپ نے ایک عورت کو دیا کہ وہ اسے گوندھ کر روٹی تیار کرے۔جب میدے کے گرم گرم اور نرم نرم پُھلکے تیار کر کے آپ کے سامنے لائے گئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک لقمہ توڑا اور اپنے منہ میں رکھ لیا مگر وہ لقمہ ابھی آپ نے اپنے منہ میں ڈالا ہی تھا کہ آپ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے دیکھنے والی عورتیں حیران رہ گئیں کہ آپ کے آنسو کیوں گرنے لگے ہیں۔چنانچہ کسی نے آپ سے پوچھا خیر تو ہے کیسی عمدہ اور نرم روٹی ہے اور آپ کے گلے میں پھنس رہی ہے؟ انہوں نے جواب دیا میرے گلے میں یہ روٹی اپنی خشکی کی وجہ سے نہیں پھنسی بلکہ اپنی نرمی کے باعث پھنسی ہے۔رنج کے واقعات نے مجھے رنجیدہ نہیں کیا بلکہ خوشی کی گھڑیوں نے مجھے افسردہ بنا دیا ہے۔ایک زمانہ تھا جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود تھے انہی کی برکت سے آج یہ نعمتیں ہمیں میسر ہیں مگر آپ کا یہ حال تھا کہ مدتوں گھر میں آگ نہیں جلتی تھی اور اگر روٹی پکتی بھی تو اس طرح کہ ہم سل بٹہ پر غلہ پیس لیا کرتے اور پھونکوں سے اس کے چھلکے اڑا کر روٹی پکا لیا کرتے۔مجھے خیال آتا ہے کہ یہ نعمتیں جس کے طفیل ہمیں میسر آئی ہیں وہ تو آج ہم میں نہیں کہ ہم یہ نعمتیں اس کے سامنے پیش کرتے اور دولتیں اس کے قدموں پر نثار کرتے لیکن ہم جن کا ان کامیابیوں کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔یہ خیال تھا جس نے مجھے تڑپا دیا اور جس کی وجہ سے میدے کا نرم نرم لقمہ بھی میرے گلے میں پھنس گیا۔تو روحانی عالم میں یہی قانون جاری ہے کہ نَہَار اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب سورج نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ النَّھَارِ اِذَا جَلّٰھَا کہ ہم دن کو پیش کرتے ہیں جب وہ سورج کو ظاہر کر دے گا سورج سامنے نہیں ہوگا مگر دن اس بات کا ثبوت ہوگا کہ سورج ضرور چڑھا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت جس طرح ظاہر ہوئی اور اسلام کی دھاک دنیا کے قلوب پر بیٹھی یہ ظہور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں ہوا۔ غرض روحانی اور جسمانی دن میں یہ فرق ہے کہ جسمانی دن کے وقت سورج موجود ہوتا ہے مگر روحانی نہار کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب جسمانی طور پر سورج غائب ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ''الوصیت'' میں اپنی وفات کی خبر دیتے ہوئے جماعت کو نصیحت فرمائی ہے کہ

''تم میری اس بات سے جو میں نے تمہارے پاس بیان کی غمگین مت ہو اور تمہارے دل پریشان نہ ہو جائیں کیونکہ تمہارے لئے دوسری قدرت کا بھی دیکھنا ضروری ہے اور اس کا آنا تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ وہ دائمی ہے جس کا سلسلہ قیامت تک منقطع نہیں ہوگا اور وہ دوسری قدرت نہیں آسکتی جب تک میں نہ جاؤں۔ لیکن میں جب جاؤں گا تو پھر خدا اس دوسری قدرت کو تمہارے لئے بھیج دے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی جیسا کہ خدا کا براہین احمدیہ میں وعدہ ہے اور وہ وعدہ میری ذات کی نسبت نہیں ہے بلکہ تمہاری نسبت وعدہ ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں اس جماعت کو جو تیرے پیرو ہیں قیامت تک دوسروں پر غلبہ دوں گا سو ضرور ہے کہ تم پر میری جدائی کا دن آوے تا بعد اس کے وہ دن آوے جو دائمی وعدہ کا دن ہے'' (الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۰۵، ۳۰۶)

وَ الَّیْلِ اِذَا یَغْشٰھَا پھر فرماتا ہے تیری امت پر ایک وہ زمانہ بھی آنے والا ہے جب سورج سے وہ اپنا منہ موڑ لے گی اور نَھَار کی بجائے لَیْل کا زمانہ اس پر آجائے گا۔ بجائے اس کے کہ امتِ محمدیہ کے افراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل پیرا رہیں وہ آپ کے مقام کو بھول جائیں گے آپ کے احکام کو فراموش کر دیں گے اور عیاشیوں میں مبتلا ہو کر شیطانی راستوں کو اختیار کر لیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا خواہ تم ہم کو بھول جاؤ ہم تمہیں نہیں بھول سکتے۔ خواہ تم ہم سے روٹھ جاؤ ہم تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔ چنانچہ جب رات ان پر چھا جائے گی اور دنیا بزبانِ حال ایک سورج کا مطالبہ کر رہی ہوگی اللہ تعالیٰ پھر ایک چاند کو جو سورج کا قائم مقام ہوتا ہے چڑھا دے گا اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روشنی لے کر اسے ساری دنیا میں پھیلا دے گا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰھَا۔ وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰھَا میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ بعض انفاس

اپنے اندر ذاتی فضیلت رکھتے ہیں اور وہ دنیا کو چمکا دیتے ہیں اور دراصل ایسے ہی وجود دنیا کی اصلاح کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس کے بالمقابل بعض انفاس قمر کی حالت رکھتے ہیں اور اسی وقت دنیا کی ہدایت کا موجب ہوتے ہیں جب وہ سورج کے پیچھے آتے ہیں یعنی ان کا نور ذاتی نہیں بلکہ مکتسب ہوتا ہے۔ ان دونوں حالتوں کو اللہ تعالیٰ نے بطور شاہد پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اصلاح عالم بغیر ان دو قسم کے وجودوں کے نہیں ہوسکتی یا نفسِ کامل یا متبع کامل۔ نفسِ کامل وہ ہے جس کا ذکر وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا میں آتا ہے۔ اور متبع کامل وہ ہے جس کا ذکر وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا میں آتا ہے۔ جب تک ان دونوں صفات میں سے کوئی ایک صفت موجود نہ ہو کوئی شخص اصلاح کا فرض سرانجام نہیں دے سکتا۔ یا تو اصلاح کا کام وہ شخص کر سکتا ہے جو شمس ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس غرض کے لئے پیدا کیا ہو کہ وہ شریعت لائے اور یا پھر وہ ایسا متبع کامل ہو کہ اپنے متبوع کے نور کو لے کر اس غرض کو پورا کردے جس کے لئے اسے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ گویا اصل غرض شریعت سے ہوتی ہے۔ جب شریعتِ لفظی موجود نہیں ہوتی اس وقت نفسِ کامل کے ذریعہ دنیا میں شریعت کو نازل کیا جاتا ہے اور جب شریعتِ لفظی غائب نہیں ہوتی صرف عمل مفقود ہوتا ہے اس وقت ظلّی طور پر وہ شریعت دوبارہ متبع کامل پر نازل ہوتی ہے اور وہ دنیا میں قیامِ شریعت کا فرض سرانجام دے دیتا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ آیا یہ اتفاقی بات ہے کہ ایک کو خدا تعالیٰ شریعت دے دیتا ہے اور ایک کو متبع بنا دیتا ہے اگر وہ یوں کرتا کہ متبع کو شریعت دے دیتا اور شریعت والے کو تابع کے مقام پر کھڑا کر دیتا تو کیا ایسا ہو جاتا؟ اس کے متعلق یہ امر سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ صاحبِ شریعت اور متبع محض اتفاق سے نہیں ہوجاتے بلکہ یہ دونوں الگ الگ استعدادیں ہیں اور شمس وقمر کی مثالوں میں یہ دونوں امر بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ بتایا جا چکا ہے کہ استعدادِ شمسی والا وجود پہلے آتا ہے اور استعدادِ قمری والے وجود پیچھے آتے ہیں جو اس کے کام کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس سے ایک اور استدلال بھی ہوتا ہے جس سے احمدیت کے ایک اہم مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ کہ ہوسکتا ہے ایک شخص شمس ہو اپنے زمانہ کا اور دوسرے زمانہ کا قمر بننے کی اہلیت نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص بڑے زمانہ کا قمر ہو مگر چھوٹے زمانہ کا شمس ہونے کی قابلیت نہ رکھتا ہو۔ یہ الگ الگ قابلیتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر استعداد کو دیکھ کر فطری مناسبت کے لحاظ سے ان کو شمس وقمر کا مقام دیا ہے اس وجہ سے ایک زمانہ کا قمر خواہ کام کے لحاظ سے قمر ہو لیکن روحانیت کے لحاظ سے پہلے دور کے شمس سے زیادہ ہوسکتا ہے لیکن اپنے شمس سے زیادہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اس نے روشنی اپنے شمس سے لی ہوتی ہے اور بوجہ اس کا نور مکتسب ہونے کے اپنے شمس سے بڑھنے کی طاقت کسی قمر میں نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ وہ

پہلے زمانہ کے شمس سے بڑا ہو۔مثلاً آگ اپنی ذات میں ایک شمس کا وجود رکھتی ہے کیونکہ خود جل رہی ہوتی ہے اس کا نور مکتسب نہیں ہوتا بلکہ اندر سے پیدا ہوتا ہے مگر قمر کی روشنی کے سامنے وہ بالکل ماند ہوتی ہے۔ جب ہم آگ جلاتے ہیں تو وہ صرف دو یا چار گز جگہ کو روشن کرتی ہے اس سے زیادہ نہیں اور اگر ہم اسے اونچا بھی لے جائیں تب بھی وہ زیادہ دور تک اپنی روشنی کو نہیں پھیلا سکتی بلکہ اگر ہم اسے کافی اونچا لے جائیں تو وہ شاید تاریکی ہی بن جائے اور اس کا اپنا وجود بھی دکھائی نہ دے۔ آگ اور چاند کی روشنی میں یہ فرق اس لئے ہوتا ہے کہ گو قمر تابع ہے مگر اس کا متبوع اس قدر روشن ہے اور دوسری روشنیوں سے اس قدر زیادہ چمک اس میں پائی جاتی ہے کہ اس کا قمر بالذات روشنیوں سے زیادہ روشن ہو جاتا اور دوسرے شموس سے بھی اپنی روشنی میں بڑھ جاتا ہے۔

حقیقت وہی ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں بارہا بتائی ہے کہ شموس ایسے لوگ بنائے جاتے ہیں جو اقدام اور جنگی قوت اور سیاسی اقتدار کا ملکہ اپنے اندر رکھتے ہیں کیونکہ شریعت کے نفاذ کے لئے ان قابلیتوں کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے کہ ان میں یہ سب قابلیتیں پائی جاتی تھیں۔لیکن قمر ایسے وجود بنائے جاتے ہیں جو سوز و گداز اور نرمی اور نصیحت کا مادہ اپنے اندر زیادہ رکھتے ہیں اس وجہ سے ہمیشہ ان کی زندگیاں مختلف ہوتی ہیں اور باوجود ایک کام کرنے کے دونوں دور اس طرح مختلف نظر آتے ہیں جس طرح دو الگ الگ وجود ہوتے ہیں۔مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں نے ایک کام کیا ہے مگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی زندگیاں دیکھی جائیں تو وہ بالکل الگ قسم کی نظر آتی ہیں۔اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگیوں کو دیکھا جائے تو ان میں بھی ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں شروع سے ہی اقدام اور جنگی قوت اور تحکیم نظام کا مادہ نمایاں تھا لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام میں سوز و گداز اور نرمی کا مادہ پایا جاتا تھا اور آپ اپنی جماعت کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے کہ سیاست سے کوئی تعلق نہ رکھو تمہارا کام یہی ہے کہ تم نرمی اور محبت سے اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤ یہ ایسا ہی ہے جیسے سورج کی روشنی ہی قمر کے ذریعہ آتی ہے مگر ان دونوں روشنیوں میں کتنا عظیم الشان فرق ہوتا ہے سورج کی روشنی دیکھو تو وہ بالکل الگ نظر آتی ہے اور چاند کی روشنی دیکھو تو وہ الگ نظر آتی ہے۔یہی چیز ہے جس کا نام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جلالی اور جمالی رکھا ہے شمس اپنے اندر جلالی رنگ رکھتا ہے اور قمر اپنے اندر جمالی رنگ رکھتا ہے۔یوں شمس میں بھی ایک حد تک جمال پایا جاتا ہے اور قمر میں بھی ایک حد تک جلال پایا جاتا ہے مگر باوجود اس کے شمس کی غالب قوت جلالی ہوتی ہے اور قمر کی غالب قوت جمالی ہوتی ہے پس چونکہ یہ دونوں الگ الگ فطرتیں ہیں

اس لئے محض تابع ہونے کی وجہ سے ہر قمر کو ہر شمس سے ادنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلا شمس چونکہ شرعی نبی تھا اس لئے وہ سب قمروں سے بڑھ کر تھا سب قمروں سے بڑھ کر نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے قمروں سے بڑھ کر تھا کیونکہ ہر قمر صرف اپنے شمس سے ادنیٰ ہوگا مگر اپنے شمس سے ادنیٰ قمر تمام دوسرے شموس سے بڑے درجہ کا ہو سکتا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آگ بالذات روشن ہے مگر قمر کے مقابلہ میں اس کی روشنی بہت ادنیٰ ہے یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

تیرے بڑھنے سے قدم آگے بڑھایا ہم نے

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۲۲۶)

یعنی اے میرے شمسِ روحانی تو چونکہ بہت روشن تھا اس لئے تیرا قمر دوسرے تمام شموس سے اپنی روشنی میں بڑھ گیا۔ اس نقطۂ نگاہ کے ماتحت ہمارا یقین ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کرتے ہوئے باقی تمام انبیاء سے اپنے درجہ اور مقام کے لحاظ سے افضل ہیں۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دوسرے شموس سے کس طرح بڑھ سکتے ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحبِ شریعت نبی تھے ان سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام کس طرح بلند ہو گیا یا بعض اور قوموں میں جو صاحبِ شریعت نبی گذرے ہیں ان سے آپ بڑے کس طرح قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک یہ انبیاء بڑے تھے مگر اُن شموس اور اس قمر میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ بے شک قمر ہے مگر یہ قمر اس شمس کا ہے جو پہلے تمام شموس سے بہت زیادہ روشن تھا اس لئے یہ لازم تھا کہ اس شمس کا قمر اپنی روشنی میں پہلے شموس سے بھی بڑھ جاتا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی جگہ پر ایک ہزار لیمپ ہو اور ہر لیمپ کا ایک ایک ری فلیکٹر ہو تو اگر اس ہزار لیمپ کے مقابلہ میں ایک لیمپ ایسا ہو جس میں دو ہزار لیمپ کے برابر روشنی کی طاقت ہو تو اس کا ری فلیکٹر اپنی روشنی میں ایک ہزار لیمپ سے بڑھ جائے گا۔ فرض کرو اس ہزار لیمپ میں سے کوئی پچاس کینڈل پاور کا ہے کوئی سو کینڈل پاور کا ہے اور اس طرح مجموعی طور پر ان کی طاقت دو لاکھ کینڈل پاور کی بن جاتی ہے تو اگر ان کے مقابلہ میں تین لاکھ کینڈل پاور کا صرف ایک ہی لیمپ ہو تو اس کا ری فلیکٹر باقی تمام روشنیوں کو مات کر دے گا اور باوجود قمر ہونے کے دوسرے شموس پر غالب آجائے گا۔

اس جگہ شمس و قمر سے مراد عام وجود بھی ہو سکتے ہیں۔ اور شمس و قمر سے شمسِ اسلام اور قمرِ اسلام بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں شہادتوں سے یہ بتایا ہے کہ یہ دونوں وجود ابراہیمی پیشگوئی کی صداقت کا ثبوت ہوں گے اور مکہ کو

عظیم الشان مرکز بنانے کا موجب ہوں گے۔

اور اگر عام معنے لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسے ہی وجودوں سے اصلاح کی بنیاد پڑتی ہے جب تک ایسے وجود پیدا نہ ہوں اصلاح نہیں ہوسکتی اور اگر اب ایسا نہ ہوگا تو ابراہیم کی پیشگوئی غلط جائے گی۔

وَ السَّمَآءِ وَ مَا بَنٰهَا ۝۶ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا طَحٰهَا ۝۷

اور آسمان کی اور اس کے بنائے جانے کی۔ اور زمین کی اور اس کے بچھائے جانے کی۔

حلّ لُغات۔ طَحٰهَا طَحَا الشَّیْءَ کے معنے ہیں بَسَطَہٗ وَمَدَّہٗ کسی چیز کو پھیلایا۔ (اقرب)

تفسیر۔ مَا طَحٰهَا میں مَا کے معنے نحوی یہاں ’’مَا‘‘ کے دو معنے کرتے ہیں بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ ’’مَا‘‘ اَلَّذِیْ کے معنوں میں ہے اور مَنْ کا قائم مقام ہے گویا یہاں ’’ما‘‘ مَنْ کی جگہ استعمال ہوا ہے اور آیت دراصل یوں ہے کہ وَ السَّمَآءِ وَ مَنْ بَنٰهَا ہم شہادت کے طور پر آسمان کو پیش کرتے ہیں اور اسے بھی جس نے اسے بنایا۔

(اِمْلَاءُ مَامَنَّ بِهِ الرَّحْمٰنُ زیر سورۃ الشمس۔ و تفسیر کشّاف زیر آیت وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا)

اس کے متعلق سورۃ البلد کے تفسیری نوٹوں میں یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم میں ’’ما‘‘ مَنْ کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے چنانچہ حضرت مریم علیہا السلام جب پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے کہا یا اللہ میں نے تو بیٹی جنی ہے حالانکہ میں چاہتی تھی کہ لڑکا پیدا ہو اور اسے میں تبلیغ کے لئے وقف کروں۔ اس موقع پر قرآن کریم میں یہ الفاظ آتے ہیں وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ (اٰلِ عمران: ۳۷) حالانکہ لڑکی کے لئے مَنْ کا لفظ استعمال ہونا چاہیے تھا اسی طرح فرماتا ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (النسآء: ۴) یعنی تمہیں عورتوں میں سے جو پسند آئیں ان کے ساتھ شادی کرلو۔ دو کرو۔ تین کرو یا چار کرو یہ تمہارا اختیار ہے ہماری طرف سے اس میں کوئی روک نہیں۔ اب عورت ذوی العلم افراد میں سے ہے اور اس کے لئے مَا کی بجائے مَنْ کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا مگر بجائے یہ کہنے کے کہ فَانْكِحُوْا مَنْ طَابَ لَكُمْ اللہ تعالیٰ نے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ فرمایا ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں دونوں جگہ مَا کا لفظ کیوں رکھا ہے جبکہ مَنْ کا لفظ اس غرض کے لئے لغت نے وضع کیا ہوا تھا اور وہ اس موقع پر استعمال بھی ہوسکتا تھا۔ آخر وجہ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک وضعی لفظ چھوڑ کر اس کی جگہ ایک غیر وضعی لفظ رکھ دیا؟ اس کی صاحب کشاف نے ایک نہایت لطیف توجیہ کی ہے جو میرے نزدیک درست ہے وہ کہتے ہیں مَنْ کی جگہ مَا کا لفظ اسی وقت استعمال ہوتا ہے جب وجود پر کوئی صفت غالب آ گئی

ہو یعنی کبھی کوئی وجود ایسا ہوتا ہے کہ اس کی کوئی صفت اس کے عام انسان ہونے پر غالب آجاتی ہے اس وقت چونکہ کسی مخصوص صفت پر زور دینا مقصود ہوتا ہے ''مَا'' کو مَنْ کا قائم مقام کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے یہ لڑکی جو تو نے جنی ہے اس میں وہ صفت جو تو لڑکے میں امید رکھتی تھی کس شان میں پائی جاتی ہے چونکہ صفت غیر ذوی العلم میں سے ہے اس لئے ''مَا'' کا لفظ استعمال کر کے اس کی ایک مخصوص قابلیت کی طرف اشارہ کر دیا اگر وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ وَضَعَتْ کہا جاتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے کہ یہ لڑکی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو یہ پتہ ہی تھا کہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان لانے والوں کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم ہے کہ تو نے کیا جنا ہے وہ تو پہلے ہی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو جانتا ہے۔ پس اگر وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ وَضَعَتْ کہا جاتا تو اس میں کوئی خاص بات نہ ہوتی مگر وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا کہ مریم کی ماں کو کیا پتہ ہے کہ اس میں کیا کیا صفات پائی جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں کیسی عظیم الشان صفات اور قابلیتیں پائی جاتی ہیں۔ پس ''مَا'' کا لفظ مریم کی قابلیت اور اس کی صفات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا ہے اگر مَنْ ہوتا تو اس کے اتنے ہی معنے ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے یہ لڑکی ہے مگر ''مَا'' کا لفظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ

ع آگے آگے دیکھیو ہوتا ہے کیا

جب یہ بڑی ہوگی تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ کیسی عظیم الشان لڑکی ہے گویا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ کے لحاظ سے یہ ایک پیشگوئی بن گئی مگر وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ وَضَعَتْ کے لحاظ سے محض ایک واقعہ کا اظہار ہوتا۔

اسی طرح فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بسا اوقات شادی بیاہ کے تعلقات محض جذباتی ہوتے ہیں اور انسان عورت کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی کسی خاص صفت کو دیکھتا ہے۔ بہت سے لوگ عورت کے جمال پر اتنے فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ عورت کس خاندان میں سے ہے، اس کا آنا ہمارے ماں باپ کے لئے یا ہمارے خاندان کے لئے کسی تکلیف کا باعث تو نہیں ہو جائے گا۔ وہ اس کی صورت پر اتنے عاشق ہوتے ہیں کہ اور تمام باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کئی لوگ صرف مال دیکھ کر شادی کرتے ہیں، کئی لوگ صرف حسب و نسب اور اعلیٰ خاندان دیکھ کر شادی کرتے ہیں، کئی لوگ صرف اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے عورت سے شادی کرتے ہیں اور کئی لوگ صرف اخلاق فاضلہ کی شہرت سن کر شادی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غرض کوئی ایک صفت اتنی غالب آجاتی ہے کہ انسان اس صفت کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ عورت سے شادی کرے پس

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم جانتے ہیں تم عورتوں کے ساتھ شادی کرتے وقت تمام وجوہ کو نہیں دیکھتے بلکہ کوئی ایک چیز تمہیں پسند آجاتی ہے اور تم ان پر لٹو ہو جاتے ہو۔ کبھی تمہیں حسن پسند آجاتا ہے اور تم شادی کر لیتے ہو، کبھی تمہیں مال اچھا لگتا ہے اور تم شادی کر لیتے ہو، کبھی تمہیں خاندان اچھا لگتا ہے اور تم شادی کر لیتے ہو، کبھی تمہیں اخلاق اچھے لگتے ہیں اور تم شادی کر لیتے ہو۔ گویا اس آیت میں انسانی فطرت کے اس جوہر کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ عورت سے شادی نہیں کرتا بلکہ اس کی کسی صفت سے شادی کرتا ہے، کبھی مال کی وجہ سے شادی کرتا ہے، کبھی حسن کی وجہ سے شادی کرتا ہے، کبھی تعلیم کی وجہ سے شادی کرتا ہے، کبھی حسب و نسب کی وجہ سے شادی کرتا ہے، کبھی دین کی وجہ سے شادی کرتا ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِاَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفُرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ (صحیح بخاری کتاب النکاح باب الاکفاء فی الدین) یہ حدیث بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ شادی کسی صفتِ غالبہ کے لحاظ سے کی جاتی ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت فرمایا کہ جب تم نے صفتِ غالبہ کے لحاظ سے ہی شادی کرنی ہے تو پھر تم وہ ''مَا'' نہ اختیار کرو جو حسن کا قائم مقام ہو یا حسب و نسب کا قائم مقام ہو یا مال کا قائم مقام ہو بلکہ تم وہ ''مَا'' اختیار کرو جو دین کا قائم مقام ہو۔ یہ عربی زبان کا ایک بہت بڑا کمال ہے کہ الفاظ کے معمولی ہیر پھیر سے اس میں نئے سے نئے معنے پیدا ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری کلام اس زبان میں نازل فرمایا۔ واقعہ یہی ہے کہ بعض دفعہ کوئی صفت اس قدر غالب آجاتی ہے کہ وہ وجود کو ڈھانپ دیتی ہے۔ مریمؑ کی ماں کو صرف ایک لڑکی نظر آتی تھی مگر اللہ کو صفتِ مریمیت نظر آتی تھی۔ اسی طرح مرد بعض دفعہ عورت کو بھول جاتا ہے اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے باقی سب امور کو نظر انداز کر دیتا ہے صرف اس کا حسن یا اس کا خاندان یا اس کی کوئی اور ادا اُسے اپنی طرف مائل کر لیتی ہے اس وقت اس لحاظ سے وہ مَنْ نہیں بلکہ مَا ہی ہو جاتی ہے۔ بہر حال جہاں ذات کی بجائے کسی صفت کا غلبہ مدِّنظر ہو اور اس صفت پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہو وہاں قرآن کریم مَنْ کی جگہ ''مَا'' کا لفظ استعمال کرتا ہے پس انہی معنوں سے اس جگہ وَمَا بَنٰهَا کے الفاظ آئے ہیں یعنی یہ بتانے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت صنعت کو اپنے سامنے رکھو۔

وہ لوگ جنہوں نے ان معنوں کو قبول نہیں کیا وہ ''مَا'' کو مصدریہ قرار دیتے ہیں۔ قتادہ، مبرد اور زجاج یہی کہتے ہیں یہ قول درحقیقت ان لوگوں کا ہے جو ''مَا'' کو افرادِ ذوی العقل کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتے وہ ہر جگہ مصدر کے معنے کرتے ہیں (البحر المحیط زیر آیت وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا) اور کہتے ہیں کہ جس جگہ ''مَا'' آجائے وہ

جملہ کو مصدریہ بنا دیتا ہے۔اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم آسمان اور اسے بنانے کی یعنی خدا تعالیٰ کی صنعت کی شہادت تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اس صورت میں بھی شہادت تو خدا تعالیٰ کے فعل کی ہی ہوگی مگر براہ راست آسمان کی بناوٹ کو پیش کرنا سمجھا جائے گا۔لیکن اگر ''مَا'' کو مَنْ کے معنوں میں لیا جائے تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم تمہارے سامنے آسمان کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس صانع عظیم کو کہ جب انسان اس کی صنعت کو دیکھتا ہے تو محو ہو جاتا ہے یعنی تم آسمان کو دیکھو اور جس نے اسے بنایا ہے اس کو بھی یعنی اس کی عظیم الشان صنعت کو دیکھو۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی اس صنعت کو دیکھے تو وہ حیران رہ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی جبروت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے پس چونکہ یہاں خدا تعالیٰ کی صفت پر زور دینا مقصود تھا اور کائناتِ عالم میں سے آسمان کی بناوٹ۔اس کی بلندی اور اس کے فوائد کی طرف بنی نوع انسان کو متوجہ کرنا تھا اس لئے یہاں ''مَا'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔

اسی طرح وَ الْاَرْضِ وَ مَا طَحٰىهَا میں اگر ''مَا'' کو مصدریہ قرار دیا جائے تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم شہادت کے طور پر زمین کو پیش کرتے ہیں اور اس کے بچھے ہوئے ہونے کو بھی۔لیکن اگر مَا کو مَنْ کے معنوں میں لیا جائے تو آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ تم زمین کو دیکھو اور اس کے اُس بچھانے والے کو دیکھو جس کی عظیم الشان صنعت کا یہ نمونہ ہے۔

بہت سے سیارے ایسے ہیں جو رہائش کے قابل نہیں اسی طرح بعض زمینیں ایسی ہیں جو انسانی رہائش کے قابل نہیں ہوتیں۔بعض تو ایسی ہوتی ہیں کہ انسان وہاں رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ ہوا جس پر انسانی زندگی کا تمام دارومدار ہے وہاں اس قدر ہلکی ہوتی ہے کہ پھیپھڑوں میں جا ہی نہیں سکتی اور بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہاں ہوا تو موجود ہوتی ہے مگر وہ اپنے اندر ایسی کیمیائی ترکیب نہیں رکھتی کہ زندگی کا باعث بن سکے۔اسی طرح کئی زمینیں ایسی ہیں جہاں انسان جیسی مخلوق ٹِک ہی نہیں سکتی اگر اس قسم کی مخلوق وہاں ہو تو یا وہ زمین پر چل ہی نہیں سکے گی اور اگر چلے گی تو فوراً گر جائے گی اور یا پھر وہاں کی زہریلی ہوا اس کو فوراً ہلاک کر دے گی۔غرض زمین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے قابل رہائش ہونے کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ بعض زمینیں ایسی ہیں جو انسانی رہائش کے قابل نہیں ہیں چنانچہ وَ الْاَرْضِ وَ مَا طَحٰىهَا میں اللہ تعالیٰ اسی صنعت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمہاری رہائش کے قابل بنایا ہے اور یہ اس کا ایک بہت بڑا احسان ہے جس سے اس نے تمہیں نوازا۔

میں نے دیکھا ہے بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر زمین رہائش کے قابل ہوتی ہے چنانچہ جب وہ

قرآن کریم میں اس قسم کے الفاظ دیکھتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے اس احسان یا اس کی اس صنعت کا ذکر ہوتا ہے کہ اس نے زمین کو انسان کی رہائش کے قابل بنایا ہے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ اس ذکر کا فائدہ ہی کیا تھا ہم نے بہرحال زمین میں ہی رہنا تھا اگر یہ زمین نہ ہوتی تو کوئی اور زمین ہو جاتی اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ وہ لوگ جو اس قسم کے خیالات میں مبتلا ہوتے ہیں درحقیقت علم ہیئت سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ موجودہ تحقیقات نے اس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ ہر زمین رہائش کے قابل نہیں ہوتی۔ بعض زمینیں ایسی ہیں کہ اگر وہاں انسان جائے تو ایک منٹ کے اندر اندر ہلاک ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے ہی سب سے پہلے اس نکتہ کو دنیا پر ظاہر کیا ہے کہ ہر زمین رہائش کے قابل نہیں ہے اور یہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ قرآن ایک اُمّی پر نازل ہوا اور اس زمانہ میں نازل ہوا جب کہ علم ہیئت کی ترقی بالکل محدود تھی اور اس قسم کے مسائل کی طرف کوئی انسانی نظر نہیں جا سکتی تھی اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا میں یہ ایک نہایت ہی لطیف راز بیان فرمایا کہ ہر زمین رہائش کے قابل نہیں ہے اس لئے جب تم زمین کو دیکھو تو صانع عظیم کی اس صنعت پر غور کیا کرو کہ کس طرح اس نے تمہارے لئے اس زمین کو قابلِ رہائش بنایا اور زندگی کے ہر قسم کے سامان اس نے تمہارے لئے مہیا کئے۔ سپکٹروسکوپ Spectroscope کی ایجاد کو صرف ستّر سال ہوئے ہیں۔ اس آلہ کی ایجاد سے پہلے دنیا اس حقیقت سے ناواقف تھی مگر جب سے یہ آلہ ایجاد ہوا ہے علمِ ہیئت کے ماہرین نے اس راز کا انکشاف کیا ہے کہ ہر ستارہ رہنے کے قابل نہیں ہے وہ سیاروں کی روشنی کا سپکٹروسکوپ کے ذریعہ سے کیمیاوی تجزیہ کرتے ہیں اور اس سے اندازہ لگاتے ہیں کہ اس سیارہ میں کیا کیا دھاتیں ہیں اور وہاں کی فضا کیسی ہے۔ اس ایجاد کے نتیجہ میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر زمین اس قابل نہیں کہ اس میں رہائش اختیار کی جا سکے مگر اللہ تعالیٰ نے سپکٹروسکوپ کی ایجاد سے تیرہ سو برس پہلے یہ فرما دیا تھا کہ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ہماری اس صنعت پر تم غور کرو کہ ہم نے اس زمین کو تمہاری رہائش کے قابل بنایا ہے۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بھی ایک ویسی ہی زمین ہے جیسے اور زمینیں ہیں بلکہ تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ وہ زمین ہے جسے خدا تعالیٰ نے خاص طور پر نسل انسانی کی رہائش اور اس کی آبادی کے قابل بنایا۔ گویا خدا تعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ وہ جو بھی کام کرتا ہے اس کے مناسب حال ایک ماحول بھی تیار کرتا ہے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ انسان پیدا کرتا اور زمین کو اس کے مناسب حال نہ بناتا۔ یا انسان پیدا کرتا اور وہ زمین سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی شان سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔

ان معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اس عظیم الشان صنعت پر غور کرو جو آسمان اور زمین دونوں میں کام

کر رہی ہے اور جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے آسمان کو اور جس نے اسے اس طرح بنایا ہے بطور شہادت پیش کرتے ہیں اسی طرح ہم تمہارے سامنے زمین کو اور جس نے اسے اس طرح بچھایا ہے بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ تم آسمان کو اس کی بلندی اور رفعت کے لحاظ سے دیکھو اور زمین کو اس کی ان قابلیتوں کے لحاظ سے دیکھو جن کی وجہ سے انسان اس میں بسنے کے قابل ہوا ہے اور سمجھ لو کہ آسمانی اور زمینی شہادتیں جس کے حق میں ہوں وہ جھوٹا کس طرح ہو سکتا یا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ادھر اللہ تعالیٰ آسمان بناتا جو بڑا مضبوط اور اعلیٰ درجے کا ہے دوسری طرف وہ زمین کو اس قابل بناتا کہ اس میں بنی نوع انسان رہائش اختیار کر سکیں اور پھر یہ تمام کارخانۂ عالم محض عبث ہوتا اور انسانی پیدائش کا کوئی مقصد نہ ہوتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس نے زمین کو بہت سے دوسرے سیاروں سے مختلف شکل دی ہے وہاں ذی روح زندہ نہیں رہ سکتے، وہ سانس نہیں لے سکتے، وہ چل پھر نہیں سکتے۔ مگر یہ زمین خدا تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ اس میں ذی روح افراد سانس لے سکتے ہیں، ان کے دماغ پوری طرح کام کر سکتے ہیں اور وہ اپنی ہر ضرورت اس ماحول میں سے مہیا کر سکتے ہیں۔ ورنہ ایسی زمین بھی ہو سکتی تھی کہ مختلف گیسوں کی وجہ سے حیوان تو اس میں بس سکتے مگر انسان نہ بس سکتا۔ مگر چونکہ انسان کے لئے ایک ایسے ماحول کی ضرورت تھی جس میں اس کا دماغی نشوونما جاری رہتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر ایسی قابلیتیں پیدا کر دیں کہ انسان اس میں بلا دریغ رہائش اختیار کر کے اپنے دماغی ارتقاء کو جاری رکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کی اس مثال کو پیش کرتے ہوئے اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ جب اس نے اتنا بڑا کارخانہ بنایا ہے اور اس کارخانہ کا ہر پرزہ انسان کی خدمت کے لئے لگا ہوا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہاری پیدائش اپنے اندر کوئی حکمت نہ رکھتی ہو اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے بلا وجہ محض لغو طور پر دنیا میں پیدا کر دیا ہو۔ ادھر آسمان کو نہایت مضبوط اور اعلیٰ درجہ کا بنانا، ادھر زمین کو رہائش کے قابل بنانا اور اس طرح قانونِ قدرت کا ایک وسیع اور طویل نظام کی شکل اختیار کر لینا بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ کام عبث نہیں۔ جب تم اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تیاری کو عبث نہیں کہتے تو تم اتنے بڑے نظام کو عبث کس طرح قرار دے سکتے ہو تمہیں بہر حال ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بہت بڑا مقصد اور بڑا بھاری مدعا ہے جو اس کارخانۂ عالم کے پیچھے کام کر رہا ہے اور ضرور ہے کہ اس کا وہ منشاء ایک دن ظاہر ہو اور وہ مقصد پورا ہو جس کے لئے اس نے آسمان اور زمین کا یہ نظام قائم فرمایا تھا۔ اگر مادیات میں اس نے ایک طرف آسمان میں بلندی اور فیوض کی طاقت رکھی ہے اور دوسری طرف زمین میں رہائش اور دماغ کو نشوونما دینے کی قابلیت رکھی ہے تو یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ وہ تمہارے جسمانی آرام کا تو

خیال رکھے اور روحانی آرام کو نظر انداز کر دے۔ وہ تمہارے چند روزہ فوائد کے لئے تو اتنا بڑا کارخانہ جاری کر دے اور تمہارے ابدی فوائد کے لئے کوئی نظام قائم نہ کرے۔ جس خدا نے جسمانیات کے لحاظ سے تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا وہ روحانیات کے لحاظ سے بھی تمہارا ساتھ کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔ تم زمین اور آسمان پر اگر مخلّی بالطبع ہو کر غور کرو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ جس خدا کی طرف سے تمہارے جسمانی آرام کے لئے اس قدر سامان مہیا کئے گئے ہیں اسی خدا کی طرف سے تمہارے روحانی ارتقاء کے لئے بھی ایسے قوانین کا آنا ضروری ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیں تا کہ جس طرح اس نے زمین کو جسمانیات کے لحاظ سے رہنے کے قابل بنایا ہے اسی طرح وہ روحانیات کے لحاظ سے بھی اس کو رہنے کے قابل بنائے ورنہ خدا تعالیٰ پر یہ الزام عائد ہو گا کہ اس نے جسم کا تو خیال رکھا مگر روح کا خیال نہ رکھا۔ اس نے مادی ترقی کے سامان تو مہیا کئے مگر روحانی ترقی کے سامان مہیا نہ کئے۔ اور یہ ایک ایسا الزام ہے جسے خدا تعالیٰ کی صفات بالکل ردّ کرتی ہیں۔ اس نے جسمانی نظام کے بالمقابل ایک روحانی نظام بھی قائم کیا ہے اور جس طرح جسم کی ترقی کے اس نے سامان کئے ہیں اسی طرح روح کی ترقی کے بھی اس نے سامان کئے ہیں۔ نادان انسان جسمانیات کو دیکھتا اور روحانیات سے آنکھیں بند کر لیتا ہے حالانکہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ زمین کو جسمانی لحاظ سے تو رہائش کے قابل بنائے مگر روحانی لحاظ سے وہ اس کو قابلِ رہائش بنانے کا کوئی انتظام نہ کرے۔ یا تو یہ کہو کہ مادی لحاظ سے بھی زمین میں یہ قابلیت نہیں کہ اس میں انسان رہ سکیں اور اگر تم یہ نہیں کہہ سکتے تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ روحانی لحاظ سے بھی اس میں یہ ضرور قابلیت پائی جاتی ہے اور وہی قابلیت ہے جس کے ماتحت وہ لوگ جو آج اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو قبول کرنے کے لئے دوڑتے چلے آئیں گے تم خواہ کس قدر زور لگا لو فطرتِ انسانی میں نیکی پائی جاتی ہے اور وہی نیکی ہے جو ایک دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے گی۔ جس طرح زمین اپنے آپ کو آسمانی فیوض سے الگ نہیں کر سکتی اسی طرح انسانی قلوب بھی آسمانی وحی سے الگ نہیں رہ سکتے ضرور ہے کہ وہ ایک دن متاثر ہوں اور اس طرح جسمانی اور روحانی نظام کی ایک دن مطابقت ثابت ہو۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا کے دوسرے معنے دوسری صورت میں اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ تم آسمان اور اس کی بناوٹ کو دیکھو اور سمجھ لو کہ آسمان کی بناوٹ ہی فیض رسانی کے لئے ہے اور زمین کی بناوٹ ہی سائل اور مانگنے والے کی ہے پس بغیر اس آسمانی نورانی وجود کے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات ہے تم لوگ کوئی بھی خوبی ظاہر نہیں کر سکتے آسمان کا کام آسمان ہی کر سکتا ہے اور زمین اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی کہ وہ آسمان کی طرف منہ

کرے اور اُس کے فیوض کو حاصل کر کے زندگی حاصل کرے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں آسمان سے مراد صرف جَوّ نہیں ہوتا بلکہ تمام ستارے، سیارے اور روشنیاں وغیرہ اس سے مراد ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس طرح ان کے بغیر زمین کام نہیں دے سکتی اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر تم بھی کوئی خوبی ظاہر نہیں کر سکتے اور پھر جس طرح آسمانی فیوض سے زمین انکار نہیں کر سکتی اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فیوض سے بھی تم ہمیشہ کے لئے انکار نہیں کر سکتے اگر زمین کے سامنے سورج آئے تو کیا زمین اس وقت کہہ سکتی ہے کہ میں روشنی نہیں لیتی۔ وہ مجبور ہے کہ سورج سے روشنی حاصل کرے۔ اسی طرح جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہو گئے ہیں تو اب دنیا آپ کا زیادہ دیر تک انکار نہیں کر سکے گی وہ ضرور آپ پر ایمان لائے گی۔ اس مضمون کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمائی ہے۔

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۪ۙ۝۸

اور انسانی نفس کی اور اس کے بے عیب بنائے جانے کی۔

حلّ لُغات۔ سَوّٰی سوَّی الشَّیْءَ تَسْوِیَةً کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهٗ سَوِیًّا وَصَنَعَهٗ مُسْتَوِیًّا اس کو درست اور عیبوں سے پاک بنایا۔ اور سوّٰی کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ عیبوں کو دور کیا چنانچہ کہتے ہیں سَوَّیْتُ الْمُعْوَجَّ فَمَا اسْتَوٰی۔ میں نے ٹیڑھے کو سیدھا کرنا چاہا مگر وہ سیدھا نہ ہوا (اقرب) گویا سوّٰی کے معنے یہ بھی ہیں کہ اسے ایسا بنایا کہ اس میں کوئی عیب نہ تھا اور سوّٰی کے یہ بھی معنے ہیں کہ اس کو جو کج تھا درست کیا۔ گویا بے عیب بنانا یا عیب کو دور کر دینا یہ دونوں باتیں تسویہ میں شامل ہیں۔

تفسیر۔ وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا کے دو معنے پہلی آیت کی طرح اس آیت کے بھی دو معنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم نفس کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں اور اس کو بھی جس نے اسے معتدل القویٰ بنایا۔ سَوّٰی کے معنے معتدل القویٰ بنانے کے ہوتے ہیں اور سورۃ الاعلیٰ کے تفسیری نوٹوں میں اس کا مفصل ذکر آ چکا ہے جس طرح پہلی آیت میں یہ بتایا تھا کہ ہم نے زمین کو قابلِ رہائش بنایا اسی طرح یہاں یہ بتایا ہے کہ ہم نے نفس کا تسویہ کیا اور اس میں ایسی قوت پیدا کی ہے کہ وہ اعتدال سے ترقی کی طرف جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تمہارے نفس میں یہ شہادت موجود نہ ہوتی اور جس طرح ہم نے زمین کو طَحٰی کیا ہے اسی طرح تمہارے نفوس کا تسویہ نہ کیا ہوتا تو تم

کہہ سکتے تھے کہ ہم پر یہ مثال چسپاں نہیں ہوسکتی لیکن جب نفوسِ انسانی میں اعتدال کو اختیار کر کے ترقی کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے تو تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ نفسِ انسانی خود اس امر پر شاہد ہے کہ کوئی نور اُسے آسمان سے ملنا چاہیے جس طرح زمین آسمانی روشنی کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح تم آسمانی نور کے محتاج ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ اگر آسمان سے پانی نہ برسے تو زمین کی تمام سرسبزی و شادابی مٹ جاتی ہے۔ اس کے درخت مرجھا جاتے ہیں، اس کے پانی خشک ہوجاتے ہیں، اس کی روئیدگیاں گل سڑ جاتی ہیں اور وہی زمین جو اپنی لطافت سے انسانی آنکھوں میں نور پیدا کر رہی ہوتی ہے ایک لمبے عرصہ تک بارش نہ ہونے کے نتیجہ میں ایسی بنجر اور ویران ہوجاتی ہے کہ اسے دیکھ کر انسان گھبرا جاتا ہے یہی حال عالمِ روحانی کا ہے آسمان سے جب تک وحی والہام کا پانی نازل نہ ہو روحانیت کے تمام کھیت مرجھا جاتے ہیں تمام روئیدگیاں گل سڑ جاتی ہیں اور وحی والہام کی بارش منقطع ہونے سے ارتقاء دماغی بھی بند ہوجاتا ہے اس وقت یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جس طرح آسمان کا زمین کے ساتھ تعلق ہے اسی طرح وحی والہام کا قلوبِ انسانی کے ساتھ تعلق ہے۔ اگر آسمان زمین کی ہوا کو صاف نہ کرتا رہے تو انسانوں کا زندہ رہنا مشکل ہوجائے کیونکہ وہ گندی ہوا جو سانس کے ذریعہ پھیپھڑوں میں سے خارج ہوتی ہے جمع ہوتی رہے اور وہی دوبارہ انسان کو اندر لے جانی پڑے مگر اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ گرم ہوا اوپر اٹھتی ہے اور اس کی جگہ سرد ہوا آجاتی ہے جو ہر قسم کے مضر اثرات سے پاک ہوتی ہے۔ اگر کسی کمرہ میں پانچ سو یا ہزار آدمی بیٹھے ہوں اور ان کے سانس کی ہوا اوپر کو نہ جائے اور نہ اس کی جگہ تازہ ہوا آئے تو چند منٹ میں ہی تمام لوگ مرجائیں مگر اب کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے تنفس سے ہوا کو کس قدر گندہ کر رہے ہیں کیونکہ آسمان ساتھ ہی ساتھ صفائی کا کام کر رہا ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ ضرورت سے بھی زیادہ آدمی ایک کمرہ میں اکٹھے ہوجاتے ہیں تو ان کو کوئی نقصان نہیں ہوتا کیونکہ انسان جس ہوا کو گندہ کرتا ہے آسمان اسے اٹھا کر لے جاتا ہے اور اس کی جگہ پاکیزہ ہوا میسر آجاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زمین بغیر آسمانی اشتراک کے کوئی کام نہیں کرسکتی۔ اب بتاتا ہے کہ جس طرح زمین میں مختلف قسم کی قابلیتیں پائی جاتی ہیں اسی طرح نفسِ انسانی میں بھی مختلف قسم کی قابلیتیں پائی جاتی ہیں۔ انسان کے اندر ایک تڑپ ہے ترقی کی، پیاس ہے صداقت کی، ندامت ہے غلطی پر اور ہر شے کی حقیقت معلوم کرنے کی اس کے اندر جستجو ہے۔ بچہ ابھی بولنا ہی سیکھتا ہے تو ماں باپ کا دماغ چاٹ لیتا ہے اور بات بات پر پوچھتا ہے یہ کیا ہے وہ کیا ہے۔ لیمپ نظر آتا ہے تو پوچھتا ہے یہ کیا ہے، بلی نظر آتی ہے تو پوچھتا ہے یہ کیا ہے، کتا نظر آتا ہے تو پوچھتا ہے یہ کیا ہے غرض ہر نئی چیز جو اس کے سامنے آتی ہے اس کے متعلق وہ اپنی ماں یا اپنے باپ سے یہ ضرور دریافت کرتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ یورپ میں کئی کئی جلدوں

میں اس قسم کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بچوں کے ان سوالات کے جوابات درج ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جب بچہ اس قسم کے سوالات کرتا ہے درحقیقت وہی وقت اس کے دماغی نشوونما کا ہوتا ہے مگر ماں باپ کو چونکہ خود ان سوالات کا صحیح جواب معلوم نہیں ہوتا وہ ادھر ادھر کی باتوں میں اس کے سوال کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب وہ بجلی کے متعلق پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے تو ہر شخص فوراً جواب نہیں دے سکتا کہ یہ کیا ہے اگر وہ کہے گا کہ بجلی ہے تو بچہ کہے گا بجلی کیا ہوتی ہے؟ اس پر کئی لوگوں کو خاموش ہونا پڑتا ہے اور کئی یہ کہہ کر بچے کو خاموش کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہیں اس کا پتہ نہیں یہ لیمپ ہے جو جل رہا ہے۔ پس چونکہ اکثر ماں باپ بچوں کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے اس لئے یورپ میں اس قسم کی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بڑی بڑی علمی باتیں آسان الفاظ میں بیان ہوتی ہیں تا کہ جب بچہ تم سے پوچھے کہ یہ کیا ہے یا وہ کیا ہے تو تم ایسا جواب دے سکو جو صحیح ہو اور جسے بچہ سمجھ سکے۔ پھر بچہ میں ایک یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ جب اس سے کوئی غلط بات کہہ دو تو وہ رونے لگ جاتا ہے اگر روٹی پڑی ہو اور کہہ دو کہ روٹی نہیں ہے تو وہ چیخیں مار کر رونا شروع کر دے گا یا بچہ بیمار ہو اور تم اسے کہہ دو کہ تم بیمار نہیں ہو تو وہ جھٹ رونا شروع کر دے گا کیونکہ اس میں یہ حس پائی جاتی ہے کہ میرے سامنے سچی بات بیان کی جائے۔ اسی طرح کوئی کھلونا بچے کو دے دو تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ اسے توڑ پھوڑ دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پہلے وہ اس کی شکل سے اس کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب شکل سے اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا تو وہ سمجھتا ہے شاید اس کے اندر کوئی حقیقت پائی جاتی ہے چنانچہ وہ اس حقیقت کی جستجو میں اسے توڑ دیتا ہے اور پھر توڑ کر خود ہی رونے لگ جاتا ہے لوگ حیران ہوتے ہیں کہ خود ہی اس نے کھلونا توڑا ہے اور خود ہی رونے لگ گیا ہے وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بچہ روتا اس لئے ہے کہ میں نے تو کھلونا اس لئے توڑا تھا کہ مجھے پتہ لگے اس کے اندر کیا ہے مگر مجھے پھر بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ وہ اس لئے نہیں روتا کہ کھلونا کیوں ٹوٹا ہے کیونکہ وہ تو اس نے خود توڑا ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ کھلونے کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس کو توڑتا ہے مگر جب اس کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی تو رونے لگ جاتا ہے، سمجھتا ہے کہ کھلونا بھی گیا اور یہ بھی پتہ نہ لگا کہ اس کی کیا حقیقت تھی۔ پھر جب بڑا ہوتا ہے تو مختلف علوم کا اسے شغف ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ شغف بھی اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے ہوتا ہے کبھی بچے باہر جاتے ہیں اور وہ کسی لوہار کو کام کرتا دیکھتے ہیں تو وہیں کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ کام کس طرح کرتا ہے۔ کبھی کسی نجّار کو دیکھتے ہیں تو اس کے کام کو دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے کسی کو لوہارے کام کا شوق ہو جاتا ہے، کسی کو نجاری کا کام پسند آ جاتا ہے، کسی کو معماری کا کام پسند آ جاتا ہے، کسی کو کوئی اور کام پسند آ جاتا ہے ہمارے ہاں ایک ملازمہ کا

لڑکا ہے اس کو یہی شوق ہے کہ بڑا ہو کر میں کاتب بنوں گا معلوم ہوتا ہے اس نے کسی کاتب کو نہایت خوشخط حروف لکھتے دیکھا تو اس کو بھی خیال آ گیا کہ میں بھی بڑا ہو کر کاتب بنوں گا اور اسی طرح خوبصورت طریق پر لکھا کروں گا۔

ہمارے ملک کی تباہی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بچوں کے مذاق اور ان کی طبیعت کی مناسبت کا خیال نہیں رکھا جاتا اور بڑے ہو کر ان کو ایسے کاموں پر لگا دیا جاتا ہے جن کے ساتھ ان کی طبیعت کی کوئی مناسبت نہیں ہوتی نہ ان کاموں کی طرف ان کا کوئی ذاتی میلان ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر کام کرنے کے باوجود وہ ترقی سے محروم رہتے ہیں۔ حالانکہ طریق یہ ہونا چاہیے کہ یا تو بچوں کے مذاق اور ان کی طبیعت کے مطابق ان کے لئے کام مہیا کیا جائے اور یا پھر بچپن میں ہی ان کے اندر وہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو رنگ ماں باپ ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں نہ والدین بچہ میں اپنی مرضی کا صحیح مذاق پیدا کرتے ہیں نہ اس کے مذاق اور طبیعت کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اس طرح اس میں دوغلہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو چونکہ اس کا طبعی میلان اور ہوتا ہے اور سپرد شدہ کام اور ہوتا ہے اس لئے اس کے نفس میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا دماغ بالکل کُند ہو جاتا ہے۔ آئندہ نسلوں کی درستی اور قوموں کی ترقی کی صرف دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو وعظ اور نصیحت سے بچوں کو صحیح مذاق کی طرف لایا جائے اور ان کے لئے بچپن سے ہی ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ وہ وہی کچھ سوچنے لگیں جو ہم چاہتے ہیں اور وہی کچھ دیکھنے لگیں جو ہم چاہتے ہیں۔ اور اگر ہم ان کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور اپنی مرضی کا صحیح مذاق ان میں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ بچوں کے مذاق کو ملحوظ رکھا جائے۔ اگر کوئی انجنیئر بننا چاہتا ہے تو اسے انجنیئر بنا دیا جائے، اگر کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو اسے ڈاکٹر بنا دیا جائے، اگر کوئی مدرس بننا چاہتا ہے تو اسے مدرس بنا دیا جائے کیونکہ ہم نے اس کے اندر اپنا وجود پیدا نہیں کیا اور جب اپنا وجود ہم نے اس کے اندر پیدا نہیں کیا تو اب اگر اس کے ذاتی مذاق کو بھی ہم ٹھکرا دیں تو یہ بالکل بچوں والی بات ہو جائے گی جو کھلونے لے کر توڑ دیتے ہیں مگر پھر بھی ان کو حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ ہم بھی اس ذریعہ سے قوم کے ایک مفید حصہ کو ضائع کرنے والے قرار پائیں گے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں مختلف علوم میں انسان کا شغف اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ بعض دفعہ غیب معلوم کرنے کے لئے اپنی عقل سے راستے تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے چنانچہ یورپ کو دیکھ لو وہ علوم میں کس قدر ترقی کر چکا ہے۔ مگر ادھر تو یہ حال ہے کہ یورپ خدا تعالیٰ کا انکار کر رہا ہے، مذہب سے بالکل لاپروا ہے اور ادھر اس کی حماقت کا یہ حال ہے کہ ذرا کوئی کہہ دے میں ہتھیلی دیکھ کر آئندہ کے حالات بتا سکتا ہوں تو بڑے بڑے لائق پروفیسر اور وکیل اور

ڈاکٹر اور انجنیئر اپنے ہاتھ کھول کر اس کے سامنے بیٹھ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں آئندہ کے حالات بتائیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر فطرتی طور پر یہ مادہ ہے کہ وہ حقیقتِ عالم اور رازِ کائنات کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔انہوں نے اپنے جھوٹے علم پر غرور کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کا تو انکار کر دیا مگر فطرت میں جو جستجو تھی کہ اس دنیا کا ایک منبع ہے جس کو دریافت کرنا چاہیے اس جستجو کو وہ نہ مٹا سکے چنانچہ غیب معلوم کرنے کے لئے ہاتھ دکھانا صاف بتا رہا ہے کہ انسان کی اس مادی دنیا سے تسلی نہیں ہوسکتی وہ علوم ماوراء الطبعیات کے حصول کے لئے ہر وقت پریشان رہتا ہے اور یہی پیاس ہے جو اسے کبھی کسی راستہ پر لے جاتی ہے اور کبھی کسی راستہ پر۔کوئی پامسٹری میں لگا ہوا ہے، کوئی تاش کے پتوں سے غیب معلوم کرنا چاہتا ہے، کوئی ستاروں کو دیکھ کر ان سے آئندہ کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر غیب معلوم کرتا ہے، کوئی تسبیح کے منکے مار مار کر یہ کوشش کرتا ہے کہ اسے غیب کی کوئی خبر معلوم ہو جائے۔طاق منکا آ جائے تو کہتے ہیں کامیابی ہوگی اور اگر جفت آ جائیں تو کہتے ہیں ناکامی ہوگی۔اسی طرح بعض لوگ قرعہ ڈالتے ہیں۔بعض تیروں سے آئندہ کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔غرض یہ خواہش کہ رازِ کائنات دریافت کئے جائیں ہر شخص میں پائی جاتی ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ اُس کے لئے صحیح طریق اختیار کرتا ہے یا غلط۔میں ایک دفعہ کراچی گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ منڈی میں کپاس کی قیمت بڑھنے لگی ہے اُس وقت بظاہر آثار ایسے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ کپاس کی قیمت گر جائے گی مگر ہوا یہ کہ اس کی قیمت بڑھ گئی۔میں نے لوگوں سے پوچھا کہ بات کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ امرتسر سے ایک سادھو آیا ہے اس سے تاجروں نے آئندہ کے بعض حالات دریافت کئے تو اُس نے کہا کہ کپاس کی قیمت بڑھ جائے گی۔یہ سنتے ہی تمام تاجروں نے کپاس خریدنی شروع کر دی اور اس کی قیمت بڑھ گئی۔مگر چونکہ کوئی حقیقی طاقت اس کے پیچھے نہیں تھی دو چار دن تو قیمت چڑھی مگر پھر کم ہونے لگی اور اس قدر کم ہوگئی کہ کئی تاجروں کے دیوالے نکل گئے۔طبعی اصول تو یہ ہے کہ چیز کم ہو اور کارخانوں کی مانگ زیادہ ہو اُس وقت قیمت بے شک بڑھتی ہے لیکن اگر چیز کافی ہو اور کسی عارضی وجہ سے گاہک زیادہ آ گئے ہوں تو اس کی قیمت میں عارضی طور پر اضافہ ہوسکتا ہے چنانچہ اس کے بعد کراچی کے کئی تاجروں کے دیوالے نکل گئے کیونکہ بمبئی والوں نے اس قیمت پر روئی خریدنے سے انکار کر دیا، نیویارک والوں نے انکار کر دیا، لنکاشائر والوں نے انکار کر دیا اور اس طرح ہزاروں دیوالیہ ہو گئے۔اب یہ ایک حماقت کی بات تھی کہ کسی سادھو سے دریافت کیا جائے کہ آئندہ کے حالات بتاؤ اور پھر جو کچھ وہ اناپ شناپ بتا دے اس کے مطابق عمل شروع کر دیا جائے مگر اس حماقت کا ارتکاب ان سے اسی لئے ہوا کہ انسان چاہتا ہے مجھے علمِ غیب کا کسی طرح پتہ

لگ جائے اور اس کے لئے بعض دفعہ ایسے ایسے احمقانہ طریق اختیار کرتا ہے کہ حیرت آتی ہے۔ غرض انسانی فطرت میں رازِ کائنات معلوم کرنے کی جستجو پائی جاتی ہے اور یہ علوم خواہ کتنے غلط ہوں اس امر پر ایک کھلی شہادت ہیں کہ انسان علوم ماوراء الطبعیات کی پیاس رکھتا ہے اور ان کے بغیر اسے چین نہیں آتا۔ پھر وہ علوم دنیاوی کی تحقیق میں لگتا ہے کہیں آسمانی عالم کی کھال اُدھیڑنے لگتا ہے، روشنیوں کو پھاڑتا ہے، ستاروں کی چالیں دیکھ دیکھ کر آئندہ کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، پھر زمین کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو کہیں کانیں دریافت کرتا ہے، کہیں خزانوں کی دریافت کرتا ہے، کوئی شخص پیتل کی، کوئی لوہے کی، کوئی سونے اور کوئی چاندی کی کانیں دریافت کرنے میں مشغول ہوجاتا ہے، کوئی جڑی بوٹیوں کے خواص معلوم کرتا اور ان کی تحقیق پر تحقیق کرتا چلا جاتا ہے، کوئی دھاتوں کے کُشتے بناتا ہے، کوئی ہوا، کوئی پانی، کوئی بجلی، کوئی آگ اور کوئی دخان کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ذرا ذرا سی بات پر جنات کے خیال میں مشغول ہوجاتا ہے۔ کسی نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ میں نے فلاں عمل پڑھا تھا اس کی اس قدر تاثیر ہوئی کہ بس جنات قابو ہوتے ہوتے رہ گئے۔ وہ سنتا ہے تو اس کے سر پر بھی جنون سوار ہوجاتا ہے اور وہ بھی جنات کو قابو میں لانے کے لئے سرگرمِ عمل ہوجاتا ہے۔ جس طرح کیمیا گر دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے کہہ دیا کرتے ہیں کہ میں نے فلاں نسخہ بنایا اور سونا بنتے بنتے رہ گیا۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ میں نے فلاں عمل کیا تو جنات قابو ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دوسرا شخص سنتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ یہ تو قابو نہ کرسکا مگر میں ان کو ضرور قابو کرلوں گا چنانچہ وہ کسی میدان میں اپنے اردگرد لکیریں کھینچ کر بیٹھ جاتا اور منہ سے بڑبڑانے لگ جاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ابھی جنات میرے قابو میں آجائیں گے۔ اگر مادی تغیرات ہی کافی سمجھے جاتے تو عاقل اور جاہل دونوں اس قسم کی جدوجہد میں کیوں مشغول ہوتے۔ آخر وجہ کیا ہے کہ یورپ کا عاقل بھی اسی میں مشغول ہے اور ہندوستان کا جاہل بھی اِسی میں مشغول ہے۔ اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ خالص مادی علوم سے انسانی قلب تسلی نہیں پاتا بلکہ وہ ماوراء الطبعیات علوم کی جستجو چاہتا ہے۔

غرض ہر طرف سے مادی عالم میں سرنگ لگانے کی یہ جدوجہد بتاتی ہے کہ اس کے اندر کسی بالائی طاقت کو پانے کی ایک تڑپ ہے جو کبھی کبھی مادی بوجھوں میں دب کر سب کانشس حالت میں چلی جاتی ہے۔ یعنی یہ حقیقت کہ خدا ہے اور اس نے دنیا بنائی ہے غائب ہوجاتی ہے مگر اس کی جدوجہد بتارہی ہوتی ہے کہ اس کے پیچھے بے جانے وہی جذبہ کارفرما ہے۔ بعض دفعہ دیکھا گیا ہے کہ جاگتے ہوئے انسان اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب وہ سوجاتا ہے تو اس کے قلب کے اندرونی خیالات بعض دفعہ اس کی حرکات سے ظاہر ہوجاتے ہیں کئی لوگ ایسے

ہوتے ہیں جو کسی کی کوئی چیز چرا لیتے ہیں دن بھر تو وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو ان کی اس چوری کا علم نہ ہو مگر چونکہ سارا دن ان کے دماغ پر یہی خیال مسلط رہتا ہے اس لئے جب وہ سوتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد ہی بڑبڑانے لگتے ہیں اور ان کی چوری کا لوگوں کو علم ہو جاتا ہے۔ بہت سے چور ایسے ہوتے ہیں جن کا لوگوں کو پتہ نہیں لگتا مگر چونکہ ہر وقت انہیں یہی خیال رہتا ہے کہ کہیں لوگوں کو ہماری چوری کا علم نہ ہو جائے اس لئے جب وہ سوتے ہیں خواب کی حالت میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں دیکھنا دیکھنا فلاں کونہ میں نہ جانا وہاں میرا مال پڑا ہے۔ دیکھنا کہیں پولیس کو خبر نہ دے دینا۔ کبھی بڑبڑاتے ہوئے کہیں گے میں نے فلاں کو خوب لوٹا ہے۔ لوگ ان باتوں کو سنتے ہیں تو انہیں فوراً پتہ لگ جاتا ہے کہ یہی چور ہے چنانچہ تحقیق پر تمام مال برآمد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض قاتل ایسے ہوتے ہیں جو جاگتے ہوئے تو اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب سو جاتے ہیں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں ارے فلاں شخص کی روح آ گئی ہے، ارے مجھے کیوں مارتے ہو، مجھے معاف کر دو میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ ہمسایہ ان آوازوں کو سنتا ہے تو اسے پتہ لگ جاتا ہے کہ یہی شخص قاتل ہے۔ تو انسان کے سب کانشس مائینڈ (غیر شعوری دماغ) میں بہت سے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جب اس کا کانشس مائینڈ (شعوری دماغ) غافل ہوتا ہے تو سب کانشس مائینڈ ان خیالات کو ظاہر کر دیتا ہے جیسے سوتے ہوئے یا رؤیا میں یا مسمریزم کے ماتحت دوسروں کی زبان سے کئی باتیں نکل آتی ہیں۔ اسی طرح دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں مگر ان کی زندگی کے حالات ان کے سب کانشس مائینڈ کی کیفیات کو ظاہر کر رہے ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی اور ہستی کی تلاش کی خواہش مٹانے میں کامیاب ہو گئے ہیں مگر ان کے حالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خواہش کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے وہ صرف ان خیالات کو دھکیل کر عارضی طور پر پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوتے ہیں مستقل طور پر نہیں۔ اور چونکہ یہ تڑپ اکثر سب کانشس حالت میں رہتی ہے انسان اس کا اقرار نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی تھک کر جس طرح بچہ جب کھلونے کی ساخت کو سمجھ نہیں سکتا تو اسے بٹوں سے توڑنے لگتا ہے یہ بھی چڑ کر کسی پیدا کرنے والے کا انکار کر دیتا ہے اور آپ ہی آپ بنے ہوئے عالم کا وجود تسلیم کرنے لگتا ہے۔ گھروں میں اکثر یہ نظارہ نظر آتا ہے کہ جب بچہ کسی کھلونے کو توڑ پھوڑ دیتا ہے تو بعض دفعہ کھسیانا ہو کر کہہ دیتا ہے کہ مجھے کھلونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ وہ اس بات کا غصہ نکالتا ہے کہ میں نے کھلونا بھی توڑا اور مجھے اس کی حقیقت کا بھی علم نہ ہوا۔ دہریہ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں وہ اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کرتے ہیں ورنہ ان کے سب کانشس مائینڈ میں

خدا تعالیٰ کی ہستی کی شہادت موجود ہوتی ہے اور وہ ادھر ادھر اس کو تلاش بھی کرتے ہیں مگر جب وہ ہستی ان کو ملتی نہیں تو اس کا انکار کر دیتے ہیں اور جس طرح بچہ کہتا ہے مجھے کھلونے کی ضرورت نہیں وہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں کسی خدا کی ضرورت نہیں۔ بعض دفعہ ماں اپنے بچہ سے دل لگی کے طور پر کہہ دیتی ہے کہ میں نے فلاں چیز تجھے نہیں دینی۔ بچہ سنتا ہے تو منہ بسورتے ہوئے کہہ دیتا ہے کہ میں نے یہ چیز لینی ہی نہیں مگر پھر للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے کہ کسی طرح یہ چیز مجھے مل جائے۔ اسی طرح انسان بعض دفعہ کھسیانہ ہو کر کہہ دیتا ہے کہ مجھے خدا کی ضرورت نہیں مگر اس سے بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی کیونکہ خود اس کی کوشش بتا رہی ہوتی ہے کہ اس کا یہ نتیجہ غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ وہ آپ ہی آپ ہے اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ہم اس چیز کی انتہاء تک پہنچ چکے ہیں۔ اگر کسی دریا کے کنارے صرف دو میل تک چل کر کوئی شخص کہہ دے کہ اس دریا کا کوئی منبع نہیں تو یہ اس کی حماقت ہوگی اگر وہ چلتا چلا جائے تو اُسے بہر حال اس کا منبع مل جائے گا۔ اِسی طرح جب تک دنیا کے انتہائی سبب کو معلوم نہ کیا جائے یہ کہنا کہ دنیا کا کوئی خدا نہیں احمقانہ بات ہے یہ نتیجہ تو منتہائے اسباب پر پہنچ کر نکالا جا سکتا ہے اس سے پہلے نہیں اور اگر اس کا یہ نتیجہ درست ہے تو اسے مزید تجسّس اور تحقیق بند کر دینی چاہیے مگر یہ پھر بھی مزید تجسّس اور جستجو میں لگا رہتا ہے بلکہ اب بھی نئی سے نئی باتیں نکل رہی ہیں اور جستجو اور تلاش کا ایک دریا ہے جو دنیا میں جاری ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ لوگ ابھی منبع تک نہیں پہنچے اور جب وہ منبع تک پہنچے ہی نہیں تو منبع کی تعیین کرنے کا انہیں کیا حق ہے؟ اللہ تعالیٰ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا۔ ہم نے تمہارے قویٰ میں اعلیٰ درجہ کی طاقت پیدا کی ہے اور ایسا مادہ ہم نے تمہارے اندر ودیعت کیا ہے کہ تم پل صراط پر چلنے کی قابلیت رکھتے ہو۔ پل صراط پر وہی شخص چل سکتا ہے جو دائیں طرف گرنے سے بھی بچتا ہے اور بائیں طرف گرنے سے بھی بچتا ہے اور پھر اپنے اندر یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ آگے کی طرف بڑھتا چلا جائے گویا انسان میں اللہ تعالیٰ نے ادھر ترقی کا مادہ پیدا کیا ہے اُدھر اسے اپنا دایاں اور اپنا بایاں پہلو مضبوط بنانے کی طاقت عطا فرمائی ہے جب اُس نے انسان کو اس طرح معتدل القویٰ بنایا ہے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اس کے لئے راستہ نہ بناتا اور منزل مقصود پر اسے نہ پہنچاتا۔ انسان کی منزل مقصود خدا تعالیٰ ہے اور وہ اس منزل مقصود پر اُسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ دائیں طرف کا بھی خیال رکھے اور بائیں طرف کا بھی خیال رکھے۔ معتدل القویٰ وہی شخص ہوتا ہے جو کسی ایک طرف کو جھکا ہوا نہ ہو۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ نے انسان کو معتدل القویٰ بنایا تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ اپنے اندر ایسی قابلیت رکھتا ہے کہ دائیں طرف گرنے سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے اور بائیں طرف گرنے سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے۔ انسان کی تمام تر کامیابی اسی میں

ہوتی ہے کہ وہ دائیں بائیں گڑھوں سے بچ کر سیدھا چلے اور منزل مقصود سے ورے نہ ٹھہرے۔ یہی دو چیزیں مذہب کی جان ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ

مذہب کی بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ انسان خدا تعالیٰ سے بھی اعلیٰ درجہ کا تعلق رکھے اور بنی نوع انسان سے بھی اعلیٰ درجہ کا تعلق رکھے۔ نہ حقوق اللہ کے بجالانے میں کوئی کوتاہی کرے اور نہ حقوق العباد کی بجا آوری میں کوئی کوتاہی کرے۔

غرض انسان کو ایک معتدل القویٰ نفس عطا کیا گیا ہے اس میں ترقی کا مادہ ہے جو اعلیٰ درجہ کے مقصود تک پہنچنے کے لئے ہے۔ پھر اس میں اپنے دائیں اور بائیں کو محفوظ رکھنے کا مادہ ہے جس سے اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فلاں کام مجھے کرنا چاہیے اور فلاں نہیں۔ فلاں کام میرے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ جب انسان کے اندر یہ تمام قابلیتیں پائی جاتی ہیں تو تم کسی راہنما اور معلم کا کیونکر انکار کر سکتے ہو؟

(۲) مصدری معنوں کے لحاظ سے اس کا یہ مطلب ہوگا کہ انسان معتدل القویٰ ہے اس لئے اس کا معتدل القویٰ ہونا کسی راہنما کی طرف بلاتا ہے گویا دلیل ایک ہی ہے صرف نقطۂ نگاہ کو بدلا ہے۔ پہلے معنوں کے لحاظ سے یہ کہا گیا ہے کہ انسان کو معتدل القویٰ بنانے والا اس کی راہنمائی کی صورت کیوں پیدا نہ کرے گا اور دوسرے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ اس کا معتدل القویٰ ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ کوئی اس اعتدال کو کام میں لانے والا راہنما بھی ہو۔ گویا مَا کے معنے اگر خدا تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ دلانے کے سمجھے جائیں تو آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ جس ذات نے انسان میں یہ صفات پیدا کی ہیں وہ کوئی علاج نہ بتاتا اور راہنمائی کی صورت پیدا نہ کرتا۔ لیکن اگر مصدری معنے لئے جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ انسان میں یہ قوتیں تو موجود ہوں مگر ان قوتوں کے ظہور کا کوئی سامان نہ ہو۔ مفہوم ایک ہی ہے مگر ایک استدلال نفس کی بناوٹ سے کیا گیا ہے اور دوسرا استدلال نفس کو بنانے والے کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا کے تیسرے معنے تیسرے معنے وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا کے یہ ہیں کہ ہم اس نفس کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو عظیم الشان ہے اور جس کی طرف آپ ہی آپ انگلیاں اٹھتی ہیں یعنی ہر زمانہ کے نفسِ کامل اور اس خدا کو پیش کرتے ہیں جس نے ایسے کامل وجود کو بنایا۔ یہاں نفس کو نکرہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے مگر حقیقتاً اس کی تنوین تفخیم اور تعظیم کے لئے ہے اور نَفْسٍ سے مراد ہر نفس نہیں بلکہ عظیم الشان نفس ہے (تنوین کا تفخیم اور تعظیم کے لئے آنا عربی زبان کا ایک مروج قاعدہ ہے) اور مراد یہ ہے کہ ہم اس شخص کی طرف تم کو توجہ

دلاتے ہیں جو اپنی عظمتِ شان کی وجہ سے اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ گو اس کا نام نہ لو مگر ہر انگلی اس کی طرف خود بخود اٹھنے لگتی ہے۔ اس امر کا قرآن کریم کے بعض اور مقامات سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نبی آتا ہے اس کے دعویٰ سے پہلے ہی لوگوں کی اس کی طرف انگلیاں اٹھنی شروع ہو جاتی ہیں اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہی وہ شخص ہے جو ہماری قوم کو کامیاب کر سکتا ہے چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ذکر فرماتا ہے کہ ان کی قوم کے افراد نے ان سے کہا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ھود: ۶۳) یعنی اے صالح ہمیں تو تم پر بڑی بڑی امیدیں تھیں اور ہم سمجھتے تھے تو بڑے اعلیٰ اخلاق کا مالک ہے تیرے اندر قوت عملیہ پائی جاتی ہے اور تو قوم کی ترقی کا بڑا فکر رکھتا ہے ہمیں تو امید تھی کہ تو قوم کو اٹھا کر کہیں کا کہیں لے جائے گا مگر تُو تو بڑا خراب نکلا اور تو نے ہماری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تُو ہمیں یہ کہنے لگ گیا ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے طریقِ عمل کو چھوڑ دیں اور تیری بات کو مان کر بتوں کی پرستش نہ کریں۔ اب یہ امر ظاہر ہے کہ جن باتوں میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم اپنی ترقی سمجھتی تھی ان باتوں میں حضرت صالح علیہ السلام اپنی قوم کی ترقی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ جھوٹ اور فریب اور خدا تعالیٰ سے بُعد میں اپنی ترقی سمجھتے تھے اور حضرت صالح علیہ السلام صداقت اور ہدایت اور خدا تعالیٰ سے تعلق میں اپنی قوم کی ترقی سمجھتے تھے۔ بہر حال انہیں یہ امید ضرور تھی کہ ہماری ترقی صالحؑ کے ساتھ وابستہ ہے اور ان کی یہ رائے بالکل درست تھی گو اپنے تنزل کا علاج وہ جن باتوں کو قرار دیتے تھے وہ درست نہیں تھا۔ یہی رنگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نظر آتا ہے اور یہی رنگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام میں پایا جاتا تھا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے خسر صوفی احمد جان صاحبؓ لدھیانوی نے دعویٰ سے پہلے ہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لکھ دیا تھا کہ ؎

ہم مریضوں کی ہے تمہیں پہ نظر
تم مسیحا بنو خدا کے لئے

گویا دنیا کی نگاہیں اسی وقت سے آپ کی طرف بلند ہو رہی تھیں اور جو انگلی بھی اُٹھتی وہ آپ کی طرف اشارہ کرتی۔ مولوی برہان الدینؓ صاحب جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نہایت مخلص صحابی تھے انہوں نے سنایا کہ جب ابتداء میں مَیں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر سنا اور مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایسا شخص ظاہر ہوا ہے جس سے اسلام کی آئندہ ترقی وابستہ معلوم ہوتی ہے اور وہی عیسائیوں اور ہندوؤں وغیرہ کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے تو میں نے ارادہ کیا کہ آپ کو دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں قادیان آیا مگر یہاں آ کر

معلوم ہوا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کسی مقدمہ کے سلسلہ میں گورداسپور تشریف لے گئے ہیں۔ میں گورداسپور پہنچا اور آپ کے جائے قیام کو دریافت کرتا ہوا ڈاک بنگلہ میں گیا جہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ان دنوں تشریف رکھتے تھے۔ باہر حافظ حامد علی صاحب بیٹھے تھے میں نے ان سے کہا کہ میں حضرت مرزا صاحب کی زیارت کرنے کے لئے آیا ہوں کسی طرح مجھے آپؑ کی زیارت کرادیں۔ انہوں نے کہا اس وقت زیارت نہیں ہوسکتی حضرت مسیح موعود علیہ السلام ایک ضروری اشتہار لکھ رہے ہیں۔ میں نے ان کی منتیں بھی کیں مگر انہوں نے کوئی پروا نہ کی۔ آخر میں ایک طرف مایوس ہو کر بیٹھ گیا اور میں نے ارادہ کرلیا حافظ حامد علی صاحب ذرا اِدھر اُدھر ہوں تو میں بغیر پوچھے ہی کمرہ کی چک اٹھا کر آپ کی زیارت کرلوں گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد ہی حافظ صاحب جو کسی کام کے لئے اٹھے تو میں چپکے سے دروازے کی طرف بڑھا اور چک اٹھا کر اندر کی طرف جھانکا اُس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کاغذ ہاتھ میں لئے جلدی جلدی کمرہ میں ٹہل رہے تھے اور آپ کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ ابھی آپ کو واپس آنے میں کچھ دیر لگے گی اور میں اطمینان سے آپ کی زیارت کر سکوں گا مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جلدی واپس لوٹ آئے اُس وقت مجھ پر ایسا رعب طاری ہوا کہ میں ڈر کے مارے وہاں سے بھاگ اٹھا اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ آپ ضرور سچے ہیں جو شخص اتنا تیز تیز چلتا ہے اس نے ضرور دور تک جانا ہے۔

غرض الٰہی سنت یہ ہے کہ ہر زمانہ کا جو نفس کامل ہو اس کی طرف خود بخود لوگوں کی انگلیاں اٹھنی شروع ہوجاتی ہیں اور وہ اسے دیکھ کر اس حقیقت کا برملا اظہار شروع کر دیتے ہیں کہ یہ شخص دنیا میں ضرور کوئی اہم تغیر پیدا کر کے رہے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم ہر زمانہ کے نفس کامل اور اس خدا کو پیش کرتے ہیں جو ایسے کامل وجود پیدا کیا کرتا ہے یا اس زمانہ کا نفسِ کامل (جس سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) اور جس نے اسے بنایا ہے اس کو اور اسی طرح اس نفسِ کامل کے اظلال کو تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو آپ زندگی کے ہر شعبہ میں کامل الوجود ثابت ہوئے ہیں۔ لوگ اپنے اموال کو اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اموال اپنی قوم کے لئے خرچ کرتے تھے۔ لوگ اپنے اوقات کو جوئے اور شراب نوشی وغیرہ میں صرف کرتے تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات اپنی قوم کی بہبودی کے لئے خرچ کرتے تھے۔ لوگ اپنے اوقات جہالت کے لئے خرچ کرتے تھے اور آپؐ اپنے اوقات علم کے لئے خرچ کرتے تھے۔ لوگ اپنے دماغ دنیوی باتوں میں مشغول رکھتے تھے اور آپؐ اپنے دماغ کو اگر ایک طرف خدا تعالیٰ کے احکام کی اتباع میں

مشغول رکھتے تھے تو دوسری طرف بنی نوع انسان کی تکالیف دور کرنے کے لئے اس سے کام لیتے تھے اور یہ تو آپ کی دعویٰ نبوت سے پہلے کی حالت تھی جب آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت نبوت کا اعلان فرمایا اور عملی رنگ میں آپ کا ہر کام لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تو اس وقت آپ اگر فوج کے ساتھ گئے تو بہترین جرنیل ثابت ہوئے، قضاء کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو بہترین قاضی ثابت ہوئے، اِفتاء کا وقت آیا تو بہترین مفتی ثابت ہوئے، تبلیغ کا وقت آیا تو بہترین مبلغ ثابت ہوئے، گھر میں گئے تو بہترین خاوند ثابت ہوئے، بچوں سے تعلق رکھا تو بہترین باپ ثابت ہوئے، دوستوں سے ملے تو بہترین دوست ثابت ہوئے۔ غرض کوئی ایک بات بھی نہیں جس میں آپ دوسروں سے دوسرے درجہ پر رہے ہوں بلکہ ہر خوبی میں آپ نے چوٹی کا مقام حاصل کیا اور اس طرح اپنے نفس کے کامل ہونے کا دنیا کے سامنے ایک ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نفسِ کامل کی اس شہادت کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے تم غور کرو کہ کیا ایسا شخص جس میں یہ یہ صفات پائی جاتی ہوں کبھی ہار سکتا ہے؟ ایک فن کا ماہر ہار سکتا ہے، دو فنوں کا ماہر ہار سکتا ہے مگر یہ تو وہ ہے جو ہر فن میں کامل ہے۔ دنیا اس کے متعلق یہ خیال بھی کس طرح کر سکتی ہے کہ یہ ہار جائے گا اور وہ جیت جائے گی اس میں اگر زیادہ قابلیتیں ہوں تو پھر بے شک وہ جیت سکتی ہے لیکن جب کہ اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کوئی قابلیت ہی نہیں پائی جاتی تو وہ جیت کس طرح سکتی ہے؟

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۹

پھر اس (یعنی خدا) نے اس (نفس) پر اس کی بدکاری (کی راہوں) اور اس کے تقویٰ (کے راستوں) کو کھول دیا۔

تفسیر - اَلْهَمَهَا میں اَلْهَمَ کا فاعل پہلی آیت میں اگر ’’ما‘‘ کے معنے مَنۡ کے ہوں گے تو ضمیر ’’ما‘‘ کی طرف جائے گی اور اگر مصدری معنے لئے جائیں گے تو ضمیر بالمعنیٰ سمجھی جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے ’’ما‘‘ کو مَنۡ کے معنوں میں لیا ہے وہ اس موقعہ پر ’’ما‘‘ کو مصدریہ کہنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے معنے درست نہیں اگر درست ہیں تو وہ بتائیں کہ اَلْهَمَهَا میں اَلْهَمَ کا فاعل کون ہے مصدر تو فاعل نہیں ہوسکتا کیونکہ تسویہ الہام نہیں کرسکتا الہام تو ایک طاقتور ہستی کرسکتی ہے مگر مصدر کے معنے کرنے والے بھی علم ادب کے بہت بڑے ماہر ہیں انہوں نے یہ جواب دیا ہے کہ تمہارا استدلال بالکل غلط ہے۔ عربی زبان میں معنوں کی طرف ضمیر پھیرنے کا کثرت

سے رواج پایا جاتا ہے پس بناء، طحٰی اور تسویہ جس کی طرف منسوب ہوں گے اسی کی طرف بالمعنیٰ ضمیر بھی تسلیم کی جائے گی یعنی بناء طحٰی اور تسویہ کا جو بانی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی طرف بالمعنیٰ ضمیر تسلیم کی جائے گی۔ بہر حال آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے آسمانی اور زمینی نظام کے بنانے اور انسانی نفس میں قابلیت رکھنے کے بعد اسے چھوڑا نہیں بلکہ اس کے اندر فجور و تقویٰ کی حس رکھی ہے اور اس مادہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ گویا دونوں صورتوں میں خواہ مصدری معنے لئے جائیں یا ''ما'' کے معنے مَنْ کے سمجھے جائیں آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نفسِ لوّامہ پیدا کیا ہے اور ہر انسان میں یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ بعض باتوں کو اچھا اور بعض باتوں کو برا سمجھتا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے سمجھنے میں بہت سے لوگ غلطی کھا جاتے ہیں اور وہ بجائے مسئلہ کو اس رنگ میں پیش کرنے کے کہ ہر انسان کچھ باتوں کو اچھا سمجھتا اور کچھ باتوں کو بُرا سمجھتا ہے وہ اس رنگ میں بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہر انسان سمجھتا ہے کہ قتل بُرا ہے یا ہر انسان سمجھتا ہے کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے یا ہر انسان سمجھتا ہے کہ ڈاکہ ڈالنا بُرا ہے۔ اس پر اس کے مخالف جواب دے دیتے ہیں کہ تم کہتے ہو ہر شخص جھوٹ کو بُرا سمجھتا ہے حالانکہ دنیا میں کئی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ جھوٹ کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر تمہاری یہ بات درست ہے کہ فجور اور تقویٰ کا الہام اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی میں کیا ہے تو چاہیے تھا کہ ہر شخص جھوٹ کو بُرا سمجھتا یا ہر شخص قتل کو بُرا سمجھتا مگر واقعہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ دنیا میں جھوٹ بولتے ہیں اور چونکہ ان کے نفس میں ہدایت نہیں ہوتی اور متواتر جھوٹ بول بول کر ان کی فطرت مسخ ہوچکی ہوتی ہے وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ جھوٹ کے بغیر دنیا میں گزارہ ہی نہیں ہوسکتا۔ یا مثلاً سختی کا مادہ ہے یہ بہت سے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ میں نے اپنی جماعت میں ہی دیکھا ہے بار بار لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ سختی سے کام نہ لیا کریں محبت اور پیار سے دوسروں تک اپنی باتیں پہنچایا کریں مگر پھر بھی وہ اپنی عادت سے مجبور ہونے کی وجہ سے بسا اوقات سختی پر اُتر آتے ہیں اور بعض تو مجھے بھی کہہ دیتے ہیں کہ لوگ سختی کے بغیر کبھی نہیں مان سکتے، نرمی کام خراب کر دیا کرتی ہے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ ہر شخص سختی کو بُرا سمجھتا ہے تو یہ واقعات کے خلاف ہوگا کیونکہ دنیا میں کئی لوگ سختی سے کام لیتے ہیں اور باوجود سمجھانے کے بھی وہ اپنی اس عادت کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نرمی اچھی نہیں دنیا کا اصل علاج سختی ہے۔ اسی طرح بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو چوری کو بُرا نہیں سمجھتے، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جھوٹ کو بُرا نہیں سمجھتے، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قتل کو بُرا نہیں سمجھتے۔ پس اگر اس کے یہ معنے لئے جائیں کہ ہر انسان چوری کو یا

جھوٹ کو یا قتل وغیرہ جرائم کے ارتکاب کو بُرا سمجھتا ہے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ دنیا میں کئی لوگ ایسے ہیں جو ان افعال کو بُرا نہیں سمجھتے۔ یا مثلاً گوشت خوری ہے اس کے متعلق مسلمانوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اس میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتے اور ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اس کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں اور گوشت خوری سے ان کو اتنی شدید نفرت ہوتی ہے کہ کھانا تو الگ رہا اگر گوشت کا کوئی شخص ان کے سامنے نام بھی لے لے تو انہیں قے آجاتی ہے۔ ہماری جماعت میں سردار فضل حق صاحب ایک نومسلم دوست تھے وہ سکھ مذہب کو ترک کر کے اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ کئی سال تک مسلمان رہے اور دوسروں کو بھی اسلام کی تبلیغ کرتے رہے ان کی یہ حالت تھی کہ وہ سالہا سال تک گائے کے گوشت سے شدید متنفّر رہے (ممکن ہے قادیان سے جانے کے بعد اُن کا یہ حال نہ رہا ہو مگر جب تک وہ قادیان میں رہے اُن کا یہی حال تھا) مجھے خوب یاد ہے وہ ایک دفعہ مہمان خانہ میں آکر ٹھہرے چونکہ وہ گائے کا گوشت نہیں کھاتے تھے اس لئے بعض دوستوں نے یہ طے کر لیا کہ جس طرح بھی ہو سکے ان کو گوشت ضرور کھلانا ہے۔ ایک دن بھائی عبدالرحیم صاحب، شیخ عبدالعزیز صاحب اور بعض اور دوست ان سے اصرار کرنے لگے کہ آج تو ہم نے آپ کو ضرور گائے کا گوشت کھلانا ہے۔ وہ یہ سنتے ہی اٹھ کر بھاگے۔ وہ آگے آگے تھے اور یہ دوست ان کے پیچھے پیچھے۔ مجھے وہ نظارہ اب تک یاد ہے کہ وہ کبھی ایک چارپائی سے کود کر دوسری طرف چلے جاتے وہاں ان کا پیچھا ہوتا تو تیسری چارپائی سے کود کر بھاگتے اور جب لوگوں نے ان کو پھر بھی نہ چھوڑا تو وہ ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں بھاگ گئے مگر لوگ بھی ان کے پیچھے پیچھے تھے آخر اسی بھاگ دوڑ میں ان کو اتنے زور سے قے آئی کہ ان کے دوست دیکھ کر ڈر گئے اور انہوں نے ان کو چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ اگر اب بھی ہم ان کو گائے کا گوشت کھانے پر مجبور کریں گے تو یہ سخت ظلم ہوگا۔ تو دنیا میں کئی لوگ ایسے ہیں جو گوشت خوری سے سخت نفرت رکھتے ہیں اور کئی ایسے ہیں جن کو گوشت خوری کے بغیر چین ہی نہیں آتا۔ مگر اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ گوشت کھانا انسانی فطرت میں داخل ہے یا گوشت نہ کھانا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کانشنس بالکل اور چیز ہے جس کی حقیقت کو لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کانشنس کے معنے صرف اتنے احساس کے ہیں کہ انسان بعض باتوں کو بُرا اور بعض باتوں کو اچھا سمجھتا ہے کانشنس میں یہ بات شامل نہیں کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بُری۔ یہ بات عادت سے تعلق رکھتی ہے جیسی کسی کو عادت ہوگی ویسے ہی اُس کا اس چیز کے متعلق احساس ہوگا مگر بہرحال کوئی انسان دنیا میں ایسا نہیں ہو سکتا جو ہر چیز کو اچھا کہتا ہو یا ہر چیز کو بُرا سمجھتا ہو۔ ہر انسان یہی کہے گا کہ بُرا کام نہیں کرنا چاہیے اور ہر انسان یہی کہے گا کہ اچھا کام ضرور کرنا چاہیے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ بُرے کام کو

اچھا سمجھتا ہو یا اچھے کام کو بُرا سمجھتا ہو مگر یہ احساس اس کے اندر ضرور پایا جاتا ہے کہ دنیا میں کچھ چیزیں اچھی ہیں اور کچھ چیزیں بُری ہیں۔ مجھے اچھی چیزیں اختیار کرنی چاہئیں اور بُری چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا میں ہستی باری تعالیٰ کے لئے ایک زبردست دلیل یہی معنے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا کے ہیں کہ ہر انسان یہ کہتا ہے کہ کچھ بُری چیزیں ہیں اور ہر انسان یہ کہتا ہے کہ کچھ اچھی چیزیں ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ ہر انسان میں بُری اور اچھی چیزوں کے امتیاز کا مادہ رکھا گیا ہے اور جب یہ بات ہے تو دلیل مکمل ہو جاتی ہے یعنی جب ہر انسان کے اندر یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھا اور کسی چیز کو بُرا کہتا ہے تو ضروری ہے کہ کوئی ایسی ہستی بھی ہو جو اسے بتائے کہ کون کون سی چیزیں اچھی ہیں اور کون کون سی چیزیں بُری ہیں۔ یہ دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کے ثبوت میں لوگوں کے سامنے پیش کی ہے اور یہ وہ دلیل ہے جس کا کوئی رد کسی بڑے سے بڑے دہریہ کے پاس بھی نہیں ہے۔ مگر میں نے دیکھا ہے لوگ بالعموم اس دلیل کو پورے طور پر سمجھتے نہیں اور وہ ایسے رنگ میں اسے مخالف کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جو اپنے اندر کمزوری رکھتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اس دلیل کا اپنی کتب میں بعض جگہ ذکر فرمایا ہے مگر لوگ پھر بھی جب نفسِ لوّامہ کی شہادت پیش کریں گے اس رنگ میں پیش کریں گے کہ ہر شخص جھوٹ کو بُرا سمجھتا ہے یا ہر شخص قتل اور چوری کو بُرا سمجھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک سب کانشس مائینڈ کا سوال ہے اس کے لحاظ سے یہ سب باتیں بُری ہیں اور ہر انسان سب کانشس مائینڈ میں ان کو بُرا سمجھتا ہے مگر کانشس مائینڈ میں وہ ان کو بُرا نہیں سمجھتا اور نہ وہ بحث کے وقت ان چیزوں کی بُرائی کا قائل ہو سکتا ہے اور اگر قائل بھی ہو تو لمبی بحث کے بعد ہوتا ہے جس میں سب کانشس مائینڈ سے ان چیزوں کی بُرائی اس کے کانشس مائینڈ میں لانی پڑتی ہے مگر ایسا ہر شخص نہیں کر سکتا یہ ماہرِ فن کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ سب کانشس مائینڈ سے کانشس مائینڈ میں کسی چیز کو منتقل کر دے۔

حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس ایک دفعہ ایک چور علاج کے لئے آیا۔ میں نے اسے نصیحت کی کہ تم نے کیا لغو پیشہ اختیار کیا ہوا ہے تمہیں چاہیے کہ محنت کرو اور کماؤ۔ یہ کیسی بُری بات ہے کہ تم چوری جیسا ذلیل کام کرتے ہو اور تمہیں ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ تم مضبوط اور ہٹے کٹے ہو محنت کرو اور کماؤ چوری کیوں کرتے ہو؟ وہ کہنے لگا مولوی صاحب ہمارے جیسی محنت بھی دنیا میں کوئی شخص کرتا ہے؟ لوگ تو دن کو محنت کرتے ہیں لیکن ہم وہ ہیں جو رات کو محنت کرتے ہیں۔ سخت سردی کے دن ہوتے ہیں، جسم ٹھٹھر رہے ہوتے ہیں، تاریکی سے قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں، جان کا خوف ہوتا ہے مگر پھر بھی ہم ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے

اپنے کام کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔اب بتایئے ہم سے بڑھ کر بھی دنیا میں کوئی محنت کرتا ہے؟ آپ فرماتے تھے جب اس نے یہ جواب دیا تو میں نے سمجھ لیا کہ اس شخص کی فطرت بالکل مسخ ہو چکی ہے اب اس کو چوری کی برائی کا قائل کرنے کے لئے کسی اور طریق سے کام لینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اس سے گفتگو کا رخ بدل لیا اور بعض اور امور کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ جب کچھ دیر گذر گئی تو میں نے اس سے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ تم چوری کرتے کس طرح ہو اور کتنے آدمی اس میں شریک ہوتے ہیں؟ کہنے لگا حکیم صاحب بات یہ ہے کہ چوری کے لئے کئی آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے سب سے پہلے تو ہم گھر کے کسی آدمی کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں جو ہمیں بتاتا ہے کہ کتنے کمرے ہیں، ان کمروں کا کیا نقشہ ہے اور کس کس رخ میں وہ واقعہ ہوئے ہیں تاکہ ہم پکڑے نہ جائیں۔ پھر ہمیں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کس کس جگہ مال پڑا ہوا ہے، کون سے ٹرنک میں زیورات ہیں، اس ٹرنک کا رنگ کیسا ہے اور وہ کس کونے میں رکھا ہوا ہے یا اگر روپیہ کہیں دبا کر رکھا ہوا ہے تو کس جگہ دبایا ہوا ہے۔ یہ سب باتیں ہم اس سے دریافت کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں جو سیندھ لگانے میں ماہر ہوتا ہے تاکہ وہ اس طرح سیندھ لگائے کہ کسی کو پتہ تک نہ لگے اور باوجود دیوار توڑنے کے کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ وہ سیندھ لگا کر الگ ہو جاتا ہے کیونکہ سیندھ لگانے کا اس کی طبیعت پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ مزید کوئی کام کرنے کے ناقابل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا شخص آگے آتا ہے جسے گھر کا نقشہ یاد کرایا ہوا ہوتا ہے وہ اندر داخل ہوتا ہے اور جہاں جہاں اسباب ہوتا ہے وہاں سے اٹھا کر باہر پہنچا دیتا ہے اس وقت دیوار کے پاس ہی ہمارا ایک آدمی تیار کھڑا ہوتا ہے جوں جوں وہ اسباب پہنچاتا جاتا ہے ہمارا آدمی اس کو سمیٹتا چلا جاتا ہے اور ایک آدمی ایسا ہوتا ہے جو دور ایک کونے میں کھڑا رہتا ہے تاکہ اگر کوئی آدمی گذر رہا ہو تو وہ اطلاع دے سکے۔ جب اس طرح چوری کے کام سے ہمیں فراغت ہو جاتی ہے تو گھر پہنچ کر ہم تمام زیورات ایک سُنار کو دے دیتے ہیں جو ان کو گلا کر سونے کی ڈلیاں بنا دیتا ہے کیونکہ زیورات اپنی اصل شکل میں ہم فروخت نہیں کر سکتے اگر کریں تو یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں پکڑے نہ جائیں۔ اس لئے ہم نے سُنار رکھا ہوا ہوتا ہے تاکہ جونہی کوئی زیور آئے فوراً اس کو گلا دیا جائے۔ حضرت خلیفہ اوّلؓ فرماتے تھے جب اس نے یہ داستان بیان کی تو میں نے کہا تمہاری اتنی محنت اور عرقریزی کے بعد اگر وہ سُنار اُس سونے کو کھا جائے تو پھر؟ اس پر وہ بے اختیار ہو کر بولا اگر وہ چوری کرے تو ہم اس بے ایمان اور خبیث کا سر نہ اڑا دیں۔ ہم تو کبھی اس کو زندہ نہ رہنے دیں۔ میں نے کہا ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ چوری کوئی عیب کی بات نہیں اور ابھی کہہ رہے ہو کہ وہ خبیث چوری کرے تو اس کا سر اڑا دیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود تمہاری فطرت چوری کو ناپسند کرتی ہے اور وہ اسے خباثت اور بے ایمانی

کا کام قرار دیتی ہے۔ ورنہ وجہ کیا ہے کہ جو کام تم خود کرتے ہو اسی کام کی وجہ سے تمہیں سُنار پر غصہ آ جائے اس پر وہ شرمندہ ہو گیا تو فطرت جو مسخ ہو چکی ہو وہ بعض دفعہ ابھر بھی آتی ہے مگر اس طرح فطرت کو ابھارنا ہر شخص کا کام نہیں ہوتا یہ ماہر فن ہی کام کر سکتا ہے اور پھر بعض جگہ باوجود کوشش کے بھی مسخ شدہ فطرت نہیں ابھرتی جیسے وہ لوگ جو گوشت کھانے کے مخالف ہیں اور وہ اسے ''جیو ہتیا'' قرار دیتے ہیں۔ ان سے جب گفتگو ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جب تمہارے زخموں میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو تم دواؤں سے ان کیڑوں کو مارتے ہو یا نہیں؟ اگر تم مارتے ہو اور تمہارے دماغ میں اس وقت جیو ہتیا کا خیال نہیں آتا بلکہ تم سمجھتے ہو کہ ادنیٰ چیز کو اعلیٰ کے لئے قربان ہی ہونا چاہیے تو تمہیں گوشت خوری پر کیا اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ اس رنگ میں جب ان کو سمجھایا جائے تو بعض دفعہ تو وہ سمجھ جاتے ہیں مگر بعض دفعہ نہیں بھی سمجھتے۔ بہر حال اصل دلیل جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بار بار استعمال کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی کانشنس میں نیکی اور بدی کا احساس پایا جاتا ہے یعنی ہر شخص میں خواہ وہ کسی مذہب وملت کا پیرو ہو یہ احساس پایا جاتا ہے کہ کچھ چیزیں اچھی ہیں اور کچھ چیزیں بُری ہیں۔ یہ نہیں کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بُری۔ یہ علم الاخلاق ہے۔ کانشنس کے معنے صرف اتنے ہوتے ہیں کہ ہر انسان میں ایک مادہ پایا جاتا ہے جو بتاتا ہے کہ کوئی چیز اچھی ہے اور کوئی چیز بُری ہے۔ تم ساری دنیا میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں دکھا سکتے جو یہ کہتا ہو کہ ہر چیز اچھی ہے یا ہر چیز بُری ہے۔ وہ کسی کو اچھا سمجھتا ہو گا اور کسی کو بُرا سمجھتا ہو گا۔ مثلاً چور چوری کو اچھا سمجھے گا مگر قتل کو بُرا سمجھے گا۔ یا قاتل قتل کو اچھا سمجھے گا مگر وعدہ کی خلاف ورزی کر بُرا سمجھے گا۔ یا ظالم ظلم کو اچھا سمجھے گا مگر جھوٹ پر اُسے غصہ آ جائے گا۔ یا جھوٹا جھوٹ کو اچھا سمجھے گا مگر قتل پر اُسے غصہ آ جائے گا۔ غرض اخلاق اور مذہب سے تعلق رکھنے والے جس قدر افراد دنیا میں پائے جاتے ہیں ہندو کیا اور عیسائی کیا اور مسلمان کیا اور سکھ اور یہودی کیا اور چوڑھے کیا اور عالم کیا اور جاہل کیا ہر انسان میں یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ کچھ کام مجھے کرنے چاہئیں اور کچھ کام نہیں کرنے چاہئیں۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا میں فجور کے بطور مصدر استعمال کرنے کی وجہ اللہ تعالیٰ اسی مادہ کے لحاظ سے جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ فرماتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا۔ ہم نے اس کو الہام کیا ہے اس کے فجور اور اس کے تقویٰ کے متعلق۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں مصدر استعمال کیا ہے یہ نہیں کہا کہ ہم نے اسے فجور والی باتوں کا الہام کیا ہے یا تقویٰ اور پاکیزگی کی تفصیلات اس پر الہام کے ذریعہ روشن کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ فرمایا ہے کہ ہم نے اسے فجور اور تقویٰ کا الہام کیا ہے یعنی ہر انسان میں فجور اور تقویٰ کی حس پائی جاتی ہے اور ہر انسان میں

اللہ تعالیٰ نے ایسا مادہ رکھا ہے کہ وہ اس بات کو خوب سمجھتا ہے کہ میرے نفس کے لئے کچھ باتیں اچھی ہیں اور کچھ باتیں بُری ہیں۔ یہی دلیل ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیش کی ہے اور یہی دلیل ہے جو قرآن کریم پیش کرتا ہے اور یہی دلیل ہے جسے میں نے بھی اپنی کتب میں بعض مقامات پر بیان کیا ہے مگر لوگ غلطی سے تفصیلات میں چلے جاتے ہیں اور وہ معین نیکیوں اور معین بدیوں کو بطور مثال پیش کر دیتے ہیں حالانکہ اس دلیل کا یہ مطلب نہیں کہ جسے ہم فجور سمجھتے ہیں یا جسے ہم تقویٰ سمجھتے ہیں اس کا علم ہر انسان کو ہے یا ہر انسان ان کو واقعہ میں بُرا یا اچھا سمجھتا ہے بلکہ دلیل یہ ہے کہ ہر شخص میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ کچھ چیزیں اچھی ہیں اور کچھ چیزیں بُری ہیں۔ اس کے بعد اختلاف ہو جاتا ہے کوئی کسی کو اچھا سمجھتا ہے اور کسی کو بُرا۔ کوئی کسی کو قابلِ تعریف قرار دے دیتا ہے اور کسی کو قابلِ مذمت۔ مگر ہمیں اس اختلاف کی تفصیلات سے سروکار نہیں ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ ادھر تو نیکی بدی کی حس ہر اِک میں ہے ادھر انسان نیکی بدی کی تعیین میں شدید اختلاف رکھتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس فطرتی مادہ کی صحیح راہنمائی کرنے والی کوئی ایسی ہستی ہو جو انسانی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتی ہو اور پھر وہ انسان کو بتائے کہ کون سی باتیں واقعہ میں اچھی ہیں اور کون سی باتیں واقعہ میں بُری ہیں۔ کن باتوں پر تمہیں عمل کرنا چاہیے اور کن باتوں سے تمہیں اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ تو ان عام معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب ہے جو نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا کے کئے گئے تھے۔

اَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا کے دوسرے معنے لیکن اس کے علاوہ ایک خاص معنے بھی کئے گئے تھے یعنی اس میں ہر زمانہ کے نفسِ کامل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ ایسے نفسِ کامل کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ الہام کے ذریعہ فجور و تقویٰ کی راہیں بتاتا چلا آیا ہے گویا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا میں حذف مضاف سمجھا جائے گا اور اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ فجور والی باتیں بتاتا ہے یا تقویٰ والی باتیں بتاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ نفسِ کامل پر الہام نازل کرتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ فجور والی باتیں کون سی ہیں اور تقویٰ والی باتیں کون سی ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۙ﴿۱۰﴾

جس نے اس (نفس) کو پاک کیا۔ وہ تو (سمجھو کہ) اپنے مقصود کو پا گیا۔

حلّ لُغات۔ زَكّٰى زَكّٰى زَكّٰى سے باب تفعیل ہے اور زَكَی الشَّیْءُ کے معنے ہیں نَمَا۔ کوئی چیز بڑھ

گئی (اقرب) اور جب زَكَّاهُ اللّٰہُ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اَنْمَاهُ۔ اللہ نے اس کو بڑھایا اور اونچا کیا (تاج العروس) نیز زَکّٰی کے معنے ہیں طَھَّرَہٗ۔ اس کو پاک کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا کے دو معنے فرماتا ہے اس الہام کے بعد جو شخص اس کی پیروی کر کے اپنے نفس کو ٹھیک راہ پر چلاتا ہے وہ بامراد ہو جاتا ہے یعنی الہام فطرت جو مجمل الہام ہوتا ہے اس کی پیروی اور اطاعت کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ نبی کا الہام تفصیلی ہوتا ہے لیکن فطرت کا الہام مجمل ہوتا ہے۔ یہاں تفصیلی الہام کا ذکر نہیں بلکہ مجمل الہام کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فجور اور تقویٰ کا وہ مجمل علم جو انسان کو ملا تھا اور جس کے مطابق وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کچھ بُری چیزیں ہیں اور کچھ اچھی چیزیں ہیں، مجھے بُری چیزوں سے بچنا چاہیے اور اچھی چیزوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ جو شخص اس مجمل علم کو صحیح طور پر استعمال کرتا ہے اور فطرت کی اس راہنمائی کے ماتحت اپنے نفس کو اونچا کرتا ہے وہ فلاح پا لیتا ہے یعنی اپنے خدا سے واصل ہو کر صاحب الہام ہو جاتا ہے۔ ان معنوں کے لحاظ سے قَدْ اَفْلَحَ میں وحیٔ حقیقی کے پانے کا ذکر ہے اور اَلْهَمَهَا میں وحیٔ مجمل کے نازل ہونے کا بیان ہے جو ہر فطرتِ انسانی پر نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس حقیقت کی طرف بنی نوع انسان کو توجہ دلاتا ہے کہ جو شخص اس بات کو سمجھتے ہوئے کہ خدا تعالیٰ نے میرے اندر اعتدال پیدا کیا ہے غور و فکر سے کام لیتے ہوئے اعتدال کی راہوں پر چلتا ہے اور فجور کی وہ حِس جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں رکھی ہے اس سے کام لے کر وہ بُری باتوں سے بچتا ہے اور تقویٰ کی حِس جو اس کے اندر پیدا کی گئی ہے اس سے کام لے کر وہ اچھی باتوں کو اختیار کرتا ہے اور اپنے نفس کو اس پیہم جدوجہد اور کوشش کے نتیجہ میں اونچا کر دیتا اور اخلاقی زندگی بسر کرتا ہے ایک دن آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا الہام اس پر نازل ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کا قرب اس کو حاصل ہو جاتا ہے۔ زَكّٰى کے معنے اونچا کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور زَكّٰى کے معنے پاک کرنے کے بھی ہوتے ہیں اس جگہ نفس کو اونچا کرنے کے معنے چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ ایسا شخص فجور اور تقویٰ کی حِس سے کام لے کر فطرت کے مقام سے بلند ہو کر اخلاقی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود صاحبِ الہام ہو جاتا ہے۔

دوسرے معنے نفسِ کامل کے لحاظ سے اس آیت کے یہ ہیں کہ جب ہم نفسِ کامل کو تفاصیلِ فجور اور تفاصیلِ تقویٰ بتاتے ہیں اور دنیا کو ان تفاصیل کا علم ہو جاتا ہے تو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وہ انسان جو ان باتوں سے فائدہ اٹھاتا اور نفسِ کامل کی تعلیم پر چل کر تزکیہ نفس کرتا ہے اسے فلاح حاصل ہو جاتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے مقربین میں شامل ہو جاتا ہے گویا نبی کی اطاعت اور اس کے احکام کی پیروی کر کے وہ وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا کا قائم مقام ہو جاتا ہے اور اس تفصیلی الہام کا تابع بنتے ہوئے اپنے اپنے درجہ کے لحاظ سے نبی کا قمر بن جاتا ہے۔ درحقیقت ہر مومن اپنے اپنے درجہ

کے مطابق نبی کا قمر ہوتا ہے اور اپنے اپنے رنگ میں کامل تعلیم پر چلنے کے نتیجہ میں فلاح حاصل کر لیتا ہے گویا پہلے معنوں کے رو سے قَدْ اَفْلَحَ میں وحیٔ جلی کا ذکر ہے اور اَلْهَمَهَا میں وحیٔ خفی کا۔ اور دوسرے معنوں کے لحاظ سے پہلی آیت میں وحیٔ جلی کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں وحیٔ تابع کا ذکر ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا میں اس وحیٔ جلی کا ذکر ہے جو نبی پر نازل ہوتی ہے اور قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا میں وحیٔ تابع کا ذکر ہے گویا وہ نور جو پہلے باہر سے آیا تھا نبی کی تعلیم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں انسان کے اندر بھی پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۱﴾

اور جس نے اسے (مٹی میں) گاڑ دیا (سمجھو کہ) وہ نامراد ہو گیا۔

حلّ لُغات۔ خَابَ خَابَ : اَفْلَحَ کے مقابل کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہوتے ہیں ناکام ہوا۔ نامراد ہوا۔ (اقرب)

دَسّٰى : دَسٰى سے مزید ہے اور دَسٰى يَدْسُوْا (دَسْوًا وَ دَسٰى يَدْسٰى دَسْيًا) کے معنے ہیں۔ نَقِيْضُ نَمٰى وَزَكٰى یعنی یہ نَمٰى اور زَكٰى کے مقابل کے الفاظ ہیں اور اس میں ان کے الٹ معنے پائے جاتے ہیں یعنی وہ نہ بڑھا۔ اور اس میں برکت نہ ہوئی اور دَسّٰى کے معنے ہیں اَغْوَاهُ وَ اَفْسَدَهٗ۔ اس کو گمراہ کیا اور خراب کیا (اقرب) بعض نے دَسّٰىهَا کا اصل دَسَّسَهَا قرار دیا ہے اس لحاظ سے اس کا اصل دَسَّ ہوگا۔ دَسَّ الشَّيْءَ (دَسًّا) تَحْتَ التُّرَابِ کے معنے ہوتے ہیں اَدْخَلَهٗ فِيْهِ وَدَفَنَهٗ تَحْتَهٗ وَ اَخْفَاهُ کسی چیز کو زمین میں دبا دیا یا زمین کے نیچے دفن کر دیا اور دَسَّسَ کے معنے بھی یہی ہوتے ہیں۔ مگر دَسَّسَ دَسَّ سے زیادہ قوی ہوتا ہے اور مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے (اقرب) پس جب یہ لفظ کسی کے متعلق استعمال کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی طاقتوں کو ابھارتا اس نے ان کو مٹا دیا۔ اسی طرح اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اس نے ان کو مٹی میں ملا دیا۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ جس نے اس وحی کو نہ مانا وہ ناکام ہوا کیونکہ وحیٔ الٰہی فطرت کی طاقتوں کو ابھارنے کے لئے آتی ہے جس نے اِسے رد کر دیا اُس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔

اسلام کی ایک خوبی حقیقت یہ ہے کہ صحیح تعلیم ہمیشہ فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ جو تعلیم فطرت کے جذبات کو کچلنے والی ہو وہ سچی نہیں ہو سکتی کیونکہ وحی اس لئے نازل ہوتی ہے کہ نفس کو اونچا کیا جائے اس لئے نازل نہیں ہوتی کہ

اسے مارا جائے اور اس کی طاقتوں کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ اسی حکمت کے ماتحت قرآن کریم نے رہبانیت سے منع کیا ہے اور اسی حکمت کے ماتحت اس نے طیّب چیزوں کو اپنے نفس پر حرام قرار دے دینا جائز نہیں رکھا۔ دوسرے مذاہب فطرت کی بعض طاقتوں کو کچلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نیکی ہے مگر اسلام اسے نیکی قرار نہیں دیتا۔ اسلام یہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر جو قوتیں پیدا کی ہیں صرف ان کا تسویہ ہونا چاہیے اور ان کے استعمال میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ تم فطرت کو مار دو بلکہ وہ کہتا ہے تم فطرت سے اونچا مقام حاصل کرنے کی کوشش کرو کیونکہ فطرت کا علم ایک مجمل علم ہوتا ہے اور مجمل علم سے نجات نہیں ہو سکتی محض کسی کا یہ کہہ دینا کہ فلاں شخص لاہور میں رہتا ہے ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ لاہور کے فلاں محلہ اور فلاں گلی میں رہتا ہے یا فلاں موڑ پر اس کا مکان ہے تاکہ ہمیں اس کی تلاش میں کوئی دقت نہ ہو اور آسانی سے ہم اس کے مکان پر پہنچ سکیں۔

فطری استعدادوں کو ابھارنے کی تلقین پس قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کے یہ معنے ہوئے کہ اگر تم اپنی فطری طاقتوں کو ابھارتے ہو تو الٰہی مدد کو حاصل کر لیتے ہو لیکن اگر تم ان طاقتوں کو دباتے ہو اور اس چیز کو ضائع کر دیتے ہو جو تمہیں ہتھیار کے طور پر دی گئی تھی تو تم کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی شخص سفر پر جانے لگے تو ہم اسے ہتھیار کے طور پر سونٹا بھی دے دیتے ہیں اور تلوار بھی دے دیتے ہیں۔ سونٹا ہم اس لئے دیتے ہیں کہ بعض جگہ تلوار کام نہیں آ سکتی اور تلوار ہم اس لئے دیتے ہیں کہ بعض جگہ سونٹا کام نہیں آ سکتا۔ اگر راستہ میں کوئی سانپ آ جائے تو اس وقت تلوار کام نہیں دے سکتی بلکہ سونٹا کام دے گا لیکن اگر کسی دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو اس وقت سونٹا اتنا کام نہیں دے سکتا جتنا کام تلوار دے سکتی ہے یا مثلاً کسی جگہ کثرت سے کانٹے ہوں اور رستہ صاف کرنے کی ضرورت ہو تو وہاں سونٹا تو کام دے سکتا ہے مگر تلوار کام نہیں دے سکے گی۔ گویا سونٹا اور تلوار دونوں اس کے لئے ضروری ہوں گے کوئی ہتھیار کسی وقت کام آ جائے گا اور کوئی ہتھیار کسی وقت کام آ جائے گا۔ اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہتھیار کو بھی لغو سمجھ کر پھینک دے گا تو یہ یقینی بات ہے کہ جب اسے ضرورت پیش آئے گی وہ سخت تکلیف اُٹھائے گا اور اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ میں نے اپنے ہتھیار کو پھینکنے میں سخت غلطی کی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جس قدر قوتیں پیدا کی ہیں سب انسان کی ترقی اور اس کے فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں اور یہ وہ ہتھیار ہیں جن سے مختلف مقامات پر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اگر ہم ان میں سے کسی ایک ہتھیار کو بھی پھینک دیتے اور اپنی کسی قوت کو لغو قرار دے کر کچل دیتے ہیں تو ہم اپنی کامیابی کی منزل کو اپنے ہاتھ سے دور کرنے والے بن جاتے ہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے انسان میں عفو کی بھی قوت پیدا کی ہے اور انتقام کی قوت بھی پیدا کی

ہے اور یہ دونوں قوتیں ایسی ہیں جن کا برمحل استعمال دنیا کی ترقی میں بہت ممد ہوتا ہے۔ کئی مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں عفو سے کام لینا ضروری ہوتا ہے اور کئی مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں انتقام سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ نہ ہر جگہ عفو قابل تعریف ہوتا ہے نہ ہر جگہ انتقام قابل تعریف ہوتا ہے بہر حال یہ دونوں قوتیں اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری ہیں لیکن اگر ہم عفو کی قوت کو کچل دیتے ہیں یا انتقام کی قوت کو لغو قرار دے کر اس سے کام نہیں لیتے تو ہم اپنی ناکامی کے سامان آپ مہیا کرتے ہیں۔ کامیابی اسی وقت ہوسکتی ہے جب فطرت کو کچلا نہ جائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر قویٰ پیدا کئے ہیں ان کا جائز اور برمحل استعمال کیا جائے۔ جو شخص اپنی فطرت کو کچل کر یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بڑا بااخلاق ہے یا اپنی فطری استعدادوں کو مٹا کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے نیکی کا کوئی بہت بڑا مقام حاصل کرلیا ہے وہ انتہا درجہ کی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ نیکی اس بات کا نام نہیں کہ فطرت کو کچل دیا جائے یا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ طاقتوں کو ضائع کر دیا جائے بلکہ نیکی یہ ہے کہ فطرت کو بیدار کیا جائے اور ان قوتوں سے صحیح رنگ میں کام لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مضمون کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو شخص فطرت کو کچل دیتا اور اس کی قوتوں کو ضائع کر دیتا ہے وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ دوسرے معنوں کے رو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ جس شخص نے اپنی روح کو فطرتی نور سے ہدایت لے کر ابھارا وہ بامراد ہوا یعنی نورِ الہام کو پالیا مگر جس نے ایسا نہ کیا وہ نامراد رہا یعنی نہ خود اسے نور براہ راست مل سکے گا اور نہ دوسرے کے طفیل مل سکے گا کیونکہ فطرت تو ایک آئینہ تھی اور فطرت نے ہی شمس سے ری فلیکٹر کے طور پر نور لینا تھا۔ جس نے اس فطرت کو زمین میں دبا دیا اسے روشنی کہاں سے آسکتی ہے وہ تو ظلمت میں ہی گرفتار رہے گا اور ظلمت میں ہی اس جہان سے گذر جائے گا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿۱۲﴾

ثمود نے اپنی حد سے بڑھی ہوئی سرکشی کی وجہ سے (زمانے کے نبی کو) جھٹلایا۔

حلّ لُغات۔ طَغْوٰی طَغْوٰی: طَغٰی سے ہے اور یہ واوی بھی ہے اور یائی بھی۔ یعنی طَغٰی یَطْغُوْ طُغْوًا بھی استعمال ہوتا ہے اور طَغٰی یَطْغٰی طَغًا وَ طُغْیَانًا بھی استعمال ہوتا ہے۔ واوی اور یائی دونوں میں معنوں کے لحاظ سے اختلاف ہے لیکن ایک معنے طَغٰی کے ایسے ہیں جو واوی اور یائی دونوں میں مشترک ہیں اور وہ معنے ہیں جَاوَزَ الْقَدْرَ وَالْحَدَّ۔ فلاں شخص حد سے نکل گیا۔ لیکن طَغٰی یَطْغٰی جو یائی ہے اس کے بعض اور معنے بھی ہوتے ہیں

چنانچہ جب کہیں طَغَی الْکَافِرُ تو اس کے معنے ہوتے ہیں غَلَا فِی الْکُفْرِ کہ کافر شخص کفر میں حد سے بڑھ گیا۔ اور طَغٰی فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں اَسْرَفَ فِی الْمَعَاصِیْ وَالظُّلْمِ۔ وہ ظلم اور معاصی میں حد سے بڑھ گیا۔ اور طَغَی الْمَآءُ کے معنے ہوتے ہیں اِرْتَفَعَ پانی بلند ہو گیا۔ (اقرب) بعض نے کہا ہے کہ طَغْوٰی کے معنے گناہوں میں حد سے بڑھ جانے کے ہیں لیکن دراصل یہ معنے یائی کے ہیں واوی کے نہیں اور یہاں چونکہ طَغْوٰی ہے جو واوی ہے اس لئے اس کے معنے تَجَاوُزٌ عَنِ الْقَدْرِ وَالْحَدِّ کے ہی ہیں۔ یعنی اپنے اندازہ اور حد سے آگے نکل جانا۔

تفسیر۔ استعدادی طاقتوں کے کچلنے کا نتیجہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے سامنے مثال پیش کی ہے اور انہیں بتایا ہے کہ دیکھو ثمود کے پاس نُور آیا پھر جیسا کہ تم خود مانتے ہو کیونکہ وہ عرب کے نبی تھے تمہارے آباء نے اس کو ردّ کر دیا اور بوجہ اندازہ وحدود سے آگے نکل جانے کے ردّ کیا یعنی وہ سَوّٰهَا کے مصداق نہ رہے اور اعتدال کو ترک کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتدل تعلیم اُن کی برداشت سے باہر ثابت ہوئی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے دَسّٰی کا طریق بتایا ہے کہ وہ دو ہی طرح ہو سکتا ہے یا تو جتنی قوت انسان کے اندر موجود ہوتی ہے وہ اس سے آگے نکل جاتا ہے اور یا پھر جتنی قوت موجود ہوتی ہے اس سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ حد سے نکل جانا دونوں طرح ہی ہوتا ہے اس طرح بھی کہ انسان اگلی طرف کو چلا جائے اور اس طرح بھی کہ پچھلی طرف کو آجائے۔ ایسے کاموں سے فطرت کا نور مارا جاتا اور اس کی قوتیں کچلی جاتی ہیں۔ فرماتا ہے ثمود کی بھی یہی کیفیت تھی وہ لوگ اپنے کاموں میں حد سے آگے نکل گئے تھے خدا تعالیٰ نے ایک وسطی تعلیم ان کے لئے نازل کی تھی مگر وہ اس درمیانی خط پر کھڑے ہونے کی بجائے کبھی ادھر چلے جاتے اور کبھی ادھر چلے جاتے۔ درمیانی راستہ جو پل صراط ہوتا ہے اور جس پر ہر مومن کو اس دنیا میں چلنا پڑتا ہے اُس راستہ پر وہ نہیں چلتے تھے بلکہ یا دائیں طرف کو نکل جاتے تھے یا بائیں طرف کو نکل جاتے، اعتدال کو انہوں نے ترک کر دیا تھا۔

اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ۝۱۳

جبکہ ان (کی قوم) میں سے سب سے بڑا بدبخت (اس کی مخالفت کے لئے) کھڑا ہوا۔

تفسیر۔ مسلمانوں کی منظم مخالفت کی پیشگوئی اس آیت میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف سورۃ الغاشیہ کی آیت عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ میں اشارہ کیا گیا تھا کہ کفار ایک منظّم مخالفت شروع کرنے والے ہیں

اب اس سورۃ میں اسی قسم کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا ہے کہ جس طرح ثمود نے باقاعدہ لیڈر مقرر کر کے مخالفت کی تھی اسی طرح کفار کرنے والے ہیں چنانچہ اس اَشْقَى النَّاس نے جس طرح حضرت ثمودؑ کو تبلیغ سے روکا تم بھی تھوڑے دنوں تک ایسے ہی منصوبے کرو گے اور اسلام کو اپنی مجموعی قوت سے مٹانے کی کوشش کرو گے مگر یاد رکھو جس طرح انہیں ناکامی ہوئی اور وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بن گئے اسی طرح تم بھی اس مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ﴿۱۴﴾

تب ان (یعنی ثمود کے آدمیوں) کو اللہ کے رسول نے کہا کہ اللہ (کے دین) کی (خدمت کے لئے وقف) اونٹنی کو (آزاد پھرنے سے) اور اسے (گھاٹوں پر) پانی پلانے سے مت روکو۔

تفسیر۔ یہ ایک نہایت لطیف مثال ہے مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے اس کی حکمت کو نہیں سمجھا اور انہوں نے خیال کر لیا ہے کہ وہ ناقہ اپنے اندر کوئی خاص عظمت اور شان رکھتی تھی جس کی کونچیں کاٹنے پر ثمود کی قوم اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بن گئی۔ اسی لئے بعض مفسرین نے اس ناقہ کے متعلق یہ عجیب بات لکھ دی ہے کہ وہ پہاڑ سے پیدا ہوئی تھی (فتح البیان سورۃ الاعراف زیر آیت وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ ....) عام اونٹنیوں کی طرح نہیں تھی حالانکہ نبی کی موجودگی میں یہ ہو ہی کس طرح سکتا تھا کہ نبی کو دکھ دینے کی وجہ سے تو قوم پر عذاب نازل نہ ہو اور ناقہ کی کونچیں کاٹنے پر عذاب نازل ہو جائے!

اونٹنی کو آزاد پھرنے دینے کے حکم کا اصل مقصد اصل بات یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام عرب میں مبعوث ہوئے تھے اور عرب میں اونٹوں پر سواری کی جاتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام بھی اپنی اونٹنی پر سوار ہوتے اور ادھر ادھر تبلیغ کے لئے نکل جاتے۔ لوگ کھلے طور پر حضرت صالحؑ کا مقابلہ کرنے سے ڈرتے تھے کیونکہ ان کے رشتہ دار موجود تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے صالحؑ کو کوئی تکلیف پہنچائی تو اس کے رشتہ دار ہم سے بدلہ لینے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے مگر چونکہ وہ تبلیغ بھی پسند نہیں کرتے تھے اس لئے وہ بعض اور طریق آپ کو دکھ پہنچانے کے لئے اختیار کر لیتے تھے۔ انہی میں سے ایک طریق یہ تھا کہ جب حضرت صالح علیہ السلام تبلیغ کے لئے اردگرد کے علاقوں میں نکل جاتے تو کسی جگہ کے لوگ کہتے کہ ہم ان کی اونٹنی کو پانی نہیں پلائیں گے، کسی جگہ کے لوگ کہتے کہ ہم کھانے کے لئے کچھ نہیں دیں گے۔ ان کی غرض یہ تھی کہ جب انہیں اونٹنی کے لئے پانی اور چارہ وغیرہ نہ ملا تو یہ خود بخود

اس قسم کے سفروں سے رک جائیں گے اور تبلیغ میں روک پیدا ہو جائے گی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ تم اس ناقہ کو آزاد پھرنے دو اور اس کے پانی پینے میں روک نہ بنو کیونکہ اس طرح میری تبلیغ میں روک واقعہ ہو جائے گی۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ تم مجھے تو اپنے پاس بے شک نہ آنے دو مگر یہ اونٹنی آئے تو اسے پانی پلا دینا۔ اُنہیں اونٹنی سے کوئی دشمنی نہیں تھی انہیں اگر دشمنی تھی تو حضرت صالح علیہ السلام سے۔ اور وہ کہتے تھے کہ وہ اونٹنی پر سوار ہو کر اردگرد کے علاقوں میں ایک شور پیدا کر دیتے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کی طرف توجہ دلاتے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ چیز تھی جو ان کی طبائع پر سخت گراں گزرتی تھی اور آخر اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ جب حضرت صالحؑ باہر نکلتے تو ان کی اونٹنی کو وہ کہیں پانی نہ پینے دیتے اس پر حضرت صالح علیہ السلام نے اظہارِ ناراضگی کرتے ہوئے کہا نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا کہ یہ طریق درست نہیں، تم میری اس ناقہ کو آزاد پھرنے دو اور اس کے پانی میں روک نہ بنو یعنی تم مختلف ذرائع سے میری تبلیغ میں روک بن رہے ہو اپنے اس طریق کو چھوڑ و اور مجھے آزاد پھرنے دو تا کہ میں خدا تعالیٰ کا پیغام سب لوگوں تک پہنچاتا رہوں۔

میں نے بعض دفعہ گھوڑے کی سواری کرتے ہوئے خود تجربہ کیا ہے کہ جب کسی احمدی گاؤں کے قریب سے گذروں تو وہاں کے لوگ بعض دفعہ میرے گھوڑے کی باگ پکڑ لیتے ہیں اُن کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں تو گھوڑے سے اتر پڑوں اور گھوڑا ان کے حوالے کر دوں تا کہ وہ اسے اپنے گاؤں میں لے جائیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں خود تھوڑی دیر کے لئے ان کے گاؤں میں چلوں۔ اسی طرح ثمود کی یہ غرض نہیں تھی کہ وہ ناقہ کو روکیں بلکہ ان کی غرض یہ تھی کہ وہ حضرت صالح علیہ السلام کو تبلیغ سے روکیں اور جب حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے کہا کہ میری اس ناقہ کو چھوڑ دو تو ان کا بھی یہ مطلب نہیں تھا کہ میرے ساتھ تو جیسا چاہو سلوک کرو مگر اس ناقہ کو کچھ نہ کہو بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ تم میری تبلیغ میں روک مت بنو اگر تم اسی طرح میری اونٹنی کو پانی پینے سے روکتے رہے تو میری تبلیغ رک جائے گی اور علاقوں کے علاقے ہدایت پانے سے محروم رہ جائیں گے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ۝

اس پر انہوں نے اس (رسول) کو جھٹلایا۔ پھر اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹ دیں۔

حلّ لُغات۔ عَقَرُوْا عَقَرُوْا : عَقَرَ سے جمع کا صیغہ ہے اور عَقَرَ الْاِبِلَ کے معنے ہوتے ہیں قَطَعَ

قَوَائِمَهَا بِالسَّيْفِ یعنی اس نے اونٹوں کی کونچیں کاٹ دیں (اقرب) پس عَقَرُوْهَا کے معنے ہوں گے اس کی کونچیں کاٹ دیں۔

تفسیر۔ حضرت صالحؑ کے سمجھانے کے باوجود ثمود نے ان کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ انہوں نے اسے جھٹلایا اور ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں یعنی اپنے ارادوں کا انہوں نے علی الاعلان اظہار کر دیا اور کہہ دیا کہ تم خواہ کچھ کہو ہم تمہیں تبلیغ نہیں کرنے دیں گے۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝۱۵

جس پر ان کے رب نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاکت نازل کی اور اس (قوم) کو (مار کر زمین کے) برابر کر دیا۔

حلّ لُغات۔ دَمْدَمَ دَمْدَمَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں اَلْزَقَهٗ بِالْاَرْضِ اسے زمین کے ساتھ پیوست کر دیا۔ دَمْدَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کے معنے ہوتے ہیں اَهْلَكَهُمْ۔ خدا تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اور دَمْدَمَ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں كَلَّمَهٗ مُغْضِبًا۔ اُس سے غصہ کے ساتھ کلام کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ عذاب کے متعلق فَسَوّٰىهَا کہنے سے انتہائی تباہی کی طرف اشارہ فرماتا ہے چونکہ انہوں نے ہمارے رسول کی بات نہ مانی اس لئے ہم نے ان پر عذاب نازل کیا اور عذاب بھی ایسا سخت کہ فَسَوّٰىهَا خدا نے انہیں زمین کے ساتھ ملا دیا اور ان کے چھوٹوں اور بڑوں کو اس طرح تباہ کیا کہ ان کا نشان تک دنیا میں نہ رہا۔

قرآن کریم اپنے کلام میں کیسی بلاغت کی شان رکھتا ہے کہ پہلے فرمایا تھا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ہم نے انسان کو معتدل القویٰ بنایا ہے اور خود انسانی نفس اس امر پر شاہد ہے کہ اسے کوئی نور آسمان سے ملنا چاہیے اب فرماتا ہے چونکہ انہوں نے اس تسویہ کی قدر نہ کی اور ہمارے احکام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس لئے ہم نے ان کا دوسری طرح تسویہ کر دیا کہ ان کا نشان تک دنیا سے مٹا دیا۔ یہ بلاغت کا کمال ہے کہ جس چیز کا انہوں نے انکار کیا تھا عذاب کے معنوں میں بھی وہی لفظ لے آیا انہوں نے تسویۂ نفس سے انکار کیا تھا اللہ تعالیٰ نے وہی لفظ اس جگہ استعمال کر دیا اور فرمایا کہ چونکہ انہوں نے تسویہ سے انکار کیا تھا ہم نے ان کا اس رنگ میں تسویہ کر دیا کہ ان کا ملک تباہ کر دیا، ان کی عمارتیں گر گئیں، قوم ہلاک ہو گئی اور اتنا بڑا زلزلہ آیا کہ ان کا نشان تک باقی نہ رہا۔

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۶﴾

ع ۱ / ۱۶

اور وہ (اسی طرح) ان (مکہ والوں) کے انجام کی بھی پروانہیں کرے گا۔

حلّ لُغات۔ **عُقْبٰی** عُقْبٰی کے معنے ہوتے ہیں جَزَآءُ الْاَمْرِ ۔ کسی کام کی جزا۔ اور عُقْبٰی کے معنے اٰخِرُ کُلِّ شَیْءٍ کے بھی ہوتے ہیں یعنی چیز کا آخری حصہ۔ (اقرب)

تفسیر۔ **وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا میں کفار مکہ کی تباہی کی طرف اشارہ** عُقْبٰهَا میں هَا کی ضمیر دَمْدَمَ کی طرف جاتی ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب دَمْدَمَ نازل کرنے کا وقت آتا ہے اور کوئی قوم کلی ہلاکت کی مستحق ہوجاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتا کہ ان کے متعلقین کا کیا حال ہوگا یا یہ کہ اس سزا کا نتیجہ کیسا خطرناک نکلے گا۔ بعض دفعہ ساری قوم ہلاک نہیں ہوتی بلکہ اس کا کچھ حصہ بچ رہتا ہے جو دنیا میں انتہاء طور پر ذلیل ہوجاتا ہے مگر فرماتا ہے جب ہماری طرف سے کسی قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ ہوجاتا ہے تو پھر ہم اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس قوم کے بقیہ افراد کیا کیا تکالیف اٹھائیں گے۔ جب قوم کی اکثریت خدا تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوجاتی ہے اور خاموش رہنے والے گو مقابلہ نہیں کرتے مگر نبی کی تائید بھی نہیں کرتے تو وہ بھی اکثریت کے ساتھ ہی تباہ و برباد کر دیئے جاتے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرتا ہے یا اندھا دھند عذاب نازل کر دیتا ہے بلکہ جس قوم کے استیصال کا وہ فیصلہ کرتا ہے انصاف کے ماتحت کرتا ہے اور جب کہ وہ خود اپنے انجام کو نہیں دیکھتی تو اللہ تعالیٰ اس کے انجام کو کیوں دیکھے۔ اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ کفار مکہ بھی ثمود کی طرح نبی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح ثمود کو تباہ کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے ایک عام عذاب نازل کیا تھا اسی طرح وہ اہل مکہ پر بھی ایک عام عذاب نازل کرے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ثمود کی قوم بہ حیثیت قوم تباہ ہوگئی تھی مگر مکہ والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کے بعد بھی باقی رہے۔ لیکن اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ بعض دفعہ تباہی جسمانی نہیں روحانی ہوتی ہے۔ ثمود جسمانی طور پر کلی ہلاکت میں مبتلا ہوئے اور مکہ والے مذہبی طور پر۔ چنانچہ ان کے مذہب اور طور و طریق کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

سُوْرَۃُ الَّیْلِ مَکِّیَّۃٌ

سورۂ لیل۔ یہ سورۃ مکّی ہے۔

وَھِیَ اِحْدٰی وَعِشْرُوْنَ اٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اوراس کی بسم اللہ کے سوا اکیس ۲۱ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ الّیل مکی ہے یہ سورۃ بقول مفسرین جمہور کے نزدیک مکّی ہے (فتح البیان سورۃ الّیل ابتدائیۃ)۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جمہور کا لفظ جو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس کے کبھی کبھی تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ اکثر کی رائے یہ ہے لیکن کبھی کبھی یہ لفظ صرف حسن کلام کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔ درحقیقت سب تو الگ رہے اکثر بھی اس مسئلہ سے متفق نہیں ہوتے لیکن مصنف لکھ دیتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک وہ اس طرح ہے اور اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اور ہمارے ہم خیال یُوں کہتے ہیں۔ جمہور کے معنے اصطلاحی طور پر عظیم الشان کثرت کے ہیں اور جب یہ لفظ واقعہ میں عظیم الشان کثرت کے معنے رکھتا ہو اور صحیح طور پر انہی معنوں میں استعمال ہو تو بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ صحابہ کی بڑی اکثریت یا تابعین یا تبع تابعین کی غالب اکثریت فلاں معنوں پر قائم تھی تو یہ امر واقعہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے لیکن جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں کبھی کبھی جمہور کے معنے ضرورتاً یہ بھی لے لئے جاتے ہیں کہ مصنف اور اُس کے ہم خیالوں کا کیا خیال ہے۔ بعض دفعہ ایک معنوں کی رَو چل جاتی ہے۔ ایک شخص کسی آیت کے ایک معنے لکھتا ہے پھر اس سے دوسرا نقل کرتا ہے اس کے بعد اس سے تیسرا نقل کرتا ہے پھر چوتھا اور پھر پانچواں نقل کرتا ہے۔ اس صورت میں جمہور کے معنے صرف اتنے ہی ہوتے ہیں کہ پانچ دس کتابوں میں ایک ہی معنے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے بعض دفعہ جمہور کا لفظ لکھ کر صحابہؓ کی ایک لسٹ دے دی جاتی ہے کہ یہ یہ صحابی ان معنوں کے خلاف ہیں۔ گویا جمہور سے اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کے معنے لے کر چونکہ لوگوں نے اُن کو پے در پے نقل کرنا شروع کر دیا اس لئے ہم کہہ رہے ہیں کہ جمہور کے نزدیک اس آیت کے یہی معنے ہیں یا دوسرے الفاظ میں جمہور سے ان کی مراد نقّالوں کی اکثریت ہوتی ہے نہ اُن لوگوں کی اکثریت جو صحابہؓ ہیں یا تابعین ہیں یا تبع تابعین ہیں۔ لیکن اس سورۃ کے متعلق جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ جمہور کے نزدیک مکی ہے یہ

اصلی معنوں میں ہے کیونکہ کسی صحابی کا قول مقابل میں نہیں آتا۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس کو مدنی بھی کہا ہے مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دونوں اس کو مکی قرار دیتے ہیں (فتح البیان سورۃ البیان ابتدائیة) اور چونکہ یہ دو جلیل القدر صحابہؓ اس سورۃ کے مکی ہونے کی تائید میں ہیں اور اس کے خلاف کسی صحابی کا قول ثابت نہیں اس لئے ہم جمہور کے معنے یہاں غالب اکثریت کے ہی قرار دیں گے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں یہ سورۃ مکی بھی ہے اور مدنی بھی (روح المعانی زیر سورۃ الّیل)۔ درحقیقت یہ ایسے ہی لوگوں کا خیال ہوتا ہے جو مضامین سے سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ کیا کرتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مضامین کی بناء پر بھی فیصلہ کیا جاسکتا ہے بلکہ میں نے خود کئی مقامات پر مضامین سے استنباط کر کے بتایا ہے کہ ان مضامین کی بناء پر فلاں فلاں روایات کو ترجیح حاصل ہے مگر یہ درست نہیں ہوتا کہ کوئی شخص محض قیاس سے فیصلہ کر دے۔ قیاس کسی واقعہ یا روایت کی تائید میں تو مفید ہوسکتا ہے مگر تاریخ کے مقابلہ میں صرف قیاس پر اعتماد درست نہیں ہوتا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایک شخص پوری کنہ تک نہ پہنچ سکے اور وہ عقلی طور پر کوئی قیاس کر لے۔ مثلاً مضمون سے قیاس کر لیا اور ایک نتیجہ نکال لیا مگر یہ کہنا کہ ضروری ہے کہ فلاں قسم کا مضمون مدنی سورتوں میں ہی پایا جائے یا مکی سورتوں میں ہی پایا جائے یہ وہی غلطی ہے جس میں یوروپین مصنفین مبتلا ہوئے ہیں۔ مثلاً تاریخ کہتی ہے کہ فلاں سورۃ مکی ہے مگر وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں یہ سورۃ تو مدنی ہے کیونکہ اس میں فلاں فلاں ذکر پایا جاتا ہے یا تاریخ کسی سورۃ کو مدنی کہتی ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ سورۃ تو مکی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں فلاں فلاں مضمون آتا ہے حالانکہ یہ صرف ان کا قیاس ہوتا ہے اور قیاس تاریخ کے مقابل پر نہیں لایا جاسکتا۔ ہاں اگر تاریخ کسی سورۃ کو مکی کہتی ہو اور اس کی تائید میں ہم کوئی قیاس لے آئیں تو یہ درست ہوسکتا ہے یا تاریخ کسی سورۃ کو مدنی کہتی ہو اور ہم اس کی تائید میں کسی قیاس سے بھی کام لے لیں تو یہ جائز ہوگا۔ بہر حال مضمون سے قیاس کرنا دلیل مرجّح تو بن سکتا ہے بالذات دلیل نہیں قرار پاسکتا۔ چنانچہ اس سورۃ کے متعلق برخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے مضمون کی وجہ سے بغیر کسی تاریخی شاہد کے اسے مدنی قرار دیا ہے میں یہ استنباط کرتا ہوں کہ یہ سورۃ مکی ہے اور وہ اس طرح کہ اس سورۃ سے پہلی دو سورتیں اور اس کے بعد کی دو سورتیں مکی ہیں اور ان دونوں سورتوں سے مضمون کے لحاظ سے یہ سورۃ بہت قریبی مشارکت رکھتی ہے اور چونکہ تاریخی شہادت بھی اس امر کی ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ اس لئے میری یہ دلیل دلیل کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ تاریخی شہادت کی تائید میں ہے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ پہلی چند سورتوں میں مسلسل ایک خاص رنگ میں صدقہ وخیرات اور غریبوں کی خبر گیری

کا ذکر کیا گیا ہے۔ایک ذکر تو ایسا ہوتا ہے جو اپنے اندر کوئی خصوصیت نہیں رکھتا صرف عمومی طور پر ایک بات کہہ دی جاتی ہے مگر یہ وہ سورتیں ہیں جن کے تمام مضامین اس رنگ میں چلتے ہیں کہ صدقہ دینے والے یا نہ دینے والے، غرباء کی ضروریات پر خرچ کرنیوالے یا نہ خرچ کرنے والے قومی لحاظ سے اپنی اپنی حالت کے مطابق ترقی پا جاتے ہیں یا تباہ ہو جاتے ہیں۔یہی مضمون اس سورۃ میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا اِنِّيْ لَاَقُوْلُ اِنَّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ نَزَلَتْ فِي السَّمَاحَةِ وَالْبُخْلِ (فتح البیان سورۃ الیل ابتدائیۃ) یعنی میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ یہ سورۃ سخاوت اور بخل کے مضمون کے بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔پس جب ایک روایت موجود ہے جو تاریخی لحاظ سے اس سورۃ کو مکی قرار دیتی ہے تو دلیل مرجّح کے طور پر اس سورۃ کی اندرونی شہادت بھی ان لوگوں کے ردّ میں پیش کی جا سکتی ہے جو اس کو مدنی کہتے ہیں اور ہم یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ نہ صرف روایات اس کو مکی قرار دیتی ہیں بلکہ اس سورۃ کا مضمون بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ روایت کے خلاف ہم کسی قیاس کو پیش کر دیں سوائے اس کے کہ وہ قیاس بعض دوسری روایتوں پر مبنی ہو مثلاً بعض دفعہ قرآن کریم میں ایک مضمون آتا ہے جسے ہم لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں اب اگر اُس مضمون کے متعلق روایات میں اختلاف پایا جاتا ہو تو لازماً ان روایات کو ترجیح حاصل ہوگی جن کی تائید قرآنی مضمون سے بھی ہوتی ہو۔ورنہ واقعات کے بارہ میں محض قیاس آرائی ثابت شدہ تاریخی روایات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

سر میور کا خیال ہے کہ یہ سورۃ بالکل ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔پادری ویری لکھتے ہیں کہ یہ سورۃ ہے تو ابتدائی مگر تبلیغ عامہ کے زمانہ کی ہے یعنی تیسرے چوتھے یا پانچویں سال کی ہے کیونکہ اس میں منکروں کے لئے عذاب کی خبر ہے (A Comprehensive Commentary On The Quran by wherry, vol:4 p:251) پادری وہیری کا یہ خیال میرے نزدیک درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس جگہ انذار عام قسم کا نہیں بلکہ اس میں خاص اور قریب میں آنے والے واقعات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

جابر بن سمرہؓ سے بیہقی نے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ظہر اور عصر میں وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى اور اسی قسم کی سورتیں پڑھا کرتے تھے (فتح البیان سورۃ الیل ابتدائیۃ)۔

ترتیب اس سورۃ کا مضمون بھی وہی ہے جو پہلی سورتوں میں بیان ہوتا آ رہا ہے یعنی اس میں بھی ترقی اسلام کا ذکر ہے پہلی سورتوں اور اس سورۃ کے مضمون میں فرق صرف یہ ہے کہ اس سے پہلی سورۃ میں یہ نقطۂ نگاہ بیان کیا گیا تھا کہ ایک نظام کامل کے لانے والے کے بغیر کعبہ کی تعمیر کی غرض پوری نہیں ہوتی اور ایسے ہی وجود کے آنے سے

قوم کو ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس سورۃ میں بھی وہی مضمون ہے مگر اس میں زور معلّم کی زندگی پر اس قدر نہیں دیا گیا جس قدر کہ متعلّمین اور ان کے مخالفوں کی زندگیوں کے فرق پر دیا گیا ہے۔ پہلی سورۃ میں یہ مضمون تھا کہ اچھے معلم کے بغیر قوم ترقی نہیں کر سکتی اور اب یہ مضمون ہے کہ اچھے معلم کو اگر اچھا متعلم مل جائے تو وہ دنیا کی کایا پلٹ دیتا ہے اور یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جو شاگرد ملے ہیں وہ ایسے اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ ان کی زندگیوں کو دیکھ کر انسان کے دل میں یہ مایوسی پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ عرب کی حالت کیوں کر پلٹا کھائے گی۔ اللہ تعالیٰ کفار مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مل رہے ہیں ان کی زندگیاں تمہاری زندگیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ دنیا میں اچھا استاد بڑا کام کر جاتا ہے اور لائق شاگرد بھی بڑا کام کر جاتا ہے لیکن جہاں لائق استاد اور لائق شاگرد مل جائیں وہاں تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کا معاملہ ہو جاتا ہے۔ اگر اچھے استاد کو بُرے شاگرد ملیں تو اس کا کام اس قدر نہیں چمکتا اور نہ نالائق استاد کے اچھے شاگرد زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔ مگر یہاں تو اچھے استاد کو اچھے شاگرد بھی مل گئے ہیں پس یہ دینِ محمدیؐ کے غلبہ کی ایک بیّن علامت ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھو وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓی صفحہ ۶۸)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ﴿۲﴾

(مجھے) قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانک لے۔

تفسیر۔ اس سے پہلی سورۃ میں فرمایا تھا وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا یعنی رات کو ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ وہ سورج کو ڈھانپ لیتی ہے مگر اس سورۃ میں يَغْشٰى کا کوئی مفعول بیان نہیں ہوا جس سے یہ پتہ لگے کہ غَشْیٌ کا عمل کس چیز پر ہوا ہے بلکہ اس کو بغیر کسی قید کے بیان کیا گیا ہے پس معلوم ہوا کہ يَغْشٰى کے معنے اس سورۃ میں زیادہ وسیع لئے گئے ہیں۔ پہلی سورۃ میں تاریکی کا صرف وہ پہلو مراد تھا جو سورج کے ڈھانپنے سے ظاہر ہوتا ہے تاریکی کے دوسرے نتائج کی طرف اشارہ نہ کیا گیا تھا مگر اس جگہ اس کے علاوہ اور معانی بھی لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ الفاظ کے لحاظ سے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ رات کی تاریکی کی وجہ سے سورج ہی نہیں پوشیدہ ہوا

بلکہ دوسری اشیاء بھی اوجھل ہوگئی ہیں۔

قرآن کریم میں ایک جگہ یہ مضمون آتا ہے کہ رات دن کو ڈھانپتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ (الاعراف:۵۵) اسی طرح یہ بھی آتا ہے کہ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (الفلق:۴) یعنی ہم پناہ مانگتے ہیں تاریک رات سے جب وہ ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے اور یہ بھی آتا ہے کہ رات سورج کو ڈھانپ لیتی ہے جیسا کہ اس سے پہلی سورۃ میں ہی فرمایا تھا وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰهَا چونکہ ان تینوں معنوں کی آیت زیر تفسیر متحمل ہوسکتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم غور کریں کہ یہ تینوں معنے ہی اس جگہ پائے جاتے ہیں یا کسی دوسری دلیل کی وجہ سے ان میں سے صرف ایک یا دو معنے مراد ہیں ان کے سوا معنے مراد نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سورۃ میں ایک ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جو اس کے معنوں کو محدود کر دیتا ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ صرف یہی معنے مراد ہیں کہ جب رات ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے۔ وہ قرینہ یہ ہے کہ یہاں وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی کے بعد وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی بیان ہوا ہے اگر وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی کی آیت وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی سے پہلے ہوتی تو اس آیت کے معنے کرتے ہوئے دن کو ڈھانکنے یا سورج کو ڈھانکنے کا مفہوم زیادہ قرینِ قیاس ہوتا مگر چونکہ یہاں وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی کی آیت کے بعد وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی کی آیت بیان ہوئی ہے اس لئے یہ قرینہ اس بات کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ یہاں دن یا سورج کی بجائے دوسری چیزوں کو ڈھانکنے کا مفہوم غالب طور پر پایا جاتا ہے پس بجائے اس کے کہ ہم تینوں معنے یہاں مراد لیں اُس قرینہ کی وجہ سے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس آیت کے صرف یہی معنے ہوں گے کہ ہم رات کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ وہ ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے یعنی انسان۔ جانور اور دوسری چیزیں سب اندھیرے تلے آجاتی ہیں۔

وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی ﴿۳﴾

اور دن کی جب وہ خوب روشن ہوجائے۔

تفسیر۔ اس آیت اور سورۃ الشّمس کی آیت وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا میں ایک فرق ہے وہاں نَہَار کے بعد اِذَا جَلّٰهَا کے الفاظ آتے ہیں مگر یہاں فرماتا ہے وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی وہاں یہ ذکر تھا کہ زمین سورج کے سامنے آکر اس کو ظاہر کر دیتی ہے اور یہاں یہ ذکر ہے کہ سورج کی روشنی سے مستفیض ہوکر دن روشن ہوگیا۔ وہاں تمام اشارے اس بات کی طرف تھے کہ استاد اپنے فن میں کامل ہے وہ دنیا کو اپنے فیوض سے مستفیض کردے گا گویا وہاں

استاد کے وجود پر زور دیا گیا ہے مگر یہاں شاگردوں کی قابلیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ خواہ یہ کہہ دو کہ استاد نے شاگرد کو پڑھایا یا یہ کہہ دو کہ شاگرد نے استاد سے پڑھا۔ اس سے کلام میں کوئی خاص فرق نہیں پڑسکتا سوائے اس کے کہ جب ہم کہتے ہیں استاد نے پڑھایا تو اس میں زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ استاد نے محنت کی اور اس نے توجہ سے اپنے فرض کو ادا کیا اور جب ہم کہتے ہیں شاگرد نے استاد سے پڑھا تو اس میں زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ شاگرد نے بھی محنت سے کام لیا۔ اسی طرح وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى میں زیادہ زور اس بات پر ہے کہ دن روشن ہو گیا یعنی جو زمین کی نسبت رکھنے والا یا شاگرد کی نسبت رکھنے والا وجود ہے اس کی قابلیتوں پر زور دیا گیا ہے مگر وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا میں سورج یعنی استاد کی قابلیتوں پر زور دیا گیا ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اس سورۃ میں گو مثال رات اور دن کی دی گئی ہے جیسے پہلی سورۃ میں رات اور دن کی مثال دی گئی تھی مگر مفہوم الگ الگ ہے۔ پہلی سورۃ میں دن کی روشنی کا پہلے ذکر کیا تھا اور اس کے مقابل پر شمس کا بھی پہلے ذکر تھا۔ چنانچہ پہلے نمبر پر وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا کہا گیا تھا اور اس کے مقابل میں وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا کا ذکر تھا۔ دوسرے نمبر پر قمر کا ذکر تھا جیسا کہ فرمایا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا اور اس کے مقابل میں وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا کا ذکر تھا۔ گویا شمس کے مقابلہ میں نہار کو رکھا گیا تھا اور قمر کے مقابلہ میں لیل کو۔ پھر جس طرح شمس کو پہلے بیان کیا تھا اور قمر کو بعد میں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نہار کو پہلے رکھا تھا اور لیل کو بعد میں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں شمسِ نبوت اور قمرِ رسالت کا ذکر تھا۔ افاضہ اور استفاضہ کا مضمون بیان کیا گیا تھا اور اس امر کا ذکر کیا گیا تھا کہ فلاں نے نور کا افاضہ کیا اور فلاں نے اُس سے فیض حاصل کیا۔ اس مناسبت کی بناء پر پہلے نور اور دن کا ذکر تھا اور بعد میں رات اور قمر کا ذکر تھا مگر یہاں رات کا ذکر پہلے ہے اور دن کا بعد میں۔ کیونکہ اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کمالات کا ذکر اصل مطلوب نہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور کفار کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ پس بوجہ کفر کے مقدم اور کثیر ہونے کے رات کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور دن کا بوجہ مسلمانوں کے موخر الزمان اور تھوڑے ہونے کے بعد میں کیا گیا ہے۔

پہلی سورۃ میں یہ ذکر تھا کہ دنیا کو منور کرنے کے لئے ہم نے ایک روحانی سورج افقِ آسمان پر پیدا کیا ہے دنیا اس سورج کی روشنی کو خواہ کس قدر چھپانا چاہے اب یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ وہ اس روشنی کو روک سکے یا اس نور کو پھیلنے نہ دے۔ یہ روشنی اب بڑھے گی اور بڑھتی چلی جائے گی یہاں تک کہ ساری دنیا کو ڈھانپ لے گی۔ مگر ایک لمبا عرصہ گذرنے کے بعد پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں یہ سورج لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا زمین والے اپنی پیٹھ موڑ لیں گے تاریکی چھا جائے گی اور روشنی جاتی رہے گی اس وقت اللہ تعالیٰ پھر ایک قمر پیدا کرے گا جو

اس شمس سے اکتسابِ نور کر کے دنیا کو منور کر دے گا۔ پس چونکہ وہاں اسلام کے زمانہ سے بات شروع کی گئی تھی طبعی طور پر شمس اور نہار کا ذکر پہلے ہونا چاہیے تھا مگر یہاں کفر و اسلام کا مقابلہ ہے اور کفر چونکہ پہلے تھا اور اسلام بعد میں آیا اس لئے لَیْل کا پہلے ذکر کیا گیا اور نَہَار کا بعد میں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ کفر چونکہ اُس زمانہ میں کثیر تھا اور مسلمان اس زمانہ میں قلیل التعداد تھے اس مناسبت کی بناء پر بھی اللہ تعالیٰ نے لَیْل کا ذکر پہلے کیا اور نَہَار کا بعد میں۔ اور اس طرح یہ پیشگوئی کی کہ رات کی حالت جو تم پر طاری ہے وہ اب دور ہونے والی ہے اس کے بعد دن کی حالت آئے گی یا اس رات کے نتیجہ میں جو جو گمراہیاں اور خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں ساکنینِ نہار اب ان کو دور کرنے والے ہیں۔ (مزید تفصیل اس کی اگلی آیت کے نیچے آئے گی)

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰٓى ۙ﴿۴﴾

اور نر و مادہ کی پیدائش کی۔

تفسیر۔ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى **کی قرأت کے متعلق ایک اختلاف** اس آیت کے متعلق حضرت ابوالدرداء کو سخت غُلُوّ تھا۔ ان کے خیال میں مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى کی جگہ اس آیت میں وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثٰى کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ علقمہ سے ابن جریر نے روایت کی ہے کہ میں ایک دفعہ شام گیا تو ابوالدرداء قافلہ میں آئے اور پوچھا کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو عبداللہ بن مسعودؓ سے قرأت پڑھا ہوا ہو؟ اس پر لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس پر میں نے بھی کہا کہ ہاں میں نے ان سے قرآن پڑھا ہے اس پر انہوں نے کہا کہ آپ نے عبداللہ بن مسعود کو یہ آیت کس طرح پڑھتے سنا ہے میں نے بتایا کہ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى۔ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى۔ وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثٰى۔ اس پر ابوالدرداء نے کہا کہ میں نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے۔ اور یہاں کے لوگ چاہتے ہیں کہ میں وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى پڑھوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا میں ان کے پیچھے نہیں چلوں گا (صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا، باب ما یتعلّق بالقراءات)۔ یہ مضمون بتغیّر الفاظ و مطالب مختلف راویوں سے مختلف کتبِ حدیث میں حضرت ابوالدرداء سے مروی ہے۔

قرآن مجید کے بعض الفاظ کی مختلف قرأتیں اس بارہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ قرأتوں کا فرق شروع زمانہ سے چلا آیا ہے۔ پوری واقفیت نہ رکھنے والے مسلمان بعض دفعہ ایسی روایتوں سے گھبرا جاتے ہیں اور وہ خیال کرتے

ہیں کہ اگر یہ روائتیں درست ہیں تو پھر ہمارا یہ کہنا درست نہیں ہوسکتا کہ قرآن کریم کامل طور پر محفوظ ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ مگر ایسا نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا۔ اس لئے کہ شروع زمانہ سے ہی نسخ کے منکر اور حفاظتِ قرآنیہ کے قائل قرأت کے اس فرق کو تسلیم کرتے چلے آئے ہیں مگر باوجود اس فرق کے ان کے نزدیک یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ایک قرأت دوسری کو منسوخ نہیں کرتی اور دوسرے مضمون میں فرق نہیں ڈالتی۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک قرأت ایسا مضمون بیان کرے جس کی دوسری قرأت حامل نہ ہو سکے ہاں بعض دفعہ وہ مضمون کو وسیع کر دیتی اور اس کی مصدق ہوتی ہے۔ دراصل بعض زبانوں کے فرق کی وجہ سے یا بعض مضامین کو نمایاں کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو سبعۃ احرف پر نازل کیا ہے یعنی اس کی سات قرأتیں ہیں۔ ان قرأتوں کی وجہ سے یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ قرآنِ کریم میں کوئی اختلاف ہے بلکہ اسے زبانوں کے فرق کا ایک طبعی نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ بسا اوقات ایک ہی لفظ ہوتا ہے مگر ایک ہی ملک کے ایک حصہ کے لوگ اسے ایک طرح بولتے ہیں اور اسی ملک کے دوسرے حصہ کے لوگ اسے اور طرح بولتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لفظ بدل گیا ہے یا اُس لفظ کا مفہوم تبدیل ہو گیا ہے۔ لفظ بتغیر قلیل وہی رہے گا اُس لفظ کے معنے بھی وہی رہیں گے صرف اس وجہ سے کہ کوئی قوم اُس لفظ کو صحیح رنگ میں ادا نہیں کر سکتی وہ اپنی زبان میں ادا کرنے کے لئے اس کی کوئی اور شکل بنا لے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں چونکہ عرب کی آبادی کم تھی قبائل ایک دوسرے سے دور دور رہتے تھے اس لئے ان کے لہجوں اور تلفظ میں بہت فرق ہوتا تھا۔ زبان ایک ہی تھی مگر بعض الفاظ کا تلفظ مختلف ہوتا تھا اور بعض دفعہ ایک معنی کے لئے ایک قبیلہ میں ایک لفظ بولا جاتا تھا دوسرے قبیلہ میں دوسرا لفظ بولا جاتا تھا ان حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ فلاں فلاں الفاظ جو مختلف قبائل کے لوگوں کی زبان پر نہیں چڑھتے۔ اُن کی جگہ فلاں فلاں الفاظ وہ استعمال کر لیا کریں۔ چنانچہ جب تک عرب ایک قوم کی صورت اختیار نہیں کر گیا اُس وقت تک یہی طریق ان میں رائج رہا۔ اگر اس کی اجازت نہ دی جاتی تو قرآن کریم کا یاد کرنا اور پڑھنا مکہ کے باشندوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے مشکل ہوتا اور قرآن کریم اس سرعت سے نہ پھیلتا جس طرح کہ وہ پھیلا۔ قبائل کی زبان کا یہ فرق غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں اب تک بھی ہے تعلیم یافتہ لوگ تو کتابوں سے ایک ہی زبان سیکھتے ہیں لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگ چونکہ آپس میں بول کر زبان سیکھتے ہیں ان میں بجائے ملکی زبان کے قبائلی زبان کا رواج زیادہ ہوتا ہے۔

میں جب حج کے لئے گیا تو ایک یمنی لڑکا جو سولہ سترہ سال کا تھا اور جو سیٹھ ابوبکر صاحب کا ملازم تھا قافلہ کے

ساتھ چلا جا رہا تھا۔ میں راستہ میں عربی زبان میں اس سے گفتگو کرتا رہا اور میں نے دیکھا کہ وہ میری اکثر باتوں کو سمجھ جاتا اوران کا جواب بھی دیتا مگر بعض دفعہ وہ حیرت سے میرے منہ کو دیکھنے لگ جاتا اور کہتا کہ میں آپ کی بات کو سمجھا نہیں۔ میں حیران ہوا کہ یہ بات کیا ہے کہ یہ لڑکا عربی سمجھتا بھی ہے مگر کبھی کبھی رک بھی جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپ کی بات کو نہیں سمجھا۔ جب میں مکہ پہنچا تو میں نے کسی سے ذکر کیا کہ یہ لڑکا عرب ہے اور عربی کو خوب سمجھتا ہے مگر باتیں کرتے کرتے بعض جگہ رک جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میری سمجھ میں بات نہیں آئی معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ تو ان صاحب نے بتایا کہ یہ لڑکا یمنی ہے اور یمنیوں اور حجازیوں کے بعض الفاظ میں بڑا بھاری فرق ہوتا ہے اس لئے یہ اسی اختلاف کے موقعہ پر ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتے چنانچہ انہوں نے اس فرق کے بارہ میں یہ لطیفہ سنایا کہ مکہ میں ایک امیر عورت تھی اس کا ایک یمنی ملازم تھا وہ عورت حقہ پینے کی عادی تھی وہاں عام رواج یہ ہے کہ حقہ کے نیچے کا پانی کا برتن شیشے کا ہوتا ہے اس لئے اسے کہتے بھی شیشہ ہی ہیں۔ ایک دن اُس عورت نے اپنے ملازم کو بلایا اور اس سے کہا غَیِّرِ الشِّیْشَۃَ شیشہ بدل دو۔ لفظ تو اس نے یہ کہے کہ شیشہ بدل دو مگر محاورہ کے مطابق اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کا پانی گرا کر نیا پانی بدل کر ڈال دو۔ ملازم نے یہ فقرہ سنا تو اُس کے جواب میں کہا سَیِّتِیْ ھٰذَا طَیِّبٌ۔ بیگم صاحبہ یہ تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ عورت نے پھر کہا کہ قُلْتُ لَكَ غَیِّرِ الشِّیْشَۃَ۔ میں نے جو تم کو کہا ہے کہ بدل دو تم انکار کیوں کرتے ہو۔ نوکر نے پھر حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ سَیِّتِیْ ھٰذَا طَیِّبٌ۔ میری آقا یہ تو اچھا بھلا ہے۔ آخر آقا نے ڈانٹ کر کہا تم میرے نوکر ہو یا حاکم ہو میں جو تم سے کہہ رہی ہوں کہ اسے بدل دو تم میری بات کیوں نہیں مانتے۔ نوکر نے شیشہ اٹھایا اور باہر جا کر اس زور سے زمین پر مارا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ عورت نے کہا ارے یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اتنا قیمتی برتن تم نے توڑ کر رکھ دیا۔ نوکر نے کہا میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ برتن بڑا اچھا ہے مگر آپ مانتی نہیں تھیں۔ اب جو میں نے توڑ دیا تو آپ ناراض ہو رہی ہیں۔ عورت نوکر پر سخت خفا ہوئی مگر ایک یمنی زبان کے واقف نے اُسے سمجھایا کہ نوکر کا قصور نہیں کیونکہ حجاز میں غَیِّرْ کے معنے بدلنے کے ہیں اور محاورہ میں جب شیشہ کے ساتھ بولا جائے تو اس کا پانی بدلنے کے ہو جاتے ہیں۔ یمنی زبان میں تَغْیِیْر کے معنے توڑنے کے ہوتے ہیں پس جب تم نے غَیِّرِ الشِّیْشَۃَ کہا تو نوکر اپنی زبان کے مطابق یہ سمجھا کہ تم اسے برتن توڑنے کا حکم دے رہی ہو اسی لئے وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ بی بی یہ تو اچھا بھلا ہے اسے کیوں تڑوا رہی ہو۔ مگر جب تم نہ مانیں اور بار بار زور دیا تو وہ غریب کیا کرتا۔ اب دیکھو غَیِّرِ الشِّیْشَۃَ ایک معمولی فقرہ ہے مگر زبان کے فرق کی وجہ سے یمنی نوکر نے اس کے کچھ کے کچھ معنے سمجھ لئے۔

قرآن کریم کے بعض الفاظ کو مختلف قرأتوں میں پڑھے جانے کی اجازت دیئے جانے میں حکمت

اس قسم کے الفاظ جو زبان کے اختلاف کی وجہ سے معانی میں بھی فرق پیدا کر دیتے ہیں اگر قرآن کریم میں اپنی اصل صورت میں ہی پڑھے جاتے تو یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ ان قبائل کو سخت مشکلات پیش آتیں اوران کے لئے قرآن کریم کا سمجھنا مشکل ہو جاتا۔ اس نقص کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے ہم معنی الفاظ پڑھنے کی اجازت دی جن سے قرآن کریم کے سمجھنے اوراس کے صحیح تلفظ کے ادا کرنے میں مختلف قبائلِ عرب کو دقت پیش نہ آئے۔ پس مضمون تو وہی رہا صرف بعض الفاظ یا بعض محاورات جو ایک قوم میں استعمال ہوتے تھے اور دوسری قوم میں نہیں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ یا ان محاورات کی جگہ ان کی زبان کے الفاظ یا اپنی زبان کے محاورات انہیں بتا دیئے تاکہ قرآن کریم کے مضامین کی حفاظت ہو سکے اور زبان کے فرق کی وجہ سے اس کی کسی بات کو سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل نہ ہو جائے۔ اسی طرح اس کا پڑھنا اور یاد کرنا بھی مشکل نہ رہے ورنہ اصل قرأت قرآن کریم کی وہی ہے جو حجازی زبان کے مطابق ہے اس تفصیل کو معلوم کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک عارضی اجازت تھی اصل کلام وہی تھا جو ابتداءً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا۔ ان الفاظ کے قائم مقام اسی وقت تک استعمال ہو سکتے تھے جب تک قبائل آپس میں متحد نہ ہو جاتے۔

حضرت عثمانؓ کا قرآن مجید کو حجازی قرأت میں محفوظ کرنا چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب بجائے اس کے کہ مکہ والے مکہ میں رہتے۔ مدینہ والے مدینہ میں رہتے۔ نجد والے نجد میں رہتے۔ طائف والے طائف میں رہتے۔ یمن والے یمن میں رہتے اور وہ ایک دوسرے کی زبان اور محاورات سے ناواقف ہوتے۔ مدینہ دارالحکومت بن گیا تو تمام قومیں ایک ہو گئیں کیونکہ اس وقت مدینہ والے حاکم تھے جن میں ایک بڑا طبقہ مہاجرین مکہ کا تھا اور خود اہل مدینہ بھی اہل مکہ کی صحبت میں حجازی عربی سیکھ چکے تھے پس چونکہ قانون کا نفاذ ان کی طرف سے ہوتا تھا، مال ان کے قبضہ میں تھا اور دنیا کی نگاہیں انہیں کی طرف اٹھتی تھیں۔ اس وقت طائف کے بھی اور نجد کے بھی اور مکہ کے بھی اور یمن کے بھی اور دوسرے علاقوں کے بھی اکثر لوگ مدینہ میں آتے جاتے تھے اور مدینہ کے مہاجر وانصار سے ملتے اور دین سیکھتے تھے اور اسی طرح سب ملک کی علمی زبان ایک ہوتی جاتی تھی۔ پھر کچھ ان لوگوں میں سے مدینہ میں ہی آکر بس گئے تھے ان کی زبان تو گویا بالکل ہی حجازی ہو گئی تھی۔ یہ لوگ جب اپنے وطنوں کو جاتے ہوں گے تو چونکہ یہ علماء اور استاد ہوتے تھے یقیناً ان کے علاقہ پر ان کے جانے کی وجہ سے بھی ضرور اثر پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں جنگوں کی وجہ سے عرب کے مختلف قبائل کو اکٹھا رہنے کا موقع ملتا تھا اور افسر چونکہ

اکابر صحابہؓ ہوتے تھے ان کی صحبت اور ان کی نقل کی طبعی خواہش بھی زبان میں یک رنگی پیدا کرتی تھی۔ پس گو ابتداء میں تو لوگوں کو قرآن کریم کی زبان سمجھنے میں دقتیں پیش آتی ہوں گی مگر مدینہ کے دارالحکومت بننے کے بعد جب تمام عرب کا مرکز مدینہ منورہ بن گیا اور قبائل اور اقوام نے بار بار وہاں آنا شروع کر دیا تو پھر اس اختلاف کا کوئی امکان نہ رہا۔ کیونکہ اس وقت تمام علمی مذاق کے لوگ قرآنی زبان سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ آئندہ صرف حجازی قرأت پڑھی جائے اور کوئی قرأت پڑھنے کی اجازت نہیں۔ آپ کے اس حکم کا مطلب یہی تھا کہ اب لوگ حجازی زبان کو عام طور پر جاننے لگ گئے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انہیں حجازی عربی کے الفاظ کا بدل استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عثمانؓ کے اس حکم کی وجہ سے ہی شیعہ لوگ جو سنّیوں کے مخالف ہیں کہا کرتے ہیں کہ موجودہ قرآن بیاضِ عثمانی ہے حالانکہ یہ اعتراض بالکل غلط ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک عربوں کے میل جول پر ایک لمبا عرصہ گذر چکا تھا اور وہ آپس کے میل جول کی وجہ سے ایک دوسرے کی زبانوں کے فرق سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ اس وقت اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ اور قرأتوں میں بھی لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دی جاتی۔ یہ اجازت محض وقتی طور پر تھی اور اس ضرورت کے ماتحت تھی کہ ابتدائی زمانہ تھا قومیں متفرق تھیں اور زبان کے معمولی معمولی فرق کی وجہ سے الفاظ کے معانی بھی تبدیل ہو جاتے تھے اس نقص کی وجہ سے عارضی طور پر بعض الفاظ کو جو ان قبائل میں رائج تھے اصل وحی کے بدل کے طور پر خدا تعالیٰ کی وحی کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی تا کہ قرآن کریم کے احکام کے سمجھنے اور اس کی تعلیم سے روشناس ہونے میں کسی قسم کی روک حائل نہ ہو اور ہر زبان والا اپنی زبان کے محاورات میں اُس کے احکام کو سمجھ سکے اور اپنے لہجہ کے مطابق پڑھ سکے۔ جب بیس سال کا عرصہ اس اجازت پر گذر گیا، زمانہ ایک نئی شکل اختیار کر گیا، قومیں ایک نیا رنگ اختیار کر گئیں، وہ عرب جو متفرق قبائل پر مشتمل تھا ایک زبردست قوم بلکہ ایک زبردست حکومت بن گیا، آئینِ ملک کا نفاذ اور نظامِ تعلیم کا اجراء ان کے ہاتھ میں آ گیا، مناصب کی تقسیم ان کے اختیار میں آ گئی، حدود اور قصاص کے احکام کا اجراء انہوں نے شروع کر دیا تو اس کے بعد اصلی قرآنی زبان کے سمجھنے میں لوگوں کو کوئی دقت نہ رہی اور جب یہ حالت پیدا ہو گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس عارضی اجازت کو جو محض وقتی حالات کے ماتحت دی گئی تھی منسوخ کر دیا اور یہی اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا مگر شیعہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا قصور اگر قرار دیتے ہیں تو یہی کہ انہوں نے مختلف قرأتوں کو مٹا کر ایک قرأت جاری کر دی۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو آسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے مختلف قرأتوں میں

قرآن کریم پڑھنے کی اجازت اسلام کے دوسرے دور میں دی ہے ابتدائی دور میں نہیں دی جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم کا نزول گو حجازی زبان میں ہوا ہے مگر قرأتوں میں فرق دوسرے قبائل کے اسلام لانے پر ہوا۔ چونکہ بعض دفعہ ایک قبیلہ اپنی زبان کے لحاظ سے دوسرے قبیلہ سے کچھ فرق رکھتا تھا اور یا تو وہ تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتا تھا یا ان الفاظ کا معنوں کے لحاظ سے فرق ہوجاتا تھا اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت بعض اختلافی الفاظ کے لہجہ کے بدلنے یا اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھنے کی اجازت دے دی۔ مگر اس کا آیات کے معانی یا ان کے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا بلکہ اگر یہ اجازت نہ دی جاتی تو فرق پڑتا۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سورۃ عبداللہ بن مسعودؓ کو اور طرح پڑھائی اور حضرت عمرؓ کو اور طرح پڑھائی کیونکہ حضرت عمرؓ خالص شہری تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ گڈریا تھے اور اس وجہ سے بدوی لوگوں سے ان کا تعلق زیادہ تھا۔ پس دونوں زبانوں میں بہت بڑا فرق تھا۔ ایک دن عبداللہ بن مسعودؓ قرآن کریم کی وہی سورۃ پڑھ رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاس سے گذرے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ کو کسی قدر فرق سے اس سورۃ کی تلاوت کرتے سنا۔ انہیں بڑا تعجب آیا کہ یہ کیا بات ہے کہ الفاظ کچھ اور ہیں اور یہ کچھ اور طرح پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے گلے میں پٹکا ڈالا اور کہا چلو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس میں ابھی تمہارا معاملہ پیش کرتا ہوں تم سورۃ کے بعض الفاظ اور طرح پڑھ رہے ہو اور اصل سورۃ اور طرح ہے۔ غرض وہ انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ نے یہ سورۃ مجھے اور طرح پڑھائی تھی اور عبداللہ بن مسعودؓ اور طرح پڑھ رہے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا تم یہ سورۃ کس طرح پڑھ رہے تھے؟ وہ ڈرے اور کانپنے لگ گئے کہ کہیں مجھ سے غلطی نہ ہوگئی ہو مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ڈرو نہیں پڑھو۔ انہوں نے پڑھ کر سنائی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بالکل ٹھیک ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے تو مجھے اور طرح پڑھائی تھی۔ آپؐ نے فرمایا وہ بھی ٹھیک ہے پھر آپؐ نے فرمایا قرآن کریم سات قرأتوں میں نازل کیا گیا ہے تم ان معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑا نہ کرو۔ اس فرق کی وجہ دراصل یہی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا عبداللہ بن مسعودؓ گڈریا ہیں۔ اور ان کا اور لہجہ ہے اس لئے ان کے لہجہ کے مطابق جو قرأت تھی وہ انہیں پڑھائی۔ حضرت عمرؓ کے متعلق آپؐ نے سوچا کہ یہ خالص شہری ہیں اس لئے انہیں اصل مکی زبان کی نازل شدہ قرأت بتائی۔ چنانچہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ان کی اپنی زبان میں سورۃ پڑھنے کی اجازت دے دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خالص شہری زبان میں وہ سورۃ

پڑھا دی۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فرق ہیں جو مختلف قرأتوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے مگر ان کا نفسِ مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا ہر شخص سمجھتا تھا کہ یہ تمدن اور تعلیم اور زبان کے فرق کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

میں ایک دفعہ کراچی میں تھا کہ وہاں ایک ایجنٹ ایک کروڑ پتی تاجر کو مجھ سے ملانے کے لئے آیا۔ ایجنٹ شہری تھا اور تاجر گنواری علاقہ کا۔ جب وہ تاجر مجھ سے بات کرنے لگا تو مجھے مخاطب کر کے کہتا کہ ''تم نوں'' یہ بات معلوم ہو گی۔ اب اوّل تو تم کا لفظ شہریوں میں معزز آدمی کو خطاب کرتے ہوئے استعمال نہیں کرتے دوسرے تم کے ساتھ ''نوں'' لگانا تو اور بھی معیوب ہے۔ اردو میں کہیں گے تم کو نہ کہ تم نوں۔ جب وہ تاجر مجھے تم نوں کہتا تو میں نے دیکھا اسے ساتھ لانے والا ایجنٹ بے حد اضطراب کے ساتھ اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگ جاتا اور میری طرف دیکھتا کہ ان پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا ہے اور مجھے تاجر کے تم نوں اور ایجنٹ کی گھبراہٹ پر لطف آ رہا تھا۔ اب معنوں کے لحاظ سے ''آپ کو'' اور ''تم نوں'' میں کوئی بھی فرق نہیں لیکن ایک شہری کے لئے ''تم نوں'' کہنا اور ایک انبالہ پٹیالہ کے گنوار کے لئے ''آپ کو'' کہنا ایک مجاہدہ سے کم نہیں۔ پنجاب میں گجرات کی طرف کے لوگ پکڑنے کو ''پھدنا'' کہتے ہیں اور ہماری طرف کے لوگ ''پھڑنا''۔ ہم لوگ پھدنا کہیں تو ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے گجراتی پھڑنا کہے تو اس کے گلے میں پھندے پڑتے ہیں۔ گورداسپور میں شریر آدمی کو شُہدا کہتے ہیں۔ ضلع سرگودہا میں شریف اور نیک طبیعت کو شُہدا کہتے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت خلیفۂ اوّلؓ کی ایک عزیزہ آئی کسی ذکر پر اس نے آپ کی نسبت کہا ''اوساں شہدے نوں انہاں گلاں دا کی پتا''۔ یعنی مولوی صاحب شریف آدمی ہیں ان کو ایسی باتوں کا کیا علم۔ اس طرف کی مستورات نے ایک دفعہ اس فقرہ کو سنا اور حیاء کے ماتحت برداشت کر گئیں مگر اتفاق سے اس نے پھر دہرایا تو وہ اس سے دست و گریباں ہونے کو تیار ہو گئیں اور کہا کہ کچھ حیاء کرو تم تو گالیاں دے رہی ہو۔ اس غریب نے حیرت سے پوچھا کہ میں تعریف کر رہی ہوں کہ گالیاں دیتی ہوں۔ ''او وہ شُہدا تے ہے''۔ آخر کسی عورت نے جو اس فرق کو سمجھتی تھی اس جوش کو ٹھنڈا کیا۔ اب دیکھو اگر کسی کتاب میں جو سارے پنجاب کے لئے لکھی گئی ہو کسی بزرگ کی نسبت شُہدے کا لفظ آ جائے تو اس کی توضیح یا دوسرے علاقہ کے لئے دوسرے لفظ کا استعمال مقرر کرنا ضروری ہو گا یا نہیں؟ یہی ضرورت اس زمانہ میں مختلف قرأتوں کی اجازت کی تھی لیکن جب تمدن اور حکومت کے ذریعہ سے قبائلی حالت کی جگہ ایک قومیت اور ایک زبان نے لے لی اور سب لوگ حجازی زبان سے پوری طرح آشنا ہو گئے تو حضرت عثمانؓ نے سمجھا اور صحیح سمجھا کہ اب ان قرأتوں کو قائم رکھنا اختلاف کو قائم رکھنے کا موجب ہو گا اس لئے ان قرأتوں کا عام استعمال اب بند کرنا چاہیے باقی کتبِ قرأت میں تو وہ محفوظ رہیں گی۔ پس انہوں نے اس نیک خیال کے ماتحت عام استعمال میں حجازی

اور اصل قرأت کے سوا باقی قرأتوں سے منع فرما دیا اور عربوں اور عجمیوں کو ایک ہی قرأت پر جمع کرنے کے لئے تلاوت کے لئے ایسے نسخوں کی اجازت دی جو حجازی اور ابتدائی قرأت کے مطابق تھے۔

ابن اُمِ عبد کا یہ واقعہ بھی اسی قسم کے قرأت کے اختلاف کے متعلق ہے۔ عربی زبان میں مَا کا استعمال کئی معنوں میں ہوتا ہے مَا نافیہ بھی ہے اور مصدریہ بھی اور مَا مَنْ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ جب مصدری معنے اور مَنْ کے معنے دونوں ہی مراد ہوں تو ایسے مقام پر مَنْ کا استعمال کرنا یا مصدر کا استعمال کرنا مفید نہیں ہوسکتا کیونکہ مصدر ایک معنے دے گا اور مَنْ دوسرے معنے دے گا دونوں معنے کسی ایک طریق کے استعمال سے ظاہر نہ ہوں گے مگر چونکہ ایسے کئی مواقع قرآن کریم میں آتے ہیں جب کہ مصدری معنے اور مَنْ کے معنے دونوں ہی بتانے مقصود ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں ایسے مواقع پر مَا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تا یہ دونوں مفہوم ظاہر ہوں۔ مگر بعض عرب قبائل مَا کے مصدری معنے تو کرتے ہیں لیکن مَا کا استعمال مَنْ کی جگہ ناجائز سمجھتے ہیں اس لئے اس استعمال سے ان کے لئے مشکل پیش آجاتی تھی پس اس کو دور کرنے کے لئے وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰی کی قرأت کی بھی اجازت دے دی گئی۔ جو جملہ ایک حد تک مَا کا مفہوم ادا کر دیتا ہے لیکن چونکہ ویسا مکمل مفہوم ادا نہیں کرتا جیسے مَا اس لئے اصل قرآنی عبارت کے طور پر اسے استعمال نہیں کیا گیا صرف عارضی قرأت کے طور پر اس کا استعمال جائز رکھا گیا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابوالدرداء کو کوئی غلطی لگی ہو جب وہ خود کہتے ہیں کہ صحابہؓ مجھ پر زور دیتے ہیں کہ میں وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی پڑھوں۔ تو اس کے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اس بارہ میں ضرور کوئی بھول چوک واقعہ ہوگئی ہے ورنہ صحابہؓ کی اکثریت ان پر یہ زور نہ ڈالتی کہ اصل قرأت وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ہی ہے وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰی نہیں ہے۔ پس اوّل تو ضروری نہیں کہ ہم اس کو دوسری قرأت قرار دیں جب کثرت سے صحابہؓ کہتے ہیں کہ یہ قرأت نہیں تو ضروری ہے کہ ہم اسے قرأت قرار نہ دیں بلکہ ابوالدرداء کی رائے کو غلط سمجھیں۔ لیکن اگر اس قرأت کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس سے آیت کے معنوں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور قرأت کا اختلاف قرآن کریم کے کسی نقص پر نہیں بلکہ اس کے معنوں کی وسعت پر دلالت کرتا ہے۔

قریب کے زمانہ میں ایک انگریز نے قرآن کریم کے تین پرانے نسخے نکالے ہیں وہ حلب میں ایک مسیحی مونسٹری Monastery میں پروفیسر مقرر تھا۔ اس نے اپنے زعم میں قرآن کریم کے تین پرانے نسخے حاصل کئے ہیں اور ان کے باہمی اختلافات کو اس نے Leaves from three different Qurans

یعنی ''قرآن کے پرانے تین نسخوں کے متفرق اوراق'' کے نام سے شائع کر دیا۔

(Leaves From Three Ancient Qurans edited by Rev Alphonse Mingana and Agnes Smith Lewis)

جب وہ کتاب شائع ہوئی تو لوگوں میں بڑا شور اٹھا اور عیسائیوں میں یہ سمجھا جانے لگا کہ اب قرآن کریم کی حفاظت کا دعویٰ بالکل باطل ہو گیا ہے۔ میں نے بھی وہ کتاب منگوائی تا کہ میں دیکھوں کہ قرآن کی حفاظت کے خلاف اس میں کون سے دلائل دیئے گئے ہیں۔ جب میں نے اسے پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ جو نسخے اس کے پیش کئے گئے ہیں ان میں اسی قسم کا اختلاف ہے کہ کسی جگہ مَا کی جگہ مَنۡ ہے اور کسی جگہ مَنۡ کی جگہ مَا ہے۔ کسی جگہ قَالُوۡا کے آگے الف ہے اور کسی جگہ الف نہیں۔ کسی جگہ ہٗ کی بجائے ھُمۡ کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس قرآنی نسخہ کا اختلاف یا تو بعض قرأتوں پر مبنی تھا یا کتابت کی غلطیاں تھیں اور بس۔ میں نے اسے پڑھ کر نتیجہ نکالا کہ اگر ان مزعومہ قدیم نسخوں کو درست سمجھا جائے تب بھی اس سے قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اس کی عبارات معنوں کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں کرتیں۔ صرف کسی جگہ مَا کی جگہ مَنۡ اور ہٗ کی جگہ ھُمۡ کی ضمیر بدلی ہوئی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف قرأتوں کا فرق ہے اور کچھ بھی نہیں۔ غرض عیسائیوں کے کتب خانہ میں سے بھی کوئی کتاب ایسی نہ نکلی جو قرأت کے اس فرق کے علاوہ قرآن کریم کے نسخوں میں کوئی اور فرق ثابت کر سکتی۔

اختلاف قرأت کے فوائد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اسی قرأت کے فرق کو بعض جگہ پیش کیا ہے۔ مثلاً وَ اِنۡ مِّنۡ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤۡمِنَنَّ بِہٖ قَبۡلَ مَوۡتِہٖ کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مَوۡتِہٖ کی بجائے ایک قرأت مَوۡتِھِمۡ بھی آتی ہے (الحق مباحثہ دہلی، روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۶۲) جو آپ کے بیان کردہ مضمون کی تائید کرتی ہے۔ پس قرأتوں کا اختلاف یا تو قبائلی زبانوں کے فرق کے ضرر سے بچانے کے لئے ہے یا قرآنی معنوں کی وسعت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے۔

اختلافِ قرأت کی حکمت بتانے کے بعد میں اب آیت کی تفسیر کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ رات کے وقت انسانی اعمال اور قسم کے ہوتے ہیں اور دن کے وقت اور قسم کے۔ مثلاً رات کو لوگ سونے کی تیاری کرتے ہیں اور دن کو کام کرنے کی تیاری کرتے ہیں۔ آدمی وہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس کے اعمال الگ الگ اوقات میں الگ الگ اقسام کے ہوتے ہیں۔ وہی آدمی جو دن کے وقت دوڑا بھاگا پھرتا ہے رات کے وقت

بستر پر لیٹے ہوئے خراٹے مار رہا ہوتا ہے۔ دن کو اس کی ہوشیاری اور چالاکی دیکھ کر حیرت آتی ہے اور رات کو اس کی نینداور غفلت دیکھ کر حیرت آتی ہے۔ اور اگر فطرتیں ہی الگ الگ ہوں تو پھر تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ بعض کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ جاگتے ہوئے بھی سو رہے ہوتے ہیں اور بعض کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ سوتے ہوئے بھی جاگ رہے ہوتے ہیں۔ حماسہ میں تَأَبَّطَ شَرًّا کا واقعہ آتا ہے (یہ صفاتی نام ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنی بغل میں شرارت دبائے پھرتا تھا) اس لڑکے کا باپ مر گیا اور اپنے بیٹے کے لئے بہت بڑی جائیداد چھوڑ گیا۔ اس کی والدہ نے کسی اور سے نکاح کر لیا۔ سوتیلے باپ نے جائیداد دیکھ کر چاہا کہ میں اس لڑکے کا خاتمہ کر دوں تا کہ اکیلا اس جائیداد سے فائدہ اٹھاؤں۔ چنانچہ وہ اسے سیر کے بہانے کہیں باہر لے گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ رات کو جب یہ سو جائے گا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ جب لڑکا سو گیا تو باپ اٹھا تا کہ اسے مار ڈالے مگر ابھی اس کے پاؤں زمین پر پڑے ہی تھے کہ لڑکا تلوار لے کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا کیا بات ہے۔ باپ نے کہا کچھ نہیں یونہی کسی کام کے لئے اٹھا تھا۔ گھنٹہ دو گھنٹے گزرنے کے بعد وہ پھر اٹھا کہ اسے قتل کر دے مگر اس کے اٹھنے کے ساتھ ہی لڑکا پھر بیدار ہو گیا اور پوچھنے لگا کیا بات ہے۔ باپ نے پھر کوئی بہانہ کر دیا۔ اسی طرح ساری رات وہ اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح لڑکا سو جائے تو میں اسے قتل کر دوں مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جب بھی اٹھتا لڑکا تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا اور کہتا کیا بات ہے؟ لڑکا مضبوط تھا اور یہ بڑی عمر کا تھا اس وجہ سے بھی اس پر ڈر غالب آ گیا اور آخر دوسرے دن وہ اسے واپس لے آیا اور اس نے سمجھ لیا کہ میں اسے قتل نہیں کر سکتا۔ الغرض بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ سوتے ہوئے بھی جاگ رہی ہوتی ہیں ذرا کوئی آہٹ ہو فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر دن کو بھی رات کی کیفیت طاری رہتی ہے وہ مجلس میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگ جاتے ہیں اور بعض بڑے اطمینان کے ساتھ ایک طرف لیٹ کر سو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سورۃ میں انہی کیفیات کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے ایک رات کی حالت ہوتی ہے اور ایک دن کی۔ رات کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ خواہ کوئی چست اور ہوشیار ہو اس پر بھی نیند طاری ہو جاتی ہے۔ بعض تو ایسے سوتے ہیں کہ کتنا جھنجھوڑو ان کی آنکھ نہیں کھلتی۔ بار بار جگانے پر بھی بیدار نہیں ہوتے۔ سردیاں ہوں تو لحاف میں سے نہیں نکلتے اور گرمیاں ہوں تو پانی کے چھینٹے مارنے پر بھی پہلو بدل کر سو جاتے ہیں لیکن دن کا وقت کام کا ہوتا ہے اس میں چست آدمی تو اپنی ترقی کے لئے کئی قسم کے کاموں کو اختیار کر لیتا ہے لیکن سست آدمی کو دن کے وقت تو کچھ نہ کچھ کام کرنا ہی پڑتا ہے مگر رات ساری اس کی سوتے ہی گذرتی ہے۔ رات اور دن کی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض قوموں پر رات کا زمانہ آیا ہوا ہوتا ہے اور بعض پر دن کا زمانہ

ہوتا ہے۔ جو قومیں رات کے مشابہ ہوتی ہیں یا یوں کہو کہ جن پر رات آئی ہوئی ہوتی ہے وہ دن کو بھی سوتے ہیں اور رات کو بھی سوتے ہیں یعنی رات تو سوتے گذر جاتی ہے دن بھی کسی ایسے کام میں نہیں گذرتے کہ ان کے لئے یا ان کی قوم کے لئے کوئی اچھا نتیجہ نکلے اور اس کے برخلاف جن اقوام پر دن کا زمانہ ہوتا ہے ان کے دن تو کام میں گذرتے ہیں ان کی راتیں بھی بیکار نہیں جاتیں اور وہ تاریکیوں اور مصیبتوں کے اوقات میں بھی اتنا کام کر جاتے ہیں کہ رات والی قوموں کو دن کے وقت یعنی ہر قسم کے سامانوں کی موجودگی میں بھی اتنے کام کا موقعہ نہیں ملتا۔ اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرماتا ہے وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی۔ ہم شہادت کے طور پر رات کو پیش کرتے ہیں جب وہ ڈھانپ لیتی ہے یعنی انسانی قویٰ پر چھا جاتی ہے جب سب لوگ سو جاتے ہیں اور حرکت کی جگہ سکون لے لیتا ہے گویا صرف تاریکی ہی نہیں ہوتی بلکہ عملاً ہر شے کو رات ڈھانک لیتی ہے۔ رات کو اندھیرے میں سفر کرو تو راستہ بہت کم طے ہوتا ہے کیونکہ سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔ موٹر میں بھی سفر کیا جائے تو رات کو اس کی رفتار آدھی رہ جاتی ہے کیونکہ خطرہ ہوتا ہے کہ کوئی نیچے نہ آجائے یا اندھیرے کی وجہ سے کوئی حادثہ نہ پیش آجائے۔ اس وجہ سے ڈرائیور موٹر کی رفتار کو کم کر دیتا ہے۔ پھر اگر وہ خود ہی سو جائے تو اور بھی خطرات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ بہر حال رات کو صرف تاریکی ہی نہیں ہوتی بلکہ عملاً ہر شے کو وہ ڈھانپ لیتی ہے یعنی صرف جسم ہی نہیں بلکہ جب انسان سو جاتا ہے تو اس کی عقل اور فکر بھی رات کی حکومت میں آجاتا ہے پھر اسے اپنے برے بھلے کی کچھ تمیز نہیں رہتی۔ یہ تو رات کی کیفیت تھی اس کے بعد فرمایا ہم اس کے بالمقابل تمہارے سامنے دن کو پیش کرتے ہیں جب وہ اس قدر روشن ہو جاتا ہے کہ سونا اور غافل رہنا بالکل ناممکن ہوتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے صرف رات کو پیش نہیں کیا کیونکہ رات کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جس میں سب لوگ جاگ رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ مسلمان تو لازماً سورج غروب ہونے کے بعد مغرب کی نماز ادا کرتے ہیں پھر کچھ دیر کے بعد عشاء کی نماز پڑھتے ہیں اور سنتوں اور وتر کی ادائیگی کے بعد ذکر الٰہی کرتے ہیں اس کے بعد وہ سونے کی تیاری کرتے ہیں یا جو لوگ مطالعہ کرنا چاہیں وہ پہلے مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سوتے ہیں۔ عیاش قومیں تھیئٹر و سینماؤں، ناچ گھروں، شراب خانوں میں اپنے وقت خرچ کرتی ہیں امراء کلبوں میں تاش و بلیرڈ کھیلتے ہیں پس ساری رات سونے کے کام نہیں آتی بلکہ رات کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جس میں لوگ بیدار رہتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے صرف لیل کو بطور شہادت پیش نہیں کیا بلکہ وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی فرمایا ہے یعنی ہم رات کی اس حالت کو تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں جب وہ عملاً ہر چیز کو ڈھانک لیتی ہے اور صرف جسم ہی نہیں بلکہ انسانی عقل

اور دماغ کا بھی وہ احاطہ کر لیتی ہے۔اس کے بعد خدا تعالیٰ نے نَہار کا ذکر کیا ہے مگر نَہار کے ساتھ بھی تَجَلّٰی کا لفظ رکھ دیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ ہم دن کے اس حصہ کو شہادت کے طور پر پیش کر رہے ہیں جب وہ اس قدر روشن ہوجاتا ہے کہ سونا اور غافل رہنا بالکل ناممکن ہوجاتا ہے۔ابتدائی حصہ کو پیش نہیں کر رہے کیونکہ صبح کے وقت کچھ لوگ سوجاتے ہیں مگر جب دن زیادہ چڑھ جائے تو پھر کوئی نہیں سوتا۔

صوفیاء میں یہ عام رواج رہا ہے کہ وہ صبح کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لئے سو جایا کرتے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بھی یہی عادت تھی کہ آپ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر تک استراحت فرماتے۔پس اللہ تعالیٰ یہاں نَہار کے ابتدائی حصہ کی مثال پیش نہیں کرتا بلکہ اس حصہ کی مثال پیش کرتا ہے جب وہ پورا روشن ہوجاتا ہے یعنی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ انسان اگر سونا بھی چاہے تو وہ نہیں سوسکتا۔یہ دونوں حالتیں یعنی رات کی وہ حالت جب وہ ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے اور دن کی وہ حالت جب سونے والے بھی جاگ اٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ بطور مثال کفار کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے یہی فرق تمہاری حالت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی حالت میں ہے۔تمہاری تمام قوتوں پر تھکان اور خوابیدگی کا اثر ہے۔چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عرب نے گو کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی مگر جتنی ترقی بھی کی تھی وہ ان کی تھکان کا موجب بن گئی تھی۔مکہ کا مجاور ہونا سب سے بڑی عزت سمجھا جاتا تھا اور جیسے مندر کے پجاریوں کی حالت ہوتی ہے وہی حالت ان کی تھی۔قوت عملیہ فنا ہوچکی تھی اور ان کے اعمال نے ان میں کوفت پیدا کردی تھی۔غرض اللہ تعالیٰ ان کو بتاتا ہے کہ تمہاری تمام قوتوں پر تھکان اور خوابیدگی کا اثر ہے تم لمبی جہالت اور لمبے عیش کے بعد زیادہ سے زیادہ سونا چاہتے ہو مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی حالت میں بیداری اور ہوشیاری اور قوت عملیہ پائی جاتی ہے۔وہ جاگنا اور کام کرنا چاہتے ہیں اور تم سونا اور غافل رہنا چاہتے ہو پھر تمہارا اور ان کا کیا مقابلہ؟ سوتا جاگتے کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے؟ تمہاری حالتوں پر رات کی خوابیدگی طاری ہے اور ان کی حالتوں پر دن کی بیداری غالب ہے۔ان کی راتیں بھی دن ہوتی ہیں اور تمہارے دن بھی رات ہوتے ہیں پھر تمہارا اور ان کا کیا مقابلہ؟ جب تک تم بھی رات کے بعد دن کی حالت پیدا نہ کرو تم کبھی سکھ نہیں پاسکتے۔

اس کے بعد فرماتا ہے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى ہم اس خدا کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس نے نر اور مادہ پیدا کیا ہے اور جن سے دنیا میں آئندہ نسل ترقی کرتی ہے یعنی جس طرح دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی حالتوں پر ہمیشہ دن کی بیداری طاری رہتی ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی حالتوں پر ہمیشہ رات کی

خوابیدگی غالب رہتی ہے اسی طرح کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں رجولیت کا مادہ ہوتا ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں نسوانیت کا مادہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو فیوض پہنچانے والے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو استفاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جو لوگ افاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں وہ ذَکر ہوتے ہیں اور جو لوگ استفاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں وہ اُنثٰی ہوتے ہیں اور جو لوگ نہ افاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں نہ استفاضہ کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں وہ خنثٰی ہوتے ہیں۔ ان سے دنیا میں کبھی کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ فرماتا ہے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى۔ ہم نر و مادہ کی پیدائش کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں یعنی نر میں افاضہ کی قوت ہوتی ہے اور وہ دوسرے کو بچہ دیتا ہے اور مادہ میں استفاضہ کی قوت ہوتی ہے اور وہ بچہ کو اس سے لیتی اور اس کی پرورش کرتی ہے۔ یہی دو قوتیں ہیں جن کے ملنے سے دنیا میں اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں اگر نر اور مادہ آپس میں نہ ملیں تو نسلِ انسانی کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جائے۔

بعض نے اس موقع پر اعتراض کیا ہے کہ قرآن کریم نے یہ تو کہا ہے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى یعنی خدا تعالیٰ نے ذَکر اور اُنثٰی کو پیدا کیا ہے مگر اس نے خنثٰی کا ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ اسے کس نے پیدا کیا ہے۔ مجھے علمی کتابوں میں اس قسم کا اعتراض پڑھ کر حیرت آئی ہے اور پھر اور زیادہ حیرت مجھے اس بات پر آئی ہے کہ مفسرین نے اس کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے اور جواب یہ دیا ہے کہ جو ہمارے نزدیک خنثٰی ہے خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بہرحال یا ذَکر ہے یا اُنثٰی ہے اس سے باہر نہیں۔ (فتح البیان زیر آیت ”وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى“) یہ بھی ایک مجبوری کا جواب ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خنثٰی کوئی پیدائش نہیں بلکہ وہ پیدائش کا ایک بگاڑ ہے اور اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے شربت بناتے وقت پاس سے کوئی خاکروب پیشاب کا پاٹ لے کر گزرے اور ٹھوکر سے اچھل کر پیشاب کا کوئی قطرہ شربت کے گلاس میں جا گرے یا اپنا ہی بچہ کھڑے ہو کر پیشاب کر دے اور شربت میں کوئی قطرہ جا گرے تو ایسے شربت کو ہم شربت کی ایک قسم نہیں کہیں گے بلکہ یہ سمجھیں گے کہ وہ ناپاک شربت ہے۔ کیا کوئی عقلمند دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے احمق ہی ہے جو یہ کہے کہ ایک شربت تو وہ ہوتا ہے جس میں ایسنس ملا ہوا ہوتا ہے اور ایک شربت وہ ہوتا ہے جس میں پیشاب پڑا ہوا ہوتا ہے کیونکہ جس میں غلطی سے پیشاب کا کوئی قطرہ جا گرا ہے وہ شربت نہیں بلکہ ناپاک شدہ شربت ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے ہر ایک کو یا ذَکر پیدا کیا ہے یا اُنثٰی پیدا کیا ہے۔ اگر ماں باپ اپنے اندر کوئی خرابی پیدا کر لیتے ہیں اور ان کی صحت میں اس قسم کا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے کہ بجائے ذَکر یا اُنثٰی کے خنثٰی پیدا ہو جاتا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ بھی ایک پیدائش ہے بلکہ صرف یہ کہا جائے گا کہ یہ پیدائش کا

ایک بگاڑ ہے جو اس رنگ میں ظاہر ہو گیا۔ خنثٰی کو بھی پیدائش قرار دینا ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ خدا تعالیٰ آنکھیں دیتا ہے تو دوسرا جواب میں کہے کہ دنیا میں اندھے بھی تو ہوتے ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات کیسی بے ہودہ ہے اگر کوئی اندھا ہوا ہے تو اپنے ماں باپ کی کسی نادانی یا غفلت یا بیماری کے نتیجہ میں ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ نے بہر حال ہر انسان کو آنکھوں والا بنایا ہے کسی کا اندھا پیدا ہونا ایک بگاڑ اور خرابی ہے نئی پیدائش نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت آتی ہے کہ ہمارے مفسرین نے اس بحث کو اٹھایا ہی کیوں کہ خدا تعالیٰ نے ذَکر اور اُنثٰی کا ہی کیوں ذکر کیا ہے خنثٰی کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ خنثٰی ہونا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی کا ناک کٹا ہوا ہو یا کسی کی آنکھ ماری ہوئی ہو یا کسی کی ٹانگ کٹی ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سب انسانی پیدائش کے مختلف بگاڑ ہیں۔ کسی کی آنکھیں نہیں ہوتیں، کسی کے ہاتھ نہیں ہوتے، کسی کی زبان نہیں ہوتی، کسی کی انگلیاں کم و بیش ہوتی ہیں۔ اگر ان میں سے ہر چیز کو پیدائش کی ایک نئی قسم قرار دے دیا جائے تو پھر تو ہزار ہا اس قسم کی پیدائشیں نکل آئیں گی۔ دنیا میں ہر شخص کی خدا تعالیٰ نے دو ٹانگیں پیدا کی ہیں لیکن بعض دفعہ ماں باپ کی بے احتیاطی یا کسی رحمی نقص کی وجہ سے ایسا بچہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی تین ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے ہر ایک کو الگ الگ جسم عطا کیا ہے لیکن بعض دفعہ اس قسم کے جڑے ہوئے بچے پیدا ہو جاتے ہیں جن کو اپریشن کے ذریعہ ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑتا ہے اور بعض دفعہ تو اپریشن کے ذریعہ بھی ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا بظاہر دو دھڑ آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں لیکن دونوں کا جگر ایک ہوتا ہے یا دل ایک ہوتا ہے یا معدہ ایک ہوتا ہے یا تلی ایک ہوتی ہے اور وہ ساری عمر اسی طرح جڑے جڑے گزار دیتے ہیں۔ پس خالی خنثٰی کا ذکر ہی نہیں پھر تو انہیں اس قسم کے تمام بگاڑ پیش کرنے چاہیے تھے اور کہنا چاہیے تھا کہ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں دو بچے آپس میں بالکل جڑے ہوئے ہوتے اور پھر ان کو الگ الگ کرنا پڑتا ہے۔ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں دونوں کا ایک ہی جگر، ایک ہی قلب، ایک ہی پھیپھڑا اور ایک ہی معدہ ہوتا ہے اور انہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں بچہ تو ہوتا ہے مگر اس کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں دو کی بجائے تین ٹانگیں بن جاتی ہیں حالانکہ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو پیدائش کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں ان کو پیش کر کے قرآن مجید پر یہ اعتراض کرنا کہ اس نے صرف ذَکر اور اُنثٰی کا نام لیا ہے خنثٰی کا نام نہیں لیا معترضین کی نادانی اور حماقت کا ثبوت ہے اور مفسرین کو چاہیے تھا کہ بجائے اس کے کہ اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے کہتے کہ یہ اعتراض کسی احمق کی زبان سے نکلا ہے دنیا میں دو ہی پیدائشیں ہوتی ہیں ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں ذکرانیت ہوتی ہے اور ایک پیدائش وہ ہوتی ہے جس میں نسوانیت ہوتی ہے یہ دونوں وجود آپس میں ملتے ہیں تب ایک تیسرا وجود پیدا ہوتا ہے اس کے بغیر نہیں۔

آیت وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى میں مسلمانوں کے ترقی کر جانے کی وجہ کا ذکر اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی سلسلۂ پیدائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم دنیا میں غور کر کے دیکھ لو آئندہ نسلوں کی ترقی صرف ذکر اور اُنثٰی سے ہوتی ہے ایک کے اندر افاضہ کا فعل پایا جاتا ہے اور دوسرے کے اندر استفاضہ کا فعل پایا جاتا ہے یہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تب کوئی نتیجہ پیدا ہوتا ہے اگر یہ دونوں آپس میں نہیں ملیں گے تو کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوگا۔ وہ شخص جس میں افاضہ کا مادہ نہیں اگر وہ کہے کہ مجھے کسی دوسرے سے فیض حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تو وہ نادان ہوگا۔ اسی طرح جس میں استفاضہ کا مادہ نہیں وہ بھی بغیر کسی دوسرے وجود کے اپنی قوت افاضہ کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ افاضہ اور استفاضہ کی قوتیں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر کسی قوم کے افراد یہ کہیں کہ ہم خود کام کر سکتے ہیں ہمیں کسی دوسرے کی راہنمائی یا مدد کی ضرورت نہیں، کسی دوسرے کی قوت کے ہم محتاج نہیں، ہمارے بازوؤں میں اتنی طاقت موجود ہے کہ ہم بغیر کسی کی مدد کے ترقی کی دوڑ میں حصہ لے سکتے ہیں مگر ان میں افاضہ کی قوت نہ پائی جاتی ہو تو ان کے سب دعاوی باطل ہوں گے۔ جب ان میں افاضہ کی قوت ہی نہیں تو وہ بغیر کسی راہنما کی مدد کے آگے بڑھ ہی کس طرح سکتے ہیں؟ وہ اگر ترقی کر سکتے ہیں تو اسی صورت میں کہ ان میں استفاضہ کی قوت ہو۔ ان میں یہ مادہ ہو کہ وہ دوسرے سے فیوض حاصل کر سکیں کیونکہ ان کی حیثیت ری فلیکٹر کی سی ہے وہ اصل روشنی نہیں بلکہ ایک آئینہ انعکاس ہیں۔ اگر اصل روشنی وہ اپنے آئینہ ظلّیت میں منعکس نہیں کریں گے تو سوائے تاریکی اور اندھیرے کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہرحال جس طرح نر اور مادہ کے باہمی اتصال سے نسل ترقی کرتی ہے اسی طرح قومیں اسی وقت ترقی کرتی ہیں جب ایک راہنما ایسا موجود ہو جو قوت افاضہ اپنے اندر رکھتا ہو اور قوم کے افراد ایسے ہوں جو قوت استفاضہ اپنے اندر رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ یہی مثال کفار کے سامنے پیش کرتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تمہاری کوئی حیثیت ہی نہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کا باہمی جوڑ دنیا میں ایک زبردست نتیجہ پیدا کرے گا کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہیں جن میں قوتِ افاضہ کمال درجہ کی پائی جاتی ہے اور صحابہ کرامؓ وہ ہیں جن میں قوتِ استفاضہ کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ دونوں آپس میں مل بیٹھیں گے تو ایک نئی دنیا آباد کرنے کا باعث بنیں گے جس طرح مرد اور عورت آپس میں ملتے ہیں تو بچہ تولد ہوتا ہے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا روحانی تعلق ایک نئی آبادی کا پیش خیمہ ہے۔ مگر اے مکہ والو! تم وہ ہو کہ نہ تم میں ذکر کی قابلیت پائی جاتی ہے اور نہ اُنثٰی کی قابلیت پائی جاتی ہے تم اسی طرح سوتے سوتے مرجاؤ گے تمہاری غفلتیں تم کو ڈبو دیں گی کیونکہ تم نر تو ہو نہیں اور نسوانی طاقتیں اپنے اندر پیدا نہیں کرتے گویا مخنث کی صورت بن رہے ہو۔ تم آئندہ کس نیک انجام یا بھلائی کی امید کر سکتے ہو؟

لوگ کہتے ہیں کہ یہاں خنثٰی کا ذکر نہیں حالانکہ یہ اگر خنثٰی کا ذکر نہیں تو اور کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں افاضہ کی قوت ہے اور صحابہ میں استفاضہ کی قوت کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ مگر اے مکہ والو! تم میں نہ افاضہ کی قوت پائی جاتی ہے اور نہ استفاضہ کی، اس لئے تم روحانی طور پر خنثٰی ہو۔ نہ ذکر ہو نہ انثٰی ہو۔ نہ تم میں نر کی قابلیت موجود ہے کہ تم دوسروں کو نور پہنچا سکو اور نہ تم میں نسائیت پائی جاتی ہے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتسابِ نور کر سکو۔ پھر تم دنیا میں ترقی کس طرح کر سکتے ہو تم تو خنثٰی ہو اور خنثٰی کی نسل نہیں چلتی۔ پس روحانی دنیا کے کامل آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور روحانی دنیا کی کامل حوائیں صحابہ کرامؓ ہیں اور خنثٰی مکہ کے منکرین ہیں۔

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۵﴾

کہ تمہاری کوششیں یقیناً مختلف ہیں۔

حلّ لُغات۔ شَتّٰی اَشْیَاءُ شَتّٰی کے معنے ہوتے ہیں مُخْتَلِفَۃٌ۔ مختلف اشیاء۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے تمہاری اور مسلمانوں کی سعی آپس میں بڑا اختلاف رکھتی ہے۔ تمہاری تمام سعی سونے کی تیاری میں ہے اور ان کی تمام سعی قومی بیداری اور ترقی کے لئے ہے۔ تمہاری سعی تاریکی کے سردار شیطان کے حق میں ہے اور ان کی سعی خدا تعالیٰ کے حق میں ہے جو خود نور اور نور کا پیدا کرنے والا ہے۔ پھر تمہاری اور ان کی کوششوں کا نتیجہ ایک کس طرح ہو سکتا ہے؟ تمہاری تمام سعی اس بات کے لئے وقف ہو رہی ہے کہ بستر بچھاؤ۔ تکیہ لگاؤ اور لحاف رکھو تا کہ ہم سو جائیں اور صحابہؓ کی تمام سعی اس بات کے لئے وقف ہو رہی ہے کہ اٹھو ہل جوتو، زمینوں میں بیج ڈالو، زمین کو پانی دو اور کاشت کی اچھی طرح نگرانی کرو تا کہ اعلیٰ درجہ کی فصل تیار ہو۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ سونے والے کچھ کمایا کرتے ہیں یا جاگنے والے کمایا کرتے ہیں؟ تم پر رات طاری ہے اور ان پر دن کی کیفیت طاری ہے جب تم دونوں کی کوششیں بالکل الگ الگ ہیں تو ان دونوں کا ایک نتیجہ کس طرح نکل سکتا ہے اور تم کس طرح خیال بھی کر سکتے ہو کہ رات کو سونے والوں اور دن کے وقت ہل جوتنے والوں کا ایک سا انجام ہو گا؟

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی کے دوسرے معنے دوسرے معنے اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم خنثٰی ہو اور نر سے بھاگ رہے ہو مگر یہ انثٰی ہیں اور نر سے بھاگ نہیں رہے بلکہ اس سے تعلق پیدا کر رہے ہیں اب تم خود ہی سمجھ لو کہ تمہارے ہاں روحانی اولاد کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ اولاد انہی دلہنوں کے ہاں پیدا ہوتی ہے جو دولہا کی طرف جاتی

ہیں مگر جو دولہا سے بھاگ جائیں ان کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی۔ یہی حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخاطبین کا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جانتے ہیں کہ ہم میں رجولیت والی طاقت نہیں بلکہ استفاضہ والی طاقت ہے اس لئے وہ اپنے روحانی دولہا کے پاس جاتے ہیں مگر تم میں وہ طاقت تو ہے نہیں کہ اپنے زور سے کوئی نتیجہ پیدا کر سکو۔ صرف اللہ تعالیٰ نے تم میں استفاضہ والی قوت رکھی ہے مگر تم میں اپنی شامتِ اعمال سے ایسی بیماری پیدا ہو چکی ہے کہ تم دولہا کو پہچانتی تک نہیں اور اس سے دور بھاگ رہی ہو۔ تمہاری حالت لیل والی ہے اور ان کی نہار والی۔ وہ انثی ہونے کے لحاظ سے وقت کے دولہا کی طرف جا رہے ہیں اور تم دولہا سے بھاگ رہے ہو اور جب تمہاری اور ان کی حالت میں اس قدر نمایاں فرق ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہیں ترقی حاصل ہو، تمہارے ہاں بھی نورِ آسمانی کی پیدائش ہو اور تم بھی دنیا میں سر بلند ہو؟ روحانی ثمرات تو انہی سے پیدا ہوں گے تم سے نہیں اور آئندہ دنیا انہی دلہنوں سے آباد ہو گی جو دولہا کے ہاں جاتی ہیں۔ ان سے آباد نہیں ہو سکتی جو دولہا کے قریب جانا پسند نہیں کرتیں۔ تم مت خیال کرو کہ دنیا کی آئندہ ترقی میں تمہارا بھی کوئی حصہ ہو گا اب دنیا کی آبادی مسلمانوں کی وجہ سے ہو گی اور وہی قوم ترقی کرے گی جس پر دن چڑھا ہوا ہے اور جو قربانیوں سے کام لے رہی ہے۔ تن آسانیوں کے لئے مرمٹنے والے وجود ان نعمتوں کو حاصل نہیں کر سکتے۔

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ تاریکی اور روشنی کا فرق اور نسائیت کاملہ والی اور بانجھ کا فرق بتاتا ہے اور ایک مثال کے ذریعہ اس امر کو واضح کرتا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ۙ﴿۶﴾ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۷﴾

پس جس نے (خدا کی راہ میں) دیا اور تقویٰ (اختیار) کیا۔ اور نیک بات کی تصدیق کی۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۸﴾

اسے تو ہم ضرور آسانی (کے مواقع) بہم پہنچائیں گے۔

حلّ لُغات۔ یَسَّرَ یَسَّرَ الشَّیْءَ لِفُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں سَھَّلَهٗ لَهٗ۔ اس کے لئے اس امر کو آسان کر دیا۔ (اقرب) پس نُیَسِّرُ کے معنے ہوں گے۔ ہم آسان کر دیں گے۔

تفسیر۔ **ترقی کرنے والی قوم کے افراد کی تین خصوصیات** فرماتا ہے دن کی مثال اور

نسائیت کا ملہ والی قوم کی مثال اس شخص کی سی ہے جو(۱) اَعۡطٰی (۲) وَاتَّقٰی (۳) وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی کا مصداق ہو۔ یہاں ایک نہایت ہی لطیف مضمون بیان کیا گی ہے اَعۡطٰی کے معنے ہوتے ہیں دوسرے کو دیا۔ اور اِتَّقٰی کے معنے ہوتے ہیں پرہیز گاری اختیار کی۔ پس اَعۡطٰی میں عمل کی درستی کی طرف اشارہ ہے اور اِتَّقٰی میں جذبات کی درستی اور ان کی صحت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی میں اچھی باتوں کی تصدیق کا ذکر ہے اور تصدیق کا تعلق انسانی فکر کے ساتھ ہوتا ہے پس عمل اور جذبات کی درستی کے ساتھ فکر کی درستی کا ذکر بھی شامل کر دیا اور اس طرح بتایا کہ ترقی کرنے والی قوم کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے عمل میں بھی صحت ہو، اس کے جذبات میں بھی صحت ہو اور اس کے افکار میں بھی صحت ہو۔ اَعۡطٰی میں عمل کی صحت کا ذکر ہے اِتَّقٰی میں جذبات کی صحت کا ذکر ہے اور صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی میں افکار کی صحت کا ذکر ہے کیونکہ اَعۡطٰی کے معنے ہیں وہ دیتا ہے یعنی اس کا عمل صحیح ہے۔ اِتَّقٰی کے معنے ہیں وہ ہر بُری بات سے ڈرتا ہے یعنی اس کے جذبات صحیح ہیں اور صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی کے معنے ہیں وہ اچھی باتوں کی تصدیق کرتا ہے یعنی اس کے افکار صحیح ہیں۔ یہاں تین اصلاحوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسانی تکمیل کے لئے یہ تینوں اصلاحیں ضروری ہیں۔ الفاظ مختصر ہیں مگر ان مختصر الفاظ میں علم النفس کا ایک نہایت اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے اور بنی نوع انسان کے سامنے اس روشن حقیقت کو رکھا گیا ہے کہ عمل، جذبات اور فکر کی درستی سے ہی انسان پورے طور پر اچھا ہوتا ہے یعنی عمل صحیح، احساس صحیح اور فکر صحیح۔ یہ تین کمالات جب تک کوئی قوم اپنے اندر پیدا نہیں کر لیتی وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ علمِ کامل افکار کی درستی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، احساسِ کامل جذبات کی درستی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور عملِ کامل اعمال کی درستی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ یہ تین چیزیں ہیں جن سے کامیابی ہوتی ہے اگر علمِ صحیح نہ ہو تو یہ لازمی بات ہے کہ اس کے جذبات بھی بگڑ جائیں گے اور اس کا عمل بھی بگڑا ہوا ہوگا۔ مثلاً پسا ہوا نمک اور میٹھا دونوں ہم شکل ہوتے ہیں اگر ہم کسی کو میٹھا دے دیں اور وہ اسے نمک سمجھ کر ہنڈیا میں ڈال لے تو چونکہ اس کا علم صحیح نہیں ہوگا نتیجہ بھی خراب ہی پیدا ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ میٹھے کو نمک سمجھ کر ہنڈیا میں ڈال لے تو میٹھا نمک بن جائے۔ غلط علم ہمیشہ غلط عمل اور غلط جذبات پیدا کیا کرتا ہے۔

بسا اوقات عورتیں آنکھ میں ڈالنے والی دوا یا مالش کرنے کی دوا بچوں کو غلطی سے پلا دیتی ہیں اور وہ ہلاک ہو جاتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ ان کے غلط علم کا کوئی غلط نتیجہ پیدا نہ ہو۔ پس غلط علم غلط عمل اور غلط جذبات پیدا کرتا ہے۔ فرض کرو کہ کسی شخص کا بچہ گم ہو جائے اور باوجود تلاش کے وہ اپنے ماں باپ کو نہ ملے لیکن ہو زندہ، اور کسی نہ کسی طرح

پل کر کسی اور شہر میں اپنا کاروبار شروع کر دے اور اتنا لمبا عرصہ اس علیحدگی پر گذر جائے کہ وہ اپنے باپ کی شکل تک بھول جائے اس کے بعد فرض کرو ایک دن اس کا باپ اسی شہر میں آ جائے اور بوجہ غربت کے مزدوری شروع کر دے اور بیٹا مثلاً سفر پر جاتے ہوئے یا گھر بدلتے ہوئے یا سودا گھر پہنچانے کے لئے ایک مزدور کا محتاج ہو اور اس کی نظر اپنے باپ پر پڑے تو کیا اس کے دل میں محبت اور رقّت کے جذبات پیدا ہو جائیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ بوجہ غلط علم کے وہ اپنے باپ کو ایک مزدور کی شکل میں ہی دیکھے گا اور بے تکلفی سے کہہ دے گا او بڈھے ادھر آؤ یہ سامان اٹھا کر فلاں جگہ تک لے چلو تم کو اتنے پیسے ملیں گے۔ تو باوجود اس کے کہ حقیقت کے لحاظ سے وہ جوان بیٹا ہو گا اور بڈھا اس کا باپ ہو گا لیکن چونکہ اسے علم نہیں ہو گا کہ یہ میرا باپ ہے بلکہ وہ اسے ایک مزدور سمجھ رہا ہو گا۔ اس لئے اس کے دل میں کوئی جذبۂ ہمدردی اپنے باپ کے متعلق پیدا نہیں ہو گا وہ اس سے اسی طرح کام لے گا جس طرح ایک عام مزدور سے کام لیا جاتا ہے پس غلط علم کے نتیجہ میں ہمیشہ غلط جذبات پیدا ہوتے ہیں اور غلط جذبات کے نتیجہ میں ہمیشہ غلط عمل پیدا ہوتا ہے۔ علم محرک ہے جذبات کا اور جذبات محرک ہیں عمل کے۔ صحیح عمل تبھی پیدا ہوتا ہے جب جذبات اعلیٰ درجہ کے ہوں اور صحیح جذبات تبھی پیدا ہوتے ہیں جب علم اعلیٰ درجے کا ہو۔ صحیح جذبات کے بغیر اچھا عمل کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ماں کی محبت کو دیکھ لو وہ کس طرح اپنے بچہ کے لئے مرتی چلی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر کسی نوکر کو بیس گنا معاوضہ بھی دے دیا جائے تب بھی وہ کبھی اس طرح دن رات کام نہیں کر سکتا جس طرح ماں باپ اپنے بچوں کے لئے تکلیف برداشت کرتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ نوکر جذبہ سے کام نہیں کرتا اس کا کام صرف فکر سے تعلق رکھتا ہے جذبات غائب ہوتے ہیں۔ تو صحیح عمل کے لئے صحیح جذبات کی ضرورت ہوتی ہے اور صحیح جذبات کے لئے صحیح علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جب یہ تینوں چیزیں اکٹھی ہو جائیں تو پھر تو وہ قوم یا فرد جوان تینوں خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے اپنی ذات میں کامل ہو جاتا ہے۔ اَعْطٰی میں اللہ تعالیٰ نے اعمال کی صحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ روپیہ جمع نہیں کرتے۔ اِتَّقٰی میں جذبات کی صحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ بُری باتوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ پہلی سورتوں میں یہ ذکر کیا تھا کہ کفار کی یہ عادت ہے کہ وہ روپیہ قومی ضروریات کے لئے خرچ نہیں کرتے بلکہ لغو باتوں میں اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا تھا۔ یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (البلد:۷) وہ کہتا ہے میں نے ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کی تھی اور بتایا تھا کہ بے شک تم نے ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کیا مگر قومی ضروریات کے لئے نہیں، یتامیٰ اور مساکین کی خبر گیری کے لئے نہیں، غرباء کی ترقی کے لئے نہیں بلکہ اپنی عزت اور اپنے نام و نمود کے لئے۔ اس لئے تمہارا وہ مال خرچ کرنا مال کو برباد کرنا تھا۔ گویا خرچ

تو اس نے بھی کیا تھا مگر غلط طریق پر۔ اسی طرح فرمایا تھا۔ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر:۲۰) تم اپنے باپ دادا کی جائیدادوں کو تباہ کر دیتے ہو۔ غرض پہلی سورتوں میں بتایا ہے کہ کفار اپنا مال خرچ تو کرتے ہیں مگر صحیح مقامات پر خرچ نہیں کرتے اسراف میں اس کو ضائع کر دیتے ہیں اور جہاں خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں بخل اور امساک سے کام لیتے ہیں۔ اب یہ بتاتا ہے کہ مومن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اَعْطٰی وہ دیتا ہے یعنی قومی ضروریات کا خیال رکھتا ہے اور جب بھی کسی قربانی کی ضرورت ہو وہ فوراً اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ ایک نکتہ یاد رکھنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَعْطَى الْمَالَ نہیں فرمایا بلکہ صرف اَعْطٰی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ درحقیقت یہ عربی زبان کا کمال ہے جو کسی اور زبان کو حاصل نہیں کہ کسی جگہ مفعول حذف کر کے اور کسی جگہ الفاظ کو اضافتوں سے آزاد کر کے معانی میں وسعت پیدا کر دی جاتی ہے۔ اگر اَعْطَى الْمَالَ فرماتا تو اس کے معنے صرف مال خرچ کرنے کے ہوتے مگر اب چونکہ صرف اَعْطٰی فرمایا ہے اس لئے اس کے معنے اَعْطَى الْمَالَ کے بھی ہو سکتے ہیں اَعْطَى الْعِلْمَ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر ایسی چیز کے ہو سکتے ہیں جو کسی کو دی جاسکتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے قرآن کریم میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرة:۴)۔ ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے اس کا ایک حصہ وہ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے عام رنگ میں انفاق کا ذکر کر کے اس کے معنوں کو وسیع کر دیا یعنی اس کے پاس مال ہو تو وہ مال خرچ کرتا ہے، علم ہو تو علم خرچ کرتا ہے، وقت ہو تو وقت خرچ کرتا ہے غرض جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہو وہ اسے لوگوں کی بھلائی کے لئے خرچ کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح اَعْطٰی میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ساری چیزیں جو اس کو حاصل ہوں لوگوں کے لئے خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو طاقت دی ہو تو وہ طاقت دیتا ہے، وقت دیا ہو تو وقت دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی وقت کے لئے دینے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح مال دیا ہو تو مال دیتا ہے، اعلیٰ درجہ کے قویٰ عطا کئے ہوں تو ان سے ایسا کام لیتا ہے جو بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے والا ہو۔ غرض اَعْطٰی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس کے معنوں کو وسیع کر دیا ہے۔ پھر وَاتَّقٰی میں یہ بتایا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے تقویٰ کے ماتحت کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ میں غلطی سے کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جس سے لوگوں کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچ جائے۔ اگر کوئی شخص کسی کو اتنا روپیہ دے دیتا ہے کہ وہ اسے عیاشی میں ضائع کرنا شروع کر دیتا ہے تو یہ اس روپیہ کا بالکل غلط استعمال ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ظالم کو طاقت پہنچا دیتا ہے تو یہ بھی اس قوت کا برمحل استعمال نہیں ہوگا۔ اسی لئے اَعْطٰی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وَاتَّقٰی کے الفاظ کا اضافہ کیا اور بتایا کہ وہ دیتا تو ہے مگر ساتھ ہی ڈرتا ہے کہ

میں کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جس سے دنیا کی علمی یا عملی یا سیاسی یا عائلی حالت کو کوئی نقصان پہنچ جائے اور میں ثواب کی بجائے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بن جاؤں۔

وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی میں یہ بتایا کہ وہ صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ وہ افکار کی درستی میں بھی لگا رہتا ہے۔ صحیح عقائد اختیار کرنے کی جدوجہد کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ بہتر سے بہتر عقیدہ کی تصدیق کرے۔ گویا صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی کہہ کر یہ بتایا کہ وہ علم کی زیادتی کی کوشش کرتا رہتا ہے حُسۡنٰی کے معنے صرف اچھی چیز کے نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کی چیز کے ہیں اور معنے یہ ہیں کہ وہ احسن سے احسن چیز کی تصدیق کرتا ہے یعنی اپنے علم کو کمال تک پہنچا دیتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو ترتیب اوپر بتائی گئی ہے اس میں علم کو محرک جذبات بتایا گیا ہے اور جذبات کو محرک عمل قرار دیا گیا ہے مگر یہاں عمل پہلے ہے جذبات کا ذکر بعد میں ہے اور فکر کا اُس کے بعد میں۔ گویا ترتیب بالکل الٹ ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ ترتیب اللہ تعالیٰ نے درجہ کی بلندی کے اظہار کے لئے الٹ دی ہے چونکہ یہاں قومی مقابلے کا ذکر تھا جس میں عمل نمایاں نظر آتا ہے اس لئے اسے پہلے، اُس کے محرک کو اُس کے بعد اور اُس کے محرک کو اس کے بعد رکھا گیا ہے ورنہ پیدائش کے لحاظ سے علم پہلے ہے جذبات دوسرے درجہ پر اور عمل تیسرے درجہ پر۔ لیکن قومی مقابلہ میں جذبات اور علم دونوں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ صرف عمل ہی ایک ایسی چیز ہے جو دوسروں کے سامنے آتی ہے۔ یہاں چونکہ کفار اور مسلمانوں کا مقابلہ کیا گیا ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تمہارا اپنی کامیابی کے متعلق ادّعا بالکل لغو ہے۔ جو خوبیاں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں وہ تم میں موجود ہی نہیں اس لئے یہ لازمی بات ہے کہ مسلمان کامیاب ہوں اور تم ان کے مقابلہ میں شکست کھاؤ اس لئے یہاں عمل کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اگر جذبات اور افکار کو پہلے پیش کیا جاتا تو وہ ان کی اہمیت کو تسلیم نہیں کر سکتے تھے مثلاً اگر یہ کہا جاتا کہ صحابہؓ کا علم تمہارے علم سے بہتر ہے تو وہ کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے ہمارا علم ان سے ہزار درجہ بہتر ہے لیکن جب یہ کہا جاتا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو غریبوں کی خدمت کرتے ہیں اور تم وہ ہو جو غریبوں کے لئے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتے تو اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا پس چونکہ یہاں کفر کا مقابلہ تھا اس لئے اس مقابلہ کی اہمیت کے لحاظ سے عمل کا پہلے ذکر کیا گیا ہے ورنہ جہاں تک محرکات کا سوال ہے علم پہلے ہے جذبات بعد میں اور عمل اس کے بعد ہے۔ مگر جہاں تک بُرے اور بھلے کے مقابلہ کا سوال ہے سب سے پہلے لوگوں کے سامنے عمل آتا ہے اور یہی وہ چیز

ہے جس سے وہ آسانی کے ساتھ اپنا اور مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اس غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہاں ترتیب الٹ دی ہے۔ عمل کا پہلے ذکر کیا ہے اور جذبات اور افکار کا بعد میں۔ کیونکہ کفار کو عمل کے ذکر سے ہی جھوٹا کیا جا سکتا تھا جذبات اور علم کے متعلق وہ سوسو حجتیں کر سکتے تھے۔

فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی کے دو معنے اس کے بعد فرماتا ہے جو شخص ان صفات کا حامل ہو فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی۔ ہم ایسے آدمی کو ضرور یُسْرٰی مہیا کر دیں گے۔ اس جملہ کے دو معنے ہیں ایک تو یہ کہ اسے ایسے حالات میسر آجائیں گے جن سے وہ آسانی کے ساتھ غالب آسکے۔ آسانی میسر آجانے کے یہی معنے ہوا کرتے ہیں کہ افعال کے نتائج انسانی ارادوں کے مطابق نکلنے شروع ہو جائیں اور جب کسی کو اس کے ارادوں کے مطابق سامان میسر آجائیں تو اسے آسانی ہو جاتی ہے پس اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ ہم اس کے ہر کام میں آسانی پیدا کر دیں گے۔ دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ہم رفتہ رفتہ اس پر عمل نیک کو آسان کر دیں گے یعنی عمل صالح پہلے بڑا گراں گزرتا ہے جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے اعمال کو بھی درست کرو، اپنے جذبات کو بھی درست کرو، اپنے افکار کو بھی درست کرو تو وہ گھبرا جاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ تو بڑا مشکل ہے مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ مگر فرماتا ہے جب کوئی شخص اس راستہ پر چل پڑے اور ہمت کے ساتھ ان افعال کی بجا آوری میں مشغول ہو جائے تو ہماری سنت یہ ہے کہ ہم ان کاموں کی سرانجام دہی اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔ پھر اس کی طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں رہتا بلکہ وہ دلی خوشی اور بشاشت کے ساتھ ان کو بجالاتا ہے۔ پہلے دن جب کسی کو نماز پڑھنے کے لئے کہا جائے تو اسے بڑی مشکل نظر آتی ہے مگر رفتہ رفتہ اسے ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ کسی ایک نماز کو چھوڑنا بھی اسے موت سے بدتر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ابتداءً انسان کے سامنے جب کوئی اہم عملِ صالح آتا ہے وہ گھبرا جاتا ہے اور کہتا ہے اس کا بجالانا مشکل ہوگا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں آسان عملِ صالح ہے اور مشکل چیز برائی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر:۱۸) ہم نے قرآن کو ہدایت کے لئے بالکل آسان بنا دیا ہے کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص نہیں جو اس نسخہ کو استعمال کرے اور اپنے رب کو راضی کر لے۔ اصل یُسْرٰی خدائی تعلیم ہے جس سے انسان کی روح کو ترقی حاصل ہوتی ہے مگر پہلے وہ عُسْرٰی نظر آتی ہے اور انسان اس پر عمل کرنے سے گھبراتا ہے اس لئے فرمایا کہ صحابہ کرام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت روحانیہ سے استفاضہ حاصل کریں گے ہم ان کے لئے بظاہر مشکل نظر آنے والے اعمالِ صالحہ کو آسان کر دیں گے اور ان کی طبائع میں ان اعمال کی طرف خاص رغبت پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ

جو شخص علم صحیح اور جذبات صحیح اور عمل صحیح سے کام لیتا ہے اس کی نظر کی غلطی کو درست کر دیا جاتا ہے اس وجہ سے اسے ان کاموں میں لذت اور سرور محسوس ہونے لگتا ہے جو دوسروں کو مشکل نظر آتے ہیں۔

وَ اَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۹﴾ وَ کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی ۙ﴿۱۰﴾

اور ایسا (شخص) جس نے بخل سے کام لیا اور بے پرواہی کا اظہار کیا۔ اور نیک بات کو جھٹلایا۔

فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ﴿ؕ۱۱﴾

اسے ہم تکلیف (کا سامان) بہم پہنچائیں گے۔

تفسیر۔ تنزل کے اسباب پہلی آیات کے بالمقابل ان آیات میں بھی تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ بَخِلَ، اَعۡطٰی کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے اور اِسۡتَغۡنٰی، اِتَّقٰی کے مقابلہ میں۔ کیونکہ اِتَّقٰی کے معنے ہیں خدا تعالیٰ سے ڈرنا کہ وہ کسی غلطی کی وجہ سے مجھ سے خفا نہ ہو جائے اور اِسۡتَغۡنٰی کے معنے ہیں بے پرواہ ہو جانا یعنی انسان کا یہ کہنا کہ مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ خدا مجھ سے خفا ہوتا ہے یا نہیں۔ چونکہ اس قسم کا استغناء تقویٰ کے خلاف ہوتا ہے اس لئے اِتَّقٰی کے مقابلہ میں اِسۡتَغۡنٰی کا لفظ رکھا گیا ہے۔ تیسری بات مسلمانوں کے متعلق یہ بیان کی گئی تھی کہ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی۔ اس کے مقابلہ میں کفار کی نسبت کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی کا ذکر کر دیا کہ وہ اچھی باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ غرض یہ تینوں باتیں پہلی تین چیزوں کے مقابل میں رکھی گئی ہیں۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ شخص جو بخل کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے مال دیا ہے، عزت دی ہے، طاقت دی ہے، وقت دیا ہے مگر وہ ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا اور پھر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے کسی کی پرواہ نہیں میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ یہ الفاظ عام طور پر گندی طبیعت کے لوگ استعمال کیا کرتے ہیں جب اُنہیں کسی برائی سے روکا جائے تو وہ کہتے ہیں ہمیں کسی کی پرواہ نہیں، کوئی شخص ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص بخل کے ساتھ یہ گند بھی اپنی طبیعت میں رکھتا ہے وَ کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی اور پھر اس کا فکر بھی غلط ہے وہ دنیا میں کیا ترقی کر سکتا ہے۔ طبیعت میں استغناء کا ہونا بتاتا ہے کہ صحیح جذبات مفقود ہیں کیونکہ جذباتِ صحیحہ محبت پیدا کیا کرتے ہیں استغناء پیدا نہیں کیا کرتے۔ بچہ مرنے لگتا ہے تو ماں نہیں کہتی کہ بے شک مرے مجھے اس کی پرواہ نہیں لیکن نوکر بعض دفعہ یہ الفاظ کہہ دیتا ہے کیونکہ اس کے جذبات اور رنگ کے ہوتے ہیں۔ بہر حال صحیح جذبات کا

نہ ہونا استغناء پیدا کرتا ہے، صحیح عمل کا نہ ہونا بخل پیدا کرتا ہے اور صحیح فکر کا نہ ہونا تکذیب پیدا کرتا ہے۔ جس طرح پہلی آیات میں یہ بتایا تھا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں صحیح عمل، صحیح جذبات اور صحیح فکر پایا جاتا ہے اسی طرح ان آیات میں یہ بتاتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں غلط علم، غلط جذبات اور غلط فکر پایا جاتا ہے اور چونکہ یہ دونوں مثالیں مسلمانوں اور کفار کی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے کفار کو بتاتا ہے کہ تم میں جب یہ یہ نقائص پائے جاتے ہیں اور مسلمانوں میں اس کے مقابلہ میں بہت بڑی خوبیاں پائی جاتی ہیں تو تم ان کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہو؟ اُن کے کاموں کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ ہم ان کے لئے یُسْرٰی مہیا کر دیں گے مگر تمہارے کاموں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم تمہارے لئے عُسْرٰی مہیا کر دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے سارے کام بگڑتے چلے جائیں گے جس کام کو بھی ہاتھ لگاؤ گے خراب ہو جائے گا اور یا پھر یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ان اعمال کے نتیجہ میں تمہارے لئے نیکی کا حصول زیادہ سے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ اصل کام اعمالِ صالح ہی ہیں ان اعمال سے انسان جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی نیکی کی طرف لوٹنا اُس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے گویا دو باتیں ہوں گی ایک تو یہ کہ نیکی کا حصول مشکل ہو جائے گا دوسرے یہ کہ تم جو کام بھی کرو گے اُس کا نتیجہ الٹ ہوگا کیونکہ تمہارے عمل میں خرابی پیدا ہو چکی ہے، تمہارے اندر بے پروائی ہے جو جذبات کے فقدان اور ان کی خرابی کی دلیل ہے اور پھر تمہارے اندر تکذیب پائی جاتی ہے جو ذہن و فکر کی نادرستی اور غلط علم کا ثبوت ہے۔ یہ ساری باتیں مل کر تمہاری ہلاکت اور بربادی کا موجب بن جائیں گی۔

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۲﴾

اور جب وہ ہلاک ہوگا تو اس کا مال اسے کوئی فائدہ نہ پہنچائے گا۔

حلّ لُغات۔ تَرَدّٰى تَرَدّٰى فِي الْهُوَّةِ کے معنے ہیں سَقَطَ فِيْهَا۔ وہ گڑھے میں گر گیا (اقرب) مفردات میں ہے کہ اَلتَّرَدِّيْ کے معنے ہیں التَّعَرُّضُ لِلْهَلَاكِ اپنے آپ کو ہلاکت کے پیش کرنا (مفردات) پس تَرَدّٰى کے معنے ہوں گے۔ گر گیا (۲) ہلاکت کے سامنے ہوا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جب مذکورہ بالا صفات والا گروہ ہلاک ہونے کے قریب پہنچے گا یا اپنے مقام سے گر جائے گا تو اسے اس کا مال کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ جب تک عزت حاصل ہے وہ بے شک فخر کر لے لیکن جب تنزل کے آثار ظاہر ہو گئے اور ہلاکت قریب آ گئی اس وقت کوئی چیز اس کے کام نہیں آئے گی۔ اس وقت وہ اچھے

کام بھی کرے گا توان کا کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوگا کیونکہ عذاب کی ساعت سر پر کھڑی ہوگی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے ہلاکت کا فیصلہ نہ ہو اس وقت تک مال، دولت اور عزت ہر چیز انسان کے کام آجاتی ہے لیکن جب تباہی کا فیصلہ ہو جائے تو پھر کوئی چیز کام نہیں آتی۔ انسان مال خرچ کرتا ہے تو الٹا نتیجہ پیدا ہوتا ہے، رحم کرتا ہے تو الٹا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ نہ دولت کام آتی ہے نہ عزت کام آتی ہے نہ نرمی اور محبت کام آتی ہے۔ پہلے اگر وہ صدقہ کرتا ہے تو لوگ اس کی قدر کرتے ہیں مگر پھر وہ صدقہ کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں اب ہمیں رشوت دے رہا ہے۔ پہلے نرمی کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں حسنِ اخلاق سے کام لے رہا ہے پھر اس وقت نرمی کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں یہ ہماری منتیں کر رہا ہے۔ گویا سارے حالات اس کے مخالف ہو جاتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جو اس کو فائدہ پہنچا سکے۔

غرض فرمایا وَ مَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى۔ جب اس کی ہلاکت کا وقت آئے گا تو اس وقت وہ وہی کام کرے گا جو ہم اب اسے کرنے کو کہتے ہیں مگر یہ نہیں کرتا۔ لیکن اس وقت ان کاموں کا الٹا نتیجہ پیدا ہوگا مال دے گا تو لوگ کہیں گے ہمیں رشوت دیتا ہے۔ نرمی سے بولے گا تو لوگ کہیں گے ہماری خوشامد کرتا ہے۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿۱۳﴾

ہدایت دینا یقیناً ہمارے ہی ذمہ ہے۔

تفسیر۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسروں کو فائدہ پہنچانا، تقوی اللہ اختیار کرنا اور اچھی باتوں کی تصدیق کرنا یہ ان اعمال میں سے ہیں جو قوموں کو ترقی کی طرف لے جاتے ہیں اور بخل سے کام لینا، استغنٰی ظاہر کرنا اور سچی باتوں کی تکذیب میں حصہ لینا یہ ان اعمال میں سے ہیں جو قوموں کو ہلاکت کے گڑھے میں گرا دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریک رات کے مارے ہوئے لوگوں کو خدا تعالیٰ ہی ہدایت دے سکتا ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا کے معنے ہیں ہم پر واجب ہے یا ہمارا ہی یہ کام ہے یعنی بنی نوع انسان سے بوجہ حقیقی شفقت اور مہربانی رکھنے کے یہ ہمارا ہی کام ہے کہ ہم ان کو ہدایت دیں انسان کا کام نہیں کہ وہ اپنے لئے آپ ہدایت تجویز کر لے کیونکہ بسا اوقات انسان اپنے نفس کے متعلق آپ فیصلہ کرتا ہے جو غلط ہوتا ہے۔ بخیل اپنے متعلق ایک فیصلہ کرتا ہے اور وہ غلط ہوتا ہے۔ ظالم اپنے متعلق ایک فیصلہ کرتا ہے اور وہ غلط ہوتا ہے۔ جاہل اپنے متعلق ایک فیصلہ کرتا ہے اور وہ غلط ہوتا ہے۔ پس خواہ وہ اپنے متعلق خود ہی کوئی فیصلہ کر لیتے پھر بھی وہ اپنے نفس کے اتنے خیر خواہ نہیں ہو سکتے تھے جتنے ہم ان کے خیر خواہ ہیں۔

اس لئے باوجود اس کے کہ وہ انکار کرتے ہیں، مخالفتیں کرتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، مومنوں کو تکالیف پہنچاتے ہیں پھر بھی ہم ان کو ہدایت دیتے چلے جاتے ہیں کیونکہ ہم انسان کو پیدا کرنے والے ہیں، ہم مشفق اور مہربان ہیں، ہم رحمٰن اور رحیم ہیں، ہم اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور باوجود ان کے انکار کے انہیں ہدایت دیتے چلے جاتے ہیں۔

وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى ⑭

اور ہر بات کی انتہا اور ابتداء بھی یقیناً ہمارے ہی اختیار میں ہے۔

تفسیر۔ کفار کے ایمان نہ لانے کی اصل وجوہات اس آیت میں اللہ تعالیٰ کفار کو بتاتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہاری راہ میں وہ کون سی مشکلات ہیں جن کی بناء پر تم سچائی کو قبول نہیں کرتے۔ تمہارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تم دنیا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اپنے مال کی پرواہ نہیں کرتے۔ جب بھی کوئی قومی اور ملی ضرورت پیش آتی ہے وہ اپنے اموال کو بلا دریغ قربان کر دیتے ہیں مگر تم اپنے اموال کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہو اسی لئے تم مسلمانوں کے متعلق کہتے ہو کہ وہ پاگل ہیں تباہ اور برباد ہو جائیں گے کیونکہ وہ اپنے اموال کو ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن ہم تباہ نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم اپنے مال کو حفاظت سے رکھتے ہیں۔ فرماتا ہے یہ خیال ہے جو تمہارے دلوں میں پایا جاتا ہے مگر تمہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ ہمارے پاس ہی آخرت ہے اور ہمارے پاس ہی دنیا ہے۔ تم دنیا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں دنیا بھی نہیں ملے گی اور دین بھی تمہارے ہاتھ سے چلا جائے گا کیونکہ دنیا بھی ہمارے پاس ہے اور آخرت بھی ہمارے پاس ہے اس کے مقابلہ میں یہ مسلمان دنیا کو چھوڑ رہے ہیں مگر ہم انہیں آخرت بھی دیں گے اور دنیا بھی دیں گے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ یہ اپنا نقصان کر رہے ہیں مگر یہ نقصان نہیں کر رہے جب یہ ہمارے پاس پہنچیں گے تو جس چیز کو چھوڑ کر یہ لوگ چلے تھے وہ وہیں کھڑی ہوگی اور یہ اس کو حاصل کر لیں گے۔ تم جانتے ہو کہ یہ لوگ ہمارے پاس آرہے ہیں جب یہ ہمارے پاس آرہے ہیں تو گو اس نیت اور ارادہ سے آرہے ہیں کہ ہمیں آخرت ملے گی مگر چونکہ دنیا بھی ہمارے پاس ہوگی اس لئے وہ بھی ان کو مل جائے گی اور تم لوگ آخرت چھوڑ کر دنیا کے پاس جا رہے ہو اور چونکہ دنیا ہمارے پاس ہے اور تم ہماری طرف نہیں آرہے اس لئے تمہاری جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بھی تمہارے ہاتھ سے جائے گی اور آخرت کی نعمتوں سے بھی تم محروم ہو جاؤ گے۔ گویا کفار کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہتے ہیں کسی شخص کے پاس بہت سا

مال و اسباب تھا اور وہ اکیلا سفر کر رہا تھا ایک چور نے اسے دیکھا تو اس نے ارادہ کیا کہ میں کسی طرح اس کا مال اڑاؤں آخر سوچنے کے بعد اس نے یہ تجویز نکالی کہ ایک نیا اور اعلیٰ جوتا رستہ میں پھینک دیا اور خود ایک طرف چھپ گیا۔ جب وہ شخص جوتے کے پاس پہنچا تو اسے بڑا پسند آیا اور اس نے اسے اٹھا لیا مگر پھر خیال آیا کہ میں نے ایک جوتا کیا کرنا ہے اگر دوسرا جوتا بھی ساتھ ہوتا تو کام بھی آتا صرف ایک جوتا کیا کام دے سکتا ہے چنانچہ وہ اسے وہیں چھوڑ کر آگے چل پڑا۔ کچھ دور آگے جا کر چور نے دوسرا جوتا پھینکا ہوا تھا جب وہ وہاں پہنچا تو اسے اپنی بے وقوفی پر افسوس آیا اور اس نے کہا کہ مجھ سے کیسی سخت غلطی ہوئی کہ میں وہ جوتا اسی جگہ چھوڑ آیا اگر میں چھوڑ کر نہ آتا تو اب مکمل جوتا بن جاتا۔ اس خیال کے آنے پر اس نے اسباب وہیں رکھا اور جوتا لینے کے لئے واپس چل پڑا۔ چور کو موقع مل گیا اور اس نے اسباب بھی اٹھا لیا اور جوتا بھی۔ جب وہ واپس گیا تو دیکھا کہ وہاں جوتا نہیں کیونکہ وہ جوتا چور اٹھا کر لے آیا تھا۔ اب یہ پھر خالی ہاتھ اپنے اسباب کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہاں اسباب بھی نہیں اور جوتا بھی غائب ہے۔

دنیا کے طلب کرنے والوں کی مثال یہی کافر کی حالت ہوتی ہے وہ آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی طرف جاتا ہے لیکن آخرت تو اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکی تھی دنیا بھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے کیونکہ دنیا خدا تعالیٰ کے پاس ہوتی ہے اور وہ اس راستہ پر چل رہا ہوتا ہے جو شیطان کی طرف جاتا ہے۔ ادھر مومن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف جاتا ہے اور کہتا ہے مجھے دنیا کی ضرورت نہیں مجھے صرف آخرت کی ضرورت ہے۔ مگر جب خدا تعالیٰ کے پاس پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ دنیا اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی اور وہ آخرت کے ساتھ کھڑی ہے۔ اور جب کافر دنیا کے پاس جاتا ہے تو وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا نہ آخرت ہوتی ہے نہ دنیا ہوتی ہے پس فرماتا ہے وہ ہمارے پاس آئے تو آخرت کی تلاش میں تھے مگر جب وہ ہمارے پاس پہنچے تو انہوں نے اولیٰ کو بھی وہیں کھڑے پایا۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۵﴾ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۶﴾

پس (یاد رکھو کہ) میں نے (تو) تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ہوشیار کر دیا ہے۔ اس میں سوائے کسی بڑے ہی بدبخت

الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۷﴾

کے کوئی داخل نہ ہوگا۔ (ایسا بدبخت) جس نے (حق کو) جھٹلایا اور (سچ سے) منہ پھیر لیا۔

حلّ لُغات۔ تَلَظّٰى تَلَظّٰى اصل میں تَتَلَظّٰى ہے مگر تاء گر گئی ہے اور تَلَظَّتِ النَّارُ کے معنے ہیں

تَلَهَّبَتْ۔ آگ بھڑک اٹھی۔(اقرب)

تفسیر۔ كَذَّبَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ صحیح اعتقاد نہیں رکھتا تھا اور تَوَلّٰی میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ صحیح جذبات اور صحیح عمل سے کام نہیں لیتا تھا۔ پس چونکہ فکری، جذباتی اور عملی تینوں خرابیاں اس میں پائی جاتی تھیں اس لئے اس کا انجام اچھا نہ ہوا۔ كَذَّبَ کا لفظ اعتقادی خرابیوں کے لئے آیا ہے اور تَوَلّٰی کا لفظ جذبات اور اعمال کی خرابی پر دلالت کرتا ہے۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۸﴾

اور جو بڑا متقی ہوگا وہ ضرور اس سے دور رکھا جائے گا۔

تفسیر۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى سے یہ مراد نہیں کہ صرف ایسا شخص ہی دوزخ کی آگ سے بچایا جائے گا جو بہت متقی ہو۔ معمولی درجہ کا مومن نہیں بچایا جائے گا۔ کیونکہ یہاں تقویٰ کا تقویٰ سے مقابلہ نہیں بلکہ تقویٰ اور کفر کا مقابلہ ہے۔ پس اس آیت کے یہ معنے نہیں کہ متقیوں میں سے زیادہ نیک بچایا جائے گا بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ تم بھی اپنے متعلق کہتے ہو کہ ہم میں تقویٰ پایا جاتا ہے اور مومن بھی اپنے متعلق کہتے ہیں کہ ہم میں تقویٰ پایا جاتا ہے اب ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ان کا تقویٰ صحیح ہے لیکن تمہارا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ تم میں تقویٰ پایا جاتا ہے گویا یہاں مومنوں کے تقویٰ کا کفار کے خیالی تقویٰ سے مقابلہ کیا گیا ہے ورنہ یہ معنے نہیں کہ سب سے اعلیٰ متقی تو بہشت میں جائے گا اور ادنیٰ درجہ کے مومن اور متقی بہشت سے محروم رہیں گے۔ ایسے معنے کرنے قرآن کریم کی ان آیات کے بالکل خلاف ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر یہ فرمایا ہے کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال:۸) جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی نیکی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں کرتا۔ پس جنت میں تو ہر مومن اور متقی جائے گا خواہ وہ تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر ہو یا تقویٰ کے ادنیٰ مقام پر ہو اور جب قرآن کریم نے یہ مضمون بیان فرما دیا ہے تو اس آیت کے یہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ صرف اعلیٰ درجہ کا متقی ہی دوزخ کی آگ سے بچایا جائے گا۔

پس ظاہر ہے کہ یہاں مومنوں کے اتقا کا آپس میں مقابلہ نہیں کیا گیا بلکہ کفار اور مسلمانوں کے تقویٰ کا باہمی مقابلہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس وقت دو تقویٰ کے دعویدار ہیں کافر بھی کہتا ہے کہ میں متقی ہوں اور مومن بھی کہتا

ہے کہ میں متقی ہوں۔ اب ان میں سے جو اَتْقٰی ہے یعنی جس کا تقویٰ بھاری ہے اور جس کے کاموں میں رضاء الٰہی حاصل کرنے کی روح زیادہ پائی جاتی ہے وہی دوزخ کی آگ سے بچایا جائے گا چنانچہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تشریح بھی کر دی ہے کہ وہ اَتْقٰی کون ہے۔

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٩﴾

(ایسا متقی) جو اپنا مال (اس طرح خدا کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اس سے) تزکیہ حاصل کرے۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿٢٠﴾

اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں کہ اس (عطا) سے (اس احسان کا) بدلہ اتارا جاتا ہو۔

تفسیر۔ اَتْقٰی کون ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ اَتْقٰی کی تشریح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کون ہے فرماتا ہے اَتْقٰی وہ ہے جو اپنا مال اس نیت اور ارادہ سے دیتا ہے کہ میں پاک ہو جاؤں۔ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى اَيْ حَالَ كَوْنِهٖ يَتَزَكّٰى کہ وہ اپنا مال دیتا ہے ایسی حالت میں کہ وہ پاک ہونا چاہتا ہے۔ دوسری بات اس میں یہ ہوتی ہے کہ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى کسی شخص کا اس پر کوئی احسان نہیں ہوتا کسی کی نعمت میں سے کوئی نعمت اس کے پاس نہیں ہوتی یعنی کسی کا سابق احسان اس پر نہیں ہوتا جس کا وہ بدلہ دے رہا ہو۔ اس کے اعمال کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ میں کسی کا احسان اتاروں بلکہ وہ ایسے اعمال کرتا ہے جن سے اس کا دوسروں پر احسان ہو جاتا ہے گویا وہ یہ تو چاہتا ہے کہ اس کا کسی نہ کسی رنگ میں دوسروں پر احسان ہو مگر وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس پر کسی کا احسان ہو۔

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢١﴾

ہاں مگر اپنے عالی شان رب کی خوشنودی حاصل کرنا (اس کا مقصود ہوتا ہے)۔

حلّ لُغات۔ اَلْوَجْهُ اَلْوَجْهُ کے معنے ہیں اَلْمَرْضَاةُ۔ رضامندی۔ (اقرب)

تفسیر۔ مومن کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اموال اس رنگ میں خرچ کرتا ہے کہ اس پر کسی کا احسان نہیں ہوتا جس کا وہ بدلہ اتار رہا ہو بلکہ بغیر اس کے کہ اس پر کسی کا سابق احسان ہو وہ اپنے رب کی رضامندی حاصل

کرنے کے لئے صدقہ وخیرات کرتا یا بنی نوع انسان کی امداد کے لئے اپنا روپیہ صرف کرتا ہے۔ یہاں رب کی صفت اعلیٰ بیان فرمائی ہے جو سب سے بڑا ہے اس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بے شک انسانوں پر دوسرے انسانوں کے بھی احسان ہوتے ہیں لیکن چونکہ اصل محسن اللہ تعالیٰ ہے اور سب سے زیادہ وہی مربّی ہے اس لئے مومن اس کی رضا کو سب دوسرے محسنوں کی رضا پر مقدم کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کام کیا تو چونکہ سب احسانوں کا منبع وہ ہے اس لئے سارے ہی محسنوں کا بدلہ بھی اتر گیا۔

وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۲﴾ ع ۲۲/۱۷

اور وہ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جب ایک شخص اپنے اموال خرچ کرتا ہے اور اس کے مدنظر محض خدا تعالیٰ کی رضامندی ہوتی ہے یہ غرض نہیں ہوتی کہ وہ کسی سابق احسان کا بدلہ اتارے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ تو میری رضا کے لئے اس قدر جدوجہد کرے اور میں اس سے راضی نہ ہوں۔ جب وہ خدا کی رضا کے لئے ایسا کر رہا ہے تو یقیناً خدا بھی اس سے راضی ہو جائے گا۔ جب ایک کمزور اور ناتوان بندہ دنیا سے اپنی توجہات ہٹا کر محض خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے اموال کو قربان کر رہا ہو تو خدا تعالیٰ کی شان سے یہ بالکل بعید ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنی رضا کی خلعتِ فاخرہ نہ پہنائے اور اسے اپنے پیاروں میں شامل نہ کر لے ایسا شخص یقیناً اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا اور خدا تعالیٰ کی رضا کا ایک دن وارث ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دنیا کے طریق اور اس کے معمول کے خلاف اپنی قربانی کا لوگوں سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ دنیا میں لوگ قربانیاں کرتے ہیں تو اس لئے کہ انہیں عہدے مل جائیں یا افسران بالا کی خوشنودی اُن کو حاصل ہو جائے یا ان کی تنخواہ میں اضافہ ہو جائے یا پبلک میں اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے مگر یہ وہ شخص ہوتا ہے جو ہر قسم کی دنیوی غرض سے اپنے دل کو صاف کر دیتا ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ میری تعریف کریں یا میرے کاموں پر واہ وا کے نعرے بلند کریں یا مجھے پبلک میں کوئی خاص عزت دی جائے وہ صرف اپنے رب کی رضا کا بھوکا ہوتا ہے اور اس کے مدنظر محض یہ بات ہوتی ہے کہ جس طرح میں دوسروں کا خیال رکھتا ہوں اسی طرح اللہ تعالیٰ میرا خیال رکھے اور وہ میرے گناہوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے مجھ سے راضی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو چھوڑ کر میرے دروازہ پر آ گرا ہے اور ہر قسم کی خوشنودیوں کو اس نے محض میری خوشنودی کے

لئے ترک کر دیا ہے تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ میں اس کا خیال نہ رکھوں، جس طرح اس نے اِبْتِغَآءَ لِوَجْهِ اللهِ اپنے اموال کی قربانی کی ہے اسی طرح میں اس پر راضی ہوجاؤں گا اور اسے اپنے قرب میں جگہ دوں گا۔

وَ لَسَوْفَ یَرْضٰی میں وہی بات بیان کی گئی ہے جو یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (الفجر:۲۸،۲۹) میں بیان کی گئی تھی۔ صرف یہ فرق ہے کہ وہاں رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً کے الفاظ تھے اور یہاں یہ الفاظ ہیں کہ وَ لَسَوْفَ یَرْضٰی۔ ورنہ مفہوم اور معانی کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ بندے کی خواہش یہ تھی کہ میرا خدا مجھ سے راضی ہوجائے گویا بندے کا راضی ہونا اس پر منحصر تھا کہ اُس کا خدا تعالیٰ اس سے راضی ہوجائے وَ لَسَوْفَ یَرْضٰی نے بتا دیا کہ وہ مَرْضِیَّةً بن جائے گا یعنی خدا اس سے راضی ہو جائے گا اور چونکہ یہی بندہ کی خواہش تھی اس لئے خدا تعالیٰ کے راضی ہونے کے بعد یہ بھی راضی ہوجائے گا اور جب یہ مقام اسے حاصل ہوجائے گا تو پھر یہ بھی یقینی بات ہے کہ وہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (الفجر:۳۰،۳۱) کا بھی مستحق ہوجائے گا اور جس شخص کو جنت حاصل ہوجائے وہ ہر قسم کی مکروہات سے امن میں آجاتا ہے۔

غرض اس سورۃ کا اختتام اللہ تعالیٰ نے اس بات پر فرمایا ہے کہ مسلمان دنیا میں کامیاب ہوں گے لیکن کفار باوجود اپنی شدید مخالفت کے کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ مسلمانوں کی محنت اور ان کی قربانیاں اور کفار کی سستی اور ان کا قربانیوں میں حصہ نہ لینا، مسلمانوں کے اندر افاضہ اور استفاضہ دونوں قوتوں کا موجود ہونا اور کفار کے اندر افاضہ کی قوت کا نہ ہونا اور استفاضہ کی قوت سے کام نہ لینا ان دونوں کا ایک نتیجہ نہیں نکل سکتا کیونکہ کفار اور مسلمانوں کے کام بالکل الگ الگ ہیں۔ مسلمانوں کے کاموں سے خدا راضی ہوجائے گا لیکن کفار کے کاموں سے نہیں۔ یہاں گو الٹ نتیجہ اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں کیا مگر وہ نتیجہ خود بخود نکل آتا ہے کہ کفار کو ان کے کاموں کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں ہوگی اور وہ اس کے غضب کا نشانہ بن کر تباہ و برباد ہوجائیں گے۔

سورۃ الضُّحٰی مَکِّیَّۃٌ

سورۃ ضحٰی ۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَھِیَ اِحْدٰی عَشْرَۃَ اٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَ فِیْھَا رَکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اوراس کی بسم اللہ کے سوا گیارہ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ ضُحٰی مکی ہے ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نَزَلَتْ بِمَکَّۃَ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔بعض کہتے ہیں فَتْرَۃُ الْوَحْیِ کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی تھی اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ سورۃ پڑھتے یا اس کی تلاوت سنتے تو اس وقت تکبیر کہنے کا حکم دیتے۔بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آپ صرف اتنا کہتے کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہو لیکن بعض دوسری روایات میں یہ آیا ہے کہ آپ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ فرمایا کرتے تھے۔

سورۃ کے وجہ نزول کے متعلق بعض بیان کردہ وجوہات بخاری میں روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ بیمار ہوئے اور تہجد کے لئے نہ اٹھے دو تین راتیں اس طرح گذر گئیں اس پر ایک ہمسایہ مخالف عورت آئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہنے لگی معلوم ہوتا ہے تیرے شیطان نے (نعوذ باللہ) تجھے چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ دو تین رات سے تیرے پاس نہیں آیا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہجد کے وقت آپ بلند آواز سے تلاوت کیا کرتے تھے اور وہ اپنے خیال میں یہ سمجھتی تھی کہ آپ جو قرآن پڑھ رہے ہیں یہ درحقیقت کوئی سکھانے والا آپ کو سکھا رہا ہے جب بیماری کی وجہ سے آپ نہ اٹھے اور دو تین راتیں اسی حالت میں گذر گئیں تو اس نے قیاس کیا کہ نعوذ باللہ آپ کو جو شخص سکھاتا تھا یا جو روح سکھاتی تھی اس نے آپ کو چھوڑ دیا ہے اس پر سورۃ الضُّحٰی نازل ہوئی۔

جندبؓ سے روایت ہے کہ حضرت جبرائیل کچھ عرصہ تک وحی لے کر نہ اترے اس پر کفار نے کہا قَدْ وُدِّعَ مُحَمَّدٌ (صلعم) محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو بھی کلام اترتا تھا اس کا اترنا اب بند ہو گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے چھوڑ دیا گیا ہے فَنَزَلَتْ مَا وَدَّعَكَ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ وَالضُّحٰی۔وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔

جندبؓ سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ ایک دفعہ کچھ عرصہ تک وحی بند رہی تو آپ کی ایک چچیری بہن نے کہا

مَا اَرٰی صَاحِبَكَ اِلَّا قَدْ قَلَاكَ کہ میرا تو یہ خیال ہے کہ تمہارا صاحب تم سے خفا ہو گیا ہے اس نے صاحب کا لفظ اس لئے بولا کہ جو لوگ خدا کو اس کلام کا نازل کرنے والا قرار دیتے ہیں وہ اس سے خدا مراد لے لیں اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیطان آپ پر یہ کلام نازل کیا کرتا ہے وہ اس سے شیطان مراد لے لیں۔ بہر حال اس نے کہا جو بھی کلام نازل کیا کرتا تھا خواہ وہ خدا تھا یا شیطان معلوم ہوتا ہے وہ اب تم سے خفا ہو گیا ہے اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

یہ مختلف روایات ہیں جو اس سورۃ کے نزول کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ایک میں آتا ہے کہ ایک ہمسائی نے آکر کہا۔ایک میں آتا ہے کہ لوگوں میں یہ چرچا ہوا اور ایک میں آتا ہے کہ آپ کی چچیری بہن نے کہا۔اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہم یہ کہیں کہ یہ ساری روایتیں غلط ہیں اور فیصلہ کر دیں کہ ان روایات کا سورۃ کے نزول سے کوئی بھی تعلق نہیں اور یا پھر یہ طریق اختیار کریں جو میرے نزدیک صحیح ہے کہ ایک وقت میں ایک واقعہ پر مختلف لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں اور ان چہ میگوئیوں کو اس واقعہ سے کسی ملتی جلتی عبارت کے ساتھ چسپاں کر لیا جاتا ہے مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک دفعہ الہام ہوا۔ A word and two girls ''اے ورڈ اینڈ ٹو گرلز'' (تذکرہ صفحہ ۵۵۸ ایڈیشن ۲۰۲۲ء) حافظ احمد اللہ صاحب ان دنوں قادیان آرہے تھے راستہ میں انہوں نے کسی دوست سے پوچھا کہ کوئی تازہ وحی سناؤ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی ہو اس نے کہا ابھی ایک الہام ہوا ہے کہ ''اے ورڈ اینڈ ٹو گرلز''۔حافظ احمد اللہ صاحب نے جھٹ کاغذ لیا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لکھا مبارک ہو الہام پورا ہو گیا میں اکیلا نہیں آیا بلکہ میرے ساتھ دو لڑکیاں بھی آرہی تھیں اور یہ الہام اسی واقعہ پر چسپاں ہوتا ہے۔پھر میں نے بعض اور لوگوں کو دیکھا کہ ان میں سے جس کی بھی دو بیٹیاں اور ایک لڑکا تھا اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ الہام میرے متعلق ہے۔میرا خیال ہے کہ ہماری جماعت میں دو درجن کے قریب ایسے لوگ تھے جنہوں نے مختلف پیرایوں میں یہ الہام اپنے اوپر چسپاں کیا۔تو بعض دفعہ ایک ملتی جلتی چیز ہوتی ہے جسے انسان اپنے خیال میں کسی الہام پر چسپاں کر دیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ میں نے اس الہام کے شانِ نزول کا پتہ لگا لیا حالانکہ الہامات کے معانی ہمیشہ ان کی ترتیب سے سمجھے جاتے ہیں اگر اس ترتیب سے وہ علیحدہ کر لئے جائیں تو ہر ٹکڑہ کے کوئی نہ کوئی معنے ہو جائیں گے مثلاً کوئی شخص کہتا ہے۔ادھر آؤ۔اب یہ الفاظ ایسے ہیں جو ہر شخص استعمال کر سکتا ہے مگر موقعہ کے لحاظ سے پتہ لگ جائے گا کہ اس کا مخاطب کون شخص ہے۔فرض کرو زید سامنے ہو اور اس وقت کوئی شخص آواز دے کہ ادھر آؤ تو ہر شخص سمجھ جائے گا کہ اس سے مراد زید ہے کوئی اور شخص نہیں۔لیکن اگر اس فقرہ کو موقعہ سے الگ کر لو تو دنیا کے ہر شخص پر یہ چسپاں ہو جائے گا۔اسی طرح یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ آیت فلاں موقعہ پر نازل ہوئی

ہے اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ قریب زمانہ میں اس سے کوئی ملتا جلتا واقعہ لوگوں کو نظر آتا ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ یہی واقعہ اس آیت کے نازل ہونے کا اصل سبب ہے چنانچہ وہ اس آیت کو اپنی سمجھ کے مطابق اس واقعہ پر چسپاں کر دیتے ہیں اور اگر ایک سے زیادہ ملتے جلتے واقعات ہوں تو مختلف لوگوں کی قیاس آرائیوں کی وجہ سے اس قسم کی روایات میں بہت کچھ اختلاف واقع ہو جاتا ہے جیسا کہ اسی سورۃ کے شانِ نزول کے متعلق تین مختلف واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ کوئی ہمسائی عورت کا واقعہ پیش کرتا ہے۔ کوئی کفار کے عام خیالات کو اس سورۃ کے نزول کا اصل باعث قرار دیتا ہے اور کوئی آپ کی ایک چچیری بہن کا واقعہ اس کا موجب قرار دیتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ابتدائی سورۃ ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی ایام میں کچھ دنوں کے لئے وحی رکی بھی ہے کیونکہ منشاء الٰہی یہ تھا کہ آپ پر نزول وحی کی وجہ سے جو ہیبت طاری ہوئی ہے اس پر کچھ وقت گزر جائے اور وحی آپ میں سموئی جائے۔ پہلے پہلے جب ایک واقعہ ہوتا ہے تو انسان اس کی اہمیت کو فوراً نہیں سمجھ جاتا بلکہ آہستہ آہستہ اس کے قلب پر حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک موقعہ پر مدینہ والوں نے کہا کہ یا رسول اللہ وہ وقت اور تھا جب ہم نے آپ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ اگر دشمن مدینہ پر حملہ آور ہوا تو ہم آپ کی مدد کریں گے لیکن اگر مدینہ سے باہر جا کر لڑنا پڑا تو ہم مدد کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ یا رسول اللہ وہ وقت ایسا تھا جب ہمیں آپ کی حقیقت کا علم نہیں تھا اور اسی وجہ سے ایسا معاہدہ کیا گیا مگر اب ہم پر آپ کی حقیقت کھل چکی ہے، آپ کی شان اور عظمت کا ہمیں علم ہو چکا ہے اس لئے اب کسی معاہدے کا سوال نہیں۔ ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور آپ کے بائیں بھی لڑیں گے، آپ کے آگے بھی لڑیں گے اور آپ کے پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گذرے۔ تو اہم واقعات کو فوراً سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اُن کی حقیقت کھلتی ہے اور انسان کو پتہ لگتا ہے کہ الٰہی منشاء کیا ہے۔

فترۃ وحی کی وجہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے وحی نازل کی اور پھر ایک وقفہ ڈال دیا۔ اس عرصہ میں آپ نے وحی پر تدبر کیا، اپنے کام کی اہمیت کو سمجھا اور اس طرح اپنے ایمان اور اپنے عزم اور اپنے استقلال میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ کر لیا۔ جب خدا تعالیٰ نے دیکھا کہ اب فزع کا کوئی سوال نہیں رہا، آپ کام کے لئے تیار ہو چکے ہیں اور وحی والہام کی اہمیت آپ کے دل میں داخل ہو چکی ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیغام پر پیغام دینے شروع کر دیئے۔ غرض پیغام اور پیغام کی تیاری میں کچھ وقفہ چاہیے وہ وقفہ اس طرح ہوا کہ پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ والی سورۃ نازل ہوئی۔ پھر سورۃ المدثر وغیرہ نازل ہوئیں۔ یہ سورتیں آپ کی طرف اللہ تعالیٰ کا پیغام لائی تھیں، آئندہ کے متعلق کئی قسم کی بشارات

اپنے اندر رکھتی تھیں اور آپ کو یہ کہنے آئی تھیں کہ ایک بہت بڑا کام تمہارے سپرد کیا جارہا ہے اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ کام کس رنگ میں ہونا تھا اور کیا کیا محنتیں آپ کو اس غرض کے لئے کرنی تھیں۔ اس کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دماغ کو تیار ہونا چاہیے تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ادھر الہام ہوتا اور ادھر کہہ دیا جاتا کہ جاؤ اور کام کرو۔ درمیان میں بہر حال ایک وقفہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ گذشتہ انبیاء کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا یہی سلوک رہا ہے کہ پہلے ان کو الہام ہوا اور پھر ایک وقفہ پیدا کیا گیا تا کہ اس عرصہ میں ان کا دماغ آئندہ کے کام کے متعلق پوری طرح تیار ہو جائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھو فلسطین سے جاتے ہوئے آپ کو الہام ہوا کہ يٰمُوْسٰى۔ اِنِّيْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰهٰ: ۱۲، ۱۳) اے موسیٰ میں ہی تیرا رب ہوں پس اپنی جوتیاں اتار دے کیونکہ تو مقدس وادی طویٰ میں ہے۔ مگر اس کے بعد ایک وقفہ ہوا اور مصر پہنچ کر دوبارہ وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ فلسطین سے اس زمانہ میں مصر پہنچنا کوئی معمولی بات نہیں تھی کم سے کم دو مہینے صرف ہو جاتے تھے بلکہ بعض دفعہ چھ چھ ماہ بھی صرف ہو جاتے کیونکہ مخدوش راستوں کی وجہ سے قافلوں کے ساتھ سفر کیا جاتا تھا اور بعض دفعہ تو قافلہ جلد مل جاتا اور بعض دفعہ چھ چھ ماہ تک انتظار کرنا پڑتا کہ کب قافلہ تیار ہو اور اس سفر کو طے کیا جائے۔ یہ تیاری کا وقت تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملا کہ چند ماہ پہلے ابتدائی وحی نازل ہوئی پھر ایک وقفہ پیدا کیا گیا تا کہ اس عرصہ میں آپ اپنے کام کی اہمیت کے مطابق تیاری کر لیں اور جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ تیاری مکمل ہو چکی ہے تو اس کے بعد تورات کا نزول ہوا۔ ایسا ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے کچھ وقفہ پیدا کر دیا۔ آپ اس وقفہ میں ان تمام باتوں کو سوچتے رہے اور غور کرتے رہے کہ الٰہی منشاء کیا ہے۔ جب دنیا کے حالات پر آپ نے غور کیا اور سمجھ لیا کہ یہ یہ خرابیاں ہیں جن کو میں نے دور کرنا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے آپ کی توجہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی طرف پھیر دیا اور قوم کے حالات کو بھی آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا اور اس کی اصلاح کے لئے کمر باندھ لی تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ہمت بندھانے کے لئے کچھ بشارتیں نازل ہوئیں۔ اسی طرح دشمنوں کے متعلق کچھ انذار کی خبریں نازل ہونی شروع ہوگئیں۔ اس دوران میں دشمنوں نے جو جو باتیں کیں لوگوں نے ان تمام باتوں کو اس سورۃ پر چسپاں کر دیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ سورۃ ان واقعات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے حالانکہ اس سورۃ کا ان واقعات کے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہیں۔ ایک عورت نے کوئی بات کہہ دی تو اس کا وَالضُّحٰى۔ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کے ساتھ کیا جوڑ ہوا؟ اگر عورت یہ بات نہ کہتی تو کیا خدا تعالیٰ آپ کو تسلی نہ دیتا؟ ہم مان لیتے ہیں کہ مکہ والوں نے یہ باتیں کہیں، یہ بھی مان لیتے ہیں کہ آپ کی کسی چچیری بہن نے

کوئی بات کہی اور اس وقت کہی جب اس سورۃ کے کچھ حصوں سے ان باتوں کا توارد ہو گیا مگر پھر بھی یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سورۃ انہی واقعات کی وجہ سے نازل ہوئی ہے اگر یہ واقعات نہ ہوتے تو یہ سورۃ نازل نہ ہوتی۔

درحقیقت اکثر محل قرآن کریم کی آیات کے نزول کے جو لوگوں کی طرف سے بتائے جاتے ہیں حقیقتاً ایسے نہیں۔ اسی لئے ان میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جیسے اس جگہ ہوا کہ کوئی کہتا ہے ایک ہمسائی عورت کی ایک بے معنی بات کی وجہ سے یہ سورۃ نازل ہوئی۔ کوئی کہتا ہے کفار میں چونکہ فترۃ الوحی پر عام چرچا ہو گیا تھا اس لئے یہ سورۃ نازل ہوئی۔ کوئی کہتا ہے اس سورۃ کے نزول کا محرک آپ کی چچیری بہن کا واقعہ ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی آیات ہیں جن کے متعلق بعض صحابی کہتے ہیں کہ یہ میرے متعلق نازل ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ میرے متعلق نازل ہوئی جیسے ’’اے ورڈ اینڈ ٹو گرلز‘‘ کے الہام پر بہت سے احمدیوں کو غلط فہمی ہو گئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ الہام ہمارے متعلق ہے۔

سرمیور کے نزدیک یہ سورۃ سورۃ البلد کے بعد کی نازل شدہ ہے لیکن نولڈکے کے نزدیک سورۃ الانشراح کے بعد نازل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک یہ سورۃ اپنے مضمون سے ظاہر کرتی ہے کہ بہت ہی ابتدائی سورتوں میں سے ہے کیونکہ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا ہے فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ یعنی یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو ردنہ کرو۔ لیکن پہلی سورتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ مسلمان ایسا ہی کرتے ہیں۔ پس اگر روایات کی تائید میں یہ بات پیش کی جائے کہ اس میں چونکہ حکم دیا گیا ہے کہ ایسا کرو اور عمل ہمیشہ حکم کے بعد ہوتا ہے اس لئے یہ اندرونی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ سورۃ پہلے نازل ہوئی ہے اور دوسری سورتیں جن میں مسلمانوں کے عمل کا ذکر ہے وہ اس کے بعد نازل ہوئی ہیں تو یہ بات قرین قیاس سمجھی جا سکتی ہے لیکن یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ابتدائی حکم نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس سورۃ کے شروع میں جن انعامات کا وعدہ دیا گیا ہے یا جن انعامات کے ظہور کی خبر دی گئی ہے جب وہ انعامات نازل ہو جائیں تو ان کے شکریہ کے طور پر جو عمل کرنے کے لئے کہا جائے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اس وقت نازل ہوا ہے جیسے حضرت زکریا علیہ السلام کو کہا گیا کہ تو نے روزے رکھنے ہیں (مریم رکوع۱) اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ روزے اسی وقت فرض ہوئے تھے اس سے پہلے نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ فرض تو پہلے سے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اب بھی تم روزے رکھو۔ اس لئے ضروری نہیں کہ ہم قطعی طور پر ان احکام سے یہ نتیجہ نکال سکیں کہ چونکہ ان میں حکم ہے اور حکم پہلے ہونا چاہیے اور عمل بعد میں۔ اس لئے یہ سورۃ بہت پہلے نازل ہوئی ہے بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس سورۃ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ گو یہ کام پہلے بھی تم کرتے ہو مگر جب یہ

الہامات نازل ہوجائیں تو ان کے شکریہ کے طور پر اور بھی ان کاموں کی طرف توجہ کرنا۔

ترتیب پہلی سورتوں اور اس سورۃ کا مضمون اس لحاظ سے ایک ہی ہے کہ ان میں مکہ والوں کی اسی قسم کی بدیوں کا ذکر تھا جو یتامیٰ اور مساکین کی نسبت ان سے سرزد ہوتی تھیں۔ اور اس میں بھی یتامیٰ اور مساکین کا ہی ذکر ہے اور اموال کی حفاظت اور ان کو صحیح طور پر خرچ کرنے کی نصیحت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سورۃ الضحیٰ میں صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ذریعہ آپ کے اتباع کو ایسا کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور پہلی سورتوں میں یہ مقابلہ تھا کہ دوسرے ایسا نہیں کرتے لیکن مسلمان ایسا کرتے ہیں۔

سورۃ ضحیٰ کا تعلق پہلی سورۃ سے اس سورۃ کا دوسرا تعلق پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ پہلی سورتوں میں یہ ذکر تھا کہ بندہ خدا تعالیٰ سے کیا سلوک کرتا ہے اور یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ بندے سے کیا سلوک کرتا ہے مثلاً پہلی سورۃ میں زیادہ زور اس بات پر تھا کہ بندہ خدا تعالیٰ کے لئے صدقہ و خیرات کرتا ہے۔ جیسے فرمایا تھا وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ـ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ـ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ـ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ـ وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى ـ گویا وہاں نیک اور متقی بندے کے عمل کا ذکر تھا کہ وہ یوں کرتا ہے لیکن یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے نیک اور متقی بندے یعنی نفسِ کامل سے کیسا سلوک کرتا ہے۔ گویا پہلی سورتوں کے مضامین بالخصوص سورۃ الیل کے مضمون کا یہ تتمہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

وَالضُّحٰى ② وَ الَّيْلِ اِذَا سَجٰى ③ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ

(مجھے) قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہوجائے۔ اور رات کی جب وہ قائم ہوجائے۔ کہ نہ تیرے رب نے تجھے ترک کیا ہے۔

وَ مَا قَلٰى ④

اور نہ تجھ سے ناراض ہوا ہے۔

حلّ لُغات۔ ضُحٰی ضُحٰی: تھوڑا سا دن نکل چکے تو اس وقت سے ضُحٰی شروع ہوتی ہے اور زوال تک جاتی

ہے لیکن بعض کے نزدیک زوال کے قریب جا کر ضُحٰی کا وقت نہیں رہتا بلکہ وہ ضُحَاءٌ کہلاتا ہے۔(اقرب)

سَجٰی سَجٰی کے معنے ہیں جب اندھیرا ترقی کرتے کرتے اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ چنانچہ مفردات میں لکھا ہے وَ الَّیْلِ اِذَا سَجٰی اَیْ سَکَنَ (مفردات)۔ جب رات ٹھہر جاتی ہے اور اس کا اندھیرا اور نہیں بڑھتا جتنا اس نے بڑھنا ہوتا ہے وہ بڑھ جاتا ہے۔

وَدَّعَكَ وَدَّعَكَ: وَدَّعَ الرَّجُلَ کے معنے ہوتے ہیں هَجَرَهٗ کسی کو چھوڑ دیا۔(اقرب)

قَلٰی قَلٰی: قَلَا فُلَانٌ (قِلًی وَ قَلَاءً) کے معنے ہوتے ہیں اَبْغَضَهٗ وَ کَرِهَهٗ غَايَةَ الْکَرَاهَةِ فَتَرَکَهٗ۔ کسی پر ناراضگی کا اظہار کیا اور اس کو انتہائی طور پر ناپسند کیا اور ناپسندیدگی کی بناء پر چھوڑ دیا۔ جب قَلَا الْاِبِلَ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں طَرَدَهَا وَ سَاقَهَا۔ اس نے اونٹ کو چلایا اور دھتکارا یعنی اسے مار کے آگے ہنکایا۔ قَلَا الْاِبِلَ میں قلا واوی ہے یعنی آخر میں اصل واو ہے اور قَلٰی فُلَانٌ میں آخر میں یاء ہے۔(اقرب)

تفسیر۔آنحضرتؐ کی زندگی میں ایک رات اور ایک ضُحٰی کا خاص واقعہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں ایک ضُحٰی اور ایک لیل خصوصیت رکھتی ہیں۔ضُحٰی وہ دوپہر ہے جبکہ آپ مکہ کو فتح کر کے اس میں داخل ہوئے تھے اور وَ الَّیْلِ اِذَا سَجٰی سے مراد وہ رات ہے جب کہ آپ نے مکہ کو چھوڑا تھا گویا وَ الضُّحٰی کے معنے ہوئے ایک خصوصیت رکھنے والا دن۔ اور وَ الَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے معنے ہوئے ایک خصوصیت رکھنے والی رات۔ اور درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کے بڑے واقعات اگر کوئی خلاصۃً پوچھے تو یہی دو ہیں۔ دشمنوں نے آپ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا پھر خدا تعالیٰ نے اپنے خاص نشانات سے دشمنوں کو تباہ کر کے آپ کو ایک فاتح کی حیثیت میں مکہ میں داخل فرمایا۔ انہی دو واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم تیری سچائی کی شہادت کے طور پر یا اگلے مضمون کی سچائی کو واضح کرنے کے لئے ایک ضُحٰی کو پیش کرتے ہیں اور ایک ایسی رات کو پیش کرتے ہیں جو تاریکی سے اپنے اردگرد کی تمام چیزوں کو ڈھانپ لے گی۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ یہاں ضُحٰی پہلے ہے اور رات پیچھے حالانکہ فتح مکہ بعد میں ہوئی ہے اور ہجرت پہلی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں آتا ہے رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (بنی اسرآءیل:۸۱) ان آیتوں میں صاف پیشگوئی فتح مکہ کی ہے کیونکہ فتح مکہ کے موقعہ پر ہی آپ بت توڑتے اور یہ فرماتے جاتے تھے کہ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا (جو اوپر کی آیات کے بعد آتا ہے) گویا آپ نے اپنے عمل سے واضح فرما دیا کہ وہ

جو پیشگوئی کی گئی تھی کہ رَبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا آج پوری ہوگئی ہے۔اس آیت میں بھی اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ کو پہلے رکھا گیا ہے جس میں مکہ میں داخل ہونے کی خبر دی گئی تھی اور اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ کو بعد میں بیان کیا گیا ہے جس میں ہجرت کی پیشگوئی تھی حالانکہ ہجرت پہلے ہوئی تھی اور فتح مکہ بعد میں۔اس کی وجہ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں یہ ہے کہ الٰہی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے پیاروں سے بات کرتے ہوئے خوشی کی خبر پہلے سناتا ہے اور تکلیف کا ذکر بعد میں کرتا ہے تا کہ خوشی کی خبر رنج کی کلفت کو کم کرنے کا موجب بن جائے۔اس طرح دونوں مطلب پورے ہوجاتے ہیں غم کی خبر بھی سنا دی جاتی ہے اور خوشی کی خبر بھی سنا دی جاتی ہے مگر چونکہ پہلے خوشی کی خبر آجاتی ہے اس لئے تکلیف کا احساس نسبتاً کم ہوجاتا ہے۔ دنیا میں بھی ہوشیار پیغامبر کا یہی طریق ہوتا ہے جب کسی کا کوئی رشتہ دار بیمار ہو اور دوسرا شخص پوچھے کہ سناؤ میرے فلاں رشتہ دار کا کیا حال ہے تو وہ کہتا ہے الحمدللہ وہ اب اچھے ہیں پچھلے دنوں شدید بیمار ہوگئے تھے اس طرح وہ خوشی کی خبر بھی سنا دیتا ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہے کہ درمیان میں بعض ایسے اوقات بھی آگئے تھے جبکہ ڈاکٹر ان کی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے۔مگر بجائے یہ کہنے کے کہ ان کی حالت نہایت نازک ہوگئی تھی وہ پہلے یہ فقرہ کہتا ہے کہ الحمدللہ وہ اب اچھے ہیں اس کے بعد وہ غم کی خبر سناتا ہے یہی طریق ہر اچھے پیغامبر کا ہوتا ہے کہ وہ بعد کے اچھے انجام کو پہلے بتا دیتا ہے اور تکلیف کا بعد میں ذکر کرتا ہے۔لیکن اس کے بالکل الٹ بعض لوگوں کو ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی حماقت کی وجہ سے خطرہ کی بات کو پہلے بیان کریں گے اور خوشی کی خبر کو دبا کر بیٹھ جائیں گے اور ان سے پوچھا جائے کہ بتاؤ خیریت ہے تو وہ یہ نہیں کہیں گے کہ خیریت ہے بلکہ پہلے جب تک گھنٹہ بھر اپنا دکھڑا نہیں رولیں گے انہیں چین نہیں آئے گا۔اسی طرح جب کسی کے سپرد کوئی ضروری کام کیا جائے اور وہ کام کر کے واپس آئے تو آتے ہی ایک لمبی کہانی سنانی شروع کر دے گا اور بعد میں کہے گا کہ الحمدللہ کام ہوگیا۔اس سے یہ نہیں ہوسکتا کہ آتے ہی کہہ دے الحمدللہ کام ہوگیا بلکہ پہلے اپنی مشکلات کا رونا رونے لگتا ہے اور گھنٹہ بھر کے بعد کہتا ہے الحمدللہ میں کامیاب ہوگیا۔تو بعض طبائع ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں بات کرنے کا اس وقت تک مزا نہیں آتا جب تک وہ دوسرے کو اچھی طرح ڈرا نہ لیں مگر الٰہی طریق یہ ہے کہ وہ پہلے خوشی کی خبر سناتا ہے اور کہتا ہے ہم تمہیں بتا دیتے ہیں کہ نتیجہ اچھا ہوگا اس کے بعد وہ بتاتا ہے کہ درمیان میں کچھ تکلیفیں بھی آئیں گی کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ جب انجام بخیر ہے تو بات کو شروع کرتے ہی بندے کے دل کو دکھ دینا شروع کر دے۔یہی طریق رَبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ میں اختیار کیا گیا ہے کہ فتح مکہ کی خبر کو پہلے رکھا ہے اور ہجرت کا ذکر بعد میں کیا ہے۔جب مسلمانوں کو

پتہ لگ گیا کہ آخر ہم نے مکہ فتح کر کے اسی جگہ آنا ہے تو ان کو تسلی ہوگئی کہ درمیان میں اگر ہجرت بھی کرنی پڑی تو کیا ہوا۔ اسی بناء پر یہاں بھی وَالضُّحٰی کو پہلے اور وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کو بعد میں رکھا گیا ہے۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی میں ہجرت اور فتح مکہ کی طرف اشارہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ دو محل اس بات کو ثابت کر دیں گے کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ تیرے رب نے تجھے نہیں چھوڑا اور وہ تجھ سے ناراض نہیں ہوا اور چونکہ وہ غرض جو وَالضُّحٰی کو پہلے رکھنے کی تھی پوری ہوگئی تھی یعنی غرض یہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے صدمہ نہ پہنچے کہ تجھے ہجرت کرنی پڑے گی۔ اسی بناء پر خدا تعالیٰ نے رات کا ذکر پیچھے کر دیا اور دن کا ذکر پہلے رکھا مگر چونکہ اس آیت سے غرض پوری ہوگئی اس لئے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ترتیب اصلی کو قائم کر دیا۔ چنانچہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ جواب ہے وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کا اور مَا قَلٰی جواب ہے وَالضُّحٰی کا۔ چونکہ غرض پوری ہو چکی تھی اور اب اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ واقعاتی ترتیب کو بدلا جاتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلی آیات کی ترتیب کو الٹ دیا اور فرمایا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جب وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی میں بیان کردہ واقعہ ہوگا اور مکہ تجھے چھوڑنا پڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس وقت تجھے چھوڑے گا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غارِ ثور میں جب حضرت ابوبکر گھبرائے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ دشمن اتنا قریب پہنچ گیا ہے کہ اگر وہ ذرا اپنے سر کو جھکائے تو ہمیں اس غار میں سے دیکھ سکتا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا غم مت کر خدا ہمارے ساتھ ہے۔ (مجمع الزوائد کتاب المغازی و السیر باب الھجرۃ الی المدینۃ)۔ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کب فرمایا تھا کہ میں ہجرت کے گھڑیوں میں تیرے ساتھ ہوں گا تو اس کا جواب یہ ہے وہ الٰہی وعدہ اسی سورۃ میں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی میں بیان شدہ واقعہ کا ظہور ہوگا تو تیرا رب تجھے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ اسی وعدہ کی بناء پر آپ نے نہایت دلیری سے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ ابوبکر! کیوں گھبرا رہے ہو خدا ہمارے ساتھ ہے وہ پہلے سے یہ وعدہ سورۃ الضحیٰ میں کر چکا ہے پس ڈرنے کی بات نہیں۔ آخر یہ خدا تعالیٰ کی معیت ہی تھی کہ دونوں طرف قطار باندھے دشمن کھڑا ہے آپ کے مکان کا سنگین پہرہ دے رہا ہے اور آپ نہایت اطمینان کے ساتھ اس سے درمیان سے گزر جاتے ہیں اور وہ یہ خیال کر لیتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہیں بلکہ کوئی اور جا رہا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تاریخ میں یہ ذکر آتا ہے (گو حوالہ یاد نہیں رہا) کہ بعد میں ایک پہرے دار نے کہا کہ میں نے خود آپ کو مکان میں سے نکلتے اور وہاں سے گزرتے دیکھا مگر میں نے یہ نہیں سمجھا کہ آپ جا رہے ہیں بلکہ خیال کیا کہ کوئی اور جا رہا ہے۔ بہرحال یہ خدا تعالیٰ کی معیت ہی تھی کہ آپ دشمنوں کی نظروں کے سامنے نکل گئے اور وہ آپ کو پکڑ نہ سکا۔ پھر

یہ خدا تعالیٰ ہی کی معیت تھی کہ جب آپ غار ثور میں پہنچے تو باوجود اس کے کہ کفار کے کھوجی نے یہ کہہ دیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو یہاں ہیں اور یا پھر آسمان پر چلے گئے ہیں ان کو یہ جرأت تک نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر اس غار کے اندر جھانک سکیں وہ اپنے کھوجی پر مضحکہ اڑانے لگے کہ آج یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے کیا اس غار میں بھی کوئی چھپ سکتا ہے یا کوئی شخص آسمان پر بھی جا سکتا ہے کہ کہتا ہے کہ اگر وہ یہاں نہیں تو آسمان پر چلے گئے ہیں یہ خدا تعالیٰ کی معیت کا ایسا کھلا اور واضح ثبوت ہے کہ دشمن سے دشمن انسان بھی اس کو سن کر انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز فتح مکہ ہے اس کے لئے مَا قَلٰی کا لفظ خدا تعالیٰ نے استعمال کیا ہے۔ مکہ والوں کا یہ خیال تھا کہ جو شخص مکہ پر حملہ کرے گا خدا کا غضب اس پر نازل ہوگا۔ وہ ابرہہ کے حملہ کو دیکھ چکے تھے کہ کس طرح وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت حملہ آور ہوا اور پھر کس طرح خدا تعالیٰ نے اسے اپنے غضب کا نشانہ بنا دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مکہ پر حملہ کرنے والا چونکہ خدا تعالیٰ کی نارضامندی کا مورد بنتا ہے اس لئے وہ تباہ ہو جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیرے معاملہ میں ایسا نہیں ہوگا بلکہ ضُحٰی کا وقت اس بات کی شہادت دے گا کہ تیرا خدا تجھ سے ناراض نہیں اگر وہ ناراض ہوتا تو تجھ پر عذاب کیوں نازل نہ کرتا۔ تجھ پر اس کا عذاب نازل نہ کرنا بلکہ تیری تائید اور نصرت کرنا اور تیرے راستہ سے ہر قسم کی روکوں کو دور کرنا اور تجھے اپنے لشکر سمیت فتح و کامرانی کا جھنڈا اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہونے کا موقع دینا بتا رہا ہے کہ الٰہی منشاء یہی تھا کہ تو آئے اور اس بلد الحرام کو فتح کر کے اس میں داخل ہو جائے۔ پس وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی میں بیان شدہ واقعہ کے ظہور نے بتا دیا کہ خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں چھوڑا اور وَالضُّحٰی میں بیان شدہ واقعہ نے بتا دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل سے خدا تعالیٰ ناراض نہیں خواہ وہ صدیوں کے فیصلہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ابراہیمؑ کے وقت سے خدا تعالیٰ کی یہ سنت چلی آ رہی تھی کہ مکہ پر حملہ کرنا جائز نہیں جو شخص مکہ پر حملہ کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو فتح کرنے کے لئے جاتے ہیں رات کو نہیں بلکہ دن دہاڑے مکہ میں داخل ہوتے ہیں۔ دنیا بھی دیکھ رہی ہے خدا بھی دیکھ رہا ہے خدا تعالیٰ کے فرشتے بھی دیکھ رہے ہیں مگر آپ پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوتا۔ آپ کے لشکر پر کوئی تباہی نہیں آتی بلکہ اگر کچھ ہوتا ہے تو یہ کہ مکہ والوں کی گردنیں پکڑ کر خدا تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیتا ہے کہ ان سے جو چاہو سلوک کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مکہ میں داخلہ عین خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق تھا ورنہ ۲۵ سو سال سے جو سلوک اللہ تعالیٰ مکہ پر حملہ کرنے والوں کے ساتھ کرتا چلا آیا تھا وہ آپ کے ساتھ کیوں نہ کرتا۔ پس اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے تیری مکہ سے رات کے وقت ہجرت اس بات کا ثبوت ہوگی کہ خدا تعالیٰ نے تجھے نہیں چھوڑا اور تیرا دن دہاڑے مکہ میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہونا اس بات کا ثبوت ہوگا کہ خدا تجھ سے خفا نہیں ہے۔

وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى کے دوسرے معنے دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ضُحٰی روشنی اور سَجٰی اندھیرے پر دلالت کرتا ہے اور یہ دونوں حالتیں انسان پر آتی رہتی ہیں۔ یعنی کبھی اس پر تکالیف آتی ہیں اور کبھی اس کے لئے خوشی کے سامان پیدا کئے جاتے ہیں، کبھی کامیابیاں اور ترقیاں حاصل ہوتی ہیں اور کبھی ناکامیاں اور تکالیف پیش آتی ہیں یہ اتار چڑھاؤ دنیا میں ہمیشہ ہوتا رہتا ہے کبھی ترقی کا وقت آتا ہے تو کبھی تنزل کا، کبھی خوشی پہنچ جاتی ہے تو کبھی غم، کبھی اولاد پیدا ہوتی ہے کبھی مرجاتی ہے، کبھی بیمار ہوجاتا ہے کبھی تندرست ہوجاتا ہے، کبھی دشمن کو مغلوب کر لیتا ہے اور کبھی دشمن کے عارضی طور پر جیتنے کا موقعہ آجاتا ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ کا بھی ایک الہام ہے کہ

ع ''دشمن کا بھی ایک وار نکلا'' (تذکرہ ایڈیشن چہارم صفحہ ۵۲۴)

تو دشمن کے وار بھی نکل آتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو جیسے قرآن کریم میں ہی کئی جگہ نقشہ کھینچا گیا ہے وہ شور مچانے لگ جاتے ہیں کہ ہائے مارے گئے، ہائے مارے گئے۔ اس کے مقابل میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کو ترقیات ملتی ہیں تو وہ تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (القصص: ۷۹) ہمیں جو کچھ ملا ہے اپنے زور بازو سے ملا ہے، ہمارے اندر قابلیتیں ہی ایسی تھیں کہ ہمیں یہ ترقیات حاصل ہوتیں، ہم نے یوں کیا ہم نے ووں کیا اور پھر ہمیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ گویا جب ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکات حاصل ہوتی ہیں یا ترقیات سے ان کو حصہ ملتا ہے ان میں تکبر پیدا ہوجاتا ہے اور جب مشکلات آتی ہیں تو اس وقت بالکل مایوس ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جہاں دشمن ایسا ہے کہ اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کہتا ہے رَبِّيْۤ اَهَانَنِ (الفجر: ۱۷) میرے رب نے مجھے ذلیل کردیا اور خوشی پہنچتی ہے تو کہتا ہے رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ (الفجر: ۱۶)۔ ہاں جی ہم تو ہیں ہی ایسے کہ خدا ہماری عزت کرتا۔ ایسے لوگوں کے بالمقابل اے محمد رسول اللہ تیری یہ حالت نہیں بلکہ وَالضُّحٰى۔ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ ہم تیری یہ دونوں حالتیں دشمنوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تیرا نفس کامل اتنا اعلیٰ درجے کا ہے کہ تیرا سلوک اپنے رب سے ہمیشہ اس قسم کا ہوگا کہ ہر مایوسی اور تکلیف کے وقت خدا تجھے بھولے گا نہیں بلکہ یاد رہے گا۔ مایوسی کبھی تیرے قریب بھی نہیں آئے گی اور خوشی کے وقت کبھی تکبر تیرے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔ جب تجھ پر انعامات نازل ہوں گے تُو یہ نہیں کہے گا کہ میں نے یہ انعام بزورِ بازو حاصل کیا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کو ناراض کرلے گا

بلکہ تو کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے یہ انعام بخشا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی خفگی کو پاس بھی نہیں آنے دے گا۔ اسی طرح جب تجھے تکلیفیں آئیں گی اس وقت بھی تو خدا پر کوئی الزام نہیں لائے گا۔ بلکہ اسی کی کنار عاطفت کی طرف تو ہر وقت جھکا رہے گا اور اس وجہ سے خدا تعالیٰ تیرے پاس آ کھڑا ہوگا۔ اب دیکھو یہ دونوں چیزیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کتنی نمایاں نظر آتی ہیں۔

وہ بھی ایک لیل تھی جب آپ کو مکہ سے ہجرت کے لئے نکلنا پڑا اور غارِ ثور میں آپ پناہ گزیں ہوئے اور وہ بھی ایک لیل تھی جو آپ پر اس وقت آئی جب ابو طالب آپ کے چچا نے ایک دن آپ کو بلایا اور کہا اے میرے بھتیجے! اب تیری قوم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ آج بڑے بڑے رؤساء اکٹھے ہو کر میرے پاس آئے تھے اور وہ مجھے کہتے تھے کہ ابو طالب صرف تیری حفاظت کی وجہ سے ہم نے تیرے بھتیجے کو اب تک چھوڑا ہوا ہے۔ ہم نے تیرا بڑا لحاظ کیا کیونکہ تو شہر کا رئیس ہے مگر آخر یہ ظلم کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ہمارے بتوں کی پرستش کرے بلکہ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے بتوں کو برا نہ کہا کرے۔ اگر وہ اتنی معمولی سی بات بھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوا اور اس نے ہمارے معبودوں کو برا کہنا ترک نہ کیا تو ہم تجھے بھی سرداری سے جواب دے دیں گے اور آئندہ تیری کوئی عزت نہیں کریں گے۔ نمبردار کے لئے اپنی نمبرداری چھوڑنی بڑی مشکل ہوتی ہے اور دنیا میں سب سے بڑی مصیبت اگر اسے نظر آتی ہے تو یہی کہ کہیں مجھے اپنی چودھرائٹ نہ چھوڑنی پڑے۔ وہ اس بات کو برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ آج تو وہ اس شان کے ساتھ بیٹھا ہو کہ لوگ آتے ہوں اور کہتے ہوں چودھری صاحب آپ جو کچھ فرمائیں وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ ہم آپ کا حکم ماننے کے لئے تیار ہیں اور دوسرے دن اس کی یہ حالت ہو کہ لوگوں نے ڈنڈے اٹھائے ہوئے ہوں اور اسے کہتے ہوں کہ ہمارے گاؤں میں سے نکل جاؤ۔ ابو طالب چونکہ مسلمان نہیں تھے اس لئے ان کے لئے یہ بڑی مصیبت تھی۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے کہا اے میرے بھتیجے مجھ سے جس قدر ہو سکا میں نے تیری مدد کی ہے مگر آج تیری قوم کے بڑے بڑے سردار مجھے بھی آخری نوٹس دے گئے ہیں کہ یا اپنے بھتیجے کے ساتھ رہو یا ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ تو ان کے بتوں کی پرستش کرے وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تو ان کو برا کہنا چھوڑ دے میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو کچھ نرمی اختیار کر لے؟ ورنہ وہ تجھے بھی نوٹس دے گئے ہیں اور مجھے بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر آئندہ تو نے اپنے بھتیجے کی مدد کی تو تیری سرداری بند۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو بغیر کسی توقف کے آپ نے جواب دیا کہ اے چچا! آپ نے میری بڑی مدد کی ہے مگر یہ معاملہ تو دین کا ہے اگر یہ لوگ

سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لاکر کھڑا کر دیں اور پھر کہیں کہ میں کوئی تبدیلی کروں تب بھی میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ اے چچا! اب اس کا ایک ہی علاج ہے اگر آپ کو آپ کی قوم میری خاطر چھوڑتی ہے تو پھر آپ مجھے چھوڑ دیں اور اپنی قوم سے مل جائیں۔ (السیرة لابن ھشام مبادأة النبی صلی اللہ علیہ وسلم قومہ) دیکھو یہ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی کا ایک وقت تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ طاقت آپ کے پاس نہیں تھی بلکہ ابو طالب کے پاس تھی مگر جس کے پاس طاقت تھی وہ گھبرا جاتا ہے اور جس کے پاس طاقت نہیں تھی وہ کہتا ہے کہ جب باقیوں نے مجھے چھوڑا ہے تو آپ بھی مجھے چھوڑ دیں میں اپنے عقائد میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ یہ ایک رات تھی تاریک اور بھیانک رات۔ جس میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں (سوائے ان کے جو اللہ تعالیٰ سے مویّد ہوں) جو مقاومت کی روح اپنے اندر قائم رکھ سکیں لیکن اس تاریک رات میں بھی آپ نے ثابت کر دیا کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی۔ آپ نے کوئی فعل ایسا نہ کیا جس پر خدا تعالیٰ بندہ کو چھوڑ دیا کرتا ہے آپ نے کوئی فعل ایسا نہ کیا جس پر خدا تعالیٰ خفا ہو جایا کرتا ہے بلکہ آپ نے وہ کچھ کیا جس پر خدا تعالیٰ اور بھی قریب ہو جاتا ہے، جس پر وہ اور بھی خوش ہو جاتا ہے۔

کیا تم سمجھ نہیں سکتے کہ جب عرش پر خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اے چچا آپ بھی مجھے چھوڑ دیں میں خدا تعالیٰ کو نہیں چھوڑ سکتا تو خدا تعالیٰ ایک عاشق کی طرح آپ کی طرف یہ کہتے ہوئے نہ جھکا ہوگا کہ دنیا تجھے چھوڑ دے پر میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔ اللہ تعالیٰ غیر مادی چیز ہے اور اس کا تعلق اپنے بندوں سے روحانی ہوتا ہے جسمانی نہیں۔ لیکن تمثیلی طور پر اپنے ذہن میں نقشہ جمانے کے لئے اگر تم فرض کر لو کہ اللہ تعالیٰ کی محبت مادی محبت ہوتی یا اس کی نفرت مادی نفرت ہوتی تو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کو یہ جواب دیا تھا کہ چچا اگر یہی بات ہے تو پھر آپ مجھے بے شک چھوڑ دیں اس وقت اگر خدا تعالیٰ دو گز پر کھڑا ہوگا تو یقیناً اس فقرہ کے بعد وہ آپ کے پاس آ کھڑا ہوا ہوگا اور اگر خدا تعالیٰ کی خوشنودی پہلے آپ کو دس نمبر کی حاصل تھی تو اس واقعہ کے بعد وہ بیس نمبر تک پہنچ گئی ہوگی۔ پس اللہ فرماتا ہے وَالضُّحٰی۔ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی۔ اے محمد رسول اللہ! ہر رات جو تیری زندگی میں آئے گی، ہر رات جو تجھ پر گزرے گی وہ اس بات کو ثابت کرنے والی ہوگی کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی۔ کہ نہ تو تیرے خدا نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ تجھ سے ناراض ہوا ہے بلکہ وہ تجھ سے ہر گھڑی زیادہ قریب ہوتا جائے گا۔

غار ثور میں ابو بکر جیسا بہادر آدمی گھبرا جاتا ہے۔ اپنے لئے نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے۔ مگر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ جس کے لئے کوئی آفت نہیں تھی جو اگر پکڑا بھی جاتا تو لوگ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر

چھوڑ دیتے اور زیادہ سے زیادہ اسے یہی کہتے کہ تو اس کے ساتھ کیوں آ گیا تھا کیونکہ ابوبکرؓ کی مکہ والے بہت عزت کیا کرتے تھے وہ تو گھبرا جاتا ہے مگر جس پر آفت آئی ہوئی ہے، جس کے ساتھ اس مصیبت کا براہ راست تعلق ہے، وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کہتا ہے لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ اس تاریک گھڑی میں جب آپ نے کہا ہوگا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا تو جتنا آپ کے ساتھ خدا تعالیٰ کا پہلے تعلق ہوگا وہ اور بھی بڑھ گیا ہوگا، وہ اور بھی سمٹ کر آپ کے قریب آ گیا ہوگا اور جتنا خدا تعالیٰ آپ سے پہلے خوش تھا وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہو گیا ہوگا۔ پھر ایک تاریک گھڑی وہ تھی جبکہ اُحد میں آپ زخمی ہوئے اور اس قسم کے واقعات جمع ہو گئے کہ اسلامی لشکر کی فتح شکست کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اس جنگ میں ایک درہ ایسا تھا جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض آدمی چن کر کھڑے کئے تھے اور انہیں حکم دیا تھا کہ جنگ کی خواہ کوئی حالت ہو تم نے اس درہ کو نہیں چھوڑنا۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ اُحد) جب کفار کا لشکر منتشر ہو گیا تو انہوں نے غلطی سے اجتہاد کیا کہ اب یہاں ٹھہرنے کا کیا فائدہ ہے ہم بھی چلیں اور لڑائی میں کچھ حصہ لیں۔ ان کے سردار نے انہیں کہا بھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ ہم یہ درہ چھوڑ کر نہ جائیں مگر انہوں نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ فتح ہو جائے تب بھی یہیں کھڑے رہو۔ آپ کے ارشاد کا تو یہ مطلب تھا کہ جب تک جنگ ہوتی رہے اس درہ کو نہ چھوڑنا۔ اب چونکہ فتح ہو چکی ہے دشمن بھاگ رہا ہے ہمیں بھی تو کچھ ثواب جہاد کا حاصل کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ درہ خالی ہو گیا۔ حضرت خالد بن ولید جو اس وقت تک ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے نوجوان تھے اور ان کی نگاہ بہت تیز تھی وہ جب اپنے لشکر سمیت بھاگے جا رہے تھے انہوں نے اتفاقاً پیچھے کی طرف نظر ڈالی تو درہ کو خالی پایا یہ دیکھتے ہی وہ واپس لوٹے اور مسلمانوں کی پشت پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کے لئے یہ حملہ چونکہ بالکل غیر متوقع تھا اس لئے ان پر سخت گھبراہٹ طاری ہو گئی اور بوجہ بکھرے ہوئے ہونے کے دشمن کا مقابلہ نہ کر سکے۔ میدان پر کفار نے قبضہ کر لیا اور اکثر صحابہ سراسیمگی اور اضطراب کی حالت میں مدینہ کی طرف بھاگ پڑے یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صرف بارہ صحابہؓ رہ گئے اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ بارہ بھی نہیں صرف تین آدمی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد رہ گئے اور کفار نے خاص طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر اندازی شروع کر دی لیکن باوجود ان نازک حالات کے آپ برابر دشمن کے مقابلہ میں کھڑے رہے اور اپنے مقام سے نہیں ہلے۔ آخر دشمن نے یک دم ریلہ کر دیا اور وہ چند آدمی بھی دھکیلے گئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے۔ آپ پر بعض اور صحابہؓ جو آپ کی حفاظت کر رہے تھے شہید ہو کر گر گئے اور اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھوڑی دیر کے لئے صحابہؓ کی نگاہوں سے

اوجھل ہو گئے اور لشکر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ یہ خبر صحابہؓ کے لئے اور بھی پریشان کن ثابت ہوئی اور ان کی رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی۔ جو صحابہؓ اس وقت آپ کے اردگرد موجود تھے اور زندہ تھے انہوں نے لاشوں کو ہٹا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گڑھے میں سے نکالا اور حفاظت کے لئے آپؐ کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ اس وقت جب دشمن اپنی فتح کے نشہ میں مخمور تھا، جب اسلامی لشکر سخت ضعف اور انتشار کی حالت میں تھا، جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صرف چند صحابہؓ تھے، باقی سب کے سب میدان سے بھاگ چکے تھے۔ ابوسفیان نے پکار کر کہا کہ بتاؤ کیا تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے؟ صحابہؓ نے جواب دینا چاہا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خاموش رہو اور کوئی جواب نہ دو۔ پھر اس نے پوچھا کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہے؟ مراد اس کی یہ تھی کہ کیا حضرت ابوبکر زندہ ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مت جواب دو۔ پھر اس نے پوچھا کیا تم میں عمر موجود ہے؟ اس کا جواب دینے سے آپ نے منع فرما دیا۔ تب اس نے خوش ہو کر کہا اُعْلُ ھُبُلْ اُعْلُ ھُبُلْ۔ ہبل کی شان بلند ہو، ہبل کی شان بلند ہو، یعنی آخر ہبل دیوتا نے ان لوگوں کو مار دیا اور اس کی شان بلند ہوئی جب اس نے یہ الفاظ کہے تو باوجود اس کے کہ ابھی ابھی دشمن صحابہؓ کو نقصان پہنچا کر ہٹا تھا۔ ابھی صحابہؓ میدان سے بھاگ رہے تھے بلکہ بعض تو ایسے بھاگے تھے کہ انہوں نے مدینہ جا کر دم لیا تھا۔ غرض باوجود اس کے کہ ایک حصہ بھاگا جا رہا تھا اور ایک حصہ پراگندہ اور منتشر تھا اور صرف چند صحابہؓ جو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد تھے جب اس نے یہ الفاظ کہے تو آپؐ برداشت نہ کر سکے اور آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا جواب کیوں نہیں دیتے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم کیا جواب دیں۔ آپ نے فرمایا کہو۔ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلّ۔ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلّ۔ (بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ اُحد) تمہارا ہبل کیا چیز ہے اللہ ہی سب سے بلند رتبہ اور شان رکھنے والا ہے۔ کہتے ہیں ''آ بیل مجھے مار'' کئی ہزار کا لشکر سامنے پڑا ہے وہ فتح کے نشہ میں مخمور ہے۔ مسلمانوں کا کثیر حصہ میدانِ جنگ سے واپس جا چکا ہے اور دشمن دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔ یہ کتنی تاریک رات تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی مگر اس تاریک رات میں بھی جب کہ صرف چند صحابہؓ آپ کے اردگرد تھے اور خطرہ تھا کہ دشمن آپ پر پھر حملہ نہ کر دے۔ جب اس نے ہبل کی تعریف کی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو صحابہؓ کو مصلحتاً اب تک جواب دینے سے روکتے چلے آئے تھے بڑے جوش سے فرمانے لگے اس کو کیوں جواب نہیں دیتے کہ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلّ۔ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلّ۔ صحابہؓ نے یہ جواب دیا اور اس طرح آپؐ نے اپنے عمل سے دشمن کو چیلنج کیا

کہ میں یہاں موجود ہوں اگر تم میں ہمت ہے تو آ جاؤ۔ وہ دشمن جس نے ایک ہزار سپاہی کو بھگا دیا تھا اس کی زبان سے اس وقت بھی شرک کا کلمہ سننا آپؐ کی طاقت برداشت سے باہر ہو گیا جبکہ آپؐ صرف چند صحابہؓ سمیت اس کی زد میں تھے اور زخموں کی وجہ سے کمزور ہو رہے تھے اور انتہائی نازک حالات کی پروانہ کرتے ہوئے آپ نے خدا کا نام اس وقت بھی بلند کر دیا۔ یہ ایک رات تھی جو آپؐ پر آئی مگر اس رات سے کیا نتیجہ نکلا؟ یہی کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ آپؐ کا خدا تعالیٰ سے تعلق اور بھی بڑھ گیا اور آپ نے کوئی ایسا فعل نہ کیا جس سے وہ ناراض ہوتا۔

پھر ایک رات وہ تھی جبکہ غزوہ خندق کے موقع پر دشمن آیا۔ اس نے اپنی طرف سے ساری تیاریاں کر لیں کہ وہ مسلمانوں کو زیر کرے گا اور ان کو شکست دے گا۔ لیکن اس تاریکی کے وقت میں اتفاق کی بات ہے رات ہی تھی جب دشمن کو شکست ہوئی۔ رات کا وقت تھا مسلمان بظاہر مایوس ہو چکے تھے، دشمن پندرہ دن سے ان کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، خوراک وغیرہ کے سامانوں میں سخت کمی آ چکی تھی، مدد کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور مسلمان سخت گھبرا رہے تھے کہ نہ معلوم اب کیا بنے گا۔ سامان اتنے کم تھے کہ مسلمان خود کہتے ہیں ہمارے ہاتھ پاؤں سردی سے سن ہو رہے تھے مگر ہمارے پاس کپڑے نہیں تھے کہ ہم ان کو اوڑھ کر اپنی سردی کو دور کر سکیں۔ غرض یہی کیفیت تھی کہ ایک دفعہ آدھی رات کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی ہے! ایک صحابیؓ بولے اور کہا یا رسول اللہؐ میں حاضر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تم نہیں کوئی اور۔ جب تھوڑی دیر تک کوئی اور شخص نہ بولا تو آپؐ نے پھر فرمایا۔ کوئی ہے! اس پر پھر وہی صحابی بولا کہ یا رسول اللہ میں حاضر ہوں آپؐ نے فرمایا تم نہیں کوئی اور۔ جب دوسری دفعہ بھی کوئی اور شخص نہ بولا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کوئی ہے! اس پر پھر وہی صحابی بولا اور کہنے لگا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں۔ آپؐ ہنس پڑے اور فرمایا جاؤ اور باہر جا کر دیکھو مجھے اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ دشمن بھاگ گیا ہے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام۔ غزوۃ الخندق) اب دیکھو رات کو مسلمان سوتے ہیں تو انتہائی مایوسی کی حالت میں مگر ابھی صبح نہیں ہوتی، آدھی رات کا وقت ہوتا ہے، تاریکی چاروں طرف مسلّط ہوتی ہے کہ اس رات کی تاریکی میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دیتا ہے کہ دشمن بھاگ گیا ہے۔ گویا تاریکی میں جہاں اور لوگ گھبرا رہے تھے آپؐ خدا تعالیٰ کی طرف جھکے ہوئے تھے اور اس سے دعائیں کر رہے تھے۔ وہ صحابی کہتے ہیں میں باہر گیا تو دیکھا کہ تمام جنگل خالی پڑا ہے اور دشمنوں کے خیمے سب غائب ہیں۔ ایک اور صحابی کہتے ہیں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ کوئی ہے! تو میں اس وقت جاگ رہا تھا مگر شدتِ سردی کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں تو الگ میری زبان بھی سن ہو چکی تھی اور اس وجہ سے میں جواب نہیں دے سکتا تھا، سنتا تھا مگر

بولنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا تھا کیونکہ کپڑے کافی نہ تھے اور برف پڑی ہوئی تھی (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام۔ غزوۃ الخندق)۔ یہ تکالیف آئیں مصائب و آلام کی گھڑیاں آپ پر گزریں مگر ان تمام لیالی میں ہر لیل کے وقت اللہ تعالیٰ نے ثابت کر دیا کہ وہ آپ کے ساتھ ہے۔ پھر ضُحٰی کے اوقات بھی آپ پر آئے چنانچہ فتح مکہ کے بعد سارے عرب کی فتح آئی اور کامیابی و کامرانی آپ کے قدموں کو چومنے لگی مگر کامیابیوں کے اوقات نے بھی کیا ثابت کیا؟ یہی کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى لوگوں کہ یہ حالت ہوتی ہے کہ ترقیات کے وقت ان میں کبر پیدا ہو جاتا ہے فتح کے وقت نشۂ غرور ان میں سما جاتا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی کیفیات کا تم اس سے اندازہ لگاؤ کہ فتح مکہ کے وقت جب لشکرِ اسلامی مکہ کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا صحابہؓ کے دلوں میں سخت جوش پایا جاتا تھا خصوصاً انصار کے دل میں مکہ والوں کے خلاف بہت زیادہ جوش تھا۔ بے شک مہاجرین بھی اس جوش سے خالی نہیں تھے مگر مہاجرین پر ان کے مظالم کا اتنا اثر نہیں تھا جتنا انصار کو یہ سن سن کر جوش آتا تھا کہ مکہ والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ یہ یہ سلوک کرتے رہے ہیں۔ اسی جوش کی حالت میں ایک انصاری جرنیل نے ابو سفیان کو دیکھا تو اس کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا آج ہم نے تم سے بدلے لینے ہیں، آج ان مظالم کا ہم نے انتقام لینا ہے جو مکہ والوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر کئے۔ کوئی اور ہوتا تو جرنیل کو بلا کر اسے تمغہ لگا دیتا اور کہتا شاباش! وفادار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلایا اور فرمایا مکہ تو خدا تعالیٰ کا متبرک مقام ہے ہمیں اپنی خوشیوں اور کامیابیوں میں اس کی اس برکت کو نہیں بھول جانا چاہیے جو خدا تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے۔ تم نے بڑی غلطی کی جو ایسا فقرہ اپنی زبان سے نکالا۔ میں تمہیں جرنیل کے عہدہ سے معزول کرتا ہوں۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام۔ ذکر فتح مکۃ)۔ دیکھو ایک ہی موقع آپ کی زندگی میں ایسا آیا جبکہ دشمن جو ایک لمبے عرصہ تک خطرناک سے خطرناک مظالم توڑتا رہا تھا اس کی گردنیں آپ کے ہاتھ میں تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ خود آپ کے دل میں ہی یہ خیال آ جاتا کہ میں ان لوگوں سے آج خوب بدلہ لوں گا اور خود بھی ایسا فقرہ کہہ دیتے یا اگر خود نہ کہتے تو اور کہنے والوں کی باتیں پسند کرتے یا اگر ظاہر میں پسند نہ کرتے تو دل میں ہی پسند کرتے اور کہتے یہ لوگ میرے بڑے وفادار ہیں، مجھ پر جو مظالم ہوئے ان کا کس قدر ان میں احساس پایا جاتا ہے، کتنا جوش ہے جو ان کی حرکات سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہا ہے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جرنیل کے عہدہ سے ہی معزول کر دیا اور فرمایا ہمارے لئے یہ تکبر کے اظہار کا موقع نہیں۔

پھر دیکھو وہ ضُحٰی کا ہی وقت تھا جب آپ مکہ میں داخل ہوئے اور آپ نے فرمایا اے عتبہ، شیبہ اور ولید کی

اولادو! اور اے عتبہ، شیبہ اور ولید کے چچو، بھائیو اور بھانجو! تم نے مجھے انتہائی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں مکہ سے نکال دیا تھا اب تم میرے قابو میں ہو بتاؤ میں تم سے کیا سلوک کروں؟ انہوں نے کہا ہم آپ سے اسی سلوک کی امید رکھتے ہیں جو آپ کی شان کے شایاں ہو اور وہی سلوک چاہتے ہیں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ۔ (السيرة الحلبية باب ذكر مغازيه صلى الله عليه وسلم) ۔ جاؤ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ تم آزاد ہو۔ یہ دوسری ضُحٰی تھی جو آپ پر آئی مگر اس ضُحٰی نے بھی بتادیا کہ کبر اور خود پسندی کبھی آپؐ کے قریب بھی نہیں آئی تھی۔ قومیں آئیں۔ وفود آئے اور ہر طرف سے آ کر انہوں نے آپ کی اطاعت کو قبول کیا مگر کبھی بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ آپ نے ان لوگوں میں کبھی اپنی شان کا کوئی خاص اظہار کیا ہو۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے تیسرے معنے تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ کچھ لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جن پر دن چڑھتے ہیں تو وہ اپنے دنوں کو کھیل میں، تماشا میں، جوئے میں، شراب میں اور اسی قسم کی اور لغویات میں ختم کر دیتے ہیں اور جب رات آتی ہے تو اس کو ناچ گانے اور سونے میں ختم کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کے مقابل پر تیرا دن بھی اس قسم کا ہوگا اور تیری راتیں بھی اس قسم کی ہوں گی کہ ہر دیکھنے والے کے سامنے تیرے ساتھی ان دنوں اور ان راتوں کو پیش کر سکیں گے اور اسے کہہ سکیں گے کہ بتاؤ کیا تمہارے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دنوں کی طرح ہیں اور کیا اس حالت میں دن گزارنے والے کو کبھی خدا تعالیٰ چھوڑ سکتا ہے یا اس سے ناراض ہوسکتا ہے؟ اسی طرح تیری راتیں ایسی گذریں گی کہ تم ہر شخص کے سامنے اپنی ان راتوں کو پیش کر کے کہہ سکو گے کہ میری راتوں کو دیکھو اور بتاؤ کہ کیا ایسی راتوں والے کو خدا تعالیٰ چھوڑ سکتا ہے؟ غرض فرمایا وَالضُّحٰی۔ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم تیرے دنوں کو ایسا کر دیں گے اور تیری راتوں کو بھی ایسا کر دیں گے کہ تیرا دن بھی اس بات کی شہادت دے گا کہ تجھے خدا نے نہیں چھوڑا اور تیری رات بھی اس بات کی شہادت دے گی کہ تیرا خدا تجھ سے ناراض نہیں ہے۔ یہ وہی دعویٰ ہے جو فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس: ۱۷) میں کیا گیا ہے کہ میں تم میں ایک لمبی عمر گذار چکا ہوں کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ میں نے اس عرصہ میں کسی ایک بدی کا بھی ارتکاب کیا ہو۔ اگر تم سب کے سب مل جاؤ تب بھی میری چالیس سالہ ابتدائی زندگی پر کوئی داغ ثابت نہیں کر سکتے۔ مگر یہ دعویٰ تو گزری ہوئی عمر کے متعلق ہے اور وَالضُّحٰی۔ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ میں آئندہ زندگی کے متعلق دعویٰ کر دیا اور

فرمایا کہ میرے دن تمہارے سامنے ہیں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا اور چوتھے کے بعد پانچواں دن تمہارے سامنے گذرے گا۔اسی طرح میری راتیں بھی تمہارے سامنے ہوں گی اور ایک کے بعد دوسری رات گزرتی چلی جائے گی لیکن یاد رکھو میری زندگی کا ہر دن جو گزرے گا وہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ اسی طرح ہر رات جو مجھ پر گزرے گی وہ ثبوت ہوگی اس بات کا کہ مَا وَدَّعَكَ وَمَا قَلٰى۔

غرض خدا تعالیٰ اس آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آپ کی صداقت کی ایک نئی دلیل سکھاتا ہے اور فرماتا ہے میں یہ پیشگوئی کرتا ہوں کہ تیرا ہر دن میری رضامندی میں گزرے گا اور تیری ہر رات میری رضامندی میں گذرے گی۔ تیری پہلی زندگی کے متعلق میں چیلنج کر چکا ہوں اب یہ دوسرا چیلنج آئندہ زندگی کے متعلق ہے۔ پچھلی زندگی کے متعلق تم کہہ سکتے ہو کہ ہم نے اس وقت سوچا نہیں تھا اگر غور کرتے تو ممکن تھا کہ کوئی نقص نظر آ جاتا۔ فرماتا ہے اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس زندگی کے متعلق تمہارا یہ عذر ہے تو اب دوسری زندگی پر کوئی اعتراض کر لینا اور دیکھنا کہ اس کی زندگی کی ایک ایک ساعت، ایک ایک رات اور ایک ایک دن اپنے فائدہ اور اپنے آرام کے لئے خرچ ہوتا ہے یا بنی نوع انسان کے فائدہ اور آرام کے لئے خرچ ہوتا ہے۔

وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى کے چوتھے معنے چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ قبض و بسط کی دونوں حالتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اچھی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ قابض بھی ہے اور باسط بھی، اور اس کے اپنے بندوں سے یہ دونوں سلوک ہوتے ہیں۔جس طرح دنیوی معاملات میں کوئی آرام کی ساعت ہوتی ہے اور کوئی تکلیف کی۔ اسی طرح روحانی عالم میں کبھی کوئی ساعت ایسی آتی ہے جس میں انسان بہت زیادہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھکا ہوا ہوتا ہے اور کبھی اس پر قبض کی ساعت آ جاتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ ایک صحابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آ کر رو پڑے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میں تو منافق ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تو تم کو مومن سمجھتا ہوں وہ کہنے لگے یا رسول اللہ! مومن نہیں میں تو منافق ہوں جب میں آپ کی مجلس میں بیٹھا ہوا ہوتا ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف جنت ہے اور ایک طرف دوزخ۔ جو بھی خیال میرے دل میں گزرتا ہے یا جو بھی عمل میں کرتا ہوں جنت اور دوزخ کو دیکھ کر کرتا ہوں۔ مگر جب گھر جاتا ہوں تو یہ حالت نہیں رہتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تو عین ایمان ہے اگر خدا تعالیٰ ہر وقت ایک جیسی حالت رکھے تو تم مر نہ جاؤ۔ تو قبض و بسط کی حالت ہر انسان پر آتی ہے چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مدارج کے اختلاف کی وجہ سے ایک انسان کی قبض کی حالت دوسرے انسان کی قبض کی حالت

سے جداگانہ ہو یا ایک انسان کی بسط کی حالت دوسرے انسان کی بسط کی حالت سے مختلف ہو لیکن بہرحال قبض اور بسط کی گھڑیاں ہر انسان پر آتی ہیں۔ ایک وقت وہ نماز پڑھ رہا ہوتا ہے دوسرے وقت وہ اپنے بیوی بچوں سے کھیل رہا ہوتا ہے تیسرے وقت وہ پاخانہ میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ علیحدہ حالتیں ہیں جن میں سے ہر انسان گزرتا ہے۔ ان میں سے نماز اور روزہ بسط کی حالتیں ہیں اور بیوی بچوں سے کھیلنا یا پاخانہ میں جانا یا دنیا کے کسی اور کام میں مشغول ہو جانا یہ قبض کی حالتیں ہیں۔ بہت لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عبادت گزار بھی ہوتے ہیں، روزہ دار بھی ہوتے ہیں، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوتے ہیں، ذکر الٰہی بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نماز ہی پڑھتے ہیں، جب حج کرتے ہیں تو حج ہی کرتے ہیں، جب زکوٰۃ دیتے ہیں تو زکوٰۃ ہی دیتے ہیں مگر جب وہ روٹی کھاتے ہیں اس وقت وہ صرف روٹی ہی کھا رہے ہوتے ہیں، جب وہ کپڑے پہنتے ہیں اس وقت وہ صرف کپڑے ہی پہن رہے ہوتے ہیں، جب وہ بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہوتے ہیں اس وقت وہ صرف بیوی سے ہی باتیں کر رہے ہوتے ہیں، جب وہ بچوں سے تلعّب کرتے ہیں اس وقت بچوں سے ہی تلعّب کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی دنیا دنیا ہوتی ہے اور ان کا دین دین ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالضُّحٰی۔ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیری تو دنیا ہی نرالی ہے۔ تیری قبض کی حالت بھی خدا کے لئے ہوتی ہے اور تیری بسط کی حالت بھی خدا کے لئے ہوتی ہے۔ جب تو بیوی سے ہنس رہا ہوتا ہے اس وقت تو بیوی سے نہیں ہنستا بلکہ ہمارے حکم کی تعمیل کرتا ہے کیونکہ تو کہتا ہے میں اپنی بیوی سے اس لئے ہنس رہا ہوں کہ میرا خدا کہتا ہے میں اپنی بیوی سے اس رنگ میں پیش آؤں۔ جب تو کھانا کھا رہا ہوتا ہے اس وقت تو صرف کھانا نہیں کھاتا بلکہ بسم اللہ سے شروع کرتا اور الحمد للہ پر ختم کرتا ہے اور درمیان میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہتا ہے۔ جب تو پانی پیتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ تو دنیا دار لوگوں کی طرح صرف پانی پیئے بلکہ تو کہتا ہے میں یہ پانی اس لئے پی رہا ہوں کہ میرے رب نے یہ چیز میری طرف بھیجی ہے۔ بارش آتی ہے تو لوگ اس سے کیسا لطف اٹھاتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کیا کیفیت تھی ایک دفعہ بادل آیا آسمان سے ہلکی ہلکی بوندیں برسیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے کمرہ سے باہر تشریف لائے زبان نکالی اس پر بارش کا ایک قطرہ لیا اور فرمایا میرے رب کی طرف سے یہ تازہ نعمت آئی ہے۔ (صحیح مسلم کتاب صلاۃ الاستسقاء باب الدعا فی الاستسقاء) آپ نے بھی لوگوں کو یہی نصیحت کی کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا تم اپنی بیویوں سے حظ نہ اٹھاؤ، میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ کھاؤ نہیں، میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم پہنو نہیں۔ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ تم جو کچھ کرو احتساباً کرو۔ اس نیت اور ارادہ کے ماتحت کرو کہ اللہ تعالیٰ کی

رضا تمہیں حاصل ہو جائے۔ اگر تم اپنے تمام کاموں میں اس نیت کو ہمیشہ مدنظر رکھو گے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تمہارا اصل مقصد ہوگا تو میں تمہیں کہتا ہوں اس کے بعد اگر تم اپنی بیوی کے منہ میں احتساباً ایک لقمہ بھی ڈالتے ہو تو فَھُوَ صَدَقَۃٌ وہ بھی ایک صدقہ ہوگا (صحیح بخاری کتاب الایمان باب ماجاء انّ الاعمال بالنیة والحسبة)۔ اب دیکھو وہ شخص لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے صدقہ قرار دیتے ہیں حالانکہ جس سے انسان کو محبت ہوتی ہے اسے بہر حال وہ کھلاتا ہے وہ یہ تو پسند کر سکتا ہے کہ میں خود بھوکا رہوں مگر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ جس سے مجھے محبت ہے اسے بھوک کی تکلیف ہو۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ اپنی بیوی کو کھلائے گا خدا تعالیٰ کے حضور یہ نہیں لکھا جائے گا کہ اس نے اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالا بلکہ خدا تعالیٰ کے حضور یہ لکھا جائے گا کہ اس نے ہماری رضا کی خاطر صدقہ کیا۔ اسی طرح ملازموں سے معاملہ ہے، ہمسایوں سے معاملہ ہے، دوستوں سے معاملہ ہے۔ جب انسان ان تمام معاملات میں خدا تعالیٰ کی رضا کو مدنظر رکھتا ہے اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لئے وہ یہ سب کام کرتا ہے تو بظاہر یہ دنیوی نظر آنے والے کام بھی اس کے لئے دین بن جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے یہ کام ایسے ہی سمجھے جاتے ہیں جیسے وہ عبادت میں اپنا وقت گزار رہا ہو۔ پس فرمایا وَالضُّحٰی ۔ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیری بسط اور قبض کی حالتیں دونوں ہمارے لئے ہیں تو بظاہر اپنی بیوی سے ہنس رہا ہوگا مگر دل میں ہمارے ساتھ پیار کر رہا ہوگا۔ تو بظاہر اپنے بچوں سے پیار کر رہا ہوگا مگر دل میں ہمارے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہوگا۔ تو بظاہر ہمسایوں کے ساتھ دلجوئی کی باتیں کر رہا ہوگا مگر اصل میں تیری باتیں ہمارے ساتھ ہو رہی ہوں گی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ تو ان کے پاس بیٹھا ہے حالانکہ تو ان کے پاس نہیں بلکہ ہمارے پاس بیٹھا ہوتا ہے۔ جب تیرا ہر فعل ہمارے لئے ہے، جب تیری ہر حرکت اور ہر سکون ہمارے لئے ہے اور جب تو دین اور دنیا دونوں راہوں سے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر رہا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم لَیْل اور نَھَار میں تجھے چھوڑ دیں؟ جب ہم نہ تیرے کھانے پر ناراض ہیں، نہ پینے پر ناراض ہیں، نہ معاشرت پر ناراض ہیں، نہ ہمسایوں سے تعلقات پر ناراض ہیں، نہ کسی اور کام پر ناراض ہیں، تو ہم تجھے چھوڑ کس طرح سکتے ہیں؟ یہ تو عبادتیں ہیں جو تو ہماری خاطر بجا لا رہا ہے ان عبادتوں پر ہم نے خفا کیا ہونا ہے ہم تو خوش ہی ہوں گے کہ تو نے ہماری خاطر دنیا کو بھی دین بنا لیا۔ غرض چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ قبض و بسط کی حالتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اچھی ہوں گی یعنی جب آپؐ عبادت میں مشغول ہوں گے تو ہوں گے ہی۔ جب آپ دنیوی کام کریں گے جو بمنزلہ لَیْل ہوتے ہیں تب بھی آپ خدا تعالیٰ کی خوشنودی ہی مدنظر رکھیں گے اور دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے رات دن

جدا نہیں ہوتا اور نہ آپ کے کسی فعل سے ناراض ہوتا ہے۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے پانچویں معنے پانچویں معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ دن کام کا وقت ہوتا ہے اور رات انسان کے آرام کا وقت ہوتا ہے فرماتا ہے وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ ہم تیرے دنوں کو پیش کرتے ہیں جب تو تبلیغ میں مصروف ہوتا ہے اور تیری راتوں کو پیش کرتے ہیں جب تو مکالمہ الٰہی میں مشغول ہوتا ہے۔ تیرا دن خدا کے اس فعل کا ثبوت ہے کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ۔ تیرے رب نے تجھے چھوڑا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدۃ:۶۸) چنانچہ دیکھ لو دن کے وقت آپؐ کی تبلیغ اور نشست و برخاست کن لوگوں میں تھی، کفار مکہ میں جو ہر وقت آپؐ کو مارنے کی فکر میں رہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیرا دن اس بات کی شہادت دے گا کہ ہم تیرے ساتھ ہیں ورنہ دشمن جو ہر وقت تیرے پاس رہتا ہے اسے کون سی چیز تجھے ہلاک کرنے سے روک سکتی ہے اس کی سب سے بڑی خواہش تو یہی ہے کہ تجھے ہلاک کر دے مگر باوجود اس خواہش اور ارادہ کے اور باوجود اس بات کے کہ دن کو تم انہیں لوگوں کے ساتھ رہتے ہو وہ تمہیں قتل نہیں کر سکتے۔ پس تیرا دن اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ خدا تیرے ساتھ ہے اور تیری رات ثبوت ہوتی ہے اس بات کا کہ وَمَا قَلٰی۔ خدا تجھ سے ناراض نہیں۔ دن کو لوگ تجھ پر اپنے غیظ و غضب اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک آتا ہے تجھے فریبی کہتا ہے، دوسرا آتا ہے تو تجھے دھوکے باز کہہ دیتا ہے، تیسرا آتا ہے تو تجھے عزت کا خواہش مند کہہ کر چلا جاتا ہے۔ غرض ہزاروں قسم کی گالیاں اور ہزاروں قسم کے الزامات ہیں جو تجھے دشمنوں سے سننے پڑتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دن اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہم تیرے ساتھ ہیں۔ دن کو لوگ تجھے اپنی دشمنی کی وجہ سے ہلاک کر سکتے ہیں مگر چونکہ ہم تمہارے ساتھ ہوتے ہیں وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وہ گالیاں دیتے ہیں، وہ تجھے برا بھلا کہتے ہیں، وہ تیرے ہلاک کرنے کے لئے کئی قسم کے منصوبے کرتے ہیں مگر اپنی تمام کوششوں میں ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھتے ہیں اور اس طرح دن کی ایک ایک گھڑی تیری صداقت اور راستبازی کا دنیا میں اعلان کر رہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب سارے دن کی گالیاں سن کر رات آتی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ میں کیا کروں مجھ سے تو ساری دنیا ناراض ہے اس وقت ہم تجھے تسلی دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو تجھ سے ناراض نہیں۔ دنیا اگر ناراض ہے تو بے شک ہو۔

میں نے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک نوٹ بک دیکھی۔ آپؑ کا معمول تھا کہ جب کوئی پاک جذبہ آپؑ کے دل میں اٹھتا آپؑ اسے لکھ لیتے۔ اس نوٹ بک میں آپ نے ایک جگہ خدا تعالیٰ کو مخاطب کر کے

لکھا تھا۔

''او میرے مولا، میرے پیارے مالک، میرے محبوب، میرے معشوق خدا! دنیا کہتی ہے تو کافر ہے مگر کیا تجھ سے پیارا مجھے کوئی اور مل سکتا ہے؟ اگر ہو تو اس کی خاطر تجھے چھوڑ دوں۔ لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ جب لوگ دنیا سے غافل ہو جاتے ہیں جب میرے دوستوں اور دشمنوں کو علم تک نہیں ہوتا کہ میں کس حال میں ہوں اس وقت تو مجھے جگاتا ہے اور محبت سے پیار سے فرماتا ہے کہ غم نہ کھا میں تیرے ساتھ ہوں تو پھر اے میرے مولا یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس احسان کے ہوتے پھر میں تجھے چھوڑ دوں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔'' (البدر جلد ۱۱ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۹۱۲ء صفحہ ۶)

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى میں بیان فرمایا ہے کہ دن ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ میں تیرے ساتھ ہوں دشمن تیری طرف اپنا ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔ اور رات ثبوت ہوتی ہے اس بات کا کہ میں تجھ سے ناراض نہیں۔ تو دن کے وقت دشمن کے منہ سے کئی قسم کی ناراضگی کی باتیں سنتا ہے اور تیرا دل سخت غمزدہ ہوتا مگر جب رات آتی ہے تو ہم تجھ سے کہتے ہیں تو دشمن کی ان گالیوں سے مت گھبرا ہم تجھ سے خوش ہیں۔ پس دن کی حفاظت اور رات کا مکالمہ الٰہی دونوں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى۔

وَ الضُّحٰى وَ الَّيْلِ اِذَا سَجٰى کے چھٹے معنے چھٹے معنے یہ ہیں کہ ایک روحانی قبض و بسط کا وقت بھی ہر انسان پر آیا کرتا ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں میں نے خالص دینی اور جسمانی کاموں کے متعلق قبض و بسط کی کیفیات کا ذکر کیا تھا وہاں ایک وقت انسان کی حالت پر ایسا بھی آتا ہے جب اس کی روحانی حالت پر قبض کی حالت طاری ہو جاتی ہے اس میں بھی چھوٹے اور بڑے سب یکساں ہیں اور سارے انسانوں پر ہی یہ قبض و بسط کا دور آتا ہے اس دور کا آنا بھی انسانی ترقیات کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے وَ الضُّحٰى وَ الَّيْلِ اِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى جیسے بعض روحانی دور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس رنگ میں آئے کہ وحی کا نزول کچھ دنوں کے لئے بند ہو گیا جو روحانی طور پر ایک وقفہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیا۔ اسی طرح فرماتا ہے وَ الضُّحٰى وَ الَّيْلِ اِذَا سَجٰى۔ ہم ان وقتوں کو بھی پیش کرتے ہیں جو تیرے لئے ضُحٰی کا رنگ رکھتے ہیں اور ہم ان وقتوں کو بھی پیش کرتے ہیں جو تیرے لئے لَیْل کا رنگ رکھتے ہیں۔ یعنی تیری روحانی حالت پر ہمیشہ ضُحٰی کی کیفیت نہیں رہے گی بلکہ کبھی کبھی رات کی تاریکی کی سی حالت بھی آئے گی۔ مثلاً کبھی نزول وحی میں روک پیدا ہو جائے گی یا قلب میں وہ بلندی نہیں ہو گی جو دوسرے وقتوں میں تجھے نظر آئے گی۔ مگر تیرے قلب کی یہ

کیفیت دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف ہوگی اور لوگوں کے دلوں میں جب قبض آتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ سے دور جا پڑتے ہیں مگر فرمایا مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ تیری ضُحٰی کی حالت بھی خدا کو پیاری ہوگی اور تیری لَیل کی حالت بھی خدا کو پیاری ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر چیزیں پائی جاتی ہیں وہ سب لہروں میں چلتی ہیں۔ پہاڑ ہیں تو وہ لہروں میں چلتے ہیں۔ دریا ہیں تو وہ لہروں میں چلتے ہیں۔ ہوائیں ہیں تو وہ لہروں میں چلتی ہیں۔ بجلیاں ہیں تو وہ لہروں میں چلتی ہیں، غرض ہر چیز اپنے اندر لہریں رکھتی ہے۔ جس طرح مادیات میں لہروں کا قانون جاری ہے اسی طرح روحانیات میں بھی مختلف لہریں چلتی رہتی ہیں لیکن بعض لہریں ایسی ہوتی ہیں کہ ان لہروں کی جو ادنیٰ حالت ہوتی ہے وہ بھی کفر کی ہوتی ہے اور جو اعلیٰ حالت ہوتی ہے وہ بھی کفر کی ہوتی ہے۔ اگر ان لہروں میں کبھی انسان پر خشیت بھی طاری ہوتی ہے تو وہ ایسی نہیں ہوتی جو ایمان کی علامت ہو۔ اس کے مقابل میں بعض لہریں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی ادنیٰ حالت کفر کی ہوتی ہے اور اعلیٰ حالت ایمان کی ہوتی ہے اور بعض ایسی روحانی حالتیں ہوتی ہیں کہ ادنیٰ حالت گو کفر کی نہیں ہوتی مگر خدا تعالیٰ کی معیت کی بھی نہیں ہوتی۔ یعنی گو وہ ادنیٰ حالت خدا تعالیٰ کی ناراضگی والی نہ ہو مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایسے شخص کو خدا تعالیٰ کی معیت حاصل ہے۔ ایک حالت عدم معیت کی ہوتی ہے اور ایک حالت حصول معیت کی ہوتی ہے یہ الگ الگ مقام ہیں جو روحانی درجات کے حصول کے وقت پیش آتے ہیں۔ ایسے شخص کی ادنیٰ حالت کو دیکھ کر ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اسے خدا تعالیٰ کی مقبولیت حاصل ہے گو ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ خدا تعالیٰ نے اسے چھوڑا ہوا ہے ہاں اس کی اعلیٰ حالت بے شک خدا تعالیٰ کی معیت کا ثبوت ہوتی ہے۔ لیکن ایک مقام وہ ہے کہ جب انسان نیچے آئے تب بھی اسے خدا تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے اور جب اونچا چلا جائے تب بھی اسے خدا تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ پس فرماتا ہے وَالضُّحٰی۔ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم روحانی لہروں میں تیرے لئے وہ وقت بھی آتا ہے جو ضُحٰی کا ہوتا ہے اور جب توکّلی طور پر خدا کے سامنے ہوتا ہے اور تیرے لئے وہ وقت بھی آتا ہے جب تجھ پر قبض طاری ہوتی ہے مگر مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ تیری قبض کی حالت بھی خدا کی معیت کے ماتحت ہوگی اور تیری بسط کی حالت بھی خدا کی معیت کے ماتحت ہوگی۔ صرف معیت کے مدارج میں فرق ہوگا یہ نہیں ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی معیت کا مقام جو تجھے حاصل ہے وہ کسی حالت میں جاتا رہے۔ تیری دونوں حالتیں خواہ وہ قبض کی ہوں یا بسط کی خدا کی معیت اور اس کی خوشنودی کا ثبوت ہوں گی صرف کمی بیشی کا فرق ہوگا مگر یہ نہیں ہوگا کہ معیت جاتی رہے۔ یہ وہی مقام ہے جسے صوفیاء نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ حَسَنَاتُ

الۡاَبۡرَارِ سَیِّئَاتُ الۡمُقَرَّبِیۡنَ (تشسیید المبانی تخریج احادیث مکتوبات الامام ربانی صفحة ۳۴) دراصل اس مقام کو کھول کر بیان کرنا سخت مشکل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ صوفیاء نے بجائے کھلے طور پر اس کا ذکر کرنے کے اشاروں اشاروں میں ہی بیان کر دیا کہ حَسَنَاتُ الۡاَبۡرَارِ سَیِّئَاتُ الۡمُقَرَّبِیۡنَ یعنی وہ مقام جو ابرار کے لئے بسط کا ہوتا ہے اور جسے وہ حصول عرفان کا بلند ترین درجہ سمجھتے ہیں وہ مقربین کے لئے قبض کا مقام ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی اشاروں میں یہ بات بیان کی ہے اور میں بھی اس بات پر مجبور ہوں کہ اشاروں تک اس بات کو محدود رکھوں۔ حقیقت میں یہ روحانی لہریں ہوتی ہیں جو کبھی اونچی چلی جاتی ہیں اور کبھی نیچے کی طرف آ جاتی ہیں۔ ان کے لئے اس بات کو بیان کرنا مشکل تھا اور میرے لئے نسبتاً آسانی ہے کیوں کہ لہروں کے علم نے اس مسئلہ کو سمجھنے میں بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ محمدی مقام کی نچلی لہریں بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کا ثبوت ہیں اور محمدی مقام کی اونچی لہریں بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کے ماتحت ہیں۔ دونوں حالتوں میں خدا تعالیٰ کی معیت آپؐ کے شامل حال رہے گی اور کبھی کوئی مقام خدا تعالیٰ کی ناراضگی یا اس کی ناپسندیدگی کا نہیں آئے گا۔ جس طرح پرندہ اڑتا ہے تو ایک جھٹکا کھاتا ہے اور بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ نیچے ہوا ہے حالانکہ وہ اڑان کا ایک حصہ ہے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ کی صفت قبض اس طرح ظاہر ہوگی کہ ہر قبض کی حالت بسط کا موجب بنے گی اور اوپر اٹھانے کا ذریعہ ہوگی۔

وَالضُّحٰى وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى کے ساتویں معنے ساتویں معنے وَالضُّحٰى وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى کے یہ ہیں کہ ہر نبی کی دو زندگیاں ہوتی ہیں ایک اس کی فردی زندگی ہوتی ہے اور ایک اس کے سلسلہ کی زندگی ہوتی ہے۔ فردی زندگی کے لحاظ سے اگر اس آیت کے مضمون کو لیا جائے تو ضُحٰی اور لَیۡل دونوں زمانے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حیات کے ساتھ تعلق رکھیں گے لیکن جب اس آیت کو آپؐ کی قومی زندگی پر چسپاں کیا جائے گا تو ضُحٰی اور لَیۡل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد کے وہ دور مراد ہوں گے جو امت محمدیہ پر آنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی جماعتی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وَالضُّحٰى وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى۔ ہم اس وقت کو بھی پیش کرتے ہیں جو تیری قومی اور جماعتی زندگی کے لئے ضُحٰی کی حیثیت رکھتا ہوگا اور ہم اس وقت کو بھی پیش کرتے ہیں جو تیری قومی اور جماعتی زندگی کے لئے لَیۡل کا مصداق ہوگا۔ دنیا میں ہر قوم پر ترقی اور تنزل کے مختلف دور آتے ہیں کبھی اقبال اور فتح مندی اس کے شامل حال ہوتی ہے اور کبھی ادبار اور ناکامی کی گھٹائیں اس پر چھائی ہوتی ہیں بالعموم قومیں ترقی کر کے جب تنزل کی طرف جاتی ہیں تو ہمیشہ کے لئے

تباہ اور برباد ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو زمانہ نبوت ہے یعنی آپؐ کے دعویٰ سے لے کر قیامت تک کا زمانہ یہ دورِ تنزل سے بالکل محفوظ رہے گا۔ ضُحٰی کی روشنی یکساں جلوہ گر رہے گی، کبھی لوگ خدا سے دور نہیں ہوں گے اور ادبار یا گمراہی کا زمانہ اُمتِ محمدیہؐ پر نہیں آئے گا بلکہ ہم مانتے ہیں کہ ضُحٰی کی حالتیں بھی اُمتِ محمدیہؐ پر آئیں گے اور وَ الَّيْلِ اِذَا سَجٰى کی حالت بھی رونما ہو گی لیکن اس کے ساتھ ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قومی حیات کے متعلق ہم ایک وعدہ کرتے ہیں جو دنیا کی اور کسی قوم کے ساتھ ہم نے نہیں کیا کہ اس کی ضُحٰی بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کے ماتحت ہو گی اور اس کی لَيْل بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کا ثبوت ہو گی۔

جہاں تک ماننے والوں کا تعلق ہے بے شک ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے کبھی ان پر ضُحٰی کی گھڑیاں آئیں گی اور کبھی لَيْل کی تاریکی ان پر چھا جائے گی۔ مگر جہاں تک شریعت محمدیہ کا اور لوگوں کے خدا تعالیٰ سے تعلق کا تسلسل ہے اس کے لحاظ سے کوئی دور ایسا نہیں ہو گا جو مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کے ماتحت نہ ہو۔ قوم پر بے شک تنزل آ جائے گا، لوگ بے شک گر جائیں گے، کامیابی اور اقبال کی درخشندہ ساعات بے شک لَيْل کی شکل میں بدل جائیں گے۔ مگر جتنا حصہ محمدیتؐ کا زندہ رہنا ضروری ہے وہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی معیت کے ماتحت قائم رہے گا۔ اس میں درحقیقت اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جہاں دوسری اقوام خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر ترقی کر جاتی ہیں وہاں تیری قوم سے ایسا نہ ہو گا۔ بلکہ تیری قوم پر جب بھی ضُحٰی کا دور آئے گا مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ کے ماتحت آئے گا۔ خدا سے الگ ہو کر دوسری قوموں کی طرح مسلمان کبھی بڑی ترقی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ دیکھ لو وہ تمام دوسری اقوام جن میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء مبعوث ہوئے تھے جب ان پر روحانی تنزل کا زمانہ آیا تو باوجود اس کے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو چھوڑا ہوا تھا وہ دنیوی لحاظ سے ترقی کر گئیں مگر فرماتا ہے تیری قوم سے ایسا نہیں ہو گا بلکہ اس پر جب بھی ضُحٰی کا وقت آئے گا مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کے ماتحت آئے گا۔ اور جب کبھی اللہ تعالیٰ ان کو دنیوی ترقی نصیب کرے گا اس کے ساتھ ہی ان کا دین بھی درست ہو گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان پر ضُحٰی کا وقت ایسی حالت میں آ جائے جب خدا تعالیٰ نے ان کو چھوڑا ہوا ہو یا ان کی دینی اور اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو۔ عیسائیوں کو دیکھ لو ان پر دنیوی ترقی کا دور بے شک آیا مگر کس وقت؟ جب عملی لحاظ سے عیسائیت بالکل مر چکی تھی۔ تین سو سال کے بعد جب عیسائی روحانی لحاظ سے سخت کمزور ہو چکے تھے اور ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کے خلاف کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں اس وقت ان پر دنیوی ضُحٰی کا زمانہ آیا۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیری امت

کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔مسلمانوں پر ضُحٰی کا دور اسی وقت آئے گا جب خدا تعالیٰ سے ان کا تعلق ہوگا۔اگر خدا تعالیٰ سے ان کا تعلق اپنی بداعمالی کی وجہ سے کٹ چکا ہوگا تو ضُحٰی کا دور بھی ان پر کبھی نہیں آئے گا۔ضُحٰی کا دور اسی وقت آئے گا جب عملی طور پر وہ خدا سے تعلق رکھ رہے ہوں گے چنانچہ دیکھ لو خلافت راشدہ کا زمانہ جو اسلام کی ترقی کا زمانہ تھا اس وقت یہ دونوں باتیں موجود تھیں ایک طرف روحانیت کا غلبہ موجود تھا اور دوسری طرف دنیوی ضُحٰی کا دور جاری تھا مگر موجودہ زمانہ میں جب تنزل کا دور آیا تو باوجود اس کے کہ مسلمانوں نے ایک ایک کر کے وہ تمام تدابیر اختیار کیں جو مختلف اقوام اپنی ترقی کے لئے اختیار کرتی ہیں پھر بھی وہ ضُحٰی کا دور واپس نہ لا سکے۔مسلمانوں نے کہا غیر قومیں سود کی وجہ سے ترقی کر گئی ہیں آؤ ہم بھی سود لینا شروع کر دیں تا کہ ہم بھی ترقی کی اس دوڑ میں حصہ لے سکیں۔انہوں نے سود لیا مگر جہاں دوسری اقوام سود کی وجہ سے ترقی کر گئیں وہاں مسلمان سود لینے کے باوجود تنزل اور ادبار میں گرتے چلے گئے۔پھر مسلمانوں نے کہا دنیا میں تعلیم سے ترقی ہوتی ہے آؤ ہم بھی تعلیم کی طرف توجہ کریں چنانچہ انہوں نے بڑے زور سے اپنی تعلیمی حالت کو درست کرنا شروع کر دیا مگر جہاں دوسری اقوام تعلیم کی طرف توجہ کرنے کے نتیجہ میں ترقی کر گئیں وہاں مسلمان تعلیم میں حصہ لینے کے باوجود گرتے چلے گئے۔پھر مسلمانوں نے کہا تجارت میں حصہ لینے سے ترقی ہوا کرتی ہے آؤ ہم تجارتوں کی طرف توجہ کریں تا کہ ہم غیر قوموں کی طرح دنیا پر غالب آسکیں چنانچہ انہوں نے تجارتوں کی طرف توجہ کی مگر جہاں دوسری اقوام تجارت سے دنیا پر غالب آگئیں وہاں مسلمان تجارت میں حصہ لینے کے باوجود ذلیل سے ذلیل تر ہوتے چلے گئے۔غرض مسلمانوں نے اپنا پورا زور اس غرض کے لئے صرف کر دیا کہ وہ کسی طرح ترقی کریں مگر ایک چیز بھی ان کو آگے بڑھانے کا موجب نہ بن سکی حالانکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے غیر اقوام ترقی کر رہی ہیں۔پس دنیا میں جس قدر قومیں پائی جاتی ہیں وہ مذہب کو چھوڑنے کے بعد بھی ترقی کر جاتی ہیں مگر مسلمانوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ ان پر ضُحٰی کا دور ہمیشہ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی کے ماتحت آئے گا یہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیں اور خدا تعالیٰ ان کو چھوڑ دے اور پھر بھی غیر قوموں کی طرح ترقی کر جائیں۔اس کی ایک مادی وجہ ہے اور ایک روحانی۔مادی وجہ تو یہ ہے کہ پہلے مذاہب کی تعلیمات سوائے یہود کے اس طرح کی تفصیلی نہیں جس طرح اسلام کی تعلیم اپنے اندر تفصیل رکھتی ہے اس لئے ان کو چھوڑ کر بھی اقوام ترقی کر جاتی ہیں کیونکہ ذہنی کشمکش کوئی نہیں ہوتی وہ جو حالت بھی اختیار کرتی ہیں اسی کا نام اپنا مذہب رکھ لیتی ہیں۔جیسے مسیحیت ہے یا ہندومت ہے لیکن اسلام کی تعلیم تفصیلی اور محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی اسے چھوڑ کر جب بھی مسلمان آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے ان کے دماغ میں ایک ذہنی کشمکش شروع ہو جائے گی

جو اطمینان قلب کو دور کر دیتی ہے اور یا تو مذہب سے دست بردار کروا دیتی ہے یا ترقی سے روک دیتی ہے۔

روحانی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم کو بغیر مذہب کے خدا تعالیٰ ترقی کرنے دے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس قوم کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی ایسا کوڑا نہیں رہتا جو اس قوم کی تنبیہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ قوموں کو مذہب کے بغیر بھی دنیوی ترقی دے دی کیونکہ خدا تعالیٰ ان قوموں کو چھوڑ چکا تھا۔ مگر فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے چونکہ تجھے کبھی نہیں چھوڑنا اس لئے ہم تیری قوم کو بھی کبھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ بغیر مذہب کی درستی کے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ اگر ہم مذہب کے بغیر ہی ان کو ترقی دے دیں تو وہ غلطی سے یہ سمجھ لیں گے کہ خدا تعالیٰ ہم سے خوش ہے اور وہ دین سے اور بھی دور جا پڑیں گے۔ اس لئے ہم دین سے غفلت کی حالت میں کبھی ان پر ضُحٰی نہیں لائیں گے۔ بلکہ جب بھی وہ دین سے غافل ہوں گے اور لَیْل کی حالت ان پر وارد ہوگی ہم انہیں سزا دیں گے کیونکہ اگر ہم سزا نہ دیں تو اس میں ان کی موت ہے۔ پس فرمایا مسلمان جب تک دین پر عمل پیرا رہیں گے ہم ان کے ساتھ رہیں گے اور انہیں دنیوی ترقیات سے بھی حصہ دیں گے مگر جب وہ ہمیں چھوڑ دیں گے ہم بھی ان کو چھوڑ دیں گے اور ان کو ان کی بداعمالی کی سزا دیں گے۔ مگر اس لئے نہیں کہ ان پر موت آئے بلکہ اس لئے کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ پھر تیری طرف واپس آئیں اور تیرے دین کو مضبوطی سے پکڑ لیں۔ گویا دونوں حالتوں میں ہمارا ان کے ساتھ معاملہ محض اس لئے ہوگا کہ وہ تیرے دامن سے وابستہ رہیں اور کبھی ایک آن اور ایک لحہ کے لئے بھی اسے چھوڑنے کا خیال نہ کریں۔ جب وہ ترقی کریں گے ایسی حالت میں کریں گے کہ تو ان کے ساتھ ہوگا اور جب تو ان کے ساتھ نہیں ہوگا ہم انہیں سرزنش کریں گے تا کہ روشنی اور ضُحٰی والا دور پھر واپس آجائے۔ گویا تاریکی اور تنزل کی گھڑیوں میں بھی ہمارا ان کے ساتھ ایسا سلوک ہوگا جو مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کا ثبوت ہوگا۔ ہم انہیں سرزنش اور تنبیہ کریں گے تا کہ وہ اپنی حالت کو بدل لیں اور جب اس تنبیہ کے بعد قوم تیری طرف واپس لوٹے گی پھر تیرے انوار اور برکات کا دنیا میں ظہور شروع ہو جائے گا گویا ضُحٰی کے وقت بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کا ظہور ہوگا اور لَیْل کے وقت بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کا ظہور ہوگا۔ ضُحٰی کے وقت اس طرح کہ جب کبھی وہ ترقی کریں گے اسلام کا نور دنیا کو نظر آنے لگ جائے گا اور لَیْل کے وقت اس طرح کہ جب ان میں تنزل واقعہ ہوگا خدا تعالیٰ کوڑے مار مار کر تیری طرف واپس لائے گا یا خدا تعالیٰ کوئی روحانی سلسلہ ایسا پھر قائم کر دے گا جو تیرے جلال اور جمال کو دنیا پر ظاہر کرنے والا ہوگا۔

غرض روحانی طور پر چونکہ اسلام آخری مذہب ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی خاص تقدیریں مسلمانوں کو بغیر اسلام

کے ترقی کرنے نہیں دیتیں تا کہ وہ مطمئن ہو کر دین سے غافل اور بے پرواہ نہ ہو جائیں۔ اور یہی مضمون وَالضُّحٰی اور مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی میں بیان کیا ہے کہ اسلامی ترقی اور الٰہی قرب ہمیشہ قدم بقدم بڑھیں گے۔ الٰہی قرب اور معیت اور رضا کے بغیر امت مسلمہ کو ترقی نہیں ہو گی جب بھی مسلمان دین کو چھوڑ دیں گے ترقیاتِ دنیویہ سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے آٹھویں معنے آٹھویں معنے وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے یہ ہیں کہ اسلام پر تنزل کا زمانہ بھی آئے گا مگر وہ دائمی نہ ہو گا اور مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی کا ایک ثبوت ہو گا یعنی پھر وہ زمانہ اچھے زمانہ سے بدل جائے گا یعنی ہر تاریکی کے بعد روشنی کا زمانہ آتا رہے گا۔ تاریکی کے زمانہ میں معیت اور رضاءِ الٰہی کی یہی دلیل ہوتی ہے کہ وہ جاتی رہے پس رات کے زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ کے راضی رہنے کے یہی معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ پھر اسلام کی تازگی کے سامان پیدا کر دے گا پھر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی مامور لوگوں کی اصلاح کے لئے کھڑا کر دے گا۔ مسلمان اپنی کوششوں سے مایوس ہو کر اُس کی طرف آئیں گے اور چونکہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ہو گا اس لئے اس کی طرف آنا تیری طرف واپس آنا ہو گا۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی کے نویں معنے نویں معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ ترقی اور تنزل دونوں زمانوں میں محفوظ رہے گی۔ قومیں شریعتوں کو دونوں زمانوں میں بدل دیتی ہیں بعض تنزل کے زمانہ میں اپنی غفلت سے بدلنے دیتی ہیں اور بعض ترقی کے زمانہ میں اپنی اغراض کے لئے بدل دیتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ پہلی جماعتوں کی یہ کیفیت رہی ہے کہ یا تو ضُحٰی اور ترقی کے زمانہ میں جب وہ عیاشی میں مبتلا ہو گئیں۔ انہوں نے شریعت کے اُن احکام کو بدل ڈالا جو ان کی خواہشات میں حائل تھے۔ جیسے عیسائیت میں جب حکومت آئی اور غالب قوم نے کہا کہ ہفتہ کی بجائے اتوار عبادت کا دن مقرر کر دیا جائے کیونکہ ہمیں اس میں سہولت ہے تو عیسائیوں نے فوراً اس کو بدل دیا اور ہفتہ کی بجائے اتوار کا دن عبادت کے لئے مقرر کر دیا۔ یا اس قوم کے افراد نے جب کہا کہ کفر کی حالت میں ہم اپنی عید فلاں فلاں دنوں میں منایا کرتے تھے عیسائیت میں بھی وہی دن مقرر ہونے چاہئیں تو عیسائیوں نے اس کو بھی مان لیا اور عیسوی احکام کو بدل ڈالا۔

(Encyclopaedia of Religion and Ethics Under the word "Sunday-in the Primitive Church")

اور یا پھر شریعت کے احکام تنزل کے زمانہ میں بدلے جاتے ہیں جب قوم میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے اور شرعی احکام کی عظمت اُس کی نگاہ سے زائل ہو جاتی ہے۔ غرض دو اوقات میں ہی شریعتیں بدلی جاتی ہیں کبھی ضُحٰی کے

وقت شریعتیں بدل جاتی ہیں اور کبھی لَیْل کے وقت۔ ضُحٰی کے وقت عیاشی کے لئے احکام شرعیہ کو قومیں بدل دیتی ہیں اور لَیْل کے وقت یا تو دشمن ان کی کتابوں کو جلا دیتے ہیں اور یا اپنی کمزوری کی وجہ سے وہ خود ہی اُس کی حفاظت کا فرض سرانجام نہیں دے سکتیں۔ جیسے بخت نصر جب یہود کو جلاوطن کر کے لے گیا تو وہ یہودی قوم کے لئے لَیْل کا وقت تھا۔ جب وہ واپس اپنے وطن میں آئے تو ان کی کتاب تورات غائب تھی۔ چنانچہ اس وقت عزرا نبی نے مع چند احبار کے تورات کو اکٹھا کیا مگر بہرحال وہ ویسی نہیں تھی جیسی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ (Apocrypha 2Esdras14:44-46) غرض شرائع دو زمانوں میں بدلی جاتی ہیں یا ترقی کے زمانہ میں یا تنزل کے زمانہ میں۔ ترقی کے زمانہ میں قوم شریعت کو اس لئے بدلتی ہے تا کہ وہ عیاشی میں حصہ لے سکے اور تنزل کے زمانہ میں قوم کی غفلت اور کوتاہی سے شرعی احکام بدلے جاتے ہیں یا دشمن شریعت کی کتابوں کو جلا دیتا ہے تا کہ یگانگت اور اتحاد کی روح قوم میں سے مٹ جائے۔ اللہ تعالیٰ اس امر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے یہ دونوں حالتیں تیری قوم پر نہیں آئیں گی اور ترقی اور تنزل دونوں دور میں ہم تیرے ساتھ رہیں گے اور تیرے کام کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو آخر ایک دن فوت ہونے والے تھے صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب تھی جو قیامت تک موجود رہنے والی تھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خواہ تیری قوم پر ترقی کے اوقات آئیں یا تنزل کی گھڑیاں آئیں ہم اس کلام کو جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے کبھی بدلنے نہیں دیں گے اور ہمیشہ اس کی حفاظت کریں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ محض قومی تنزل کوئی حقیقت نہیں رکھتا وہ تنزل تو افراد کی خرابی پر دلالت کرتا ہے اگر کوئی قوم تنزل کے بعد ترقی کر جائے تو پھر اس کی گزشتہ ناکامیوں کا داغ دُھل سکتا ہے لیکن اگر شریعت بدل جائے اور قوم ترقی کر جائے تو اس ترقی کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ پس جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ محض قومی تنزل نہیں یا لوگوں کی حالت کا بدل جانا نہیں بلکہ اصل اہمیت رکھنے والی چیز رسول کا بدل جانا ہے یعنی اس کی تعلیم کا بدل جانا اور اُس کے کلام کا خراب ہوجانا۔ سو اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ ان آیات میں وعدہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ترقی اور تنزل دونوں دور میں ہم اس کلام کی حفاظت کریں گے جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے۔

وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ﴿۵﴾

اور (دیکھ تو سہی کہ) تیری ہر پیچھے آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہوتی ہے۔

تفسیر۔ بہت سے ترقی کرنے والے یکدم بڑھتے ہیں مگر آخر ٹھوکر کھاتے اور گر جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو

ہٹلر، نپولین، تیمور اور سکندر سب ایسے ہیں جو دنیا میں بڑھے اور انہوں نے ترقی کی مگر آخر ناکامی پر ان کا خاتمہ ہوا۔ اسی طرح اور کئی بڑے بڑے لوگ دنیا میں گزرے ہیں جنہوں نے حیرت انگیز ترقیات کیں مگر آخر وہ گر گئے اور اُن کی تمام شہرت اور ناموری جاتی رہی۔ پھر بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بڑے ذہین ہوتے ہیں مگر آخر میں پاگل ہو جاتے ہیں یا اپنی ذہانت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ مولوی محمد حسین صاحب آزادلاہور میں رہتے تھے بڑے ذہین اور قابل آدمی تھے بہت بڑی علمیت کے مالک تھے مگر آخر میں ان کے دماغ میں نقص واقعہ ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ وہ بازار میں سے گذرتے تو لوگ اکٹھے ہو جاتے اور جب ان سے کوئی بات کرتا تو وہ اسے گالیاں دینے لگ جاتے۔ عالم ہوتے ہیں مگر آخر میں جاہل ہو جاتے ہیں، ان کا حافظہ خراب ہو جاتا ہے اور وہ علم جو انہوں نے سیکھا ہوتا ہے سب بھول جاتا ہے۔ بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محبوب ہوتے ہیں مگر آخر وہ متروک ہو جاتے ہیں بلکہ جس قدر جسمانی محبوب ہوتے ہیں ان سب کا یہی حشر ہوتا ہے۔ جوانی میں ہر شخص ان کی طرف دیکھتا ہے مگر جب ان کے دانت گر جاتے ہیں، جب ان کی کمر جھک جاتی ہے، جب ان کے چہرہ پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ تو بدصورت سے بدصورت انسان بھی ان کو دیکھ کر ہنستا ہے اور کہتا ہے یہ کیسا بدشکل انسان ہے۔

فرانس کا ایک قصہ مشہور ہے۔ ایک شخص نے فرانس کی ایک بڑھیا عورت کو دیکھا تو اس کی شکل وصورت اور رفتار کو دیکھ کر سخت کراہت کا اظہار کیا وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی اور اسے ایک تصویر دکھا کر کہا کہ جانتے ہو یہ کس کی تصویر ہے؟ وہ کہنے لگا ہاں میں جانتا ہوں یہ فلاں حسین عورت کی تصویر ہے میری ماں اس کی سہیلی تھی اور یہ عورت اتنی حسین اور خوبصورت تھی کہ سارا پیرس اس پر شیدا تھا۔ جب وہ یہ بات کہہ چکا تو عورت کہنے لگی یہ میری ہی تصویر ہے۔ تو کئی محبوب ہوتے ہیں مگر آخر میں مبغوض ہو جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ہمارے رسول! تیرا یہ حال نہیں ہوگا۔ تجھ کو جو ترقیات ملیں گی وہ ہر قدم پر بڑھتی چلی جائیں گی۔ پہلے مدینہ کا گردونواح صاف ہوا، پھر مکہ فتح ہوا، پھر سارا عرب پھر شام اور عراق اور مصر فتح ہوئے۔ غرض ہر قدم آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

آنحضرت صلعم کی ہر دوسری گھڑی پہلی سے بہتر ممکن ہے کوئی کہے کہ مکہ تو آپؐ کے ہاتھوں پر فتح ہوا تھا مگر عراق اور مصر وغیرہ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد فتح ہوئے ہیں اس لئے شاید غلطی سے یہ نام لے لئے گئے ہیں مگر میں نے غلطی نہیں کی میں نے دیدہ و دانستہ شام اور عراق اور مصر وغیرہ کا نام لیا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کوئی کہے کہ اگر لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کے ثبوت میں عراق اور مصر وغیرہ کی فتوحات کو پیش کیا جا سکتا ہے تو پھر اس بات کا کیا جواب ہے کہ ان فتوحات کے بعد اسلام کا تنزل شروع ہو گیا اور آخرت اُولیٰ

سے بہتر نہ رہی۔ میں اِس کو بھی درست سمجھتا ہوں اور اُس کو بھی درست سمجھتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہمیشہ یہ قانون رہے گا کہ ان کی آخرت اولیٰ سے بہتر ہوگی۔ جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود رہے اسلام بڑھتا رہا اور جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں نے چھوڑ دیا اسلام کا تنزل شروع ہو گیا۔ عراق اور شام اور مصر مسلمانوں کو اس لئے ملے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود تھے۔ بے شک جسمانی اعتبار سے آپؐ وفات پا چکے تھے مگر روحانی اعتبار سے آپؐ کا وجود امت میں موجود تھا اور گو جسدِ عنصری کے ساتھ آپؐ دنیا میں زندہ نہیں تھے مگر ابوبکرؓ کے دل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے۔ عمرؓ کے دل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے۔ عثمانؓ کے دل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے۔ علیؓ کے دل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فتوحات پر فتوحات ہوتی چلی گئیں مگر جب وہ لوگ آ گئے جن کے دلوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نہ تھے مسلمانوں کا تنزل شروع ہو گیا۔ آخر غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تو نہیں کہا کہ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّيَزِيْدَ۔ یزید کے لئے بھی آخرت اُولیٰ سے بہتر ہو گی۔ خدا تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لئے آخرت اُولیٰ سے بہتر ہوگی چنانچہ جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عملی طور پر دنیا میں موجود رہے مسلمانوں کے ساتھ بھی یہ وعدہ پورا ہوتا رہا۔ جب وہ لوگ آ گئے جن کو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نہیں کہا جا سکتا تھا جو آپؐ کے نقشِ قدم پر چلنے والے نہیں تھے تو خدا تعالیٰ نے بھی ان کو چھوڑ دیا۔

پھر دیکھو وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کی صداقت کا یہ کیسا شاندار نظارہ تھا کہ جب آپؐ بدر کی جنگ پر تشریف لے گئے تو صرف ۳۱۳ صحابہؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ اُحد کی جنگ آئی تو ایک ہزار صحابہؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ خندق کی جنگ آئی تو تین ہزار صحابہؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ فتح مکہ کا وقت آیا تو دس ہزار صحابہؓ آپ کے ساتھ تھے۔ غرض وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کے مطابق یہ تعداد بڑھتی چلی گئی۔

پھر آپؐ کا تقویٰ اور صلاح بھی ترقی کرتے چلے گئے۔ دولت و امارت نے آپ کو جابر اور متشدد نہیں بنایا وہی غرباء پروری وہی انکسار اور وہی عبادت اور وہی استغناء آخر تک رہا۔ فتح مکہ کے بعد آپ کے گلے میں ایک شخص نے پٹکا ڈال دیا مگر آپؐ خاموش رہے (مسند احمد بن حنبل مسند انس بن مالک)۔ ایک ظالم نے یہ اعتراض کیا کہ تِلْكَ قِسْمَةٌ لَّا تُرَادُ بِهَا وَجْهُ اللهِ۔ آپؐ نے مال اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی مدنظر نہیں (صحیح بخاری کتاب الادب باب من اخبر صاحبہ بما یقال فیہ)۔ مگر قتل کرنے کی خواہش کرنے والے کو منع

فرمادیا(صحیح مسلم کتاب الزکاۃ باب ذکر الخوارج وصفاتھم)۔

جسمانی لحاظ سے دیکھو تو وہ شخص جو اکیلا مکہ میں سے نکلا تھا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوا۔ روحانی لحاظ سے دیکھو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو مکہ میں چار پانچ لوگوں کو پالنے والا تھا وہ مدینہ میں لاکھوں کو پالنے والا بن جاتا ہے اوران کو اسی طرح پالتا ہے جس طرح مکہ میں وہ چندافراد کو جنہیں انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا تھا پالتا تھا۔

جب فتوحات ہوئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن بازار سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک اچھا کوٹ خرید لائے اورعرض کیا یا رسول اللہ! یہ کوٹ مجھے بڑا اچھا لگا تھا میں آپ کے لئے خرید لایا ہوں،اب فتوحات ہوئی ہیں، بڑے بڑے بادشاہ اوروفود آپؐ سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ جب وہ آئیں آپؐ یہ کوٹ پہن لیا کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو آپؐ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور آپؐ نے فرمایا خدا تعالیٰ نے مجھے ان کاموں کے لئے نہیں بھیجا، میں اس کوٹ کو نہیں پہن سکتا اسے واپس لے جاؤ (صحیح بخاری کتاب الأدب باب من تجمل للوفود)۔غرض یہ نہیں ہوا کہ فتوحات کے وقت آپ کی حالت میں کوئی فرق پیدا ہو جاتا اور آپ زیادہ اعلیٰ لباس یا زیادہ آسائش کے سامان اپنے لئے پسند فرماتے بلکہ ہمیشہ آپؐ کے تقویٰ اور برّ میں زیادتی ہی ہوتی چلی گئی۔

پھر محبوبیت کا یہ حال تھا کہ روز بروز اس میں کمال پیدا ہوتا گیا۔مکہ کے لوگ آپؐ کے بے شک فدائی تھے مگر مکہ سے نکلنے کے بعد انہوں نے اپنی فدائیت کے نظارے دکھلائے۔ مکہ میں صحابہؓ کی فدائیت کا جو نظارہ نظر آتا ہے وہ بہت کم ہے اور اس کی مثالیں زیادہ نہیں۔ ایک حضرت علیؓ کا واقعہ ہے جو فدائیت کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے اور یا پھر غارِ ثور میں حضرت ابوبکرؓ کی فدائیت کا واقعہ ہے جو نظر آتا ہے۔ان کو مستثنیٰ کرتے ہوئے مکہ میں فدائیت کے نظارے بہت کم نظر آتے ہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں مکہ والے مظالم سے تنگ آکر حبشہ چلے جاتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا چھوڑ جاتے ہیں۔مگر مدینہ میں آپؐ کو جو انصار ومہاجرین کی جماعت ملی اس نے آپؐ سے جس محبت کا سلوک رکھا ہے اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ جنگِ بدر کے موقعہ پر انصار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک الگ مقام بنا دیا اور وہاں دو تیز رفتار اونٹنیاں باندھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو اس جگہ بٹھا دیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ جنگ ہونے والی ہے ورنہ ہمارے دوسرے بھائی بھی اس سعادت سے محروم نہ رہتے۔ یا رسول اللہ! اگر ہم سب کے سب مارے جائیں تو آپؐ اور ابوبکرؓ ان تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر مدینہ تشریف لے جائیں وہاں اسلام کی ایک بہادر فوج موجود ہے حضورؐ جو بھی حکم دیں گے ہمارے وہ بھائی اس کو پوری خوشی کے ساتھ قبول کریں گے اور اپنی جانیں اسلام

کے لئے قربان کر دیں گے (السیرۃ الحلبیۃ باب ذکر مغازیہ صلی اللہ علیہ وسلم)۔ پھر ہم اُحد کے موقعہ پر دیکھتے ہیں کہ صحابہؓ نے فدائیت کا کیسا شاندار نمونہ دکھایا۔ ایک مہاجر حضرت طلحہؓ تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑے تھے دشمن کے تیروں کا اصل نشانہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اس لئے جو بھی تیر آپؐ کی طرف آتا حضرت طلحہؓ اس کو اپنے ہاتھ پر لے لیتے۔ یہاں تک کہ تیروں کی بوچھاڑ کی وجہ سے ان کا ہاتھ شل ہو گیا۔ کسی نے بعد میں ان سے پوچھا کہ جب آپ کو تیر لگتے تھے تو آپ کے منہ سے آہ نہیں نکلتی تھی؟ حضرت طلحہؓ نے جواب دیا آہ نکلنا تو چاہتی تھی مگر میں نکلنے نہیں دیتا تھا تا ایسا نہ ہو کہ میں آہ کروں اور کوئی تیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جا لگے۔ دوسرا واقعہ مالک انصاری کا ہے۔ پہلی فتح کے بعد وہ الگ جا کر کھجوریں کھانے لگے کیونکہ سخت بھوکے تھے۔ پھرتے ہوئے ایک جگہ آئے تو انہوں نے دیکھا حضرت عمرؓ ایک ٹیلہ پر بیٹھے ہوئے رو رہے تھے انہوں نے حیرت سے کہا عمر کیا ہوا یہ رونے کا مقام ہے یا ہنسنے کا؟ خدا تعالیٰ نے اسلام کو فتح دی ہے اور تم بیٹھے رو رہے ہو! حضرت عمرؓ نے کہا تم کو پتہ نہیں کہ فتح کے بعد کیا ہوا؟ وہ کہنے لگے کیا ہوا؟ حضرت عمرؓ نے کہا فتح کے بعد لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول تھے، لشکر تتر بتر تھا کہ دشمن نے موقعہ پا کر حملہ کر دیا اور اس نے حملہ ایسا شدید کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید ہو گئے۔ مالکؓ نے کہا عمرؓ پھر بھی تو بیٹھ کر رونے کا کوئی موقعہ نہیں اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو پھر جہاں ہمارا پیارا گیا وہیں ہم جائیں گے۔ یہاں بیٹھنے کا کون سا موقعہ ہے۔ یہ کہا اور صرف ایک ہی کھجور جو ان کے ہاتھ میں رہ گئی تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے میرے اور جنت کے درمیان سوائے اس کھجور کے اور کون سی چیز حائل ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے کھجور کو پھینک دیا اور تلوار لے کر دشمن کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ اب بظاہر ان کے دل میں یہ خیال بھی آ سکتا تھا کہ جس شخص کے لئے ہم قربانی کر رہے تھے جب وہی نہیں رہا تو اب قربانی کرنے کا کیا فائدہ ہے مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قربانی کر رہے تھے جب وہ نہیں رہے تو اب قربانی کا کیا فائدہ۔ بلکہ وہ کہتے ہیں جس کام کے لئے وہ کھڑے ہوئے تھے اس کام کے لئے ہمیں اسی جوش اور اسی ولولہ کے ساتھ قربانی کرنی چاہیے جس جوش اور ولولہ کے ساتھ ہم آپؐ کی زندگی میں قربانی کیا کرتے تھے اگر وہ زندہ نہیں رہے تو پروا نہیں۔ میں اکیلا جاؤں گا اور دشمن سے لڑوں گا۔ چنانچہ وہ اکیلے تلوار لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک آدمی تین ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں کیا کر سکتا ہے چنانچہ لڑائی کے بعد ان کے جسم کے ستر ٹکڑے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے گئے تب ان کی لاش مکمل ہوئی۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس طرح مجنونانہ طور پر لڑے تھے اوّل تو جب تک زندہ رہے انتہائی دلیری کے ساتھ لڑتے رہے پھر جب ایک ہاتھ کٹا تو

دوسرے ہاتھ میں تلوار سنبھال لی۔ دوسرا ہاتھ کٹ گیا تو منہ میں تلوار لے لی اور دشمن کو مارتے چلے گئے یہ دیکھ کر دشمن کو بھی شدید غصہ پیدا ہوا اور اس نے ان کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ لڑائی کے بعد جب ان کے جسم کے مختلف ٹکڑے اکٹھے کئے گئے تو تلوار کے زخموں کی وجہ سے ان کی لاش پہچانی تک نہیں جاتی تھی۔ آخر ان کی ایک انگلی ملی جس پر ایک نشان تھا اس نشان کو دیکھ کر مالک انصاری کی بہن نے کہا کہ یہ میرے بھائی کی لاش ہے (شرح الزرقانی کتاب المغازی غزوۃ احد)۔ غرض وَ لَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی کے مطابق آپؐ کی محبوبیت میں روز بروز کمال پیدا ہوتا چلا گیا اور صحابۂ کرام نے اپنی فدائیت کے وہ نظارے دکھلائے جو آج تک کسی نبی کے ماننے والے دکھلا نہیں سکے۔

پھر آپؐ کی وفات پر جو واقعہ ہوا وہ صحابۂ کرام کی اس محبت کا کتنا بڑا ثبوت ہے جو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رکھتے تھے۔ وہ صحابہؓ جو دن رات سنتے تھے کہ مردے زندہ نہیں ہوتے، وہ صحابہؓ جو روزانہ سنتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وفات آسکتی ہے۔ اُن پر اُس وقت ایسی جنون کی کیفیت طاری ہوگئی کہ باوجود اس مضمون کے جو روزانہ اُن کے سامنے دہرایا جاتا تھا اُن کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ تلوار لے کر کھڑے ہوگئے کہ اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے ہیں تو میں اس کی گردن کاٹ دوں گا۔ حضرت حسانؓ کہتے ہیں ہمارے دلوں میں مایوسی پیدا ہو چکی تھی مگر جب عمرؓ تلوار لے کر کھڑے ہوگئے تو ہمارے دلوں میں بھی جھوٹی امید پیدا ہوگئی اور ہم خوش ہوگئے کہ چلو وہ بات غلط نکلی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو زندہ موجود ہیں۔ آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے، منبر پر چڑھے اور انہوں نے تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ کہ تم میں سے جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کیا کرتا تھا تو وہ اچھی طرح سن لے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے ہیں۔ وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔ لیکن تم میں سے جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے اور وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ پھر آپؓ نے یہ آیت پڑھی کہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤی اَعْقَابِکُمْ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اگر وہ مر جائیں گے تو کیا تم اپنے ایمان سے پھر جاؤ گے۔ جب ابوبکرؓ نے یہ بات بیان کی تب صحابہؓ کی آنکھیں کھلیں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں جب انہوں نے یہ آیت پڑھی تب مجھے ہوش آیا اور یا تو میری یہ حالت تھی کہ ابوبکرؓ کے رعب سے میں فوراً تلوار نہیں چلا سکا تھا اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ یہ بڈھا اپنی بات ختم

کر لے تو میں اس کی گردن اڑا دوں اور یا جب ابوبکرؓ نے اپنی بات ختم کر لی تو میری ٹانگیں کانپ گئیں اور میں زمین پر گر گیا (السیرۃ النبویۃ لاحمد بن زینی دحلان باب فی ذکر وفاتہ)۔ اس وقت صحابہؓ کو اپنے محبوب کی جدائی سے جس قدر غم ہوا اس کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت حسانؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہا۔ جب انہیں یقین آ گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فوت ہو چکے ہیں تو حضرت حسانؓ نے کہا ؎

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

وہ کہتے ہیں حضرت عمرؓ کے کھڑے ہونے سے پہلے تو ہم نے سمجھا کہ شاید یہ بات غلط ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں مگر جب ابوبکرؓ نے ہماری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا تو بے اختیار میری زبان پر یہ شعر جاری ہو گیا ؎

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تُو تو میری آنکھ کی پتلی تھا تیرے مرنے سے میری آنکھ کی پتلی جاتی رہی ہے اور میں اندھا ہو گیا ہوں اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک تُو زندہ رہا مجھے وہ سب کے سب فوائد تجھ سے مل رہے تھے جو کسی کو مل سکتے ہیں۔ مجھے دین بھی مل رہا تھا اور دنیا بھی مل رہی تھی اور مجھے دنیا کی ہر نعمت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آتی تھی لیکن آج جب کہ تو زندہ نہیں رہا میں اندھا ہو گیا ہوں۔ اس لئے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کوئی مرے۔ باپ مرے، بیٹا مرے، بیوی مرے، بھائی مرے مجھے کسی کی پروا نہیں۔ مجھے تو تیری جان کا ہی ڈر لگا ہوا تھا۔ دیکھو یہ کیسی شاندار محبت تھی جس کا صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات پر نمونہ دکھایا اور جو ثبوت تھا اس بات کا کہ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ لوگ مرتے ہیں تو دنیا انہیں برا بھلا کہتی ہے۔ کہتے ہیں اچھا ہوا چھٹکارا ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوتے ہیں تو بیویاں کیا اور بچے کیا اور ساتھی کیا ہر شخص کا دل غمگین ہو جاتا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھ لو کہ پہلا گھر مکہ کا تھا جہاں صرف چند رشتہ دار آپؐ کے پاس تھے یا آپؐ کے چچا ابو طالب آپؐ کی مدد کیا کرتے تھے مگر وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کے مطابق دوسرا گھر خدا تعالیٰ نے آپ کو مدینہ میں دیا جو پہلے سے بہتر ثابت ہوا مکہ میں صرف دس بیس فدائی تھے اور مدینہ میں شہر کا شہر۔ مرد کیا اور عورتیں کیا۔ بچے کیا اور بوڑھے کیا سب آپ پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

پھر ذہانت آپ کی آخر تک قائم رہی۔انسان بالعموم آخر عمر میں جا کر کمزور دماغ کے ہوجاتے ہیں اوران کا علم سلب ہونا شروع ہوجاتا ہے مگر آپؐ کے علم اور ذہانت میں آخر تک کوئی فرق نہ آیا بلکہ ہر دن جو آپؐ کی زندگی میں آیا پہلے سے بڑھ کر آیا۔اسی طرح جو کلام آپ پر نازل ہوا وہ آخر دم تک نازل ہوتا رہا اور ہر روز نئی سے نئی باتوں کا آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم دیا جاتا رہا۔غرض کوئی دن آپ کی زندگی میں ایسا نہ آیا جب لوگوں نے یہ کہا ہو کہ یہ سٹھیا گیا ہے،اس کا دماغ کمزور ہوگیا ہے،اس کا علم جاتا رہا ہے بلکہ ہر دن جو آپؐ پر آیا پہلے سے زیادہ علم لے کر آیا اور پہلے سے زیادہ دنیا کے سکھانے اور سمجھانے اور پڑھانے میں صرف ہوا اوراس طرح اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی صداقت کو واضح کر دیا کہ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔تیرے لئے آخرت پہلی حالت سے بہت اچھی ہوگی۔

وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى کے ایک اور معنے بھی ہیں جو قبض و بسط کی روحانی کیفیات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى میں یہ مضمون بیان کیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بسط کی حالت بھی خدا تعالیٰ کی معیت کا ثبوت ہوگی اوران کی قبض کی حالت بھی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى کا ثبوت ہوگی۔ اب اس آیت میں یہ بتاتا ہے کہ ہم ایک بات کی تمہیں تسلی دلا دیتے ہیں اور وہ یہ کہ تم ان روحانی لہروں میں یکساں نہیں چلو گے بلکہ ہمیشہ پہلے سے اونچے نکلتے جاؤ گے۔لہر کی رفتار دراصل دو قسم کی ہوتی ہے۔ایک رفتار تو اس قسم کی ہوتی ہے کہ ایک ہی مقام پر وہ اوپر نیچے ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے لیکن ایک رفتار اس قسم کی ہوتی ہے کہ ہر دفعہ نیچے آ کر وہ پہلے سے اور زیادہ اونچی چلی جاتی ہے یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى میں بیان فرمایا ہے کہ بے شک تجھ پر قبض کی حالتیں بھی آئیں گی اور بسط کی حالتیں بھی آئیں گی اور یہ دونوں حالتیں معیت الٰہی اور رضاء باری تعالیٰ کے ساتھ ہوں گی مگر اس کے ساتھ ہی ایک زائد بات یہ بھی ہوگی کہ تیرا نیچے جھکنا ایسا ہی ہوگا جیسے پرندہ نیچے کی طرف اپنا پَر مارتا ہے وہ بے شک نیچے جھک کر اپنا پَر مارتا ہے مگر اس کا نیچے جھکنا اسے اور زیادہ بلندی پر لے جانے کا موجب بن جاتا ہے اسی طرح ہر دفعہ تیرا نیچے جھکنا ایسا ہی ہوگا جیسے پرندہ پَر مارتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے بھی اونچا چلا جاتا ہے۔گویا بتا دیا کہ تیری پرواز پرندوں والی ہوگی اور قبض کی ہر حالت جو تجھ پر وارد ہوگی وہ تجھے اور زیادہ بلندی کی طرف لے جائے گی۔

اس آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ جو شخص ماموریت کا مدعی ہو وہ جب لوگوں سے ملتا ہے تو لوگ کہتے ہیں یہ وجاہت پسندی کے لئے یا لوگوں میں اپنی مقبولیت اور عظمت قائم کرنے کے لئے ملتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس آیت میں لوگوں کے اس خیال کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے تو اگر علیحدگی اختیار کرتا ہے تو ہمارے ذکر کے لئے۔

اور اگر لوگوں سے ملتا ہے تو ہمارے حکم کے ماتحت۔ پس تیرے متعلق لوگوں کا یہ خیال کرنا قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہے۔ تیری علیحدگی ذکر کے لئے ہوتی ہے اور تیرا پبلک میں آنا محض بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے ہوتا ہے۔ اپنے نفس کے لئے نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرماتا ہے وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ نادان تیری زندگی سے ناواقف ہیں انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ علیحدگی کی حالت تجھے ہمیشہ پیاری رہتی ہے تو اگر لوگوں سے ملتا ہے تو محض خدا کے لئے پس وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى میں یہ بتایا کہ آخرۃ تجھے اُولیٰ سے زیادہ راحت والی معلوم ہوتی ہے۔ خَيْرٌ کے معنے راحت والی یا آرام پہنچانے والی چیز کے ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان آیات میں کون سی چیز آخرۃ کہلا سکتی ہے اور کون سی اُولیٰ۔ سو پہلی آیت میں ضُحٰی کو پہلے بیان کیا گیا ہے اور لیل کو بعد میں۔ پس آخرۃ لیل ہوئی اور اُولیٰ ضحٰی ہوئی اور ضحٰی یعنی دن کے وقت چونکہ انسان لوگوں سے ملتا ہے اس لئے وہ ضحٰی جلوت کا قائم مقام سمجھی جائے گی اور رات کو وہ چونکہ علیحدہ ہوتا ہے اس لئے لَیل خلوت کا قائم مقام سمجھی جائے گی ان معنوں کے مطابق آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ اے ہمارے رسول! تجھے خلوت سے جلوت کی نسبت زیادہ راحت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ تجھے جاہ پسند سمجھتے ہیں حالانکہ تو لوگوں سے محض ہمارے حکم کے ماتحت ملتا ہے ورنہ رات کو ہم سے راز و نیاز کی باتیں کرنا تجھے زیادہ پسند ہیں اور جو برکات تجھے رات کو ہم دیتے ہیں وہ دن کو ملنے والے انسان تجھے کہاں دے سکتے ہیں۔ پس جب کہ تیری تمام ترقیات تیری خلوت کی گھڑیوں سے وابستہ ہیں اور تو اسے دل سے جلوت پر ترجیح دیتا ہے تو لوگوں کا یہ کہنا کہ تو جاہ پسند ہے تیرے دل کو کیوں دکھ پہنچائے کہ یہ اعتراض حقیقت سے دور اور سر تا پا جھوٹ ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے متعلق بھی بیان فرمائی ہے کہ

> ”میں پوشیدگی کے حجرہ میں تھا اور کوئی مجھے نہیں جانتا تھا اور نہ مجھے یہ خواہش تھی کہ کوئی مجھے شناخت کرے۔ اُس نے گوشۂ تنہائی سے مجھے جبراً نکالا۔ میں نے چاہا کہ میں پوشیدہ رہوں اور پوشیدہ مروں مگر اس نے کہا کہ میں تجھے تمام دنیا میں عزت کے ساتھ شہرت دوں گا۔ پس یہ اس خدا سے پوچھو کہ ایسا تو نے کیوں کیا؟ میرا اس میں کیا قصور ہے۔“ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۵۳)

وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جبراً گوشۂ تنہائی سے باہر نکالا۔ ورنہ ان کی خواہش یہی تھی کہ وہ خلوت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہیں۔ چنانچہ دیکھ لو غار حرا میں جب فرشتے نے کہا اِقْرَأْ تو آپؐ نے یہی جواب دیا کہ مَآ اَنَا بِقَارِئٍ۔ (صحیح بخاری

کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی اِلٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم) میرے سپرد یہ کام کیوں کیا جاتا ہے میں تو اپنے رب کی عبادت پسند کرتا ہوں۔ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس اعتراض کو رد کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجاہت پسندی کے لئے لوگوں سے ملتے ہیں اور بتایا ہے کہ ان نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ ساعت آخرت یعنی لَیْل تیرے لئے اچھی ہوتی ہے اور تو اس سے بہت زیادہ راحت محسوس کرتا ہے۔ لوگوں کو ملنا تجھے پسند نہیں۔ تو اگر ملتا ہے تو محض خدا تعالیٰ کے حکم سے۔ تیری ذاتی خواہش کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

وَ الضُّحٰی وَ الَّیْلِ اِذَا سَجٰی۔ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی کے ایک معنے یہ بھی کئے گئے تھے کہ ترقی اور تنزل دونوں دَور میں ہم تیرے ساتھ رہیں گے اور تیرے کام کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ ان معنوں کے رُو سے وَ لَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی کا یہ مفہوم ہوگا کہ ہمیشہ رات کے بعد ضُحٰی آتی رہے گی یہ معنے نہیں کہ آخری زمانہ پہلے سے اچھا ہوگا بلکہ تاریکی اور روشنی کے دَور دو طرح آسکتے ہیں ایک یہ کہ پہلے روشنی اور پھر تاریکی کا دَور آئے اور دوسرے یہ کہ پہلے تاریکی پھر روشنی کا دَور آئے۔ فرماتا ہے تیرے لئے ہمیشہ روشنی کا دَور آخری ہوتا چلا جائے گا۔ بعض لوگ پہلے ترقی کرتے ہیں پھر گر جاتے ہیں اور ان کی پہلی ترقی کی وجہ سے لوگ اُن پر رشک نہیں کرتے اُن کی آخری تباہی کی وجہ سے اُن کے حالات سے عبرت پکڑتے ہیں۔ پھر قومی طور پر بعض اقوام یک دم بڑھ کر گر جاتی ہیں اور بعض گرتی ہیں پھر اونچی نکل جاتی ہیں پھر گرتی ہیں پھر اونچی نکل جاتی ہیں۔ اِسی طرف اِس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی معاملہ بھی ایسا ہوگا کہ آپ پہلے تکالیف اُٹھائیں گے مگر پھر ترقی کر جائیں گے اور آپ کی قوم سے بھی یہ معاملہ ہوگا کہ ہر تنزل کے بعد اللہ تعالیٰ مامورین یا مجددین کے ذریعہ سے اس کے اُبھارنے کے سامان کرتا چلا جائے گا اور اسی طرح بعد میں آنے والا دَور اپنے سے پہلے تنزل کے دور سے بہتر ہوگا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ یہ ذکر نہیں کہ ہر آنے والا روحانی دور پہلے روحانی زمانہ سے اچھا ہوگا کیونکہ اس طرح تو یہ ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ آئندہ روحانی دَور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اچھے ہوں گے اور یہ بالبداہت غلط ہے۔ پس اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر تنزل کے بعد اس سے بہتر زمانہ اُمتِ اسلامیہ پر لایا جائے گا جس میں اس کی روحانی حالت پھر ترقی کر جائے گی۔ پس پہلے روحانی دَوروں کا مقابلہ نہیں بلکہ ہر دَور روحانی کا مقابلہ پہلے تنزل کے دور سے ہے۔

اور یہ جو حدیثوں میں آتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ میری قوم کا پہلا حصہ اچھا ہے یا آخری (مسند احمد عن انس) اس کے یہ معنی نہیں کہ آخری زمانہ پہلے زمانہ سے بلحاظ روحانیت کے بہتر ہوگا بلکہ اس زمانہ کو بہتر اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ اس نے اسلامی تنزل کے ایک بہت بڑے دَور کے گذرنے کے بعد آنا تھا اور آپ کا صرف یہ مطلب ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام پر جو مشکلات ابتدائی دور میں آئی ہیں اُن کو زیادہ سخت کہوں یا اُن مشکلات کو زیادہ سخت کہوں جو آخری زمانہ میں آنے والی ہیں اور چونکہ خوشی مشکلات کی نسبت سے ہوتی ہے آپ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ اُن کو اچھا کہوں جو اَب ہیں یا اُن کو جو آخری دَور میں پیدا ہونے والے ہیں یعنی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ دَور کے لوگ کامیابی کے لحاظ سے زیادہ خوش قسمت ہیں یا آئندہ دَور کے لوگ زیادہ خوش قسمت قرار دیئے جانے کے مستحق ہوں گے۔ بہرحال آیت کے یہ معنے نہیں کہ ہر پچھلا زمانہ پہلے زمانہ سے روحانیت کے لحاظ سے بہتر ہوگا بلکہ معنے یہ ہیں کہ قربِ قیامت تک تیرے لئے روشنی کا دَور ہمیشہ آخر میں آئے گا البتہ اس میں ایک استثنٰی ہے اور وہ یہ کہ قیامت صرف اشرار پر آئے گی چنانچہ قرآن کریم سے بھی پتہ لگتا ہے اور حدیثوں سے بھی کہ خرابی کا وہ آخری دَور جو قرب قیامت کے وقت ہوگا صرف اشرار پر آئے گا ابرار اُس وقت دنیا میں نہیں رہیں گے۔ پس وہ دَور بہرحال وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى سے مستثنٰی ہے لیکن اسے اس لحاظ سے مستثنٰی بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ نبوت محمدیہ کے ختم ہونے کا زمانہ ہوگا۔ اُس دَور کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دنیا ختم ہوجائے گی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام اس دنیا میں ختم ہوجائے گا۔

وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴿۶﴾

اور ضرور تیرا رب تجھے (وہ کچھ) دے کے رہے گا جس پر تُو خوش ہوجائے گا۔

تفسیر۔ وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ میں اسلامی فتوحات کی پیشگوئی اس آیت کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ گو اس وقت چاروں طرف مخالفت کا ایک شور برپا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو کچلنے کے لئے کفار نے اپنی تدابیر کو انتہاء تک پہنچایا ہوا ہے مگر چونکہ ہم پیشگوئی کر چکے ہیں کہ اسلام پر ضُحٰی کا دَور آنے والا ہے اِس لئے ہم تمہیں خوشخبری دیتے ہیں کہ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤ گے کفر کو نابود ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے اور وہ کام جسے دنیا ناممکن سمجھتی ہے الٰہی تائید اور نصرت کے ساتھ اپنی تکمیل کو پہنچ جائے گا اور

تیرا رب جلد ہی تجھ کو وہ سب کچھ دے گا جس سے تُو راضی ہو جائے گا۔

درحقیقت کام ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے کسی شخص کی شان اور اس کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کام کیا گیا تھا وہ بظاہر بہت بڑا وقت چاہتا تھا، بہت بڑی جدوجہد اور بہت بڑی قربانی کا تقاضا کرتا تھا اور انسان اس کام کو دیکھ کر یہ خیال کرتا تھا کہ اس کے لئے تو عمرِ نوح کی ضرورت ہے تھوڑے سے وقت میں اتنا عظیم الشان کام کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلایا کہ بے شک کام بڑا ہے اور بظاہر بہت بڑا وقت چاہتا ہے مگر ہم یہ کام تجھ سے جلدی کروا دیں گے چنانچہ ایک قلیل ترین عرصہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حیرت انگیز کام کر کے دکھایا اُس کی مثال دنیا میں کہیں نظر نہیں آسکتی۔ تم اپنے صوبہ پنجاب کو ہی لے لو، سندھ کو لے لو، سرحد کو لے لو باوجود اس کے کہ یہ صوبے سو سال سے تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہیں پھر بھی وہ پوری تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ باوجود اس کے کہ وہ سو سال سے اپنے تمدن کی ترقی میں مصروف ہیں پھر بھی وہ اپنے تمدن کو پورے طور پر ترقی نہیں دے سکے۔ باوجود اس کے کہ وہ سو سال سے لوگوں کے اخلاق کی درستی میں لگے ہوئے ہیں پھر بھی وہ درستیٔ اخلاق میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ غرض الگ الگ جماعتیں الگ الگ کاموں کے لئے سو سو سال سے مصروف ہیں مگر ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے۔ نہ انہیں تعلیمی ترقی حاصل ہوئی ہے نہ اُنہیں تمدنی ترقی حاصل ہوئی ہے نہ انہیں اخلاقی ترقی حاصل ہوئی ہے۔ اس کے مقابل میں اسلام ایک ایسا منزلِ مقصود تھا جس سے اونچا اور بلند تر کوئی اور منزلِ مقصود نہیں ہو سکتا۔ پھر اسلام وہ مذہب تھا جو حاوی تھا تمام اقسام کی اصلاحات پر۔ اُس میں تمدنی اصلاح بھی شامل تھی۔ اُس میں اقتصادی اصلاح بھی شامل تھی۔ اُس میں عائلی اصلاح بھی شامل تھی۔ اُس میں سیاسی اصلاح بھی شامل تھی۔ اُس میں فکری اصلاح بھی شامل تھی۔ غرض ایک نہیں ساری اصلاحیں اُس میں شامل تھیں اور پھر ہر ایک کا آئیڈیل Ideal اور منزلِ مقصود بہت بالا تھا۔ جب یہ عظیم الشان کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر بھی دے دی گئی کہ تم اپنی آنکھوں سے ضُحٰی بھی دیکھ لوگے تو چونکہ محب اپنے محبوب سے زیادہ دیر تک جدا نہیں رہ سکتا بلکہ محب اپنے محبوب کے پاس جانا ہی پسند کرتا ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ نہ معلوم یہ کام کب ختم ہو۔ آپ کہتے ہوں گے الٰہی پتہ نہیں یہ کام پچاس سال میں ختم ہو، ساٹھ سال میں ختم ہو، سو سال میں ختم ہو۔ کیا میں اتنی دیر تجھ سے جدا رہوں گا اللہ تعالیٰ اسی مضمون کو اس آیت میں بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے ہم تیرے اُن کاموں کا ذکر کر رہے ہیں جو دنیا سے متعلق ہیں اور تُو اپنے دل میں کہہ

رہا ہوگا کہ اصل مطلب کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کام بڑا ہے مگر ہم جلدی کروادیں گے اور جلد ہی تم کو وہ دے دیں گے جس سے تو راضی ہو جائے گا۔ یعنی اس کام کے لئے بظاہر تو سینکڑوں سال کی عمر چاہیے مگر تیرے سب دنیوی کام جلد ہو جائیں گے اور تُو اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی کہتا ہوا ہمارے پاس آ جائے گا اور اس طرح تجھے وہ چیز مل جائے گی جو تُو پسند کرتا ہے یعنی ہمارا وصال تجھے حاصل ہو جائے گا اور فراق کی یہ کٹھن گھڑیاں کٹ جائیں گی۔

احادیث میں آتا ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سورۃ نازل ہوئی کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ۔ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ تو آپؐ نے ایک خطبہ پڑھا اور فرمایا ہر نبی کے زمانہ کا ایک کام ہوتا ہے جب وہ اُس کام کو ختم کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ ایک دوسرا دَور شروع کر دیتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا خدا کا ایک بندہ تھا اُس سے خدا تعالیٰ نے کہا کہ تم اگر چاہو تو دنیا میں رہو اور اگر چاہو تو ہمارے پاس آ جاؤ اُس نے کہا کہ یا اللہ! میں اب دنیا میں نہیں رہنا چاہتا میری خواہش یہی ہے کہ تُو مجھے اپنے پاس بُلا لے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ واقعہ بیان فرمایا تو حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور اس قدر روئے کہ گھگھی بندھ گئی باقی صحابہ کو سخت حیرت ہوئی کہ ابوبکرؓ رو کیوں رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں مجھے تو اُن کے رونے سے سخت غصہ آیا اور میں نے کہا اسلام کے لئے فتح کا وقت آیا ہے تو یہ بڈھا رونے لگ گیا ہے۔ یہ بدشگونی کیوں کرتا ہے خدا تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو اختیار دیا کہ وہ اگر چاہے تو دنیا میں رہے اور اگر چاہے تو اللہ تعالیٰ کے پاس چلا جائے۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کو ترجیح دی اور دنیا میں رہنا پسند نہ کیا۔ اس میں رونے کا کون سا مقام ہے اور پھر ایسی حالت میں جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کی فتح اور اُس کے غلبہ کی پیشگوئی ہوئی ہے مگر ابوبکرؓ تھے کہ اُن کا رونا تھمتا ہی نہیں تھا۔ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا مِّنْ اُمَّتِیْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ۔ اگر کسی کو خلیل بنانا جائز ہوتا تو میں ابوبکر کو خلیل بناتا۔ پھر آپ نے فرمایا لَا یَبْقَیَنَّ فِی الْمَسْجِدِ بَابٌ اِلَّا سُدَّ اِلَّا بَابُ اَبِیْ بَکْرٍ۔ مسجد میں جس قدر کھڑکیاں کھلتی ہیں وہ سب کی سب بند کر دو سوائے ابوبکر کی کھڑکی کے۔ (بخاری کتاب الصلٰوۃ باب الخوخۃ والممرّ فی الْمَسْجِدِ) اس طرح آپ نے اس امر کا اظہار فرما دیا کہ ابوبکر سمجھ گئے ہیں کہ میرا اس واقعہ کے بیان کرنے سے کیا منشاء تھا مجھے دنیا میں رہنے کی خوشی نہیں بلکہ میری ساری خوشی اور میری ساری راحت اپنے آقا اور محبوب کے پاس جانے میں ہے اب چونکہ میرا کام ختم ہو چکا ہے اس لئے میرا دنیا میں ٹھہرنا عبث ہے میری خواہش اور میری آرزو یہی ہے کہ میرا رب مجھے اپنے پاس بُلا لے۔ باقی صحابہؓ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطلب کو نہ سمجھے مگر ابوبکر سمجھ گئے اور اُن سے

رِقّت برداشت نہ ہوسکی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو تسلّی دے دی کہ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا اگر دنیا میں کسی کو خلیل بنانا جائز ہوتا تو میں ابوبکر کو اپنا خلیل بناتا۔ پھر اس کے ساتھ ہی آپ نے اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ میرے بعد کام کی ذمہ داری ابوبکر پر پڑنے والی ہے چنانچہ آپ نے فرمایا سب کھڑکیاں بند کردو سوائے ابوبکرؓ کی کھڑکی کے جس میں حکمت یہ تھی کہ ابوبکرؓ کو نمازیں پڑھانے کے لئے مسجد میں آنا پڑے گا اِس لئے اُن کی کھڑکی کا کھلا رہنا ضروری ہے۔

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خوشی اِسی بات میں تھی کہ آپ کو اپنے رب کا وصال حاصل ہو۔ دنیوی کام کو آپ جلد سے جلد سرانجام دیں اور رفیق اعلیٰ کے پاس لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہتے ہوئے حاضر ہوجائیں چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض الموت سے بیمار ہوئے تو آخری وقت میں آپ کی زبان پر یہی الفاظ جاری تھے کہ اِلَى الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى یعنی اے میرے رب میری خواہش اب یہی ہے کہ میں تیرے پاس آجاؤں۔ پس وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ کے الفاظ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم اپنا کام جو تیرے سپرد کرتے ہیں بظاہر وہ بہت لمبا نظر آتا ہے مگر ہم تجھے ایسی توفیق دے دیں گے کہ تو اس کام کو جلدی ختم کرلے گا چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس سال کی قلیل مدت میں اپنے تمام کام کو ختم کر لیا۔ اتنے قلیل عرصہ میں اس قدر عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کی مثال دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آسکتی بلکہ اس کام کی مثال تو کیا اس کے ہزارویں بلکہ لاکھویں حصہ کی مثال بھی دنیا کے اور کسی شخص کی زندگی میں نہیں مل سکتی۔ دنیا میں بڑے بڑے لوگ گذرے ہیں مگر ان کا انجام کتنا تلخ اور عبرت ناک ہوا ہے۔ ہٹلر کو دیکھ لو اس کا کیا انجام ہوا۔ نپولین کو دیکھ لو وہ کیسی خراب حالت میں مرا۔ یہ لوگ بڑے بڑے دعووں کے ساتھ اٹھے تھے اور انہوں نے بظاہر کچھ کامیابی بھی حاصل کی مگر آخر ناکامی کے سوا ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر یہ بھی ایک غور کرنے والی بات ہے کہ یہ لوگ جن قوموں میں پیدا ہوئے اور جن لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر ترقی کی طرف بڑھے وہ پہلے ہی قربانی کی روح اپنے اندر رکھنے والے تھے۔ پہلے ہی ان کے اندر یہ جوش پایا جاتا تھا کہ ہم دنیا پر حکومت کریں اور لوگوں پر غلبہ واقتدار حاصل کریں۔ نپولین نے بے شک ترقی حاصل کی مگر وہ ایک ترقی یافتہ قوم کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ اسی طرح ہٹلر نے بے شک فتوحات حاصل کیں مگر ہٹلر ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا کہ جرمن قوم دنیا میں سب سے زیادہ منظم اور سب سے زیادہ قربانی کی روح اپنے اندر رکھنے والی سمجھی جاتی تھی لیکن عرب کیا تھا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں گوبر دیا گیا جسے بیس سال کے قلیل عرصہ میں انہوں نے سونا بنادیا اور خالی سونا نہیں بلکہ صاف اور کھرا سونا۔

اخلاق ان کے درست ہو گئے، تمدن ان کا درست ہو گیا، علمی حالت ان کی درست ہوگئی، رعب اور دبدبہ ان کا بڑھ گیا، عزت ان کی بڑھی، رتبہ اور شان وشوکت ان کو حاصل ہوا۔ غرض کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو نامکمل رہ گیا ہو۔ کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں اُن کو کمال تک نہ پہنچا دیا گیا ہو۔ ہر قسم کی اصلاح خواہ وہ اخلاقی ہو یا دینی، مذہبی ہو یا عائلی، اقتصادی ہو یا سیاسی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرانجام دی۔ پس فرمایا وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ گھبراؤ نہیں ہم جلدی ہی اس عظیم الشان کام سے تمہیں فارغ کر دیں گے۔ بے شک ہم نے ایک بہت بڑے کام کی تم پر ذمہ داری ڈالی ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ تمہاری اصل خوشی ہمارے پاس آنے میں ہے اس لئے ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تجھے جلد ہی ان مقاصد میں کامیاب کر دیں گے۔ چنانچہ اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنا بڑا کام دنیا میں اور کسی نے بھی نہیں کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر وفات کے وقت شمسی لحاظ سے صرف باسٹھ سال تھی اتنی قلیل عمر میں کتنا عظیم الشان کام آپؐ نے کیا کہ اسے دیکھ کر حیرت آتی ہے۔

وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى میں آنحضرت صلعم کی طرف کامل شریعت نازل کئے جانے کی طرف اشارہ

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ کامل شریعت تجھ پر نازل ہوجائے گی کیونکہ انسان کمال پر راضی ہوتا ہے فرماتا ہے وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ ہم تجھے اتنا دیں گے کہ تو آپ ہی آپ کہہ دے گا کہ اب ترقی کی گنجائش نہیں۔ جب آخری شریعت آپؐ کو دے دی گئی تو اس کے بعد آپؐ نے اور کیا مانگنا تھا۔ بے شک جہاں تک الٰہی قرب اور اس کے مدارج کا سوال ہے وہ غیر محدود ہیں اور کبھی کوئی مقام ایسا نہیں آ سکتا جب انسان یہ کہے کہ اب مجھے کسی اور درجہ قرب کی احتیاج باقی نہیں رہی مگر جہاں تک شریعت کا سوال ہے آخری اور کامل شریعت کے بعد اور کون سی بات باقی رہ سکتی ہے پس فرماتا ہے ہم تجھے وہ کچھ دیں گے کہ تو بھی یہ کہہ دے گا کہ اس سے اوپر اور کوئی درجہ نہیں۔ چنانچہ جہاں تک انسانی تعلق ہے اس کے لحاظ سے آخری شریعت سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟ پس اس کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ ہم شریعت کاملہ تجھے عطا کریں گے۔

اسلام کے بچاؤ کے لئے مستقل نظام قائم کئے جانے کا وعدہ

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ آئندہ اسلام کے بچاؤ کے لئے ایک مستقل نظام قائم کر دیا جائے گا۔ درحقیقت پہلی خواہش انسان کے دل میں یہ ہوتی ہے کہ میں اپنا کام جلد سے جلد پورا کر لوں۔ دوسری خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو کام میرے سپرد ہو وہ اپنی ذات میں کامل ہو۔ تیسری خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کام مٹے نہیں۔ وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى میں یہ تینوں باتیں اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیں کہ ہم تجھے اس کام سے جلد سے جلد فارغ کر دیں گے، ہم کامل شریعت تجھے عطا کریں گے اور پھر ایک

زائد وعدہ تجھ سے یہ کرتے ہیں کہ جب بھی اس کام میں کوئی نقص پیدا ہوگا اللہ تعالیٰ تیری روحانی اولاد میں سے کسی کو اصلاح خلق کے لئے کھڑا کر دے گا اور اسلام کو تباہ نہ ہونے دے گا۔ اولاد پیدا ہوتی ہے تو لوگ کتنے خوش ہوتے ہیں محض اس لئے کہ وہ ان کے نام کو زندہ رکھے گی لوگوں کی یہ خوشی تو بعض دفعہ بالکل بے حقیقت ہوتی ہے اور جس اولاد کی پیدائش پر وہ خوش ہوتے ہیں وہی ان کو ذلیل کرنے والی بن جاتی ہے مگر فرماتا ہے تیرے لئے یہ حقیقی خوشی کی بات ہے کہ جب بھی کسی روحانی بیٹے کی تجھے ضرورت محسوس ہوگی ہم اسے پیدا کر دیں گے جو تیرے کام کو پھر دنیا میں زندہ کر دے گا۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۷

کیا اس نے تجھے یتیم پا کر (اپنے زیر سایہ) جگہ نہیں دی۔

تفسیر۔ فرماتا ہے تیرے مستقبل کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ تو محض باتیں ہوئیں ہم کس طرح مان سکتے ہیں کہ ایسا ہو جائے گا۔ یوں تو ہر شخص دوسروں کو تسلی دے سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یوں ہو جائے گا، ووں ہو جائے گا۔ اس قسم کی باتوں سے کیا بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ لوگ جن کے دلوں میں یہ شبہ پایا جاتا ہے وہ تیرا ماضی دیکھ لیں تُو بھی دیکھ اور دنیا بھی دیکھے کہ کیا ہم نے تجھے یتیم نہیں پایا تھا اور کیا ہر موقع پر ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے تجھے پناہ دی اور تجھے ہر قسم کے نقصان سے بچایا۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى کی صداقت کا ثبوت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی رحم مادر میں ہی تھے کہ آپؐ کے والد فوت ہو گئے۔ جب آپؐ کی پیدائش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے دادا عبد المطلب کے دل میں آپ کی غیر معمولی طور پر محبت پیدا کر دی۔ عام طور پر ایسے حالات میں انسان کی توجہ پوتوں کی بجائے اپنے دوسرے بیٹوں کی طرف ہوتی ہے مگر عبد المطلب کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کو تو ڈانٹ ڈپٹ لیتے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ محبت اور پیار رکھتے حالانکہ ان کے لڑکے جوان تھے اور وہ ان کی خدمت بھی کرتے رہتے تھے مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی محبت پیدا کر دی کہ آپؐ اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تو وہ بے چین ہو جاتے تھے۔ آپؐ کو ہر وقت گودی میں اٹھائے رکھتے تھے۔ آپؐ کی محبت میں اشعار پڑھتے رہتے تھے اور اپنے بچوں کو ڈانتے رہتے تھے کہ اس کی قدر کیوں نہیں کرتے

پھر عربوں میں رواج تھا کہ وہ بچے پالنے کے لئے دائیاں رکھا کرتے تھے آپؐ کی والدہ نے چاہا کہ انہیں بھی کوئی دائی مل جائے مگر غربت کی وجہ سے کوئی دائی نہ ملی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حلیمہ کو اس عظیم الشان خدمت کے لئے منتخب فرمایا۔ حلیمہ وہ تھی جسے ہر دروازہ سے محض اس لئے رد کیا گیا تھا کہ وہ ایک غریب عورت تھی اگر اسے بچہ دیا گیا تو وہ اسے کھلائے گی کہاں سے؟ گویا وہ جس کے گھر میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کا سامان کرنا تھا اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مکہ کے تمام بچے حرام کر دیئے۔ وہ جس گھر میں بھی گئی اسے یہی کہا گیا کہ ہم تمہیں اپنا بچہ نہیں دے سکتے، تم بچہ لے گئیں تو اسے کھلاؤ گی کہاں سے۔ گویا سارے مکہ میں اس روز ایک بچہ ایسا تھا جسے کوئی دایہ نہ ملی اور ایک دایہ ایسی تھی جسے کوئی بچہ نہ ملا۔ جب شام ہوگئی اور ادھر حلیمہ کسی بچہ کے ملنے سے مایوس ہوگئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کسی دایہ کے ملنے سے مایوس ہوگئیں تو اللہ تعالیٰ نے حلیمہ کے دل میں ڈالا کہ گو یہ بچہ غریب گھرانے کا ہے اور اس کا والد فوت شدہ ہے مگر میرا خالی جانا دوسرے لوگوں کی ہنسی کا موجب ہوگا چلو میں اسی کو لے چلوں چنانچہ وہ آئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی محبت ڈال دی کہ آپؐ کا دم بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہونا اس پر سخت گراں گزرتا اور وہ آپؐ کی محبت میں بے تاب ہو جاتی۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ آپؐ ذرا بھی اس کی آنکھ سے اوجھل ہوتے تو وہ اپنے بچوں کو ڈانٹنے لگ جاتی کہ تم اسے چھوڑ کر کیوں آ گئے ہو اور پھر آپؐ کو لانے کے لئے دوڑ پڑتی (السیرۃ الحلبیۃ باب وفاۃ والدۃ)۔ غرض باپ کے بعد آپؐ کو پرورش کے لئے حلیمہ جیسی دائی ملی، عبدالمطلب جیسا محبت کرنے والا دادا ملا اور پھر جب عبدالمطلب فوت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے چچا ابوطالب کے دل میں آپؐ کی محبت ڈال دی۔ ابوطالب کو بھی آپؐ سے بے انتہا محبت تھی ایسی محبت کہ میرے نزدیک دنیا میں بہت کم چچا ہوں گے جنہوں نے اپنے کسی بھتیجے کو اس محبت کے ساتھ پالا ہو۔ جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک مالدار عورت کے دل میں آپؐ کی محبت پیدا کر دی اور خود اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں ان سے شادی کر لوں کیونکہ یہ بہت ہی بلند اخلاق کے مالک ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے گھر بار کا سامان پیدا کر دیا۔ پھر یتیم کے لئے ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں باپ زندہ ہوتے ہیں تو ان کی خوشنودی کے لئے لوگ دوستیاں اختیار کرتے ہیں لیکن جب مر جاتے ہیں تو ان کے تمام تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور دوستی کا خیال تک بھی ان کے دل میں کبھی نہیں آتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین چونکہ فوت ہو چکے تھے اس لئے طبعی طور پر آپؐ کو بھی ساتھیوں اور دوستوں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ اور حکیم بن حزام جیسے دوست آپؐ کو عطا فرما دیئے۔ ابوبکرؓ تو شروع

میں ہی اسلام لے آئے مگر حکیم بن حزام مدتوں کافر رہا مگر کفر کی حالت میں بھی جب لوگ آپؐ کی مخالفت کرتے تو وہ ان کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ ایک دفعہ وہ باہر تجارت کے لئے گیا تو وہاں اس کو ایک خاص قسم کا کپڑا ملا وہ کپڑا اسے بہت پسند آیا اور اس نے دل میں کہا کہ اس کپڑے کو پہننے کے قابل میرے دوست محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کوئی اہل نہیں۔ چنانچہ وہ کپڑا لے کر مدینہ پہنچا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے یہ کپڑا بڑا پسند آیا تھا میں آپ کے لئے لے آیا ہوں کیونکہ آپ کے سوا یہ کسی کو نہیں سج سکتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کافر کا تحفہ قبول نہیں کر سکتا ہاں اگر چاہو تو مجھ سے قیمت لے لو۔ اس نے کہا اچھا اگر آپؐ تحفہ قبول نہیں فرماتے تو قیمت ہی دے دیں کیونکہ میری خواہش یہی ہے کہ آپؐ اس کپڑے کو پہنیں (جمهرة نسب قريش وَ اَخْبَارِهَا تَحْتَ حکیم بن حزام بن خويلد) یہ کتنا عشق ہے جو ایک کافر کے دل میں آپؐ کے متعلق تھا اس نے اپنے مذہب کو نہیں چھوڑا مگر کفر کی حالت میں بھی آپؐ سے اس قدر پیار تھا کہ سب سے اچھی چیز جو ملی اس کا مستحق آپؐ کو قرار دیا اور تیرہ منزلیں مارتا ہوا مکہ سے مدینہ پہنچا تا آپؐ کی خدمت میں وہ تحفہ پیش کرے۔ خدا تعالیٰ نے اس کو کافر رکھا اور دیر تک رکھا۔ شاید یہ ثابت کرنے کے لئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی وجہ سے لوگ آپؐ سے محبت کرتے تھے کسی اور وجہ سے نہیں۔ پھر غلاموں میں سے زیدؓ اور رشتہ داروں میں سے علیؓ۔ غرض اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایسے ساتھی دیئے جو کسی یتیم کو ملنے ناممکن ہوتے ہیں۔

وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۸

اور (دیکھ تو کہ جب) اس نے تجھے (اپنی قوم کی اصلاح کی فکر میں) سرگرداں پایا تو صحیح راستہ بتادیا۔

حلّ لُغات۔ ضَآلًّا ضَآلًّا : ضَلَّ سے اسم فاعل ہے اور ضَلَّ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں۔ ضِدُّ اِهْتَدٰى اَيْ جَارَ عَنْ دِيْنٍ اَوْ حَقٍّ اَوْطَرِيْقٍ۔ وہ دین یا سچائی کے راستہ کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر چلا گیا یا اصل راستہ سے اِدھر اُدھر ہو گیا نیز ضَلَّ فُلَانٌ الطَّرِيْقَ وَعَنِ الطَّرِيْقِ کے معنے ہیں لَمْ يَهْتَدِ اِلَيْهِ۔ اُسے راستہ کا پتہ نہ لگا وَ كَذَا الدَّارَ وَالْمَنْزِلَ وَكُلَّ شَيْءٍ مُّقِيْمٍ لَّا يُهْتَدٰى لَهٗ۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس کا پتہ نہ لگے یا جس کی طرف جانے کا راستہ نہ ملے اس پر بھی اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے (اقرب)۔ ایک ہوتا ہے راستہ بھول جانا اور گمراہ ہو جانا۔ اور ایک ہوتا ہے راستے کا علم نہ ہونا۔ یہ دو الگ الگ مفہوم ہیں اور یہ دونوں معنے ضَلَّ میں پائے جاتے ہیں اور

ضَلَّ فُلَانٌ اَلْفَرَسَ وَ الْبَعِیْرَ کے معنے ہوتے ہیں ذَهَبَا عَنْهُ گھوڑا یا اونٹ کھو یا گیا اور ہاتھ سے جاتا رہا ضَلَّ عَنِّیْ کَذَا کہتے ہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں ضَاعَ۔ وہ چیز ضائع ہوگئی۔ اور ضَلَّ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں مَاتَ وَصَارَ تُرَابًا وَعِظَامًا وہ مر گیا اور مر کے مٹی ہو گیا۔ ضَلَّ الْمَآءُ فِی اللَّبَنِ کے معنے ہوتے ہیں خَفِیَ وَغَابَ۔ دودھ میں پانی غائب ہو گیا (اقرب) ضَلَّ کے معنے کسی کام میں منہمک ہو جانے کے بھی ہوتے ہیں جیسے قرآن کریم میں آتا ہے ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (الکھف :۱۰۵) ان کی تمام تر کوششیں دنیوی زندگی کے کاموں میں ہی صرف ہو گئیں اسی طرح ضَلَالٌ کے ایک معنے محبت شدیدہ کے بھی ہوتے ہیں دراصل یہ معنی بھی ضَلَّ سَعْیُهُمْ والے معنوں سے ملتے جلتے ہیں کیونکہ محبت میں بھی انسان کامل طور پر ایک طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مفردات والے لکھتے ہیں یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسبت ان کے بیٹوں نے کہا اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (یوسف:۹) ہمارا باپ کھلی کھلی ضلال میں مبتلا ہے۔ اس میں ضلال کے معنے گمراہی کے نہیں بلکہ اِشَارَةً اِلٰی شَغَفِهٖ بِیُوْسُفَ وَشَوْقِهٖ اِلَیْهِ۔ اس میں ان کی اس محبت اور شوق ملاقات کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنے دل میں رکھتے تھے۔

ضلال کے معنے بے انتہا محبت کے گویا ضلال کے ایک معنے کمال درجہ کی محبت اور انتہا درجہ کے شوق کے بھی ہیں اسی طرح قرآن کریم میں جو آتا ہے قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (یوسف:۳۱) اس میں بھی ضلال کے معنے بے انتہا محبت کے ہیں غرض ضلال کا لفظ جہاں اور معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے وہاں اس کے ایک معنے انتہا درجہ کی محبت کے بھی ہوتے ہیں۔ (مفردات)

تفسیر۔ حل لغات میں جو مختلف معانی بیان کئے جا چکے ہیں ان کے لحاظ سے وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی کے بھی مختلف معنے ہو جائیں گے۔

وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی کے چار معنے پہلے معنے تو اس آیت کے یہ ہیں کہ تمہیں ہمارا راستہ معلوم نہ تھا، تم شریعت سے بے خبر تھے، تمہیں معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے کیا ذرائع ہیں۔ ایسی حالت میں ہم نے اپنی شریعت تم پر نازل کی اور تمہیں اپنی طرف آنے کا راستہ دکھا دیا۔ دنیا کا کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جس میں کوئی شریعت نہیں تھی مگر اس کے باوجود آپؐ دن رات خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتے تھے اور اس کے قرب اور وصال کے حصول کے متمنی تھے اُس ملک میں عیسائی بھی موجود تھے اور یہودی بھی موجود تھے اور یہ دونوں قومیں وہ ہیں جن کے پاس خدا تعالیٰ کا کلام موجود تھا مگر

باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ان کے پاس تھا انہیں خدا تعالیٰ کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اور وہ اس سے کلی بیگانگت کی حالت میں اپنی زندگی کے ایام بسر کر رہے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ یہ حالت تھی کہ آپ کے پاس خدا تعالیٰ کا کوئی کلام نہیں تھا مگر پھر بھی آپ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے۔ پس یہ امر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کی بلندی اور آپؐ کی عظمت کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام اپنے پاس رکھنے والے تو خدا تعالیٰ سے دور ہو گئے مگر جس کے پاس خدا تعالیٰ کا کوئی کلام نہیں تھا وہ خدا تعالیٰ کے قریب ہوتا چلا گیا۔ جب خدا تعالیٰ نے دیکھا کہ یہ وہ شخص ہے جو ہماری طرف آنا چاہتا ہے مگر اسے ہمارے قرب اور وصال کے راستوں کا علم نہیں ہے تو اس نے آپ پر شریعت نازل کر دی اور اس طرح تمام راستوں کو آپؐ پر منکشف کر دیا۔

آپؐ کا پہلے اس کوچہ سے ناواقف ہونا ہرگز قابل اعتراض امر نہیں۔ ہر صاحب شریعت نبی پر جب خدا تعالیٰ کی وحی نازل ہوتی ہے تب اسے شرعی راستہ کا علم ہوتا ہے اس سے پہلے وہ اُس راستہ سے واقف نہیں ہوتا۔ یہی بات اس جگہ بیان کی گئی ہے کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے ہمارے راستے کا علم نہیں تھا پھر ہم نے اپنے فضل سے تجھے وہ راستہ دکھا دیا جس کی جستجو تیرے دل میں پائی جاتی تھی۔

وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے دوسرے معنے ضَلَّ کے ایک معنے خَفِيَ وَ غَابَ کے بھی بتائے جا چکے ہیں اُن معنوں کے لحاظ سے اس آیت میں خدا تعالیٰ اپنی قدرت اور مہربانی کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ضُحٰی آئے گی۔ بڑی بڑی ترقیات اسلام اور مسلمانوں کو حاصل ہوں گی اور لوگ تیرے متعلق کہیں گے واہ وا کیا خوب آدمی تھا۔ کتنے بڑے کمالات اپنے اندر رکھتا تھا، کتنے بڑے فضائل اور محاسن کا مالک تھا۔ کس طرح اس نے دنیا میں ایک عظیم الشان تغیّر پیدا کر دیا اور بھولی بھٹکی مخلوق کو خدا تعالیٰ کے آستانہ پر لا ڈالا۔ مگر ہم ان سے کہتے ہیں وہ غور کریں اور سوچیں کہ آخر تجھے کس نے چنا۔ کس نے دنیا کی ہدایت کے لئے تیرا انتخاب کیا، کون تھا جو تجھے گوشۂ گمنامی سے دنیا کے سامنے نکال کر لایا۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہماری نظر ہی تھی جس نے تجھے منتخب کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک قیمتی موتی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل پڑا ہے لوگ اس کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ وہ کس قدر آب و تاب رکھنے والا ہے۔ ہم نے کان میں سے اس موتی کو نکالا اور اُسے دنیا کے سامنے لا رکھا۔ ہم نے کفرستان میں ایک ہیرا پڑا ہوا دیکھا ایسا ہیرا جس کا کوئی ثانی نہیں تھا ہم نے کفرستان میں سے اس ہیرے کو اٹھایا اور انسانیت کے تاج میں لگا لیا۔ آج تیری چمک کو دیکھ کر دنیا کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں۔ وہ تیرے حسن اور تیرے جلال اور تیرے کمال کو دیکھ کر رطب اللسان ہیں مگر وہ نہیں دیکھتے

کہ یہ سب کچھ ہمارے فضل کا نتیجہ ہے۔ تو لوگوں کی نگاہوں سے بالکل غائب تھا اور دوسروں کا تو کیا ذکر ہے تو خود بھی نہیں جانتا تھا کہ تیرے اندر کون سے کمالات ودیعت کئے گئے ہیں۔ ہم تجھے نکال لائے اور تیری شوکت اور عظمت کو دنیا پر ظاہر کر دیا ورنہ اور کون تھا جو تیری فطرت صحیحہ کو پہچان سکتا، ہم ہی تھے جنہوں نے تجھے پہچانا اور گمنامی کے گوشوں سے نکال کر تجھے دنیا میں عزت کے ساتھ مشہور کر دیا۔

وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے تیسرے معنے پھر ضلال کے ایک معنے محبت شدیدہ کے بھی بتائے جا چکے ہیں ان کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھ کو شدید محبت میں مبتلا دیکھا تیرے اندر تڑپ تھی اپنے پیدا کرنے والے کے لئے تو زمین کو دیکھتا، تُو آسمان کی بناوٹ پر غور کرتا اور تیری فطرت تجھے کہتی کہ اس کارخانۂ عالم کو پیدا کرنے والا ایک خدا ضرور ہے مگر ادھر تو اس قوم میں پیدا ہوا تھا جس کے پاس کوئی شریعت نہیں تھی اور جسے خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ معلوم نہیں تھا ہم نے دیکھا کہ جیسے یوسفؑ کے لئے یعقوبؑ تڑپ رہا تھا اس سے بھی زیادہ شوق اور محبت کے ساتھ تو اپنے پیدا کرنے والے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ تیری فطرت تجھے ہماری طرف توجہ دلاتی تھی مگر تجھے ہمارا راستہ ملتا نہ تھا۔ نیچر کی انگلیاں اٹھ اٹھ کر تجھے بتاتی تھیں کہ تیرا کوئی مالک ہے، تیرا کوئی خالق ہے، تیرا کوئی رازق ہے۔ تو چاروں طرف دیکھتا اور کہتا کہ میرا خالق اور مالک کہاں ہے؟ میں اُس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اور چونکہ کوئی شریعت نہیں تھی جس پر چل کر تو ہمارے پاس پہنچ جاتا اس لئے جب ہم نے تیری اس تڑپ اور محبت کا مشاہدہ کیا تو فَهَدٰى اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھے آواز دے دی کہ ہم یہاں ہیں ہمارے پاس آ جاؤ۔

وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے چوتھے معنے پھر اس آیت کے ایک معنے اور بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء: ۴)۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم شاید تو اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کر دے گا کہ یہ لوگ کیوں تجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ضَلَّ کے ایک معنے مر کھپ جانے کے بھی ہیں پس وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ میں اللہ تعالیٰ یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے دیکھا کہ تو اپنی قوم کی تباہی اور گمراہی کو دیکھ کر مر رہا تھا، تو ان کے کفر کو دیکھتا تھا، تو ان کی بداخلاقیوں کو دیکھتا تھا، تو ان کی چوریوں کو دیکھتا تھا، تو ان کے ڈاکوں کو دیکھتا تھا، تو ان کے اسراف کو دیکھتا تھا، تو ان کی اخلاقی اور عائلی کوتاہیوں کو دیکھتا تھا، تو ان کو علم میں تمام دوسری قوموں سے پیچھے دیکھتا تھا، تو ان کو سیاست میں تمام دوسری قوموں سے پیچھے دیکھتا تھا اور ہم دیکھتے تھے کہ جس طرح تو ہم سے

ملنے کے لئے مر رہا تھا اسی طرح تو اپنی قوم کے لئے بھی مر رہا تھا۔ جس طرح تو ہماری محبت کے لئے بے تاب ہو رہا تھا اسی طرح اپنی قوم کے درد میں بھی ہلاک ہو رہا تھا گویا تجھ پر وہی کیفیت تھی جو ہم دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر چکے ہیں کہ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (الشعراء:۴)۔ جب ہم نے دیکھا کہ تو اپنی قوم کے لئے مر رہا ہے، اُس کے غم میں ہلاک ہو رہا ہے، اُس کی اصلاح کی فکر میں گھلتا چلا جا رہا ہے اور دن رات تجھے یہی تڑپ اور یہی فکر ہے کہ کسی طرح میری گری ہوئی قوم ترقی کرے تو ہم نے تجھے وہ رستہ دکھا دیا جس پر چل کر تیری قوم اس موت سے بچ جائے یعنی تجھے قرآن دے دیا جس میں وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو نہ صرف مکہ والوں کی تباہی کو دور کر سکتی ہیں بلکہ ساری دنیا کی ہلاکت اور بربادی کا واحد علاج ہیں پس وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا میں اس جذبۂ اصلاح کی طرف اشارہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں اپنی قوم کی اصلاح اور پھر ساری دنیا کی اصلاح کے متعلق نمایاں طور پر پایا جاتا تھا اور درحقیقت یہ جملہ ترجمہ ہے لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ کی آیت کا۔ بَاخِعٌ کے معنے صرف گردن کاٹنے کے نہیں ہوتے بلکہ اس رنگ میں گردن کاٹنے کے ہوتے ہیں کہ انسان گردن کی پچھلی نسوں تک اسے کاٹتا چلا جائے اور آخری حد تک اسے پہنچا دے (لسان العرب)۔ اس طرح بتایا کہ تجھے اپنی قوم کے کفر اور اس کے خدا تعالیٰ سے دور چلے جانے کا اس قدر غم اور اس قدر صدمہ تھا کہ گویا اس غم میں اپنی ساری گردن کاٹ بیٹھا تھا۔

خدا تعالیٰ کی محبت کے لحاظ سے تو اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے تجھ کو اپنی محبت میں بے انتہا صدمہ رسیدہ دیکھا اور آخر تجھے وہ راستہ بتا دیا جس پر چل کر تو ہمارے پاس پہنچ سکتا اور قوم کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے تجھے اپنی قوم کے غم میں بالکل مردہ کی طرح پایا۔ جب ہم نے یہ حالت دیکھی تو ہم نے تجھے وہ شریعت دے دی جس سے یہ گری ہوئی اور تباہ شدہ قوم بھی ترقی کی طرف دوڑ پڑے۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُن احسانات کا ذکر فرمایا ہے جو اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے۔ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى میں تو یہ بتایا کہ ہم نے تیرے جسمانی یُتم میں تجھے جسمانی رشتہ دار عطا کئے۔ تُو اس بات کا محتاج تھا کہ کوئی شخص تیری پرورش کرنے والا ہوتا، تجھے محبت اور پیار سے رکھتا اور تیری ضروریات کو پورا کرتا۔ سو اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے ایسے لوگ کھڑے کر دیئے جو انتہائی توجہ کے ساتھ تیری پرورش کا فرض سرانجام دیتے رہے اور ہر موقع پر جسمانی طور پر تیری مدد کرتے رہے دوسری طرف روحانی یُتم کے لئے ہم نے اپنی محبت اور اپنا فیضان تجھ کو عطا کیا اور تجھے ایسی تعلیم عطا کی جو مکہ والوں کو قعرِ مذلت سے اٹھا کر ترقی کے بلند ترین مینار

پر پہنچانے والی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک دعویٰ تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کیا جارہا تھا مگر دعویٰ وہ تھا جسے پرکھا جاسکتا تھا۔ قرآن کریم لوگوں کے سامنے موجود تھا اور انہیں کہا جاسکتا تھا کہ آؤ اور دیکھو کہ اس میں قوموں کو اُبھارنے والی تعلیم موجود ہے یا نہیں اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب اور آپ کے تعلق باللہ کو وہ آپؐ کی دعاؤں اور آپ کے نشانات کے ذریعہ دیکھ سکتے تھے۔ غرض نہ وہ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی کی صداقت کا انکار کرسکتے تھے اور نہ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی کی صداقت کا انکار کرسکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان دو مثالوں کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب کہ تیری جسمانی پرورش بھی ہم نے کی اور تیری روحانی پرورش بھی ہم نے کی اور ہر قدم پر تیرے ساتھ اپنی تائید رکھی۔ تُو جسمانی توجہ کا محتاج تھا تو ہم نے تیری جسمانی پرورش کی طرف توجہ کی۔ تُو روحانی توجہ کا محتاج تھا تو ہم نے تیری روح پر شفقت کی نظر ڈالی۔ جب ہماری محبت تیرے دل میں پیدا ہوئی تو ہم نے تجھے اپنا چہرہ دکھا دیا اور جب بنی نوع انسان کی محبت تیرے دل میں پیدا ہوئی اور ان کی خرابیوں نے تجھے بے چین کر دیا تو ان کی اصلاح اور حالات کی درستی کے لئے اپنی شریعت تجھ پر نازل کر دی۔ جب ہم اپنی محبت اور اپنے سلوک کا اس قدر نمونہ تیری ذات میں دکھا چکے ہیں تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ آئندہ ترقیات اور ضُحٰی کے متعلق جو خبر دی گئی ہے وہ بھی پوری ہو کر رہے گی۔ جس خدا نے تجھے پیچھے نہیں چھوڑا وہ آئندہ تجھے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟

اس بات کا ثبوت کہ وَجَدَکَ ضَآلًّا میں ضَالٌّ کے معنے گمراہ ہوجانے کے نہیں یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ وجہ کیا ہے کہ ضَلَال کے اور معنے تو لے لئے گئے ہیں مگر ایک معنوں کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ ضَلَال کے ایک معنے گمراہ ہوجانے، خرابی میں مبتلا ہو جانے اور رستہ کو چھوڑ دینے کے بھی ہیں مگر ان معنوں کو چھوا تک نہیں گیا۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم اس آیت کے یہ معنے کیوں نہ کرلیں کہ اس نے تجھے گمراہ پایا تھا پھر اس نے تجھے ہدایت دے دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معنے اس لئے چھوڑے گئے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ معنے یہاں چسپاں نہیں ہوسکتے۔ دشمن اس آیت کے یہ معنے کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جادۂ اعتدال سے یا جادۂ شریعت سے اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔ یہ معنے خواہ لغتاً صحیح ہوں ہمارے نزدیک اس مقام پر کسی صورت میں بھی چسپاں نہیں ہوسکتے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ ہدایت ہمیشہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک ہدایت شرعی اور ایک ہدایت طبعی یا فطری۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ تم یہ معنے کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گمراہ پایا اور پھر انہیں ہدایت دی۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ دنیا میں ہدایت کی دو ہی قسمیں ہوتی ہیں یا ہدایت شرعی ہو

جس سے انسان انحراف اختیار کرے یا ہدایت طبعی اور فطری ہو جس کے خلاف عمل کرنے کے لئے وہ تیار ہو جائے۔ ان دو قسم کی ہدایتوں کے سوا اور کوئی ہدایت نہیں ہو سکتی۔ پس وہ لوگ جو اپنے معنوں پر اصرار کرتے ہیں ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ اس آیت کے کیا معنے ہوں گے؟ کیا یہ معنے ہوں گے کہ ضَلَّ مُحَمَّدٌ عَنْ شَرِیْعَةِ الْمُسْتَقِلَّةِ الَّتِیْ کَانَتِ الْقَوْمُ عَلَیْهَا۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس شریعت سے گمراہ ہو گئے جس پر قوم چل رہی تھی۔ اگر ہم یہ معنے کریں تو بالکل غلط ہوں گے کیونکہ اس وقت کوئی شریعت تھی ہی نہیں اور کوئی شخص بھی یہ تسلیم نہیں کرتا خواہ وہ اسلام کا کیسا ہی شدید معاند کیوں نہ ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کسی شریعت پر قائم تھی اور آپ اس شریعت سے پھر گئے تھے۔ پس جو بات بالبداہت غلط ہے اور جس کی تکذیب کے لئے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں وہ بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کس طرح کی جا سکتی ہے اور کس طرح اس آیت کے یہ معنے کئے جا سکتے ہیں کہ آپ شریعت سے گمراہ ہو چکے تھے مگر خدا تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دے دی۔ جب کوئی شریعت آپ کی قوم میں موجود ہی نہیں تھی اور آپ کسی شریعت کے مخاطب ہی نہیں تھے تو گمراہی اور ضلالت کے کیا معنے ہوئے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں پیدا ہوئے تھے اس کے پاس کوئی شریعت نہیں تھی، کوئی آسمانی قانون نہیں تھا جس پر وہ عمل کرتی، کوئی وحی نہیں تھی جس کو وہ اپنے سامنے رکھا کرتی۔ ایسی صورت میں ہم یہ معنے کس طرح کر سکتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریعت سے پھر گئے تھے۔ شریعت تو اس وقت کوئی تھی ہی نہیں جس کے آپؐ مخاطب ہوتے۔

دوسرے معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ شریعت تو اس وقت بے شک کوئی نہیں تھی مگر آپ نعوذ باللہ بد اخلاق تھے، جادۂ اعتدال سے منحرف ہو چکے تھے، ہدایت طبعی جو اخلاقی اور فطرتی ہدایت ہوتی ہے اس کے قانون کو آپؐ نے توڑ رکھا تھا اور خدا تعالیٰ نے اسی کی طرف وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى میں اشارہ کیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا یہ معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں یا نہیں۔ دشمن کہتا ہے کہ ضَآلًّا کے معنے بد اخلاق کے ہیں گویا اس کے نزدیک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا داغ دار ہونا اس آیت میں بیان کیا گیا ہے مگر دشمن تو اس آیت کے یہ معنے کرتا ہے اور خدا تعالیٰ دوسری جگہ ان معنوں کو بالکل غلط اور بے ہودہ قرار دیتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے تُو لوگوں کو چیلنج دے کہ اگر ان میں ہمت ہے تو وہ تیری چالیس سالہ ابتدائی زندگی کا کوئی ایک عیب ہی ثابت کر دیں چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چیلنج دیا اور فرمایا فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس:۱۷) میں تم میں چالیس سال تک رہا ہوں اور تم میری زندگی کو دیکھتے چلے آئے ہو اگر تم میں ہمت ہے تو تم سب کے سب مل کر میری

ابتدائی چالیس سالہ زندگی کا کوئی ایک عیب ہی ثابت کر کے دکھا دو مگر یاد رکھو تم ایسا کبھی نہیں کر سکو گے کیونکہ میری زندگی بالکل بے عیب ہے اور خدا تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے گناہ سے آج تک محفوظ رکھا ہے۔ اب بتاؤ کہ ہم یہ دوسرے معنے بھی کس طرح کر سکتے ہیں؟ شریعت سے انحراف والی بات تو اس لحاظ سے بالبداہت باطل تھی کہ اس وقت آپ کی قوم کے پاس کوئی شریعت کی کتاب تھی ہی نہیں جس سے انحراف کرنے کا الزام آپ پر عائد ہو سکتا۔ باقی رہا اخلاق میں کسی قسم کے نقص کا ہونا سو اس کے متعلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کریم میں دعویٰ موجود ہے کہ میں تم میں ایک لمبا عرصہ رہ چکا ہوں تم میری اس زندگی کا کوئی ایک عیب بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ اس چیلنج کے یہ معنے نہیں تھے کہ میں تم میں ایک لمبا عرصہ رہ چکا ہوں بتاؤ میں نے قرآن کے احکام پر اس زندگی میں عمل کیا تھا یا نہیں؟ کیونکہ قرآن کریم تو اس دعویٰ کے وقت میں نازل ہونا شروع ہوا ہے پہلے تو قرآن کریم تھا ہی نہیں۔ پس اس آیت میں ہدایتِ طبعی کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ہدایت شرعی کی طرف اور اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں کو چیلنج دے اور ان سے کہہ کہ وہ بتائیں کہ کیا میری چالیس سالہ زندگی میں کوئی ایک دن بھی ایسا آیا جب میں نے ہدایت طبعی یعنی اخلاق کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہو جب کوئی ایک برائی بھی تم میری طرف منسوب نہیں کر سکتے، جب کوئی ایک بدی بھی تم میرے اندر ثابت نہیں کر سکتے تو اب کس طرح کہتے ہو کہ میں برا ہوں۔ غرض ان میں سے کوئی معنے بھی ایسے نہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں ہو سکتے ہوں۔ جہاں تک ہدایت شرعی کا تعلق ہے عیسائی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نزول قرآن سے قبل اہل مکہ کے پاس کوئی شرعی قانون نہیں تھا اور جب وہ کسی شریعت کے پابند ہی نہیں تھے تو وَجَدَكَ ضَآلًّا کے یہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریعت سے منحرف ہو گئے تھے۔ دوسرے معنے ہدایت طبعی سے انحراف کے ہو سکتے ہیں مگر وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں نہیں ہو سکتے کیونکہ قرآن کریم میں آپ کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی زندگی کے متعلق چیلنج موجود ہے اور لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ آپ نے بے عیب زندگی بسر کی تھی۔ جب دونوں معنے آپ پر چسپاں نہیں ہو سکتے تو دشمنانِ اسلام کا اس آیت کے یہ معنے کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نعوذ باللہ گمراہ ہو گئے تھے اس مقام پر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ وَجَدَكَ ضَآلًّا تو خدا تعالیٰ کی گواہی ہے لیکن فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ اپنی ذات کے متعلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی گواہی ہے ان دونوں گواہیوں میں سے بہر حال خدا تعالیٰ کی گواہی کو مقدم قرار دیا جائے گا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اپنی گواہی کو مؤخر سمجھا جائے گا۔ اس لحاظ سے بات وہی درست ہوگی جس کی خدا تعالیٰ نے گواہی دی نہ وہ بات جسے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی طرف سے پیش کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ گواہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اپنی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی گواہی ہے۔ چنانچہ قُلْ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس گواہی کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ ہم تمہارے متعلق اس گواہی کو پیش کرتے ہیں تم لوگوں کے سامنے اسے پیش کرو اور انہیں چیلنج دو کہ اگر ان میں ہمت ہے تو وہ تمہاری زندگی میں کوئی عیب ثابت کریں۔ چنانچہ اصل آیت یوں ہے۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس : ۱۷) اس آیت میں قُلْ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی گواہی ساتھ شامل کر دی ہے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اکیلی گواہی نہیں رہی۔ غرض وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اگر خدا تعالیٰ کی گواہی ہوتی اور فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اپنی گواہی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ خدائی گواہی کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات کے متعلق گواہی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن خدا تعالیٰ نے قُلْ کہہ کر اپنی گواہی بھی ساتھ ہی شامل کر دی ہے۔ تا یہ نہ سمجھا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اپنے پاس سے کہی ہے پس ان میں سے کوئی گواہی بھی دوسری گواہی کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

جب دشمن بحث سے تنگ آ جائے اور دلائل کے میدان میں وہ بالکل بے بس ہو جائے۔ تو بعض دفعہ تنگ آ کر وہ کہہ دیا کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا تعالیٰ کی طرف یہ بات منسوب کرنا ایک دعویٰ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اپنی طرف سے بات کہنا تعلّی اور لاف زنی ہے۔ دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ کیا لوگ بھی آپ کو ایسا ہی بے عیب سمجھتے تھے جیسا کہ آپ نے دعویٰ کیا۔ اگر لوگ آپؐ کو بے عیب نہیں سمجھتے تھے تو محض تعلّی کے طور پر ایک بات پیش کر دینے سے کیا بن جاتا ہے۔ لوگ تو جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اور یہ تعلّی صداقت سے کس قدر دور ہے۔

آنحضرتؐ کے صدوق و امین ہونے کے متعلق آپ کے نہ ماننے والوں کی گواہی اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر لوگوں کی گواہی کو لو تب بھی ان کی شہادت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ دعویٰ نبوت سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ صدوق اور امین سمجھتے اور آپؐ کی راستبازی کے وہ حد درجہ قائل تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب آپ کو انذار کا حکم ہوا تو صفا پہاڑی پر آپؐ کھڑے ہوئے اور آپؐ نے نام لے لے کر مختلف قبائل کو بُلانا شروع کیا۔ جب تمام لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا۔ اچھا یہ بتاؤ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بہت بڑا لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات کو مان لو گے؟ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ کیونکہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولنے والا پایا ہے

(بخاری کتاب التفسیر سورۃ الشعراء زیر آیت وانذر عشیر تک الاقربین) حالانکہ یہ بات ایسی تھی جسے بظاہر کوئی شخص تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا تھا وجہ یہ ہے کہ مکہ کے لوگوں کے جانور وادی میں چرا کرتے تھے اور وہ ایسا علاقہ تھا کہ جس میں کسی لشکر کا چھپ رہنا ناممکن تھا۔ کیونکہ وہاں کوئی درختوں کا جنگل نہ تھا بلکہ کھلا میدان تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ ظاہری حالات کے لحاظ سے ایسا بالکل ناممکن تھا کہ کوئی لشکر آئے اور مکہ والوں کو اس کا علم نہ ہو۔ پھر بھی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے (یہ پہاڑ دراصل ایک معمولی ٹیلہ ہے۔ ڈلہوزی شملہ جیسا پہاڑ نہیں) ایک لشکر چھپا ہوا ہے اور وہ تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری بات کو مان لو گے یا نہیں؟ تو ان سب نے یہ جواب دیا کہ ہم ضرور مان لیں گے۔ جس کے معنے یہ تھے کہ گو یہ بات بالکل ناممکن ہے مگر چونکہ آپ کہیں گے اور آپ وہ ہیں جنہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس لئے ہم اس ناممکن بات کو بھی ممکن سمجھ لیں گے اور آپؐ کی بات کو درست قرار دے دیں گے۔ جب انہوں نے آپؐ پر اس قدر اعتماد کا اظہار کر دیا تو آپؐ نے فرمایا۔ میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ تم پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے تم اپنی اصلاح کر لو۔ یہ سنتے ہی سب لوگ آپ کو پاگل کہتے اور ہنسی اڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے دشمن کی یہ گواہی اس صداقت اور راستبازی کا ایک بیّن ثبوت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پائی جاتی تھی۔

اسی طرح خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت جب حجر اسود کو اس کی اصل جگہ پر رکھنے کے متعلق قبائل قریش میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا یہاں تک کہ وہ آپس میں کٹ مرنے کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ اس وقت آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس جھگڑے کو نپٹایا اور تاریخ میں لکھا ہے کہ جب لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آتے دیکھا تو سب لوگ یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ هٰذَا الْاَمِيْنُ رَضِيْنَا هٰذَا مُحَمَّدٌ۔ اَمِيْنٌ۔ اَمِيْنٌ۔ اور سب نے کہا کہ ہم اس کے فیصلہ پر راضی ہیں (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام حدیث بنیان الکعبۃ) یہ کفار کی دوسری شہادت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ابتدائی زندگی کے نہایت ہی اعلیٰ ہونے کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ قریب کی گواہ بیوی ہوتی ہے وہ اپنے شوہر کے جن حالات کو جانتی ہے عام لوگ ان حالات کو نہیں جانتے۔ اس لئے خاوند کے متعلق بیوی کی گواہی اور تمام گواہیوں سے زیادہ معتبر شمار کی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گواہی بھی حاصل ہوئی۔ چنانچہ جب آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور آپؐ نے گھبرا کر حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا تو حضرت خدیجہؓ نے ان الفاظ میں آپؐ کو تسلی دی کہ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى

نَوَائِبِ الْحَقِّ (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) خدا کی قسم اللہ آپؐ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں آپ لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں۔آپؐ معدوم اخلاق کو اپنے اندر رکھتے ہیں۔آپ مہمان نوازی کرتے ہیں۔آپ مصیبت زدوں کی امداد کرتے ہیں۔آپؐ جیسے انسان کو خدا کس طرح ضائع کرسکتا ہے۔یہ بیوی کی گواہی ہے جو اس بات کو ثابت کررہی ہے کہ آپؐ ان معنوں میں ضَالًّ نہیں تھے جو دشمن کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔

پھر بیوی نے تو آپ کی چالیس سالہ عمر کے وقت یہ گواہی دی تھی۔اس سے پہلے آپؐ کی ۲۴ سالہ عمر میں حضرت خدیجہؓ کے غلاموں نے آپ کی نیکی اور راستبازی اور دیانت کی گواہی دی۔چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مال تجارت دے کر شام میں بھجوایا تو واپسی پر حضرت خدیجہؓ نے ایک ایک غلام کو بلا کر اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حالات دریافت کئے۔ہر غلام نے آپ کی تعریف کی اور ہر غلام نے کہا کہ ہم نے اس جیسا دیانتدار اور با اخلاق انسان اور کوئی نہیں دیکھا۔حضرت خدیجہؓ جانتی تھیں کہ تجارتی قافلوں کے ساتھ جن لوگوں کو بھیجا جاتا ہے وہ خود بہت سا مال کھا جاتے ہیں۔مگر ان غلاموں نے بتایا کہ انہوں نے نہ صرف خود کوئی مال نہیں کھایا بلکہ ہمیں بھی ناجائز طور پر کوئی تصرف نہیں کرنے دیا۔جو رقم ان کے لئے مقرر تھی صرف وہی لیتے تھے اور اسی رقم میں سے کھانا بھی کھاتے تھے۔اس سے زائد انہوں نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔یہی وہ حالات تھے جن کو دیکھ کر حضرت خدیجہؓ اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے آپؐ کو شادی کا پیغام بھجوادیا (السیرۃ الحلبیۃ باب سفرہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الشام ثانیا)۔غرض تمام گواہیاں جو بچپن سے لے کر چالیس سالہ عمر تک ملتی ہیں وہ سب کی سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاقی لحاظ سے گمراہ نہیں تھے اور جب کہ سب کی سب گواہیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو پاک اور بے عیب ثابت کررہی ہیں تو وہ لوگ جو ضَآلًّا کے معنے گمراہ ہوجانے کے کرتے ہیں وہ خود ہی بتائیں کہ ان کے معنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح چسپاں ہوسکتے ہیں۔شریعت سے گمراہ تو آپؐ ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ کوئی شریعت اس وقت تھی ہی نہیں۔اگر اخلاقی گمراہی مراد لو تو وہ بھی چسپاں نہیں ہوسکتی۔کیونکہ اوّل سے آخر تک تمام گواہیاں ثابت کررہی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کے تھے۔جب آپؐ شریعت کے لحاظ سے بھی گمراہ نہیں تھے اور اخلاق کے لحاظ سے بھی گمراہ نہیں تھے تو پھر سوال یہ ہے کہ تیسری کون سی گمراہی ہے جو آپؐ کے اندر پائی جاتی تھی۔اگر کہو کہ اس کے معنے یہ

ہیں کہ آپؐ کفر سے گمراہ ہو گئے تو ہم بے شک کہتے ہیں کہ اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپؐ نے کفر کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ مگر جو معنے مخالف کرتے ہیں وہ قطعی طور پر غلط ہیں کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایک ایک گھڑی اور اس وقت کے حالات دونوں ان معنوں کو بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔

وَ وَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰى ۝۹

اور تجھے کثیر العیال پایا تو غنی کر دیا۔

حلّ لُغات۔ **عَآئِلًا** عَائِلاً: عَالَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور عَالَ عَيَالَهٗ کے معنے ہوتے ہیں كَفَاهُمْ مَعَاشَهُمْ وَمَانَهُمْ۔ اپنے اہل وعیال کے گذارہ کا پوری طرح بندوبست کیا۔ اور عَالَ الْيَتِيْمَ کے معنے ہوتے ہیں كَفَلَهٗ وَ قَامَ بِهٖ یتیم کے اخراجات کا ذمہ دار ہو گیا۔ اور عَالَ فُلَانٌ عَوْلًا کے معنے ہوتے ہیں كَثُرَ عَيَالُهٗ۔ اس کا کنبہ زیادہ ہو گیا (اقرب)۔ گویا اس کے دو معنے ہوئے۔ ایک معنے تو یہ ہیں کہ انسان دوسروں کا کفیل ہو جائے۔ ان کے اخراجات کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لے اور ان کی خبر گیری رکھے اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ وہ کثیر العیال ہو جائے۔

تفسیر۔ وَ وَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰى کے دو معنے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم نے تجھ کو کثیر العیال پایا اور تیری ضرورت پوری کر دی۔ دوسرے یہ کہ ہم نے دیکھا کہ تو ہی ایک ایسا شخص ہے جو ہر یتیم اور بے کس کی خبر گیری کرتا ہے اس لئے ہم نے بھی تجھے دولت دے دی تا کہ تو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ پہلے معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہو گا کہ تُو اپنے عیال کی خبر گیری کے قابل نہ تھا مگر ہم نے دولت دے کر تیری غربت کو دور کر دیا اور دوسرے معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ تیرے اندر یہ جذبۂ شوق پایا جاتا تھا کہ تو ہر مسکین اور یتیم کو پناہ دے۔ جو بھی درماندہ اور بے کس انسان تجھے نظر آتا تو اسے اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیتا۔ اُس کے سر پر اپنی محبت کا ہاتھ رکھتا اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جب ہم نے تیرے اس جذبۂ محبت اور جذبۂ ہمدردی کو دیکھا۔ تو ہم نے بھی اپنی دولت تیرے سپرد کر دی تا کہ تو ہمارے بے کس اور نادار بندوں کا کفیل ہو۔ یہاں دولت سے مراد صرف جسمانی دولت نہیں بلکہ روحانی دولت بھی مراد ہے اور یتامیٰ و مساکین سے مراد بھی صرف جسمانی یتامیٰ و مساکین نہیں بلکہ روحانی یتامیٰ و مساکین بھی مراد ہیں۔

جسمانی غرباءاور یتیم جو اُس وقت پائے جاتے تھے۔ اُن کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو تڑپ پائی جاتی تھی اور جس قدر ہمدردی اور محبت آپؐ کے قلب میں اُن کے متعلق موجود تھی اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آسکتی۔ بے انتہا تڑپ، بے انتہا ہمدردی اور بے انتہا محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل میں قوم کے غرباء اور یتامیٰ کے متعلق پائی جاتی تھی۔ آپؐ ان کے حالات کو دیکھتے تو بے تاب ہو جاتے۔ آپؐ کے دن بے چینی میں اور راتیں اضطراب میں کٹتیں۔ محض اس وجہ سے کہ غرباء کا کوئی سہارا نہ تھا۔ یتامیٰ کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ مساکین کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ جو آپؐ کے دل کے اسرار سے آگاہ تھا۔ اس نے جب آپؐ کی اس بے انتہا اور غیر معمولی تڑپ کو دیکھا تو آپؐ کی ان پاکیزہ خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اس نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے دل میں یہ تحریک پیدا فرمادی کہ میں اپنا سب مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقف کردوں۔ چنانچہ شادی کے بعد انہوں نے اپنا سب مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمادیا اور آپؐ کو اختیار دے دیا کہ آپؐ اس روپیہ میں جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بے شک خود غریب تھے مگر چونکہ غرباء کو دیکھ دیکھ کر آپؐ کا دل دکھتا تھا اور آپ ان کی غربت کو دور کرنے کا اپنے پاس کوئی سامان نہ پاتے تھے اس لئے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنا سارا مال آپؐ کے قدموں پر نثار کردیا تو آپؐ کو اپنی خواہشات کے برلانے اور آرزوؤں کو پورا کرنے کا موقع میسر آگیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ہزاروں روپیہ رکھنے والی خاتون نہیں تھیں بلکہ لاکھ پتی خاتون تھیں۔ مستقل طور پر ان کی طرف سے متعدد قافلے تجارت کے لئے شام کی طرف آتے جاتے تھے اور یہ وسیع کاروبار وہی شخص کرسکتا تھا جو اپنے پاس لاکھوں روپیہ رکھتا ہو۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حضرت خدیجہؓ کی اس عدیم المثال قربانی کے نتیجہ میں دولت کے ڈھیروں ڈھیر مل گئے تو آپؐ نے وہ تمام اموال قوم کے غرباء اور یتامیٰ و مساکین میں تقسیم کرکے اپنے دل کو ٹھنڈا کرلیا۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ بھی ہیں کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ تڑپ تھی کہ آپؐ کو خدا تعالیٰ کا وصال حاصل ہو۔ الٰہی قرب میں آپؐ کو جگہ ملے اور اس کا الہام آپؐ پر نازل ہو۔ اسی طرح عرب کی سرزمین میں خدا تعالیٰ کے کچھ اور بندے بھی اپنے رب کی محبت اور اس کے پیار کے لئے تڑپ رہے تھے۔ وہ بھی آرزو رکھتے تھے کہ ہمارا خدا ہم سے مل جائے۔ اس کا وصال ہمیں میسر آئے۔ اس کی محبت کی گود میں ہم جا بیٹھیں۔ اور اس کی پیاری اور میٹھی آواز ہمارے کانوں میں آئے۔ مگر وہ بے بس تھے بے کس تھے۔ کوئی راستہ ان کو

نظر نہیں آتا تھا۔ایک تڑپ تو موجود تھی مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اس تڑپ کا کیا علاج ہے۔ یہ لوگ جو اپنی اپنی جگہوں میں خدا کی رضا کے لئے تلملا رہے تھے۔ ان میں سے کوئی ابوبکر تھا، کوئی عمر تھا، کوئی عثمان تھا، کوئی علی تھا، کوئی زید تھا، کوئی طلحہ تھا۔ کوئی زبیر تھا۔ یہ سب لوگ خدا کی محبت میں گھلے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں گریاں اور ان کے دل بریاں تھے۔ اس لئے کہ ان کا محبوب ان سے ملے۔ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے جب دیکھا کہ تیرے سوا اور لوگ بھی مکہ بلکہ ساری دنیا میں ہیں جو اپنے دلوں میں ہماری محبت رکھتے اور ہماری جستجو کے لئے بےچین ہیں تو ہم نے ان کی تسلی کے لئے تجھے وہ روحانی غذا مہیا فرما دی جس کے بعد ان کی بےکلی جاتی رہی اور وہ پوری سرعت کے ساتھ ہماری طرف دوڑنا شروع ہو گئے۔ گویا اس آیت میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر فطرت کی تسلی کی تعلیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہے اور اس طرح روحانی عیال کی خبر گیری کا سامان آپ کو پوری طرح دے دیا ہے۔ کوئی فطرت نہیں جس کی آپؐ خبر گیری نہ کر سکتے ہوں اور کوئی فطرت نہیں جس کے مناسب حال تعلیم آپؐ کی کتاب میں موجود نہ ہو۔ بےشک کفار اسلام کی اس جامع تعلیم کو تسلیم نہیں کر سکتے مگر انہیں اتنا تو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں ان کے دل کی کیا کیفیت ہے اور آیا ان کو سکون اور اطمینان نصیب ہے یا نہیں۔ آخر وجہ کیا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ ایمان سے پہلے تو بےقرار تھے، بےچین اور مضطرب تھے۔ سمجھتے تھے کہ ہمیں منزل مقصود کا پتہ نہیں مگر جب ایمان لے آئے تو ان کے دلوں میں ٹھنڈک پڑ گئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہم جس مقصد کے لئے پیدا کئے گئے تھے وہ مقصد ہمیں حاصل ہو گیا ہے۔ یہی بات اس زمانہ میں ہم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کے متعلق لوگوں کے سامنے بار بار پیش کرتے ہیں کہ بےشک تم مخالفت کرتے ہو مگر اس کا کیا جواب ہے کہ جو لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لائے ہیں ان کے دل مطمئن ہو چکے ہیں تسلی کی ایک لہر ہے جو اُن کے قلوب میں پائی جاتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا خدا ہم سے مل گیا ہے۔ کیا کسی کاذب انسان کے ساتھ تعلق رکھنے کے نتیجہ میں بھی یہ ثلجِ خاطر حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ برکت تو اسی شخص کو مل سکتی ہے جس نے کسی سچے کا دامن پکڑا ہوا ہو۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ صرف تجھے ہم نے پالا اور تیری پرورش کا سامان کیا بلکہ تیرے ذریعہ سے اور ہزاروں یتامیٰ ومساکین کی پرورش کا بھی ہم نے انتظام کر دیا۔ جسمانی یتیم، جسمانی مسکین، جسمانی غریب اور جسمانی نادار روٹی کھا کر شہادت دے رہے ہیں۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستباز انسان ہیں اور روحانی یتیم ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ تیری تعلیم سے مطمئن ہو کر گواہی دے

رہے ہیں کہ ہم بڑے بھوکے تھے اگر سیری حاصل ہوئی تو اسی خوان ہُدیٰ سے جو اس پاک نفس انسان نے پیش کیا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ آئندہ بھی خدا ہمیشہ تیرے ساتھ ہوگا ہمیشہ تیری تائید کرے گا۔ ہمیشہ تجھے اپنی نصرت عطا کرے گا۔ جو خدا آج تک تیرے کام آتا رہا ہے جس نے ایک لمحہ کے لئے بھی تجھے کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ آئندہ تجھے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟

اس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ آپؐ کے روحانی عیال جوں جوں زیادہ ہوتے جائیں گے اللہ تعالیٰ ان کی خبرگیری کے سامان پیدا کرتا جائے گا۔ چنانچہ جس قدر معلم علم دین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے اور کسی نبی یا بزرگ کو نہیں ملے۔ اسی وجہ سے آپؐ نے فرمایا اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اهْتَدَیْتُمْ۔ میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں جس کے پیچھے بھی چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ؕ۝۱۰

پس یتیم کو تُو دبا نہیں۔

حلّ لُغات۔ لَا تَقْهَرْ لَا تَقْهَرْ۔ قَهَرَ سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور قَهَرَهٗ کے معنے ہیں غَلَبَهٗ۔ اس پر غالب آیا۔ نیز کہتے ہیں اَخَذْتُهُمْ قَهْرًا۔ اور مراد یہ ہوتی ہے اَیْ مِنْ غَیْرِ رِضَاهُمْ یعنی بغیر ان کی رضامندی کے ان کو کام پر لگا لیا۔ (اقرب)

مفردات میں ہے اَلْقَهْرُ: اَلْغَلَبَةُ وَالتَّذْلِیْلُ مَعًا وَیُسْتَعْمَلُ فِیْ کُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا یعنی قہر کے معنے ایسے غلبہ کے ہیں جس کے ساتھ مغلوب کی تذلیل بھی ہو۔ بعض اوقات قہر کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنے صرف غلبہ کے ہوتے ہیں یا صرف تذلیل کے (مفردات) پس لَا تَقْهَرْ کے معنے ہوئے۔ تو مغلوب نہ کر (۲) ذلیل نہ کر۔

تفسیر۔ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم نے تیرے ساتھ غیر معمولی طور پر ہمیشہ اچھا سلوک کیا ہے تو آئندہ یتیم کے متعلق ہماری تعلیم تمہیں یہ ہے کہ تم اس سے وہ معاملہ کیا کرو جو لَا تَقْهَرْ والا ہو۔ تمہیں جن اخلاق سے ہم نے نوازا ہے ان کو ہمیشہ بڑھاتے چلے جاؤ اور اس بات کو ہمیشہ مدنظر رکھو کہ تم یتیم تھے ہم نے تمہاری پرورش کے سامان پیدا کئے۔ اب اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ہمارے اور بھی بہت سے یتیم بندے ہیں

تم اُن سے کبھی ایسا سلوک مت کرو جو اُن کو ذلیل کرنے والا ہو۔ بلکہ ہمیشہ اُن کی فلاح اور بہبودی کا خیال رکھو۔ان کا اکرام کرو۔ان کو اُبھارنے اور ترقی دینے کی کوشش کرو اور اُن کی ضروریات کو پورا کرو۔

حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب قیامت کا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں سے فرمائے گا۔اے میرے بندو! میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہیں پلایا میں بیمار تھا تم نے میری بیمار پُرسی نہیں کی۔وہ لوگ گھبرا جائیں گے اور کہیں گے۔خدایا تُو یہ کیا کہہ رہا ہے تو کب بھوکا تھا کہ ہم نے تجھے کھانا نہیں کھلایا۔کب پیاسا تھا کہ ہم نے تجھے پانی نہیں پلایا۔کب مریض تھا کہ ہم نے تیری بیمار پُرسی نہیں کی۔تُو تو خود سارے جہاں کو کھانا کھلاتا۔اُن کو پانی پلاتا اور اُن کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ہم ناچیز بندے کیا طاقت رکھتے تھے کہ اے ہمارے رب تیری بیمار پُرسی کر سکتے یا تجھے کھانا کھلا سکتے یا تجھے پانی پلا سکتے۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ درست ہے۔مگر میری مراد یہ ہے کہ دنیا میں میرے بعض بندے بھوکے تھے تم نے اُنہیں کھانا نہیں کھلایا۔بعض بندے پیاسے تھے تم نے اُنہیں پانی نہیں پلایا۔بعض بندے ننگے تھے تم نے اُنہیں کپڑا نہیں دیا۔جب تم نے اُن کی ضروریات کا خیال نہیں رکھا تو گویا تم نے ان کی طرف سے بے پرواہی نہیں کی بلکہ میری طرف سے بے پرواہی کی۔وہ میرے بندے تھے جو مختلف قسم کی تکالیف میں مبتلا تھے اس لئے اُن کو کھلانا یا پلانا یا پہنانا ایسا ہی تھا جیسے تم مجھے کھلاتے یا مجھے پلاتے یا میری بیمار پُرسی کرتے۔مگر تم نے اس فرض کو ادا نہیں کیا (صحیح مسلم کتاب البر و الصلة باب فضل عیادة المریض) انجیل میں یہ واقعہ اس طرح آتا ہے کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن بعض بندوں کو بلائے گا اور فرمائے گا۔اے میرے بندو! میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اُتارا۔ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔بیمار تھا تم نے میری خبر لی۔قید میں تھا تم میرے پاس آئے آؤ اب میں تمہیں اس کی جزا دوں۔تب لوگ کہیں گے اے خداوند! ہم نے کب تجھے بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا۔ہم نے کب تجھے پردیسی دیکھ کر گھر میں اُتارا یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا۔ہم کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تیرے پاس آئے؟ تب اللہ تعالیٰ بندوں کے جواب میں فرمائے گا۔کہ اے میرے بندو! جب تم نے اپنے بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ہی ساتھ کیا۔اس لئے اب میں تمہیں اس کی جزاء دیتا ہوں اور جنت میں داخل کرتا ہوں۔(متی باب ۲۵ آیت ۳۵ تا ۴۰)

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو یتیم تھا ہم نے تجھے پالا۔اب دنیا میں ہمارے اور بھی بہت سے یتیم بندے ہیں اُن کی پرورش تیرے ذمہ ہے اور تیرا فرض ہے کہ تو اُن کی نگرانی

رکھے اور ان کی تکالیف کا ازالہ کرے۔

وہ حدیث جو اوپر بیان کی جا چکی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یتامیٰ و مساکین کی پرورش کا معاملہ خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے اور خدا تعالیٰ اس پرورش یا عدم پرورش کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ جو شخص یتیم سے حسن سلوک کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرتا ہے اور جو شخص یتیم سے بے اعتنائی کرتا یا اس سے ظالمانہ سلوک کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے غضب کو اپنے اوپر بھڑکاتا ہے۔ لَا تَقْهَرْ کہہ کر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یتیم کی پرورش اس رنگ میں نہیں کرنی چاہیے کہ وہ خراب ہو جائے۔ یعنی نہ ایسی سختی کرو کہ جس کے نتیجہ میں اس کے قویٰ دب جائیں اور وہ ترقی سے محروم ہو جائے اور نہ ایسی نرمی کرو کہ جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ اپنے اوقات اور اپنے قویٰ کو برباد کر دے۔ قَهْرٌ کے معنے دراصل غلبہ کے ہوتے ہیں۔ پس لَا تَقْهَرْ کے معنے یہ ہوئے کہ اُس سے ایسا معاملہ نہ کرو جس کے نتیجہ میں تم اُس کے قوائے دماغیہ اور جسمانیہ پر غالب آ جاؤ اور اس کی ترقی کو نقصان پہنچا دو۔ انسانی ترقی کو دو ہی طرح نقصان پہنچتا ہے یا بے جا سختی سے یا بے جا نرمی اور محبت سے۔ پس لَا تَقْهَرْ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بے جا سختی سے بھی روک دیا اور بے جا نرمی سے بھی منع فرما دیا اور نصیحت کی کہ یتیم سے تم ایسا ہی معاملہ کرو جو اس کی اچھی تربیت کے لئے ضروری ہو۔

وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۱﴾ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۲﴾ ع ۱۲/۱۸

اور سوالی کو تو جھڑک مت۔ اور تو اپنے رب کی نعمت کا ضرور اظہار کرتا رہ۔

حلّ لُغات۔ لَا تَنْهَرْ لَا تَنْهَرْ: نَهَرَ سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور نَهَرَ السَّآئِلَ کے معنے ہیں زَجَرَهٗ سائل کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔ (اقرب) پس لَا تَنْهَرْ کے معنے ہوں گے۔ مت ڈانٹ۔

تفسیر۔ فرماتا ہے سائل کو تم جھڑکو نہیں کیونکہ تم بھی سائل تھے محبت کی بھیک ہم سے مانگنے کے لئے آئے تھے۔ ہم نے تمہارے سوال کو رد نہ کیا بلکہ تمہارے دامن کو گوہر مقصود سے بھر کر لوٹایا۔ اب تم سے اور لوگ محبت کی بھیک مانگنے آئیں گے تمہارا فرض ہے کہ تم ان سائلوں کی طرف ہمہ تن متوجہ رہو اور ان کی خواہشات کو پورا کرو۔

اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ تحدیث نعمت دو طرح ہوتی ہے ایک اس طرح کہ انسان علیحدگی میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر ادا کرے اور اس کے پیہم فضلوں کو دیکھ کر سجدات شکر بجا لائے اور زبان کو اس کی حمد سے تر

رکھے۔ دوسرا طریق تحدیث نعمت کا یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنا بڑا فضل کیا۔ فرماتا ہے ہم نے جو نعمتیں تجھے عطا کی ہیں اُن کا خود بھی شکر ادا کرو اور اپنے رب کی ان نعمتوں کا لوگوں میں بھی خوب چرچا کرو۔ یا خدا تعالیٰ نے جو نعمتیں تجھے دی ہیں ان سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور اپنے جسم پر اُن کے آثار کو ظاہر کرو اور کچھ حصہ صدقہ و خیرات کے طور پر لوگوں میں بھی تقسیم کرو۔

اس سورۃ کے آخر میں جو تین باتیں بیان کی گئیں ہیں۔ یہ پہلی بیان کردہ تین باتوں کے مقابل میں ہیں۔ پہلے فرمایا تھا۔ (۱) اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (۲) وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۳) وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى۔ تم یتیم تھے ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تم ہماری محبت اور اپنی قوم کی نجات کے طالب تھے ہم نے تمہیں اپنی محبت بھی عطا کر دی اور قوم کی نجات کا سامان بھی عطا کر دیا۔ اسی طرح تم روحانی اور جسمانی یتامیٰ سے گھرے ہوئے تھے ہم نے دونوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا سامان تجھے دے دیا۔ اب تیرا بھی فرض ہے کہ تو یتامیٰ سے ایسا سلوک نہ کر جو ان کی طاقتوں کو توڑنے والا ہو۔ تو ہماری محبت کے سائلوں کو جو تیرے دروازہ پر آئیں کبھی مایوس مت لوٹا بلکہ جس طرح ہم نے تیری مرادیں پوری کی ہیں تو ان کی مرادوں کو پورا کر۔ اور پھر یہ بھی دیکھ کہ ہم نے تجھے عائل بنایا تھا پھر تجھے غنی کر دیا۔ اب تمہارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم نے تجھ پر جو احسانات کئے ہیں ان کا تو شکر ادا کر۔ ہماری نعمتوں سے خود بھی فائدہ اٹھا اور لوگوں میں بھی ان نعماء کو تقسیم کر۔ یہ اسلامی تعلیم نہیں ہے کہ انسان کو اگر کوئی نعمت ملے تو وہ اسے رد کر دے اور اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں روحانیت کا مفہوم نہ سمجھنے کے نتیجہ میں یہ خیال پیدا ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعماء کا استعمال روحانیت کے خلاف ہے۔ اچھا کھانا کھانا یا اچھا کپڑا پہننا یا اعلیٰ درجہ کی اشیاء سے فائدہ اٹھانا روحانی لوگوں کا کام نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ لوگوں کی خودساختہ روحانیت ہے اسلام اور عرفان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ الٰہی حکم یہی ہے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی نعمت ملے وہ اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ کاہنوں کی طرح ان نعمتوں کو رد نہ کر دے۔ اس آیت کے روحانی لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے جو تعلیم تجھے عطا کی ہے اس پر خود بھی عمل کرو اور دوسروں سے بھی عمل کراؤ اور جسمانی لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے جو نعمتیں تجھے دی ہیں ان سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاؤ۔ بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے جو فضل نازل کئے تھے ان کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ سے مطالبہ کیا ہے کہ جیسے تم یتیم تھے اور

ہم نے تمہاری خبر گیری کی اسی طرح تم ہمارے یتیموں کی خبر گیری کرو۔ جیسے تم سائل تھے اور ہم سے محبت کی بھیک لینے آئے اور ہم نے تمہاری آرزو کو پورا کر دیا اسی طرح اب ہمارے سائل جو تیرے پاس آئیں تیرا فرض ہے کہ تُو ان کی آرزوؤں کو پورا کرے۔ پھر جس طرح ہم نے تجھے عائل پا کر غنی کر دیا تھا اسی طرح دنیا میں بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جن کو اس بات کا کوئی علم نہیں کہ خدا نے ان کی ہدایت کے لئے آسمان سے کتنا بڑا نور نازل کر دیا ہے وہ جہالت کی تاریکیوں میں اپنی عمر بسر کر رہے ہیں اور آسمانی نور کی شعائیں ان تک نہیں پہنچیں۔ ان کے دل بھی اس شوق میں تڑپ رہے ہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ کی محبت حاصل ہو۔ اس کا پیار ان کی غذا ہو اور اس کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں ہو۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ وہ شمع کہاں ہے جس کے گرد وہ پروانہ وار اپنی جانوں کو قربان کر دیں۔ ہم نے تجھے آسمانی دولت سے مالا مال کر کے اس لئے بھیجا ہے کہ تو دنیا کے سب لوگوں تک خدائے قدوس کی آواز پہنچا دے۔ سوڈھنڈورا دو اور خوب دو۔ تبلیغ کرو اور خوب کرو۔ خدا کا نام دنیا کے کناروں تک پہنچاؤ اور خوب پہنچاؤ۔ سوتی دنیا کو جگاؤ اور خوب جگاؤ اور جو خزانے خدا نے تمہیں عطا کئے ہیں انہیں بلا دریغ لوگوں میں تقسیم کر دو کہ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے تمہیں دنیا میں کھڑا کیا گیا ہے۔

یہ تینوں آیتوں کا تقابل بھی بتاتا ہے کہ وَجَدَكَ ضَآلًّا میں گمراہی مراد نہیں۔ کیونکہ یتیم کے مقابل پر یتیم کا ذکر کیا ہے نعمت کے مقابل پر تحدیث بالنعمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے لازماً ضَآلًّا کے مقابل پر جو آیت ہے اس میں پہلی آیت کے متعلق ہی اشارہ چاہیے اور اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی سوالی کو رد نہ کر پس ضَآلًّا کے معنے بھی سوال کے کرنے کے ہوں گے اور یہی معنے کئے گئے ہیں۔ یعنی تو خدا تعالیٰ کی محبت کا سوالی تھا سو ہم نے تیری اس غرض کو پورا کیا اور ہدایت بخشی۔

سُوۡرَۃُ الۡاِنۡشِرَاحِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ انشراح۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَهِیَ ثَمَانِیۡ اٰیٰتٍ دُوۡنَ الۡبَسۡمَلَۃِ وَفِیۡهَا رُکُوۡعٌ وَّاحِدٌ

اوراس کی بسم اللہ کے سوا آٹھ آیات ہیں اورایک رکوع ہے۔

یہ سورۃ مکی ہے بلا خلاف (فتح البیان زیرسورۃ الانشراح)۔ وہیری کے نزدیک اس کے نزول کا وقت مضمون کی مشارکت کی وجہ سے پہلی سورۃ کے زمانہ کا ہی معلوم ہوتا ہے(A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry Surat Al Inshirah vol:4 p:255)۔یعنی پہلے یا دوسرے سال کی معلوم ہوتی ہے۔ مغربی مصنفین کا اس امر کوتسلیم کرنا اسلام کی ایک بہت بڑی فتح ہے کیونکہ اس سورۃ میں ایسی زبردست پیشگوئیاں ہیں کہ انہیں تسلیم کر لینے کے بعد اسلام کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا ورنہ اس سورۃ کو مدنی کہہ کر ان پیشگوئیوں پر پردہ ڈالا جاسکتا تھا۔ میرے نزدیک یہ سورۃ تیسرے سال یا اس کے قریب کی ہے۔

اس کی ترتیب کے متعلق یادرکھنا چاہیے کہ اس کا تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انجام کے اچھا ہونے کا ذکر تھا جیسا کہ فرمایا تھا وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّكَ مِنَ الۡاُوۡلٰی۔ یہ آیت اُس سورۃ کے مضمون کا گویا خلاصہ تھی کیونکہ اس میں پہلے دلائل کا ایک نتیجہ نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اب سورۃ الانشراح میں اس دعویٰ کے متعلق کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا انجام اچھا ہوگا مزید روشنی ڈالی گئی ہے اور پچھلی سورۃ کے تسلسل میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ انجام کے اچھا ہونے کی کچھ علامتیں ہوتی ہیں اگر وہ علامتیں کسی شخص میں موجود ہوں تو وقت سے پہلے لوگ قیاس کر سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی مدد اس شخص کو حاصل ہے یعنی انجام تو جب ہوگا سو ہوگا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اچھے انجام کو بعض علامتوں کے ساتھ پہچانا بھی جاسکتا ہے۔ چنانچہ چار اہم علامتیں اللہ تعالیٰ اس جگہ بیان کرتا ہے۔

اوّل یہ کہ انسان کو خود اپنے دعووں پر شرح صدر ہو۔ دوم جس مقصد کو لے کر وہ کھڑا ہوا اُس کو پورا کرنے کے ذرائع اس کو میسر آجائیں اور تیسرے یہ کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف پھر جائے۔ چوتھے یہ کہ یہ سامان الٰہی تقدیر

کے ماتحت پیدا ہوں۔ جب یہ چار چیزیں کسی شخص کو حاصل ہو جائیں تو ابتداء ہی سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ شخص غالب آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاروں باتیں تجھے حاصل ہیں اس صورت میں تیرے مخالفین کو سمجھ لینا چاہیے کہ تیرے انجام کی بہتری کے متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝۱

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۝۲

کیا ہم نے تیرے لئے تیرے سینے کو کھول نہیں دیا۔

حلّ لُغات۔ الشّرح نَشۡرَحۡ: شَرَحَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے اور لَمۡ نفی کے لئے آیا ہے۔ اور شَرَحَ (یَشۡرَحُ شَرۡحًا) اللَّحۡمَ کے معنے ہوتے ہیں قَطَعَہٗ طِوَالًا۔ گوشت کو لمبی طرز پر کاٹا یا اس میں شگاف دیا اور شَرَحَ الۡغَامِضَ کے معنے ہوتے ہیں کَشَفَہٗ کسی پیچیدہ بات کو واضح کر دیا یعنی معمّہ کو حل کر دیا۔ فَسَّرَہٗ وَبَیَّنَہٗ اس کی تفسیر کی اور اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور شَرَحَ الشَّیۡءَ کے معنے ہوتے ہیں فَتَحَہٗ اس کو کھول دیا۔ اسی طرح وَسَّعَہٗ اسے پھیلا دیا اور شَرَحَ الۡکَلَامَ کے معنے ہوتے ہیں فَھَّمَہٗ اس کو سمجھا دیا اور شَرَحَ صَدۡرَہٗ بِالشَّیۡءِ وَلِلشَّیۡءِ کے معنے ہوتے ہیں سَرَّہٗ بِہٖ وَ طَیَّبَ بِہٖ نَفۡسَہٗ اسے اس کے ذریعہ سے خوش کر دیا (اقرب)۔

مفردات راغب میں لکھا ہے اَصۡلُ الشَّرۡحِ بَسۡطُ اللَّحۡمِ وَ نَحۡوِہٖ یعنی شَرۡحٌ کے اصل معنے تو گوشت یا ایسی ہی کسی چیز کو چیر کر کھول دینے کے ہوتے ہیں وَ مِنۡہُ شَرۡحُ الصَّدۡرِ اور اسی سے شرح الصدر کا محاورہ نکلا ہے۔ جس کے معنے بَسۡطُہٗ بِنُوۡرٍ اِلٰھِیٍّ وَ سَکِیۡنَۃٍ مِّنۡ جِھَۃِ اللّٰہِ وَ رَوۡحٌ مِّنۡہُ (مفردات) کے ہیں یعنی الٰہی نور اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی تسکین اور اطمینان اور اس کی طرف سے آنے والے کلام یا ملائکہ کے ذریعہ سے سینہ کو کھول دینا۔ ظاہر ہے کہ یہ معنے تفسیری ہیں ورنہ شرح صدر کا فعل صرف خدا تعالیٰ کے لئے نہیں بولا جاتا بلکہ عربی محاورہ کے مطابق بعض دفعہ اپنے ہم کلام کی بات سُن کر آدمی کہتا ہے کہ اب میرا شرح صدر ہو گیا اور اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آ گئی ہے۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے حق

میں شَرَحَ صَدْرَہٗ کے الفاظ استعمال ہوں گے تو اس وقت بوجہ محل استعمال کے نہ کہ وضع لغت کے وہ معنے ہوں گے جو کہ علامہ راغب نے اس جگہ کئے ہیں۔

تاج العروس عربی لغت کی سب سے بڑی کتاب میں لکھا ہے شَرَحَ کَمَنَعَ: کَشَفَ، شَرَحَ مَنَعَ کے وزن پر ہے اور اس کے معنے ہیں کھول دیا۔ کہتے ہیں شَرَحَ فُلَانٌ اَمْرَہٗ: اَوْضَحَہٗ۔ فلاں شخص نے اپنا معاملہ خوب کھول کر رکھ دیا۔ شَرَحَ مَسْأَلَۃً مُّشْکِلَۃً: بَیَّنَھَا اور جب کہیں کہ اس نے ایک مشکل مسئلہ کی شرح کی تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اسے کھول کر بیان کر دیا اور حل کر دیا پھر لکھا ہے وَ ھُوَ مَجَازٌ۔ یہ استعمال اس کا مجازاً ہے اس کے آگے اس لفظ کے اصل معنے جو وضع لغت کے مطابق ہیں یہ لکھے ہیں شَرَحَ: قَطَعَ اللَّحْمَ عَنِ الْعُضْوِ قَطْعًا یعنی شَرَحَ کے معنے ہیں گوشت کو عضو سے کاٹ کر الگ کر دیا۔ وَقِیْلَ قَطَعَ اللَّحْمَ عَلَی الْعَظْمِ قَطْعًا۔ ہڈی پر چھری مار مار کر گوشت کو الگ کر دیا یعنی جس طرح پسندے بناتے ہیں کہ گوشت ہڈی سے چمٹا ہی رہتا ہے مگر پھول کی پنکھڑیوں کی طرح یا مخمل کے پھندوں کی طرح اوپر سے اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ گویا اس لفظ کے یہ بھی معنے ہیں کہ کاٹ کر الگ کر دیا اور یہ بھی کہ ایک جہت سے گوشت آپس میں الگ ہو جائے اور ایک جہت سے ہڈی سے چمٹا رہے۔ پھر لکھا ہے شَرَحَ الشَّیْءَ کے ایک معنے فَتَحَ کے بھی ہیں اور اس کے معنے ہیں بیان کیا، کھولا (درحقیقت یہ معنے اوپر کے دو معنوں میں سے آخری معنوں میں سے مجازاً نکالے گئے ہیں یعنی ایک مجوف چیز کو ایک طرف سے کھول کر اس کے اندر جھانکنے یا اس کے اندر کوئی چیز ڈالنے کے لئے راستہ بنا دیا) پھر لکھا ہے (امام لغت) ابن الاعرابی کے نزدیک شَرَحَ کے معنے بیان اور فہم اور فتح اور حفظ کے ہیں۔ یعنی واضح کرنا، سمجھانا، کھولنا اور محفوظ کرنا۔ پھر لکھا ہے شَرَحَ کے معنے ازالہ بکارت کے بھی ہوتے ہیں۔ پھر لکھا ہے مجازی طور پر شَرَحَ الشَّیْءَ کے معنے وَسَّعَہٗ کے بھی ہوتے ہیں یعنی اسے پھیلا دیا اور وسیع کر دیا اور شرح صدر اسی قبیل سے ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ قبول حق یا قبول خیر کے لئے سینہ کو وسیع کر دیا (یعنی دل میں حق کے قبول کرنے کے لئے انشراح پیدا ہو گیا اور حق کی طرف اسے رغبت ہو گئی۔ جہاں سے بھی حق ملے اور جس قدر بھی ملے وہ اسے قبول کرنے کو تیار ہوتا ہے)۔ اسی طرح کہتے ہیں شَرَحَ اِلَی الدُّنْیَا وہ دنیا کی طرف مائل ہوا۔ (تاج العروس)

صَدْرٌ اور صَدْرٌ کے معنے ہوتے ہیں اَعْلٰی مُقَدَّمُ کُلِّ شَیْءٍ یعنی ہر چیز کے اگلے حصہ کی جو چوٹی ہوا سے صدر کہتے ہیں اور یوں حیوان یا انسان کے متعلق جب یہ لفظ بولا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں مَادُوْنَ الْعُنُقِ اِلٰی فَضَآءِ الْجَوْفِ۔ یعنی گردن سے لے کر پیٹ کے خلاء تک جسم کا جو حصہ ہوتا ہے اس کو صدر کہتے ہیں یعنی سینہ۔

اسی طرح ہر چیز کے ابتدائی حصہ کو بھی صدر کہتے ہیں۔ چنانچہ جب صَدْرُ النَّھَارِ یاصَدْرُ الشِّتَآءِ یاصَدْرُ الصَّیْفِ کہتے ہیں تو اس کے معنے دن کے ابتدائی حصہ یا سردی یا گرمی کے ابتدائی ایام کے ہوتے ہیں (اقرب) گویا ایک لحاظ سے یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ ہر چیز کی چوٹی کو بھی صدر کہتے ہیں اور ہر چیز کے ابتدائی حصہ کو بھی صدر کہتے ہیں جو بالعموم حقیقت کے لحاظ سے ادنیٰ ہوتا ہے جیسے صبح دوپہر سے کم روشن ہوتی ہے۔ موسموں کے لحاظ سے جب سردی یا گرمی کا موسم شروع ہو یا بہار یا خزاں کے ایام آئیں تو وقت کے لحاظ سے موسم کا جو ابتدائی حصہ ہوتا ہے اسے بھی صدر کہتے ہیں۔ لیکن محاورہ میں صدر اس کو کہتے ہیں جو قوم کے نزدیک عزت کے قابل ہو یا اعلیٰ رتبے پر رکھے جانے کا مستحق ہو۔ ہماری زبان میں بھی یہ لفظ اعزاز کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں فلاں کو صدر مقام پر بٹھایا گیا۔ یا فلاں کو صدر مجلس تجویز کیا گیا۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُسے عزت کے مقام پر کھڑا کیا گیا ہے یا لیڈری کا مقام اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ اسی طرح صدر سردارِ قوم کو بھی کہتے ہیں (اقرب) اور صدر دل کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ سینہ میں ہوتا ہے اور صدر کسی چیز کے حصہ کو بھی کہتے ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے اَخَذْتُ صَدْرًا مِّنْہُ۔ میں نے اس میں سے ایک حصہ لے لیا (اقرب)

انشراح صدر کا محاورہ اطمینان کو ظاہر کرنے کے لیے جہاں تک انشراح صدر کا تعلق سینہ سے ہے قطع نظر اس سے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہر ملک اور ہر قوم میں یہ دستور پایا جاتا ہے کہ ان میں سے جب کسی شخص کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے یا کسی حقیقت پر اس کا دل تسلی پا جاتا ہے تو ایسے موقع پر ہمیشہ اظہارِ اطمینان کے لئے وہ شرح صدر کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اردو میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں بات کے لئے میرا سینہ کھل گیا۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی ڈاکٹر کہہ دے کہ سینہ کا کسی بات کے سمجھنے سے کیا تعلق ہے سینہ تو ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کا نام ہے جس میں دل ہے، پھیپھڑا ہے، معدہ ہے، جگر ہے، گلے کی نالی ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا کسی بات کے سمجھنے سے کوئی تعلق نہیں۔ بے شک طبی طور پر اسی کا نام صدر ہوگا مگر زبان کے لحاظ سے سینہ کھل جانے کے معنے ہوتے ہیں کسی بات پر اطمینان ہو گیا اور سینہ تنگ ہو جانے کے معنے ہوتے ہیں کسی بات پر اطمینان پیدا نہ ہوا یا غم کے سامان پیدا ہو گئے۔ یہ سوال کہ ایسا کیوں کہا جاتا ہے اس کی ذمہ داری زبان بنانے والوں پر ہے مذہب پر نہیں۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ اپنی حماقت کی وجہ سے زبان کی بحث مذہب میں بھی شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح خود بھی ٹھوکر کھاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں۔ مثلاً ہماری زبان میں عام طور پر یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے کہ میرے دل میں فلاں بات آئی۔ اس جگہ کوئی عقلمند انسان یہ سوال پیدا نہ کرے گا کہ بات دل میں آتی ہے یا دماغ

میں ۔کیونکہ لغت نے اس فقرہ کے مفہوم کے ادا کرنے کے لئے یہی الفاظ وضع کئے ہیں اس لئے ہم ان کے استعمال پر مجبور ہیں۔لُغت یہی کہتی ہے کہ جب کوئی شخص کہے کہ میرے دل میں فلاں بات آئی تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں اُسے ایک نیا خیال سوجھا اور جب بھی کسی شخص کو کوئی نئی بات سوجھتی ہے تو وہ یہی فقرہ استعمال کرتا ہے خواہ وہ جاہل ہو یا فلاسفی کا پروفیسر یا علم تشریح الابدان کا ماہر۔

انشراح صدر کے متعلق ایک اعتراض اور اُس کا جواب رہا یہ سوال کہ وہ بات دل میں آتی ہے یا سر میں آتی ہے یا پاؤں میں آتی ہے زبان کے لحاظ سے ہمیں اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔مگر بعض لوگ غلطی سے اس قسم کی بحث شروع کر دیتے ہیں کہ تم کہتے ہو دل میں بات آئی۔دل میں بات کس طرح آسکتی ہے یا تم کہتے ہو سینہ کُھل گیا سینہ کس طرح کُھل سکتا ہے۔ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ تو سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو معنے کئے جاتے ہیں وہ عربی لغت کے لحاظ سے چسپاں ہوتے ہیں یا نہیں مگر یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اُن کا استعمال علم ڈاکٹری کے لحاظ سے درست ہے یا نہیں کیونکہ اس کی ذمہ واری قرآن مجید پر نہیں بلکہ زبان بنانے والوں پر ہے۔اگر زبان میں کوئی فقرہ کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایجاد کر لیا گیا ہے تو ہم پابند ہیں کہ وہی فقرہ بولیں خواہ حقیقت سے وہ تعلق رکھتا ہو یا نہ۔عام یوروپین ہی نہیں ایک اناٹومی کا پروفیسر اور ایک سائکالوجی کا پروفیسر بھی جب کسی تکلیف دہ امر کا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ It aches my heart یہ بات میرے دل کو تکلیف دیتی ہے حالانکہ احساس تکلیف دماغ کے حصۂ امتیاز میں ہوتا ہے نہ کہ دل کے گوشت میں۔اسی طرح جب وہ کسی تکلیف کا اظہار کرتا ہے تو کہتا ہے کہ My heart sank میرا دل ڈوبنے لگا۔کیا اس پروفیسر کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دل دریا یا سمندر میں نہیں پڑا ہوا کہ ڈوبنے لگا ہے۔وہ خوب جانتا ہے کہ سینہ میں کوئی کنواں کُھدا ہوا نہیں کوئی ندی نالہ جاری نہیں۔کوئی سمندر پھیلا ہوا نہیں۔مگر وہ ایسا کہنے پر مجبور ہے کیونکہ اُس کے بزرگوں نے اس خیال کو ادا کرنے کے لئے جو اُس نے بیان کرنا چاہا ہے یہی الفاظ مقرر کر چھوڑے ہیں۔بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گزرتا ہے My heart sank in my boots میرا دل ڈوب کر جوتیوں تک چلا گیا۔اسی طرح ہر اناٹومی اور سائکالوجی کا پروفیسر جب یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے یہ بات محسوس کی۔تو وہ کہتا ہے I felt in my heart۔میں نے اپنے دل میں فلاں امر محسوس کیا۔حالانکہ طبی طور پر اور علم النفس کے مطابق وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ محبت کا دل سے تعلق نہیں بلکہ دماغ سے تعلق ہوتا ہے۔مگر جب بھی الفاظ استعمال کرے گا یہی کرے گا کہ میں نے اپنے دل میں محبت یا

فلاں بات محسوس کی ۔ اسی طرح ان علوم کے پروفیسر بھی اپنی منگیتروں یا بیویوں کو جب وہ جدا ہوں یہی لکھیں گے کہ You always live in my heart تم ہر وقت میرے دل میں رہتی ہو یہ کبھی نہیں لکھے گا کہ You always live in my head ۔ بلکہ اگر وہ لکھ دے تو شاید منگنی ہی ٹوٹ جائے اور منگیترا سے پاگل سمجھنے لگ جائے ۔ پس جب ہر شخص روزانہ اپنی زبان میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس پر اعتراض نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا تو یہ کیا حماقت کی بات ہے کہ مذہبی کتب پر زبانوں کے محاوروں کی وضع کی وجہ سے لوگ اعتراض شروع کر دیتے ہیں ۔ جنہوں نے وہ محاورے بنائے ہیں جا کر ان سے سوال کریں ۔ مذہبی کتاب تو مجبور ہے کہ ان محاوروں کی اتباع کرے ورنہ اُس کے مخاطبین اُس کی بات ہی نہ سمجھیں گے اور وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے گی ۔

دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ مثلاً ایک عرب قلب کا لفظ اُن معنوں میں استعمال کرتا ہے یا نہیں جن معنوں میں تشریح الابدان کے ماہرین دماغ کا لفظ استعمال کرتے ہیں ۔ اگر کرتا ہے تو محض قلب کے لفظ کے استعمال پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کریم کو دماغ کا لفظ بولنا چاہیے تھا قلب کا لفظ اس نے کیوں بولا ۔ یا مثلاً یہ تو سوال ہوسکتا ہے کہ سینہ کا کھل جانا یا اُس کا تنگ ہوجانا عربی زبان میں محاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے یا نہیں ۔ اگر ہوتا ہے تو قرآن کریم کے لئے صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری تھا کہ وہ ان محاورات کو استعمال کرتا کیونکہ اگر وہ ان محاورات کو استعمال نہ کرتا تو لوگ سمجھتے کیا خاک؟ آج علمی زمانہ ہے ۔ سائنس کی ترقی اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے ۔ ماہرین تشریح الابدان بال کی کھال اتار چکے ہیں ۔ مگر آج بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ میرے دل میں تمہاری محبت ہے ۔ اگر کوئی شاعر ان الفاظ کی بجائے یہ کہہ دے کہ میرے دماغ میں تمہاری محبت ہے تو سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں گے کہ پاگل ہوگیا ہے ۔ حالانکہ واقعہ یہی ہوتا ہے ۔ مگر چونکہ زبان نے اس غرض کے لئے دل کا لفظ وضع کیا ہوا ہے اس لئے جب وہ محاورۂ زبان کے خلاف دماغ کا لفظ استعمال کرے گا سب لوگ ہنس پڑیں گے کہ بڑا احمق انسان ہے حالانکہ طبی طور پر وہ درست کہہ رہا ہوگا ۔ پس ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں کہ تشریح الابدان کے ماہرین کیا کہتے ہیں ۔ ہم زبان کو دیکھیں گے کہ اُس میں کیا الفاظ رائج ہیں ۔ جو کچھ زبان میں الفاظ رائج ہوں گے انہی کا استعمال فصاحت ہوگا ۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور الفاظ استعمال کئے جائیں گے تو وہ معیارِ فصاحت سے بالکل گر جائیں گے ۔

تفسیر ۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ میں گو الفاظ استفہامی یعنی سوالیہ استعمال کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ کیا ہم نے تیرے سینہ کو نہیں کھولا؟ مگر مفہوم یہ ہے کہ تو جانتا ہے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے ایسے

سوال کو عربی لغت والے انکار ابطالی کہتے ہیں۔ایک عرب کا قول ہے کہ اَلَسْتُمْ خَيْرَ مَنْ رَكِبَ الْمَطَايَا(اقرب) کیا تم سواریوں پر چڑھنے والوں میں سے سب سے اچھے نہیں ہو؟ یعنی اچھے ہو۔ درحقیقت یہ وہی حسابی اصول ہے کہ دو منفیاں ایک مثبت بنا دیتی ہیں۔ جب استفہام انکاری کے بعد نفی کا لفظ آ جائے تو وہ مثبت کے معنے دینے لگ جائے گا کیونکہ منفی کی نفی مثبت کا مفہوم دیتی ہے۔مثلاً اگر طنزاً کہیں کیا تو عالم ہے؟ تو اس کے معنے ہوں گے کہ تو عالم نہیں ہے لیکن اگر یوں کہیں کیا تو عالم نہیں ہے؟ تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تو عالم ہے مگر باوجود عالم ہونے کے فلاں حرکت کرتا ہے یا یہ کہ تو عالم ہے باوجود اس کے جاہل لوگ تجھ پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔اسی طرح اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کے یہ معنے نہیں کہ تجھ سے ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا تیرا سینہ کھولا گیا ہے یا نہیں؟ بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ تو بھی جانتا ہے کہ تیرا سینہ ہم نے کھول دیا ہے اور تیرے دشمن بھی جانتے ہیں کہ تیرا سینہ ہم نے کھول دیا ہے۔اس جگہ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ کیوں نہ سیدھے سادھے الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ کہا جاتا کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے تو اس سے صرف ایک خبر کا مفہوم نکلتا یعنی اللہ تعالیٰ اطلاع دیتا ہے کہ ہم نے سینہ کو کھول دیا لیکن یہ مفہوم نہ نکلتا کہ اس شرح صدر کا کوئی ظاہر نتیجہ بھی نکلا ہے یا نہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس شرح صدر کا کوئی احساس ہوا ہے یا نہیں اور کفار نے بھی اس کا کوئی ثبوت دیکھا ہے یا نہیں اور یہ مضمون ظاہر ہے کہ بہت ہی نامکمل ہوتا۔لیکن اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کہہ کر اس امر پر زور دے دیا کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے اور یہ امر تو بھی جانتا ہے اور تیرے دشمن بھی جانتے ہیں یعنی ایک چھپی ہوئی بات نہیں ایک ظاہر اور کھلا نشان ہے جس کا انکار کوئی نہیں کرسکتا۔غرض ایسا فقرہ استعمال کرکے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ حقیقت دوسروں پر مخفی نہیں شرح صدر کی اہمیت کو ایسا واضح کر دیا ہے کہ اور کوئی مختصر الفاظ اس مضمون کو بیان نہ کر سکتے تھے۔

یہ مضمون اس رنگ میں بھی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ہم فرض کریں ایک شخص ہمارے پاس آئے اور ہمیں خبر پہنچائے کہ میں نے آپ کے گھر میں گوشت پہنچا دیا ہے اب جہاں تک اس خبر کا تعلق ہے ہمیں اس سے صرف اتنا ہی پتہ لگ سکتا ہے کہ زید کہتا ہے اس نے ہمارے گھر میں گوشت پہنچا دیا ہے۔اب واقعہ میں گوشت پہنچا ہے یا نہیں پہنچا اس کا اس فقرہ سے علم نہیں ہوتا۔ایسی حالت میں زید کبھی یہ نہیں کہے گا کہ کیا میں نے گوشت تمہارے گھر میں نہیں پہنچا دیا۔ بلکہ وہ صرف اتنا کہے گا کہ میں نے تمہارے گھر میں گوشت پہنچا دیا ہے۔لیکن اگر شخص مخاطب گھر جائے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ گوشت پہنچ گیا ہے تو اس کے بعد زید اُسے بے شک کہہ سکے گا کہ کیا میں نے

تمہارے گھر میں گوشت نہیں پہنچایا۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں نے تمہارے گھر میں گوشت پہنچا دیا ہے اور تمہیں خود بھی اس بات کا علم ہے کہ گوشت پہنچ گیا ہے۔ پس ’’کیا ایسا نہیں کیا‘‘ کے فقرہ سے یہ زائد معنے پیدا ہوجاتے ہیں کہ یہ بات ایسی پختہ ہے کہ مخاطب بھی اس بات کی تصدیق کرے گا اور کہے گا کہ ہاں یہ بات واقعہ میں درست ہے میں خود اس بات کا گواہ ہوں کہ یہ واقعہ ہوگیا ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ کے فقرہ میں تصدیق مخاطب پس اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ اپنے اندر تصدیق مخاطب کا مضمون بھی رکھتا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ مخاطب اس علم میں ہمارا شریک ہے وہ اس واقعہ سے انکار نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم نے تیرا سینہ اس طرح نہیں کھولا کہ تو خود بھی اس بات کی گواہی دے گا اور تجھے علم ہے کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے۔

یہ جملہ کہ یہ بات ظاہر ہے اور اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ تیرا سینہ کُھل چکا ہے۔ ہے تو ایک معمولی جملہ مگر اس کے اندر وسیع مطالب پائے جاتے ہیں۔ شَرَحَ کے معنے حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں کہ (۱) کھولنے (۲) پھیلانے (۳) سمجھانے (۴) محفوظ کردینے (۵) اچھی طرح بیان کرنے کے ہیں۔ ان معنوں کے رو سے آیت کے ایک تو یہ معنے ہوں گے کہ کیا ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا۔ یعنی اس بات کو تو بھی جانتا ہے اور دوسری دنیا بھی جانتی ہے کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے۔ سینہ کھولنے کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے مادۂ قبولیت کے پیدا ہوجانے کے ہیں اور چونکہ یہ محاورہ اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اچھی باتوں کی قبولیت کے لئے دل آمادہ رہتا ہے یا کسی خاص معاملہ کے متعلق دل تسکین پالیتا ہے اُسے اس بات پر یقین کامل ہو جاتا ہے تو اسے شرح صدر کہتے ہیں۔ جب یقین ایسے کمال کو پہنچ جائے کہ اس میں معجزانہ رنگ پیدا ہوجائے۔ تو اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے شرح صدر کہتے ہیں اور جب ایسے امور کے متعلق یقین ہو جو غیبی ہوں اور جن پر یقین پیدا ہونا الٰہی تصرف کے نتیجہ میں ہوسکتا ہو تو اسے بھی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور انکار ابطالی کا استعمال جو درحقیقت اثبات پر دلالت کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ وہ امر پوشیدہ نہیں بلکہ اس کی حقیقت ظاہر و باہر ہوچکی ہے۔ ان معنوں کے رو سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صداقتوں اور نیکیوں کو ماننے اور اُن پر عمل کرنے کے لئے بہت بشاشت قلب عطا فرمائی تھی اور وہ امور سماویہ جو امور غیبیہ پر مشتمل تھے اُن پر بڑا زبردست یقین بخشا تھا اور یہ دونوں امر بار بار اس طرح ظاہر ہوچکے تھے کہ آپ کے مخالفوں کو بھی اُن کے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔ اور اگر یہ تینوں باتیں کسی شخص میں پائی جائیں تو اوّل تو یہ اس کی سچائی کا ثبوت ہوتی

ہیں۔ دوسرے یہ اس بات کا ثبوت ہوتی ہیں کہ وہ شخص ضرور کوئی نیک تغیر دنیا میں پیدا کر کے چھوڑے گا۔

نیک کاموں کی تعریف تو اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جو ہر عُسر اور یُسر کی حالت میں نیکی پر قائم رہتے ہیں؟ ایسے لوگ تو کم ملتے ہیں جو یہ کہیں کہ سچ بولنا ضروری نہیں۔ لیکن ایسے لوگ بھی بہت کم ہیں جو سو فیصدی سچ بولیں۔ دنیا کے اکثر لوگ امانت کی تعریف کرتے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جن کو ان کی ساری قوم بلا شک وشبہ امین قرار دیتی ہو؟ آخر ایک امر کو اچھا سمجھ کر اور اچھا قرار دے کر کیوں عمل کے وقت کمزوری دکھائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے کہ اس صداقت پر اس شخص کو پورا یقین نہیں ہوتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں پہلے شخص تھے جنہوں نے جن صداقتوں کو مانا ان پر عمل کیا۔ آپ نے صرف کہا ہی نہیں کہ سچ اچھا ہے بلکہ آپ نے سچ بولا بھی اور آپ نے صرف کہا ہی نہیں کہ امانت اچھی بات ہے بلکہ آپ نے امین بن کر دکھایا بھی۔ حتیٰ کہ مکہ کے لوگ جو خالص مادی دماغ رکھتے تھے اور اخلاق کی قدر بہت کم جانتے تھے پکار اٹھے کہ یہ امین وصدوق شخص ہے۔ (السیرة النبویة لابن هشام: حدیث بنیان الکعبة و حکم رسول اللہ) یہ گواہی معمولی گواہی نہیں سچ بولنا الگ امر ہے اور ساری قوم سے راستباز کا خطاب لے لینا اور امر ہے۔ امانت پر ثابت قدم رہنا اور ہے اور امین کا خطاب ساری قوم سے لے لینا اور بات ہے۔ ہر شخص کے قوم میں دشمن بھی ہوتے ہیں اور دوست بھی۔ نام ایک شخص اسی وقت پیدا کرتا ہے جب اس کا کمال اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ دشمن بھی اس کے انکار کی جرأت نہیں پاتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ مرتبہ پانا اس امر کا شاہد تھا کہ آپ کا سینہ نیکیوں کے لئے کھل گیا تھا اور جس کا سینہ نیکیوں کے لئے کھل گیا ہو اسے جھوٹ یا فریب کا الزام لگانا کتنا ظلم ہے اور ایسے آدمی سے اس کے دشمن ملک والوں کو کب تک دور رکھ سکتے تھے۔

انشراح صدر کے معنے یقین کامل کے دوسرے معنے سینہ کھلنے کے یقین کامل کے کئے گئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی صداقت پر جو یقین تھا وہ مخفی امر نہیں۔ جب مکہ کے لوگوں نے حضرت ابوطالب آپ کے چچا کو ڈرایا کہ اگر محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) بتوں کے خلاف کہنے سے باز نہ آئیں گے تو وہ ان کے اور ان کے حامیوں کے مٹا دینے کا فیصلہ کر لیں گے اور اگر وہ صرف بتوں کو برا کہنے سے باز آجائیں گے تو وہ اپنی قوم کی لیڈری، بادشاہت، اس کا مال، اس کی خوبصورت لڑکیاں جو کچھ بھی مانگیں قوم اسے حاضر کرنے کے لئے تیار ہوگی۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس شان سے جواب دیا کہ اے میرے چچا! آپ مجھے چھوڑ کر اپنی قوم کے ساتھ بے شک مل جائیں میں تو اس صداقت کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میری قوم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے

بائیں لا کھڑا کر دیں تب بھی خدائے واحد کی توحید کے اقرار سے نہیں رکوں گا۔ اور اس سچ کے اظہار سے باز نہیں آؤں گا۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: مبادأۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ وما کان منھم) یہ اعلان کیا بغیر ایک ایسے یقین کے ہوسکتا ہے جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہو۔ اسی طرح جب آپؐ غار ثور میں گھِر گئے، کفار نے آپ کا محاصرہ کرلیا اور بعض نے اندر گھس کر آپ کا پتہ لینا چاہا اور حضرت ابوبکرؓ کو اس بات کی فکر ہوئی کہ کہیں دشمن آپ کو پکڑ نہ لے تو آپ نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا غم مت کر یہ لوگ ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ (مجمع الزوائد باب الھجرۃ الی المدینۃ) جس وقت صرف دو غیر مسلح آدمی مسلح قوم کے نرغہ میں گھِرے ہوئے ہوں اس وقت اپنے صاف بچ کر نکل جانے اور کامیاب ہونے کا اعلان اس شخص کے سوا جو خدا تعالیٰ کی تائیدات کا عینی مشاہدہ کر چکا ہو کون کرسکتا ہے اور یہ وہ امور ہیں جو صرف مسلمان ہی نہیں بیان کرتے تھے بلکہ کفار مکہ بھی ان امور کی تصدیق کرتے تھے۔ امین وصدوق کا خطاب انہوں نے خود آپ کو دیا تھا۔ غار ثور کا واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا، ابوطالب کے ساتھ آپ کی گفتگو ان کے اپنے آدمیوں کے سامنے ہوئی تھی اور ایسے ہی اور واقعات جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیکی آپ کے یقین اور آپ کے ایمان کا ثبوت ملتا تھا۔ روزِ اوّل سے ان لوگوں کے مشاہدہ میں آتے رہے تھے اور وہ ان کا مشاہدہ کرتے رہے تھے۔ پس اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کہہ کر قرآن کریم کا مکہ والوں پر حجت کرنا بالکل درست اور مطابق حقیقت تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیکی میں جو مقام حاصل تھا۔ خدا تعالیٰ پر جو یقین تھا۔ خدا تعالیٰ کے نشانات پر جو ایمان تھا وہ اس بات کا یقیناً ضامن تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پاگل نہ تھے۔ آپ غیر ذمہ دار شخص نہ تھے۔ آپ ارادہ کر کے اس سے ہٹنے والے نہ تھے۔ آپ کسی وقتی خیال کے مطابق کام نہیں کر رہے تھے بلکہ کوئی زبردست نشان آپ نے دیکھا تھا جس نے آپ کے ایمان کو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط کر دیا تھا۔ ایسے شخص کے جیتنے میں کسی کو کیا شبہ ہوسکتا تھا؟ یہ سوال تھا جس کا جواب آپ کے مخالفوں کے ذمہ تھا اور یقیناً اس سوال کا جواب دینے سے وہ گھبراتے بھی تھے اور کتراتے بھی تھے۔

انسانی کامیابی کا مدار یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی کامیابی کا پہلا مدار خود اس کے یقین پر ہوتا ہے۔ کوئی انسان دنیا میں کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اسے اپنے دعویٰ پر یقین نہ ہو۔ بلکہ اگر روحانیات کو جانے دیں اور مادیات کو لے لیں تب بھی کوئی انسان کسی کام کے لئے سنجیدگی سے کوشش نہیں کرسکتا جب تک اسے اپنے نفس پر یقین نہ ہو۔ جب کسی کو یقین حاصل ہو جائے تو چاہے وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو وہ اُس کو پورا کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ جب کسی امر کے متعلق عارضی یقین انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تب بھی کوشش شروع کر دیتا ہے اور

بعض دفعہ تو عارضی یقین ہی نہیں عارضی شک بھی اگر انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ کوشش شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ عرب میں ایک نیم پاگل لڑکا تھا۔لڑکے اسے چھیڑتے اور تنگ کرتے رہتے۔ جب وہ بہت ہی اکتا جاتا اور دیکھتا کہ یہ تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تو چونکہ وہ اپنے ہم عمروں کی فطرت کو خوب سمجھتا تھا جھوٹے طور پر کہہ دیتا کہ فلاں شخص کے ہاں آج دعوت ہے تم مجھے بے شک چھیڑتے رہو۔ کھانا تو تمہارا ہی خراب ہوگا۔ اہل عرب میں مہمان نوازی کا مادہ بہت زیادہ پایا جاتا تھا اور ان میں دستور تھا کہ عام طور پر بڑے بڑے رؤسا اونٹوں کو ذبح کر کے عام لوگوں کو دعوت دے دیتے کہ آؤ اور کھانا کھاؤ۔ ان دعوتوں کا وہ طریق نہ تھا جو ہمارے ہاں ہے کہ مخصوص طور پر بعض لوگوں کو دعوت کے لئے نامزد کیا جاتا ہے بلکہ ان کی دعوتوں میں شمولیت کے متعلق کسی قسم کی شرط نہیں ہوتی تھی جو شخص بھی چاہتا شریک ہو جاتا۔ جب کسی ایسی دعوت کی وہ ان لڑکوں کو خبر دے دیتا تو یہ سنتے ہی لڑکے اسے چھوڑ دیتے اور اس رئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتے۔ جب وہ اکیلا رہ جاتا تو اس کے دل میں شبہ پیدا ہوتا کہ شاید واقعہ میں اس کے ہاں دعوت ہو اگر ایسا ہی ہوا تو یہ بڑی بری بات ہوگی کہ میں نے لڑکوں سے مار بھی کھائی اور دعوت سے بھی محروم رہا۔ چنانچہ اس خیال کے آنے پر دس پندرہ منٹ کے بعد وہ خود بھی اسی مکان کی طرف دوڑ پڑتا۔ راستہ میں لڑکے مایوس ہو کر واپس آ رہے ہوتے تھے۔ وہ اسے پکڑ لیتے اور خوب پیٹتے کہ تو نے ہمیں بڑا دھوکا دیا ہے۔ یونہی جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ فلاں رئیس کے ہاں دعوت ہے حالانکہ وہاں کوئی دعوت نہ تھی۔ اس پر اُسے پھر شرارت سوجھتی اور کہتا کہ اس کا نام تو میں نے یونہی لے دیا تھا اصل بات یہ ہے کہ فلاں رئیس کے ہاں دعوت ہے۔ اس دفعہ لڑکوں کو پھر یقین آ جاتا اور وہ دوسرے رئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتے۔ جب لڑکے چلے جاتے تو بعد میں پھر اس کے دل میں خیال آتا کہ اگر اس کے ہاں واقعہ میں دعوت ہوئی تو میرے ساتھی تو دعوت کھا جائیں گے اور میں محروم رہ جاؤں گا۔ چنانچہ اس خیال کے ماتحت وہ بھی اس رئیس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتا۔ اتنے میں لڑکے غصہ سے بھرے ہوئے واپس آ رہے ہوتے تھے وہ اسے پکڑ لیتے اور پیٹنا شروع کر دیتے۔ چنانچہ اسی واقعہ کی وجہ سے عربوں میں شدتِ حرص کو بیان کرنے کے لئے اس لڑکے کے نام پر مثال بیان کی جانے لگی۔

اب دیکھو وہ لڑکا جھوٹ بولتا تھا مگر جھوٹ بتا کر بھی اس کے دل میں خیال پیدا ہو جاتا تھا کہ شاید یہ بات ٹھیک ہی ہو اور وہ خود بھی اسی طرف دوڑ پڑتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر کوشش یقین کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ آگے جیسا جیسا یقین ہو انسانی کوشش اور جدوجہد بھی مختلف رنگ اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ تھوڑا یقین ہو تو اس کے مطابق کوشش ہوگی اور زیادہ یقین ہو تو اس کے مطابق کوشش ہوگی۔

یقین کے تین مراتب قرآن کریم نے یقین کے مختلف مدارج بیان کئے ہیں یوں تو اس کے ہزاروں مدارج ہیں مگر موٹے موٹے تین مدارج ہیں۔علم الیقین ،عین الیقین ،حق الیقین ۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابوں میں جو خاص اصولی مضامین ہیں ان میں سے ایک یہ بھی مضمون ہے جو مراتب یقین کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمایا (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۰۲)۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پہلے صوفیاء کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ۔ پہلے صوفیاء کی کتابوں میں بھی بے شک اس کا ذکر ملتا ہے مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون میں جو جدتیں پیدا کی ہیں وہ ان لوگوں کی تشریحات میں نہیں ہیں ۔بعض لوگ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ یہ باتیں تو امام غزالی کی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں یا فلاں فلاں مضامین انہوں نے بھی بیان کئے ہیں ۔جیسے ڈاکٹر اقبال نے کہہ دیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس قسم کے مضامین صوفیاء کی کتابوں سے چرائے تھے ۔حالانکہ اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو دونوں کے تقابل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے مضمون میں وہ باریکیاں پیدا نہیں کیں جو ایک ماہر فن پیدا کیا کرتا ہے اور نہ مضمون کی نوک پلک انہوں نے نکالی ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جس مضمون کو بھی لیا ہے ایک ماہر فن کے طور پر اس کی باریکیوں اور اس کے خدو خال پر پوری تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور کوئی پہلو بھی تشنۂ تحقیق رہنے نہیں دیا اور یہی ماہر کا کام ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے نمایاں کام کر کے دکھا دیتا ہے۔مثلاً تصویر کھینچنا بظاہر ایک عام بات ہے ہر شخص تصویر کھینچ سکتا ہے میں بھی اگر پنسل لے کر کوئی تصویر بنانا چاہوں تو اچھی یا بری جیسی بھی بن سکے کچھ نہ کچھ شکل بنا دوں گا۔مگر میری بنائی ہوئی تصویر اور ایک ماہر فن کی بنائی ہوئی تصویر میں کیا فرق ہوگا ؟ یہی ہوگا کہ ماہر فن اس کی نوکیں پلکیں خوب درست کرے گا اور میں صرف بے ڈھنگی سی لکیریں کھینچ دینے پر اکتفا کروں گا۔ پس کسی مضمون کا خالی بیان کر دینا اور بات ہوتی ہے اور اس کی نوک پلک درست کر کے اسے بیان کرنا اور بات ہوتی ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گو بعض جگہ وہی مضامین لئے ہیں جو پرانے صوفیاء بیان کرتے چلے آئے تھے مگر آپ کے بیان کردہ مضامین اور پہلے صوفیاء کے بیان کردہ مضامین میں وہی فرق ہے جو ایک اناڑی اور ماہر مصور کی بنائی ہوئی تصاویر میں ہوتا ہے۔انہوں نے تصویر اس طرح کھینچی ہے جیسے ڈرائنگ کا ایک طالب علم کھینچتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تصویر اس طرح کھینچی ہے جیسے ایک ماہر فن تصویر کھینچ کر اپنے کمالات کا دنیا کے سامنے ثبوت پیش کرتا ہے اور پھر ہر بات پر قرآن کریم سے شواہد پیش کر کے بتایا ہے کہ اس مضمون کا بتانے والا قرآن کریم ہے۔

علم الیقین کے بعد عین الیقین ہوتا ہے کہ انسان ایک بات خود دیکھتا ہے لیکن ایسے طور پر کہ شبہ کی گنجائش نہ ہو جیسے دور سے دھواں دیکھ کر آگ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کا درجہ حق الیقین کا ہے جیسے کہ کوئی شخص آگ میں انگلی ڈال کر اس کے جلانے والے اثرات کو خود دیکھ لیتا ہے۔

انبیاء کو ان کے اپنے دعووں پر ایمان لانے کا حکم دینے کی وجہ ان تین مدارج میں سے سب سے مکمل درجہ حق الیقین کا ہے جس کے اندر شک وشبہ کا کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اور یہی مقام رسولوں کو حاصل ہوتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بوجہ سید الانبیاء ہونے کے سب سے زیادہ حاصل تھا۔ اسی درجہ یقین کی وجہ سے جب بھی کوئی رسول آیا اللہ تعالیٰ نے اسے پہلے یہی کہا کہ تو خود اپنے دعوے پر ایمان لا اور پھر اسے لوگوں کے سامنے پیش کر۔ گویا الٰہی سنت جو سلسلہ انبیاء پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ پہلے خود نبی کے دل میں یقین پیدا کیا جاتا ہے اور پھر اُسے لوگوں کی ہدایت کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو قرآن کریم میں اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (الانعام: ۱۶۴) کے الفاظ آتے ہیں ان کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہمارا پہلا کام تیرے دل میں یقین پیدا کرنا ہے۔ اگر تیرے دل میں دُبدہ اور شک رہے گا تو تُو اس کام کے لئے وہ کوشش نہیں کر سکے گا جس کوشش کے بغیر یہ کام اپنی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ غلطی سے اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ (الاعراف: ۱۴۴) یا اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ کہنے کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور وہ اعتراض کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ اپنے دعوے پر آپ ایمان لانے کے کیا معنے ہوئے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اس یقین کے بغیر کوئی شخص دوسروں کو شکوک وشبہات سے نجات نہیں دلا سکتا۔ وہی شخص دوسروں کے دل میں یقین پیدا کر سکتا ہے جس کے دل میں خود یقین موجود ہو اور وہی شخص دوسروں کو روحانی لحاظ سے منور کر سکتا ہے جس کے دل میں خود نورِ ایمان موجود ہو اور انشراح صدر سے مراد یہ آخری قسم کا یقین ہی ہوتا ہے جو حق الیقین کہلاتا ہے اور اسی یقین کے پیدا کرنے کے لئے انبیاء کو اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ کہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ درحقیقت بڑے کام بغیر اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ہونے کے ہو ہی نہیں سکتے۔ جو شخص اپنے کام کے متعلق یقین ہی نہیں رکھتا ایسا یقین جو ہر قسم کے شکوک وشبہات سے منزہ ہو وہ دوسروں کو کیا ہدایت دے سکتا ہے۔ پس اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ کہنا کوئی معمولی فقرہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑی دلیل ہے جس کا انبیاء اور خدا تعالیٰ کے مقربین کی زبان سے اظہار ہوتا ہے۔ یہی ایمان ہے جو دوسروں کے شکوک کو مٹاتا اور ان کو بھی یقین کی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

آنحضرت صلعم اور حضرت موسیٰؑ کے مقام میں ایک امتیاز پھر یہ بھی سوچو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو دعا

کرتے ہیں کہ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ (طٰہٰ:۲۶) اے میرے رب میرا سینہ کھول دے۔جس کے معنے یہ ہیں کہ خدایا مجھے وہ یقین حاصل ہوجائے جس کے بعد میں یہ سمجھوں کہ اگر یہ کام نہ ہوا تو میرا قصور ہے لیکن اس کے مقابلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے یہ چیز تجھے دے دی ہے اور نہ صرف تجھے دے دی ہے بلکہ تو بھی جانتا ہے کہ ہم یہ چیز تجھے دے چکے ہیں۔یعنی ایسے رنگ میں یہ چیز تجھے دی ہے کہ تجھ پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے۔کیونکہ انکارِ ابطالی اسی وقت استعمال ہوتا ہے جب مخاطب اس امر سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ورنہ بعض کمالات انسان میں موجود ہوتے ہیں مگر وہ ان سے واقف نہیں ہوتا۔یہ صاف بات ہے کہ وراء الادراک امور پر یقین کامل بغیر تجلی کے نہیں ہوسکتا۔

اگر کوئی مادی چیز ہو اور وہ کسی انسان کو مل جائے مثلاً روٹی مل جائے یا روپیہ مل جائے تو اس پر یقین لانے کے لئے کسی تجلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔انسان جانتا ہے کہ فلاں چیز مجھے مل گئی ہے لیکن یہاں جس چیز کے ملنے کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ مادی نہیں بلکہ روحانی ہے اور روحانی چیز پر یقین اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی متواتر تجلیات انسان کو حق الیقین کے مقام پر لا کر کھڑا نہ کر دیں۔درحقیقت یقین کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔کبھی یقین کسی مادی چیز کے متعلق ہوتا ہے اور کبھی روحانی چیز کے متعلق کبھی غیر معمولی طور پر مضبوط یقین انسان کو حاصل ہوتا ہے اور کبھی یقین تو ہوتا ہے مگر ذرا سی بات پر انسان شکوک وشبہات میں مبتلا ہوجاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے مجھے یقین ہے مگر یہ نہیں سمجھتا کہ اس کا یقین غیر متزلزل یقین نہیں۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک لڑکی جس کا نام مَیستی تھا وہ ایک دفعہ شدید بیماری ہوئی اور اس کی بیماری روز بروز تشویش ناک صورت اختیار کرتی چلی گئی۔اس کی والدہ روزانہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کرتی تھی کہ الٰہی اگر ملک الموت نے روح قبض ہی کرنی ہے تو میری روح قبض کر لے میری لڑکی کو کچھ نہ کہے۔اتفاقاً ایک رات اس کی گائے کھلی رہ گئی۔اس نے صحن میں اِدھر اُدھر پھر کر برتنوں میں منہ ڈالنا شروع کر دیا۔اسی دوران میں اسے ایک گھڑا نظر آیا جس میں چھان پڑا ہوا تھا اس نے گھڑے میں منہ ڈال دیا اور جب اس نے دو چار لقمے لینے کے بعد اپنے سر کو باہر نکالنا چاہا تو وہ باہر نہ نکال سکی اس کا سر گھڑے میں پھنس کر رہ گیا۔اس پر وہ گھبرا کر صحن میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔لڑکی کی ماں نے شور سنا تو وہ بھی جاگ اٹھی مگر سمجھ نہ سکی کہ یہ چیز کیا ہے۔اس نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو یہ ملک الموت ہے جو میری روح قبض کرنے کے لئے آیا ہے کیونکہ میں روزانہ یہ دعا کیا کرتی ہوں کہ یا اللہ میں مر جاؤں اور مَیستی بچ جائے۔

جب اس خیال کے نتیجہ میں اسے اپنی موت بالکل سامنے نظر آئی تو وہ بے اختیار کہنے لگی ؎

ملک الموت من نہ میستی ام من یکے پیر زال محنتی ام

گر ترا میستی است اندر کار اینک او را ببر مرا بگذار

ملک الموت میں میستی نہیں میں تو ایک بڑھیا مزدور عورت ہوں میستی تو وہ اندر لیٹی ہوئی ہے تو نے اگر جان نکالنی ہے تو اس کی نکال لے۔

اب دیکھو وہ اپنے دل میں روزانہ یہ سمجھتی تھی کہ میں میستی کے لئے جان دے سکتی ہوں مگر وہ یقین اس حد تک نہیں تھا کہ موت کے سامنے آنے پر بھی قائم رہتا۔ جب اسے اپنی موت سامنے نظر آئی وہ اپنے تمام دعاوی محبت کو بھول گئی اور لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی کہ میستی تو وہ ہے اس کی جان نکال لے۔ تو بسا اوقات انسان سمجھتا ہے کہ مجھے یقین حاصل ہے مگر دراصل اُسے غیر متزلزل یقین حاصل نہیں ہوتا اور جس چیز کو وہ یقین قرار دے رہا ہوتا ہے وہ اس کے نفس کا دھوکا ہوتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شک یقین حاصل تھا مگر آپ کو کس طرح پتہ لگ سکتا تھا کہ میرا یقین اب کسی بڑی سے بڑی مشکل کے آنے پر بھی بدل نہیں سکتا۔ اسی وقت آپ کو اس حقیقت کا علم ہو سکتا تھا۔ جب امر غیب کو امر ظاہر بنا دیا جاتا اور اللہ تعالیٰ کی متواتر تجلیات آپ کو اس مقام پر کھڑا کر دیتیں جس کے بعد کسی تزلزل یا کسی جنبش قدم کا امکان بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پس چونکہ وراء الادراک امور پر یقین کامل تجلی کے بغیر نہیں ہو سکتا اس لئے یہ آیت قطعی طور پر اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی متواتر تجلیات آپ پر ہو چکی تھیں اور آپ ایسے یقینی شواہد حاصل کر چکے تھے کہ جن کی بناء پر آپ سمجھتے تھے کہ جس طرح میں نے سورج کو دیکھا ہے، میں نے چاند کو دیکھا ہے، میں نے زمین اور آسمان کو دیکھا ہے اسی طرح میں نے اپنے رب کی متواتر تجلیات کو مشاہدہ کیا ہے جس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ میرے دل سے اس یقین کو نکالا جا سکے۔ پس اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت تک آپ پر متواتر تجلیات ہو چکی تھیں ورنہ خدا تعالیٰ یہ کس طرح کہہ سکتا تھا کہ ہم نے تیرا سینہ کھول دیا ہے اور اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تو بھی جانتا ہے کہ تیرا شرح صدر ہو چکا ہے۔ پس یہ آیت صرف اس مضمون کی حامل نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شرح صدر ہوا بلکہ ایک زائد بات اس میں یہ بھی پائی جاتی ہے کہ آپ پر امر نبوت تجلیات الٰہیہ کے ذریعہ اتنا واضح ہو چکا تھا کہ آپ یہ کہنے کے لئے بھی تیار تھے کہ بے شک میں مانتا ہوں کہ مشکلات آئیں گی مگر میں مٹ نہیں سکتا۔ مشکلات میرے پائے ثبات کو جنبش میں نہیں لا سکتیں۔ چنانچہ آنے والے واقعات نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ آپ میں اس قسم کا یقین تھا اور الٰہی تجلیات نے آپ کو

ایسے مقام پر کھڑا کر دیا تھا کہ کوئی چیز آپ کو ہلا نہ سکی۔ چنانچہ میں اس کے ثبوت میں سات مثالیں پیش کرتا ہوں۔

آنحضرتؐ کے دل میں حق الیقین پیدا ہونے کی سات مثالیں

(۱) پہلی مثال ابوطالب کا واقعہ ہے۔ مکہ کے بڑے بڑے رؤساء ان کے پاس آئے اور انہوں نے کہا ہم اس غرض کے لئے آئے ہیں کہ آپ اپنے بھتیجے کو ہماری طرف سے یہ پیغام پہنچا دیں کہ اگر وہ دولت کا خواہش مند ہے تو ہم اس کو اتنی دولت دینے کے لئے تیار ہیں کہ وہ ہم سب میں سے زیادہ امیر ہو جائے۔ اگر وہ حسین بیوی کا شائق ہے تو ہم عرب کی سب سے زیادہ حسین لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کرنے کے لئے تیار ہیں اور اگر وہ حکومت اور ریاست کا شوق رکھتا ہے تو ہم اسے اپنا بادشاہ ماننے کے لئے تیار ہیں۔ غرض اس کی ہر خواہش اور مطالبہ کو ماننے کے لئے ہم تیار ہیں۔ وہ صرف اتنی بات مان لے کہ ہمارے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے۔ اب اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یقین میں ذرا بھی تذبذب ہوتا یا لالچ کا کوئی ایک محرک بھی آپ کے قلب میں پایا جاتا تو آپ اس پیغام پر خوش ہوتے اور کہتے چلو اچھا ہوا مقصد حاصل ہو گیا۔ مجھے دولت چاہیے تھی سو اس ذریعہ سے دولت آ رہی ہے۔ مجھے بیوی چاہیے تھی سو اس ذریعہ سے حسین ترین لڑکی مل رہی ہے۔ مجھے قوم کی سرداری چاہیے تھی سو وہ بھی حاصل ہو رہی ہے۔ اگر میں بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دوں تو اس میں میرا کیا حرج ہے۔ مگر آپ یہ جواب نہیں دیتے کہ بہت اچھا میں تمہارے مطالبہ کو مان لیتا ہوں تم مجھے دولت دے دو۔ مجھے ریاست دے دو۔ مجھے حسین ترین لڑکی دے دو میں بتوں کو برا بھلا کہنا ترک کر دیتا ہوں۔ بلکہ آپ اپنے چچا کو یہ جواب دیتے ہیں کہ اے میرے چچا! اگر میری قوم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دے تب بھی میں اپنے عقائد پر قائم رہوں گا اور ایک شوشہ بھر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوں گا۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: مبادأۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ وما کان منھم) دیکھو یہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی صداقت کا کتنا بڑا ثبوت ہے کہ آپ کو بڑے سے بڑا لالچ دیا گیا مگر آپ نے پرِ پشہ کے برابر بھی اُن چیزوں کو کوئی وقعت نہ دی اور فرمایا کہ مجھے جس کام کے لئے خدا نے کھڑا کیا ہے وہ میں مرتے دم تک کرتا چلا جاؤں گا اور میں اس سے نہیں ہٹوں گا خواہ مکہ والے سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دیں۔

(۲) ہجرت کے وقت گھر سے نکلنے کا واقعہ بھی اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم ہو چکا تھا کہ باہر کفار کھڑے ہیں۔ آپ کو یہ علم ہو چکا تھا کہ وہ قتل کے ارادہ سے آئے ہیں مگر چونکہ خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ یہ کفار خواہ تیری ہلاکت کے کتنے بڑے منصوبے کریں وہ تجھے قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ذرا بھی گھبراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ آپ

نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے گھر سے نکلے اور بڑی دلیری سے کفار کے گھیرے میں سے نکل گئے۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے، اس کے قدم لڑکھڑا جاتے اور وہ سخت پریشان ہوتا کہ اب میں کیا کروں (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم و استخلافہ علیًا علی فراشہ)۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہایت جرأت کے ساتھ دشمن کی قطار کے سامنے سے گزر گئے۔ میں نے حضرت خلیفہ اوّلؓ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے ایک روایت میں ہے کہ ان میں سے ایک شخص نے بعد میں بتایا کہ میں نے رات کو آپ کے مکان میں سے ایک شخص کو نکلتے تو دیکھا تھا مگر میں نے خیال کیا کہ یہ کوئی اور شخص ہوگا۔ چنانچہ میں نے اسے دیکھ کر اپنا منہ پرے کر لیا تا ایسا نہ ہو کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جا کر یہ بتا دے کہ باہر قتل کے ارادہ سے کئی لوگ کھڑے ہیں (مجھے خود اب تک کسی کتاب میں یہ حوالہ نہیں ملا)۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ بغیر کسی گھبراہٹ کے نہایت جرأت کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے۔ آپ کے قدم نہایت مضبوطی سے پڑ رہے تھے۔ آپ کے چہرہ پر بشاشت اور اطمینان کے آثار تھے اور دشمن یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اتنی جرأت کے ساتھ گھر سے نکلنے والا وجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو سکتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو دشمن کو دیکھتے ہی چکرا کر گر پڑتا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ذرا بھی پروا نہ کی کیونکہ آپ کے دل میں یہ یقین کامل تھا کہ کفار مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔ خدا تعالیٰ کی حفاظت میرے ساتھ ہے اور وہ اپنے وعدہ کو بہرحال پورا کرے گا۔ پس ہجرت عن الدار کا واقعہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ کی صداقت کا ایک اہم ثبوت ہے۔

(۳) تیسرا واقعہ غار ثور کا ہے۔ دشمن سر پر آ پہنچا ہے۔ ابوبکرؓ گھبرا رہے ہیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبۃ:۴۰) گھبرانے کی کون سی بات ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی معیت کے ہوتے ہوئے یہ لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ آتے ہیں اور خائب و خاسر چلے جاتے ہیں یہ کمال یقین ہی تھا کہ دشمن سر پر کھڑا ہے اس کی آوازیں کانوں میں پہنچ رہی ہیں مگر آپ فرما رہے ہیں لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔

(۴) چوتھا واقعہ اُحد کا ہے۔ اس جنگ میں ایک غلطی کی وجہ سے اکثر صحابہؓ میدانِ جنگ سے بھاگ گئے تھے۔ دشمن تین ہزار کی تعداد میں تھا وہ حملہ کرتے ہوئے آگے بڑھا مگر باوجود اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بہت کم صحابہؓ تھے آپ دشمن کے ریلے کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہلے اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ آپ بالکل اکیلے رہ گئے اور یہی وہ وقت تھا جب آپ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور خود بھی زخمی ہو کر ایک گڑھے میں جا گرے۔ ایسے موقع پر طبعی طور پر انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ میں کسی پتھر کے پیچھے چھپ جاؤں تا کہ دشمن

کے حملہ سے محفوظ رہوں۔مگر آپ کھڑے رہے اور کھڑے رہے اور کھڑے رہے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ میں نے لوگوں کے ہاتھ سے مرنا تو ہے ہی نہیں۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ مجھے ہلاک کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدة:٦٨) خدا تعالیٰ میری حفاظت کرے گا اور وہ مجھے قتل سے محفوظ رکھے گا۔ یہ وعدہ بہرحال پورا ہوگا اور دشمن اپنے ارادوں میں ناکامی کا منہ دیکھے گا۔ پس احد کا واقعہ بھی اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

(۵) پانچواں واقعہ غزوۂ غطفان کا ہے۔ایک شخص نے ارادہ کیا کہ وہ آپ کو قتل کئے بغیر گھر واپس نہ جائے گا۔ وہ چھپتا چھپتا اسلامی لشکر کے پیچھے چلا آیا تا کہ موقع ملنے پر آپ پر حملہ کرے مگر اسے کوئی موقعہ نہ ملا۔ یہاں تک کہ صحابہؓ مدینہ کے قریب جا پہنچے۔ وہ چونکہ مسلمانوں کا اپنا علاقہ تھا صحابہؓ نے احتیاط کا پہلو پوری طرح ملحوظ نہ رکھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت صحابہ دور دور پھیل گئے اور مختلف درختوں کے نیچے چادریں تان کر سو گئے۔اس نے یہ موقع غنیمت سمجھا آگے بڑھا اور جس درخت کے نیچے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سو رہے تھے وہاں پہنچ کر اس نے درخت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تلوار اتار لی اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جگا کر کہا بتاؤ اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی تذبذب کے لیٹے لیٹے نہایت اطمینان اور یقین کے ساتھ فرمایا اَللّٰهُ۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات ہے تم خود کسی دشمن کے سامنے اَللّٰهُ کہہ کر دیکھو اس پر کوئی بھی اثر نہیں ہوگا۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وثوق اور ایمان اور یقین کے ساتھ اَللّٰهُ کہا وہ ایسا زبردست تھا کہ دشمن نے صرف آپ کی زبان سے اَللّٰهُ کا لفظ نہیں سنا بلکہ اس نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ کھڑا ہے۔اس کا ہاتھ کانپ گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً تلوار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا اب بتاؤ تم کو کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ آپ ہی رحم کریں تو کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔افسوس تم نے سن کر بھی سبق حاصل نہ کیا۔تم کہہ سکتے تھے کہ اللہ مجھے بچا سکتا ہے مگر تم نے میری زبان سے یہ بات سننے کے باوجود اللہ کا لفظ استعمال نہ کیا (صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ ذات الرقاع)۔

اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس پر حجت تمام کردی اور بتادیا کہ تم یہ نہ سمجھو میں نے بناوٹ کے ساتھ اللہ کہا تھا۔ اگر میں بناوٹ کے ساتھ کہتا تو تم بھی ایسا کہہ سکتے تھے بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ قریب ترین عرصہ میں تمہارے سامنے میں نے اللہ تعالیٰ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا اور تم نے دیکھ لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ

نے میری حفاظت فرمائی اور تمہارے حملہ سے اس نے مجھے محفوظ رکھا۔ مگر تم پھر بھی اللہ کا لفظ اپنی زبان پر نہ لا سکے۔ جو ثبوت ہے اس بات کا کہ گھبراہٹ کے موقع پر تصنّع اور بناوٹ سے اللہ کا لفظ زبان پر نہیں آ سکتا۔ یہ آتا ہے تو اسی حالت میں جب انسان کے رگ و ریشہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہو چکی ہو اور وہ سورج سے بھی زیادہ یقینی دلائل سے اس یقین پر قائم ہو چکا ہو کہ میرا رب مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ پس یہ واقعہ بھی اس شرح صدر کا ایک بیّن ثبوت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔

(۶) چھٹا واقعہ غزوۂ خندق کا ہے۔ دشمن آیا اور اس نے مدینہ کا چاروں طرف سے احاطہ کر لیا۔ قرآن کریم نے اس محاصرہ کا سورۂ احزاب میں نہایت ہی اعلیٰ نقشہ کھینچا ہے۔ جب دشمن سمجھتا تھا کہ میں نے مسلمانوں کو مار لیا۔ اس وقت مومن بندے کہہ رہے تھے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کی باتیں پوری ہو گئیں۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا (الاحزاب: ۲۳) بجائے گھبرانے کے وہ خوش خوش پھرتے تھے کہ خدا نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا۔ یہ بھی ثبوت ہے اس شرح صدر کا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ کیونکہ اگر آپ کو شرح صدر نہ ہوتا تو آپ کے ماننے والوں کے دلوں میں یہ غیر معمولی یقین خدائی دعووں پر کس طرح پیدا ہو جاتا کہ دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے ہے اور وہ خوش ہو رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی باتیں پوری ہو گئیں۔

(۷) ساتواں واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب مسیلمہ کذاب اپنے قبیلہ کے سرکردہ لوگوں کو لے کر آپ کے پاس آیا۔ اس کی پشت پر اس کی قوم کا ایک لاکھ سپاہی تھا۔ سرداران قوم نے کہا یا رسول اللہ ہم آپ کو مان چکے ہیں اور آپ کی بیعت بھی کر چکے ہیں مگر اب ہماری قوم کا ایک فرد کہتا ہے کہ تم مجھے مانو۔ ہم اسے آپ کے پاس لے آئے ہیں تا کہ آپس میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور یہ فتنہ بڑھنے نہ پائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر مل چکی تھی کہ آپ کی وفات قریب ہے۔ ادھر عرب میں سے سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ تعداد رکھنے والا قبیلہ آپ کے پاس وفد لایا اور کہا کہ مسیلمہ کو بھی الہام ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے مجھے مان لو۔ ہم اسے آپ کے پاس اس لئے لائے ہیں تا کہ آپ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیلمہ سے فرمایا کہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا پہلے آپ بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں یہی چاہتا ہوں کہ مجھے رسول مانا جائے اور میری اطاعت اختیار کی جائے۔ مسیلمہ نے کہا ہم آپ کو بے شک رسول مانتے ہیں مگر ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ اپنی وفات کے بعد جب کہ آپ کو اس معاملہ سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی (کیونکہ آپ

کی نرینہ اولاد نہ تھی) مجھے اپنا خلیفہ مقرر کر دیں۔اس نے اپنی طرف سے سمجھوتہ کے لئے نہایت ہی نرم شرط آپ کے سامنے پیش کی۔ایک لاکھ سپاہی اس کی پشت پر تھا اور اس نے صرف یہ مطالبہ کیا کہ مجھے وفات کے بعد خلیفہ بنا دیا جائے۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب یوں دیا کہ ایک تنکا اٹھایا اور فرمایا کہ خلافت تو الگ رہی یہ تنکا بھی تمہیں نہ دیا جائے گا اور میرے معاملہ میں وہی ہوگا جو خدا تعالیٰ چاہے گا یعنی وہی شخص خلافت کے مقام پر کھڑا ہوگا جس کو خدا تعالیٰ خود کھڑا کرنا چاہے گا۔تم ان معاملات میں دخل دینے والے کون ہو۔مسیلمہ غصہ اور ناراضگی کی حالت میں واپس چلا گیا اور اپنی قوم سمیت اسلام سے مرتد ہو گیا۔جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وفات پا گئے تو وہ ایک لاکھ سپاہی اپنے ساتھ لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا اور اس نے ایسا شدید حملہ کیا جس کی پہلے کسی حملہ میں مثال نہیں ملتی۔صحابہؓ اس جنگ میں اس طرح مارے گئے جس طرح چنے بھونے جاتے ہیں اور وہ شکست کھا کر واپس لوٹ گئے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس شکست کا اتنا صدمہ ہوا کہ آپ نے سرداران لشکر کو حکم دے دیا کہ ان میں سے کوئی شخص آئندہ مدینہ میں میرے سامنے نہ آئے۔یہ سزا جو ان سرداران لشکر کو دی گئی بتاتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس شکست کا کیسا صدمہ ہوا تھا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام :قدوم بنی حنیفۃ و معھم مسیلمۃ الکذاب)۔مگر باوجود اس کے خطرہ حقیقی تھا اور مسیلمہ اور اس کی قوم کا ارتداد بہت سی مشکلات کا موجب بن سکتا تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ تم خلافت مانگتے ہو تمہیں تو یہ تنکا بھی نہیں دیا جا سکتا۔یہ خدا تعالیٰ کی ایک امانت ہے اور اسی شخص کے پاس جائے گی جو اس امانت کا بہترین اہل ہو۔غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی شروع سے لے کر آخر تک اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کی صداقت کا ایک بیّن اور واضح ثبوت ہے۔ہر مقام پر آپ نے اس غیر متزلزل یقین کا ثبوت دیا جو آپ کو خدا تعالیٰ کی ذات پر تھا اور یہی یقین تھا جو مسیلمہ کذاب والے واقعہ میں کام کر رہا تھا۔آپ نے سمجھا جب خدا تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ ابوبکر خلیفہ بنے گا تو مسیلمہ اس کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتا ہے۔آپ نے اس مطالبہ کو رڈ کر دیا اور اس بات کی ذرا بھی پروا نہ کی کہ اس کے نتیجہ میں کیا کیا مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے جو مثالیں دی ہیں ان میں سے بعض اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کی ہیں۔لیکن میرا منشاء اس جگہ یہ بتانا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی اس آیت کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔شروع سے لے کر آخر تک آپ کی زندگی سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا سینہ اسلام اور اس کی تعلیم کے لئے کھول دیا تھا اور وہ آخر تک کھلا رہا۔

انشراح صدر سے مراد حفاظت سینہ دوسرے معنے شَرَحَ کے محفوظ رکھنے کے ہوتے ہیں۔ان معنوں کے رو سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ کیا ہم نے تیرے سینہ کو تیرے لئے محفوظ نہیں کر دیا۔سینہ یا دماغ جو چاہو کہہ لو (اس کے متعلق بحث اوپر گزر چکی ہے)انسانی تجارب کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ہر کام جو انسان کرتا ہے وہ اس کے دماغ میں محفوظ ہوجاتا ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا کَانَتْ نُکْتَۃٌ سَوْدَاءُ فِیْ قَلْبِہٖ فَاِنْ تَابَ وَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُہٗ فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰی یُغْلَفَ قَلْبُہٗ۔(تفسیر طبری سورۃ البقرۃ زیر آیت ختم اللہ علی قلوبھم)یعنی جب انسان کوئی کام کرتا ہے اگر نیک کام ہو تو اس پر ایک نیک نکتہ لگ جاتا ہے یعنی علاوہ اس نیک کام کا شرعی نتیجہ نکلنے کے اس کا ایک طبعی نتیجہ بھی نکلتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس شخص کے دل پر ایک نورانی نشان ڈال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ نیکیوں پر آئندہ زیادہ قادر ہوجاتا ہے اور جو کوئی بدی کرتا ہے اسے علاوہ شرعی سزا ملنے کے ایک طبعی نتیجہ اس شکل میں ملتا ہے کہ اس کے دل پر ایک سیاہ داغ ڈال دیا جاتا ہے اور آئندہ اس کے لئے بدی کا ارتکاب آسان ہوجاتا ہے۔اسی طرح یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر میں یا دل سارا سفید ہوجاتا ہے یا سارا سیاہ۔اس نکتہ کی طرف بھی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تیرے فائدہ کے لئے (لَكَ کا لام فائدہ کے معنے دیتا ہے) تیرا سینہ کھول دیا ہے یعنی وہ روحانی امور جو تیرے لئے نفع بخش ہوتے ہیں ان کے قبول کرنے کے لئے ہم نے تیرا سینہ محفوظ کر دیا ہے یعنی اس کے خلاف بدی کی کوئی تحریک تیرے سینہ میں داخل نہیں ہوسکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ تیرا سینہ نیکی کے لئے محفوظ رہنا چاہیے۔اس آیت کی تشریح خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے اِنَّ اللّٰہَ اَعَانَنِیْ عَلَیْہِ فَاَسْلَمَ فَلَا یَاْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ (صحیح مسلم کتاب صفات المنافقین احکامھم باب تحریش الشیطان و بعثہ سرایاہ) کہ میرا شیطان مسلمان ہوگیا ہے اور میرے دل میں صرف نیک تحریکات ہی ڈالتا ہے۔اس حدیث کے یہی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ کو آپ کے فائدہ والی چیزوں کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ہر وہ چیز جو آپ کے لئے مضر ہو اس میں داخل نہیں ہوسکتی تھی اور اگر کوئی بری بات آپ کے کان میں پڑے تو وہ نیک پہلو اختیار کر لیتی تھی۔جس طرح کہتے ہیں کہ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔یہ کتنا بڑا مقام ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔آپ کے دل میں جو خیال آتا نیک ہی آتا۔اگر بدی آپ کے سامنے آتی تو وہ بھی نیک شکل اختیار کر لیتی۔طائف کے لوگوں نے جب آپ پر پتھر مارے۔کتے آپ کے پیچھے ڈال دیئے تو اس شرارت نے غم و غصہ آپ کے دل میں پیدا نہیں کیا بلکہ آپ نے خدا تعالیٰ سے یہ دعا کرنی شروع کر دی کہ رَبِّ اِنَّ

قَوۡمِیۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ میرے اللہ ان کی اس بے ہودگی پر ناراض نہ ہونا ان کو معلوم نہیں کہ میں آپ کی طرف سے پیغامبر ہوں (صحیح مسلم کتاب الجهاد و السیر باب غزوة أحد)۔کیا ہی نیکی کا یہ نمونہ ہے جو آپ نے دکھایا۔کیا ایسے موقعہ پر کوئی بھی اپنے جذبات کو دبا کر رکھ سکتا ہے؟ منہ سے عفو کہنا الگ امر ہے مگر پتھراؤ ہو رہا ہے، کتے پیچھے ڈالے جا رہے ہیں اور ساتھ کے ساتھ آپ ان لوگوں کے لئے دعا کرتے جاتے ہیں۔ یہ وہ نمونہ ہے جس کی مثال صرف خدا رسیدہ لوگوں میں ہی مل سکتی ہے۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مقام سب سے بلند حاصل تھا اور اسی طرف اللہ تعالیٰ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ سے اشارہ فرماتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے تیرے سینہ کو ہر شر سے محفوظ کر دیا ہے۔صرف نیکیاں ہی اس میں جاسکتی ہیں۔کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ اب دنیا کی اصلاح تیرے ہی ذریعہ سے ہوگی اور جس طرح شیطان کو تیرے سینہ میں دراندازی سے روکا گیا ہے اسی طرح تیرے ذریعہ سے وہ دوسروں کے سینوں میں دراندازی سے روکا جائے گا۔یہ دلیل کس قدر شاندار اور واضح ہے۔بینا ہی نابیناؤں کی راہنمائی کرسکتا ہے۔ایک نابینا کس طرح راہنمائی کرسکتا ہے۔پس کامل راہنمائی دنیا کی ایسا ہی انسان کرسکتا ہے جس کا سینہ خدا تعالیٰ نے شیطان کے اثر سے محفوظ کر دیا ہو اور جس کا سینہ شیطانی اثرات سے محفوظ ہو۔اس کی بات کا انکار نیکی کا میلان رکھنے والے کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ مقناطیس سے لوہا الگ نہیں رہ سکتا اور کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔

انشراح صدر سے مراد حقائق اشیاء کے علم کے لئے دل کا کھل جانا تیسرے معنے شَرَحَ کے سمجھانے کے ہیں۔ان معنوں کے رو سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے تیرے دل میں حقائق اشیاء اتار دیئے اور خود تیرا استاد بن کر تجھ کو سمجھایا۔یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھانے اور حقیقت بتانے والا خود اللہ تعالیٰ تھا۔اس مضمون کی حقیقت ظاہر ہی ہے جس کا خدا تعالیٰ استاد ہو وہی روحانی دنیا میں استاد ہوسکتا ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں اس وقت لوگ حقیقت روحانیہ سے بالکل نابلد ہو چکے تھے اور دنیا محتاج تھی کہ پھر نئے سرے سے اللہ تعالیٰ کسی کا استاد بن کر اسے دنیا کے لئے استاد بنائے۔اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اور فرمایا گیا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تیرے دل کو خود حقائق روحانیہ سے آگاہ نہیں کیا۔یعنی ایسا کیا ہے اور جب خدا تعالیٰ نے تیرے دل پر نازل ہو کر اسے حقائق اشیاء سے آگاہ کیا ہے تو پھر تیرے سوا اور کون ہے جو گمراہوں کو ہدایت دے سکتا ہے اور تو ناکام کس طرح رہ سکتا ہے کیونکہ شاگرد کی ناکامی استاد کی ناکامی ہوتی ہے۔تو ناکام رہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا تعالیٰ نے جو تجھے سکھا کر دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا وہ ناکام

رہا اور یہ ہو نہیں سکتا۔ پس تو ضرور کامیاب ہو کر رہے گا۔

آنحضرتؐ کو علم خارجی کے علاوہ علم اندرونی کی موہبت اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کے ایک اور معنے بھی ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپ کی بلندیٔ درجات کا ایک کھلا ثبوت ہیں اور وہ معنے یہ ہیں کہ دنیا میں دو قسم کے علوم ہوتے ہیں۔ ایک علم خارجی ہوتا ہے اور ایک علم اندرونی ہوتا ہے۔ تکمیل علم کا انحصار انہی دو ملکوں پر ہوتا ہے اور یہ علم النفس کا ایک بہت بڑا نکتہ ہے جس سے بہت سے لوگ ناواقف ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ علم خارجی ہی اصل علم ہے۔ حالانکہ علم خارجی بہت محدود علم ہوتا ہے اور وہ مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ علم اندرونی بھی شامل نہ ہو۔ مثلاً میں اس وقت درس دے رہا ہوں اب اگر کوئی شخص ایسا ہو جسے اللہ تعالیٰ نے ملکۂ ادراک بخشا ہو اور علم قرآن کا چشمہ اس کے سینہ میں پھوڑا ہو تو وہ میرے اس درس کو سن کر نہ صرف دوسروں تک یہ تمام باتیں پہنچا دے گا بلکہ وہ انہی باتوں کے کئی ایسے جدید پہلو بھی بیان کر سکے گا جو قلت وقت کی وجہ سے بیان نہیں کئے جا سکے۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جو درس کو سن کر صرف اتنی قابلیت رکھتا ہو کہ اس درس کو من وعن بیان کر دے اس میں یہ قابلیت نہیں ہوگی کہ وہ جدید پہلو اپنی ذہنی قابلیت سے نکال کر بیان کر سکے۔ پھر کوئی ایسا ہوگا جو پورا درس بیان کرنے کی بھی قابلیت نہیں رکھے گا۔ وہ جو کچھ بیان کرے گا اصل درس کا ۳/۴ حصہ ہوگا اور کوئی ایسا ہوگا جو صرف آدھی باتیں بیان کر سکے گا اور کوئی ایسا ہوگا کہ اس سے پوچھو کہ درس میں کیا بیان ہوا تھا تو وہ کہہ دے گا قرآن کی کچھ تفسیر بیان کی گئی تھی مگر یاد نہیں رہی صرف اتنا یاد ہے کہ اچھا دلچسپ تھا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ عورتوں میں کچھ مدت تک سلسلہ تقاریر جاری رکھا۔ ایک دن آپ کو خیال آیا کہ عورتوں کا امتحان لینا چاہیے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ ہماری باتوں کو سمجھتی ہیں یا نہیں۔ ایک عورت جو بڑی مخلصہ تھیں اور نابھہ کی رہنے والی تھیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم ہماری تقریریں سنتی رہی ہو۔ اس نے کہا جی ہاں روزانہ تقریر سنتی رہی ہوں میں یہاں آئی ہی اس غرض کے لئے ہوں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اچھا بتاؤ میں کیا بیان کرتا رہا ہوں۔ اس نے جواب دیا بس اللہ اور رسول کی باتیں تھیں اور کیا تھا۔ یہ جواب جو اس عورت نے دیا اس کی وجہ یہی تھی کہ اندرونی علم اس کے اندر نہیں تھا۔ اس نے صرف خارجی علم پر انحصار رکھا اور سمجھا کہ میں بہت کچھ سمجھ رہی ہوں حالانکہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں رہی تھی۔ تو اندرونی علم کے بغیر کبھی کوئی شخص کسی بات کو صحیح طور پر دوسروں تک نہیں پہنچا سکتا۔ جب بھی کوئی بات بیان کی جاتی ہے ہمیشہ اس کے کچھ پہلو چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اگر سارے پہلو بیان کئے جائیں تو چند باتوں میں ہی عمر

گزر جائے اور علوم کا بہت سا حصہ نامکمل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کبھی کسی شخص نے بیان کامل نہیں کیا جو کچھ بیان کیا جاتا ہے ایک بیج کے طور پر ہوتا ہے جس سے ہر شخص اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی قابلیت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا کلام جب آسمان سے نازل ہوتا ہے کسی کے لئے وہ کلام اتنا ہی مفہوم رکھتا ہے جتنے اس کے الفاظ ہوتے ہیں۔ کسی کو آدھے الفاظ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، کسی کو چوتھے حصہ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور کسی شخص کے لئے وہ کلام ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے جیسے درخت کا بیج یا گٹھلی ہوتی ہے کہ اس میں سے شاخ در شاخ علوم نکلتے چلے آتے ہیں اور نئے سے نئی باتیں اس پر منکشف ہوتی جاتی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ کیا ہم نے تیرا سینہ وسیع نہیں کر دیا۔ یعنی اس چیز کے لئے تیرا سینہ بمنزلہ زرخیز زمین ہو گیا تھا۔ قرآن تو ایک گٹھلی تھی مگر تیرے سینہ میں وہ ایک درخت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اگر سینہ بھی گٹھلی کے برابر ہوتا تو قرآن کے صرف الفاظ ہی الفاظ تیرے پاس رہ جاتے۔ مگر چونکہ خدا نے تجھ کو ایک بہت بڑے کام کے لئے مقرر کیا تھا اور تجھے اس غرض کے لئے دنیا میں بھیجا گیا تھا کہ تو قرآن کی تفسیر کرے، اس کے احکام کی تشریح و توضیح کرے اور اس کے معارف و حقائق دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اس لئے تیرے سینہ میں اس کے متعلق گنجائش ہونی چاہیے تھی تا کہ یہ علم جو ہم نے تجھے بخشا ہے روز بروز بڑھتا رہے۔ نئی نئی باتیں اس میں سے نکلتی رہیں اور نئے نئے نکات لوگوں کے سامنے آتے رہیں۔ پس فرماتا ہے اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا تو اس بات کا گواہ نہیں کہ ہم نے تیرے اندر یہ مادہ پیدا کیا ہے کہ جب تجھ پر ایک آیت نازل ہوتی ہے تو اس کے تمام مَا لَهٗ اور مَا عَلَيۡهِ تیرے سامنے آ جاتے ہیں جو حکم بھی نازل ہوتا ہے اس کی باریکیاں اور وسعتیں سب تیرے ذہن میں مستحضر ہو جاتی ہیں اور تو فوراً سمجھ جاتا ہے کہ کن مواقع پر یہ حکم چسپاں ہوتا ہے اور کن مواقع پر چسپاں نہیں ہوتا۔

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے علم خارجی کے علاوہ علم اندرونی بھی بخشا تھا اور اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ کے معنے یہی ہیں کہ کیا علاوہ قرآن شریف کے ہم نے تجھے علم اندرونی نہیں بخشا اور تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا؟ میں بتا چکا ہوں کہ علم خارجی سب شاگردوں کو ایک قسم کا ملتا ہے مگر علم اندرونی ہر طالب علم کا الگ الگ ہوتا ہے اور اپنی الگ الگ استعدادوں کے مطابق وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسلام کی وسیع تعلیم کے لئے اس قدر وسیع سینہ کی ضرورت تھی جو ہر قسم کے علم کو سمجھ سکے، سمجھا سکے اور دنیا میں پھیلا سکے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم ملا چونکہ وہ جامع و مانع تھا اس کے لئے بہر حال ایسے سینہ کی ضرورت تھی جو ہر علم کو اخذ کر لے اور اسے پھیلا کر کہیں

کا کہیں لے جائے۔ایک شخص ایسا ہوتا ہے جسے اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنے الفاظ ہوتے ہیں مگر ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو تھوڑے سے الفاظ سے بہت بڑا علم حاصل کر لیتا ہے اور بات کو پھیلا کر کہیں کا کہیں لے جاتا ہے۔اسی کو تَفَقُّہ کہتے ہیں جو ایک نہایت قیمتی چیز ہے۔بعض لوگ اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ فلاں حکم تو قرآن کریم میں نہیں ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں سے نکال لیا۔وہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں تَفَقُّہ کا مادہ تھا مگر تم میں تَفَقُّہ کا مادہ نہیں۔تمہیں وہ علوم کس طرح حاصل ہوں جو قرآن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گئے۔بے شک جہاں تک حقیقت کا سوال ہے میں چکڑالویوں سے بالکل متفق ہوں مگر جہاں تک تشریح کا سوال ہے میں ان کو پاگل سمجھتا ہوں۔یہ تو صحیح ہے کہ قرآن سے باہر کوئی چیز نہیں مگر یہ بکواس ہے کہ عبداللہ چکڑالوی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ایک جیسا قرآن سمجھتے تھے۔ہم اپنے اوپر قیاس کر کے اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ہزاروں ہزار قرآنی نکات اور باریکیاں ہیں جو اور لوگوں پر نہیں کھلیں مگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر کھول دیں۔اگر ہم پر قرآن کریم کے ایسے ہزاروں اسرار کھل سکتے ہیں جو کروڑوں کروڑوں لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رہے تو کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہم سے کروڑوں درجے زیادہ قرآن کریم کے معارف نہیں کھل سکتے تھے؟ پھر ہم یہ کیوں فرض کر لیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فلاں حکم دیا تھا وہ قرآن میں موجود نہیں۔

قرآن مجید کا درخت لگانے کے لئے آنحضرت صلعم کا سینہ بہترین زمین کی طرح

یہ آیت اس امر پر شاہد ہے کہ قرآن کریم کی گٹھلی کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ بمنزلہ اعلیٰ زمین کے تھا اس میں وہ گٹھلی لگ کر فوراً اپنے آپ کو پھیلانے اور بلند کرنے لگ گئی تھی اور جو چیز لوگوں کے لئے گٹھلی تھی آپ کے سینہ میں وہ ایک وسیع اور بلند درخت تھی۔غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو دماغ عطا فرمایا تھا وہ بہرحال ہم سے اعلیٰ تھا اس لئے جس رنگ میں آپ قرآن کو سمجھ سکتے تھے اس رنگ میں دنیا کا اور کوئی شخص اس کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔دیکھو اس مادی دنیا میں بھی بیج ہمیشہ زمین کی قابلیت کے مطابق اگتا ہے۔کھجور ہمارے علاقہ میں نہیں ہوتی لیکن عرب میں ہوتی ہے کیونکہ کھجور کے لئے عرب کی زمین زیادہ مناسب ہے۔اسی طرح خربوزہ ہے۔یہ بھی ہر جگہ اچھا نہیں ہوتا بلکہ بعض جگہ اچھا ہوتا ہے اور بعض جگہ ناقص۔پنجاب میں چمیاری کا خربوزہ بہت اعلیٰ ہوتا ہے لیکن دوسرے مقامات کا خربوزہ ایسا اچھا نہیں ہوتا۔جس طرح مادی پھلوں کے عمدہ یا ناقص ہونے کا دارومدار مختلف زمینوں پر ہوتا ہے اچھی زمین میں بیج ڈالا جائے تو اچھا پھل دیتا ہے اور ناقص زمین میں بیج ڈالا جائے تو ناقص پھل دیتا ہے اور پھر بعض

زمینیں ایسی ہوتی ہیں جو بعض پھلوں کو اگانے کی مخصوص طور پر اپنے اندر قابلیت رکھتی ہیں اسی طرح قرآن کے لئے سب سے بہترین زمین جو الٰہی ہاتھوں سے تیار کی گئی وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سینہ تھا۔ قرآن کا جو درخت وہاں پیدا ہوسکتا تھا وہ اور کہاں پیدا ہوسکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اور بھی بعض اچھے درخت ہوئے ہیں مگر بہرحال وہ سب کے سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اظلال ہوں گے۔ کامل تابع ہو یا ادنیٰ سے ادنیٰ تابع، دونوں اپنی اپنی قابلیت اور استعداد کے مطابق قرآن کریم کا پھل دنیا کے سامنے رکھیں گے۔ کامل تابع جس پھل کو لوگوں کے سامنے رکھے گا وہ اور قسم کا ہوگا اور ادنیٰ تابع جس پھل کو لوگوں کے سامنے رکھے گا وہ اور قسم کا ہوگا۔ جیسے لنگڑے آم کی گٹھلی جہاں بھی بو دو کچھ نہ کچھ اگ آئے گا مگر اس کی خوبی زمین کی قابلیت کے مطابق ہوگی۔ اعلیٰ زمین ہوگی تو اعلیٰ درجے کا لنگڑا آم ہوگا اور ادنیٰ زمین ہوگی تو ادنیٰ درجے کا لنگڑا آم ہوگا۔ بہرحال اعلیٰ درجہ کی پیداوار اعلیٰ درجہ کی زمین کی متقاضی ہوتی ہے۔ امریکن کپاس لائل پور میں ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں نہیں ہوتی۔ اِیجپشن کاٹن مصر میں اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں اگر یہ کپاس بوئی جائے تو اس میں سفیدی کم آتی ہے۔ سٹیپل Staple بہت تھوڑا ہوتا ہے اور بونے والا کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ سفیدی کم ہو تو اعلیٰ درجے کا کپڑا تیار نہیں ہوسکتا اور اگر مضبوطی کم ہو تب بھی لوگ اس کپاس کو نہیں خریدتے کیونکہ اس روئی سے تیار کردہ کپڑا بہت جلد پھٹ جاتا ہے۔ غرض مختلف قسم کی اشیاء کے لئے مختلف قسم کی زمینیں ضروری ہوتی ہیں۔ جس طرح آموں کے لئے ملیح آباد مشہور ہے اور سنگتروں کے لئے ناگپور یا جس طرح زعفران دنیا میں صرف چند محدود علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح اگر قرآن پیدا ہوتا ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ۔

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ میں شَرَحَ کے معنے ہل چلانے اور پھاڑنے کے

شَرَحَ کے معنے پھاڑنے اور ہل چلانے کے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں کے رو سے آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم نے تیرے سینہ میں قرآن لگانے کے لئے ہل چلائے ہیں یا نہیں؟ جس طرح مادی اشیاء کے لئے مناسب حال زمین کو تلاش کیا جاتا ہے اسی طرح ہم اپنے قرآن کے لئے اسی زمین میں ہل چلا سکتے تھے جو قرآن کے مناسب حال ہو۔ سو ہمیں وہ مناسب حال زمین تیرا سینہ دکھائی دیا اور ہم نے اس میں ہل چلا دیا اب دنیا دیکھے گی کہ اس میں سے کیسے شاندار پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ جیسا بیج بونے والا ہو، خدا تعالیٰ جیسا ہل چلانے والا ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ جیسی زمین ہو تو اس کھیتی کی برتری کا کون انکار کرسکتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

غرض اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم کے نزول کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا علم لدنی بخشا گیا تھا کہ اس کے ذریعہ آپ ہر علم کو فوراً قبول کر کے اس کی وسعتوں کے انتہا تک پہنچ جاتے تھے اور اس سے استنباط اور تفقّہ کر کے مسلمانوں کو علم دین سکھاتے ۔ یہ وسعت بھی عجیب قسم کی ہے جو کتاب آپ کو ملی وہ ایسی عظیم الشان ہے کہ کوئی فن اور کوئی علم نہیں جو اس میں نہ پایا جاتا ہو۔ اس میں اقتصادیات کے اصول بھی ہیں، اس میں تمدن کے اصول بھی ہیں، اس میں سیاست کے اصول بھی ہیں، اس میں علم العائلہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں میراث کے مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں، اس میں علم الاخلاق کی باریکیاں بھی بیان کی گئی ہیں، اس میں علم العبادات کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے، اس میں علم المعاملات کو بھی پوری تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھا گیا ہے۔ غرض علم کی کوئی شاخ انسانی ذہن میں ایسی نہیں آسکتی جو مذہب سے براہ راست تعلق رکھتی ہو اور اس میں تفصیلی احکام موجود نہ ہوں اور جو شاخ براہ راست تعلق نہ رکھتی ہو اس کے متعلق اجمالی علم اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ ایسی کتاب کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ کا کھول دیا جانا خود ایک غیر معمولی بات ہے۔ اوّل تو جو کتاب آپ کو ملی وہ غیر معمولی ہے اور وہ تمام علوم کی جامع ہے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص ہوشیار اور سمجھدار تھا۔ اقتصادی مسائل سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے علم الاقتصاد کی کوئی کتاب پڑھی اور اس کے سینہ میں اس علم کے چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص سیاسی معلومات کا شوق رکھتا اور بوجہ اس کے کہ سیاسیات سے اس کی طبعی مناسبت تھی جب اس نے کسی سیاسی کتاب کو پڑھا تو اس کے سینہ میں وسعت پیدا ہوگئی اور سیاست کے متعلق نئے سے نئے مضامین اس کے ذہن میں آنے شروع ہو گئے۔ یہ بھی قیاس میں آسکتا ہے کہ کوئی شخص قضاء سے دلچسپی رکھتا تھا قضائی امور اس کے سامنے پیش آگئے اور چونکہ اس کی نفسی مشابہت قضاء کے ساتھ تھی قضائی معاملات میں اس کا دماغ تیز ہوگیا اور وہ کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ کوئی شخص فوجی طبیعت رکھنے والا تھا اس نے ملٹری کے قواعد وضوابط کے متعلق کوئی کتاب پڑھی یا دشمنوں کے ساتھ تعلقات کا وسیع مطالعہ کیا تو اس کے دل میں اور بھی کئی قسم کی نئی باتیں اس کے متعلق پیدا ہوگئیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص علم العائلہ کا واقف تھا جب اس نے کوئی ایسی کتاب پڑھی جس میں خاندانوں کے متعلق قوانین بیان کئے گئے تھے جس میں باپ اور بیٹے، خسر اور داماد، میاں اور بیوی، دوست اور دوست کے متعلق ہدایات دی گئی تھیں اور پھر خود بھی اس نے ان تعلقات پر غور کیا تو چونکہ اس علم سے اسے ذاتی مناسبت تھی اس کے متعلق نئے سے نئے علوم اس کے دماغ میں آنے لگ گئے۔ غرض ہم یہ تمام باتیں اپنے قیاس میں لا سکتے ہیں۔ مگر

یہاں دو غیر قیاسی اور بالکل غیر معمولی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

قرآن مجید ہر لحاظ سے کامل ہے اوّل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ کتاب نازل ہوئی جس میں ہر علم پر بحث کی گئی تھی اور پھر جو بحث کی گئی وہ ایسی تھی کہ اپنی ذات میں ہر لحاظ سے کامل تھی اور اس میں کسی نئے پہلو کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پس پہلی بات یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کتاب ملی جو جامع ہے تمام علوم کی۔ یہ نہیں کہ وہ سیاست کے متعلق کتاب ہے یا انٹرنیشنل لاء کے متعلق کتاب ہے یا اخلاق کے متعلق کتاب ہے یا علم النفس کے متعلق کتاب ہے بلکہ ہر فن کے متعلق ہم اس میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس میں عبادت پر بھی بحث کی گئی ہے، اس میں اقتصادیات پر بھی بحث کی گئی ہے، اس میں استاد اور شاگرد، باپ اور بیٹا، نوکر اور مالک کے حقوق پر بھی بحثیں ہیں، اس میں حکومتوں کے تعلقات اور لڑائی اور صلح وغیرہ پر بھی بحث ہے۔ غرض ایک غیر معمولی کتاب ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ مگر اس کے مقابلہ میں ایک اور ذمہ واری بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالی گئی کہ اس غیر معمولی کتاب کی تمام جزئیات آپ کے سینہ میں آکر درخت بن جائیں۔ گویا قرآن ایک گٹھلی تھی جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں ایک بہت بڑا درخت پیدا ہونا تھا یہ اور بھی غیر معمولی بات ہے اور یہی بات ہے جو اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ میں بیان کی گئی ہے۔ جس چیز کے لئے آپ کا شرح صدر ہوا وہ یہاں محذوف ہے جو سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں۔ گویا اصل آیت یوں ہے اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ لِلۡقُرۡاٰنِ۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم نے تیرا سینہ قرآن کے لئے نہیں کھول دیا؟ اگر خالی اس حد تک انسان چلتا ہے جس حد تک دلالۃ النص کے طور پر مضامین بیان کرنے پڑتے ہیں تب بھی یہ غیر معمولی بات ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ صرف دلالۃ النص کے طور پر قرآن کریم سے مختلف قسم کے علوم اخذ کر کے بیان فرماتے ہیں بلکہ اشارۃ النص میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں ان کو بھی بیان فرماتے ہیں اور پھر اُن کی ایسی ایسی باریکیاں بیان فرماتے ہیں جہاں عام انسانی عقول نہیں پہنچ سکتیں۔ یہ ایک ایسی غیر معمولی چیز ہے جو سوائے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل اور اس کی خاص برکت کے انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے صرف علم قرأت پر بحث کی ہے اور وہ بڑے بڑے عالم کہلاتے ہیں۔ بعض صرف قرآن کریم کی لغت پر بحث کرتے ہیں اور وہ بڑے بڑے عالم کہلاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جنہوں نے صرف قرآن کریم کی قضاء پر بحث کی ہے اور وہ بڑے بڑے عالم کہلائے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جنہوں نے صرف قرآن کی اقتصادیات پر بحث کی ہے اور وہ بڑے بڑے عالم کہلائے ہیں۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ تمام جزئیات لیتے ہیں بلکہ ان کو پھیلاتے

ہیں اوران کی ایسی تشریحات اور تفصیلات بیان کرتے ہیں جو پہلے کسی انسان نے بیان نہیں کیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ کو چاک کئے جانے کا واقعہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف حدیثوں میں اس رنگ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ چاک کیا گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی رشتہ داروں کی طرف سے روایت آتی ہے کہ بچپن میں جب آپ کو حلیمہ دائی پرورش کے لئے لے گئی تو ایک دن جبکہ آپ باہر کھیل رہے تھے آپ کا ایک رضاعی بھائی گھبراہٹ کی حالت میں دوڑا ہوا اپنی والدہ اور والد کے پاس آیا اور اس نے کہا اَلْحِقَا اَخِیْ مُحَمَّدًا فَمَا تُلْحِقَانِہٖ اِلَّا مَیِّتًا قُلْتُ وَمَا قَضِیَّتُہٗ قَالَ بَیْنَا نَحْنُ قِیَامٌ اِذَا اَتَاہُ رَجُلٌ فَاخْتَطَفَہٗ مِنْ وَّسَطِنَا وَعَلَابِہٖ ذِرْوَۃَ الْجَبَلِ وَ نَحْنُ نَنْظُرُ اِلَیْہِ حَتّٰی شَقَّ صَدْرَہٗ اِلٰی عَانَتِہٖ وَلَا اَدْرِیْ مَا فُعِلَ بِہٖ (السیرۃ الحلبیۃ باب ذکر رضاعہ صلی اللہ علیہ وسلم وما اتصل بہ) ہمارے بھائی پر کسی نے حملہ کر کے اسے مار دیا ہے۔ حلیمہ دوڑتی ہوئی باہر گئی تو اس نے دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حلیمہ نے آپ سے دریافت کیا کہ بتاؤ کیا ہوا تھا؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ تین آدمی آئے تھے انہوں نے میرا سینہ چیرا اور میرے دل کو دھو کر اندر رکھ دیا اور پھر چلے گئے۔ روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ کے سینہ پر اس کا ایک نشان بھی تھا۔ بعض دوسری روایتوں میں جو واقعہ معراج کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں ان میں بھی ذکر آتا ہے کہ ایک فرشتہ آیا اس نے آپ کے سینہ کو چیر کر دل نکالا آلائش صاف کی اور پھر دوبارہ اسے آپ کے سینہ میں رکھ دیا (الروض الانف الجزء الاوّل مسألۃ شق الصدر مرۃً اخری)۔

آنحضرت صلعم کا سینہ چاک کئے جانے کا واقعہ ایک کشفی واقعہ تھا مسلمان اس کو جسمانی معجزہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں جس رنگ میں مسلمان اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں اگر وہ زیادہ غور سے دیکھتے تو یہ آپ کی شان کو بڑھانے والے معجزہ کی بجائے آپ کی تنقیص کرنے والا معجزہ بن جاتا ہے۔ اوّل تو یہ سوال ہے کہ دل پر کون سی مادی آلائشیں ہوتی ہیں جنہیں صاف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ جنوں اور بھوتوں کے قائل ہیں وہ بھی اتنی معقولیت سے کام لیتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ فلاں جن نے فلاں کا دیکھتے ہی کلیجہ کھالیا۔ وہ جنات کی ماہیت کے لحاظ سے سمجھتے ہیں کہ انہیں چیرنے پھاڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی یونہی دیکھتے اور دوسرے کا کلیجہ نکال کر چبا جاتے ہیں۔ اگر جنات کے متعلق بعض نہایت ضعیف الخیال لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں جن پیٹ چیرنے کے محتاج نہیں ہوتے تو فرشتوں کے متعلق کیوں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ چیرنے پھاڑنے کے محتاج ہیں۔

اگر دل بنانے کے لئے فرشتے کسی کا پیٹ پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ اگر پھیپھڑا بنانے کے لئے وہ کسی کا پیٹ پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ اگر جگر اور معدہ بنانے کے لئے وہ کسی کا پیٹ پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ اگر تلی بنانے کے لئے وہ کسی کا پیٹ پھاڑنے کے محتاج نہیں۔ اگر دماغ بنانے کے لئے وہ کسی کا سر پھاڑنے کے محتاج نہیں تو وہ دل کو صاف کرنے کے لئے کسی کا سینہ چاک کرنے کے کیوں محتاج ہو گئے؟ جس طرح وہ پیٹ چیرے بغیر انسان کے اندر گھس گئے تھے اور انہوں نے دل اور دماغ اور معدہ اور جگر وغیرہ بنا دیا اسی طرح وہ سینہ کو چیرے بغیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بھی صاف کر سکتے تھے۔ پھر سوال یہ ہے کہ آیا فرشتوں کو چھریوں کی ضرورت ہوتی ہے؟ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں، پہاڑوں، دریاؤں اور دوسری سب چیزوں کے بنانے میں خدا تعالیٰ کے ملائکہ بھی ایک علت کے طور پر کام کرتے ہیں مگر جب وہ پہاڑ اور دریا وغیرہ بناتے ہیں تو نہ انہیں ہتھوڑوں کی ضرورت ہوتی ہے نہ آری کی ضرورت ہوتی ہے، نہ کدالوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بغیر ان مادی ہتھیاروں کے یہ تمام کام سرانجام دے دیتے ہیں۔ پھر وجہ کیا ہے کہ اور جگہ تو انہیں کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑتی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی صفائی کے لئے جب ان کو آنا پڑا تو وہ چھری بھی اپنے ساتھ لے آئے جس سے انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سینہ چاک کیا۔ پس یہ روایت عقل کے بالکل خلاف ہے۔ کروڑوں کروڑ کام دنیا میں فرشتے کرتے ہیں مگر کبھی اس رنگ میں انہوں نے اپنے فرائض کو سرانجام نہیں دیا۔ پس اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عملی طور پر ایسا ہوا تھا تب بھی اس کے لئے پیٹ کو چاک کرنے کی ضرورت تسلیم نہیں کی جاسکتی اور نہ چھریوں کی حاجت تسلیم کی جاسکتی ہے۔ فرشتے اگر کسی کے دل کی صفائی کے لئے پیٹ کو چاک کریں تو وہ وزیر آباد یا بھیرہ کی بنی ہوئی چھریوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ درحقیقت اس غلطی کی بناء یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف یہ خیال کر لیا گیا ہے کہ فرشتے ان مادی اشیاء کے محتاج ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات ایسی ہے جس کو دوسرے مقامات پر خود مسلمان بھی تسلیم نہیں کرتے۔ حدیثوں میں صاف طور پر ذکر آتا ہے کہ جب جنین رحم مادر میں ہوتا ہے تو فرشتہ ماں کے پیٹ میں جاتا اور اس میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے (صحیح بخاری کتاب القدر ابتدائیة)۔ مگر کیا کسی نے دیکھا ہے کہ کبھی عورت کا پیٹ فرشتوں نے چاک کیا ہو؟ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ بے شک سب کام فرشتے کرتے ہیں مگر وہ پیٹ چاک کرنے کے محتاج نہیں ہوتے۔ جب وہ وہاں چھریوں کی ضرورت تسلیم نہیں کرتے تو اس واقعہ کو کیوں ظاہری شکل دی جاتی ہے اور کیوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ ظاہری طور پر چاک کیے جانے پر زور دیا جاتا ہے؟ ہم مانتے ہیں کہ فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ انہوں نے آپ کے دل کی صفائی کی مگر ہم ساتھ ہی یہ بھی مانتے

ہیں کہ انہوں نے اسی طرح آپ کا سینہ چاک کیا اور اسی طرح آپ کا دل نکال کر دھویا۔جس طرح وہ جگر بناتے ہیں، تلی بناتے ہیں، دل اور پھیپھڑا بناتے ہیں۔جس طرح وہاں وہ انسان کا دل اور جگر بناتے ہیں اسی طرح یہاں بھی انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دل نکالا۔اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ بات ایسی ہے جسے ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک کشف دیکھا تھا اور کشفی نظارہ بعض دفعہ دوسرے لوگ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ساری غلطی مسلمانوں کو اس وجہ سے لگی ہے کہ حلیمہ کے بیٹے نے بھی یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔وہ کہتے ہیں اگر یہ ظاہری واقعہ نہیں تھا تو حلیمہ کے بیٹے نے کس طرح دیکھ لیا؟ حالانکہ اگر صحابہؓ جبریل کو دیکھ سکتے ہیں تو حلیمہ کا بیٹا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کشفی واقعہ کو کیوں دیکھ نہیں سکتا تھا۔حدیثوں میں آتا ہے ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپ سے مختلف سوالات کئے جن کے آپ نے جوابات دیئے۔جب وہ چلا گیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا جانتے ہو یہ کون تھا؟ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ ہمیں تو معلوم نہیں۔خدا اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جبریل تھا جو تمہیں علم سکھانے کے لئے آیا۔اب دیکھو جبریل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا مگر صحابہؓ نے بھی دیکھ لیا۔پس کئی ایسے کشفی نظارے ہوتے ہیں جن میں ساتھ کے لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں مگر اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ مادی واقعہ ہوتا ہے۔پھر معلوم نہیں وہ صرف چھری کو مادی کیوں قرار دیتے ہیں۔فرشتے کو بھی کیوں مادی نہیں سمجھ لیتے۔مگر وہ فرشتے کو تو روحانی قرار دیتے ہیں اور چھری کو مادی قرار دیتے ہیں۔اگر آدھی روحانی چیز تھی تو آدھی مادی کیوں ہوگئی؟

وہ کہتے ہیں اس واقعہ کے مادی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر اس کا نشان تھا۔(صحیح مسلم کتاب الایمان باب الاسراء برسول اللہ الی السمٰوات و فرض الصلوٰت) ہم کہتے ہیں اگر نشان تھا تب بھی یہ اس واقعہ کے مادی ہونے کا ثبوت نہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالیٰ نے ایک نشان دکھایا جس کے نتیجہ میں آپ کے کپڑوں پر سرخ روشنائی کے بعض نشانات آ گئے مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یہ ظاہری واقعہ تھا۔تھا تو یہ کشفی واقعہ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کشف کی صداقت کے لئے ظاہر میں بھی روشنائی پیدا کر دی یہ بتانے کے لئے کہ میں قادر مطلق خدا تمہیں یہ نظارہ دکھا رہا ہوں۔پس گو یہ واقعہ مادی نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ظاہر میں اس کا نشان پیدا کر دیا۔اسی طرح اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر

نشان تھا تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ یہ ظاہری واقعہ تھا۔ یا ظاہر میں انسانی قلب پر کوئی میل ہوتی ہے جسے دھونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غرض یہ غلط ہے کہ یہ ایک ظاہری واقعہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزرا۔ یہ ظاہری واقعہ نہیں بلکہ ایک کشف تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا ہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کی عظمت کے اظہار کے لئے اور آپ کے رضاعی خاندان کے دل میں آپ کی محبت پیدا کرنے کے لئے ایسا تصرف کیا کہ حلیمہ کے بیٹے نے بھی اس واقعہ کو دیکھ لیا۔ اور اس کی گواہی سے سب پر یہ اثر ا ہوا کہ یہ غیر معمولی واقعہ بتا رہا ہے کہ یہ لڑکا ایک دن بہت بڑی عظمت اور شان حاصل کرے گا۔ پھر یہ بتانے کے لئے کہ یہ کشف واقعہ میں ہم نے دکھایا تھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے سینہ پر بھی نشان پیدا کر دیا۔ تا کہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کے اس نشان کے گواہ رہیں۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کرتے پر سرخ روشنائی کے قطرات اللہ تعالیٰ نے اس لئے ڈالے تا کہ اور لوگ بھی اس نشان کے گواہ رہیں۔ گو معتبر روایتوں میں یہ ذکر نہیں آتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر نشان تھا۔ مگر ہمیں اس کو تسلیم کرنے سے انکار کی خاص ضرورت نہیں۔ اگر روشنائی کے نشان اللہ تعالیٰ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کپڑوں پر پیدا کر سکتا ہے تو اس کشف کی تصدیق کے لئے اگر اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر کوئی نشان پیدا کر دیا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ پس جس حد تک اس واقعہ کو کشفی ماننے کا تعلق ہے ہمیں اس کی صحت سے ہرگز انکار نہیں لیکن جس حد تک اس واقعہ کو مادی قرار دینے کا سوال ہے ہمارے نزدیک یہ بات عقل کے خلاف ہے ورنہ جیسا کہ احادیث میں آتا ہے ماننا پڑے گا کہ جب کوئی شخص برا کام کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نشان پڑ جاتا ہے اور جب اچھا کام کرتا ہے تو اس کا دل اعلیٰ حالت میں رہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات واقعات کے خلاف ہے۔ نعشوں کو چیرنے پھاڑنے اور مختلف امراض کے نتیجہ میں انسانی جسم میں جو تغیرات واقع ہوتے ہیں ان کو دیکھنے بھالنے کا کام اس زمانہ میں بہت ترقی پر ہے۔ لاکھوں نعشیں اب تک چیری جا چکی ہیں اور تشریح الابدان کے ماہرین نے ان تمام تغیرات کا پوری طرح جائزہ لے لیا ہے جو امراض کے نتیجے میں انسانی جسم میں واقعہ ہوتے ہیں۔ اگر اس نظریہ کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ برے کام کے نتیجہ میں قلب پر مادی شکل میں سیاہی چھا جاتی ہے اور اچھے کام کے نتیجہ میں قلب پر مادی شکل میں نور آ جاتا ہے تو کئی مسلمانوں کو کافر اور کئی کافروں کو مسلمان قرار دینا پڑے گا۔ وہ مسلمان جو دم گھٹ کر مر جاتے ہیں ان کے دل یقیناً کالے ہوں گے اور وہ ہندو اور سکھ جن کے تنفس پر بیماری کا اثر نہیں ہوتا ان کے دل یقیناً اچھی حالت میں ہوں گے۔ ایسی حالت میں ہمیں روزانہ کافروں کو مسلمان اور مسلمانوں کو کافر قرار دینا پڑے گا اور یہ حقیقت کے خلاف ہے۔

درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک کشف تھا۔کشفی حالت میں فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے آپ کا سینہ چاک کر کے دل نکالا اور اسے دھو دھا کر پھر اندر رکھ دیا۔ بے شک ظاہر میں اس واقعہ کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا مگر خواب یا کشف کی حالت میں اس قسم کے واقعہ کو تسلیم کرنا ہرگز بعید از قیاس نہیں۔خواب میں ایک چھوڑ دس دل بھی سینوں میں سے نکال کر دھوئے جا سکتے ہیں اور اس میں کسی تعجب کی بات نہیں سمجھی جا سکتی کیونکہ خواب ہمیشہ تعبیر طلب ہوتا ہے۔ہم خواب میں زید کے دس سر دیکھ سکتے ہیں حالانکہ ظاہری لحاظ سے کسی کے دس سر نہیں ہو سکتے۔خواب چونکہ تعبیر طلب ہوتا ہے اس لیے اگر ہم کسی کے دس سر دیکھیں تو اس کے حالات کے مطابق اس کی دو تعبیریں ہوں گی۔ یا تو اس کی یہ تعبیر ہوگی کہ اس کے اندر استقلال نہیں پایا جاتا اور یا پھر یہ تعبیر ہوگی کہ اس کی عقل وسیع ہے۔اگر اس کے حالات اس کی اخلاقی جرأت کا ثبوت ہوں تو دس سر دیکھنے کی اچھی تعبیر ہوگی۔اور اگر اس کے حالات اس کے خلاف ہوں تو دس سر دیکھنے کی بری تعبیر ہوگی۔ بری تعبیر تو یہ ہوگی کہ اس کے اندر استقلال کا مادہ نہیں پایا جاتا۔ایک سر ایک دفعہ بات کرتا ہے دوسرا سر دوسری دفعہ بات کرتا ہے۔ایک دفعہ وہ ایک رائے قائم کرتا ہے اور دوسری دفعہ دوسری رائے قائم کرتا ہے اور اچھی تعبیر یہ ہوگی کہ وہ بڑا عقلمند ہے۔لوگ ایک سر سے کام لیتے ہیں اور وہ دس سروں سے کام لیتا ہے۔پس کسی کے دس سر دیکھنا یا تو اس کے تدبر اور اعلیٰ درجہ کے دماغ کا ثبوت ہوگا اور یا پھر اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ دس دفعہ اپنی رائے بدلتا ہے اس کے اندر استقلال کا مادہ نہیں۔پس ایک ہی خواب کی اچھی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی اور یہ تعبیر دیکھنے والے کے حالات پر منحصر ہوتی ہے۔اسی طرح اگر رؤیا یا کشف کی حالت میں کوئی شخص اپنے دس دل دیکھے تو یہ بھی ہو سکتا ہے جس طرح وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کا دل سینہ میں سے نکالا گیا اور اسے فرشتہ نے دھو کر پھر اس کی اصل جگہ پر رکھ دیا۔

غرض عام مسلمانوں کو تمام دھوکا کشف کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لگا ہے ورنہ کشفی حالت میں دل پر سیاہی بھی دیکھی جا سکتی ہے اور کشفی حالت میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ دل میں نور بھر دیا گیا ہے۔فرق صرف یہ ہوگا کہ اگر جھوٹی خواب ہو تو گو انسان بہت کچھ دیکھتا ہے مگر اسے ملتا کچھ نہیں لیکن اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی خواب دکھایا جائے تو فوراً انسان کو اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام بھی مل جاتا ہے۔مثلاً اگر خدا تعالیٰ کسی کو دکھائے کہ اس کا سر بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے بہت بڑا علم مل جائے گا اور اس کی عقل بہت وسیع ہو جائے گی (تعطیر الانام فی تعبیر المنام زیر لفظ ''رأس '')۔اب اگر یہ خدائی خواب ہے تو چند دنوں کے بعد ہی اسے نظر آئے گا کہ اس کے علم اور اس کی ذہانت میں ترقی ہو رہی ہے۔لیکن اگر

نفسانی خواب ہے تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ بعض لوگوں کے کان میں سوتے ہوئے چیونٹی گھس جاتی ہے تو وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ توپیں چل رہی ہیں، لڑائیاں ہو رہی ہیں، ڈھول بج رہے ہیں اور دنیا میں ایک شور برپا ہے یا بعض دفعہ کان میں میل پھنسی ہوئی ہوتی ہے ایسی حالت میں جب ہوا کان کی میل سے ٹکراتی ہے تو سویا ہوا انسان دیکھتا ہے کہ بجلیاں چمک رہی ہیں، بادل کڑک رہے ہیں، اولے برس رہے ہیں اور دنیا پر بڑی تباہی آئی ہوئی ہے۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ میل کا ایک ذرہ اس کے کان میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح سوتے سوتے کسی کو بھڑ کاٹ جائے اور وہ گہری نیند سو رہا ہو تو وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ میرا سر بڑا ہو گیا۔ اب اس کی یہ تعبیر نہیں ہوگی کہ وہ بڑا عقلمند ہو جائے گا بلکہ اس خواب کا صرف اتنا مطلب ہوگا کہ سوتے ہوئے اسے بھڑ نے کاٹ لیا تھا جس کا اس کے اندرونی شعور نے اسے اس رنگ میں نظارہ دکھایا۔

قادیان میں ایک دفعہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ مرزا صاحب کو بھی بے شک الہام ہوتا ہے کہ تجھے ہم نے بڑا درجہ دیا ہے مگر مجھے بھی خدا تعالیٰ روزانہ کہتا ہے کہ تو موسیٰ ہے، تو عیسیٰ ہے، تو محمد ہے۔ لوگوں نے اسے بہت کچھ سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر کسی نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں اس کا ذکر کر دیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا اسے ہمارے پاس لاؤ یا آپ نے فرمایا اس سے سوال کرو (مجھے اس وقت اچھی طرح یاد نہیں) کہ جب خدا تم سے کہتا ہے کہ تم عیسیٰ ہو تو کیا عیسیٰ کی طرح تمہیں خلقِ طیر کا نشان بھی ملتا ہے یا تمہارے ہاتھ سے بھی اسی طرح مردے زندہ ہوتے ہیں جس طرح عیسیٰ کے ہاتھ سے زندہ ہوتے تھے یا جب خدا تمہیں موسیٰ کہتا ہے تو کیا موسیٰ کی طرح ید بیضا کا نشان بھی تمہیں عطا کرتا ہے یا جب محمدؐ کہتا ہے تو کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مقام جو دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (النّجم:۹،۱۰) میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی تمہیں ملتا ہے یا تمہیں وہی فصاحت اور وہی بلاغت عطا کی جاتی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی؟ وہ کہنے لگا ملتا تو کچھ نہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تو پھر وہ خدا نہیں بلکہ شیطان ہے جو تمہیں روزانہ عیسیٰؑ اور موسیٰؑ اور محمدؐ کہتا ہے۔ اگر خدا تمہیں یہ مقام عطا کرتا تو تمہیں اس مقام سے تعلق رکھنے والے انعامات بھی دیتا۔ اسی طرح ایک دوسرا شخص بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس کا سینہ چیرا گیا اور دل دھو کر دوبارہ اس کے اصل مقام پر رکھ دیا گیا۔ مگر فرق یہ ہوگا کہ اس کا سینہ پھر بھی تنگ ہی رہے گا۔ مگر جس کا خدا دل دھو کر اس کے سینہ میں رکھ دے گا اس کا سینہ پہلے سے ہزاروں گنا زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق آپ کے رضاعی بھائی نے جو شہادت دی اگر وہ بات جھوٹی ہوتی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کا شرح صدر

ہو کس طرح گیا؟ پھر تو چاہیے تھا آپ کا شرح صدر نہ ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ادھر آپ کا سینہ چاک کر کے دل دھویا گیا اور ادھر دنیا نے دیکھ لیا کہ ہر علم وفن کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیمات دیں جن کی نظیر اور کسی شخص میں نہیں ملتی۔ علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں قرآنی خیالات لے کر آپ نے ری فلیکٹر کے طور پر دنیا میں نہایت اعلیٰ اور بے عیب تعلیمیں پیش نہ کی ہوں۔ جب ہم ان واقعات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کا سینہ چیرنے والا فرشتہ ہی تھا ورنہ خالی دل دھودھا کر سینہ کے اندر رکھ دینے میں کیا کمال ہوسکتا تھا۔ بات تو وہی رہی پہلے بھی دل میں خون آتا تھا اور اس کے بعد بھی دل میں خون نے ہی آنا تھا۔ جو چیز اس واقعہ کو عظمت دیتی ہے وہ اس کا جسمانی نہیں بلکہ روحانی پہلو ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ کیا بچپن میں ہی ہم نے یہ نظارہ تجھے نہیں دکھادیا تھا اور ہم نے بچپن میں ہی تجھ سے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ ہم ایک دن تجھ میں بڑے بڑے کمالات پیدا کر دیں گے؟ یہ تعبیر ہے جو اس کشفی واقعہ کی تھی اور جس نے بعد میں آپ کی صداقت کو آفتابِ نیم روز کی طرح ظاہر کر دیا ورنہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ نعوذ باللہ آپ کے دل پر سیاہی تھی جسے فرشتوں نے دھودیا۔ آپ کا دل پہلے بھی پاک تھا اس کو دھونے کے معنے یہ تھے کہ ہم نے نئی قابلیتیں اور علوم کی نئی وسعتیں تیرے اندر پیدا کر دی ہیں۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کے دل پر نعوذ باللہ کوئی گند لگا ہوا تھا جسے انہوں نے دھودیا۔

آنحضرت صلعم کی بے مثال قوت برداشت ایک معنے اس آیت کے یہ بھی ہیں کہ ہم نے تیرے اندر قوت برداشت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ شرح صدر کے الفاظ اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کسی چیز پر آپ کو تنگیٔ نفس پیدا نہیں ہوتی تھی بلکہ جو بات آتی آپ اس کو برداشت کر لیتے اور کہتے

ہر چہ از دوست مے رسد نیکو است

آپ جانتے تھے کہ میرے ساتھ جو معاملہ ہے وہ خاص قانون کے ماتحت ہے میں خدا تعالیٰ کے کامل تصرف کے ماتحت ہوں میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا خواہ وہ بظاہر برا ہو میرے لئے انجام کار اچھا ہوگا۔ اسی وجہ سے آپ مصائب اور مشکلات میں گھبراتے نہیں تھے۔ پس اس آیت کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ تیرے اندر قوت برداشت کمال درجہ کی پیدا ہو چکی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی قسم کے مشکلات آئے، کئی قسم کے مصائب سے آپ کو دوچار ہونا پڑا مگر آپ پر کبھی گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی ایسے اطمینان سے آپ نے ان مشکلات کو برداشت کیا۔ جیسے آپ کو یقین تھا کہ یہ سب کچھ میرے حق میں ہے خدا میرا دوست ہے دشمن نہیں۔ وہ مجھے

کامیاب کرے گا اور میرے دشمنوں کو ناکامی کے گڑھے میں گرائے گا۔ لوگ آپ کو گالیاں دیتے، آپ کو برا بھلا کہتے، آپ کے خلاف بڑے بڑے منصوبے کرتے مگر آپ ان کی ذرا بھی پروا نہ کرتے اور کبھی آپ کی زبان سے ان کے حق میں کوئی برا کلمہ نہیں نکلا۔ لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر راہ چلتے ہوئے کوئی شخص ان کے سامنے آجائے اور انہیں معمولی سی ٹکر لگ جائے تو وہ غیظ وغضب سے بھر جاتے ہیں اور کہتے ہیں تم دیکھتے نہیں تمہاری آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں! مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم دیکھتے ہیں مکہ فتح ہو چکا ہے، آپ کے غلبہ اور آپ کی شان اور آپ کی عظمت کا تمام عرب قائل ہو چکا ہے کہ اس حالت میں ایک اعرابی آتا ہے اور سختی سے کہتا ہے۔ سارے لوگ اپنا اپنا حصہ لے گئے ہیں مجھے بھی مال غنیمت میں سے حصہ دو۔ صحابہ نے اسے پکڑ کر ہٹایا کہ یہ کیا بیہودگی ہے جو تم کر رہے ہو مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمایا اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں تمہیں ضرور دیتا مگر میرے پاس جو مال تھا وہ میں دے چکا ہوں اب میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ قوتِ برداشت جو آپ کے اندر نظر آتی ہے یہ ایک ایسی بے مثال چیز ہے جس کا نمونہ ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ بے شک نصیحت بھی کرتے، لوگوں کو ان کی برائیوں سے منع بھی فرماتے اور ناراضگی کے موقع پر ناراضگی کا بھی اظہار فرماتے مگر طبیعت آپ کے قابو سے کبھی باہر نہیں ہوتی تھی۔ پس اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ کیا ہم نے تیرے سینہ کو وسیع نہیں کر دیا کہ تجھے گالیاں ملتی ہیں مگر تو ان کی پرواہ نہیں کرتا۔ دکھ دیئے جاتے ہیں مگر تو ان کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتا۔ تیرے اندر اس قدر قوتِ برداشت پیدا کر دی گئی ہے کہ دشمنوں کے لئے مقابلہ اور ان کے متواتر مظالم پر بھی تیرے پائے استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوتی۔

وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ ۙ﴿۴﴾

اور (ایسا کر کے) ہم نے تیرے (اس) بوجھ کو تجھ پر سے اتار دیا۔ جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی۔

حلّ لُغات۔ اَلۡوِزۡرُ اَلۡوِزۡرُ: اَلثِّقۡلُ یعنی وِزۡرٌ کے معنے بوجھ کے ہیں (اقرب)۔

تفسیر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک فضیلت

کامیابی کے لئے دوسری ضروری چیز انسان کو کام کرنے کے ذرائع کا میسر آجانا ہے۔ دل کا حوصلہ اور قوتِ برداشت کا پایا جانا بھی کامیابی کے حصول کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے مگر وہ پہلی چیز ہے۔ دوسری چیز

جس کا انسانی کامیابی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان کو کام کرنے کے ذرائع مہیا ہو جائیں۔ اس معاملہ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ جس طرح پہلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ کے مقابل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ اسی طرح وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ میں ماضی کے الفاظ استعمال کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آپ کی ایک فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (طٰهٰ: ۳۰) اے میرے رب میرے اہل میں سے کوئی میرا بوجھ بٹانے والا پیدا کر دے۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ایک ایسا شخص مانگنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی جو ان کا بوجھ بٹانے والا ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ہم نے بغیر تیرے مانگنے کے تجھے ایسے ساتھی عطا کر دیئے ہیں جو تیرے بوجھ کو صرف بٹانے والے نہیں بلکہ سارا بوجھ اپنے آپ پر اٹھانے والے ہیں۔ انہوں نے تیرے اوپر سے وہ سب کا سب بوجھ اٹھالیا ہے جس نے تیری کمر کو توڑ دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا بڑا بوجھ تھا جس کو کوئی اکیلا شخص اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ آپ کے سپرد یہ کام تھا کہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کریں۔ ساری دنیا کو اسلام میں داخل کریں۔ ساری دنیا کی بدیوں اور عیوب کا قلع قمع کریں۔ آپ دیکھتے تھے کہ میں اکیلا ہوں نہ میں ہر شخص کے پاس پہنچ سکتا ہوں اور نہ ہر شخص کو منوانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ ایک ایک آدمی کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے بظاہر کئی کئی سال چاہیے تھے کیونکہ ان کے عقائد اور اسلام کی پیش کردہ تعلیم میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ کئی کئی بتوں کو مانتے تھے اور قرآن کہتا تھا کہ بت اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتے وہ جھوٹ اور فریب اور دغا اور خیانت اور ڈاکہ اور قتل اور اسی قسم کے دوسرے افعال کو جائز سمجھتے تھے اور اسلام ان سب کو ناجائز اور حرام قرار دیتا تھا۔ وہ عبادت سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور اسلام انسان کو ہر وقت الٰہی آستانہ پر جھکے رہنے کی تعلیم دیتا تھا۔ غرض تعلیم میں اختلاف تھا، عبادت میں اختلاف تھا، رسم و رواج میں اختلاف تھا، مطمح نظر میں اختلاف تھا۔ پھر مکہ والے الہام کے قائل نہیں تھے مگر قرآن نزولِ الہام کا قائل تھا۔ اسی طرح وہ خدا تعالیٰ کی خاص قدرتوں کے قائل نہیں تھے مگر قرآن اس بات کا قائل تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے نشانات سے اپنی ذات کا ثبوت دیا کرتا ہے۔ پھر وہ اس بات پر دن رات فخر کیا کرتے تھے کہ ہم آزاد ہیں کسی کے ماتحت نہیں۔ مگر قرآن کی تعلیم یہ تھی کہ سب ایک ہاتھ پر جمع ہو جاؤ اور منظم ہو کر اپنی اور

دوسری اقوام کی اصلاح کرو۔غرض اٹھنا بیٹھنا،سونا جاگنا، چلنا پھرنا ہر اک امر کو اسلام ایک نظام کے ماتحت لاتا تھا اور اس طرح کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس میں غیر مسلم عربوں اور قرآنی تعلیم کے درمیان اتحاد ہوسکتا۔قرآن کریم ان کے خیالات میں بھی دخل دیتا تھا،ان کے اخلاق میں بھی دخل دیتا تھا،ان کے عقائد میں بھی دخل دیتا تھا،ان کی سیاسیات میں بھی دخل دیتا تھا۔ان کی اقتصادیات میں بھی دخل دیتا تھا۔غرض کوئی معاملہ ایسا نہ تھا جس میں اسلام دخل اندازی نہ کرتا ہو۔اتنی لمبی اور تفصیلی باتیں منوانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی بڑی مشکلات پیش آسکتی تھیں مگر یہ الٰہی فعل ہی تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی کو اطلاع دیتے ہیں کہ مجھ پر یوں وحی ہوئی ہے۔تو بیوی یہ نہیں کہتی کہ یہ کیا پاکھنڈ بنانے لگے ہو بلکہ وہ کہتی ہے كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِى الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔آپ گھبرائیں نہیں آپ نے جو کچھ دیکھا ٹھیک دیکھا۔اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہ کرسکتا تھا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔نادار کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔گم شدہ نیکیوں کو قائم کرتے ہیں۔مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی مدد کرتے ہیں۔پھر بیوی آپ کو اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہے جو اسرائیلی علوم کے عالم تھے تو وہ سنتے ہی فرماتے ہیں کہ یہ ویسی ہی وحی ہے جیسے موسیٰ پر نازل ہوئی تھی (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) اور ویسے ہی احکام اور فرامین اس وحی میں پائے جاتے ہیں جیسے موسیٰ کی وحی میں پائے جاتے تھے۔گھر میں ایک چچیرا بھائی جو جوانی کی عمر کو پہنچنے والا ہے اور نوجوانوں میں تبلیغ کا اچھا ذریعہ بن سکتا ہے جب وہ اپنے بھائی اور بھاوج کو نہایت سنجیدگی سے ایک اہم تغیر کی نسبت باتیں کرتے ہوئے سنتا ہے تو بڑی متانت سے آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ میں بھی یقین رکھتا ہوں کہ آپ سچے ہیں اور ضرور خدا تعالیٰ نے آپ سے یہ باتیں کی ہیں اور آپ کو دنیا کی اصلاح کے لئے مامور کیا ہے۔ایک آزاد کردہ غلام جو آپ کے اخلاق کا شکار ہو کر ماں باپ کو چھوڑ کر آپ کے دروازہ پر بیٹھ گیا تھا۔جب ان آہستہ آہستہ ہونے والی باتوں کو سنتا ہے اور اپنے آقا کے چہرہ پر فکر و اندیشہ کے آثار دیکھتا ہے تو آگے بڑھ کر اپنے آقا کے دامن کو تھام لیتا ہے اور کہتا ہے میرے آقا وہی ہوگا جو آپ نے دیکھا۔آپ جیسے انسان سے قدرت دھوکا بازی نہیں کرسکتی۔اب وہ وقت آگیا ہے کہ آپ کے ہاتھوں دنیا کی اصلاح ہو۔مجھے بھی اپنے ساتھ رہنے اور خدمت کرنے کی اجازت دیجئے۔ایک ہی گہرا دوست جو گویا ایک ہی صدف میں پلنے والا دوسرا موتی تھا جب سنتا ہے کہ اس کے دوست نے بے پر کی اڑانی شروع کردی ہے اور شاید اس کے دماغ میں خلل آگیا ہے تو بھاگا ہوا جاتا ہے اور دروازہ کھلوا کر پوچھتا ہے کہ کیا جو کچھ سنتا ہوں سچ ہے؟ جب آپ اس کے سامنے تشریح کرنے لگتے ہیں تو کہتا

ہے خدا کی قسم دلیلیں نہ دیجئے صرف یہ بتائیے کیا یہ باتیں سچ ہیں اور آپ کی تصدیق کرنے پر کہتا ہے میرے سچے دوست میں آپ کی رسالت پر ایمان لایا۔آپ تو غضب ہی کرنے لگے تھے کہ دلیلیں دے کر میرے ایمان کو مشتبہ کرنے لگے تھے۔میرے دوست جس نے تیرے چہرہ کو دیکھا وہ کب تیری بات میں شبہ کرسکتا ہے(تاریخ الخلفاء للسیوطی: ابو بکر رضی اللہ عنہ)۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مخالفت ہونی ہی چاہیئے تھی کیونکہ بقول ورقہ بن نوفل کہ لَمۡ یَأۡتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثۡلِ مَا جِئۡتَ بِهٖ اِلَّا عُوۡدِیَ (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) یعنی جو شخص بھی ایسا پیغام لایا لوگوں کی مخالفت سے نہیں بچا۔مگر خدا تعالیٰ کی تدبیر دیکھو کہ اس مخالفت کا طوفان آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کس طرح آپ کے ساتھی پیدا کر دیئے۔ساکنینِ مکہ میں سے ایک ہی اسرائیلیات کا عالم ورقہ پہلے حملہ میں ہی آپ کے آگے گھٹنے ٹیک گیا۔رفیقہ حیات خدیجہؓ نے وحی سنتے ہی آپ کی بلائیں لیں۔ نوعمر بھائی علیؓ جو ہر وقت آپ کے عائلی اخلاق کو دیکھتا تھا اپنی خدمات پیش کرنے لگا۔وہ آزاد غلام زید جس نے آپ کے لین دین اور غرباء سے سلوک کا گہرا اور لمبا مطالعہ کیا تھا آپ کی صداقت کی قسمیں کھانے لگا۔بچپن کا دوست، مکہ کا محسن، شرافت کا پتلا ابوبکرؓ صرف اتنا سن کر کہ آپ نے وحی کا دعویٰ کیا ہے اپنے گلے میں غلامی کا پٹکہ ڈال کر دروازہ پر آبیٹھا۔اس عقیدت و اخلاص کے بے نظیر مظاہرہ نے آپ کے دل میں کس قدر خوشی نہ پیدا کر دی ہوگی۔مکہ والوں کی ہاؤہُو، ان کے طعنہ سن کر آپ کس طرح مسکرا دیتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے یہ تمہارا فتویٰ ہے جو مجھے نہیں جانتے۔اب ذرا اس فتویٰ کو بھی تو سنو جو مجھے جاننے والوں نے دیا ہے۔کس طرح جانیں دے کر وہ میرے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔موسیٰؑ نے دعا مانگ کر ایک وزیر بوجھ اٹھانے کے لئے مانگا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے پانچ وزیر بن مانگے ہی دے دیئے اور ایسے وزیر جنہوں نے آپ کا بوجھ بٹانے میں کمال کر دکھایا۔ورقہ بے شک جلدی فوت ہو گئے مگر ایک نہ مٹنے والی شہادت آپ کی صداقت پر دے گئے۔حضرت خدیجہؓ نے بارہ سال تک اس کے بعد عورت ہو کر وہ کام کر کے دکھایا کہ بہادر سے بہادر مرد کی بھی آنکھیں نیچی ہوتی ہیں۔ زیدؓ نے بیس سال تک اس کے بعد قربانی کا بے مثال نمونہ دکھایا اور آخر تلواروں کی دھاروں کے سامنے اپنا خون بہا کر ثابت کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر کیسے ہونے چاہئیں۔ابوبکرؓ اور علیؓ تو آپ کی وفات کے بعد بھی رہے اور خلیفہ بن کر وزارت کا ایک نئے رنگ میں ثبوت دے گئے۔

وَ وَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ میں شیعہ اصحاب کے خیالات کی تردید

شیعہ اصحاب ذرا اس آیت پر غور کریں تو خلافت کے جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔اسی مفہوم کی آیت حضرت موسیٰؑ کے بارہ میں آتی ہے وہ دعا

کرتے ہیں وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ (طٰہٰ:۳۰) اور اس کے معنے اختلافی نہیں مسلمہ ہیں کہ موسیٰؑ دشمنوں کی مخالفت کے خیال سے فوراً ہی ایک مومن کا مطالبہ کرتے ہیں جو آپ کا بوجھ اٹھائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اللہ تعالیٰ خود فرما دیتا ہے کہ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ اس خبر کے مطابق وہ کون لوگ تھے جو آپ پر سنتے ہی ایمان لائے۔ یقیناً یہی پانچ جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ پس یہ پانچوں آپ کے وزیر تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تین آپ کی زندگی میں فوت ہو گئے کیونکہ حضرت ہارون بھی تو حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ مگر فوت ہونے والوں کو نکال بھی دو تو بھی فوراً ایمان لانے والوں میں سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ دونوں ہی ہیں اور دونوں ہی اس آیت کے ماتحت آپ کا بوجھ بٹانے والے ہیں ان میں سے کسی ایک کو برا کہنا قرآن کریم کی تکذیب اور تضحیک ہے۔

ہم کئی مدعیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ادھر دعویٰ کرتے ہیں اور ادھر ان کے اپنے رشتہ دار انہیں پاگل کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ بیوی کہتی ہے تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے، بیٹا کہتا ہے تو پاگل ہو گیا ہے، دوست کہتے ہیں تیری عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ وہ تلاش کرتے ہیں کہ کوئی ان کو ساتھی ملے مگر نہیں ملتا۔ بے شک بعض کو ان کے رشتہ داروں نے مانا بھی ہے مگر شروع میں اکثر ایسا ہی نظارہ نظر آتا ہے کہ ان کو ساتھی نہیں ملتے اور اگر ملتے بھی ہیں تو فاتر العقل۔ مگر یہاں پہلے دن ہی یہ پانچوں شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کا شکار ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دعا کی تھی کہ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ۔ تو خدا تعالیٰ نے ان کی اس دعا کو فوراً قبول نہیں کر لیا بلکہ فرمایا تم سفر کرتے چلے جاؤ جب مصر پہنچو گے تو وہاں تمہیں ہارون مل جائے گا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ دعا کرتے ہیں نہ سفر کرتے ہیں، نہ محنت اور مشقت برداشت کرتے ہیں اور پہلے دن ہی آپ کو پانچ وزیر مل جاتے ہیں۔ یہی وہ حقیقی پنجتن ہیں جن سے اسلام کا آغاز ہوا۔ بے شک جسمانی اولاد کے لحاظ سے پنجتن اور ہیں مگر روحانی لحاظ سے خدا تعالیٰ نے پہلے ہی دن آپ کو پنجتن دے دیئے تھے جن میں سے ہر شخص آپ کا جاں نثار اور فدائی تھا۔ پس فرماتا ہے وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ ہم نے تیرا بوجھ اتار دیا اور تیری مدد کے لئے وہ لوگ کھڑے کر دیئے جنہوں نے تیرے بوجھ کے نیچے اپنے کندھے دے دیئے اور کہا یا رسول اللہ ہم اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔

پھر قریب زمانہ میں طلحہؓ اور زبیرؓ اور عمرؓ اور حمزہؓ اور عثمان بن مظعونؓ اس قسم کے ساتھی آپ کو مل گئے۔ جن میں سے ہر شخص آپ کا فدائی تھا، ہر شخص آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کے لئے تیار تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

تیرہ سال تک مصائب بھی آئے، مشکلات بھی آئیں۔ تکالیف بھی آپ کو برداشت کرنی پڑیں۔ مگر آپ کو اطمینان تھا کہ ان مکہ والوں میں سے عقل والے، سمجھ والے، رتبہ والے، تقویٰ والے، طہارت والے مجھے مان چکے ہیں اور اب مسلمان ایک طاقت سمجھے جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتا کہ وہ پاگل ہے تو اس کے دوسرے ساتھی ہی اسے کہتے کہ اگر وہ پاگل ہے تو فلاں شخص جو بڑا سمجھدار اور عقلمند ہے اسے کیوں مانتا ہے؟ یہ ایک ایسا جواب تھا جس کے مقابلہ میں کوئی شخص بولنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ یوروپین مصنف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنا تمام زور بیان صرف کر دیتے ہیں اور بسا اوقات آپ پر گند اچھالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے مگر جہاں ابوبکرؓ کا نام آتا ہے وہ کہتے ہیں ابوبکرؓ بڑا بے نفس تھا۔ اس پر بعض دوسرے یوروپین مصنف لکھتے ہیں کہ جس شخص کو ابوبکرؓ نے مان لیا وہ جھوٹا کس طرح ہو گیا۔ اگر وہ بے نفس تھا تو اس نے ایسے لالچی کو مانا کیوں؟ اور اگر وہ واقع میں بے نفس تھا تو پھر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کا آقا بھی بے نفس تھا۔ یہ ایک بہت بڑی دلیل ہے جس کو ردّ کرنا آسان نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ آپ کو جاہل کہتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے اس اعتراض کو ردّ کرنے کے لئے ایسے سامان کر دیئے کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ شروع میں ہی آپ پر ایمان لے آئے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی بھی دعویٰ سے پہلے آپ کی تعریف کرنے والے تھے۔ پھر جب آپ نے دنیا میں اپنی ماموریت کا اعلان کیا تو تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت اللہ تعالیٰ نے ایسی کھڑی کر دی جو فوراً آپ پر ایمان لے آئی۔ یہ تعلیم یافتہ لوگ علماء میں سے بھی تھے، امراء میں سے بھی تھے اور انگریزی دان طبقہ میں سے بھی تھے۔

رعب اور دبدبہ تین ہی چیزوں سے ہوتا ہے۔ یا تو ایمان سے ہوتا ہے یا علم سے ہوتا ہے اور یا روپیہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تینوں چیزیں آپ کی جماعت میں پیدا کر دیں۔ ایسے لوگ بھی آپ کو دے دیئے جو اپنے اندر صلاحیت اور نورِ ایمان رکھتے اور چوٹی کے علماء سمجھے جاتے تھے۔ ایسے لوگ بھی آپ کو دے دیئے جو امراء میں سے تھے اور ایسے لوگ بھی آپ کو دے دیئے جو انگریزی دان تھے اور اس طرح نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ پر اچھا اثر ڈال سکتے تھے۔ جب لوگ کہتے کہ مرزا صاحب جاہل ہیں تو ان کے اپنے آدمی ان کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاتے اور کہتے اگر وہ جاہل ہے تو کالج کے سٹوڈنٹ اس کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہیں۔ پھر جب لوگ کہتے کہ مرزا صاحب کو دین کی واقفیت نہیں تو ان کے اپنے بعض آدمی کہتے کہ اگر انہیں دین کی واقفیت نہیں تو علماء ان کے پیچھے کیوں بھاگے چلے جاتے ہیں۔ پھر جب لوگ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب دنیا پرست ہیں تو ان کے اپنے بعض آدمی کہتے ہیں کہ اگر وہ دنیا پرست ہے

تو وجہ کیا ہے کہ امراء اور دنیا کی عیاشیوں میں مبتلا انسان اپنی دولت کو قربان کر کے اس کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں؟ غرض ہر طبقہ کے لوگ علماء میں سے بھی، امراء میں سے بھی اور انگریزی دانوں میں سے بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو عطا فرمائے اور اس لئے عطا فرمائے تا اس اعتراض کا ازالہ ہو کہ آپ جاہل ہیں یا آپ دنیادار ہیں یا آپ علم دین سے واقفیت نہیں رکھتے۔ یہی حال ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھتے ہیں کہ ہر طبقہ کے لوگ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرما دیئے۔ عثمانؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ مکہ کے چوٹی کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر کوئی کہتا کہ ادنیٰ ادنیٰ لوگ اس کے ساتھ ہیں اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے اس کو قبول نہیں کیا تو عثمانؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ اس کا جواب دینے کے لئے موجود تھے اور اگر کوئی کہتا کہ چند امراء کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر لیا گیا ہے۔ غرباء جن کی دنیا میں اکثریت ہے انہوں نے اس مذہب کو قبول نہیں کیا تو زیدؓ اور بلالؓ وغیرہ اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے موجود تھے اور اگر بعض لوگ کہتے کہ یہ نوجوانوں کا کھیل ہے تو لوگ ان کو یہ جواب دے سکتے تھے کہ ابوبکرؓ تو نوجوان اور ناتجربہ کار نہیں۔ انہوں نے کس بنا پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کر لیا ہے؟ غرض وہ کسی رنگ میں دلیل پیدا کرنے کی کوشش کرتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے ہر شخص ان دلائل کو ردّ کرنے کے لئے ایک زندہ ثبوت کے طور پر کھڑا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل حال تھا۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے وَ وَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ الَّذِيۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ۔ اے محمد رسول اللہ! کیا دنیا کو نظر نہیں آتا کہ جن سامانوں سے دنیا جیتا کرتی ہے وہ سارے سامان ہم نے تیرے لئے مہیا کر دیئے ہیں۔ اگر دنیا قربانی کرنے والے نوجوانوں سے جیتا کرتی ہے تو وہ تیرے پاس موجود ہیں۔ اگر دنیا تجربہ کار بڈھوں کی عقل سے ہارا کرتی ہے تو وہ تیرے پاس موجود ہیں۔ اگر دنیا مالدار اور بارسوخ خاندانوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے شکست کھاتی ہے تو وہ تیرے پاس موجود ہیں اور اگر عوام الناس کی قربانی اور فدائیت کی وجہ سے دنیا جیتا کرتی ہے تو یہ سارے غلام تیرے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تو ہار جائے اور یہ مکہ والے تیرے مقابلہ میں جیت جائیں۔ پس وَ وَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ الَّذِيۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ کے معنے یہ ہیں کہ وہ بوجھ جس نے تیری کمر کو توڑ دیا تھا وہ ہم نے خود اٹھا لیا تو نے اس کام کی طرف نگاہ کی اور حیران ہو کر کہا کہ میں یہ کام کیونکر کروں گا۔ خدا نے ایک دن میں ہی تجھے پانچ وزیر دے دیئے۔ ابوبکرؓ کا ستون اس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کے لئے کھڑا کر دیا۔ خدیجہؓ کا ستون اس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کے لئے کھڑا کر دیا۔ علیؓ کا ستون اس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کے لئے کھڑا کر دیا۔ زیدؓ کا ستون اس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کے لئے کھڑا کر دیا۔ ورقہ بن نوفل کا

ستون اس نے اسلام کی چھت قائم کرنے کے لئے کھڑا کر دیا اور اس طرح وہ بوجھ جو تجھ اکیلے پر تھا وہ ان سب لوگوں نے اٹھالیا۔

وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ میں قرآن کے دلکش ہونے کی طرف اشارہ اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ ہم نے تجھے ایسی تعلیم دی ہے جو آپ ہی آپ دلوں کو موہ لیتی ہے۔ بعض تعلیمیں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر اچھی ہوتی ہیں مگر وہ ایسی فلسفیانہ باتوں پر مشتمل ہوتی ہیں کہ ان کا سمجھنا لوگوں کے لئے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ وہی تعلیم ملک میں فوری طور پر مقبولیت حاصل کر سکتی ہے جو سمجھنے میں آسان ہو اور جس میں ہر فطرت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ پس وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ میں ایک یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ تجھے اپنی تعلیم کا پھیلانا بڑا مشکل نظر آتا تھا مگر ہم نے اسے اس قدر دلکش اور اس قدر جاذبیت رکھنے والی بنایا ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ تیری طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ عرب لوگ عورتوں کو ان کے حقوق نہیں دیتے تھے۔ مگر قرآن کریم نے ان کے حقوق کو محفوظ کر دیا۔ عرب لوگ غلاموں کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا کرتے تھے مگر اسلام نے ان کو ایسی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا کہ جس کے بعد دنیا میں کوئی غلامی نہیں رہتی۔ عرب لوگ ورثہ کی تقسیم کے وقت جنبہ داری سے کام لینے کے عادی تھے اور وہ اپنے رعب کی وجہ سے لوگوں کے حقوق کو غصب کر لیا کرتے تھے مگر اسلام نے اس نقص کا بھی ازالہ کر دیا اور تمام ورثاء کے حقوق شریعت میں مقرر کر دیئے۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جو شخص بھی ایسی اچھی تعلیم کو سنے گا اس کا دل پکار اٹھے گا کہ یہ تعلیم درست ہے۔ پس فرماتا ہے اگر تیری تعلیم فلسفیانہ اور پیچیدہ ہوتی تو لوگوں کا تجھے قبول کرنا مشکل ہوتا۔ مگر ہم نے جو تعلیم تجھے دی ہے وہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ جو بھی پاکیزہ فطرت رکھنے والا انسان اس تعلیم کو سنتا ہے فوراً کہہ اٹھتا ہے اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا۔ میں ایمان لایا اور میں اس کی صداقت کو قبول کرتا ہوں۔

مجھے ایک لطیفہ ہمیشہ یاد آیا کرتا ہے۔ لدھیانہ کے ایک دوست میاں نظام الدین صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت تعلق رکھا کرتے تھے اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے بھی وہ دوست تھے۔ جب انہوں نے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کی زبان سے سنا کہ مرزا صاحب کہتے ہیں حضرت مسیح ناصری فوت ہو چکے ہیں تو انہوں نے خیال کیا کہ مرزا صاحب تو بہت نیک آدمی ہیں معلوم ہوتا ہے لوگ ان پر غلط الزام لگاتے ہیں یا ان کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے ورنہ وہ قرآن کے خلاف ایسا دعویٰ دنیا کے سامنے کیوں پیش کرتے۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ میں خود قادیان جاؤں گا اور مرزا صاحب کو سمجھاؤں گا کہ وہ اس قسم کا دعویٰ ترک کر دیں اور امید ظاہر کی کہ مرزا صاحب میری بات ضرور مان جائیں گے۔ کیونکہ وہ قرآن کے خلاف کوئی بات اپنی زبان سے نہیں نکال سکتے۔ اس فیصلہ کے بعد

وہ قادیان آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا کہ میں نے سنا ہے آپ کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہاں یہ درست ہے۔ وہ بولے میں نے تو سمجھا تھا لوگ یونہی غلط باتیں مشہور کر رہے ہیں اور آپ کہتے ہیں یہ درست ہے۔ اچھا بتائیے جب قرآن میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو آپ خلافِ قرآن ایسا دعویٰ کیوں کر رہے ہیں؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا میاں نظام الدین صاحب! میں تو قرآن کی ہر بات مانتا ہوں اگر قرآن سے حیاتِ مسیح ثابت ہو جائے تو میں آج ہی اپنی بات چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ کہنے لگے بس یہی میں کہتا تھا کہ مرزا صاحب قرآن کے خلاف نہیں جا سکتے ضرور اُنہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اگر اُن پر یہ حقیقت روشن کر دی جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو وہ اپنی بات کو بالکل چھوڑ دیں گے اچھا اب اس بات پر مضبوط رہیے اگر میں سو آیات ایسی لے آیا جن سے حیاتِ مسیح ثابت ہوتی ہو تو کیا آپ اپنا دعویٰ چھوڑ دیں گے؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا سو آیات کا کیا ذکر ہے ہم تو قرآن کا ایک ایک لفظ مانتے ہیں اگر آپ ایک آیت بھی لے آئیں تو میں اپنا دعویٰ چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگے اچھا اگر سو آیات نہ ہوئیں اور صرف چالیس پچاس آیتیں ہوئیں تب بھی آپ اپنا دعویٰ چھوڑ دیں گے؟ حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام نے فرمایا میں تو کہہ چکا ہوں کہ آپ ایک آیت ہی لے آئیں پچاس آیات کے لانے کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے اچھا دس آیات تو میں ضرور لے آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ قادیان سے چلے اور سیدھے لاہور پہنچے۔ لاہور میں اُن دنوں حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ جموں سے چھٹی پر آئے ہوئے تھے اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی سے مباحثہ کے لئے شرائط کا تصفیہ کر رہے تھے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو فخر کی بہت عادت تھی انہوں نے اشتہار شائع کیا ہوا تھا کہ مرزا صاحب تو میرے مقابلہ میں نہیں نکلتے اب نورالدین آیا ہوا ہے میں دیکھوں گا کہ وہ میرے پنجہ سے کس طرح نکلتا ہے۔ بہت دنوں تک شرائط کا تصفیہ ہوتا رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ حضرت خلیفہ اوّلؓ فرماتے تھے کہ ہمارے تمام جھگڑوں کے لئے قرآن حَکَم ہے۔ ہمیں اس سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ مگر مولوی محمد حسین صاحب کہتے تھے کہ حدیثیں بھی ضرور شامل کرنی چاہئیں۔ آخر کئی دن کی بحث کے بعد حضرت خلیفہ اولؓ نے مان لیا کہ اچھا قرآن کے علاوہ بخاری کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب حضرت خلیفہ اوّلؓ نے یہ آخری جواب دیا تو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی چینیاں والی مسجد میں بیٹھے بڑے زور سے لاف زنی کر رہے تھے کہ نورالدین نے یوں کہا اور میں نے اس کی دلیل کو یوں توڑا۔ اس نے اِس طرح کیا اور میں نے اسے اس طرح رگیدا اور آخر میں نے منوا لیا کہ قرآن کے علاوہ اس موضوع کے لئے بخاری بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ ابھی وہ

یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میاں نظام الدین صاحب جا پہنچے اور کہنے لگے چھوڑیں بھی آپ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے دس آیتیں ایسی لکھ دیجئے جن میں حیاتِ مسیح کا ذکر آتا ہو۔ میں قادیان گیا تھا اور مرزا صاحب سے یہ منوا کر آیا ہوں کہ اگر میں دس آیتیں ایسی لے آیا تو وہ اپنے دعویٰ سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اس لئے ان جھگڑوں کو رہنے دیجئے اور جلدی سے مجھے دس آیتیں ایسی لکھ دیجئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر قرآن سے حیات مسیح ثابت ہوگئی تو پھر آپ کو شاہی مسجد لاہور میں اپنے عقیدہ سے توبہ کرنی پڑے گی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہاں مجھے یہ شرط منظور ہے۔ میاں نظام الدین صاحب اس پر بڑے خوش تھے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب سے بھی انہوں نے کہا کہ آپ یہ کیا بحث مباحثہ لیے بیٹھے ہیں۔ مجھے دس آیتیں لکھ دیجئے میں ابھی مرزا صاحب کو لاہور لا کر شاہی مسجد میں ان سے توبہ کرا دوں گا۔ مولوی محمد حسین صاحب جو اسی وقت اپنے ساتھیوں میں فخر کر رہے تھے کہ میں نے نورالدین کو یوں پکڑا اور میں نے اسے یوں رگیدا، انہوں نے جب یہ بات سنی تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور انہوں نے کہا احمق! تجھے کس نے کہا تھا کہ بیچ میں دخل دیتا۔ میں دو مہینے بحث کر کر کے اس مضمون کو حدیث کی طرف لایا تھا تو پھر قرآن کی طرف لے گیا۔ وہ آدمی تھے نیک جونہی یہ الفاظ ان کے کان میں پڑے ان پر سناٹا سا چھا گیا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہے جیسے انسان کسی نئے صدمہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور پھر ایک آہ کھینچ کر کہنے لگے مولوی صاحب اگر یہی بات ہے تو پھر جدھر قرآن ہے ادھر ہی ہم ہیں۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے واپس آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت میں شامل ہو گئے (حیاتِ احمد جلد سوم صفحہ ۲۳۲ تا ۲۳۵ مطبوعہ ۲۰۱۴ء)۔ تو دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بات چونکہ فطرت کے مطابق تھی میاں نظام الدین صاحب اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یہی قرآنی تعلیم کا حال ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو جو بھی حکم دیا ہے اس میں ہر قسم کی فطرت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص کہے کہ قرآن کا فلاں حکم ناقابل عمل ہے یا فطرت انسانی کے خلاف اس میں تعلیم دی گئی ہے۔ ہر حکم اپنی ذات میں کامل ہے اور ہر حکم ایسا ہے جس پر آسانی کے ساتھ عمل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن باقی مذاہب میں یہ خوبی نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف اوقات میں اپنے لئے حکومتوں سے کئی قسم کے قوانین نافذ کرانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اُن خامیوں کا ازالہ ہو سکے جو ان کے مذہب میں پائی جاتی ہیں۔ ہندو بھی آج کل اسی رَو میں بہہ رہے ہیں اور وہ اپنے لئے ایسا لاء تیار کرنا چاہتے ہیں جو موجودہ زمانہ کے حالات کے مطابق ہو۔ لیکن دراصل وہ جو کچھ کر رہے ہیں قرآن کی نقل ہے اور اگر کسی جگہ وہ اس تعلیم سے انحراف کریں گے تو لازماً ٹھوکر کھائیں گے اور اس

کے غلط نتائج انہیں جلد ہی نظر آنے لگ جائیں گے۔ غرض فرماتا ہے وَ وَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ الَّذِيۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ۔ اے محمد رسول اللہ کیا ہم نے تجھے یہ سامان نہیں بخشا کہ ایک طرف تجھے ہم نے ایسے ساتھی دیئے جنہوں نے تیرا بوجھ اٹھالیا اور دوسری طرف ہم نے تجھے ایسی تعلیم دی جو خود بخود فطرت کے اندر نفوذ کرتی چلی جاتی ہے کوئی روک اس کی اشاعت میں حائل نہیں ہوتی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب کفار مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کرلیا کہ میں بھی مکہ کو چھوڑ کر کہیں باہر چلا جاؤں۔ ایک دن آپ اسی ارادہ سے باہر جارہے تھے کہ راستہ میں آپ کو مکہ کا ایک رئیس ملا اور اس نے دریافت کیا کہ آپ کہاں جارہے ہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا میں یہاں سے ہجرت کر کے کہیں باہر جارہا ہوں۔ اس نے کہا ہجرت؟ وہ شہر نہ اجڑ جائے جس میں سے تم سا انسان نکل جائے۔ میں تمہیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ آئندہ تمہیں کوئی شخص دکھ نہ دے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس آگئے اور اس رئیس نے اعلان کر دیا کہ ابوبکرؓ میری پناہ میں ہیں۔ مکہ والے پناہ کا بڑا لحاظ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس اعلان کے بعد ایسا ہی ہوا کہ مکہ والوں نے حضرت ابوبکرؓ کو دکھ دینا ترک کر دیا اور آپ آزادانہ رنگ میں مکہ کے گلی کوچوں میں پھرتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طبیعت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طبیعت سے ملتی تھی اور سوز اور گداز کا مادہ آپ میں بہت زیادہ تھا۔ جب صبح کے وقت آپ اٹھتے تو قرآن کریم کی تلاوت نہایت سوز اور رقت کے ساتھ کرتے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو بہتے جاتے۔ مکہ کی عورتیں اور بچے جب اس نظارہ کو دیکھتے وہ اکٹھے ہو جاتے اور نہایت توجہ کے ساتھ کان لگا کر سنتے کہ ابوبکرؓ کیا پڑھ رہے ہیں۔ جب ایک طرف وہ ابوبکرؓ کی رقت اور گریہ وزاری کو دیکھتے اور دوسری طرف قرآن کریم کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم ان کے کانوں میں پڑتی تو وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگ جاتے کہ واہ وا یہ کیسی اچھی باتیں ہیں۔ یہ اثر روز بروز بڑھتا چلا گیا یہاں تک مکہ والوں کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر ابوبکرؓ اسی طرح قرآن پڑھتے رہے تو ہماری عورتیں اور بچے سب مسلمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ اکٹھے ہو کر اس رئیس کے پاس گئے جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی پناہ میں لیا تھا۔ اور کہا کہ اپنی پناہ واپس لے لو ورنہ ہمارا دین بگڑ جائے گا (صحیح بخاری کتاب مناقب الانصار باب هجرة النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینة)۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح قرآن کریم لوگوں کے دلوں میں دھنستا جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے وہ نکلے تو اس ارادہ سے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کریں مگر جب انہیں اپنی بہن سے قرآن سننے کا موقع ملا اور چند آیتیں ہی کان میں پڑیں تو ان کے آنکھوں سے آنسو بہنے لگ

گئے اور اسی حالت میں کہ تلوار ان کے ہاتھ میں تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمر کس ارادہ سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں تو غلام بننے کے لئے حاضر ہوا ہوں (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ذکر اسلام عمر بن الخطاب)۔ قرآن کریم کی اسی معجزانہ تعلیم کی طرف اللہ تعالیٰ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر سے اس بوجھ کو کہ میں لوگوں کو منواؤں گا کس طرح بالکل ہلکا کر دیا تھا۔

وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ۝۵

اور تیرے ذکر کو ہم نے بلند کر دیا۔

تفسیر۔ وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ میں آنحضرت صلعم کے غلبہ کے آثار کی طرف اشارہ تیسری چیز جو ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ اس طرف منعطف ہو جائے۔ دراصل دشمن کی توجہ کو کھینچنا سب سے اہم بات ہوتی ہے اور صرف وہی چیز لوگوں کی دشمنی کو کھینچتی ہے جو اپنے اندر غلبہ کے آثار رکھتی ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ مخالفت بُری چیز ہے حالانکہ یہ سب سے اچھی چیز ہے۔ طبائع میں جوش اسی چیز کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اس کا مقابلہ نہ کیا تو ہمیں نقصان پہنچائے گی اور ہمارے عقائد اور خیالات کا باطل ہونا ثابت کر دے گی۔ جب تک یہ احساس لوگوں کے اندر پیدا نہ ہو اس وقت تک ان کی طرف سے کبھی شدید مخالفت نہیں ہوتی۔ جب انبیاء علیہ السلام دعویٰ کرتے ہیں تو سارے ملک میں ان کے خلاف جوش پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں یہ تعلیم جو ان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے ایسی ہے کہ ایک دن ضرور غالب آ جائے گی۔ یہی حال سچے دنیوی علوم کا ہوتا ہے کہ جب کوئی نئی تحقیق لوگوں کے سامنے پیش کی جائے تو لوگ اس کی ضرور مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دلوں میں یہ ڈر پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ہم نے مخالفت نہ کی تو ہمارا نظریہ اس کے مقابلہ میں باطل ہو جائے گا۔ گلیلیو نے جب پرانے علم ہیئت کے خلاف دنیا میں یہ اعلان کیا کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے تو پادریوں نے اس کے خلاف فتوے دے دیئے یہاں تک کہ پوپ نے بھی کہا کہ یہ شخص جان سے مار دینے کے قابل ہے۔ کیونکہ بائبل کی تعلیم کے صریح خلاف ایک نیا نظریہ لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ آخر اسے اتنا دکھ دیا گیا کہ گلیلیو کو اعلان کرنا پڑا کہ معلوم ہوتا ہے میرے اوپر شیطان سوار تھا جس نے مجھے اس غلط راہ پر ڈال دیا۔ بائبل میں تو لکھا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے مگر مجھ بیوقوف کو یہ دکھائی دیا کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ میں

اعلان کرتا ہوں کہ نظر تو مجھے اسی طرح آتا ہے کہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے مگر چونکہ بائبل کہتی ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے اور شیطان میرے سر پر سوار ہے۔ پادری اس اعلان پر خوش ہو گئے اور انہوں نے سمجھا کہ گلیلیو نے توبہ کر لی ہے۔ حالانکہ یہ اعلان خود بتا رہا تھا کہ اس نے توبہ نہیں کی محض پادریوں کو خوش کرنے کے لئے اس نے ایسے الفاظ میں اعلان کر دیا جس سے وہ دھوکہ کھا گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ گلیلیو نے اپنے نظریہ کو ترک کر دیا ہے۔ غرض مادی دنیا ہو یا روحانی اس میں جب بھی کوئی ایسی بات نکلتی ہے جس کے خلاف لوگوں کے عقائد ہوتے ہیں تو لوگ اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ بات دنیا میں پھیل گئی تو ہم جس تعلیم کو پیش کرتے ہیں وہ دنیا میں کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعد میں صداقت کو بہر حال تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ مگر ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ مخالفت کرتے ہیں اور ہر قسم کی تدابیر سے سچائی کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی مخالفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ہم نے تیرا ذکر بلند کر دیا ہے۔ یہاں ذکر کا بلند ہونا ماننے کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تیرا ذکر ہو رہا ہے چاہے اچھے رنگ میں ہو یا برے رنگ میں۔ تعریف کے رنگ میں ہو یا مذمت کے رنگ میں۔ بہر حال ہر مجلس اور ہر محفل اور ہر گھر اور ہر خاندان میں تیرا نام بلند ہو رہا ہے اور ایک شور ہے جو تیری وجہ سے برپا ہے۔ کوئی کہتا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیا بات کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور بت کوئی چیز نہیں۔ ہم تو باپ دادا سے ان بتوں کو مانتے چلے آئے ہیں۔ اس کے کہنے کی وجہ سے بتوں کی پرستش کو کس طرح ترک کر دیں۔ کوئی کہتا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہا تم بے شک اپنے بتوں کو جوتیاں مار کر دیکھ لو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ پھر کوئی اور بول اٹھتا اور کہتا یہ فتنہ بڑھتا جا رہا ہے آؤ ہم لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پاگل ہو گیا ہے۔ اس پر ایک چوتھا شخص کہہ اٹھتا کچھ ہوش کی دوا کرو کیا وہ پاگل ہے؟ اگر پاگل ہوتا تو ایسے ایسے سمجھدار اشخاص اس کی طرف کیوں کھچے چلے جاتے۔ اس پر ایک پانچواں شخص کہتا پاگل تو نہیں مگر شاعر ضرور ہے مگر پھر انہی میں سے کوئی بول اٹھتا اس کی کتاب تو دیکھو کیا وہ شعروں میں ہے اگر نہیں تو تم اسے شاعر کس طرح کہہ سکتے ہو۔ کوئی اور کہتا اصل میں وہ نہ پاگل ہے نہ شاعر۔ بلکہ درحقیقت کاہن ہے اور کاہنوں کی طرح غیب کی بعض خبریں دے دیتا ہے۔ اس پر پھر بعض لوگ انہی میں سے کھڑے ہو جاتے اور کہتے وہ کاہن کس طرح ہے وہ تو کاہنوں کو جھوٹا کہتا ہے۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا ایک سلسلہ تھا جو ہر مجلس اور ہر خاندان میں جاری تھا۔ جہاں بھی دیکھو یہی ذکر ہوتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بہت بڑا فتنہ پیدا

کر دیا ہے۔اس فتنہ کے سدباب کے لئے اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔مخالفت کا یہ جوش وخروش اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تذلیل کی یہ کوششیں ثبوت تھیں اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعلیم میں ایسی کشش رکھی تھی کہ دنیا سمجھتی تھی اس کا ہمارے ساتھ ٹکراؤ ہماری تباہی اور بربادی کا موجب بننے والا ہے۔یہی تیسری چیز ہے جو کامیابی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔لوگ شور مچاتے ہیں، مخالفت کے لئے پورے جوش سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کی تدابیر سے اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ ایسا کرتے ہیں سعادت مند طبائع تحقیق کی طرف مائل ہو جاتی ہیں اور آخر اس مخالفت کے نتیجہ میں وہ ایمان لے آتی ہیں۔

مخالفت ہدایت کا موجب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک دوست جو بہت بڑے شاعر تھے لغت کی انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کی دو تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں ریاست رامپور ان کو اس کام کے لئے وظیفہ دیا کرتی تھی، قادیان آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملے۔آپ نے ان سے پوچھا کہ آپ کو ہمارے سلسلہ کی طرف کیسے توجہ پیدا ہوئی؟ انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے ذریعہ سے۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کس طرح؟ انہوں نے عرض کیا مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' ہمارے ہاں آیا کرتا تھا میں یہ تو جانتا ہی تھا کہ مولوی محمد حسین صاحب بہت بڑی شہرت رکھنے والے اور سارے ہندوستان میں مشہور ہیں مگر ان کے رسالہ کو دیکھ کر بار بار میرے دل میں خیال آتا کہ اگر ان کے دل میں اسلام کا واقعی درد تھا تو انہیں چاہیے تھا کہ مدرسے جاری کرتے، قرآن اور حدیث کے درس کا انتظام کرتے، لوگوں کو اسلامی احکام پر عمل کرنے کی طرف توجہ دلاتے۔مگر انہیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ سارے کام چھوڑ کر بس ایک بات کی طرف ہی متوجہ ہو گئے ہیں اور دن رات احمدیت کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔اس میں ضرور کوئی بات ہے۔ چنانچہ مجھے ان کی مخالفت سے تحقیق کا خیال پیدا ہوا اور میں نے کسی شخص سے اپنے اس شوق کا اظہار کیا۔اس نے مجھے ''درثمین'' پڑھنے کے لئے دی۔میں نے اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں جب آپ کا کلام دیکھا تو میں نے کہا لو پہلا جھوٹ تو یہیں نکل آیا کہ کہا جاتا تھا مرزا صاحب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کرتے ہیں۔حالانکہ جو عشق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کے دل میں پایا جاتا ہے اس کی موجودہ زمانہ میں نظیر ہی نہیں ملتی۔اس کے بعد میں نے مزید تحقیق کی اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ احمدیت سچی ہے۔اسی طرح ہر سال مجھے دس بیس خطوط ضرور ایسے آجاتے ہیں جن میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ جب ہم نے احمدیت کی مخالفت میں کتابیں پڑھیں تو ہمارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہم جماعت احمدیہ کی کتابیں بھی پڑھ کر دیکھیں۔چنانچہ ہم نے آپ کی کتب کا

مطالعہ کیا اور ہمیں معلوم ہوا کہ سچے عقائد وہی ہیں جو آپ کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ لوگوں کی طرف سے مخالفت میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے اس لئے ہم آپ کی بیعت میں شامل ہوتے ہیں۔

وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ میں آنحضرت صلعم کی شہرت پھیل جانے کی پیش گوئی اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ ہمارا تجھ پر کتنا بڑا احسان ہے کہ آج ہر مجلس میں تیرا ذکر ہورہا ہے۔ سیاستدان کہتے ہیں اب کیا ہوگا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کر دیا ہے۔ عالم کہتے ہیں اب کیا ہوگا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کر دیا ہے۔ تاجر کہتے ہیں اب کیا ہوگا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کر دیا ہے۔ کاہن کہتے ہیں اب کیا ہوگا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کر دیا ہے۔ غرض ہر سننے والا کہتا ہے کہ اب کچھ ہونے والا ہے۔ اب دنیا میں کوئی نہ کوئی انقلاب پیدا ہونے والا ہے۔ پس وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ ہم نے تیرے ذکر کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ ہر مجلس اور ہر نادیہ میں تیرا ذکر ہونے لگا ہے۔ لوگوں کی طبائع میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا ہے اور وہ اس بات پر مجبور ہوگئے ہیں کہ تیری طرف توجہ کریں۔ اس کا نتیجہ تیرے حق میں لازماً اچھا ہوگا کیونکہ لوگ جب غور کریں گے تو ان پر تیری صداقت واضح ہو جائے گی۔ اس کی ایک موٹی مثال دیکھ لو ورقہ بن نوفل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مکہ میں مسیحیت کا پرچار کرتے رہتے تھے۔ مگر مکہ والوں میں کوئی شور نہ تھا۔ وہ ان کی باتوں کو سنتے اور ہنس کر چلے جاتے (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی)۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی آواز بلند کی، عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مخالفت کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہر شخص آپ کو کچلنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ اسی طرح زید بن عمرو جو حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی تھے وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٔ نبوت سے قبل توحید کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ مگر کبھی ان کی مخالفت نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کھانے کی دعوت دی انہوں نے کہا میں مشرکوں کا کھانا نہیں کھاتا۔ آپ نے فرمایا میں نے تو کبھی شرک نہیں کیا (أسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ زیر لفظ زید بن عمرو)۔ اس زید جیسے کٹر موحد کی لوگوں نے کبھی مخالفت نہیں کی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بتوں کے خلاف آواز بلند کی تو سارا عرب آپ کا مخالف ہوگیا کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا کہ زید کی زبان سے تو ہمارے بت نہیں ٹوٹے تھے مگر یہ وہ زبان ہے جو ہمارے بتوں کو توڑ کر رکھ دے گی۔ پس وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ ہم نے تمام لوگوں کی توجہ تیری طرف پھیر دی ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ دنیا میں کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس آیت کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ ہم نے تیری قبولیت دنیا میں پھیلا دی ہے۔ درحقیقت کامیابی کے ساتھ اس امر کا بھی تعلق ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں قبولیت کے آثار پیدا کر دیئے جائیں۔ حدیثوں میں

آ تا ہے جب خدا تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اپنی محبت کے لئے منتخب فرماتا ہے تو اپنے فرشتوں سے کہتا ہے میں نے فلاں شخص کو چن لیا ہے تم بھی اس سے محبت کرو اور لوگوں کے دلوں میں اس کی قبولیت پیدا کرو۔ چنانچہ آہستہ آہستہ تمام دنیا میں اس کی قبولیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ معنے بھی اس آیت کے ہیں فرماتا ہے کہ گو یہ لوگ تیری مخالفت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی تیری بڑائی اور عظمت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جب وفات ہوئی تو کئی غیر احمدیوں اور ہندوؤں نے مضامین لکھے جن میں انہوں نے آپ کی بڑائی اور عظمت کا ذکر کیا (تاریخ احمدیت جلد ۲ صفحہ ۵۶۰ تا ۵۶۸)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ ظاہر میں آپ کی مخالفت کرتے تھے مگر ان کے دل آپ کی عظمت کے قائل تھے۔ یہ قبولیت اور عظمت کسی مفتری انسان کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس فرماتا ہے دنیا میں مخالفتیں کرنے والے مخالفتیں کرتے ہیں مگر ان کی مخالفت کا پہلو یک طرفہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی مخالفت کے ساتھ اس کی عظمت کے بھی قائل ہیں مگر یہاں یہ حالت ہے کہ یہ لوگ تیرے دشمن بھی ہیں اور تیری طاقت اور عظمت کے بھی قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ تو بڑا جھوٹا ہے مگر ساتھ ہی کہتے ہیں تو بڑا امین ہے۔ سننے والا سنتا ہے تو حیران ہوتا ہے کہ یہ کیا متضاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے وہ شاعر تو ہے مگر شعر نہیں کہتا یا کاہن تو ہے مگر کاہنوں کا دشمن ہے۔ گویا جہاں وہ الزام لگاتے ہیں وہاں ساتھ ہی ایک رنگ میں عظمت اور نیکی کا بھی اقرار کر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس آیت کا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پھیلنا شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد آپ کا ذکر سارے عرب میں پھیل گیا تھا اور لوگ ایمان بھی لانے لگے تھے۔ چنانچہ ابوذر غفاریؓ غفار میں، بعض لوگ یمن میں، بعض مدینہ میں، مکی زندگی میں ہی ایمان لے آئے اور اس طرح آپ کا سلسلہ مختلف ممالک میں پھیل گیا۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ﴿۶﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ﴿۷﴾

پس (یاد رکھو کہ) اس تنگی کے ساتھ ایک بڑی کامیابی (مقدر) ہے۔ (ہاں) یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک (اور بھی) بڑی کامیابی (مقدر) ہے۔

تفسیر۔ عربی قواعد کے رو سے تنوین ہمیشہ بڑائی اور عظمت کے اظہار کے لئے آتی ہے۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک بہت بڑی آسانی ہے۔ ہاں ہاں یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک بہت بڑی آسانی ہے۔ گویا اصل مقصد تنگی کا ذکر کرنا نہیں بلکہ اصل مقصد یسر کی بڑائی اور اس کی اہمیت پر زور دینا ہے۔

لیکن بعض نحوی کہتے ہیں کہ آیت میں یُسۡرًا کا نکرہ کے طور پر استعمال اور پھر اس کا تکرار بتا رہا ہے کہ یہاں ایک نہیں بلکہ دو یسر مراد ہیں ۔ بے شک عسر ایک ہی ہے مگر یسر دو ہیں ۔ان کے نزدیک اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک بہت بڑی آسانی ہے ۔ یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک اور بھی بہت بڑی آسانی ہے(فتح البیان زیر سورۃ الانشراح فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا)۔گویا نکرہ کا تکرار اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یسر دو ہیں اور یسر کی تنوین بتاتی ہے کہ ہر یسر بہت بڑی شان کا ہے ۔ان دوسرے معنوں کی احادیث سے بھی تائید ہوتی ہے ۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ہنستے ہوئے اپنے گھر سے باہر تشریف لائے اور فرمایا میں نے دیکھا ہے کہ عسر یسر کے پیچھے دوڑا چلا جا رہا ہے ۔ پھر آپ نے فرمایا ایک عسر دو یسر پر غالب نہیں آ سکتا ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشفاً بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت کا یہی مفہوم سمجھایا گیا ہے کہ یسر دو ہیں اور عسر ایک ہے ۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دو یسر کون سے ہیں جن کا اس آیت میں ذکر آتا ہے ۔اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو پورے طور پر اسی وقت سکون حاصل ہوتا ہے جب ذہنی اور خارجی طور پر دونوں لحاظ سے اسے اطمینان کے سامان میسر ہوں ۔ اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کی باتوں کی لوگ تردید کرتے ہوں تو گو وہ اسے مار پیٹ نہیں رہے ہوتے اور خارجی طور پر اسے کوئی دکھ نہیں ہوتا مگر ذہنی طور پر اس کے اندر ایک خلش اور بے چینی پائی جاتی ہے اور وہ اطمینان جس کا انسان متلاشی ہوتا ہے اسے پورے طور پر میسر نہیں ہوتا ۔ہم ایسے شخص کو دیکھ کر یہی کہیں گے کہ گو اسے خارجی طور پر یسر میسر ہے مگر ذہنی طور پر عسر میں مبتلا ہے ۔لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ یُوں تو تردید نہیں کرتے لیکن موقعہ ملے تو مار پیٹ لیتے ہیں ۔قصہ مشہور ہے کہ ایک جاٹ کے کھیت کے پاس ایک دفعہ کسی شخص نے آ کر ڈیرہ لگا دیا اور اس نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ میں خدا ہوں ۔کئی مشٹنڈے اس نے اکٹھے کر لئے جو ارد گرد کے گاؤں سے بھیک مانگ لاتے اور جو شخص وہاں آتا اسے کہتے کہ یہی خدا ہیں ان کو سجدہ کرو ۔وہ زمیندار روزانہ یہ نظارہ دیکھتا مگر کچھ کر نہ سکتا کیونکہ وہ اکیلا تھا اور اس شخص کے ارد گرد ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا ۔ایک دن اتفاقاً سب لوگ ادھر ادھر چلے گئے اور وہ جو اپنے آپ کو خدا کہتا تھا اکیلا رہ گیا ۔زمیندار نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا وہ ہل چھوڑ کر فوراً اس کے پاس گیا اور دو زانو بیٹھ کر کہنے لگا میں حضور سے یہ دریافت کرنے آیا ہوں کہ کیا حضور ہی خدا ہیں؟ اس نے کہا ہاں میں ہی خدا ہوں ۔ یہ سنتے ہی اس نے کود کر اس کی گردن پکڑ لی اور زور سے اسے ایک گھونسہ مار کر کہا اچھا میرے باپ کی تو نے ہی جان نکالی تھی ۔ پھر ایک اور گھونسہ مار کر کہا اچھا میری ماں کی بھی تو نے ہی جان نکالی تھی ۔ پھر ایک اور گھونسہ مار کر کہا اچھا تو نے ہی میری بہن کی جان نکالی تھی ۔اس طرح ایک ایک کر کے وہ اپنے مردہ رشتہ داروں کا نام

لیتا گیا اور گھونسے پر گھونسہ مارتا چلا گیا۔ ابھی پانچ دس گھونسے ہی لگے تھے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا مجھے معاف کرو میں خدا نہیں ہوں۔ تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ دلیلیں نہیں دیتے ڈنڈے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے شخص کو خارجی لحاظ سے عسر ہوتا ہے مگر ذہنی لحاظ سے عسر نہیں ہوتا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو خارجی لحاظ سے تو اطمینان حاصل ہوتا ہے مگر اس کے ذہن میں سکون نہیں ہوتا۔ وہ ایک تعلیم کو مان رہا ہوتا ہے مگر بار بار اس کے دل میں یہ خیال بھی اٹھتا ہے کہ نا معلوم یہ تعلیم سچی بھی ہے یا نہیں۔ کامل اطمینان اور کامل سکون وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جسے خارجی لحاظ سے بھی اطمینان ہو اور ذہنی لحاظ سے بھی اطمینان ہو۔

آنحضرت صلعم کے صحابہؓ کو ہر طرح اطمینان حاصل ہو جانے کی پیش گوئی

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ہمارے رسول! بے شک آج دنیا تیرے ساتھیوں کو سخت سے سخت تکالیف پہنچا رہی ہے مگر ہم عنقریب ان کو دونوں قسم کے اطمینان دینے والے ہیں۔ پہلا اطمینان جو ان کو میسر آئے گا وہ ذہنی ہوگا۔ یعنی تیری جماعت کا ہر فرد ذہنی لحاظ سے اس بات پر مطمئن ہوگا کہ اس نے سچائی کو قبول کیا ہے، راستی کو اختیار کیا ہے، نجات کے طریق کو پسند کیا ہے۔ یہ خلش اور یہ دُبدہ اس کے اندر نہیں ہوگا کہ نہ معلوم جس راہ پر میں چل رہا ہوں وہ خدا تک انسان کو پہنچاتا ہے یا نہیں پہنچاتا۔ اس کے بعد خارجی لحاظ سے بھی ہم ان کے اطمینان کے سامان پیدا کر دیں گے یعنی دشمن کی تکالیف کا سلسلہ جاتا رہے گا۔ ان کو کامیابی حاصل ہو جائے گی اور وہ تنگی جو آج محسوس کی جا رہی ہے بالکل دور ہو جائے گی گویا وہ دو یسر جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ ذہنی اور خارجی اطمینان کے سامان ہیں۔ یعنی ہم قوم کو باایمان بنانے کے لئے اس کے تمام شکوک و شبہات کو مٹا کر اسے یقین کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑا کر دیں گے اور خارجی لحاظ سے ان تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کو دور کر دیں گے جو دشمن کی طرف سے انہیں پیش آ رہی ہیں اور وہ غالب اور بادشاہ ہو جائیں گے جس کی وجہ سے کوئی انہیں جسمانی عذاب نہ دے سکے گا۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا میں اُمت محمدیہ کو دینی و دنیوی انعام ملنے کی پیش گوئی

دوسرے معنے دنیوی اور اخروی انعامات کے ہیں۔ یعنی تمہیں دنیا کے بھی انعامات ملیں گے اور آخرت کے انعامات بھی تمہیں عطا کئے جائیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ اخروی انعامات کے ملنے کا کیا ثبوت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ رؤیا و کشوف اور الہامات جن سے اللہ تعالیٰ کے مومن بندے اس دنیا میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق حصہ لیتے ہیں۔ وہ اس بات کا ثبوت ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اخروی نعماء کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بالکل درست ہے۔

اس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ جب کبھی اسلام پر تنگی اور مصیبت کا زمانہ آئے گا اللہ تعالیٰ اس کے بعد ترقی کا

ایک نیا دور پیدا کر دیا کرے گا۔ گویا اسلام کے ایک دفعہ قائم ہوجانے اور اس کے ہلاکت سے بچ جانے کے بعد ہر موقع پر اس کی ترقی کے نئے سے نئے سامان پیدا ہوتے رہیں گے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ اسلام ہمیشہ کے لئے مغلوب ہوجائے اور کفر کو غلبہ حاصل ہوجائے۔ گویا حفاظت اسلام کا وعدہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ کی تائید ہمیشہ اس مذہب کے ساتھ ہوگی اور وہ ہمیشہ تنزل کے بعد اس کی ترقی کے سامان پیدا کرتا رہے گا۔

آنحضرت صلعم کی دوسری بعثت کی پیش گوئی دو کے لفظ کو مدّنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں بعثت محمدی اور بعثت احمدی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں کفر نے خاص جوش مارا ہے مگر ہم اس کفر کو توڑنے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو روحانی بعثتیں کریں گے تا اس کا زور بالکل ٹوٹ جائے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ﴿۸﴾

پس جب (بھی) تو فارغ ہوتو (دوسرے مقصد کے حصول کے لئے) پھر کوشش میں لگ جا۔

حلّ لُغات۔ فَرَغْتَ۔ فَرَغَ سے واحد مخاطب مذکر کا صیغہ ہے اور فَرَغَ کے کئی معنے ہوتے ہیں۔ جب فَرَغَ مِنَ الْعَمَلِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں خَلَا ذَرْعُهٗ وہ کسی کام سے فارغ ہو گیا اور جب فَرَغَ لَهٗ وَاِلَيْهِ کہیں تو معنے ہوتے ہیں قَصَدَ۔ اس نے کسی چیز کا ارادہ کیا۔ نیز کہتے ہیں فَرَغَ فُلَانٌ فُرُوْغًا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ مَاتَ فلاں شخص مر گیا۔ اور جب برتن کے لئے فَرَغَ کا لفظ بولیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں خَلَا۔ خالی ہو گیا۔ نیز فَرَغَ کے معنے کسی کام کو پورا کر دینے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں فَرَغَ فُلَانٌ مِّنَ الشَّيْءِ: اَتَمَّهٗ کہ فلاں نے کام کو ختم کر دیا۔ (اقرب)

فَانْصَبْ نَصِبَ يَنْصَبُ سے امر کا صیغہ ہے اور نَصِبَ الرَّجُلُ نَصَبًا کے معنے ہوتے ہیں اَعْيَا وہ تھک گیا۔ اور نَصِبَ فِي الْاَمْرِ کے معنے ہوتے ہیں جَدَّ وَاجْتَهَدَ اس نے محنت اور کوشش کی (اقرب) یہاں فَانْصَبْ کے معنے محنت اور جدوجہد کرنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ۔ جب تو فارغ ہوجائے تو پھر جدوجہد میں مشغول ہوجا۔

تفسیر۔ یہاں ایک عجیب بات بیان کی گئی ہے بظاہر فراغت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ مشکل دور ہوگئی اور کام ختم ہو گیا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب تو فارغ ہو جائے تو پھر محنت میں مشغول ہو جا پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فارغ ہونے کے بعد بھی محنت میں ہی مشغول رہنا ہے تو پھر فراغت کیسی ہوئی؟ درحقیقت اس میں اسلام کی ترقی کے متعلق پیشگوئی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کتنا بلند مقصد ہے جو ہم نے اپنے رسول کے سامنے رکھا ہے۔ بعض دفعہ دنیا میں یک دم کوئی تغیر پیدا ہو جاتا ہے مگر وہ دیرپا نہیں ہوتا بلکہ جلد ہی روبہ زوال ہو جاتا ہے لیکن بعض تغیرات ایسے ہوتے ہیں جو گو تدریجاً پیدا ہوتے ہیں مگر ایک لمبے عرصہ تک دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے کہ تیری ترقی گو تدریجی ہوگی مگر تیری کوششوں کے نتائج مستقل اور دیرپا ہوں گے۔ پہلے ایک مشکل تمہارے سامنے آئے گی اور جب تم اس کو دور کرلو گے اور اپنے پہلے مقام سے اونچے ہو جاؤ گے تو پھر دوسری مشکل پیش آجائے گی اس وقت تمہارا فرض ہوگا کہ اس دوسری مشکل کو دور کرو اور اپنے مقام سے اور اونچے ہو جاؤ جب وہ مشکل بھی حل ہوگئی تو ایک تیسری مہم تمہارے سامنے آجائے گی اُس وقت تمہارا فرض ہوگا کہ اُس تیسری مہم کو سر کرو اور اپنے مقام سے اور اونچے ہو جاؤ گویا ایک دور ہے جو چلتا چلا جائے گا اور غیر متناہی ترقیات ہیں جو تمہارے سامنے آتی چلی جائیں گی کوئی وقت اور کوئی لمحہ تمہاری زندگی میں ایسا نہیں آ سکتا جب تم یہ خیال کرلو کہ میں اپنا کام ختم کر چکا یا میں نے جس بلندی پر پہنچنا تھا پہنچ گیا وہ شخص جو صرف پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھنا چاہے جب پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ جائے گا بیٹھ جائے گا اور کہے گا کہ میں جس مقام پر پہنچنا چاہتا تھا پہنچ گیا مگر جس شخص کا یہ مقصد ہو کہ وہ ساری چڑھائیوں پر چڑھتا چلا جائے وہ کسی مقام پر نہیں رکے گا بلکہ ایک چوٹی کے بعد دوسری چوٹی اور دوسری چوٹی کے بعد تیسری چوٹی پر وہ چڑھتا چلا جائے گا۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علمی اور عملی کام کیا گیا تھا اس کی کوئی انتہاء نہیں تھی اس لئے اللہ تعالیٰ اس آیت میں آپ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ اے محمد رسول اللہ ہم نے تیرے لئے کوئی محدود مقصود مقرر نہیں کیا بلکہ غیر معمولی ترقیات کا دروازہ تیرے لیے کھولا گیا ہے جب تو کسی ایک مہم کو سر کر لے تو سمجھ لے کہ ابھی اس سے اوپر کی مہم کو تو نے سر کرنا ہے اور جب دوسری مہم بھی سر ہو جائے تو تُو سمجھ لے کہ تیسری مہم تیرے سامنے کھڑی ہے اور تیرا فرض ہے کہ تُو اس کو بھی سر کرے۔ غرض تُو نے بلندیوں کی طرف اپنے پورے زور کے ساتھ بڑھتے چلے جانا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی اپنے قدم کو نہیں روکنا۔ گویا فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر متناہی سفر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ اپنے کام میں بڑھتے چلے جائیں گے اور کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا جب یہ کہا جا سکے

کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے اور اب وہ اپنے کام سے فارغ ہو گئے ہیں۔ اگر وہ ایک کام سے فارغ ہو جائیں گے تو دوسرا کام شروع کر دیں گے دوسرے کام سے فارغ ہوں گے تو تیسرا کام شروع کر دیں گے۔ ہم جب بچے تھے اس وقت ایک کھیل کھیلا کرتے تھے جو اسی مفہوم کو ادا کرتی ہے۔ ایک لڑکا بیٹھ جاتا تھا اور باقی سب لڑکے اس کے سر پر اوپر نیچے اپنی مٹھیاں بند کر کے رکھتے چلے جاتے اور پھر ایک لڑکا کہتا

بھنڈا بھنڈاریا کتنا کُ بھار

وہ جواب میں کہتا

اک مٹّی چک لے دوجی تیار

یعنی ایک مٹھی سر پر سے ہٹا لو تو دوسری مٹھی اس کی جگہ لینے کو تیار ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے تمہارے لئے غیر معمولی ترقیات مقدر ہیں جب تم ایک مشکل کو حل کر لو گے تو خدا تعالیٰ دوسری مشکل تمہارے سامنے کھڑی کر دے گا تا کہ تم اس کو حل کر کے اور زیادہ ترقی کرو اور زیادہ قرب اور محبت کے مقامات طے کرو۔ گویا کوئی مقام ایسا نہیں آ سکتا جسے تم اپنی ترقی کی آخری منزل قرار دے سکو۔ ہر مقام پر پہنچ کر ایک نیا دروازہ تمہارے لئے کھول دیا جائے گا اور اس طرح غیر متناہی ترقیات کا سلسلہ تمہارے لئے قائم کیا جائے گا۔ بے شک ہم نے تجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم تجھے کامیاب کریں گے اور تیری ہر مشکل کو دور کریں گے مگر فتح اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ نہ سمجھنا کہ میرا کام ختم ہو گیا ہے بلکہ ہر فتح کے بعد نئی مشکلات سامنے آ جائیں گی کیونکہ روحانی ترقی کے اسرار میں سے یہ بات ہے کہ نئی سے نئی مشکلات پیدا ہوتی جائیں اور انہیں سر کیا جائے۔ پس تم یہ خیال نہ کرنا کہ شیطانی حملہ صرف ایک رنگ کا ہوگا اور اس کا ایک رنگ میں مقابلہ کرنا ہی اس کو شکست دینے کے لئے کافی ہوگا بلکہ شیطان کے حملے مختلف انواع کے ہوں گے۔ اس کے حملے علمی بھی ہوں گے، اس کے حملے عملی بھی ہوں گے اس کے حملے فکری بھی ہوں گے اس کے حملے سیاسی بھی ہوں گے اس کے حملے اقتصادی بھی ہوں گے اور یہ تمام حملے اس کی طرف سے یکے بعد دیگرے ہوتے چلے جائیں گے۔ تمہارا کام یہ ہوگا کہ ایک دشمن کو مارا اور آگے بڑھے، دوسرے دشمن کو مارا اور آگے بڑھے، تیسرے دشمن کو مارا اور آگے بڑھے۔ اس طرح ایک ایک کر کے دشمن کو ہٹاتے چلے گئے اور خدا تعالیٰ کے قرب کی بلندیوں میں اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتے گئے۔

ع۱
۹
۱۹

وَ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ؏ ⑨

اور تو اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔

تفسیر۔فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تم اس طرح چوٹیوں پر چڑھتے چلے آ ؤ گے تو دیکھو گے کہ ہم آگے بیٹھے ہیں ہم بلندیوں پر رہتے ہیں اور وہی ہمارے پاس آ سکتا ہے جو غیر محدود جدو جہد سے کام لینے والا ہو۔اس لئے ہماری ملاقات کے راستہ میں کسی مقام پر ٹھہرنا نہیں بلکہ بڑھتے چلے آنا۔عیسوی مقام آ جائے تو ٹھہرنا نہیں بلکہ اوپر چڑھنا۔موسوی مقام آ جائے تو ٹھہرنا نہیں بلکہ اوپر چڑھنا پہلے آسمان پر پہنچو تو وہاں ٹھہرنا نہیں بلکہ اپنی کمر باندھ لو اور دوسرے آسمان پر پہنچو دوسرا آسمان آئے تو تیسرے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو تیسرا آسمان آئے تو چوتھے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ چوتھا آسمان آئے تو پانچویں آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ پانچواں آسمان آئے تو چھٹے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو چھٹا آسمان آئے تو ساتویں آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ ساتواں آسمان آئے تو اس بھی اوپر پہنچنے کی کوشش کرو۔اوپر ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں تم اپنے رب کی طرف آ ؤ اور اپنا انعام پا لو۔

سُوْرَۃُ التِّیْنِ مَکِّیَّۃٌ

سورۂ تین۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَھِیَ ثَمَانِیْ اٰیَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اوراس کی بسم اللہ کے سوا آٹھ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ التین مکی ہے جمہور کے نزدیک یہ سورۃ مکی ہے۔قرطبی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ مدنی ہے۔قتادہ کا بھی قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ مدنی ہے۔مگر اس کے مقابل میں ابن الفریس، نحاس، ابن مردویہ اور بیہقی نے ابن عباسؓ سے ہی روایت کی ہے کہ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃُ التِّیْنِ بِمَکَّۃَ یعنی سورۂ تین مکہ میں نازل ہوئی تھی (فتح البیان زیر سورۃ التین و تفسیر قرطبی زیر سورۃ التین نیز روح المعانی زیر سورۃ التین)۔ یہ دوسری روایت قرطبی کی روایت کو رد کرتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ کی طرف سے بھی یہی روایت ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ابن مردویہ نے عبداللہ بن زبیرؓ سے بھی اس قسم کی روایت نقل کی ہے۔گویا ابن عباسؓ کے علاوہ عبداللہ بن زبیرؓ بھی اس سورۃ کو مکی قرار دیتے ہیں۔بقیہ علماء نے بھی باوجود اس روایت کے جو قرطبی نے نقل کی ہے اسے مکی ہی قرار دیا ہے۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں اور اسی طرح بعض اور کتب میں بھی براء بن عازب سے روایت نقل کی گئی ہے کہ کَانَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلّم فِیْ سَفَرٍ فَصَلَّی الْعِشَاءَ فَقَرَأَ فِیْ اِحْدَی الرَّکْعَتَیْنِ بِالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ فَمَا سَمِعْتُ اَحَدًا اَحْسَنَ صَوْتًا وَّلَا قِرَاَۃً مِّنْہُ یعنی ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جارہے تھے کہ آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور اس کی پہلی دو رکعتوں میں سے ایک میں آپ نے سورۂ تین پڑھی۔میں نے کسی شخص کو اس سے زیادہ خوبصورت آواز اور اچھی قرأت کے ساتھ قرآن کریم کو پڑھتے نہیں سنا جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے پڑھتے سنا۔ایک دوسری روایت جو انہی کی ہے اس میں بھی یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر ابن الخطیب میں براء بن عازب کی جو روایت آتی ہے اس میں عشاء کی بجائے مغرب کا لفظ ہے۔

نولڈکے جرمن مستشرق اسے سورۃ البروج کے ساتھ کی نازل شدہ بتاتا ہے۔یعنی یہ بھی ابتدائی زمانہ کی مکی سورۃ

ہے۔ویری بھی اس کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا سٹائل مکی ہے۔(A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry vol:4 p:257) میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ یہ اس کی زبردستی ہے۔ وہ عربی بھی اچھی طرح نہیں جانتا سٹائل کو کہاں پہچان سکتا ہے۔اسی طرح وہ کہتا ہے کہ اس سورۃ میں ھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ کے جو الفاظ آتے ہیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے۔کیوں کہ اس میں ھٰذَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ’’یہ شہر مکہ‘‘ جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ویری کی یہ دلیل وزنی ضرور ہے مگر قطعی نہیں۔ہم اتنے حصہ میں اس سے متفق ہیں کہ یہ مکی ہے۔مگر اس نے اپنے بُغض کی وجہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض مسلمان مصنف ان حدیثوں کی اندھا دھند تقلید میں جو قرآن کریم کو واضح کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں اسے مدنی قرار دیتے ہیں نہایت ناپسندیدہ فعل ہے۔یہ فقرہ اس کے بُغض پر دلالت کرتا ہے۔کیوں کہ جمہور مسلمان تو اسے مکی قرار دیتے ہیں اور ہمارا اپنا فائدہ بھی اگر مسلمان فائدہ اٹھانے کے لئے حدیثیں بناتے ہیں تو اسے مکی قرار دینے میں ہی ہے۔پس جبکہ جمہور بھی اسے مکی قرار دیتے ہیں مسلمان مصنفوں پر اس قدر رکیک الزام اور خصوصاً احادیث پر نہایت قابل شرم امر ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ روائتیں اسے مکی قرار دے رہی ہیں صرف قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں اسے مدنی قرار دیا ہے مگر ممکن ہے کہ وہاں کتابت کی غلطی کی وجہ سے مکی کی بجائے مدنی لکھا گیا ہو اور اگر وہ کتابت کی غلطی نہیں تب بھی قرطبی اصل راوی نہیں بلکہ وہ دوسروں کی روائتوں کو نقل کرنے والا ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اصل راوی سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سورۃ مدنی نہیں بلکہ مکی ہے۔لیکن ویری کا اسے سٹائل کی وجہ سے مکی قرار دینا محض دھینگا مشتی ہے۔اگر پادری ویری کے سامنے ہی قرآن کریم کھول کر رکھ دیا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ اگر تم سٹائل کو پہچاننے کا ملکہ اپنے اندر رکھتے ہو تو بتاؤ اس میں سے مکی آیات کون سی ہیں اور مدنی آیات کون سی تو وہ بیسیوں غلطیاں کر جائیں گے یہاں چونکہ تمام روائتیں اس سورۃ کو مکی قرار دے رہی تھیں انہوں نے سمجھا کہ میں اس کے مکی ہونے کا ثبوت اس سورۃ کے سٹائل کو قرار دے کر ایک جدت پیدا کر دوں حالانکہ سٹائل کو پہچاننا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا انسان جو رات اور دن غور کرتا رہا ہو اور جس نے باریک طور پر تدبر اور دماغی کاوش سے کام لیا ہو اُس کے لئے بھی سٹائل کو الگ طور پر پہچاننا مشکل ہوتا ہے اور باقی لوگوں کے لئے تو اس قدر مشکل مرحلہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ لاکھوں میں سے کسی ایک کے لئے یہ بات ممکن ہو تو ہو باقی کسی کے لئے سٹائل کو پہچاننا ممکن نہیں ہے۔یہی بات دیکھ لو سب مسلمان قرآن جانتے اور اسے پڑھتے ہیں مگر پھر کئی مقرر مسلمان بعض ضعیف حدیثیں پیش کر کے کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں ایسا لکھا ہے حالانکہ وہ ویری سے زیادہ قرآن جانتے ہیں۔

مولوی محمد احسن صاحب امروہی میں یہ مرض تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب بھی کوئی بات کرتے وہ درمیان میں جلدی جلدی بولنا شروع کر دیتے تھے اور واہ وا! اور سبحان اللہ کہنے لگ جاتے مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کسی گفتگو میں فرماتے کہ قرآن کریم نے فلاں بات نہایت لطیف طور پر بیان کی ہے تو وہ کہنا شروع کر دیتے تھے کہ سبحان اللہ بڑی لطیف بات ہے کس کی طاقت ہے کہ ایسی بات کہہ سکے۔ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سیر کے لیے جا رہے تھے میں بھی ساتھ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مجھے آج ایک الہام ہوا ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام اور بندے کے کلام میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بات بیان فرمائی تو مولوی محمد احسن صاحب نے جھٹ ہاتھ مارنے شروع کر دیئے اور کہا حضور فرق! خدا کے کلام اور بندہ کے کلام میں زمین اور آسمان کا فرق ہے حضور خدا کا کلام خدا کا کلام اور بندے کا کلام بندے کا کلام، بھلا ممکن ہے بندہ اپنے کلام میں خدا کا مقابلہ کر سکے؟ یہ تو بالکل ناممکن ہے۔ جب وہ ذرا خاموش ہوئے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر بات شروع کی اور فرمایا دیکھو حریری عربی ادب کے لحاظ سے کمال کو پہنچا ہوا تھا مگر الہام الٰہی میں جو باریکیاں ہوتی ہیں وہ اس کے کلام میں کہاں ہیں؟ مولوی محمد احسن صاحب نے پھر کہنا شروع کر دیا حضور حریری! بھلا حریری میں رکھا ہی کیا ہے؟ اس کی کیا طاقت ہے کہ وہ خدا کے کلام کا مقابلہ کر سکے۔ خدا کا کلام جس شان اور عظمت کا حامل ہوتا ہے بھلا حریری کی طاقت ہے کہ اس جیسا کلام کہہ سکے۔ اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مثلاً یہ فقرہ ہے ابھی وہ فقرہ مولوی محمد احسن صاحب نے سنا ہی تھا کہ انہوں نے جھٹ کہنا شروع کر دیا۔ حضور یہ بھی کوئی فقرہ ہے۔ یہ بھی کوئی عربی ہے۔ حریری کیا جانتا ہے کہ عربی کیا ہوتی ہے؟ حالانکہ وہ الہام تھا حریری کا فقرہ نہیں تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ مولوی صاحب! سنیئے تو سہی یہ حریری کا فقرہ نہیں یہ تو وہ الہام ہے جو مجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اب دیکھو مولوی محمد احسن صاحب مولوی آدمی تھے۔ رات دن عربی کتابیں پڑھنے میں مشغول رہتے تھے اور اگر سٹائل کو پہچاننا ایسا ہی آسان کام ہوتا تو وہ فوراً پہچان لیتے کہ یہ انسانی کلام ہے یا خدائی کلام مگر پھر بھی وہ غلطی کر گئے اور انہوں نے الہام کو انسانی کلام سمجھ لیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موانست اور مشابہت کی وجہ سے انسان بعض دفعہ اندازہ کر لیتا ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے یا مدنی سورۃ ہے مگر یہ اندازہ دلیل نہیں بن جاتا۔ مثلاً جہاں تک عربی الفاظ کا تعلق ہے جس طرح وہ الفاظ قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں اسی طرح اور عربی کتب میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں بھی رزق کا لفظ آتا ہے اور

دوسری عربی کتب میں بھی رزق کا لفظ آتا ہے۔قرآن میں بھی جہاد کا لفظ آتا ہے اور دوسری عربی کتب میں بھی جہاد کا لفظ آتا ہے۔قرآن میں بھی غَدًا کا لفظ آتا ہے اور دوسری عربی کتب میں بھی غَدًا کا لفظ آتا ہے مگر اس کے باوجود جس شان اور عظمت کے حامل قرآن کریم کے الفاظ ہیں اس شان اور عظمت کے پاسنگ بھی وہ الفاظ نہیں جو دوسری کتب میں پائے جاتے ہیں۔کیونکہ محض الفاظ کا اشتراک کوئی چیز نہیں بلکہ اصل چیز جو الہام الٰہی کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے وہ ان الفاظ کا ایک ایسے ہار میں پرویا جانا ہے جس کی دنیا میں اور کہیں نظیر نہیں ملتی مگر پھر بھی قطعیت کے ساتھ صرف اجتہاد سے کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ قرآنی اور غیر قرآنی عبارت کو بغیر قرآن کے حفظ کرنے یا کالحفظ کرنے کے قطعاً الگ الگ پہچان سکتا ہے۔پس ویری کا محض سٹائل کی بناء پر اس سورۃ کو مکی قرار دینا اس کی خوش فہمی ہے۔اگر ان کے سامنے ہی قرآن کریم کی آیات الگ الگ رکھ دی جائیں اور ان سے پوچھا جائے کہ بتاؤ ان میں سے مکی کون سی ہیں اور مدنی کون سی تو وہ سینکڑوں غلطیوں کا ارتکاب کر جائیں گے۔وہ اگر سٹائل کو پہچانتے ہیں تو صرف اس نقطۂ نگاہ سے کہ اگر لمبی آیت ہوئی تو اس کے متعلق کہہ دیا یہ مدنی ہے اور اگر چھوٹی آیت ہوئی تو کہہ دیا یہ مکی ہے۔حالانکہ یہ امتیاز تو ایک بچہ بھی کرسکتا ہے۔پس ویری کا مسلمان مصنفوں اور مسلمانوں کی حدیثوں پر یہ حملہ نہایت ناواجب ہے اور اُس بُغض اور کینہ کا ثبوت ہے جو اس کے دل میں اسلام کے متعلق پایا جاتا ہے۔کیونکہ خود مسلمان راوی بھی اس کو مکی قرار دیتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان راویوں کے کہنے کی وجہ سے ہی انہوں نے اس سورۃ کو مکی قرار دیا ہے ورنہ اگر وہ نہ بتاتے تو یہ خود کچھ بھی نہ کہہ سکتے کہ یہ سورۃ مکی ہے یا مدنی۔

سورۃ تین کا پہلی سورتوں سے تعلق۔ **ترتیب** اس سورۃ کا سورۃ الانشراح سے یہ تعلق ہے کہ سورۂ انشراح میں بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انجام اچھا ہوگا کیونکہ نیک انجام کے لئے جن امور کی ضرورت ہوتی ہے وہ آپ کو حاصل ہیں۔اب اس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ پہلی اقوام کی شہادت اس امر کی تائید میں موجود ہے۔ دنیا میں جب کوئی عقلی دلیل دیتا ہے تو انسان کی پوری تسلی نہیں ہوتی وہ چاہتا ہے کہ مجھے کوئی نقلی دلیل بھی دی جائے تا کہ میں سمجھ سکوں کہ واقعہ میں اس کے مطابق کام ہوسکتا ہے یا نہیں۔سورۃ الانشراح میں عقلی دلیل دی گئی تھی اب اس سورۃ میں نقلی دلیل دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے بعض پہلی قوموں کو بھی ترقی دی ہے اس سے تم نتیجہ نکال سکتے ہو کہ جس طرح آدمؑ اور نوحؑ اور موسیٰؑ کے وقت میں ہوا کہ باوجود مخالف حالات کے محض روحانی سامانوں سے ان کو فتح حاصل ہوئی اب بھی ایسا ہی ہوگا۔اس کے بعد اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ میں بھی اسی مضمون کو جاری رکھا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ①

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ ۙ② وَ طُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ③

(مجھے) قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔ اور سینین کے پہاڑ کی۔

وَ ہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ④

اور اس امن والے شہر کی۔

تفسیر۔ تین و زیتون کی تشریح پرانے مفسرین کے قلم سے فرماتا ہے قسم ہے ہم کو یا ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں انجیر کو بھی۔ زیتون کو بھی۔ طور سیناء کو بھی اور اس بلد الامین کو بھی۔ فتح البیان میں لکھا ہے قَالَ اَکۡثَرُ الۡمُفَسِّرِیۡنَ اَلتِّیۡنُ ھُوَ التِّیۡنُ الَّذِیۡ یَاۡکُلُہُ النَّاسُ وَالزَّیۡتُوۡنُ ھُوَ الَّذِیۡ یَعۡصِرُوۡنَ مِنۡہُ الزَّیۡتَ الَّذِیۡ ھُوَ اِدَامُ غَالِبِ الۡبُلۡدَانِ وَ دُھۡنُھُمۡ وَ یَدۡخُلُ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَدۡوِیَۃِ یعنی اکثر مفسرین کے نزدیک تین سے مراد وہی تین ہے جو لوگ کھاتے ہیں یعنی اس سورۃ میں جو وَ التِّیۡنِ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد وہی عام انجیر ہے جسے لوگ کھایا کرتے ہیں اور زیتون سے مراد بھی وہی زیتون ہے جسے لوگ کھاتے ہیں۔ جو اکثر ملکوں میں بطور سالن اور چکنائی کے استعمال ہوتا ہے اور بہت سی دواؤں میں بھی پڑتا ہے۔ گویا یہاں اس سورۃ میں جو وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ فرمایا گیا ہے اس میں کوئی بات استعارۃً یا تمثیلاً بیان نہیں کی گئی بلکہ اس سے وہی انجیر مراد ہے جو کھانے کے کام آتی ہے اور وہی زیتون مراد ہے جس کا تیل لوگ اچاروں میں ڈالتے یا سالن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اچار میں تیل یا سرکہ ڈالتے ہیں مگر مغربی ممالک میں عموماً زیتون کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ وَ قَالَ الضَّحَّاکُ اَلۡمَسۡجِدُ الۡاَقۡصٰی اور ضحاک کہتے ہیں کہ تین سے مراد مسجد بیت الحرام اور زیتون سے مراد مسجد اقصیٰ ہے۔ وَ قَالَ ابۡنُ زَیۡدٍ مَسۡجِدُ بَیۡتِ الۡمُقَدَّسِ اور ابن زید کہتے ہیں کہ اس سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے۔ وَقَالَ قَتَادَۃُ الۡجَبَلُ الَّذِیۡ عَلَیۡہِ بَیۡتُ الۡمُقَدَّسِ اور قتادہ کہتے ہیں اس سے مراد وہ پہاڑ ہے جس پر بیت المقدس بنایا گیا ہے وَقَالَ عِکۡرِمَۃُ وَ کَعۡبُ الۡاَحۡبَارِ بَیۡتُ الۡمُقَدَّسِ اور عکرمہ اور کعب الاحبار کہتے ہیں

کہ اس سے مراد بیت المقدس ہے۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِلَادُ فَلَسْطِيْن اور ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ اس سے مراد فلسطین کا علاقہ ہے۔ وَقَالَ اَيْضًا بَيْتُ الْمُقَدَّسِ اسی طرح ان سے یہ بھی روایت ہے کہ اس سے مراد بیت المقدس ہے۔ فتح البیان کے مصنف ان معانی کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ’’لَيْتَ شِعْرِيْ مَا الْحَامِلُ لِهٰؤُلَاءِ الْاَئِمَّةِ عَلَى الْعُدُوْلِ عَنِ الْمَعْنَى الْحَقِيْقِيِّ فِي اللُّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ وَالْعُدُوْلُ اِلٰى هٰذِهِ التَّفْسِيْرَاتِ الْبَعِيْدَةِ عَنِ الْمَعْنَى الْمَبْنِيَّةِ عَلٰى خَيَالَاتٍ لَّا تُرْجَعُ اِلٰى عَقْلٍ وَّ نَقْلٍ وَّ اَعْجَبُ مِنْ هٰذَا اِخْتِيَارُ ابْنِ جَرِيْرٍ لِلْاٰخِرِ مِنْهَا مَعَ طُوْلِ بَاعِهٖ فِيْ عِلْمِ الرِّوَايَةِ وَالدِّرَايَةِ‘‘ (فتح البیان زیر آیت والتین.....)۔ یعنی مجھے بڑی حیرت آتی ہے اور میری سمجھ سے یہ بات باہر ہے کہ یہ جو بڑے بڑے آئمہ ہیں ان کو کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ لغت عرب میں تین اور زیتون کے جو حقیقی معنی ہیں ان کو چھوڑ کر انہوں نے اور اَور معنے کرنے شروع کر دیئے اور بعید از قیاس ایسی تفسیریں کرنی شروع کر دیں جو ایسے خیالات پر مبنی ہیں جن کی نہ عقل تصدیق کرتی ہے نہ نقل تائید کرتی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں مجھے سب سے زیادہ تعجب ابن جریر پر آتا ہے (ابن جریر بہت بڑے مفسر اور محدث ہیں اور ان کی عقلی رائے بھی نہایت اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے) کہ وہ بھی آخری معنوں کی تصدیق کرتے ہیں کہ تین اور زیتون سے یا تو بیت المقدس مراد ہے یا پھر فلسطین کا علاقہ حالانکہ درایت اور روایت میں ان کو بڑا دخل حاصل ہے یعنی باوجود اس قدر علم و فضل کے انجیر اور زیتون کے سیدھے سادے معنے کرنے کی بجائے وہ ادھر اُدھر کی دور از قیاس باتوں میں چلے گئے ہیں۔

پھر صاحب فتح البیان لکھتے ہیں قَالَ الْفَرَّاءُ سَمِعْتُ رَجُلًا يَّقُوْلُ التِّيْنُ جِبَالُ حُلْوَانَ اِلٰى هَمَدَانَ وَالزَّيْتُوْنُ جِبَالُ الشَّامِ۔ یعنی فراء کہتے ہیں میں نے ایک آدمی سے سنا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ تین سے مراد حلوان کے پہاڑ ہیں جن کا ہمدان تک سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے اور زیتون سے مراد شام کے پہاڑ ہیں۔ فراء جیسے آدمی کا یہ مضمون بیان کرنا ایک ایسی بات ہے جس پر واقعہ میں ہنسی آتی ہے۔ چنانچہ فتح البیان والوں نے یہاں ایک ایسا مزیدار فقرہ لکھا ہے جسے پڑھتے وقت مجھے ہنسی آ گئی تھی وہ لکھتے ہیں هَبْ اَنَّكَ سَمِعْتَ هٰذَا الرَّجُلَ فَكَانَ مَاذَا فَلَيْسَ بِمِثْلِ هٰذَا تَثْبُتُ اللُّغَةُ وَلَا هُوَ نَقْلٌ عَنِ الشَّارِعِ کہتے ہیں میاں اگر تم نے کسی آدمی سے ایسا سن بھی لیا تھا تو پھر ہوا کیا۔ کسی نے گپ ہانک دی تو تم اس کو لے اڑے۔ یہ بھی کوئی دانائی اور عقلمندی ہے۔ مان لیا کہ تم نے ایک آدمی سے یہ بات سنی تھی مگر کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ قرآن کریم کی تفسیر ہوگئی۔ یہ ایک ایسا بے ساختہ فقرہ صاحب فتح البیان کی قلم سے نکلا ہے جس کی داد دینی پڑتی ہے۔ واقعہ میں یہ حیرت کی بات ہے کہ فراء

جیسے آدمی نے اس قسم کی بات نقل کردی۔ وہ روایت یہ کرتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو یہ کہتے سنا تھا کہ تین اور زیتون سے یہ مراد ہے۔ حالانکہ وہ کوئی بچہ بھی ہوسکتا ہے۔ پاگل بھی ہوسکتا ہے لغت سے ناواقف بھی ہوسکتا ہے۔ ایک غیر معروف الحال شخص کی ایک بے ہودہ بات پر قرآن کریم کی تفسیر کی بنیاد رکھنا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ یا تو وہ کہتے کہ میں لغت کو جانتا ہوں اس لئے میرے نزدیک اس کے یہ معنے ہیں یا فلاں ادیب سے میں نے ایسا سنا ہے یا فلاں قبیلہ میں اس کے یہ معنے کئے جاتے تھے مگر وہ کہتے یہ ہیں کہ میں نے ایک شخص سے سنا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ تین سے یہ مراد ہے اور زیتون سے وہ مراد ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے غالب اور ذوق کہیں کہ ہم نے ایک گاؤں کے جاہل اور اجڈ لڑکے کو فلاں شعر کے یہ معنے کرتے سنا ہے۔ غرض فتح البیان والوں کا یہ فقرہ بڑا لطیف ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اوّل تو مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے ایسا سنا ہو۔ لیکن اگر سن بھی لیا تھا تو اس پر قرآن کریم کی تفسیر کی بنیاد رکھنا کس طرح درست تھا۔ فتح البیان والے اگر اس اصول پر قائم رہتے تو بہت اچھا ہوتا مگر وہ خود بھی ایسی بہت سی باتیں کہہ گئے ہیں۔

قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ كَعْبٍ اَلزَّيْتُوْنُ مَسْجِدُ اِيْلِيَا۔ محمد بن کعب کہتے ہیں کہ زیتون سے مراد مسجد ایلیا ہے۔ وَقِيْلَ اِنَّهٗ عَلٰى حَذْفِ مُضَافٍ اَیْ وَ مَنَابِتِ التِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ بعض نے کہا ہے کہ یہاں حذف مضاف ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم تین اور زیتون اگانے والی جگہوں کو پیش کرتے ہیں۔ قَالَ النُّحَاسُ لَا دَلِيْلَ عَلٰى هٰذَا مِنْ ظَاهِرِ التَّنْزِيْلِ وَلَا مِنْ قَوْلِ مَنْ لَّا يَجُوْزُ خِلَافَهٗ نحاس کہتے ہیں کہ اس توجیہہ کے متعلق قرآن کریم کی کوئی تصدیقی دلیل نہیں ملتی اور نہ کسی ایسے آدمی کا قول ملتا ہے جس کی بات کو ردّ کرنے کی جرأت نہ ہوسکے۔ قَالَ الرَّازِیُّ اَمَّا الزَّيْتُوْنُ فَهُوَ فَاكِهَةٌ مِّنْ وَّجْهٍ وَّ دَوَاءٌ مِّنْ وَّجْهٍ وَّ يُسْتَصْبَحُ بِهٖ۔ رازی کہتے ہیں کہ زیتون سے مراد وہی شے ہے جو ایک لحاظ سے میوہ ہے کہ لوگ اسے کھاتے ہیں اور ایک لحاظ سے دوا بھی ہے اور اس سے دیئے بھی جلائے جاتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں وَمَنْ رَاٰى وَرَقَ الزَّيْتُوْنِ فِی الْمَنَامِ اِسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى اگر کوئی شخص خواب میں زیتون کے ورق دیکھ لے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس نے ایک مضبوط اور نہ ٹوٹنے والا کڑا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

اب ہم تفسیر ابن کثیر کو دیکھتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے قَالَ الْقُرْطَبِیُّ هُوَ مَسْجِدُ اَصْحَابِ الْكَهْفِ قرطبی کا بیان ہے کہ اس سے اصحاب کہف کی مسجد مراد ہے۔ وَرَوَى الْعَوْفِیُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَسْجِدُ نُوْحٍ اَلَّذِیْ عَلَى الْجُوْدِیِّ عوفی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اس سے وہ مسجد نوح مراد ہے جو جودی پہاڑ پر ہے جہاں طوفان

کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہری تھی۔ وَقَالَ بَعْضُ الْاَئِمَّةِ هٰذِهٖ مَحَالٌّ ثَلَاثَةٌ بَعَثَ اللّٰهُ فِيْ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهَا نَبِيًّا مُّرْسَلًا مِّنْ اُولِي الْعَزْمِ اَصْحَابِ الشَّرَائِعِ الْكِبَارِ بعض آئمہ کہتے ہیں کہ یہ تین اہم مقامات ہیں جن میں سے ہر مقام میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم اور صاحب شریعت انبیاء کو بھیجا تھا۔ فَالْاَوَّلُ مَحَلَّةُ التِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَهِيَ بَيْتُ الْمُقَدَّسِ الَّتِيْ بَعَثَ اللّٰهُ فِيْهَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ پہلے نبی کے اترنے کا محل تین اور زیتون کا مقام ہے اور اس سے مراد وہ بیت المقدس ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح ابن مریمؑ کو نازل کیا تھا۔ گویا ان کے نزدیک تین اور زیتون دونوں سے مراد بیت المقدس ہے گو بعض آئمہ نے صرف تین کے متعلق یہ کہا تھا کہ اس سے مراد بیت المقدس ہے مگر یہ کہتے ہیں تین اور زیتون دونوں سے بیت المقدس مراد ہے کیونکہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ وَالثَّانِيْ طُوْرُ سِيْنِيْنَ اور دوسرا مقام طور سینین ہے۔ وَهُوَ طُوْرُ سَيْنَاءَ الَّذِيْ كَلَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مُوْسَى بْنَ عِمْرَانَ اور اس سے مراد وہ طور ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ بن عمران سے باتیں کی تھیں۔ وَالثَّالِثُ مَكَّةُ اور بلد الامین جس کا تیسرے مقام پر ذکر آتا ہے اس سے مراد مکہ ہے۔ وَهٰذَا الْبَلَدُ الْاَمِيْنُ الَّذِيْ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا اور یہ وہی بلد الامین ہے جس میں داخل ہوکر انسان کو امن حاصل ہوجاتا ہے۔ وَهٰذَا وَالَّذِيْ اُرْسِلَ فِيْهِ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور یہی وہ جگہ ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اس کے بعد ابن کثیر والے لکھتے ہیں کہ وَ قَالُوْا وَفِيْ اٰخِرَةِ التَّوْرَاةِ ذِكْرُ هٰذِهِ الْاَمَاكِنِ الثَّلَاثَةِ یعنی بعض مفسرین نے جو یہ معنے کئے ہیں کہ تین اور زیتون سے مراد تین اور زیتون کے پیدا ہونے کی جگہ ہے خصوصاً تین اور زیتون سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ مقام ہے جہاں آپ نازل ہوئے۔ طورِ سینین سے مراد وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور بلد الامین سے مراد وہ مکہ ہے جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ان تینوں مقامات کا تورات کے آخر میں ذکر آتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے جَاءَ اللّٰهُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ ...... وَاَشْرَقَ مِنْ سَاعِيْرَ ...... وَاسْتَعْلَنَ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ یعنی ’’خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا‘‘ (استثناء باب ۳۳ آیت ۲) یہ ایک مشہور حوالہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق بائبل میں پایا جاتا ہے اور میرے نزدیک یہ پہلا حوالہ ہے جو مفسرین نے صحیح طور پر پیش کیا ہے اور اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشگوئی بھی پائی جاتی ہے ورنہ مفسرین بائبل کے جو حوالہ جات دیتے ہیں وہ اکثر غلط ہوتے ہیں یا تو وہ حوالے بائبل میں ملتے ہی

نہیں اور اگر ملتے ہیں تو اُس رنگ میں نہیں ہوتے جس رنگ میں مفسرین ان کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ پہلا حوالہ ہے جو انہوں نے صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ جَاءَ اللّٰہُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَاءَ کے ساتھ انہوں نے بطور تشریح لکھا ہے یعنی الَّذِیْ کَلَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ مُوْسٰی اور اَشْرَقَ مِنْ سَاعِیْرَ کے ساتھ لکھا ہے یعنی جَبَلُ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰہُ مِنْہُ عِیْسٰی اور وَاسْتَعْلَنَ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ کے ساتھ لکھا ہے۔ یعنی جِبَالُ مَکَّۃَ الَّتِیْ اَرْسَلَ اللّٰہُ مِنْھَا مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ پھر اس کے بعد وہ ایک نوٹ میں لکھتے ہیں فَذَکَرَھُمْ مُّخْبِرًا عَنْھُمْ عَلَی التَّرْتِیْبِ الْوُجُوْدِیِّ بِحَسَبِ تَرْتِیْبِھِمْ فِی الزَّمَانِ یعنی اس پیشگوئی میں جو بائبل میں بیان کی گئی ہے ان تینوں انبیاء کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ اسی ترتیب سے ذکر ہے جس ترتیب کے ساتھ یہ تینوں انبیاء یکے بعد دیگرے آئے۔ پہلے طُوْرِ سِیْنَا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور اَشْرَقَ مِنْ سَاعِیْرِ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور اسْتَعْلَنَ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے کیونکہ اسی ترتیب سے یہ انبیاء آئے تھے۔ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تھے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے اور آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے گویا جس ترتیب سے ان انبیاء نے ظاہر ہونا تھا اسی ترتیب سے اللہ تعالیٰ نے اس پیشگوئی کا بائبل میں ذکر کیا ہے۔ وَلِھٰذَا اَقْسَمَ بِالْاَشْرَفِ ثُمَّ الْاَشْرَفِ مِنْہُ ثُمَّ بِالْاَشْرَفِ مِنْھُمَا یہاں معلوم ہوتا ہے کوئی عبارت رہ گئی ہے یا ترتیب زمانی چونکہ پہلے بیان ہو چکی تھی اس لئے انہوں نے خیال کر لیا کہ لوگ خود بخود اس بات کو سمجھ جائیں گے کہ قرآن کریم نے بائبل کی ترتیب کے خلاف پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ذکر کیا ہے تو درجہ کی ترتیب کے لحاظ سے کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں قرآن کریم نے زمانی ترتیب کو نہیں لیا بلکہ درجہ کی ترتیب کو لیا ہے اور اس لئے پہلے تین اور زیتون کا ذکر کیا ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ وہ باقی دو انبیاء سے درجہ میں چھوٹے ہیں۔ اس کے بعد طورِ سینین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ درجہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بڑے ہیں۔ آخر میں وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ کہہ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا کیونکہ آپ عیسیٰؑ اور موسیٰؑ دونوں سے افضل ہیں۔ یہ توجیہ ابن کثیر والوں کی نہایت معقول اور درست ہے میں نے دیکھا ہے کہ اکثر مقامات پر ان کی عقل خوب چلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں بائبل نے تو ان کی ترتیب وجودی کو مدنظر رکھا تھا مگر قرآن کریم نے ان کی ترتیب مقامی کو مدنظر رکھا ہے۔ وہاں یہ ذکر تھا کہ پہلے کون ہوگا پھر کون ہوگا اور پھر اس کے بعد کون ہوگا۔ لیکن یہاں یہ ذکر ہے کہ ان تینوں میں سے چھوٹا درجہ کس کا ہے اور پھر اس سے بڑا درجہ کس کا ہے اور پھر ان دونوں سے بڑا درجہ کس کا ہے۔ یہ

ایک ایسی بات ہے جو میں نے اور کسی تفسیر میں نہیں دیکھی۔ باقی تفاسیر کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں حضرت مسیحؑ کا ذکر آجاتا ہے وہ بوجہ ان روایتوں کے جو حضرت ابوہریرہؓ کی مہربانی سے احادیث میں آگئی ہیں ڈر جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو ہم حضرت مسیحؑ سے کسی اور نبی کو افضل قرار دے کر آپ کی ہتک کے مرتکب ہو جائیں مگر ابن کثیر نے جو نہایت اعلیٰ پایہ کے مفسر ہیں قطعی اور حتمی طور پر حضرت مسیح ناصری کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کم درجہ رکھنے والا قرار دیا ہے۔

مولوی محمد علی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ انجیر کا ذکر دوسری جگہ قرآن کریم میں نہیں ہے مگر زیتون کا سورۂ نور میں ذکر ہے جہاں نورِ محمدی کو زیتون سے مشابہت دی ہے دوسری طرف بائبل میں انجیر کو سلسلہ موسویہ سے مشابہت دی ہے چنانچہ یرمیاہ باب ۲۴ میں لکھا ہے ’’دوٹوکریاں انجیروں کی خداوند کی ہیکل کے سامنے دھری تھیں۔ ایک ٹوکری میں اچھے سے اچھے انجیر تھے.... اور دوسری ٹوکری میں بُرے سے بُرے انجیر‘‘ اور پھر آگے چل کر اچھے انجیروں کو بنی اسرائیل کے اچھے لوگ قرار دیا ہے اور بُرے انجیروں کو بُرے لوگ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور انجیر کے درخت پر لعنت کرنے کے واقعہ میں بھی درحقیقت اسی طرف اشارہ ہے دیکھو متی باب ۲۱ ’’اور جب صبح کو شہر میں جانے لگا اسے بھوک لگی تب انجیر کا ایک درخت راہ کے کنارے دیکھ کر اُس پاس گیا اور جب پتوں کے سوا اس میں کچھ نہ پایا تو کہا اب تجھ میں کبھی پھل نہ لگے وہیں انجیر کا درخت سوکھ گیا‘‘ پھر لکھتے ہیں بے موسم پھل نہ لگنے پر درخت پر کیا خفگی ہوسکتی تھی۔ اصل میں یہ ایک تمثیل تھی۔ انجیر کا درخت سلسلۂ بنی اسرائیل کا قائم مقام تھا جسے لفظ پرست انجیل نویسوں نے واقعہ کا رنگ دے دیا (بیان القرآن جلد سوم زیر سورۃ التین)۔

مگر یہ بات بھی ویری کی طرح کہی گئی ہے واقعہ یہ ہے کہ انجیل کے ماننے والے بھی اس واقعہ کو ظاہری نہیں مانتے بلکہ وہ اس کو ایک تمثیلی واقعہ قرار دیتے ہیں چنانچہ مجھے یاد ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اس واقعہ سے حضرت مسیح ناصری کے اخلاق کے متعلق استدلال کیا اور لکھا کہ کیا یہی حضرت مسیحؑ کے اخلاق تھے کہ ایک انجیر کے درخت پر محض اس وجہ سے آپ نے لعنت کر دی کہ اس پر پھل نہیں تھا۔ حالانکہ اس میں درخت کا کوئی قصور نہ تھا (چشمۂ مسیحی، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۴۶) تو عیسائیوں نے اس کے جواب میں یہ لکھا کہ ہم اس کو ظاہری واقعہ تسلیم نہیں کرتے۔ خود انجیل سے ثابت ہے کہ وہ پھلوں کا موسم نہیں تھا اس لئے یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ حضرت مسیحؑ ایک انجیر کے درخت کی طرف اس کے پھل کی امید میں ایسے موسم میں جاتے جس میں پھل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ درحقیقت انجیر کے درخت سے یہودی لوگ مراد ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے چاہا کہ یہودی قوم ان پر ایمان لا کر زندہ

ہو جائے اور وہ بھی روحانی پھل پیدا کرنے لگے مگر یہودی قوم نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا اس پر حضرت مسیحؑ نے لعنت کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ آئندہ یہ قوم خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے ہمیشہ محروم رہے گی مولوی محمد علی صاحب نے سمجھا ہوگا کہ میں ایک بہت بڑا نکتہ نکال کر پیش کر رہا ہوں حالانکہ عیسائی بھی یہی معنے کرتے ہیں کہ اس واقعہ میں یہودیوں کی تباہی کی طرف اشارہ تھا اور مراد یہ تھی کہ انجیر کے درخت پر اب پتے ہی باقی رہ گئے ہیں پھل نہیں۔ یعنی یہودیوں میں صرف ظاہر ہی ظاہر رہ گیا ہے۔ پھل اور روحانیت ان میں نہیں رہی اس لئے آئندہ یہ درخت سوکھ جائے گا۔ یعنی کوئی نبی ان میں نہیں آئے گا۔ پس انجیر سلسلۂ اسرائیل کا قائم مقام ہے اور زیتون سلسلہ محمدیہ کا اور انجیر اور زیتون الگ مثال نہیں ہیں بلکہ طور اور بلد الامین ہی کی طرف اشارہ کرتی ہیں پہلے ان کے ذریعہ سے مخفی اشارہ موسوی اور محمدیؐ سلسلہ کی طرف کیا گیا پھر طور و بلد الامین کہہ کر اس اشارہ کو واضح کر دیا گیا۔

تین وزیتون کی تفسیر حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کی زبانی

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں (خلاصہ میرے الفاظ میں ہے) کہ ان کی قسم اس لئے کھائی یعنی تین اور زیتون کی کہ علاوہ غذا کے دوا کے طور پر بھی یہ استعمال ہوتی ہیں۔ کبھی طبیب تین تجویز کرتا ہے تو کبھی زیتون۔ مطلب یہ کہ ایک زمانہ میں خدا تعالیٰ نے طور سینین کا نسخہ استعمال کیا اور اس زمانہ میں بلد الامین کا نسخہ اس نے تجویز کر دیا (حقائق الفرقان جلد ۴ صفحہ ۴۱۷)۔ گویا وہی لف ونشر کی مثال ہے۔ تین سے مراد بنی اسرائیل اور زیتون سے مراد بلد الامین سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں گویا وہ مضمون جو مولوی محمد علی صاحب نے بیان کیا ہے۔ درحقیقت حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کا بیان کردہ ہے۔ اسی طرح دو ٹوکریوں کی مثال جو مولوی محمد علی صاحب نے پیش کی ہے یہ بھی حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی زبان سے میں نے خود سنی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آپ کے درس کے چھپے ہوئے نوٹوں میں یہ بات نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مفتی محمد صادق صاحب اور قاضی اکمل صاحب نے یہ نوٹ لکھے ہیں اور وہ مضمون کا بہت سا حصہ چھوڑ کر صرف مختصر نوٹ لینے پر اکتفا کیا کرتے تھے لیکن پھر بھی ان نوٹوں میں یہ بات موجود ہے کہ ’’تین اور زیتون ان دو چیزوں کو قسمیہ بطور شہادت کے اس لئے بیان کیا کہ علاوہ غذا کے جسمانی امراض کے لئے بھی بطور دوا کے یہ دونوں چیزیں استعمال کی جاتی ہیں کبھی طبیب تین تجویز کرتا ہے تو کبھی تبدیل نسخہ کے لئے زیتون مفید سمجھتا ہے۔‘‘ گویا حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے مضمون میں ایک زائد بات یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں جس طرح طبیب کبھی تین کو چھوڑ کر زیتون استعمال کراتا ہے اسی طرح خدا نے اگر تین والے نسخے کو بدل کر زیتون والا نسخہ استعمال کرانا شروع کر دیا تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے۔ خدا حکیم ہے اور وہ ہمیشہ مرض کے مطابق آسمان سے علاج نازل

کیا کرتا ہے۔ جب تین کے نسخہ کی ضرورت تھی اس نے تین نازل کر دی اور جب زیتون کے نسخہ کی ضرورت تھی اس نے زیتون نازل کر دیا۔اس تبدیلی سے خدا تعالیٰ پر کوئی اعتراض عائدنہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی حکمت پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے بندوں کے فائدہ اور مخلوق کی نفع رسانی کے لئے کرتا ہے۔ یہ مضمون جو نہایت ہی لطیف تھا مولوی محمد علی صاحب نے چھوڑ دیا کیونکہ مضمون ظاہر کر رہا تھا کہ اس نکتہ کو بیان کرنے والا کوئی طبیب ہے۔انہوں نے وہ حصہ تو لے لیا جس کے بیان کرنے سے حضرت خلیفہ اوّل ؓ کی طرف اشارہ نہیں ہوتا تھا۔مگر وہ حصہ ترک کر دیا جس کو بیان کرنے سے آپ کی طرف اشارہ ہو جاتا تھا۔ بے شک مولوی محمد علی صاحب نے یہ مضمون بیان کر کے لوگوں سے واہ واہ لے لی ہوگی اور وہ ہزاروں غیر احمدی جو ان کی تفسیر میں اس نکتہ کو پڑھتے ہوں گے خیال کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد علی صاحب نے نہایت عجیب بات نکالی ہے مگر افسوس ہے کہ جس شخص نے قرآن کریم کا یہ لطیف نکتہ نکال کر پیش کیا تھا اس کا ذکر انہوں نے چھوڑ دیا اور اس کی محنت کو اپنی طرف منسوب کر لیا پھر جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے وہ بھی مکمل مضمون نہیں بلکہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں وہ حضرت خلیفہ اوّل ؓ کے مضمون کے اس حصہ کو چھوڑ گئے ہیں کہ جس طرح طبیب حالات کی تبدیلی پر نسخہ تبدیل کر دیتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے تین کی بجائے زیتون کا نسخہ لوگوں کو استعمال کرانا شروع کر دیا۔ یہ نکتہ نہایت ہی شاندار ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک نئی شریعت کے نزول سے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر وجہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسوی شریعت کو کالعدم قرار دے دیا اور اس کی جگہ محمدی شریعت کو نازل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ کیا طبیب جب کسی مریض کے لیے نسخہ تجویز کرتا ہے تو ہمیشہ ایک ہی نسخہ رکھتا ہے؟ تم جانتے ہو کہ حالات کے بدلنے پر ہر سمجھدار طبیب نسخہ میں تبدیلی کر دیا کرتا ہے کبھی وہ تین استعمال کراتا ہے اور کبھی زیتون۔ کبھی ایک دوا استعمال کراتا ہے اور کبھی دوسری۔ جب روزانہ دنیا میں یہ نظارہ نظر آتا ہے اور تم جانتے ہو کہ کامل طبیب کی علامت یہی ہوتی ہے کہ وہ حالات کے مطابق نسخہ بدل دے تو تمہیں اللہ تعالیٰ کے اس فعل سے کیوں تکلیف ہوئی اور کیوں تمہارے دل میں یہ اعتراض پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ اس نے موسوی شریعت کی بجائے محمدی شریعت کیوں نازل کر دی ہے؟ غرض مولوی محمد علی صاحب نے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے معنے اوّل تو ادھورے نقل کئے ہیں اور پھر آپ کا حوالہ دینے سے وہ کترا گئے ہیں حالانکہ دیانتداری کا تقاضا یہ تھا کہ جس شخص نے یہ معنے نکالے تھے اس کا ذکر بھی کیا جاتا۔ میں نے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے یہ بھی سنا ہوا ہے کہ تین اور زیتون مسیحؑ کے لیے، طور موسیٰؑ کے لیے اور بلد الامین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے گویا ابن کثیر والے مضمون کو بھی آپ پیش کیا کرتے تھے۔

سابق مفسرین کے بیان کردہ معنوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ علماء کوشروع سے ہی یہ خیال تھا کہ تین وزیتون مثالی رنگ میں استعمال ہوئے ہیں اوراس کی طرف ان کی طبائع کا شدت سے رجحان پایا جاتا ہے۔ بے شک بعض نے تین اور زیتون سے ظاہری تین اور ظاہری زیتون ہی مرادلیا ہے مگر اکثر نے ان الفاظ کو استعارہ قرار دے کر نئے معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ کسی نے اس سے بیت المقدس مرادلیا ہے، کسی نے بلادِ فلسطین، کسی نے مسجد اقصیٰ اور کسی نے مسجد نوح۔ گو یہ طریق جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے زبردستی کا ہےاور تاویل بعیدہ کا ایک وسیع دروازہ کھول دیتا ہے مگر جہاں تک ان لوگوں کے معنوں کا تعلق ہے جو اس جگہ حذف مضاف کہتے ہیں ان پر غیر معقولیت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا اس میں کوئی بعید بات نہیں کیونکہ یہ عربی کا عام قاعدہ ہے کہ کبھی حذف مضاف کر کے صرف مضاف الیہ کو بیان کر دیا جاتا تو اسی رنگ میں اگر یہاں بھی تین اور زیتون کا استعمال ہو گیا ہوتو اس میں حرج کی کون سی بات ہے۔ قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (یوسف:۸۳) تو ہمارے متعلق گاؤں سے پوچھ لے یا تو ہمارے متعلق گدھوں سے پوچھ لے حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ نہ گاؤں بولا کرتا ہےاور نہ گدھے کسی سے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ دونوں باتیں ناممکن ہیں اور دونوں کو عقلی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا مگر قرآن کریم نے قَرْیَہ اور عِیْر سے ہی سوال کرنے کو کہا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو یہاں قَرْیَہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر مراد اَهْلُ الْقَرْيَة سے ہے یعنی بستی والے اور گو صرف عِیْر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر مراد یہ ہے کہ گدھوں کے مالکوں سے پوچھ لو۔ اسی طرح قرآن کریم میں اور بھی بہت سی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کثرت سے اس محاورہ کو استعمال فرماتا ہے۔ ہاں ایسے مواقع پر قرائن قویہ کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر قرائن قویہ کے بغیر ایسے معنے کئے جائیں تو بے شک معقول وغیر معقول کے درمیان کی دیوار ٹوٹ جاتی ہے۔ چنانچہ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا میں یہ ایک نہایت کھلا قرینہ ہے کہ بستی کلام نہیں کیا کرتی یا گدھے بولا نہیں کرتے اور جب یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں تو ان سے سوال کرنے کے بجز اس کے اور کوئی معنے نہیں ہو سکتے کہ بستی سے تعلق رکھنے والے جو لوگ ہیں ان سے دریافت کیا جائے یا گدھوں کے جو مالک ہیں ان سے اصل حقیقت معلوم کی جائے۔ اسی طرح اگر بعض لوگوں نے وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ کے یہ معنے لے لئے کہ اس سے مراد وہ علاقے ہیں جہاں تین اور زیتون دونوں کثرت سے ہوتی ہیں (فتح البیان زیر آیت وَالتِّيْنِ)۔ تو اس میں عجیب بات کون سی ہوگئی۔ قرآن کریم اپنے کلام میں لازماً عربی محاورات اور عربی طریق گفتگو کو مدنظر رکھے گا۔ جب عربی زبان میں

یہ عام قاعدہ ہے کہ کبھی حذف مضاف کر کے صرف مضاف الیہ بیان کر دیتے ہیں۔تو کوئی وجہ نہیں کہ قرآن کریم اس محاورہ کو استعمال نہ فرمائے۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس جگہ قرینہ قویہ کون سا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ قرینہ اگلے دو الفاظ ہیں یعنی طور اور بلد الامین ۔قرآن کریم سے ثابت ہے کہ طور ایک مقام ہے جو ایک نبی کی وجہ سے معزز ہوا اور مکہ بھی ایک مقام ہے جو ایک نبی کی وجہ سے معزز ہوا۔ پس جبکہ تین اور زیتون کے معطوف دو مقام ہیں جو ایک ایک نبی کی وجہ سے معزز ہوئے تو عقل ضرور اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ تین وزیتون میں بھی کسی مقام کا نام ہوگا۔ یا کسی نہ کسی نبی سے تعلق رکھنے والی چیز ہوگی جس کی وجہ سے اسے طور اور مکہ کی طرح خدا تعالیٰ کی قدرت اور شوکت کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے۔اسی طرح ابن کثیر والوں نے جو اس سوال کا جواب دیا ہے کہ ترتیب قرآنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے کیوں بیان کیا گیا ہے وہ ایک نہایت لطیف جواب ہے اور ان کی نگاہ کی باریکی کی قدر کرنی پڑتی ہے۔مولوی محمد علی صاحب نے جو معنے کئے ہیں ان کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ وہ درحقیقت حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے معنے ہیں جو انہوں نے چرا کر اپنی طرف منسوب کر لئے ہیں لیکن بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے معنے نہایت لطیف ہیں کہ ایک قوم کو تین سے مشابہت دی گئی ہے اور دوسری کو زیتون سے اور بتایا گیا ہے کہ ایک وقت ہم نے تین کا نسخہ تجویز کیا تھا اور دوسرے وقت میں زیتون کا کیونکہ ہم کامل طبیب ہیں اور جیسی جیسی بیماری ہوتی ہے ویسا ہی اس کا علاج کرتے ہیں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ اس جگہ یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تین مزے میں تو اچھی ہوتی ہے مگر وہ جلدی سڑ جاتی ہے اس کے مقابل میں زیتون علاوہ اس کے کہ پھل کا کام دیتا ہے اس کا روغن کثرت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور اچار میں بھی ڈالا جاتا ہے جو اس کو دیر تک قائم رکھتا ہے۔گویا تین تو اپنی ذات میں بھی قائم نہیں رہ سکتی اور زیتون کے ساتھ دوسری چیزیں بھی قائم رکھی جاتی ہیں اور ان دو مثالوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ موسوی تعلیم انجیر کی طرح سڑ جانے والی تھی۔اب ہم تمہیں وہ تعلیم دیں گے جو نہ صرف سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ رہے گی بلکہ انسانی ذہنوں میں ایک ایسا نور پیدا کر دے گی کہ اس کے ذریعہ سے نئے سے نئے معارف اور نئے سے نئے علوم انہیں اس کتاب سے حاصل ہوتے رہیں گے۔جیسے سورۂ نور میں زیتون کے تیل کی تعریف کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (النور:۳۶)۔ یہ تیل ایسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ خواہ آگ اس کے قریب نہ لائی جائے تب بھی وہ خود بخود بھڑک اٹھتا ہے۔ایسی اعلیٰ درجہ کی چیز کے ساتھ الٰہی کلام کو مشابہہ قرار دینے کے معنے یہی ہیں کہ وہ کلام جو اب دنیا میں نازل کیا جائے گا نئے سے نئے علوم اور

معارف کو دنیا میں قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہوگا۔ اور جہالت اور معصیت کی تاریکیوں کو دور کر دے گا۔ ان دونوں معنوں میں جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ترتیب طبعی پائی جاتی ہے۔ ایک میں درجہ کے لحاظ سے اور ایک میں زمانہ کے لحاظ سے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ ان مثالوں سے پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہایت معتدل القویٰ بنایا ہے۔ کیونکہ جب بھی خدا تعالیٰ کے نبی آئے آخر دنیا ان کو مان گئی۔ اور وہ پہلے معنی جو مفسرین نے بائبل کی اس پیش گوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے کئے ہیں کہ "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا" (استثناء باب ۳۳ آیت ۲) اور یہ سمجھ لو کہ یہی پیش گوئی اس جگہ بیان کی گئی ہے۔ تو اس لحاظ سے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کے یہ معنے ہوں گے کہ ان میں سے جس نبی کو بھی دیکھ لو تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ آخر وہی فتح یاب ہوا۔ بے شک دنیا نے ان کی مخالفت کی۔ ان کو مٹانے کے لئے اس نے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کیں مگر آخر ان کی تعلیم کو ماننے پر مجبور ہوگئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکل آیا کہ ہم نے انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کی تقویم میں پیدا کیا ہے۔ موسیٰؑ آئے تو ہم نے انہیں فتح دی۔ عیسیٰؑ آئے تو ہم نے انہیں فتح دی۔ اب تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے مگر ایک دن تمہیں اس کی تعلیم کے سامنے اپنے سر کو جھکانا پڑے گا اور اس طرح ثابت ہو جائے گا کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ کی نئی تفسیر

غرض حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے معنے بھی بڑے لطیف ہیں اور پرانے مفسرین کے بعض معنے بھی بہت اچھے ہیں مگر میں نے اس سورۃ پر مزید غور کیا کہ کیا ایسے لطیف اور واضح معنوں کے ہوتے ہوئے پھر کوئی اور معنے بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ جب میں نے غور کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان آیات کا ایک نیا علم بخشا۔ اس کے لحاظ سے یہاں نہ دو زمانوں کا ذکر ہے نہ تین کا بلکہ چار زمانوں کی خبر دی گئی ہے اور اس طرح ایک نہایت ہی لطیف مضمون بیان کیا گیا ہے جو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کے ساتھ گہرے طور پر تعلق رکھتا ہے۔ بے شک اگر ہم موسیٰؑ کی مثال لے لیں یا عیسیٰؑ کی مثال لے لیں یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال لے لیں تب بھی یہ آیت اپنے معانی کے لحاظ سے پوری طرح چسپاں ہو جاتی ہے مگر اس صورت میں انسان کو احسنِ تقویم میں پیدا کرنے کی مثال زمانہ کے صرف ایک جزو کے ساتھ تعلق رکھے گی۔ کامل مثال تب ثابت ہوتی ہے جب ساری دنیا پر مجموعی لحاظ سے نظر ڈالنے کے بعد یہ نتیجہ پیدا ہو کہ انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے اگر ساری دنیا پر مجموعی نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ تو اس صورت میں یقیناً یہ پہلے سے زیادہ زبردست دلیل بن جائے گی اور قرآن کریم کے حسن اور اس کی شان کو دوبالا کر دے گی۔

آنحضرت صلعم کی فتح کے یقینی ہونے کی پہلی دلیل غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ سے پہلے کی چند سورتوں میں ہجرت کا ذکر چلا آتا ہے۔ چنانچہ پہلے تو یہ بتایا گیا ہے کہ تمہیں ہجرت کرنی پڑے گی پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ہجرت کس طرح ہوگی اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ہجرت کے بعد تمہیں کس طرح غلبہ حاصل ہوگا۔ کفار کیونکر مغلوب ہوں گے اور اسلام کو کس طرح شوکت اور عظمت حاصل ہوگی۔ یہ مضمون سورۂ فجر سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد کی ہر سورۃ میں اشارۃً یا وضاحتاً کسی نہ کسی رنگ میں ہجرت کا ذکر چلا آتا ہے۔ ہجرت کا پہلا اثر انسان کی طبیعت پر یہ ہوتا ہے کہ ہار گئے، بھاگ گئے، شکست کھا گئے۔ جب بھی ہجرت کا ذکر کیا جائے گا۔ دشمن تالیاں پیٹنے لگ جائے گا کہ لو اب بھاگنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج تو ہم یہاں سے جا رہے ہیں مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر فتح حاصل کر کے واپس آئیں گے۔ تب بھی دشمن حقارت کی ہنسی ہنستا ہے اور کہتا ہے فتح کو تو میں نہیں مانتا مگر اتنا تو تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ اس وقت تم میرے مقابلہ سے بھاگ رہے ہو۔

غرض ہجرت پر شیطان کو ایک خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ بظاہر شیطان جیت جاتا ہے اور نبی ہار جاتا ہے گویا شیطان کی فتح کی ایک ظاہری علامت قائم ہو جاتی ہے اور کمزور دل لوگ ڈر جاتے ہیں کہ کیا اس کے نتیجہ میں اب یہ سلسلہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا مدعی ہے تباہ تو نہ ہو جائے گا۔ اس کا بانی تو کہتا تھا کہ ہم جیت جائیں گے اور دشمن ہار جائے گا۔ مگر ہوا یہ کہ خود ہی دشمن سے ڈر کر بھاگ رہا ہے۔ پس چونکہ ہجرت پر شیطان کو ایک ظاہری فتح حاصل ہوتی ہے اور کمزور ایمان والوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں ہجرت کی چار مثالیں بیان فرمائی ہیں اور بتایا ہے کہ اس سے پہلے شیطان نے تین دفعہ بظاہر خدا تعالیٰ کے نبیوں کو شکست دی تھی اور ان کو دق کر کے ان کے وطن سے نکال دیا تھا مگر آخر نتیجہ کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی پردہ پوشی فرمائی اور ان کی شکست کو فتح میں بدل دیا۔ اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ تم ہمارے رسول کو اس قدر تکالیف پہنچاؤ گے کہ آخر وہ مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور تم خوش ہو گے کہ تم نے اسے شکست دے دی اور اسے اپنے شہر میں سے نکال دیا۔ مگر یاد رکھو آخر تم کو ہی ذلیل ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ہم تمہارے سامنے تین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ تینوں دفعہ شیطان نے خدا تعالیٰ کے نبیوں کو نکالا مگر تینوں دفعہ شیطان نے منہ کی کھائی اور ان انبیاء کا اپنے وطن سے نکلنا ہی دشمن کی تباہی کا موجب بن گیا۔

شیطان کا حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکہ دینا پہلی مثال آدمؑ کی ہے۔ آدم کو بظاہر شیطان سے شکست ہوئی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک درخت کے پاس جانے سے انہیں منع کیا تھا جس کے پاس وہ شیطان کے بہکانے کے نتیجہ میں چلے گئے اور انہیں کئی قسم کی تکالیف میں مبتلا ہونا پڑا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم

میں فرماتا ہے فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى۔ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى۔ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى۔ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى۔ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَ عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى۔ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى۔ (طٰهٰ:۱۱۸ تا ۱۲۳) یعنی ہم نے آدم کو جنت میں رکھا تو شیطان ان کا مدمقابل بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا۔ اے آدم یہ تیرا دشمن ہے اور تیری بیوی یا تیرے ساتھیوں کا بھی دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکال دے اور تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔ تیرے لئے خدا کا فیصلہ یہی ہے کہ تو اس جنت میں نہ بھوکا رہے نہ ننگا، نہ پیاسا رہے اور نہ گرمی کی تکلیف تجھے ستائے۔ جب خدا نے یہ کہا تو شیطان کو اور غصہ چڑھا کہ اچھا میرے مقابلہ میں اب اس کے غلبہ اور کامیابی کی خبریں دی جارہی ہیں۔ چنانچہ شیطان نے اپنا بھیس بدلا اور اس نے آدم کے پاس آ کر کہا۔ کیا میں آپ کو ایک ایسے درخت کا پتہ دوں جس کا پھل کھانے سے آپ کو دائمی حیات حاصل ہو سکتی ہے اور ایسی حکومت کا آپ کو پتہ دوں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔ جب اس طرح کی چکنی چپڑی باتیں اس نے کیں تو دھوکہ کھا جانے کی وجہ سے آدم اور اس کی جماعت نے یا آدم اور اس کی بیوی نے اس درخت کا پھل کھا لیا اور چونکہ آدم کا یہ فعل خدائی منشاء کے خلاف تھا اس لئے یک دم اس فعل کے برے نتائج ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور آدم کی آنکھیں کھل گئیں کہ اس نے خدائی منشاء کی خلاف ورزی کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس نے سمجھا تھا کہ یہ کامیابی حاصل کرنے کا طریق ہے مگر ہوا یہ کہ دشمن کی بات مان کر اس کی مشکلات اور بھی بڑھ گئیں اور وہ فتوحات جو اسے پہلے حاصل ہو رہی تھیں ان میں یک دم روک پیدا ہو گئی۔

شیطان نے آدم کو ورغلانے کا یہی ڈھنگ نکالا تھا کہ آپس کے تعلقات سے بہت فائدہ ہوگا۔ رشتہ داری کے تعلقات بڑھ جائیں گے۔ دوستانہ تعلقات بڑھ جائیں گے۔ محبت اور پیار کے تعلقات بڑھ جائیں گے اور اس طرح بہت جلد ترقی حاصل ہو جائے گی پھر اس نے کہا آخر خدا کا بھی تو یہی منشاء ہے کہ تمہیں ترقی حاصل ہو اگر ایک دوسرے سے مل کر اور آپس کی مغائرت کو دور کر کے یہ ترقی حاصل ہو جائے تو خدا کو کب ناپسند ہوگی۔ اس کو تو بہر حال یہ بات اچھی لگے گی۔ آدم اس کے دھوکہ میں آ گئے اور انہوں نے دشمن سے صلح کر لی۔ صلح کرنے کی دیر تھی کہ یک دم ان کی فتوحات رک گئیں کامیابیاں جاتی رہیں اور اس باہمی میل جول کے بدنتائج ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا کہ درخت کا پھل کھانے سے ان کا ننگ ظاہر ہونا شروع

ہو گیا اور اس فعل کے برے نتائج ان پر روشن ہو گئے۔ جب آدم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہیں معلوم ہوا کہ شیطان کی طرف صلح اور محبت کا ہاتھ بڑھا کر انہوں نے خطرناک غلطی کی ہے تو اس غلطی کے ازالہ کے لئے طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْھِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ انہوں نے جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا۔ وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی اور آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی تھی جس سے وہ تکلیف میں مبتلا ہوا۔ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ مگر پھر خدا نے اسے بزرگی دے دی اور اس نے ورق الجنۃ سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا اور خدا تعالیٰ نے اسے وہ راستہ دکھا دیا جو اسے اور اس کی جماعت کو کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے والا تھا۔ اب دیکھو یہاں شیطان نے آدم کو دھوکا دے کر بظاہر اسے شکست دے دی تھی مگر آدم نے فوراً ورق الجنۃ سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا اس کی شکست فتح سے بدل گئی اور آخر آدم ہی کامیاب رہا۔ ورق کے معنے زینت کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْوَرَقُ: جَمَالُ الدُّنْیَا وَ بَھْجَتُھَا کہ دنیا کی خوبصورتی اور اس کے حسن کو ورق کہتے ہیں۔ اسی طرح ورق کے معنے نسل کے بھی ہیں۔ چنانچہ عربی زبان کا محاورہ ہے اَنْتَ طَیِّبُ الْوَرَقِ اور اس محاورہ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تو طَیِّبُ النَّسْل ہے ان دونوں محاوروں کے لحاظ سے طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْھِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ کے معنے یہ ہوئے کہ آدم نے جنت کی زینت اور جمال سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا اور جنت کا جمال اس کے مومن ساکنین ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے معنوں کی رو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ آدم نے پاکیزہ نسل کے ذریعہ سے شیطانی فریب کا ازالہ کرنا شروع کیا اور وہ کامیاب ہو گیا۔

انجیر کے پتوں سے مراد صلحاء کی جماعت اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وَرَقِ الْجَنَّةِ کا تعلق انجیر سے کیا ہوا۔ ہر ایک درخت کے پتے وَرَقِ الْجَنَّةِ کہلا سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل ہم علم تعبیر الرؤیا کو دیکھتے ہیں تو اس میں لکھا ہے کہ اَلتِّیْنُ فِی الْمَنَامِ یُفَسَّرُ بِالصُّلَحَاءِ وَ خِیَارِ النَّاسِ (تعطیر الانام فی تعبیر المنام زیر لفظ ’’التین‘‘) یعنی جب کوئی شخص رؤیا یا کشف کی حالت میں انجیر کا درخت دیکھے تو اس کے معنے صالح اور نیک لوگوں کے ہوتے ہیں۔ یہی وَرَقِ الْجَنَّةِ کے معنے تھے کیونکہ ورق پاکیزہ نسل کو کہتے ہیں اور وَرَقِ الْجَنَّةِ کے معنے تھے جنت کی پاکیزہ نسل اور جنتی نسل صلحاء اور مومن لوگ ہی ہوتے ہیں۔ پس وَرَقِ الْجَنَّةِ کا ترجمہ تعبیر الرؤیا کے مطابق انجیر کے پتے ہوا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا آدم کے واقعہ کے ساتھ خصوصیت سے انجیر کا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اس غرض کے لئے جب ہم بائبل کو دیکھتے ہیں تو اس میں یہ لکھا ہوا پاتے ہیں۔

’’اور سانپ میدان کے سب جانوروں سے جنہیں خداوند خدا نے بنایا تھا ہوشیار تھا۔ اور

اس نے عورت سے کہا کیا یہ سچ ہے کہ خدا نے کہا کہ باغ کے ہر درخت سے نہ کھانا عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل ہم تو کھاتے ہیں مگر اس درخت کے پھل کو جو باغ کے بیچوں بیچ ہے خدا نے کہا کہ تم اس سے نہ کھانا اور نہ اسے چھونا ایسا نہ ہو کہ مر جاؤ۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن اُس سے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے ہوؤ گے اور عورت نے جوں دیکھا کہ وہ درخت کھانے میں اچھا اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے، تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ہم ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کے اپنے لئے لنگیاں بنائیں'' (پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۷)

یعنی جب شیطان نے آدم کو جنت میں سے نکالنے کا سامان کیا تو آدم نے وَرَقِ الْجَنَّةِ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس طرح وہ ننگ جو ظاہر ہو گیا تھا اس کو ڈھانک لیا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ وَرَق الْجَنَّةِ تعبیر الرؤیا کے مطابق انجیر کے پتوں کو کہتے ہیں اور جیسا کہ انجیر کے معنے صلحاء اور پاک طینت لوگوں کے ہیں۔ اسی طرح وَرَقِ الْجَنَّةِ کے معنے بھی جنتی نسل کے ہیں اور جنتی نسل وہی ہوتی ہے جو صلحاء اور پاک لوگوں پر مشتمل ہو۔ بہر حال قرآن اور بائبل دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ شیطان جب آدم کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوا تو آدم نے انجیر کے پتوں کو اپنے گرد لپٹا لیا۔ یعنی جب شیطان نے ان کو دھوکا دیا اور صلح کے نام پر آدم کو اپنے ساتھ ملا کر خدائی سکیم کو ناکام کرنا چاہا تو آدم کو یک دم اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے مومنوں کی جماعت کو اپنے ساتھ ملا کر شیطانی تدابیر کو ناکام کر دیا۔ شیطان نے تو چاہا تھا کہ اس ذریعہ سے وہ آدم کو شکست دے دے مگر بجائے اس کے کہ آدم کا یہ فعل ان کے لئے کسی نقصان یا خرابی کا موجب ہوتا ان کے اندر ایک نئی بیداری پیدا ہو گئی اور وہ ترقی کے میدان میں اور بھی آگے نکل گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رجوع برحمت فرمایا اور انہیں پہلے سے بھی زیادہ ترقی دے دی۔ جیسے احرار نے ۱۹۳۴ء میں جماعت احمدیہ کے خلاف ایک بہت بڑا فتنہ اٹھایا اور اس لئے اٹھایا کہ وہ جماعت احمدیہ کو کچل کر رکھ دیں مگر یہی فتنہ ایسی بیداری اور حرکت پیدا کرنے کا موجب بن گیا کہ ہماری جماعت پہلے سے کئی گنا ترقی کر گئی۔ اسی طرح شیطان نے آدم اور اس کی جماعت کی تباہی کے لئے جو تدبیر اختیار کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی خرابیاں اتنی جلدی آدم پر ظاہر کر دیں کہ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے یک دم وَرَقِ الْجَنَّةِ کو سمیٹ لیا اور دشمن کے سامنے اعلان کر دیا کہ ہمارا تمہارے ساتھ کوئی جوڑ نہیں تم صلح اور آشتی کے نام پر ہمیں

اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے ہمارا راستہ خدا نے اور مقرر کیا ہے اور تمہارا راستہ اور ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ ہماری جماعت مداہنت سے کام لے اور تمہاری ہاں میں ہاں ملاتی چلی جائے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد خدا نے ہمیشہ کے لئے یہ قانون مقرر کر دیا کہ مومنوں کی جماعت کفار سے ہمیشہ علیحدہ رہے گی۔ جب تک شیطان نے یہ فعل نہیں کیا تھا اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اتنی ہدایت تھی کہ شیطان کے دھوکا میں نہ آنا مگر آدمؑ کے اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے یہ رسم قائم کر دی کہ انبیاء کی جماعتوں کو شیطانی لوگوں سے الگ رہنا چاہیے۔ بعض احکام ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر نئے دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ نئے نہیں ہوتے۔ مثلاً ہماری جماعت کے افراد کو یہ حکم ہے کہ وہ غیروں کے پیچھے نمازیں نہ پڑھیں، ان کو رشتے نہ دیں، ان کے جنازے نہ پڑھیں۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسے سخت احکام جماعت کو کیوں دیئے جاتے ہیں مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ احکام نئے نہیں بلکہ وہی ہیں جن کا آدم کے وقت سے آغاز ہو چکا ہے۔ جب تک شیطان نے آدم کو دھوکا نہیں دیا اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ احکام نازل نہیں ہوئے۔ مگر جب شیطان ایک دفعہ آدم کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے یہ قانون مقرر کر دیا کہ الٰہی جماعتوں کو اپنے مخالفوں سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی جو دنیا میں آیا اس نے اپنی جماعت کو دوسروں سے علیحدہ رکھا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی نبی آیا ہو اور اس نے اپنی جماعت کو یہ اجازت دے دی ہو کہ وہ غیروں سے مل جل کر رہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی شیطان کے مقابل پر فتح غرض شیطان نے آدم کو جنت سے نکالنے کا سامان کیا اور آدم کو جنت سے ہجرت کرنی پڑی مگر اس کے بعد خدا نے جو اسے تین نصیب کی وہ اسے اس قدر کامیاب کرنے والی ثابت ہوئی کہ آج دنیا میں ابلیس کو ماننے والا تو کوئی نظر نہیں آسکتا مگر آدم کو ماننے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ آدم کا ننگ انجیر کے پتوں سے ڈھانکا گیا تھا جو درحقیقت تمثیلی زبان میں ایک الہام تھا جسے یہود نے سمجھا نہیں اور فی الواقعہ ننگا ہونا اور انجیر کے پتوں سے ڈھانکنا سمجھ لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک درخت سے یعنی اُسی سانپ سے اور اُس کے ساتھیوں سے تعلق رکھنے سے منع فرمایا جو جنات میں سے تھا (سانپ زیر زمین رہتا ہے اور یہ شخص بھی، کیومین Caveman تھا یعنی زیر زمین رہنے والا) اس نے آ کر دھوکا دیا کہ ہمارا پھل کھانے سے یعنی ہمارے ساتھ تعلقات پیدا کرنے سے فائدہ ہی ہے اور خدا تعالیٰ کا بھی تو اصل منشاء تم کو فائدہ پہنچانا ہے اب ہم جو صلح کر کے ملتے ہیں تو وہ مقصد بدرجۂ اتم پورا ہو جائے گا۔ آدم اس کے

فریب میں آ گئے۔ ان لوگوں سے تعلقات پیدا کئے اور نقصان اٹھایا۔ تب اللہ تعالیٰ سے ہدایت پا کر آپ نے انجیر کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا یعنی مومنوں کو اپنے گرد جمع کرنے لگے اور کفار سے قطع تعلق کر لیا۔ اس طرح جنت سے نکلنے کی جو تکلیف پہنچی تھی یعنی آپ کو جو ہجرت کرنی پڑی تھی اس کا ازالہ ہو گیا۔ بظاہر شیطان کی فتح ہوئی مگر دراصل آدم کی ہوئی۔ کیونکہ اس کو قومی تنظیم کا خاص خیال پیدا ہو گیا اور بجائے گرنے کے ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى (طٰهٰ:۱۲۳) کے سامان پیدا ہو گئے۔ پس فرمایا کہ ایک تو تین کے واقعہ کو لو کہ شیطان نے آدم کو دھوکا دیا اور اس کے نتیجہ میں آدم کو ہجرت کرنی پڑی اور جس ارضی جنت میں وہ رہتے تھے اسے چھوڑنا پڑا مگر اسی ہجرت کے نتیجہ میں ایک مومنوں کی جماعت آدم کے گرد جمع ہو گئی اور ان کی مدد سے آدم نے شیطان کی تدبیر کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ اے مکہ والو اب تم بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی کرنے والے ہو مگر یاد رکھو اب بھی وہی ہوگا جو آدم کے وقت میں ہوا تھا۔ تین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقص کو ڈھانپ لے گی اور ہجرت ہی کے نتیجہ میں ایک صلحاء کی جماعت آپ کے گرد جمع ہو جائے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ (طٰهٰ:۲۶) مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ اسی طرح آدم کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ آدم نے تین کے پتوں کو اپنے گرد جمع کرنا شروع کیا اور اس طرح اپنے ننگ کو ڈھانکا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تین کے پتے خود بخود آپ کی طرف بڑھے اور جنگ بدر کے وقت انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم موسیٰؑ کے ان ساتھیوں کی طرح نہیں جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور دشمن سے لڑتے پھرو۔ بلکہ یا رسول اللہ ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے، آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گزرے۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب قولہ تعالیٰ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ) یہ کتنا بڑا فرق ہے جو آدم اوّل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں پایا جاتا ہے۔ آدم کو تو خود اپنی جدوجہد سے تین کے پتے اپنے اردگرد لپٹانے پڑے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ چونکہ آدمؑ سے بہت بلند تھا اس لئے آپ سے تین کے پتے خود بخود چمٹنے لگ گئے۔ پس فرمایا کیا تم سمجھتے ہو کہ ہجرت کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شکست کھا جائیں گے اور تم فتح حاصل کر لو گے۔ پہلے بھی ایسا کئی بار ہو چکا ہے کہ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو شکست دینی چاہی مگر ہمیشہ اس نے منہ کی کھائی۔ چنانچہ آدم کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ شیطان نے اسے جنت سے نکالا اور وہ چلا گیا

مگر آخر کیا ہوا۔ وہی ہجرت اس کی کامیابی کا ذریعہ بن گئی۔ اور اس نے تین کے پتے اپنے اردگرد لپٹا کر دشمن کو اس کی تدابیر میں ناکام کردیا۔ اسی طرح اب بھی تم سمجھو گے کہ ہم کامیاب ہو گئے ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں سے نکال دیا۔ مگر آخر یہی ہجرت تمہاری تباہی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا ذریعہ ہوگی اور اس طرح ثابت ہوجائے گا کہ خدا نے انسان کو چھوڑنے کے لئے نہیں بنایا بلکہ ترقی کرنے کے لئے بنایا ہے۔

زیتون کی شہادت سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی ہجرت کا واقعہ ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ الزَّيْتُوْنِ دوسری مثال ہم زیتون کی دیتے ہیں۔ زیتون کی مثال نوحؑ کا واقعہ ہے۔ نوحؑ کو اس کی قوم نے سخت تنگ کیا اور آخر ایک عذاب عظیم آیا جس کی وجہ سے نوحؑ کی قوم تباہ ہوئی اور نوح کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۔ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۔ وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۔ وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ٟابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۔ وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (ھود: ۳۷ تا ۴۵) یعنی نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو پہلے ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اور کوئی لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ پس تو ان کے فعل پر غمگین مت ہو اور اس بات کا کچھ خیال نہ کر کہ وہ تجھ پر کیوں ایمان نہیں لاتے۔ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے حکم اور وحی سے ایک کشتی بنا اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے خطاب کرنا چھوڑ دے کیونکہ ان کے متعلق الٰہی فیصلہ یہ ہے کہ وہ غرق کئے جائیں گے۔ نوحؑ نے ہمارے اس حکم کے مطابق کشتی بنانی شروع کردی۔ لوگ وہاں سے گزرتے تو ہنسی اور مذاق کرتے کہ دیکھو خشکی میں کشتی چلانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ حضرت نوحؑ ان کو جواب میں کہتے کہ تم بے شک ہنسی کرلو ایک دن آئے گا جب اللہ تعالیٰ تم کو تباہ کردے گا اور تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ کس پر

رسوا کرنے والا اور قائم رہنے والا عذاب نازل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا حکم نازل ہوگیا اور تنور جوش میں آ گیا۔ ہم نے نوحؑ سے کہا کہ ہر قسم کے جوڑے اپنی اس کشتی میں رکھ لے اسی طرح اپنے اہل کو بھی بٹھا لے سوائے اُن کے جن کے متعلق عذاب کی خبر دی جا چکی ہے اور مومن بندوں کو بھی سوار کرلے۔ اور اس پر ایمان نہیں لائے تھے مگر بہت تھوڑے لوگ۔ اُس نے سب سے کہا کہ اس کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی۔ میرا رب یقیناً بخشنے والا اور مہربان ہے۔ جب طوفان آیا اور پہاڑوں جیسی لہروں میں کشتی چلنے لگی اس وقت نوحؑ نے اپنے بیٹے سے جو علیحدہ تھا کہا کہ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہوجاؤ اور کافروں سے مت ملو۔

ہجرت کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا جودی پہاڑ پر ٹھہرنا اور شیطان کے مقابل پر فتحیاب ہونا

دیکھو یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ اس وقت ہجرت کر کے اپنے وطن کو چھوڑ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی تحریک کی کہ ہمارے ساتھ آ جاؤ اور اپنے وطن کو چھوڑ دو۔ مگر اس نے جواب دیا کہ مجھے اپنا وطن چھوڑنے کی ضرورت نہیں آپ بے شک چلے جائیں میں کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ یعنی تو اگر وطن چھوڑنا چاہتا ہے تو بے شک چھوڑ دے میں اپنا وطن چھوڑنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ حضرت نوحؑ نے کہا آج خدا کے عذاب سے وہی بچ سکتا ہے جس پر وہ خود رحم کرے اور کوئی شخص اپنی تدبیر کے زور سے اس ہلاکت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اتنے میں ایک لہر اٹھی اور ان کا لڑکا غرق ہوگیا۔ پھر خدا نے کہا۔ اے زمین تو اپنا پانی پی لے اور اے آسمان تو بھی اپنا پانی روک لے چنانچہ پانی تھم گیا اور نوحؑ کی کشتی جودی مقام پر ٹھہر گئی اس وقت کہا گیا بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ یعنی ظالموں کی قوم دور ہوگئی۔ یا اب تمہارے اور ان کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہوگیا ہے۔

اب دیکھو یہ بھی ایک ہجرت تھی جو نوحؑ نے کی۔ نوحؑ اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر ان کے بیٹے نے ان کا ساتھ نہ دیا بلکہ ان کی تحریک پر جب اس نے کہا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا تو اس کے معنے بھی یہی تھے کہ نوحؑ کی قوم سمجھتی تھی کہ ہم تباہ نہیں ہوں گے۔ یہ چلا جائے گا اور ہم پہاڑوں میں امن سے رہیں گے اور شکر کریں گے کہ ہمارے سر سے یہ بلا ٹلی۔ مگر ہوا یہ کہ نوحؑ بچ گیا اور وہ قوم جو نوحؑ کی ہجرت میں اپنی کامیابی سمجھتی تھی تباہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زیتون کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے آدم کا واقعہ تو تم نے سن لیا۔ اب تم نوحؑ کے واقعہ پر غور کرو۔ یہاں بھی نوحؑ کو دشمنوں کی وجہ سے ملک چھوڑنا پڑا مگر اس ہجرت کے نتیجہ میں بھی کفار ہی تباہ ہوئے اور نوحؑ اور ان کی قوم کو زیتون کی شاخ ملی یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے صلح کا پیغام اور ایک ایسی جماعت جو عُرْوَةُ الْوُثْقٰى کو پکڑنے والی تھی یعنی ایمان میں مضبوط اور قربانی میں کامل۔ چنانچہ

پیدائش باب ۸ میں نوحؑ کے واقعہ کے ساتھ زیتون کا بھی ذکر ہے۔ بائبل میں لکھا ہے۔

’’پھر خدا نے نوح کو اور سب جانداروں اور سب مواشیوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے یاد کیا اور خدا نے زمین پر ایک ہوا چلائی اور پانی ٹھہر گیا اور گہراؤ کے سوتے اور آسمان کی کھڑکیاں بند ہوئیں۔ اور آسمان سے مینہ تھم گیا اور پانی زمین پر سے رفتہ رفتہ گھٹتا جاتا تھا اور ڈیڑھ سو دن کے بعد کم ہوا اور ساتویں مہینہ کی سترھویں تاریخ کو اراراط کے پہاڑوں پر کشتی ٹک گئی اور پانی دسویں مہینہ تک گھٹتا جاتا تھا اور دسویں مہینہ کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں اور چالیس دن کے بعد یوں ہوا کہ نوح نے کشتی کی کھڑکی جو اس نے بنائی تھی کھول دی اور اس نے ایک کوے کو اڑا دیا سو وہ نکلا اور جب تک کہ زمین پر سے پانی سوکھ نہ گیا آیا جایا کرتا تھا۔ پھر اس نے ایک کبوتری اپنے پاس سے اڑا دی کہ دیکھے کہ زمین پر پانی گھٹا یا نہیں۔ پر کبوتری نے پنجہ ٹیکنے کی جگہ نہ پائی اور اس کے پاس کشتی میں پھر آئی کیونکہ تمام روئے زمین پر پانی تھا۔ تب اس نے ہاتھ بڑھا کے اسے لے لیا اور اپنے پاس کشتی میں رکھا پھر اس نے اور سات روز صبر کیا تب اس کبوتری کو پھر کشتی سے اڑا دیا اور وہ کبوتری شام کے وقت اس کے پاس پھر آئی اور دیکھو زیتون کی ایک تازہ پتی اس کے منہ میں تھی۔ تب نوح نے معلوم کیا کہ اب پانی زمین پر کم ہوا اور وہ اور بھی سات دن ٹھہرا بعد اس کے پھر اس کبوتری کو اڑا دیا وہ اس کے پاس پھر کبھی نہ آئی۔‘‘ (پیدائش باب ۸ آیت ۱ تا ۱۲)

غرض نوحؑ کو جس چیز نے یہ بشارت دی تھی کہ تیری ہجرت کامیاب ہوگئی ہے تو جیت گیا اور تیرے دشمن ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے ہیں وہ زیتون کی پتی تھی اور آدم کو جس چیز نے یہ بتایا کہ تو کامیاب ہو گیا ہے وہ انجیر کے پتے تھے اللہ تعالیٰ انہی دو واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ کہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ آدم ہمارا پہلا نبی تھا جس کو شیطان نے جنت سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کیا مگر وہ ہجرت آدم کو نقصان پہنچانے کا موجب نہیں ہوئی، وہ ہجرت مومنوں کو ناکام کرنے کا موجب نہیں ہوئی۔ بے شک آدم نے ہجرت کی مگر آخر آدم ہی جیتا اور شیطان ناکام ہوا۔ اسی طرح اے مکہ والو! آج تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر میں سے نکالنا چاہتے ہو۔ مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تم اپنے افعال میں اس شیطان کے مثیل ہو جس نے آدم کو جنت میں سے نکالا تھا تو ہمارا یہ رسول آدم ہے جسے ہم نے ایک نئی روحانی مخلوق پیدا کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے تم اسے آدم کی طرح ہجرت کرنے پر مجبور کرو گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدم کی طرح اسے بھی تین کے پتے مل جائیں گے یعنی صلحاء

اور پاک طینت لوگوں کی ایک جماعت اسے عطا کی جائے گی جو اس کی قدر و منزلت کو سمجھتے ہوئے ہر قسم کی قربانیاں اس کے لئے کرے گی اور اگر تم نوحؑ کے دشمنوں کی طرح ہو تب بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بے شک نوحؑ نے ہجرت کی مگر خدا نے اس کے دشمنوں کو غرق کر دیا اور اسے زیتون کے پتے کے ذریعہ نجات کی بشارت دی اسی طرح بے شک تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر میں سے نکال دو تم نوحؑ کے دشمنوں کی طرح غرق کیے جاؤ گے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹھہرے گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے زیتون کی شاخ عطا کی جائے گی۔ مدینہ کیا تھا؟ وہ جودی تھی جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کشتی ٹھہری اور مدینہ کے انصار کیا تھے؟ وہ زیتون کے پتے تھے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیے گئے چنانچہ تعطیر الانام میں لکھا ہے مَنْ رَاٰی وَرَقَ الزَّیْتُوْنِ فِی الْمَنَامِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی اگر کوئی شخص خواب میں زیتون کے پتے دیکھے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس نے ایک نہ ٹوٹنے والا کڑا مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ پس زیتون کا عطا کیا جانا یہ معنے رکھتا تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ایک ایسی جماعت دی جائے گی جو عروۃ الوثقی کو پکڑنے والی ہوگی وہ ایمان میں مضبوط ہوگی وہ قربانی میں کامل ہوگی وہ اطاعت میں حد کمال تک پہنچی ہوئی ہوگی اور کسی قسم کی تکلیف اس کے پائے ثبات میں جنبش پیدا نہ کرے گی۔ درحقیقت عروۂ وثقی کو مضبوطی سے پکڑ لینا ایمان باللہ کا ایک طبعی نتیجہ ہوتا ہے وہ شخص جس کے دل میں سچے طور پر ایمان پایا جاتا ہے وہ الٰہی تعلیم کو ایسی مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے طوفان اور زلازل بھی اس کو ادھر ادھر نہیں کر سکتے۔ وہ میدان کا بہادر اور جرأت و استقلال کا پیکر ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں ہر قسم کی موت کو اختیار کرنا لذیذ ترین نعمت سمجھتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تین کا واقعہ بھی تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اور زیتون کا واقعہ بھی تمہیں یاد دلاتے ہیں دونوں جگہ ہجرت ہوئی مگر دونوں جگہ شیطان کو ناکامی ہوئی آدمؑ نے ہجرت کی مگر آخر آدمؑ ہی دشمن پر کامیاب ہوا۔ نوحؑ نے ہجرت کی مگر آخر نوحؑ ہی دشمن پر کامیاب ہوا۔ نوحؑ کے بعد وہ ملک جس میں آپ رہتے تھے پھر بسا نہیں بلکہ تباہ ہو گیا۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد تم تباہ کر دیئے جاؤ گے تمہارے لیے شیطان کی طرح ہر طرف لعنت اور پھٹکار ہو گی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تین کے پتے ہوں گے جو اسے عطا کیے جائیں گے۔ تم نوحؑ کے دشمنوں کی طرح غرق کیے جاؤ گے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مدینہ کے لوگ اپنے ہاتھوں میں زیتون کی پتیاں لئے آگے بڑھیں گے اور کہیں گے یا رسول اللہ ہمارے ہاں تشریف لایئے ہم آپ کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے اور آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا وہ زیتون کی ٹہنی تمہیں یاد ہے جو نوحؑ کو ہجرت کے بعد ملی تھی؟ کچھ خبر بھی ہے؟ وہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تیار ہو رہی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ جب ہم نے انسان کی فطرت کو نیک بنایا ہے تو وہ دیر تک نیکی سے محروم نہیں رہ سکتا۔

طور سینین سے مراد زیتون کے بعد طُوْرِ سِيْنِيْنَ کی قسم کھائی گئی ہے یعنی اسے بھی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سِيْنِيْنَ کیا چیز ہے؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ سینین ایک علاقہ ہے جو دشت سینا کہلاتا ہے اس سے مسلمانوں کو بھی دلچسپی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اس کا ذکر آتا ہے اور یوروپین مصنفین کو بھی دلچسپی ہے کیونکہ بائبل میں اس کا ذکر آتا ہے لیکن یہ سوال کہ سینا اور طور سینا کہاں ہے؟ اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض مؤرخین کے نزدیک دشت سینا مصر کے شمال مشرقی حصہ میں ہے ان لوگوں کا خیال ہے کہ موسیٰؑ کے سمندر پار ہونے کا واقعہ جو بیان کیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ سمندر مصر وفلسطین کے درمیان خاکنائے کے جنوب کی طرف ہے اور اس طرف حضرت موسیٰؑ آئے ہی نہیں بلکہ آپ شمال کی طرف نکل گئے تھے بعض کا یہ خیال ہے کہ فلسطین سے ورے اور مصر اور فلسطین کے درمیان جو خاکنائے ہے جس میں سے اب آبنائے سویز بن گئی ہے اس میں خلیج عقبہ کے اوپر جو حصہ ہے وہ دشت سینا کہلاتا ہے گویا وہ دشت سینا کو خلیج عقبہ سے کچھ اوپر قرار دیتے ہیں لیکن بعض کے نزدیک دشت سینا کا علاقہ فلسطین کی طرف جھکا ہوا ہے بعض نے سینا اور طور کا کلی طور پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ محض ایک روایت ہے جس کے اندر کوئی حقیقت نہیں پائی جاتی (The Jewish Encyclopedia under the word "Sinai Mount")۔ بہرحال قرآن کریم نے طور کا لفظ استعمال کیا ہے اور طور کے معنے پہاڑ کے بھی ہوتے ہیں۔ پس طور سینین کے یہ معنے ہیں کہ سینا کا ایک پہاڑ۔ قرآن کریم سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے طور کو اس پہاڑ کا نام قرار نہیں دیا بلکہ طور بمعنے پہاڑ استعمال کیا ہے۔ یوروپین مؤرخ بھی اسی طرف گئے ہیں کہ طور کسی پہاڑ کا نام نہیں۔ سورۂ طور میں وَالطُّوْرِ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ کہہ کر طور پر الف لام لایا گیا ہے لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے الف لام چھوڑ دیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سورۂ طور میں جو الف لام لایا گیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں طور کی کسی اور چیز کی طرف اضافت کر کے اس کی تعیین نہیں کی گئی تھی اس لئے اَلطُّوْر کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ ہماری مراد موسیٰؑ والے طور یا سینا والے طور سے ہے جس کو تم جانتے ہی ہو لیکن یہاں چونکہ سینین کی طرف طور کی اضافت موجود ہے اس لئے الف لام کو چھوڑ دیا گیا۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طور ایک نکرہ ہے جو اضافت سے ہی خاص معنے پاتا ہے بغیر اضافت کے اس کے کوئی خاص معنے نہیں سمجھے جا سکتے۔ جیسے پہاڑ کا لفظ اگر ہم اپنی گفتگو میں استعمال

کریں تو اس کے معنے ہمالیہ پہاڑ کے نہیں ہو سکتے لیکن اگر ہم کہیں ہمالیہ کا پہاڑ تو اس کے معنے ہوں گے وہ پہاڑ جسے ہمالیہ کہتے ہیں یا اگر ہم کہتے ہیں کشمیر کا پہاڑ یا ہزارہ کا پہاڑ یا افغانستان کا پہاڑ یا درہ خیبر کا پہاڑ تو اس کے بھی مخصوص معنے ہوں گے۔ پس طورِ سینین کے یہ معنے ہوئے کہ سینا کا وہ پہاڑ جس پر موسیٰ علیہ السلام کا کوئی خاص واقعہ ہوا تھا۔ وَالطُّوْرِ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ میں انہی معنوں کو الف لام کی زیادتی سے ظاہر کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے جو یہ سمجھا ہے کہ طور کسی پہاڑ کا نام ہے یہ درست نہیں۔ طور کے معنے محض ایک پہاڑ کے ہیں اور انہیں معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے البتہ عرفِ عام میں بوجہ ایک خاص مناسبت کے اس نے مخصوص معنے پیدا کر لئے ہیں جیسے بعض دفعہ ایک چیز تو عام ہوتی ہے لیکن کسی خاص چیز کی طرف منسوب ہوتے ہوتے آخر اس کا ایک نام بن جاتی ہے۔ مثلاً کتاب ایک عام لفظ ہے جو ہر کتاب کے متعلق استعمال ہوتا ہے لیکن ''اَلْکِتَاب'' ایک مخصوص لفظ ہے جو بائبل کے متعلق استعمال ہوتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اَلْکِتَاب کے معنے بائبل کے ہیں بلکہ بائبل کی طرف یہ لفظ منسوب ہوتے ہوتے اتنا عرصہ گزر چکا ہے اور اس قدر زبان زدِ خلائق ہو چکا ہے کہ اب اَلْکِتَاب کا لفظ جب بھی استعمال ہوگا یہی سمجھا جائے گا کہ اس سے بائبل مراد ہے۔ یا مثلاً انجیل کے لفظی معنے بشارات کے ہیں اور شروع میں انہی معنوں میں انجیل کا لفظ استعمال ہوا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وہ بشارات جو آپ نے اپنی قوم کو دیں مگر اب انجیل کا لفظ بولو تو اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ زید کی بشارتیں یا بکر کی بشارتیں بلکہ ہر شخص کے ذہن میں فوراً یہ بات آ جائے گی کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے۔ حالانکہ لفظی معنے اس کے صرف بشارات کے ہیں۔ اسی طرح طورِ سینین کے معنے ہیں سینا کا ایک پہاڑ مگر چونکہ سینا کے پہاڑ کا ذکر لوگوں کے زبان پر آتا ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اس لئے رفتہ رفتہ طور سے مخصوص طور پر وہی پہاڑ سمجھا جانے لگا جس پر یہ واقعہ ہوا تھا۔ حالانکہ معنوں کے لحاظ سے طور ہر پہاڑ کو کہا جا سکتا ہے۔

سینا کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ اس کی تعیین میں مؤرخین کو بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض تو سینا نام کا کوئی علاقہ تسلیم ہی نہیں کرتے مگر بعض اس علاقہ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان لوگوں میں بھی بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض کسی جگہ کو سینا قرار دیتے ہیں اور بعض کسی جگہ کو۔ میرے خیال میں اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شوق ہوتا ہے کہ ہم کوئی جدید چیز پیدا کریں اور اس شوق کی وجہ سے وہ واقعات اور حقائق کو نظر انداز کر کے محض اپنی کسی تھیوری اور قیاس پر بنیاد رکھ کر ایک نئی بات لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس طرح ہم بھی موجد قرار پا جائیں گے۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ جب سنتے ہیں کہ فلاں نے یہ چیز ایجاد کی

ہے اور فلاں نے وہ چیز ایجاد کی ہے تو ان کے دلوں میں بھی شوق پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی کوئی نئی چیز ایجاد کریں۔ اس پر بعض خیالات ان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ فوراً اخبارات میں اعلان کرا دیتے ہیں کہ ہم نے اس قسم کی چیز ایجاد کر لی ہے مگر جب زیادہ کرید کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایجاد کوئی نہیں صرف ایک نئی تھیوری انہوں نے پیدا کی ہے۔ اسی طرح بعض مؤرخوں نے سمجھا کہ اگر ہم یہ کہہ دیں گے کہ حضرت موسیٰؑ شمال کی طرف گئے تھے اور سینا بھی شمال میں ہی تھا تو تاریخ میں ہم بھی موجد سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ وہ معمولی معمولی شبہات کی بناء پر دوسروں کی باتوں کو ردّ کر دیتے ہیں اور ایک نئی تھیوری اور نیا خیال پیدا کر کے خوش ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آئندہ جب بھی اس واقعہ کی تحقیق کی جائے گی لوگ کہیں گے کہ ایک تھیوری فلاں شخص کی بھی تھی اس پر بھی غور کر لیا جائے۔ ایسے لوگوں کو تاریخ کی صحت مدنظر نہیں ہوتی بلکہ اپنی ذات کی شہرت ان کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ حقائق پر غور کریں ان کو ہر وقت یہی شوق رہتا ہے کہ کسی طرح ہمارا نام نکل جائے۔ ایسے ہی لوگ بعض دفعہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ موسیٰؑ کوئی تھا ہی نہیں۔ بعض کہہ دیتے ہیں کہ عیسیٰؑ کوئی شخص نہیں تھا۔ بعض کہہ دیتے ہیں کہ سینا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اسی طرح زرتشتؑ کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہی حال کرشنؑ اور رامچندرؑ کا ہے کہ ان کے وجود کا بعض لوگوں کی طرف سے انکار کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس میں بھی اسلام کا معجزہ ہے کہ اگر کسی شخص کے وجود کا انکار نہیں ہوا تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ورنہ بعض عیسائی ایسے ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ محض ایک تمثیلی ذکر ہے۔ اسی طرح پروفیسر فرائیڈ جو خود یہودی ہے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وجود کا انکار کیا ہے(The Life and Work of Sigmund Freud, p:31)۔ بعض ہندو ایسے ہیں جو یورو پین مشککین کی اتباع میں کرشنؑ اور رامچندرؑ کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور بعض پارسی ہیں جو زرتشتؑ کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور اس کو محض ایک تمثیلی وجود قرار دیتے ہیں لیکن اگر کسی عظیم الشان نبی کے وجود کا انکار نہیں کیا گیا تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے۔ میرے نزدیک اس میں بھی ایک بہت بڑی الٰہی حکمت کام کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ذریعہ سے دنیا کو بتایا ہے کہ اگر کوئی قابل اعتناء ذات ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے باقی سب انبیاء کا اگر تم انکار بھی کر دو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

غرض طور کے وجود کا بھی بعض لوگوں نے انکار کیا ہے اور سینا کے وجود کا بھی بعض لوگوں نے انکار کیا ہے لیکن جو لوگ طور کو مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ سینا کے نیچے جنوب میں خلیج عقبہ کے اوپر تیس چالیس میل لمبا ایک پہاڑ ہے جس

کوطور کہتے ہیں(The Jewish Encyclopedia under the word "Sinai Mount")۔مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں کہ اس پہاڑ کا نام طور تھا۔طور کے معنے پہاڑ کے ہیں اور طور کے لفظ سے اس پہاڑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس پر حضرت موسیٰؑ سے کلام ہوا اور اس واقعہ کو چونکہ ہزاروں لوگوں نے بار بار بیان کیا آہستہ آہستہ طور کا لفظ ہی بجائے پہاڑ کے ایک خاص پہاڑ کا عَلَم یعنی مخصوص نام سمجھا جانے لگا۔بہر حال خلیج عقبہ کے اوپر ایک پہاڑی ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور تاریخوں سے ثابت ہے کہ یہودی ہمیشہ اس پہاڑی کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔میرے نزدیک قرآن کریم اور بائبل سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کے لحاظ سے خلیج عقبہ کے اوپر والا علاقہ ہی سینا کا ہے اور اسی علاقہ میں وہ پہاڑ ہے جسے عرفِ عام میں طور کہا جاتا ہے۔

مجھے تعجب آتا ہے کہ جب قرآن کریم اور بائبل دونوں سے اس علاقہ کا وجود ثابت ہے اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ یہودی ہمیشہ اس پہاڑ کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے (The Jewish Encyclopedia under the word "Sinai Mount") تو پھر کسی مؤرخ کا کیا حق ہے کہ وہ یہ کہے کہ طور کوئی پہاڑ ہی نہیں تھا یا سینا کوئی علاقہ ہی نہیں تھا۔

طُوْرِ سِيْنِيْنَ میں سینین لفظ جمع استعمال کرنے کی وجہ اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں سینین کا لفظ کیوں استعمال کیا جبکہ سورۂ مومنون میں وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (المؤمنون:۲۱) کہہ کر اس کا نام سینا بتایا گیا ہے نہ کہ سینین۔اس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ سینا اور سینین دونوں عَلَم ہیں لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ سینا کی بجائے سینین کا لفظ وقف کی وجہ سے بدل دیا گیا ہے(روح البیان زیر آیت طُوْرِ سِيْنِيْنَ)اور یہ ایسا ہی ہے جیسے سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ (الصّٰفّٰت:۱۳۱)حالانکہ وہاں صرف ایک الیاس مراد ہیں آخر میں یا اور ن کا اضافہ قافیہ بندی کے لئے کیا گیا ہے۔مگر ہمارے نزدیک یہ بات درست نہیں کہ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ میں صرف وقف کے لئے یا اور ن کا اضافہ کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ ہماری جماعت کا اعتقاد ہے الیاس کی بجائے الیاسین کا لفظ اللہ تعالیٰ نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ یہاں ایک سے زیادہ الیاس مراد ہیں۔ایک تو وہ الیاس ہیں جو اسرائیلی انبیاء کے وسط میں گزر چکے ہیں۔ دوسرے الیاس یوحنا ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معاً پہلے آئے اور تیسرے الیاس حضرت سید احمد صاحب بریلوی ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے آئے۔چونکہ نزول قرآن سے پہلے دو الیاس دنیا میں آچکے تھے اور ایک الیاس نے ابھی آنا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْيَاسِيْنَ کی بجائے سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ کہہ کر ان سب کی طرف اشارہ کر دیا۔اسی طرح ممکن ہے سینا کے متعلق لوگوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے سینین میں اس

کی طرف اشارہ ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف قوموں میں مختلف علاقوں کو سینا کہتے ہوں۔ مثلاً عرب لوگ پنجاب اور اس کے ارد گرد کے علاقہ کا نام ہند رکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ عربی کتابوں میں بعض جگہ لکھا ہوتا ہے کہ ہند اور بنگال میں فلاں فلاں بات پائی جاتی ہے حالانکہ ان دنوں بنگال ہندوستان کا حصہ ہے مگر وہ چونکہ صرف پنجاب اور اس کے اردگرد کے علاقہ کا نام ہند رکھ دیتے ہیں اس لئے بنگال کو وہ علیحدہ شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ افغانستان صرف قندھار تک کے علاقہ کو کہتے ہیں۔ بعض افغانستان کی حدود پشاور تک سمجھتے ہیں اور بعض دریائے سندھ تک کے علاقہ کو افغانستان قرار دیتے ہیں اس لحاظ سے طُوْرِ سِيْنِيْنَ کے الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اس علاقہ میں سینا کے نام سے کئی دشت مشہور ہیں مگر وہ پہاڑ جس پر موسیٰؑ سے کلام ہوا ایک ہی ہے ہم ان سیناؤں کے طور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

میں بتا چکا ہوں کہ وَ التِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ میں آدمؑ اور نوحؑ کی ہجرتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان ہجرتوں سے دشمن کو ایک جھوٹی خوشی حاصل ہوئی اور اس نے سمجھا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں پھر بھی خدا نے اپنے نبیوں کو کامیاب کیا اور دشمن کو ان کے مقابلہ میں ذلیل اور رسوا ہونا پڑا۔ اسی طرح اب مکہ والوں کا یہ خیال کرنا صریح نادانی ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال کر کامیاب ہو جائیں گے جس طرح سابق انبیاء کے دشمنوں کا یہ خیال کہ ہم جیت جائیں گے اور نبی ہار جائے گا باطل ثابت ہوا تھا اسی طرح اب بھی مکہ والوں کا خیال باطل ثابت ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کی جھوٹی خوشی کو ایک دن ہمیشہ کی ذلت اور رسوائی میں بدل دے گا۔ اب اسی مضمون کی وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ موسیٰؑ کی ہجرت کا واقعہ بطور مثال پیش کرتا ہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ طور کا واقعہ ہجرت کے بعد ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم کے ابتداء میں ہی جہاں بنی اسرائیل کا ذکر کیا گیا ہے وہاں آتا ہے وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (البقرۃ:۵۱،۵۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے بنی اسرائیل یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑ دیا تھا ہم نے تمہیں نجات دی اور آلِ فرعون کو ہم نے غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے پھر اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰؑ سے ہم نے چالیس راتوں کا وعدہ کیا (جب آپ سینا کے پہاڑ پر تشریف لے گئے تھے) اور تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر شرک کا ارتکاب شروع کر دیا اور خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ظالم بن گئے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت پہلے ہوئی ہے اور طور کا واقعہ بعد میں ہوا ہے۔ پہلے آپ نے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر کو چھوڑا پھر خدا تعالیٰ آپ کو طور پر لے گیا۔ جہاں اس نے

وہ کلام آپ پر نازل کیا جس میں یہودی قوم کو دس ایسے احکام دیئے گئے تھے جو تمام تورات کا مغز سمجھے جاتے ہیں۔ بائبل سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ طور کا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصر سے نکل آنے کے بعد ہوا ہے۔ چنانچہ خروج میں پہلے ہجرت کا ذکر کیا گیا ہے پھر دشت سینا میں بنی اسرائیل کے پہنچنے کا ذکر آتا ہے اور پھر آخر میں طور کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب ظاہر کر رہی ہے کہ ہجرت پہلے ہوئی ہے اور واقعہ طور بعد میں ہوا ہے۔ ہجرت کا ذکر خروج باب ۱۴ میں آتا ہے۔ دشت سینا میں پہنچنے کا ذکر خروج باب ۱۶ میں آتا ہے اور واقعہ طور کا ذکر خروج باب ۱۹ میں آتا ہے۔ خروج باب ۱۴ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ پرانی بائبل میں اس طرح درج ہے۔

''اس بیان میں کہ خدا بنی اسرائیل کو ان کی راہ بتاتا فرعون اُن کا پیچھا کرتا۔ بنی اسرائیل گُڑگُڑاتے۔ موسیٰ ان کو دلاسا دیتا۔ خدا موسیٰ کو سکھلاتا۔ بدلی کا ستون لشکر کی پشت پر جا ٹھہرتا۔ بنی اسرائیل دریائے قلزم کے بیچ سے ہو کے جاتے اسی میں اہل مصر غرق ہوتے''۔

یہ تو ہجرت کا واقعہ ہوا۔ اس کے بعد خروج باب ۱۶ کا خلاصہ یوں لکھا ہے۔

''اس بیان میں کہ بنی اسرائیل سین میں جا پہنچتے۔ خوراک نہ ہونے کے باعث سب گُڑگُڑاتے۔ خدا آسمان سے روٹی بھیجنے کا وعدہ کرتا۔ ان کے لئے بٹیریں بھیجی جاتیں۔ من بھی بھیجا جاتا۔ ہر ایک کو من کے جمع کرنے کا حکم ہوتا۔ سبت کے دن وہ نہ مل سکے گا۔ من کا اُومر بھر قرنوں کو دکھانے کے لئے حفاظت سے رکھتے''۔

اس کے بعد خروج باب ۱۹ کا خلاصہ ان الفاظ میں درج ہے۔

''اس بیان میں کہ بنی اسرائیل سینا کے بیابان میں آتے ان کے لئے خدا کا پیغام پہاڑ پر سے موسیٰ کی معرفت آتا۔ وے لوگ اس کا جواب دیتے۔ تیسرے دن کے لئے تیار ہو جاتے۔ پہاڑ کا چھونا منع ہوتا۔ پہاڑ کے اوپر یہوواہ ہیبت ناک وضع سے ظاہر ہوتا''۔

غرض بائبل اور قرآن دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ ہجرت کا واقعہ پہلے ہوا ہے اور طور کا واقعہ بعد میں۔

غرض اللہ تعالیٰ آدمؑ اور نوحؑ کی مثالیں پیش کرنے کے بعد فرماتا ہے ہم تیسری مثال تمہارے سامنے موسیٰؑ کی پیش کرتے ہیں۔ موسیٰؑ کو دشمن کے مظالم کی وجہ سے ہجرت کرنی پڑی تھی اور وہ اپنی قوم کو ساتھ لے کر مصر سے باہر نکل آیا تھا۔ موسیٰ کے دشمنوں نے سمجھا ہوگا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ ہمیں اس کے فتنہ سے نجات ملی مگر خدا نے اس ہجرت کو دشمنوں کی تباہی اور بنی اسرائیل کی ترقی کا موجب بنا دیا۔ اگر یہ لوگ مصر میں ہی رہتے تو خواہ فرعون کے مظالم سے

آزاد ہوجاتے مگر پھر بھی وہ محکوم ہی رہتے۔لیکن طورِسینین کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسی برکات نازل کیں کہ نہ صرف بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہوگئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ بادشاہت کا وعدہ دے کر یہودی قوم کی حکومت کی بنیاد رکھ دی جو ایک ہزار سال تک نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ یہاں یہ مضمون بیان کر رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہاری تدبیروں سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔تین اور زیتون اور طورِسینین کے واقعات تمہارے سامنے ہیں۔آدمؑ کو شیطان نے دھوکا دیا تو تین نے اس کا ننگ ڈھانک لیا۔نوحؑ کے زمانہ میں طوفان آیا تو زیتون کی شاخ سے اس کو خوشخبری ملی۔ مصر سے موسیٰؑ کو بھاگنا پڑا تو طورِسینین پر اس کو پناہ مل گئی۔چونکہ یہاں غلبہ اور ترقی کا مضمون ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے دشمن کی تکالیف والے حصہ کو بیان نہیں کیا۔ورنہ دراصل وَالتِّیْنِ کے معنے ہیں شیطان کا آدمؑ کو دھوکا دینا اور تین سے اس کا کامیاب ہونا۔وَالزَّیْتُوْنِ کے معنے ہیں نوح کے لئے عرصہ حیات کا تنگ کیا جانا۔طوفان آنا اور پھر زیتون سے نوحؑ کو اپنی کامیابی کی بشارت ملنا۔طُوْرِ سِیْنِیْنَ کے معنے ہیں مصر سے موسیٰؑ کا بھاگنا اور طُوْرِ سِیْنِیْنَ پر اس کو اپنی کامیابیوں کی بشارات ملنا اور ھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ کے معنے ہیں مکہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھاگنا اور پھر آپ کا فاتح اور حکمران ہونے کی حیثیت سے مکہ میں واپس آنا۔مگر تکالیف اور ہجرت وغیرہ کا ذکر چونکہ مضمون سے خود بخود نکل آتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر محض اشارۃً کیا ہے۔اصل ذکر غلبہ اور کامیابی کا کیا ہے تا کہ دشمن اپنی عارضی کامیابی پر خوش نہ ہو اور وہ یہ خیال نہ کرے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو شکست دے دی ہے۔

غرض طُوْرِ سِیْنِیْنَ میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ موسیٰ کو جب مصر سے نکالا گیا تو فرعون تو سمندر کی تہہ میں ڈوبا مگر موسیٰؑ کو ہم نے پہاڑ پر تجلی دکھائی۔گویا ایک نیچے کی طرف چلا گیا اور دوسرا اوپر کی طرف نکل گیا۔تجلی دونوں نے ہی دیکھی مگر ایک نے سمندر کی تہہ میں دیکھی اور دوسرے نے طورِسینین پر تجلی دیکھی۔اے مکہ والو! تمہارے ساتھ بھی یہی ہونے والا ہے۔بظاہر موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کے مظالم سے تنگ آکر مصر سے بھاگ گئے تھے وہ اپنے گھروں سے نکل گئے تھے انہوں نے اپنے مکانوں اور اپنی جائیدادوں کو چھوڑ دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے طورِسینین پر موسیٰؑ کو تجلی دکھا دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے اپنی قوم کے غلبہ کا وعدہ مل گیا۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی طورِسینا تیار ہو رہا ہے۔یہ طورِسینا مدینہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔فرماتا ہے کہ تم خود سمجھ لو کہ تمہارے لیے کیا مقدر ہے؟ محمدؐ رسول اللہ کو نکال کر دیکھ لو میں فرعون کی طرح تم کو غرق کر دوں گا اور محمدؐ رسول اللہ کو طورِسینا پر بلند جگہ دوں گا اور ثابت کر دوں گا کہ انسانی فطرت پاک ہے۔پاک فطرت لوگ اس کی طرف دوڑیں گے اور

اس بات کے شاہد ہوں گے جس طرح موسیٰؑ کے وقت ہوئے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ میں پیدا کیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ هٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ کہ ہم اس بلد الامین کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ امین کے معنے یا تو اٰمِنٌ کے ہوتے ہیں اور یا مَاۡمُوۡنٌ کے ہوتے ہیں یعنی یا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ بلد جو دنیا کو امن دیتا ہے اور یا پھر اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ بلد جس کو خدا نے مامون کر دیا ہے۔ میرے نزدیک بلد الامین کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ وہ شہر جو امن دینے والا ہے اور یہ بھی کہ وہ شہر جسے امن دیا گیا ہے۔ امین کا لفظ جو اس آیت میں استعمال کیا گیا ہے اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اس وقت کے مکہ کی حالت کا اس میں ذکر نہیں کیونکہ اس وقت تو جو کچھ کیفیت تھی اس کا ذکر اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں کر چکا ہے کہ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ تجھے اس بلد میں حلال سمجھا جا رہا ہے کوئی تکلیف نہیں جو تجھے نہ پہنچائی جاتی ہو اور کوئی ظلم نہیں جو تجھ پر توڑا نہ جاتا ہو۔ ہر قسم کے تیروں کا نشانہ انہوں نے تجھ کو بنایا ہوا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ایک جائز فعل کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ جس شہر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے امن پسند انسان پر ظلم کیا جاتا تھا وہ بلد الامین کس طرح کہلا سکتا تھا۔ پس بلد الامین سے درحقیقت مکہ کی وہ حالت مراد ہے جو فتح مکہ کے بعد پیدا ہوئی جب ہر قسم کے مظالم کا سلسلہ جاتا رہا تھا اور مسلمانوں کو کفار پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ ورنہ فتح مکہ سے پہلے وہ بلد الامین کہاں تھا۔ نہ اس میں روحانی لحاظ سے امن تھا نہ جسمانی لحاظ سے۔ دینی امن لو تو مکہ وہ شہر تھا جہاں لوگوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالا جاتا تھا اور انہیں خدائے واحد کی پرستش کی بجائے بتوں کی پرستش کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور اگر جسمانی لحاظ سے دیکھو تو مکہ والوں کی طرف سے خطرناک سے خطرناک ظلم ایک ایسی قوم پر ہو رہا تھا جو انصاف پسند اور مخلوق کی خیر خواہ تھی جو اس مقصد کو لے کر کھڑی ہوئی تھی کہ دنیا میں امن قائم ہونا چاہیے، ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنا چاہیے اور الٰہی فرائض کو پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مقصد بھی ایسا ہے جس پر مکہ والوں کو غصہ آنا چاہیے تھا اور جس کی بنا پر انہیں اپنی ترکش کا ہر تیر مسلمانوں کے سینہ کی طرف پھینکنا چاہیے تھا مگر ہوا یہی کہ مسلمانوں کو دکھ دیا گیا، ان کو ستایا گیا، ان کو مارا گیا، ان کے ننگ و ناموس پر حملہ کیا گیا اور انہیں شدید سے شدید عذاب میں ایک لمبے عرصہ تک مبتلا کیا گیا۔ پھر یہی نہیں بلکہ ان کے محبوب آقا پر جس کی غلامی وہ اپنے لئے فخر کا موجب سمجھتے تھے اور جس کے اشارہ پر وہ اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے متواتر اور مسلسل مظالم کئے گئے حالانکہ قوم کا آپ کے متعلق فتویٰ یہ تھا کہ آپ صدوق اور امین ہیں۔ گویا مکہ میں ایک کافر کو امن حاصل تھا، ایک بت پرست کو امن حاصل تھا، ایک جھوٹے اور دغا باز کو امن حاصل تھا، ایک ظالم اور غاصب کو امن حاصل تھا

لیکن اگر کسی شخص کو مکہ میں امن حاصل نہیں تھا تو صرف اس کو جو قوم میں صدوق اور امین مشہور تھا (صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ الشعراء باب وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ)۔غرض روحانی طور پر دیکھ لو یا جسمانی طور پر مکہ کو اس وقت کی حالت کے لحاظ سے قطعی طور پر بلد الامین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ روحانی طور پر یہ کیفیت تھی کہ مکہ میں لوگوں کے ایمانوں کو لوٹا جاتا تھا۔ کبھی کہا جاتا لات پر چڑھاوا چڑھاؤ۔ کبھی کہا جاتا عزیٰ پر چڑھاوا چڑھاؤ۔ کبھی منات اور ھبل اور دوسرے بتوں کی پرستش پر مجبور کیا جاتا۔ یہ بت پرستی مکہ میں اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ بیت اللہ جو خدائے واحد کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا خود اس میں تین سو ساٹھ بت رکھے گئے تھے اور ہر روز ایک نئے بت کے سامنے اپنے سر جھکائے جاتے تھے۔ پس بلد الامین میں مکہ کی اس حالت کا ذکر نہیں جو اس سورۃ کے نازل ہونے کے وقت تھی بلکہ ان الفاظ میں اس آخری ترقی کا ذکر ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد حاصل ہونے والی تھی۔ تِیْن بھی ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے جب آدمؑ شیطان پر کامیاب ہوئے۔ زَیْتُوْن بھی ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے جب نوحؑ طوفان سے بچے۔ طُوْرِ سِیْنِیْنَ بھی ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے جب موسیٰؑ کو آئندہ ترقیات کی خوشخبری ملی۔ اسی طرح بَلَدِ الْاَمِیْنِ بھی ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے جس کی ابتدائی مکی زندگی میں پیشگوئی کر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ گو آج مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں مگر ایک دن آنے والا ہے جب مکہ تمہارے لئے اور سب دنیا کے لئے بلد الامین ہوگا۔ ہر قسم کے مظالم کا سلسلہ مٹ جائے گا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو امن حاصل ہو جائے گا۔ گویا ہجرت بجائے مضر ہونے کے اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ تم سمجھو گے کہ ہم نے اسلام کو تباہ کر دیا مگر خدا تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر اس شہر میں واپس لائے گا۔ آپ کو فتح اور کامرانی عطا کرے گا، آپ کے ہاتھ سے مکہ کے ایک ایک بت کو تڑوائے گا، شرک کا قلع قمع کر دیا جائے گا اور خدائے واحد کا نام مکہ کی گلی کوچوں میں گونجنا شروع ہو جائے گا اور اس طرح روحانی امن قائم ہو جائے گا اس کے علاوہ اس وقت تم میں یہ طاقت نہ رہے گی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی طرف نظرِ بد سے دیکھ سکو یا غریبوں پر ظلم کر سکو اور اس طرح جسمانی طور پر مکہ بلد الامین ہو جائے گا اور اگر امین کے معنے مامون کے لو تو اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ گو مکہ ہمیشہ سے محفوظ چلا آتا ہے مگر ایک موقع ایسا آنے والا ہے جب اس کو قسراً فتح کیا جائے گا۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ مَکَّۃَ وَلَمْ یَحِلُّ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ وَلَا لِاَحَدٍ بَعْدِیْ وَاِنَّمَا حَلَّتْ لِیْ سَاعَۃً (بخاری کتاب البیوع باب ما قیل فی الصواع) کہ مکہ بلد الحرام ہے اور قیامت تک حرام ہی رہے گا کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مکہ پر حملہ کرے یا اس کی حرمت کو کسی اور رنگ میں توڑنے کی

کوشش کرے۔ صرف مجھے اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ میں قسراً مکہ کو فتح کروں مگر میرے لئے بھی یہ اجازت صرف چند گھڑیوں کے لئے تھی ہمیشہ کے لئے نہیں تھی۔

یہ ایک طبعی بات ہے کہ لمبے عرصہ میں عارضی طور پر اگر کوئی واقعہ ہو جائے تو انسان اس کو نظر انداز کر دیا کرتا ہے۔ وہ شخص جو دس پندرہ سال تک تندرست رہے اگر ایک دن اسے بخار ہو جائے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ بیمار آدمی ہے کیونکہ یہ بیماری ایک لمبے عرصہ میں صرف تھوڑی سی دیر کے لئے اس پر آئی تھی۔ اسی طرح بلد الامین میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ بے شک مکہ پر ایک ایسا حملہ مقدر ہے جو اس کی حلت کو توڑ دے اور بے شک ایک دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قسراً فتح کریں گے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا کہ مکہ بلد الامین نہیں۔ اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے امن دیا گیا ہے۔ اس کی حرمت کو خدا تعالیٰ نے اپنے حکم سے قائم کیا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں قسراً داخلہ ایک وقتی چیز ہوگا جس کی اللہ تعالیٰ بعض پیشگوئیوں کو پورا کرنے کے لئے اجازت دے گا ورنہ مکہ بلد الامین تھا بلد الامین ہے اور بلد الامین رہے گا۔ کوئی شخص اس کی حرمت کو توڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کر لیا تو اس کے بعد آپ نے اعلان فرمایا کہ یہ حملہ صرف میرے لئے مقدر تھا۔ آج کے بعد کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مکہ کی حرمت کو توڑنے کی جرأت کرے۔

پس چونکہ ایک زمانہ ابھی ایسا آنا تھا جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکہ کی حرمت کو توڑا جانا مقدر تھا اور خود خدا نے یہ کہنا تھا کہ تمہارے لئے مکہ پر حملہ کرنا جائز ہے اس لیے جب تک وہ موقعہ آ کر گزر نہ جاتا مکہ کامل طور پر بلد الامین نہیں کہلا سکتا تھا۔ بے شک وہ پہلے بھی بلد الامین تھا اور بعد میں بھی وہ بلد الامین رہا مگر چونکہ درمیان میں ایک وقفہ ایسا آنا تھا جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت مکہ کو قسراً فتح کیا جانا مقدر تھا اس لیے کامل طور پر مکہ اگر بلد الامین کہلا سکتا تھا تو فتح مکہ کے بعد ہی نہ کہ اس سے پہلے۔ چنانچہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا تو اس کے بعد آپ نے ہمیشہ کے لیے مکہ کی حرمت کو قائم فرما دیا بہر حال جب تک مکہ فتح نہیں ہوا تھا وہ کلی طور پر بلد الامین نہیں کہلا سکتا تھا کیونکہ ایک سانحہ موجود تھا جس میں اس کی حرمت کو ظاہری نگاہوں میں توڑا جانا تھا کلی طور پر اگر وہ بلد الامین قرار پایا تو فتح مکہ کے بعد۔ غرض یہ تینوں واقعات فتح مکہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ایمان کے لحاظ سے مکہ کے امن کو لو تو فتح مکہ کے بعد اس میں سے شرک نکلا اور اگر جسمانی لحاظ سے مکہ کے امن کو لو تو فتح مکہ کے بعد کفار کے جور و ستم کا سلسلہ بند ہوا اور اگر مکہ کا مامون ہونا لو تب بھی فتح مکہ کے بعد اسے امن حاصل ہوا جب تک مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح نہیں ہوا وہ کامل طور پر بلد الامین نہیں کہلا سکتا تھا کیونکہ ایک سانحہ ابھی

آنے والا تھا جس میں مکہ کی حرمت کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑنا اور اپنے لشکر سمیت اس کو فتح کرنا تھا غرض مکہ کا بلد الامین ہونا خواہ روحانی اور جسمانی لحاظ سے آمن ہونے کی صورت میں لو خواہ مکہ کے مامون ہونے کی صورت میں لو ہر طرح مکہ اگر بلد الامین بنا ہے تو فتح مکہ کے بعد۔ اس سے پہلے نہ دینی لحاظ سے اس میں امن تھا نہ جسمانی لحاظ سے اس میں امن تھا اور نہ وہ خود کامل طور پر مامون سمجھا جاسکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم یہ چاروں واقعات تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں ان میں سے تین واقعات تو ہو چکے ہیں اور چوتھا ابھی ہونے والا ہے۔ تم گزشتہ تین واقعات سے قیاس کر سکتے ہو کہ یہ چوتھا واقعہ بھی ہونے والا ہے اور یہ شہر جو آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے لئے آگ ہے ہجرت کے بعد بلد الامین ہونے والا اور دنیا کو اس بات کی چوتھی شہادت مہیا کر کے دینے والا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۵

یقیناً ہم نے انسان کو موزوں سے موزوں حالت میں پیدا کیا ہے۔

حَلّ لغات: اَلتَّقْوِيْمُ اَلتَّقْوِيْمُ: اَلتَّعْدِيْلُ (اقرب) تقویم کے معنے تعدیل کے ہیں یعنی کسی چیز کو صحیح القویٰ بنانا اور ہر قسم کی کجی اور خرابی سے اس کو محفوظ رکھنا۔ پس اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کے معنے ہوئے اعلیٰ سے اعلیٰ اور نقص سے پاک اور بے عیب بنانا۔ یہ الفاظ انسان کے لئے بطور حال استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی حَالَ كَوْنِهٖ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ یعنی انسان کو ایسا بنایا ہے کہ تعدیل و اصلاح کرنے میں بے نظیر ہے۔ یہاں مفسرین کو دقت پیش آئی ہے کہ اعتدال اور تقویم پیدا کرنے والا تو خدا تعالیٰ ہے انسان ایسا کس طرح ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ یہاں تقویم سے مراد قِوَامٌ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن قویٰ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ یہاں حذف مضاف ہے اور تقدیر یہ ہے کہ فِيْٓ اَحْسَنِ قِوَامِ التَّقْوِيْمِ یعنی تقویم کے نتیجہ میں جو قوام پیدا ہوتا ہے اس کا احسن انسان کو حاصل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق انسان ہے۔ اور اسے دوسروں سے زیادہ قوام حاصل ہے۔ اس لحاظ سے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کے معنے یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدائش کی صفت کا بہترین نمونہ انسان کو بنایا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں فِيْ زائدہ ہے۔ اور اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ اللہ تعالیٰ کے لئے حال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی احسن تقویم سے

پیدا کیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کی تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے یعنی خدا نے اپنی تعدیل کی صفت کامل طور پر انسان کی پیدائش میں ظاہر کی ہے (روح المعانی زیر آیت لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ)۔ اس کے بھی یہی معنے بن جاتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اعلیٰ درجہ کی اعتدالی طاقتوں کے ساتھ بنایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک زائد معنے یہ بھی نکل آتے ہیں کہ انسان باقی تمام مخلوق سے افضل ہے۔ جب خدا نے انسان کو احسن تقویم میں بنایا ہے اور اس نے اپنی صفت تقویم کامل طور پر انسانی پیدائش میں ہی ظاہر کی ہے تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکل آیا کہ دوسری کوئی مخلوق انسان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو صوفیاء میں زیر بحث چلا آیا ہے اور انہوں نے اپنی کتابوں میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ انسان افضل ہیں یا ملائکہ۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ ملائکہ افضل ہیں کیونکہ ان سے کسی قسم کی بدی سرزد نہیں ہوتی لیکن بعض نے کہا ہے کہ انسان بحیثیت انسان یا بحیثیت جماعت ملائکہ سے افضل ہے۔ اس لئے کہ خدا نے اس کو ایسی طاقتیں دے کر بھیجا ہے کہ اگر وہ ان کا صحیح طور پر استعمال کرے تو ملائکہ سے بڑھ جاتا ہے۔ میرے نزدیک لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان ملائکہ سے افضل ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کے یہ معنے ہوں کہ خدا نے اپنی تقویم کی صفت کو اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر انسان پر ظاہر کیا ہے تب بھی اس کے یہی معنے ہیں کہ خدا نے انسان کو تمام مخلوق میں سے اعلیٰ مقام پر پیدا کیا ہے اور اگر اس کا دوسرا مفہوم لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہتر سے بہتر طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے اندر کمال درجہ کا اعتدال رکھا ہے تب بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان ملائکہ سے افضل ہے۔ کیونکہ انسان ہی وہ مخلوق ہے جس کے اندر کمال درجہ کا اعتدال پیدا کیا گیا ہے اور جسے بہتر سے بہتر طاقتوں کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ بہرحال اس آیت سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بحیثیت فرد نہیں بلکہ بحیثیت انسان دوسری تمام مخلوق پر اپنی بالقوہ طاقتوں کے ذریعہ فضیلت بخشی ہے خواہ وہ ملائکہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر ہم عقلی طور پر غور کریں تب بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ملائکہ انسان سے افضل نہیں ہوسکتے اس لئے کہ ملائکہ کے اندر جو نیکی یا اطاعت پائی جاتی ہے وہ جبری ہے اور اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے دنیا میں اونچے اونچے پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں۔ بے شک وہ اونچے ہیں لیکن اس اونچائی میں پہاڑوں کی کوئی خوبی نہیں۔ ہمالیہ پہاڑ یہ فخر نہیں کرسکتا کہ دیکھو میں کتنا اونچا نکل گیا ہوں کیونکہ اس کی اونچائی اور بلندی جبری ہے۔ خدا نے اسے اونچا بنایا اور وہ بن گیا۔ اس میں اس کے کسی ذاتی کمال یا خوبی کا دخل نہیں ہے لیکن اگر کوئی انسان اپنی کوشش اور محنت اور ورزش سے اپنے جسم کو فربہ بنالیتا ہے تو یہ

یقیناً اس کی خوبی سمجھی جائے گی۔ چونکہ انسان کے اندر نیکی کی قوت بھی رکھی گئی ہے اور بدی کی بھی اور وہ دونوں طرف جا سکتا ہے یعنی نیکی میں حصہ لے کر اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل کر سکتا ہے اور بدی کا ارتکاب کر کے خدا تعالیٰ کو ناراض بھی کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ شخص جو نیکی کرتا ہے خواہ بظاہر معمولی درجہ کا مومن ہو وہ عام ملائکہ پر ضرور فضیلت رکھے گا۔ کیونکہ ملائکہ کا کمال ذاتی نہیں بلکہ انہیں یہ کمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنا بنایا مل گیا ہے۔

انسان کی فضیلت ملائکہ پر اس ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا فرد کامل ملائکہ کے فرد کامل سے بڑا ہے یا نہیں؟ مگر میرے نزدیک اس سوال کا جواب اسی آیت سے نکل آتا ہے جب خدا نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے اور ملائکہ سے اسے زیادہ قوتیں عطا فرمائیں ہیں تو لازماً انسان کا فرد کامل ملائکہ کے فرد کامل سے افضل ہوگا چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف باقی انسانوں سے بلکہ تمام ملائکہ سے بھی افضل تھے۔ بے شک ایک عام مومن جو گناہوں اور غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے اس سے ملک افضل ہوتا ہے کیونکہ گو اسے بالقوہ طاقتوں کے لحاظ سے فضیلت دی گئی تھی مگر ان قوتوں کے بالفعل ظہور میں وہ بہت پیچھے رہ گیا۔ لیکن جو شخص اپنی بالقوہ طاقتوں کا نہایت اعلیٰ طریق پر اظہار کرتا ہے اس کی ملائکہ پر فضیلت سے کسی صورت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جو طاقتیں اسے ملائکہ سے زیادہ دی گئیں تھیں وہ عملی طور پر بھی اس کی طرف سے ظہور میں آ گئیں۔ اس لحاظ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء یقیناً ملائکہ کے فرد کامل سے افضل ہیں۔ گو مسلمانوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ افضل نہیں ہیں۔ مگر میرے نزدیک بغیر اس توجیہ کے کہ فِیْ کو زائد قرار دیا جائے یہ جملہ اپنی اصل شکل میں بھی درست ہے اور اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ انسان کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے۔ مفسرین کو شبہ یہ پڑا ہے کہ چونکہ خدا معدّ ل ہے اس لئے انسان کو معدّ ل نہیں کہا جا سکتا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے لئے رؤوف کی صفت بھی آتی ہے، رحیم کی صفت بھی آتی ہے، رازق کی صفت بھی آتی ہے، خلق کی صفت بھی آتی ہے، بصیر کی صفت بھی آتی ہے، سمیع کی صفت بھی آتی ہے۔ اگر یہ تمام صفات انسان میں پائی جا سکتی ہیں تو اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کی صفت اس میں کیوں نہیں پائی جا سکتی؟ جس طرح انسان رؤوف اور رحیم اور رازق اور خالق اور بصیر اور سمیع ہو سکتا ہے وہ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ بھی ہو سکتا ہے مگر بہر حال اسی حد تک یہ صفات اس میں پائی جائیں گی جس حد تک انسان ان صفات کو اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ ان صفات میں انسان خدا تعالیٰ کے مقابل میں کھڑا ہو سکتا ہے کیونکہ ہر شخص کا کام اس کی طاقتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ یہاں انسان کا خدا کے ساتھ مقابلہ نہیں بلکہ مخلوق کا مخلوق کے ساتھ مقابلہ ہے اور مضمون یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں سے انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ

کا نظارہ دکھا سکتا ہے۔ ملائکہ اس کی مخلوق ہیں مگر وہ اس صفت میں انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اور جس قدر مخلوق پائی جاتی ہے اس میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو احسن تقویم ہونے کے لحاظ سے انسان کا مقابلہ کر سکے۔ مثلاً وہی کام جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا جبریل نہیں کر سکتا تھا یا وہ کام جو اور انبیاء کے سپرد ہوا خدا تعالیٰ کے دوسرے ملائکہ سرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دنیا کی اصلاح کے لئے موسیٰؑ کو بھیجا، عیسیٰؑ کو بھیجا، داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا مگر ملائکہ کو نہیں بھیجا کیونکہ انسان میں خدا نے اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کی صفت رکھی تھی جو ملائکہ میں نہیں رکھی یعنی تربیت اور تعلیم اور اصلاح کا کام جو انسان کر سکتا ہے وہ ملائکہ یا خدا تعالیٰ کی کوئی اور مخلوق نہیں کر سکتی اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں سے انسان بحیثیت جماعت افضل ہے اور انسان کامل ملائکہ کے فرد کامل سے افضل ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کے دو معنے غرض میرے نزدیک اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تقویم کرتا ہے یعنی دوسرے انسانوں اور دوسری مادی اشیاء کی تعلیم و تربیت اور تقدیر اور تصویر اور تخلیق نہایت اعلیٰ درجہ کی کرتا ہے گویا خدا نے انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کا روحانی اور جسمانی معلم بنایا ہے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا روحانی اور جسمانی خالق بنایا ہے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا روحانی اور جسمانی مربی بنایا ہے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا روحانی اور جسمانی صناع بنایا ہے اور یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن میں دوسری مخلوق پر اسے بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ یہ معنے ایسے ہیں جن سے قطعاً کوئی شرک لازم نہیں آتا۔ جب یہ ایک حقیقت ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں کہ انسان بصیر بھی ہے، سمیع بھی ہے، رؤوف بھی ہے، رحیم بھی ہے تو احسن تقویم کی صفت بھی اس میں ہو سکتی ہے اور یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ ہم نے احسن تقویم کی صفت بھی انسان کو بخشی ہے اور اسے روحانی اور جسمانی خالق بنایا ہے کہ اس کی تربیت سے کامل انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں وہ صنعت و حرفت کے بڑے بڑے کمالات دکھاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے چار دور اس کے مصدق ہیں۔ اگر تم ان چاروں دوروں کو دیکھو تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے تربیت اور تعلیم اور تعدیل کی بہت بڑی قوت بخشی ہے۔ آدمؑ آئے اور انہوں نے وہ اصلاح کی کہ سینکڑوں سال تک چلتی چلی گئی۔ نوحؑ آئے اور وہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی پاکباز جماعت قائم کر کے دنیا پر اپنی اصلاح کے اَن مِٹ نقوش قائم کر گئے۔ موسیٰؑ آئے انہوں نے تعدیل القویٰ کیا اور ایسی اعلیٰ درجہ کی جماعت قائم کی کہ خدا کا جلال اور اس کا جمال اس جماعت کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہو گیا۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں ان کے ذریعہ بھی انسان کی یہ

صفت ایک دن ظاہر ہوگی اور اس طرح دنیا پر ثابت ہو جائے گا کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم کی قوت دے کر بھیجا ہے۔ آدمؑ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ کا ثبوت ہے، نوحؑ احسن تقویم کا ثبوت ہے، موسیٰؑ احسن تقویم کا ثبوت ہے اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسن تقویم کا ثبوت ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ان کی تعلیم اور تربیت کے نتیجہ میں انسان کیسی کیسی قوتیں ظاہر کرتا ہے۔

یہ چار دور جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے درحقیقت انسانی تکمیل کے چار دور ہیں۔ آدمؑ دور تمدّن کا بانی ہے۔ نوحؑ دور شریعت کا مؤسّس Hero ہے۔ موسیٰؑ دورِ تفصیل کی بنیاد رکھنے والے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دورِ تکمیل کے بانی ہیں۔ انسانیت کی تشکیل آدمؑ نے کی۔ شریعت کی بنیاد نوحؑ نے رکھی لیکن شریعت کی تفاصیل موسیٰؑ نے بیان کیں اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریعت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کئے گئے۔ آپ آئے اور آپ نے انسانیت اور تمدن کو بھی مکمل کیا۔ آپ نے شریعت کو بھی مکمل کیا اور آپ نے تفصیل شریعت کو بھی تکمیل تک پہنچایا۔ گویا وہ تینوں دور جو نامکمل تھے ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کمال تک پہنچا دیا۔ آپ نے دورِ تمدّن کو نقائص سے پاک کر کے ایک کامل اور بے عیب تمدّن دنیا کے سامنے رکھا۔ آپ نے دورِ شریعت کو ہر قسم کے نقائص سے پاک کر کے ایک کامل اور بے عیب شریعت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور آپ نے دور تفصیل کو ہر قسم کے نقائص سے منزہ کر کے ایک ایسا کامل اور بے عیب مجموعہ قانون دنیا کو دیا جس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی اور بے ضرورت کوئی چیز نہ تھی۔ وہ کامل اور بے عیب تھی اپنی ہمہ گیری کے لحاظ سے اور کامل اور بے عیب تھی اپنی گہرائی کے لحاظ سے گویا وہ شریعت آپ نے دنیا کے سامنے پیش کی جو اپنی وسعت کے لحاظ سے بھی کامل تھی اور اپنے عمق کے لحاظ سے بھی کامل تھی۔ نوحؑ نے بے شک دنیا کے سامنے سب سے پہلے شریعت پیش کی مگر اس میں وسعت نہیں تھی صرف عمق تھا اور وہ بھی چند موٹے موٹے مسائل کے متعلق۔ اس کے بعد موسیٰؑ نے جو شریعت پیش کی اس میں وسعت تو تھی مگر تمام امور میں عمق نہیں تھا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کی گہرائیوں کو بھی مکمل کیا اور اس کی وسعت کو بھی مکمل کیا۔ کوئی اخلاقی گہرائی نہیں تھی جس پر آپ پر نازل شدہ کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو اور کوئی اخلاقی وسعت نہیں تھی جو آپ کی لائی ہوئی کتاب میں بیان نہ ہوئی ہو۔ موسیٰؑ سے شریعت کی کئی گہرائیاں رہ گئیں تھیں۔ نوحؑ سے شریعت کی کئی وسعتیں رہ گئی تھیں اور آدمؑ سے تمدّن کی کئی اہم باتیں رہ گئی تھیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو مکمل کیا اور اس طرح ثابت ہو گیا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ہم نے انسان کو اعلیٰ درجہ کی تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ہر دور نے

بنی نوع انسان کی ایک تکمیل کی اور یہ عمارت بڑھتے بڑھتے کہیں کی کہیں جانکلی۔

تفسیر۔اوپر بتایا جاچکا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے مختلف معانی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے انسان کو بہترین وجود بنایا ہے۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے انسان کو بہترین طاقتیں دے کر پیدا کیا ہے اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ انسان کو ہم نے بڑا اصنّاع بنایا ہے۔اس کے اندر تقویم کی طاقت رکھی ہے اور وہ اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی اور جسمانی پیدائش کر سکتا ہے۔

انسان کے متعلق چھ مختلف نظریے یہ دعویٰ جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کے متعلق مختلف مذاہب میں چھ بڑے بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ان چھ اختلافات میں سے ایک عقیدہ تو وہ ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور پانچ عقائد وہ ہیں جو اور مذاہب دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ذیل میں ان تمام عقائد کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا نظریہ پہلا عقیدہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ انسان برائی کا میلان لے کر دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ ہاں سدھارنے سے وہ سدھر بھی جاتا ہے۔گویا انسان کا فطرتی میلان برائی کی طرف ہے اور پیدائش کے دن سے ہی ایک کمزوری اس کے اندر رکھ دی گئی ہے گو اصلاح کے لئے بھی اسے طاقتیں دی گئی ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان لچک دار تو ضرور ہے مگر اس کی بنیاد گند پر ہے۔ جیسے وہ درخت جو دلدل میں اگتا ہے لچک دار تو ہوتا اور اگر ہم اسے کھینچ کر خشکی کی طرف لائیں تو لا سکتے ہیں لیکن بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی جڑیں ایک گندی زمین میں ہیں۔

دوسرا نظریہ دوسرا دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ انسان بھلائی کو لے کر پیدا ہوا تھا۔مگر پہلے انسان سے ہی بدی کا ارتکاب ہو گیا اور اس نے بدی کا ارتکاب کر لیا اور چونکہ انسان ایسی طرز پر دنیا میں آیا ہے کہ وہ ماں باپ سے ضرور ورثہ کا اثر لیتا ہے اس لئے بوجہ اس کے کہ پہلے ماں باپ یعنی آدمؑ اور حوّا نے گناہ کیا تھا اب ان کی اولاد باوجود اپنی فطرت میں نیکی رکھنے کے گناہ کرنے پر مجبور ہے۔ بے شک ان کی فطرت انہیں نیکی کی طرف مائل کرتی ہے مگر چونکہ باپ نے انہیں ورثہ میں گناہ دیا ہے اس لئے گناہ کی طرف میلان ان کی فطرت میں چلتا چلا جاتا ہے کیونکہ یہ ورثہ کا اثر ہے جو ان کے اندر آ گیا ہے۔وہ کہتے ہیں انسان میں دو قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں ایک ذاتی اور ایک اکتسابی۔ذاتی قوت انسان کے اندر بے شک نیکی کی ہے مگر چونکہ گناہ اسے ورثہ میں مل گیا ہے اس لئے ورثہ کے گناہ نے اس کی فطرتی نیکی میں آمیزش کر دی ہے جس سے وہ بلا کسی اور امداد کے آزاد نہیں ہوسکتا۔اس کے بعد وہ کہتے ہیں جب خدا نے دیکھا

کہ انسان کسی صورت میں بھی اس گناہ سے بچ نہیں سکتا تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم اگر لوگوں کی خاطر قربانی کرو اور بے گناہ ہو کر لوگوں کے گناہوں کے بدلے قربان ہو جاؤ تو دنیا اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ بیٹے نے اس تجویز کو مان لیا اور خدا نے اس سے کہا کہ اب تم انسان کی صورت میں دنیا میں جاؤ۔ لوگوں کو یہ مقدرت حاصل ہوگی کہ وہ تمہیں ماریں پیٹیں، سزائیں دیں اور بالآخر پھانسی پر لٹکا دیں۔ بے شک انسان بن کر لوگوں کے ہاتھوں سے تم یہ سب دکھ برداشت کرو گے مگر چونکہ بے گناہ ہونے کی حالت میں تم کو یہ دکھ ملے گا اس لئے خدا تعالیٰ اس کے بدلہ میں ساری دنیا کے گناہ بخش دے گا۔ پس دوسرا خیال یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت تو نیک ہے مگر چونکہ پہلے انسان سے ہی گناہ ہو گیا اس لئے فطرت کی نیکی کے باوجود ورثہ میں ہر انسان کے اندر گناہ کا مادہ آ گیا۔ اس گناہ سے وہ کفارہ مسیحؑ پر ایمان لائے بغیر نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

تیسرا نظریہ تیسرا نظریہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ انسان کسی خاص ملکہ کو لے کر پیدا نہیں ہوا۔ یہ کہنا کہ اس کی فطرت میں نیکی ہے یا یہ کہنا کہ اس کی فطرت میں بدی ہے یہ دونوں خیال غلط ہیں۔ انسان بعض تقاضے لے کر دنیا میں آتا ہے جو نہ نیک ہوتے ہیں نہ بد۔ مثلاً شجاعت، تہوّر، محبت، سخاوت، رفق اور غضب وغیرہ کئی قسم کے مادے ہیں جو انسان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی تعلیم و تربیت سے متاثر ہوتا اور اس کے مطابق بن جاتا ہے۔ گویا ہر انسان حالات سے مجبور ہے۔ یعنی یوں تو اس کی فطرت آزاد ہے مگر ماحول میں وہ آزاد نہیں رہتا۔ جس قسم کا ماحول اسے میسر آتا ہے اسی قسم کا رنگ اس پر چڑھ جاتا ہے۔ مثلاً اگر اس کے ماں باپ ہندو ہیں تو وہ ہندو بن جائے گا یا اپنے محلہ کے لڑکوں سے کھیلتا ہے تو جس قسم کے اخلاق ان کے ہوتے ہیں اسی قسم کے اخلاق اس میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بہرحال حالات اسے مجبور کر کے نیکی یا بدی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر حالات اچھے ہوں تو وہ اچھا بن جاتا ہے اور اگر بُرے ہوں تو وہ بُرا بن جاتا ہے۔ گویا اس کی زندگی کا تمام دارومدار اس کے ماحول پر ہے اور وہ نیک یا بد حالات کی مجبوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اس کے اندر نیکی یا بدی کا کوئی مادہ پایا جاتا ہے بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کا ماحول اسے مجبور کر کے کبھی نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور کبھی بدی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ فرائیڈ کی تھیوری ہے جو آج کل کے فلسفیوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔

چوتھا نظریہ چوتھا خیال لوگوں میں یہ پایا جاتا ہے کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ گویا وہ مجبور ہے قانون الٰہی سے۔ یہ آج کل کے بگڑے ہوئے صوفیوں کا خیال ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان وہی کچھ کرتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے اور اگر انہیں کسی اصلاح کی طرف توجہ بھی دلائی جائے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ جب ہماری تقدیر میں گناہ

لکھا ہے تو ہم اس کے خلاف کیا کر سکتے ہیں۔

پانچواں نظریہ پانچواں خیال لوگوں میں یہ پایا جاتا ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے نتائج بھگتنے کے لئے اس دنیا میں آتا ہے اور اس کی زندگی سابق کرم کا نتیجہ ہوتی ہے۔

1. Encyclopaedia of Religion and Ethics under the word Sin

2. Encyclopaedia of Religion and Ethics under the word Adam

3. Encyclopaedia of Religion and Ethics under the word Hindu

چھٹا نظریہ چھٹا خیال جس کا اسلام مؤید ہے وہ یہ ہے کہ انسان بھلائی کے میلان کو لے کر پیدا ہوا ہے ہاں بگاڑنے سے وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔

پہلا عقیدہ کہ انسان برائی کے میلان کو لے کر پیدا ہوا ہے ہاں سدھارنے سے وہ سدھر بھی سکتا ہے۔ بدھوں، چینیوں اور وام مارگیوں وغیرہ کا ہے۔ دوسرا عقیدہ کہ انسان بھلائی کو لے کر پیدا ہوا ہے مگر بوجہ اس کے کہ آدمؑ نے گناہ کیا اب ورثہ کا گناہ اس کے اندر آ گیا ہے اور وہ اس سے بلا کسی اور امداد کے آزاد نہیں ہو سکتا عیسائیوں کا ہے۔ تیسرا عقیدہ کہ انسان کسی خاص ملکہ کو لے کر پیدا نہیں ہوا وہ اپنی تعلیم و تربیت سے متاثر ہوتا اور اس کے مطابق ہو جاتا ہے گویا وہ مجبور ہے حالات سے، زمانۂ حال کے فلسفی فرائیڈ کا ہے۔ چوتھا عقیدہ کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے گویا وہ مجبور ہے قانونِ الٰہی سے یہ آخری زمانہ کے صوفیاء اور بعض عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ پانچواں عقیدہ کہ انسان اپنی پیدائش کے نتائج بھگتنے کے لئے اس دنیا میں آتا ہے اور اس کی زندگی سابق کرم کا نتیجہ ہوتی ہے یہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ چھٹا عقیدہ کہ انسان دنیا میں بھلائی کے میلان کو لے کر پیدا ہوا ہے اور اس کے لئے بے انتہاء ترقی کے راستے کھلے ہیں۔ ہاں بگاڑنے سے وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔ یہ اسلام کا عقیدہ ہے۔

یہ چھ فلسفی نظریے ہیں ان میں سے چار جو فلسفیانہ کہلاتے ہیں جبر کی تائید میں ہیں۔ ایک کفارہ کا عقیدہ ہے کہ وہ جبر کی وجہ اپنے دادا (یعنی آدمؑ) کے عمل کو کہتا ہے اور سب دنیا کے لوگوں کو فطرتاً برا قرار دیتا ہے۔ دوسرا تناسخ کا عقیدہ ہے کہ وہ جبر کی وجہ اپنی سابقہ جونوں کے عمل کو قرار دیتا ہے اور گو اس عقیدہ کے ماتحت بعض کو اچھا اور بعض کو برا کہا جاتا ہے مگر بہرحال تناسخ جونوں کے چکر کو برائی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ یعنی جو اچھا ہے تناسخ ماننے والوں کے نزدیک ابھی وہ پورا اچھا نہیں تبھی وہ مختلف جونوں میں جاتا ہے گویا برائی ہر انسان میں ہے صرف فرق یہ ہے کہ کسی میں کم ہے اور کسی میں زیادہ۔ جو بظاہر اچھا نظر آتا ہے اس میں بھی درحقیقت برائی پائی جاتی ہے اور اسی لئے

مختلف جونوں کے چکر میں اسے جانا پڑتا ہے۔ تیسرا مسلمانوں کا غلط العام عقیدہ ہے کہ وہ جبر کی وجہ خدا تعالیٰ کے فعل کو کہتا ہے یعنی کچھ انسان اچھے بنائے گئے ہیں اور کچھ برے۔ جن کو اچھا بنایا گیا ہے ان کو اچھی فطرت دے دی گئی ہے اور جن کو برا بنایا گیا ہے ان کو بری فطرت دے دی گئی ہے۔ چوتھا فلاسفۂ جدیدہ کا عقیدہ ہے کہ وہ انسان کو آزاد نہیں کہتے گو وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے یا انسان کے اپنے یا اس کے کسی دادا کے فعل کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ورثۂ طبعی یا ماحول کے نتیجہ میں وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ جن کے اندر ورثۂ طبعی کے طور پر بعض طاقتیں آ جاتی ہیں یا جو اچھے کام کرنے والوں کے ماحول میں رہتے ہیں وہ اچھے کام کرنے لگ جاتے ہیں اور کچھ لوگ جن کے اندر ورثۂ طبعی کے طور پر بعض کمزوریاں آ جاتی ہیں یا جو برے کام کرنے والوں کے ماحول میں رہتے ہیں وہ برے کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ماحول ان کی فطرت کو بدل دیتا ہے۔

یہ عقیدہ کہ انسان بری فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب کا عقیدہ ہے چنانچہ وہ عقائد جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے قریباً ہر عقیدہ میں یہ بات پائی جاتی ہے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ گناہ اصل ہے جس کو مٹانا ہمارا فرض ہے۔ عوام الناس تو اس بات کے اس طرح قائل ہیں کہ وہ کہتے ہیں غلطی کرنا بشر کا کام ہے۔ بُدھوں کے نزدیک ہر انسان بری فطرت لے کر آیا ہے اور باقی عقائد بھی ایسے ہیں کہ اگر ان میں انسان کی کوئی خوبی تسلیم بھی کی جاتی ہے تو برے معنوں میں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ انسان حالات سے مجبور ہوتا ہے اگر اس کے لئے اچھا ماحول میسر آ جائے تو وہ اچھا ہو جاتا ہے اور اگر برا ماحول میسر آ جائے تو وہ برا ہو جاتا ہے۔ اس عقیدہ میں گو انسان کی نیکی کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی نیکی نہیں۔ اگر کوئی شخص جبراً نیکی کرتا ہے تو اس کی نیکی حقیقی نیکی نہیں کہلا سکتی۔ حقیقی نیکی وہی ہوتی ہے جس میں جبر اور اکراہ کا کوئی پہلو نہ ہو۔ بہرحال قریباً سب مذاہب سوائے اسلام کے اس بات کے قائل ہیں کہ انسان بری فطرت لے کر آیا ہے مگر یہ سب عقائد باطل اور ناقابل قبول ہیں۔ پہلا عقیدہ کہ سب انسان بری فطرت لے کر پیدا ہوئے ہیں ایک تو عوام الناس میں پایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں بندہ بشر ہے اور اس بات پر مجبور ہے کہ غلطی کرے مگر جب ہم بچہ کی فطرت پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات غلط ہے بُری فطرت آخر بُرے اعمال سے ہی پہچانی جا سکتی ہے لیکن ہم جب بچوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ جھوٹ خود نہیں بولتے بلکہ دوسروں کو جھوٹ بولتے دیکھ کر اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کسی بچے میں ذاتی طور پر چوری کا مادہ یا خیانت کا مادہ یا اسی قسم کی اور برائیوں کا مادہ نہیں پایا

جاتا۔ بعض باتیں جو بچہ کرتا ہے اور جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ بری ہیں وہ بری باتیں نہیں ہوتیں اس لئے کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علم سے تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کا مال نہیں اُٹھانا چاہیے یہ ایک خوبی ہے جو ہر شخص میں ہونی چاہیے اور اگر کسی شخص میں یہ بات نہ پائی جائے تو ہم یقیناً اس کو برا کہیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ہم اسی کو برا کہیں گے جو دوسرے کی ملک کا مفہوم سمجھتا ہو۔ اور جانتا ہو کہ مال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک انسان کا اپنا مال ہوتا ہے اور ایک مال دوسرے کا ہوتا ہے۔ جو چیز کسی دوسرے کی ملکیت میں ہو وہ اٹھانی نہیں چاہیے۔ جب تک یہ مفہوم کوئی شخص پوری طرح نہ سمجھتا ہو ہم اسے مجرم قرار دے کر اس کے فعل کو برا نہیں کہہ سکتے۔ اس نکتۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بچہ بے شک بعض دفعہ دوسروں کی چیز اٹھا لیتا ہے مگر ہم اس سے اس کی فطرت کی برائی کا استدلال نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ دیکھو اگر بچہ کی فطرت میں نیکی تھی تو اس نے دوسرے کا مال کیوں اٹھایا؟ اس لئے کہ اسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ملکیت کا کیا مفہوم ہے یا یہ کہ دوسرے کا کون سا مال ہوتا ہے؟ نہ وہ ملکیت کے معنے جانتا ہے۔ نہ دوسرے کے مال کی حقیقت کو جانتا ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جو اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہوتی ہیں اور جو چیزیں بچہ کے دائرۂ عمل سے باہر ہوں ان کو برا یا بھلا نہیں کہا جاسکتا۔

انسان کے متعلق پہلے غلط نظریے کا بطلان فلسفیانہ طور پر یہ عقیدہ کہ انسان برائی کے میلان کو لے کر پیدا ہوا ہے بدھوں کا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی فطرت بری ہے اور جب بری ہے تو انسان کے اندر جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے وہ بری ہے۔ اس لئے ان کا عقیدہ ہے کہ نجات کامل حاصل کرنے کے لئے خواہش کو مارنا چاہیے۔ جب تک ہم اپنی خواہشات کو مارتے نہیں اس وقت تک کامل نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یہ بات عقلاً باطل ہے اس لئے کہ خواہشات کس چیز کا نام ہے؟ خواہشات نام ہے کھانے پینے کا، شادی کرنے کا، ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور تعلقات قائم کرنے کا، روزی کمانے کا، علم پڑھنے کا، عبادت وغیرہ کرنے کا۔ یہی خواہشات ہیں جو انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ لیکن جب ہم بدھ مذہب کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شادی سے صرف بھکشو کو روکتا ہے۔ حالانکہ نجات تو وہ سب دنیا کو دینا چاہتا ہے۔ اب اگر نجات خواہش مٹانے کا نام ہے تو جو بدھ مذہب والا ارادہ کرے گا کہ میں نکاح کروں اس کی نجات کس طرح ہوگی؟ آخر یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جس طرح ناک انسان کو بغیر کسی ارادہ کے مل گیا ہے، جس طرح کان انسان کو بغیر کسی ارادہ کے مل گئے ہیں، جس طرح زبان انسان کو بغیر ارادہ کے مل گئی ہے اسی طرح بیوی بھی بغیر کسی ارادہ کے مل جائے۔ نہ ماں باپ کو علم ہو کہ فلاں ہماری بہو بننے والی ہے، نہ

خاوند کو علم ہو کہ فلاں میری بیوی بننے والی ہے اور بغیر ارادہ اور خواہش کے ہی ماں باپ کو بہو اور خاوند کو بیوی مل جائے۔ لازماً انسان کو بیوی کے لئے خواہش کرنی پڑے گی اور جب وہ خواہش کرے گا تو بدھ مذہب کے رو سے وہ نجات سے محروم ہو جائے گا کیونکہ اس کے نزدیک خواہشات کو مارنا ہی انسانی نجات کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ کوئی مرد اور عورت شادی نہ کرے تب تو یہ بات ایک حد تک تسلیم بھی کی جاسکتی تھی مگر بدھ مذہب شادی سے صرف بھکشو کو روکتا ہے ہر شخص کو نہیں روکتا۔ حالانکہ وہ دوسروں کے لئے بھی نجات کو جائز قرار دیتا ہے۔ اگر نجات کا حصول ان کے لئے جائز قرار نہ دیتا تو بھکشوؤں کے سوا وہ اوروں کو اپنے مذہب میں داخل کیوں کرتا؟ اس کا بھکشوؤں کے سوا اور لوگوں کو بھی اپنے مذہب میں داخل کرنا صاف طور پر بتا رہا ہے کہ بدھ مذہب ہر شخص کی نجات کا قائل ہے اور جب بھکشوؤں کے سوا وہ دوسروں کو شادی کی اجازت دیتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ بدھ مذہب کے رو سے شادی کا ارادہ انسان کو نجات سے محروم نہیں کرتا۔ اب اس عقیدہ کے ماتحت کہ خواہش انسان کو نجات سے محروم کر دیتی ہے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ شادی کے معاملہ میں بدھ مذہب کیا تعلیم دے سکتا ہے کیا یہ کہے گا کہ شادی نہ کرو؟ یہ تو وہ کرتا نہیں۔ کیونکہ بھکشوؤں کے سوا اور کسی کو وہ شادی سے نہیں روکتا پھر خواہش کو کس طرح مارا جائے گا۔ انسان خواہش کرتا ہے کہ شادی کرے اس سے بدھ مذہب نے نہیں روکا۔ اب کیا ہم یہ سمجھیں کہ شادی کے بارہ میں محض شادی کی خواہش کو تو وہ خواہش قرار نہیں دیتا لیکن اور کسی خواہش کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر یہ بات ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی کے ساتھ محض شادی کی خواہش کا ہی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اور بھی کئی قسم کی خواہشات شادی سے وابستہ ہوتی ہیں ان کا بدھ مذہب نے کیا علاج کیا ہے۔ مثلاً انسان چاہتا ہے کہ نیک عورت سے شادی کرے۔ کیا بدھ مذہب یہ کہے گا کہ ایسی خواہش مت کرو۔ کیا اس خواہش کو مارا جائے گا؟ اور اسے حکم دیا جائے گا کہ بد اور شریر عورت سے شادی کرو؟ انسان خوبصورت عورت چاہتا ہے کیا اسے کہا جائے گا کہ خوبصورت عورت کی خواہش نہ کرو بدصورت عورت سے شادی کرو؟ انسان تعلیم یافتہ عورت چاہتا ہے بدھ مذہب کہتا ہے کہ تم اپنی خواہشات کو مٹا دو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بدھ مذہب اسے یہ کہے گا کہ جاہل عورت سے نکاح کرو؟ انسان چاہتا ہے کہ بچے جننے والی عورت مجھے حاصل ہو۔ کیا بدھ مذہب کے ماتحت اسے یہ تعلیم دی جائے گی کہ بچے جننے والی عورت سے شادی نہ کرو بلکہ بانجھ سے کرو؟ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بچے پڑھیں لکھیں۔ کیا بدھ مذہب اسے کہے گا کہ چونکہ خواہش بری چیز ہے اس لئے تم یہ خواہش نہ کرو کہ تمہارے بچے پڑھیں لکھیں بلکہ انہیں جاہل رہنے دو؟ انسان چاہتا ہے کہ اس کے ہاں نیک اولاد ہو کیا اسے کہا جائے گا کہ بد اولاد چاہو؟ انسان چاہتا ہے کہ اسے کوئی اچھا کام مل جائے اچھی ملازمت میسر

آ جائے یا اچھی تجارت شروع کر دے بدھ مذہب اسے کیا کہے گا؟ کیا یہ کہے گا کہ اچھی تجارت کی خواہش نہ کرو بلکہ گھاٹے والی تجارت کی خواہش کرو یا اچھی ملازمت تلاش نہ کرو بلکہ بری ملازمت تلاش کرو؟ یا اچھی فصل کی خواہش نہ کرو بلکہ تباہ ہونے والی فصل چاہو؟ انسان صحت چاہتا ہے۔ بدھ مذہب کہتا ہے خواہش بری چیز ہے ایسی حالت میں جب انسان کہے گا کہ مجھے صحت کی خواہش ہے تو بدھ مذہب کہے گا صحت کی خواہش کر کے تم گنہگار بن گئے ہو تمہیں تو چاہیے کہ بیماری کی خواہش کرو۔ انسان اپنے ہمسایہ سے صلح چاہتا ہے اپنے ملک میں امن چاہتا ہے کیا بدھ مذہب کی طرف سے اسے کہا جائے گا کہ اپنے ہمسایہ سے ہمیشہ لڑائی رکھو؟ اور ملک میں فساد برپا کرتے رہو؟ انسان اچھی حکومت کا تقاضا کرتا ہے۔ کیا اسے کہا جائے گا کہ بری حکومت چاہو؟ انسان چاہتا ہے اسے خدا کی رضا حاصل ہو جب بدھ مذہب خواہش کو برا قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو ہمیشہ یہ خواہش رکھنی چاہیے کہ خدا مجھ سے ناراض رہے۔ ایک بدھ مذہب والا چاہتا ہے کہ اس کا مذہب پھیل جائے مگر جونہی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی وہ نجات سے محروم ہو جائے گا۔ جب ایک شخص بھکشو بننے کے لئے آتا ہے تو آخر اسی لئے کہ وہ چاہتا ہے مجھے نجات مل جائے حالانکہ بھکشو بنتے ہی اس کی نجات ماری جاتی ہے کیونکہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ میں اور لوگوں کو بھی اس مذہب میں داخل کروں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں کو بھکشو بنانے کا ارادہ کر کے خود بدھ کی نجات بھی ماری گئی کیونکہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ میں لوگوں کو بھکشو بناؤں پھر اگر بدھ مذہب کے لوگ اپنے ملک کی آزادی چاہتے ہیں تو اس تعلیم کے ماتحت انہیں کیا کہا جائے گا؟ کیا یہ کہا جائے گا کہ آزادی کی خواہش نہ کرو۔ اگر تمہارے ملک پر کوئی قبضہ کرنا چاہتا ہے تو اسے بےشک کرنے دو۔ ورنہ نجات سے محروم ہو جاؤ گے۔ اگر بدھ مذہب والے کہیں کہ یہ تو جائز اور اچھی خواہشات ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ تم بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہو کہ خواہشات اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اچھی خواہشات کے پیچھے چلے اور بری خواہشات کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش نہ کرے۔ پس تمہارا یہ کہنا کہ چونکہ انسان میں خواہشات پائی جاتی ہیں اس لئے وہ پیدائشی طور پر برا ہے بالکل غلط ہوا۔ تم نے خود تسلیم کر لیا کہ خواہشات اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی۔ بری خواہشات کو مٹانا اور اچھی خواہشات کو قائم کرنا ہمارا فرض ہے اور یہی وہ نقطۂ نگاہ ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ پس ہمارا اور تمہارا اتحاد ہو گیا۔

ایک بدھ مذہب والا ہماری اس تنقید پر یہ کہہ سکتا ہے کہ تم ہمارے مذہب کو غلط طور پر پیش کرتے ہو۔ جب تم کہتے ہو کہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ آزادی کی خواہش نہ کی جائے بلکہ غلامی کی خواہش کی جائے۔ صحت کی خواہش نہ کی

جائے بلکہ بیماری کی خواہش کی جائے۔ خوبصورت بیوی کی خواہش نہ کی جائے بلکہ بدصورت بیوی کی خواہش کی جائے۔ علم کی خواہش نہ کی جائے بلکہ جہالت کی خواہش کی جائے تو تم بالمقابل کی خواہشات ہماری طرف منسوب کر دیتے ہو۔ حالانکہ ہمارا نظریہ تو یہ ہے کہ خواہشات ہر حالت میں بری ہیں خواہ وہ اچھی چیزوں کی ہوں یا بری چیزوں کی ہوں ہم خواہش کو مٹانا چاہتے ہیں یہ نہیں کہتے کہ اچھی خواہش نہ کرو بری خواہش کرو بلکہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ نہ اچھی خواہش کی جائے نہ بری کیونکہ اسی میں انسان کی نجات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اچھا ہم مان لیتے ہیں تمہارا یہی مقصد ہے تم یہی کہتے ہو کہ نہ یہ چاہو نہ وہ چاہو مگر سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں انسان کام کس طرح کرے گا؟ باپ اس سے شادی کے متعلق پوچھے گا تو وہ کہے گا نہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں نہ کنوارہ رہنا چاہتا ہوں۔ ایک شادی شدہ بدھ اپنے گھر میں جاتا ہے بیوی اس سے کہتی ہے کہ کھانا تیار ہے آؤ اور کھالو۔ وہ جواب دے گا نہ میں کھانا چاہتا ہوں نہ بھوکا رہنا چاہتا ہوں۔ غرض یہ عقیدہ اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو بدھوں کو قدم قدم پر نہایت سخت مشکلات پیش آ سکتی ہیں فرض کرو کسی مجلس میں بدھ مذہب کا کوئی پیرو آ جائے تو وہ حیران ہوگا کہ میں اس مجلس میں بیٹھوں یا چلا جاؤں اگر وہ بیٹھے گا تو یہ بھی خواہش کا نتیجہ ہوگا اور اگر چلا جائے گا تو یہ بھی خواہش کا نتیجہ ہوگا۔ غرض ایک بدھ ایسے چکر میں پھنس جاتا ہے کہ اس کے لئے اٹھک بیٹھک کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔

حکومت کے بارہ میں اس سے سوال کیا جائے گا کہ کیسی حکومت چاہتے ہو تو وہ جواب دے گا کہ نہ میں اچھی حکومت چاہتا ہوں نہ بری حکومت چاہتا ہوں۔ اگر سوال کیا جائے گا کہ میاں منظم حکومت چاہتے ہو یا انارکی؟ تو وہ کہے گا کہ نہ میں منظم حکومت چاہتا ہوں نہ انارکی۔ ووٹ کے متعلق حاضر ہوگا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ اس ممبر کو ووٹ دینا چاہتے ہو یا اس کو؟ تو وہ کہے گا کہ نہ میں اس کو ووٹ دینا چاہتا ہوں اور نہ اس کو۔ پولنگ افسر کہے گا تو پھر جاؤ تم آئے کس لئے تھے وہ کہے گا نہ میں جانا چاہتا ہوں نہ کھڑا رہنا چاہتا ہوں۔

غرض یہ عقیدہ ایسا غلط اور بے بنیاد ہے کہ اس کی جس قدر بھی تشریح کی جائے سوائے ہنسی اور مذاق کے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اگر کہا جائے کہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسان نیک خواہش کرے تو معلوم ہوا کہ نیکی کا مادہ اس میں موجود ہے اور یہی ہم کہتے ہیں کہ انسان میں نیک خواہشات بھی پائی جاتی ہیں اور بری بھی۔ جب کوئی شخص اپنے فطرتی تقاضوں کو عقل اور مصلحت کے ماتحت استعمال کرتا ہے تو وہ نیک کہلاتا ہے اور جب فطری تقاضوں کو عقل اور مصلحت کے خلاف استعمال کرتا ہے تو برا کہلاتا ہے ایسی صورت میں صحیح طریق یہ ہوتا ہے کہ فطرت کو ابھارا جائے اور طبعی تقاضوں کے غلط استعمال سے انسان کو بچایا جائے نہ یہ کہ انسانی فطرت کو ہی گندا اور ناپاک قرار دے دیا

جائے۔ بہر حال اگر بدھوں کی طرف سے کہا جائے کہ ہمارا مدعا یہ ہے کہ انسان نیک خواہش کرے تو معلوم ہوا کہ نیکی کا مادہ اس میں موجود ہے اور اس کی خواہش اسے کرنی چاہیے اور جب خواہش کرنی ثابت ہوئی تو پھر ہم سوال کریں گے کہ وہ کون سی بات فطرت میں ہے جسے برا کہا جا سکتا ہے۔ فطرت میں تو جس قدر تقاضے پائے جاتے ہیں سب کے سب اچھے ہیں صرف ان کا غلط استعمال انسان کو برا بنا دیتا ہے مثلاً فطرت یہ کہتی ہے کہ کھانا کھاؤ وہ یہ نہیں کہتی کہ زید کا کھانا اٹھا کر کھا جاؤ اگر تم زید کا کھانا اٹھا کر کھا جاتے ہو تو یہ تمہارا اپنا قصور ہے فطرت نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ تم زید کا کھانا کھاؤ۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ کھانا کھاؤ۔ دوسرے کی روٹی اٹھا کر کھا جانے کا خیال تمہارے دل میں اس وقت آتا ہے جب تم کہتے ہو کہ روٹی میرے پاس موجود نہیں اور بھوک لگی ہوئی ہے اس وقت تم فطرت کے اس تقاضا کا غلط استعمال کر کے کسی اور شخص کا کھانا چرا کر کھا جاتے ہو۔ ورنہ فطرت نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ کھانا کھاؤ۔ یہ نہیں کہا تھا کہ زید یا بکر کا کھانا کھا جاؤ۔ یا مثلاً جب شادی کی خواہش انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے تو فطرت اسے اتنا ہی کہتی ہے کہ شادی کر لو۔ یہ نہیں کہتی کہ کسی دوسرے کی بیوی کو اڑا لو۔ یا مثلاً فطرت یہ تو کہتی ہے کہ مال خرچ کرو مگر یہ نہیں کہتی کہ بے موقعہ اور بے محل اپنا مال خرچ کرتے چلے جاؤ۔ یہ بگاڑ جو بعد میں پیدا ہوتے ہیں انسانی ماحول اور اس کے مختلف حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ورنہ فطرت ان امور کی طرف انسان کی رہنمائی نہیں کرتی۔ اسی طرح مثلاً شجاعت کا مادہ ہے جو فطرت میں پایا جاتا ہے۔ بسا اوقات انسان اپنی جان یا اپنے مال کی قربانی کر کے دوسروں کو بڑے بڑے نقصانات سے بچا لیتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ظلم پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اب ظلم کوئی الگ خاصہ نہیں بلکہ شجاعت کے ایک فطری مادے کا غلط استعمال ہے۔ خدا نے یہ مادہ انسان میں اس لئے رکھا تھا کہ وہ دوسروں کے لئے قربانی کرے مگر بعض دفعہ یہ اس تقاضے کا غلط استعمال کر کے دوسروں کے حقوق کو غصب کر لیتا ہے۔ یا مثلاً ترقی کا جذبہ ہر انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ مگر جب اس جذبہ کو برے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے حسد پیدا ہوتا ہے یعنی انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف میں ہی آگے بڑھوں اور کوئی نہ بڑھے۔ بہر حال جب فطرت میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی گئی جسے برا کہا جا سکتا ہو۔ صرف فطری جذبات اور تقاضوں کا غلط استعمال برا ہوتا ہے تو سوال صرف اتنا رہ جائے گا کہ کیا خدا تعالیٰ نے شجاعت، سخاوت اور محبت وغیرہ اچھے کاموں کے لئے پیدا کی ہے یا برے کاموں کے لئے۔ اگر کہو کہ برے کاموں کے لئے تو برا کام ہی نیکی ہوا کہ خدا تعالیٰ کی رضا مندی اس میں ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ پر اعتراض آئے گا کہ اس نے ان قوتوں کو پیدا تو اس لئے کیا تھا کہ برے کام کئے جائیں مگر جب برے کام کئے جاتے ہیں تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ اور اگر کہو کہ اچھے

استعمال کے لئے خدا تعالیٰ نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے تو فطرت نیک ہوئی بد کس طرح ہوئی؟ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اس سے ہرگز انکار نہیں کہ وہ حالات جن میں سے انسان گزرتا ہے اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ کبھی ان حالات کی وجہ سے وہ نیکی کی طرف چلا جاتا ہے اور کبھی بدی کی طرف جھک جاتا ہے لیکن بہرحال فطرت جن چیزوں کا تقاضا کرتی ہے وہ بری نہیں ہیں۔

اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے وام مارگی پیدا ہوئے ہیں انہوں نے اس نظریہ کا ایک اور پہلو لیا ہے۔ وام مارگ کے معنے ہیں خواہش کا مذہب اور بدھ مذہب کے معنے ہیں خواہش مارنے کا مذہب۔ بدھ مذہب تو اس بات پر زور دیتا ہے کہ چونکہ خواہشات بری چیز ہیں اس لئے ان کو مٹانا انسان کا اوّلین فرض ہے۔ جب تک وہ اپنی خواہشات کو کلی طور پر فنا نہیں کر دیتا اس وقت تک نجات اسے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن وام مارگی یہ کہتے ہیں کہ انسانی پیدائش کی غرض اس وقت پوری ہوتی ہے جب وہ اپنی خواہشات کا جائزہ لیتے ہوئے ہر خواہش کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرے۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ فطرت چونکہ خدا کی پیدا کردہ ہے اس لئے انسان کے دل میں جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے وہ خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہوتی ہے مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ بے شک فطرت کو خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے مگر فطرت کا ظہور تو اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ بچہ کی شکل خدا تعالیٰ نے کامل بنائی ہے لیکن کیا وہ ماں کے پیٹ میں رہائش کے وقت کئی بیماریوں اور چوٹوں سے بری شکل اختیار نہیں کر سکتا؟ اسی طرح انسانی فطرت کو حالات بد بھی بنا دیتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو خواہش بھی انسان کے دل میں پیدا ہو وہ ضرور اچھی ہوتی ہے اگر حالات نے اسے برا بنا دیا ہوگا تو لازماً اس کے دل میں بری خواہشات پیدا ہوں گی جن پر عمل اس کے جسم اور روح دونوں کے لئے مہلک ہوگا۔ بہرحال وام مارگی یہ کہتے ہیں کہ اگر انسان کی فطرت نیک ہے تو اس کی ہر خواہش نیک ہے اور اگر فطرت بری ہے تو پھر جن امور کو تم برا کہتے ہو وہی نیکی کا معیار ہیں۔ چنانچہ اسی بناء پر یہ لوگ پیشاب، پاخانہ، مردہ کا گوشت اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کو بھی جائز سمجھتے اور گندگی اور غلاظت کو صفائی وغیرہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ وام مارگیوں نے بھی وہ چیز جو ماحول سے پیدا ہوتی ہے اس کا نام فطرت رکھ دیا ہے حالانکہ اس کا نام فطرت نہیں۔ ہم صرف ان تقاضائے بشری کے متعلق جو غیر معین ہوں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں نیکی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے یہ نہیں کہتے کہ مخصوص حالات کے ماتحت جو خواہشات انسانی قلب میں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی نیک ہوتی ہیں۔ جو تقاضے مخصوص حالات کے ماتحت انسانی قلب میں پیدا ہوں ہم اس کا نام فطرت نہیں رکھتے اور نہ قرآن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ ضرور نیک ہوں گے مگر افسوس کہ وہ اس ٹھوکر میں مبتلا ہو گئے کہ اگر فطرت نیک ہے تو پھر جن چیزوں

کو تم برا کہتے ہو وہ بری نہیں بلکہ اچھی ہیں اور اگر فطرت بری ہے تو پھر جن امور کو تم برا کہتے ہو وہی نیکی کا معیار ہیں مگر خود انسانی فطرت ان امور کا انکار کرتی ہے چنانچہ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو چھپاتے ہیں اور ظاہر ہونے سے ڈرتے ہیں جس سے ہمارے قیاس کی تصدیق ہوتی ہے۔

انسان کے متعلق دوسرے غلط نظریے کا بطلان دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ انسان بھلائی کو لے کر پیدا ہوا مگر آدم اوّل نے گناہ کیا اس لئے سب انسان گناہ پر مجبور ہیں۔ اگر یہ لوگ دہریہ ہوتے تو ہم ان سے اور رنگ میں گفتگو کرتے لیکن یہ لوگ ایک مذہب کو ماننے والے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ خود ان کا اپنا مذہب اس عقیدہ کو رد کرتا ہے۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ عقیدہ درست ہے کہ آدم اوّل نے گناہ کیا جس کے نتیجہ میں اب ورثہ کا گناہ انسان کے اندر آ گیا ہے اور وہ اس سے بلا کسی اور امداد کے آزاد نہیں ہو سکتا۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کی تمام مخلوق نجات سے محروم ہونی چاہیے۔ کیونکہ کفارہ تو مسیحؑ نے پیش کیا ہے۔ مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لانے والے تو نجات پا سکتے ہیں مگر پہلے لوگوں کی نجات اس عقیدہ کی رو سے قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا فطرت کی اس اصلاح یعنی کفارہ مسیحؑ سے پہلے سب لوگ گنہگار اور غیر ناجی تھے؟ اس کا جواب خود بائیبل دیتی ہے کہ وہ آدم کو لعنتی قرار نہیں دیتی بلکہ شیطان سے دھوکا کھانے کے بعد بھی خدا اس پر راضی رہتا ہے۔ چنانچہ بائیبل میں لکھا ہے کہ جب آدم نے گناہ کیا اور اس کے نتیجہ میں وہ ننگا ہو گیا تو ’’خداوند خدا نے آدم اور اس کی جورو کے واسطے چمڑے کے کرتے بنا کے ان کو پہنائے‘‘ (پیدائش باب ۳ آیت ۲۱) اگر آدم سے خدا ناراض ہو چکا تھا اور اسے اپنی روحانی اولاد سے وہ خارج کر چکا تھا۔ تو چاہیے تھا کہ اس واقعہ کے بعد آدم پر ناراضگی کا اظہار ہوتا۔ نہ یہ کہ اسے اور اس کی بیوی کو چمڑے کے کپڑے بنوا کر دیتا اور ان کے ننگ کو ڈھانکتا۔ اللہ تعالیٰ کا آدم اور اس کی بیوی کو اس واقعہ کے بعد چمڑے کے کپڑے بنوا کر دینا بتا رہا ہے کہ خدا تعالیٰ اس واقعہ کے بعد بھی آدم سے راضی رہا۔ پھر لکھا ہے۔ فرشتوں سے خدا نے کہا ’’دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا‘‘ (پیدائش باب ۳ آیت ۲۲) یعنی نیکی اور بدی کی پہچان میں آدم خدا اور اس کے فرشتوں جیسا ہو گیا ہے جو شخص نیکی اور بدی کی پہچان میں خدا اور اس کے فرشتوں جیسا ہو جائے وہ لعنتی کس طرح ہو سکتا ہے یہ تو ایک اعلیٰ درجے کا مقام ہے جو آدم کو حاصل ہوا۔

آدمؑ کے بعد حنوک آئے جو حضرت نوحؑ کے پردادا تھے ان کے بارہ میں لکھا ہے ’’حنوک کی ساری عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور غائب ہو گیا اس لئے کہ خدا نے اسے لے لیا‘‘ (پیدائش باب ۵ آیت ۲۴) اس آیت کا خلاصہ بائیبل میں اس طرح درج کیا گیا ہے۔ ’’حنوک کی دینداری اور اس

کے جیتے جی خدا کے حضور چلے جانے کی خبر‘‘ یہ حوالہ ظاہر کر رہا ہے کہ حنوک اللہ تعالیٰ کا اس قدر پیارا تھا کہ خدا نے اسے اور لوگوں کی طرح موت جسمانی نہیں دی بلکہ جیتے جی اسے آسمان پر اٹھا لے گیا۔ حالانکہ عیسائی عقیدہ کی رو سے آدم کو گناہ کی جو سزا دی گئی تھی اس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ وہ دنیا میں ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک دن موت کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ پیدائش باب ۳ آیت ۱۹ میں اس سزا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ’’تو خاک ہے اور پھر خاک میں جائے گا‘‘ گویا عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آدم کے گناہ کے نتیجہ میں انسان کو موت کی سزا دی گئی ہے اسی طرح اسے زمین پر رہنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اگر آدم گناہ نہ کرتا تو انسان ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا اور زمین پر رہنے پر مجبور نہ ہوتا۔ مگر اوپر کے حوالہ میں بتایا گیا ہے کہ حنوک کو خدا نے موت نہیں دی بلکہ اسے زندہ ہونے کی حالت میں آسمان پر اٹھالیا۔ اگر اس حوالہ میں صرف حنوک کی دینداری کا ذکر ہوتا۔ یہ بات بیان نہ کی جاتی کہ خدا نے اسے موت سے بچایا اور جیتے جی آسمان پر اٹھالیا تب بھی یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ مسیح کی آمد یا اس کے کفارہ پر ایمان لانے کے بغیر بھی لوگ نیک ہو سکتے ہیں۔ مگر اس حوالہ سے یہ زائد بات بھی نکلتی ہے کہ حنوک موت سے بچ گیا اور آسمان پر زندہ اٹھالیا گیا۔ حالانکہ موت اور زمین پر رہنا ایک سزا تھا آدم کے گناہ کی۔ پس جسے موت نہیں آئی اور آسمان پر چلا گیا اس کے متعلق بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس نے ورثہ کے گناہ سے کوئی حصہ نہیں پایا۔ اگر پایا ہوتا تو عیسائی عقیدہ کی رو سے وہ ضرور مرتا۔ مگر چونکہ وہ زندہ رہا اور جیتے جی آسمان پر اٹھالیا گیا اس لئے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اس نے ورثہ کے گناہ سے حصہ نہیں لیا۔ پھر ساتھ ہی لکھا ہے۔ ’’حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا‘‘ (پیدائش باب ۵ آیت ۲۴) خدا کے ساتھ ساتھ چلنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی زندگی صرف خدا کے کام میں مصروف تھی کسی اور طرف اس کی توجہ نہیں تھی۔ اور جس شخص کی زندگی صرف خدا کے کام میں صرف ہو رہی ہو اور دن اور رات اسے یہی فکر ہو کہ میں ان فرائض کو بجا لاؤں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس رنگ میں اپنی معاش کا سامان نہیں کر سکتا جس رنگ میں دوسرے لوگ جدوجہد کرتے اور اپنی روزی کا فکر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر خدا کے ساتھ ساتھ چلنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اسے رزق بلا محنت ملتا تھا۔ گویا وہ دوسری سزا بھی اسے نہیں ملی جو آدم کے گناہ کی وجہ سے مقرر ہوئی تھی اور جس کا ذکر بائیبل میں ان الفاظ میں پایا جاتا ہے کہ ’’تو اپنے مونہہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں پھر نہ جاوے کہ تو اس سے نکالا گیا ہے کہ تو خاک ہے اور پھر خاک میں جائے گا‘‘ (پیدائش باب ۳ آیت ۱۹) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ آدم کو دو سزائیں دی گئی تھیں ایک یہ کہ وہ ہمیشہ اپنے ماتھے کے پسینہ سے روٹی کھائے گا اور دوسرے یہ کہ وہ اس دنیا میں ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا بلکہ ایک دن آئے گا جب

اسے موت کا تلخ گھونٹ پینا پڑے گا۔مگر حنوک کو نہ موت کا تلخ گھونٹ پینا پڑا اور نہ ماتھے کے پسینہ سے اپنے لئے روزی کا سامان مہیا کرنا پڑا وہ جیتے جی بغیر مرنے کے آسمان میں غائب ہو گیا اور پھر وہ ہمیشہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔گویا اسے رزق بلا محنت ملتا رہا۔اس سے ظاہر ہے کہ عیسائی مذہب کے رو سے حنوک ورثہ کے گناہ اور اس کے اثرات سے قطعی طور پر محفوظ تھا۔اگر ورثہ کا گناہ حنوک میں بھی آتا تو ضروری تھا کہ وہ مر کر زمین میں دفن ہوتا اور ضروری تھا کہ وہ ماتھے کے پسینہ سے اپنے لئے روٹی مہیا کرتا۔مگر اس کا نہ مرنا اور نہ ماتھے کے پسینہ سے روٹی کھانا بتا رہا ہے کہ حنوک عیسائی مذہب کے رو سے بالکل پاک تھا۔

اس کے بعد نوحؑ آئے ان کی نسبت لکھا ہے کہ لمک نے اپنے بیٹے کا نام نوحؑ رکھا اور کہا کہ ’’یہ ہمارے ہاتھوں کی محنت اور مشقت سے جو زمین کے سبب سے ہیں جس پر خدا نے لعنت کی ہے ہمیں آرام دے گا‘‘ (پیدائش باب ۵ آیت ۲۹) یعنی آدم کے گناہ کی وجہ سے جو زمین پر لعنت ڈالی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ انسان ہمیشہ محنت اور مشقت سے اپنے لئے روزی کمائے گا وہ لعنت نوحؑ کی وجہ سے دور ہو جائے گی۔

یہ امر بتایا جا چکا ہے کہ آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو سزائیں ملی تھیں۔ایک یہ کہ انسان محنت و مشقت سے روزی کمائے گا اور دوسری یہ کہ وہ ایک دن مر کر زمین میں دفن ہو گا۔لمک نے اپنے بیٹے کا نام نوحؑ رکھا اور اس لئے رکھا کہ ’’یہ ہمارے ہاتھوں کی محنت اور مشقت سے جو زمین کے سبب سے ہیں جس پر خدا نے لعنت کی ہے ہمیں آرام دے گا‘‘۔گویا انہوں نے امید ظاہر کی کہ نوحؑ کی وجہ سے وہ محنت اور مشقت سے آزاد ہو جائیں گے اور انہیں آرام میسر آجائے گا۔جس کے معنے یہ ہیں کہ نوحؑ نے اس لعنت کو آکر دور کر دیا۔اگر کہا جائے کہ انہوں نے یونہی بلا وجہ ایک امید ظاہر کر دی تھی تو سوال یہ ہے کہ بائیبل نے اس کو نقل کیوں کیا ہے؟ بائیبل کا اسے نقل کرنا بتا رہا ہے کہ انہوں نے خدا کے حکم کے ماتحت یہ امید ظاہر کی تھی اور یہ توقع وہ تھی جسے نوحؑ نے اپنی زندگی میں پورا کرنا تھا اور اس طرح انہوں نے اس لعنت کو دور کر دینا تھا جو آدم کے گناہ کی وجہ سے زمین پر مسلط تھی۔پھر نوحؑ کے بارہ میں لکھا ہے۔’’نوح اپنے قرنوں میں صادق اور کامل تھا اور نوحؑ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا‘‘ (پیدائش باب ۶ آیت ۹) جو شخص صادق اور کامل تھا وہ گنہگار کس طرح ہو گیا؟ پھر نوح وہ شخص تھا جو خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔اب بتاؤ جو شخص صادق بھی ہو اور کامل بھی اور پھر خدا کی مرضی کے خلاف کبھی کوئی فعل بھی نہ کرتا ہو اسے گنہگار کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر نوحؑ سے خدا تعالیٰ نے کہا۔ ’’میں تجھ سے اپنا عہد قائم کروں گا‘‘ (پیدائش باب ۶ آیت ۱۸) جس شخص کو خدا اپنے عہد کے لئے منتخب فرمالے

اسے غیر نجات یافتہ کس طرح کہا جا سکتا ہے؟

پھر لکھا ہے نوحؑ نے خدا کے لئے ایک مذبح بنایا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ جب نوحؑ نے عبادت کی تو ’’خداوند نے خوشنودی کی بُوسونگھی اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے لئے میں زمین کو پھر کبھی لعنت نہ کروں گا‘‘ (پیدائش باب ۸ آیت ۲۱) گویا نوحؑ کی عبادت اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے کہا۔ میں زمین پر پھر کبھی لعنت نہیں کروں گا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب پہلی لعنت نوحؑ نے دور کر دی تھی تو آئندہ کون سی نئی لعنت پیدا ہوئی تھی جس سے فطرت انسانی مسخ ہوگئی اور جو مسیح نے آ کر دور کی؟

پھر ان کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے ان کے متعلق بائیبل میں لکھا ہے کہ خدا نے ان کو فرمایا۔ ’’میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا۔ اور تو ایک برکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا اور اس کو جو تجھ پر لعنت کرتا ہے لعنتی کروں گا اور دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پاویں گے۔‘‘ (پیدائش باب ۱۲ آیت ۲، ۳) اب دیکھو اس میں کتنی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی بات یہ بیان کی گئی ہے کہ میں تجھ کو مبارک کروں گا۔ یہ صاف بات ہے کہ خدا کا مبارک کیا ہوا انسان لعنتی نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ تو ایک برکت ہوگا یعنی تو مجسم برکت ہوگا۔ اور تیسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ نہ صرف تو مبارک ہوگا اور تیری وجہ سے دنیا برکت پائے گی بلکہ جو تجھے برکت دیں گے میں ان کو بھی برکت دوں گا۔ یہی وہ فقرہ ہے جس کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ دعا سکھائی کہ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ (صحیح بخاری کتاب الدعوات باب الصلاۃ علی النبی) یعنی اے خدا! تو نے جو ابراہیمؑ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تجھے برکت دوں گا اور تجھے برکت دینے والوں کو بھی برکت دوں گا ہم تیرے اس وعدہ کے مطابق ابراہیمؑ کو برکت دے رہے ہیں تو ہمارے گھروں کو بھی اپنی برکتوں سے بھر دے اور اپنے فضلوں سے ہمیں حصہ دے۔ گویا ابراہیمؑ کو برکت دینے والے لعنتی نہیں ہو سکتے اور ابراہیمؑ پر لعنت کرنے والے کبھی اللہ تعالیٰ کی برکت سے حصہ نہیں لے سکتے۔ عیسائی کہتے ہیں آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے خدا نے دنیا پر لعنت کی اور یہاں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ ابراہیمؑ اور اس سے تعلق رکھنے والے کبھی لعنتی نہیں ہو سکتے ہاں ابراہیمؑ کو لعنت کرنے والے ضرور لعنتی ہیں۔ پس وہ عقیدہ جو آج کل عیسائیوں میں پایا جاتا ہے اس حوالہ کی موجودگی میں بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔

پھر ابراہیمؑ کے زمانہ میں ایک اور شخص تھے جن کا نام ملک صدق سالیم تھا۔ ان کے متعلق خود انجیل میں لکھا ہے کہ

’’وہ پہلے اپنے نام کے معنوں کے موافق راستی کا بادشاہ ہے اور پھر شاہ سالیم یعنی سلامتی کا بادشاہ (عبرانیوں باب ۷ آیت ۲) مطلب یہ ہے کہ جیسا اس کا نام تھا ویسے ہی اوصاف اس کے اندر پائے جاتے تھے۔ اس کا نام بھی ملک صدق تھا اور واقعہ میں بھی راستی کا بادشاہ تھا اور پھر جس طرح وہ ظاہر میں شاہ سالیم تھا اسی طرح معنوی لحاظ سے بھی وہ سلامتی کا بادشاہ تھا۔ آگے لکھا ہے ’’یہ بے باپ بے ماں بے نسب نامہ جس کے نہ دنوں کا شروع نہ زندگی کا آخر مگر خدا کے بیٹے کے مشابہ ٹھہر کے ہمیشہ کاہن رہتا ہے‘‘ (عبرانیوں باب ۷ آیت ۳) گویا ملک صدق سالیم جو راستی اور سلامتی کا بادشاہ تھا وہ بے باپ بھی تھا اور بے ماں بھی۔ نہ اس کی زندگی کا آغاز تھا اور نہ اس کا کوئی انتہاء اور وہ خدا کے بیٹے کے مشابہ تھا۔

ایسا شخص تو یقیناً سب سزاؤں سے بچا ہوا تھا۔ یہاں کوئی عیسائی کہہ سکتا ہے کہ ملک صدق سالیم نے اس لیے نجات پائی تھی کہ وہ بے باپ اور بے ماں تھا ورثہ کا گناہ اسے حاصل نہ ہوا تھا مگر سوال یہ ہے کہ اگر بے باپ اور بے ماں مصلحین پہلے سے دنیا کو مل چکے تھے تو پھر مسیح کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارا مسیح کی معصومیت اور اس کی قربانی پر زور دینا اسی لئے ہے کہ تم سمجھتے ہو دنیا کے لیے کوئی ایسا مصلح چاہیے تھا جو بے گناہ ہو اور چونکہ آدم سے لے کر مسیح تک کوئی بے گناہ مصلح نہیں آیا بلکہ ہر شخص جو پیدا ہوا وہ ورثہ کا گناہ لے کر آیا اس لیے ضروری تھا کہ خدا کا بیٹا جو بے گناہ تھا آتا اور لوگوں کے گناہوں کا کفّارہ ہو جاتا مگر عبرانیوں کا وہ فقرہ جسے اوپر درج کیا گیا ہے بتا رہا ہے کہ مسیح سے پہلے ملک صدق سالیم آیا اور وہ ایسا شخص تھا جو قطعی طور پر بے گناہ تھا نہ اس کی ماں تھی نہ باپ اور اس طرح ورثہ کے گناہ کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اسی طرح اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ سب کی نیکی اور پاک بازی کا اقرار بائیبل میں موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسیحؑ سے پہلے اگر اتنے لوگ کفارۂ مسیحؑ پر ایمان لائے بغیر نجات پا گئے ہیں تو آئندہ کیوں نجات نہیں پا سکتے جس ذریعہ سے پہلوں نے نجات پائی ہے اسی ذریعہ سے بعد کے لوگ بھی نجات پا سکتے ہیں مسیحؑ کی قربانی یا اس کے کفارہ کی کیا ضرورت ہے؟ بہرحال پہلے لوگوں کا نجات پا جانا ثبوت ہے اس بات کا فطرت انسانی کو کوئی گناہ ورثہ میں نہیں پہنچا اگر پہنچا ہوتا تو یہ لوگ خدا تعالیٰ کے محبوب اور اس کے مقرب نہ بن سکتے!

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیحؑ کی آمد نے کوئی ایسا تغیر پیدا کیا ہے جس سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ انسان فطرت کے گناہ سے بچ گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ مسیح کے بعد گناہ نے ترقی کی ہے شرک نے ترقی کی، ظلم نے ترقی کی، جھوٹ فریب اور دغا بازی نے ترقی کی اور تو اور عیسائی لوگ ایک دوسرے کے ظلموں کے شاکی ہو رہے ہیں پس سوال یہ ہے کہ اگر مسیحؑ کے کفارہ سے واقعہ میں ورثہ کا گناہ معاف ہو گیا تھا تو مسیحؑ کے آنے کے بعد گناہ میں زیادتی

کیوں ہوئی؟ عیسائی اس سوال کا ایک فلسفیانہ جواب دیتے ہیں جو ہماری جماعت کے دوستوں کو مدنظر رکھنا چاہیے وہ کہتے ہیں ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ محض مسیحؑ پر ایمان لانے کی وجہ سے گناہ جاتا رہتا ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر جو نیک بننے کی خواہش پائی جاتی ہے اگر کفارۂ مسیح پر ایمان لانے کے بعد یہ خواہش انسان کے دل میں پیدا ہو تو وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر تم ہمیں کروڑوں عیسائی بھی گنہگار دکھا دو تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں تم بھی تو یہ نہیں کہتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ہر شخص کے اندر نیکی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ تم یہ کہتے ہو کہ انسان کے اندر اس ایمان کی وجہ سے ایک مقدرت پیدا کر دی جاتی ہے جس سے کام لے کر وہ اگر نیک بننا چاہے تو بن سکتا ہے۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں مسیحؑ کے کفارہ سے پہلے کوئی شخص نجات نہیں پا سکتا تھا کیونکہ اس میں ورثہ کے گناہ کا اثر تھا جو اسے ترقی سے روک رہا تھا۔ لیکن مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے کے بعد اس کی نجات کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ ہم امکانِ نجات کے مدعی ہیں اس بات کے مدعی نہیں کہ ہر شخص جو کفارہ مسیحؑ پر ایمان لائے گا وہ خواہ اپنی نیک قوتوں کو استعمال نہ کرے تب بھی نجات پا جائے گا۔ جس طرح آدمؑ نے گناہ کیا تھا اسی طرح اب بھی لوگ گناہ کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر وہ اس سے بچنا چاہیں تو بچ بھی سکتے ہیں۔ کیونکہ پچھلا بوجھ اتر گیا ہے اور آئندہ کے لیے ایمان نے ان کے اندر نیکی کی مقدرت پیدا کر دی ہے۔ یہ جواب ہے جو عیسائی لوگ دیا کرتے ہیں۔ اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے۔ کہ بائیبل اس بات پر گواہ ہے کہ مسیحؑ کی آمد سے پہلے بھی کئی لوگ گناہ سے بچا کرتے تھے۔ جب پہلے لوگ گناہ سے بچا کرتے تھے تو اب بغیر کفارۂ مسیح پر ایمان لانے کے وہ گناہوں سے کیوں بچ نہیں سکتے اور جب کہ پہلے لوگ بغیر اس کفارہ کے نجات پا گئے اور خدا کے ساتھ ساتھ چلنے والے بنے بلکہ بقول بائیبل بعض موت سے بھی بچے رہے جیسا کہ ایلیاہ کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ''وہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا'' (۲ سلاطین باب ۲ آیت ۱۲) تو پھر ورثہ کا گناہ کہاں گیا اور جب بعد کے لوگ بھی گناہ میں مبتلا رہے تو پھر کفارہ کا فائدہ کیا ہوا؟ اس کا جواب عیسائی لوگ یہ دیتے ہیں کہ مسیح کی آمد سے پہلے جو لوگ گناہوں سے بچتے تھے وہ اس لیے بچتے تھے کہ مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آئے تھے۔ خدا تعالیٰ سے ان کو خبر مل جاتی تھی کہ آئندہ زمانہ میں خدا کا ایک بیٹا آئے گا لوگ اسے صلیب پر لٹکائیں گے اور وہ دنیا کے گناہوں کے بدلے اپنے آپ کو قربان کر دے گا۔ وہ یہ خبر سنتے اور کہتے اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا چنانچہ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میں آنے والے مسیح پر ایمان لاتا ہوں تو وہ گناہ سے بچ گیا۔ اس پر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعض پیش گوئیاں بھی بیان کرتے ہیں جو ان کے نزدیک حضرت مسیحؑ پر چسپاں ہوتی ہیں۔ اس کا جواب یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اوّل تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

پیش گوئیاں خود زیر بحث ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مان لینے سے یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ نوح اور حنوک بھی یہ جانتے تھے کہ آئندہ زمانہ میں خدا کا ایک بیٹا ظاہر ہونے والا ہے؟ یا تو بائیبل میں یہ مسئلہ ان الفاظ میں بیان ہوتا کہ آنے والے خدا کے بیٹے پر ہر نبی ایمان لا یا تھا پھر چاہے یہ ذکر نہ ہوتا کہ حنوک مسیح پر ایمان لا یا تھا یا نہیں یا نوحؑ مسیح پر ایمان لا یا تھا یا نہیں ہم کہتے کہ جب بائیبل نے کہہ دیا ہے کہ ہر نبی خدا کے بیٹے پر ایمان لاتا رہا ہے تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ نام بنام ہر نبی کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ وہ خدا کے بیٹے پر ایمان لاتا تھا۔ مگر بائیبل نے ایک طرف تو ایسا کوئی اصل پیش نہیں کیا اور دوسری طرف اس نے حنوک کا واقعہ تو بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ مگر اس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ حنوک خدا کے بیٹے پر بھی ایمان لا یا تھا۔ اسی طرح آدمؑ کے متعلق یہ تو ذکر ہے کہ وہ خدا کا مقبول رہا مگر بائیبل میں یہ کہیں ذکر نہیں کہ آدم کو خدا نے یہ اطلاع دی تھی کہ میرا بیٹا دنیا میں آنے والا ہے۔ جو لوگوں کے گناہوں کے بدلے پھانسی پائے گا تم اس پر ایمان لے آؤ۔ اسی طرح یسعیاہ اور حزقیل وغیرہ انبیاء ہیں جن کی پاک بازی کا تو بائیبل میں ذکر آتا ہے مگر مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لانے کا ان کے متعلق کہیں ذکر نہیں؟ بلکہ اور تو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی بائیبل میں یہ کہیں نہیں بیان کیا گیا کہ وہ کفارۂ مسیح پر ایمان لائے تھے۔ اگر ان کی کوئی پیش گوئی نکل بھی آئے تو اس سے صرف اتنا ثابت ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ خبر دی تھی کہ میرے بعد مسیحؑ آئے گا۔ یہ کہیں سے ثابت نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے یہ کہا ہو کہ مسیح لوگوں کو گناہوں کی سزا سے بچانے کے لئے اپنے آپ کو قربان کرے گا اور میں اس کفارہ پر ایمان لاتا ہوں۔ پس بفرض محال اگر حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی کوئی پیشگوئی ثابت بھی ہو جائے تو اس سے صرف اتنا پتہ لگے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آمد مسیح کی خبر دی تھی اس سے ان کی نجات کس طرح ہو گئی؟ اور وہ گناہ سے بچ کس طرح گئے؟ کفارہ کا مسئلہ جو عیسائیوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اس کی بنیاد اس امر پر نہیں کہ خدا کے بیٹے پر ایمان لا یا جائے بلکہ اس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ خدا کے بیٹے کے مصلوب ہونے اور اس کے کفارہ ہونے پر ایمان لا یا جائے مگر کفارۂ مسیح پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان لانے کا بائیبل سے کہیں ثبوت نہیں ملتا۔

پھر اگر حضرت ابراہیمؑ کی پیش گوئیوں کو لو تو وہ بھی حضرت مسیحؑ پر چسپاں نہیں ہوتیں۔ مجھ سے ایک دفعہ ایک پادری کی گفتگو ہوئی میں نے اس سے کہا۔ پہلے لوگ کس طرح نجات پا گئے تھے؟ کہنے لگا وہ مسیحؑ پر ایمان لاتے تھے۔ میں نے کہا کیا ابراہیمؑ بھی ایمان لائے تھے؟ اس نے کہا ہاں! حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ’’تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہو گی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی‘‘

(پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷، ۱۸) یہ پیش گوئی حضرت مسیحؑ کے متعلق تھی اور انہی کے ذریعہ پوری ہوئی ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لے آئے تھے۔ میں نے کہا اس پیش گوئی میں یہ ذکر ہے کہ آنے والا ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہوگا اور تم جانتے ہو کہ اولاد ہمیشہ مرد کے نطفے سے ہوتی ہے اس لئے وہی شخص اس پیش گوئی کا مصداق سمجھا جا سکتا ہے جو مرد کے نطفہ سے ہو۔ اس وقت دنیا میں دو مدعی کھڑے ہیں اور دونوں اس امر کے دعویدار ہیں کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیش گوئی کا مصداق ہیں ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کا باپ تھا اور ایک مسیحؑ ہیں جن کا کوئی باپ نہیں تھا۔ اب تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ بائیبل کی یہ پیش گوئی ان دونوں میں سے کس پر چسپاں ہوگی آیا اس پر چسپاں ہوگی جس کا کوئی باپ ہی نہیں تھا یا اس پر چسپاں ہوگی جس کا باپ تھا اور جو واقعہ میں ابراہیم کی نسل میں سے تھا۔ بائیبل بتا رہی ہے کہ آنے والا ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہوگا یعنی وہ مرد کے نطفہ سے پیدا ہوگا جو شخص مرد کے نطفہ سے ہی نہیں وہ ابراہیمؑ کی اولاد میں سے کس طرح سے ہو گیا؟

عیسائیوں کو یہاں سخت مشکل پیش آئی ہے۔ وہ ایک طرف یہ بھی چاہتے تھے کہ اس پیش گوئی کو حضرت مسیحؑ پر چسپاں کریں اور دوسری طرف یہ بھی دیکھتے تھے کہ حضرت مسیحؑ کا کوئی باپ نہیں تھا جس کی بنا پر وہ انہیں ابراہیمی نسل میں سے قرار دیں۔ آخر اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ انجیل میں لکھ دیا یوسف نجار مسیحؑ کا باپ تھا اور پھر اس کا نسب نامہ انہوں نے داؤد سے ملا دیا حالانکہ وہ ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مسیحؑ کنواری کے بطن سے پیدا ہوا۔ بہرحال اوّل تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پیش گوئی میں کفارۂ مسیحؑ کا کوئی ذکر نہیں نہ اس امر کا کوئی ذکر ہے کہ وہ اس کفارہ پر ایمان لائے تھے صرف ابراہیمؑ کی اولاد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ میں اسے برکت دوں گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس پیش گوئی کو جب ہم کسی شخص پر چسپاں کریں گے تو اس شخص پر کریں گے جس کا کوئی باپ ہی نہیں یا اس شخص پر چسپاں کریں گے جس کا باپ موجود ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہودی عقیدہ کے ماتحت ماں کی طرف سے نسل نہیں چلتی بلکہ باپ کی طرف سے نسل چلتی ہے اس لئے جس شخص کا باپ موجود ہے وہی اس پیش گوئی کا مصداق ہو سکتا ہے نہ وہ جس کا کوئی باپ ہی نہیں اور جو ابراہیمی نسل میں سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

تیسرا اعتراض ان لوگوں پر یہ ہے کہ مسیحؑ کس طرح پاک ہوا؟ وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مسیحؑ چونکہ بے باپ پیدا ہوا اس لئے وہ گناہ سے پاک تھا۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بے باپ کے پیدا ہونے سے انسان گناہ سے نجات پا جاتا ہے تو ملک صدق سالیم بھی تو بے باپ پیدا ہوا تھا بلکہ اس کی تو ماں بھی نہ تھی اس کے متعلق کیوں نہیں کہا جاتا کہ وہ گناہ سے پاک تھا؟ پھر سوال یہ ہے کہ اگر بے باپ پیدا ہونے سے انسان گناہ سے

نجات پاتا ہے تو آدمؑ نے گناہ کس طرح کیا جبکہ آدمؑ کا بھی نہ باپ تھا نہ ماں۔ بن باپ پیدائش اگر انسان کو پاکیزہ بناتی ہے تو آدمؑ بھی بے گناہ ہونا چاہیے تھا پھر یہ ورثہ کا گناہ کہاں سے آ گیا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ایک جسم میں سے نکلنے کی وجہ سے انسان گنہگار بن جاتا ہے تو جیسے باپ کے اندر سے اسے گناہ پہنچتا ہے ویسے ہی اسے ماں سے گناہ پہنچ سکتا ہے؟ اور بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اصل میں حوّا سے ظاہر ہوا تھا۔ چنانچہ پیدائش باب ۳ کا بائیبل کے چھاپنے والوں نے ان الفاظ میں خلاصہ درج کیا ہے ''اس بیان میں کہ سانپ حوّا کو فریب دیتا انسان گناہ سے شکستہ حال ہو جاتا۔ خدا مرد و عورت دونوں کو اپنے حضور میں بلاتا۔ سانپ پر لعنت بھیجی جاتی۔ عورت کو خاص نسل کا وعدہ۔ انسان کی سزا کا احوال۔ ان کی پہلی پوشاک۔ ان دونوں کا باغ عدن سے نکالا جانا۔''

پھر خود اس باب میں یوں لکھا ہے ''اور سانپ میدان کے سب جانوروں سے جنہیں خداوند خدا نے بنایا تھا ہوشیار تھا۔ اور اس نے عورت سے کہا کیا یہ سچ ہے کہ خدا نے کہا کہ باغ کے ہر درخت سے نہ کھانا۔ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں مگر اس درخت کے پھل کو جو باغ کے بیچوں بیچ ہے خداوند نے کہا کہ تم اس سے نہ کھانا اور نہ اسے چھونا ایسا نہ ہو کہ مر جاؤ۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن اس سے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے ہوؤ گے اور عورت نے جوں دیکھا کہ وہ درخت کھانے میں اچھا اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی دیا اور اس نے کھایا'' (پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۶) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ شیطان نے پہلے حوّا کو ورغلایا اور حوّا کے کہنے سے آدم بھی اس غلطی میں شریک ہو گیا چنانچہ جب خدا نے آدم سے کہا کہ ''کیا تو نے اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ اس سے نہ کھانا'' تو آدم نے جواب دیا حضور اس میں میرا کیا قصور ہے آپ نے جو عورت مجھے دی تھی اور جس کے متعلق کہا تھا کہ یہ تیری ساتھی ہو گی اس نے جب مجھے درخت کا پھل دیا تو میں نے سمجھا کہ یہ خدا کا عطا کیا ہوا ساتھی ہے اس کی دی ہوئی چیز کو میں رد نہ کروں ایسا نہ ہو کہ میں گنہگار بن جاؤں چنانچہ میں نے پھل لیا اور کھا لیا۔ بائیبل میں لکھا ہے ''آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اس درخت سے دیا اور میں نے کھایا تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا۔ عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا'' (پیدائش باب ۳ آیت ۱۱ تا ۱۳) ان حوالجات سے صاف پتہ لگتا ہے کہ شیطان پہلے حوّا کے پاس گیا اور اسے ورغلایا۔ اس کے بعد حوّا نے آدمؑ کو ورغلایا۔ گویا زیادہ

گنہگار آدم نہیں بلکہ حوّا تھی اور اس کی تحریک پر آدم بھی اس گناہ میں ملوث ہوا۔ اس پادری سے گفتگو کے دوران میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے میں نے اس سے پوچھا کہ بتاؤ شیطان نے پہلے آدم کو ورغلایا تھا یا حوّا کو؟ کہنے لگا حوّا کو۔ میں نے کہا حوّا کو ورغلانے سے شیطان کی کیا غرض تھی؟ اس نے پہلے ہی آدم کو کیوں نہ ورغلا لیا۔ وہ آدم کو چھوڑ کر حوّا کے پاس کیوں گیا تھا؟ پادری نے کہا اس لئے کہ حوّا جلدی قابو میں آ سکتی تھی۔ میں نے کہا تو پھر معلوم ہوا کہ حوّا میں گناہ کا مادہ زیادہ تھا اسی وجہ سے وہ پہلے آدمؑ کے پاس نہیں گیا کیونکہ اس نے سمجھا کہ آدم میرے دھوکا میں جلدی نہیں آ سکتا وہ حوّا کے پاس گیا اور کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے کہا اب بتاؤ مسیحؑ حوّا کا بیٹا تھا یا آدم کا؟ کہنے لگا اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا کچھ مطلب ہو۔ تم یہ بتاؤ کہ مسیحؑ آدم کا بیٹا تھا یا حوّا کا؟ کہنے لگا مریم کا بیٹا تھا۔ میں نے کہا اچھا اگر گرم پانی میں سرد پانی ملا دیا جائے تو اس کی گرمی بڑھ جائے گی یا کم ہوگی؟ کہنے لگا کچھ گرم پانی کی گرمی کم ہوگی اور کچھ سرد پانی کی سردی کم ہو جائے گی۔ میں نے کہا تو اب مسئلہ صاف ہو گیا۔ اگر مسیحؑ بن باپ نہ ہوتا تو اسے باپ کی طرف سے اس روحانی طاقت میں سے حصہ ملتا جو آدم میں تھی اور ماں کی طرف سے اسے اس کمزوری میں سے حصہ ملتا جو حوّا میں تھی۔ آدم کی طاقت اور حوّا کی کمزوری مل کر ورثہ کے گناہ کا اثر کچھ نہ کچھ کم کر دیتی مگر مسیحؑ بن باپ تھا جس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے آدم کی طاقت سے حصہ نہیں لیا صرف حوّا کی کمزوری سے حصہ لیا ہے اب بتاؤ وہ مسیحؑ جو خالص حوّا کی نسل میں سے تھا جس کے متعلق تم تسلیم کرتے ہو کہ وہ آدم کی نسبت زیادہ گنہگار تھی وہ گناہوں سے پاک کس طرح ہو گیا وہ تو اور لوگوں کی نسبت زیادہ گنہگار رہا کیونکہ اس نے خالص حوّا کا اثر ورثہ میں لیا ہے؟ کہنے لگا یہ کوئی اصول نہیں کیا مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا؟ میں نے کہا اگر مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے تو بات حل ہو گئی جس طرح مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے اسی طرح آدمؑ کے بیٹے نیک بھی ہو سکتے ہیں۔ کہنے لگا نہیں نہیں سونا تو سونے میں سے نکلتا ہے میں نے کہا تو پھر مسیحؑ ایک عورت کے بطن سے پیدا ہو کر پاک کس طرح ہو گیا؟ سونا تو سونے میں سے نکلتا ہے مٹی میں سے نہیں نکلتا اور اگر سونا مٹی میں سے بھی نہیں نکلتا اور سونے میں سے بھی نہیں نکلتا تو وہ نکلتا کس چیز میں سے ہے؟ غرض اگر یہ درست ہے کہ مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے تو گنہگار آدم کی اولاد بھی نیک ہو سکتی ہے اور اگر مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا بلکہ سونے میں سے سونا نکلتا ہے تو مسیحؑ ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہو کر پاک نہیں ہو سکتا۔ پس ان دونوں میں سے کوئی صورت لے لو عیسائی مذہب قائم نہیں رہ سکتا۔

تیسرے ہم خود مسیحؑ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو نیک کہتے ہیں یا نہیں۔ جب اس نکتہ نگاہ سے ہم انجیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ ’’اور دیکھو ایک نے آ کے اس سے کہا۔ اے نیک استاد!

میں کون سا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں؟ اس نے اس سے کہا تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے۔ نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔ پر اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہے تو حکموں پر عمل کر۔'' (متی باب ۱۹ آیت ۱۶، ۱۷) گویا مسیحؑ خود کہتے ہیں کہ میں نیک نہیں۔ اب بتاؤ جس نے دنیا کو نیکی دینی تھی جب وہ اپنی نیکی کا آپ منکر ہے تو ہم یہ کس طرح تسلیم کر لیں کہ وہ بے گناہ تھا اور دنیا کو گناہوں سے پاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ یہ تو وہی مثال بن جاتی ہے کہ مدعی سست اور گواہ چست۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعہ میں مسیحؑ نیک تھا اور اگر واقعہ میں اس کے کفارہ کے ذریعہ دنیا گناہ سے بچ گئی تھی اور اس میں یہ قابلیت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ نیکی کو اختیار کرے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسیحؑ پیدائش عالم کا آخری نقطہ تھا۔ کیونکہ انسانی پیدائش کی غرض اس کے آنے سے پوری ہو گئی لیکن جب ہم بائیبل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ پیدائش عالم کا آخری نقطہ نہیں تھا۔ بلکہ اگر مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا تو اس کی اپنی پیش گوئی کے مطابق خود خدا بھی دنیا میں آنے والا تھا چنانچہ مرقس باب ۱۲ میں وہ اس پیشگوئی کو تمثیلی رنگ میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''ایک شخص نے انگور کا باغ لگایا اور اس کے چاروں طرف گھیرا اور کولھو کی جگہ کھودی اور ایک برج بنایا اور اسے باغبانوں کے سپرد کر کے پردیس چلا گیا۔ پھر موسم میں اس نے ایک نوکر کو باغبانوں کے پاس بھیجا تا کہ وہ باغبانوں سے انگور کے باغ کے پھل میں سے کچھ لے۔ انہوں نے اسے پکڑ کے مارا اور خالی ہاتھ بھیجا۔ اس نے دوبارہ ایک اور نوکر کو ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے اس پر پتھر پھینک کے اس کا سر پھوڑا اور بے حرمت کر کے پھیر بھیجا۔ پھر اس نے ایک اور کو بھیجا انہوں نے اسے قتل کیا پھر اور بہتیروں کو۔ ان میں سے بعضوں کو پیٹا اور بعضوں کو مار ڈالا۔ اب اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو اس کا پیارا تھا۔ آخر کو اس نے اسے بھی ان پاس یہ کہہ کے بھیجا کہ وے میرے بیٹے سے دبیں گے۔ لیکن ان باغبانوں نے آپس میں کہا یہ وارث ہے آؤ ہم اسے مار ڈالیں تو میراث ہماری ہو جائے گی اور انہوں نے اسے پکڑ کے قتل کیا اور انگور کے باغ کے باہر پھینک دیا۔ پس باغ کا مالک کیا کہے گا؟ وہ آوے گا اور ان باغبانوں کو ہلاک کر کے انگور کا باغ اوروں کو دے گا۔'' (مرقس باب ۱۲۔ آیت ۱ تا ۹) اس تمثیل میں باغ سے مراد وہ سلسلۂ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی اصلاح کے لئے قائم کیا۔ باغ بنانے والا موسیٰؑ تھا جو الٰہی جلال کے اظہار کے لئے آیا اور باغبانوں سے مراد بنی اسرائیل تھے جن کے سپرد اس باغ کی حفاظت کا کام کیا گیا۔ نوکر جو میوہ کا حصہ لینے کے لئے باغ کے مالک کی طرف سے یکے بعد دیگرے بھیجے گئے اللہ تعالیٰ کے وہ انبیاء تھے جو موسیٰؑ کے بعد پے بہ پے آتے رہے مگر لوگوں کا سلوک ان کے ساتھ یہ رہا کہ

انہوں نے کسی نبی کو مارا، کسی کو دکھ دیا اور کسی کو بے عزت کیا۔ آخر خدا نے اپنا بیٹا بھیجا جس سے مراد حضرت مسیحؑ خود تھے۔ جو موسیٰؑ کے بعد آنے والے نبیوں میں سے سب سے زیادہ خدا تعالیٰ کے مقرب اور محبوب تھے مگر لوگوں نے ان کی بھی پرواہ نہ کی اور انہیں صلیب پر چڑھا دیا۔ حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں۔ تم جانتے ہو اب کیا ہوگا۔ باغ کا مالک آئے گا اور ان باغبانوں کو ہلاک کر کے انگور کا باغ اوروں کو دے گا۔ یعنی اب وہ نبی دنیا میں ظاہر ہوگا جس کا آنا خود خدا کا آنا ہوگا۔ جس کا ظہور خدا تعالیٰ کا ظہور ہوگا۔ اور وہ گذشتہ سنت کے خلاف بنی اسرائیل میں سے نہیں ہوگا بلکہ ان کے بھائیوں بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔

یہ تمثیل واضح کر رہی ہے کہ حضرت مسیحؑ پیدائش عالم کا آخری نقطہ نہیں تھے اگر آخری نقطہ ہوتے تو وہ اپنے بعد ایک ایسے نبی کی بعثت کی خبر نہ دیتے جس کا آنا خود خدا کا آنا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ بیٹا باپ نہیں ہوسکتا۔ پس اس تمثیل میں جس کو باپ کہا گیا ہے وہ یقیناً بیٹے کے علاوہ کوئی اور شخص ہی ہوسکتا ہے اور جب مسیحؑ کے علاوہ ہدایت عالم کے لئے کسی اور شخص کا آنا خود مسیحؑ کی اپنی پیشگوئی کے ماتحت ثابت ہوگیا اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ مسیحؑ کے متعلق یہ خیال درست نہیں کہ وہ پیدائش عالم کا آخری نقطہ تھا۔ اگر مسیحؑ سے نیکی قائم ہو چکی تھی تو پھر مسیح کے سوا کسی اور کے آنے کی کوئی غرض ہی نہیں ہوسکتی تھی مگر جیسا کہ انجیل کے مذکورہ بالا حوالہ سے ظاہر ہے مسیحؑ اگر خدا کا بیٹا تھا تو خود خدا بھی آنے والا تھا۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ ایک اور مقام پر کہتے ہیں۔ ''میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہیں بتا دے گی۔ اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی سو کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی۔ وہ میری بزرگی کرے گی اس لئے کہ وہ میری چیزوں سے پاوے گی اور تمہیں دکھاوے گی۔'' (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۲، ۱۳) یہاں حضرت مسیحؑ اقرار کرتے ہیں کہ میرے بعد ایک اور شخص آئے گا جو روح حق کہلائے گا اور وہ ایسی تعلیمیں دے گا جو میں نے بھی نہیں دیں۔ یعنی مجھ سے بڑھ کر سچائی کی راہیں دنیا پر روشن کرے گا اور میری تعلیم سے زیادہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔ اور پھر ایک مزید بات یہ ہوگی کہ اس کو ایسی کتاب ملے گی جس میں اس کے اپنے الفاظ نہیں ہوں گے بلکہ صرف وہی الفاظ ہوں گے جو خدا نے کہے ہوں گے۔ ''وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی سو کہے گی۔'' ان الفاظ کا مفہوم یہی ہے کہ اس کو جو کتاب ملے گی اس کی یہ ممتاز خوبی ہوگی کہ شروع سے لے کر آخر تک وہ اللہ تعالیٰ کے کلام پر مشتمل ہوگی۔ کوئی بات اس میں ایسی نہیں ہوگی جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ یہ انسان کا کلام ہے خدا کا کلام نہیں۔ گویا اوّل حضرت مسیحؑ اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دیتے ہیں۔ دوم حضرت مسیحؑ یہ خبر بھی

دیتے ہیں کہ وہ آنے والا اپنے ساتھ ایک کتاب بھی لائے گا۔ سوم اس کتاب کی یہ خوبی بتاتے ہیں کہ اس میں انسانی کلام نہیں ہوگا بلکہ ابتداء سے انتہا تک اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف خدائی کلام پر مشتمل ہوگا۔ اس پیشگوئی کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مبعوث ہوئے اور آپ نے وہ شریعت لوگوں کے سامنے پیش کی جو اپنی شان اور عظمت کے لحاظ سے تمام الہامی کتب میں یگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ بائیبل کو دیکھا جائے تو جہاں اس میں خدائی کلام نظر آتا ہے وہاں بہت سی انسانی باتیں بھی اس میں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ایک طرف اس میں ان پیشگوئیوں کا ذکر پایا جاتا ہے جو موسیٰؑ نے کیں تو دوسری طرف ہم اس میں یہ بھی لکھا پاتے ہیں کہ ''خداوند کا بندہ موسیٰؑ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مرگیا اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیتِ فغور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا۔'' (استثناء باب ۳۴ آیت ۵) اب بتاؤ کیا یہ خدا کا کلام ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوا کہ موسیٰؑ مرگیا اور فلاں جگہ گاڑا گیا مگر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ الفاظ بعد میں لوگوں نے بڑھا دیئے تھے۔ جب موسیٰؑ مر چکے تھے اور ان کی موت پر اس قدر عرصہ گزر چکا تھا کہ ان کی قبر کا بھی لوگوں کو علم نہیں رہا تھا کہ وہ کس جگہ تھی۔ اسی طرح متی، مرقس اور لوقا وغیرہ میں جہاں خدا کی باتیں ہیں وہاں بندوں کی باتیں بھی ہمیں ان میں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ خود لوقا کہتا ہے ''چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ ان کاموں کا جو فی الواقعہ ہمارے درمیان انجام ہوئے بیان کریں۔ جس طرح سے انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کی خدمت کرنے والے تھے ہم سے روایت کی میں نے بھی مناسب جانا کہ سب کو سرے سے صحیح طور پر دریافت کر کے تیرے لئے اے بزرگ تھیوفلس بہ ترتیب لکھوں تا کہ تو ان باتوں کی حقیقت کو جن کی تو نے تعلیم پائی جانے۔'' (لوقا باب ۱ آیت ۱ تا ۴) گویا موجودہ اناجیل کیا ہیں؟ وہ کتب ہیں جو حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد مختلف لوگوں نے مرتب کیں اور انہوں نے مختلف روایات کو ایک ترتیب سے ان میں جمع کر دیا۔ اس لئے ان کتب میں جہاں ہمیں وہ کلام نظر آتا ہے جو خدا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے وہاں ایسا کلام بھی ان میں پایا جاتا ہے اور اسی کی کثرت ہے جو کہ بندوں نے اپنی طرف سے شامل کر دیا ہے۔

غرض دنیا میں کوئی ایسی الہامی کتاب نہیں جو شروع سے آخر تک صرف وہی باتیں بیان کرتی ہو جو خدا نے کہی ہوں۔ تورات لے لو۔ انجیل لے لو۔ ژند اور اوستا لے لو۔ وید لے لو ہر کتاب انسانی دست بُرد کا شکار نظر آئے گی۔ ہر کتاب میں خدائی الہامات کے ساتھ ساتھ بندوں کی اپنی تشریحات کو بھی شامل دیکھو گے۔ مگر قرآن وہ کتاب ہے جو ابتداء سے انتہاء تک ہر قسم کے انسانی الفاظ سے منزہ ہے۔ ابتداء سے انتہاء تک اس کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف

اور ایک ایک شعشہ ایسا ہے جو خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ پس قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس پر حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں کہ ’’وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی سو کہے گی۔‘‘ پھر اس کے ساتھ ہی حضرت مسیحؑ نے یہ خبر بھی دی تھی کہ وہ کتاب ’’تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی‘‘ یعنی اس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا بلکہ قیامت تک چلتا چلا جائے گا۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں لوگ اس کتاب کی ضرورت سے مستغنی ہوجائیں اور پھر یہ کہ ’’وہ میری بزرگی کرے گی‘‘ یعنی لوگ مجھے جھوٹا اور لعنتی قرار دیں گے وہ میری بزرگی کا اظہار کرے گا۔ یہودی کہیں گے کہ میں صلیب پر مر کر لعنتی ہوگیا۔ عیسائی کہیں گے کہ میں صلیب پر لٹک کر لوگوں کے گناہوں کے بدلے دوزخ میں چلا گیا۔ مگر وہ کہے گا مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (النسآء:۱۵۸) یہ بات غلط ہے کہ لوگوں نے اسے قتل کر دیا تھا یا صلیب پر لٹکا کر اسے لعنتی ثابت کر دیا تھا۔ وہ قتل سے بھی محفوظ رہا تھا اور صلیب سے بھی محفوظ رہا تھا۔ بے شک دوست دشمن نے اسے لعنتی ثابت کرنا چاہا مگر خدا نے اسے عزت دی اور دشمن کو اس کے ارادوں میں ناکام کر دیا۔

آخر میں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوگا کہ ’’وہ میری چیزوں سے پاوے گی اور تمہیں دکھادے گی۔‘‘ میری چیزوں سے پانے کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ مسیحؑ کا متبع ہوگا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسے وہ تعلیم ملے گی جس میں تمام انبیاء کی تعلیمیں شامل ہوں گی۔ نوحؑ کی تعلیم بھی اس میں موجود ہوگی۔ ابراہیمؑ کی تعلیم بھی اس میں موجود ہوگی۔ موسیٰؑ کی تعلیم بھی اس میں موجود ہوگی اور میری یعنی عیسیٰؑ کی تعلیم بھی اس میں موجود ہوگی اور اس طرح اس کی تعلیم جامع ہوگی تمام سابق انبیاء کی تعلیمات کی۔ اور پھر وہ کتاب ایسی ہوگی جو ’’تمہیں دکھادے گی‘‘ یعنی اس میں صرف زبانی باتیں نہیں ہوں گی بلکہ عملی طور پر وہ تمام سچائیوں کو روشن کر کے دنیا پر ان کو واضح کر دے گی۔ یہ پیشگوئیاں صاف طور پر بتاتی ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے بعد ایک ایسے وجود نے ابھی آنا تھا جو مسیحؑ سے زیادہ کامل ہوتا۔ اور پھر مقدر یہ تھا کہ وہ ایک ایسی جامع اور بے مثل کتاب اپنے ساتھ لاتا جس میں تمام سچائیاں جمع ہوتیں۔ جس میں شروع سے لے کر آخر تک اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا اور پھر عملی طور پر وہ کتاب تمام سچائیوں کو روشن کرنے والی ہوتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر حضرت مسیحؑ نے واقعہ میں ساری دنیا کے گناہ اٹھا لئے تھے اگر دنیا کی نجات کے لئے ان پر ایمان لانا کافی تھا اور اگر انسانی نجات کا آخری نقطہ وہی تھے تو ساری سچائیاں انہیں بتانی چاہئیں تھیں مگر وہ تو کہتے ہیں میں سب سچائیاں نہیں بتا سکتا ان کو میرے بعد آنے والا بتائے گا۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیحؑ ناصری کے نزدیک ان کا اپنا وجود پیدائش عالم کا آخری نقطہ نہیں تھا بلکہ بعد میں آنے والا ایک اور وجود اس شرف اور عظمت کا مستحق تھا۔

پانچویں اگر حضرت مسیحؑ کفارہ ہوئے ہیں تو ان کا کفارہ ہونا اسی صورت میں تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ خوشی اور انتہائی بشاشت کے ساتھ کفارہ ہوئے ہوں۔ جس شخص کو جبراً صلیب پر لٹکا دیا جائے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی خوشی سے لوگوں کے لئے قربان ہوا ہے۔ اگر حضرت مسیحؑ واقعہ میں کفارہ ہونے کے لئے دنیا میں تشریف لائے تھے تو چاہیے تھا کہ وہ دوڑ کر صلیب پر چڑھتے اور خوش ہوتے کہ جس غرض کے لئے میں آیا تھا وہ آج پوری ہو رہی ہے۔ مگر بائیبل میں لکھا ہے جب انہیں پتہ لگا کہ صبح مجھے صلیب پر لٹکایا جانے والا ہے تو انہوں نے ساری رات دعائیں کرتے ہوئے گذار دی اور اپنے حواریوں سے بھی بار بار کہا کہ ''جاگو اور دعا مانگو تا کہ امتحان میں نہ پڑو'' (متی باب ۲۶ آیت ۴۱) حضرت مسیحؑ ایک پہاڑی پر دعائیں کر رہے تھے اور ان کے حواری نیچے تھے وہ گھبراہٹ کی حالت میں بار بار نیچے آتے اور دیکھتے کہ حواری دعائیں کر رہے ہیں یا نہیں۔ مگر جب بھی آتے، دیکھتے کہ وہ سو رہے ہیں حضرت مسیحؑ پھر ان کو جگاتے اور چلے جاتے۔ پھر نیچے آتے اور دیکھتے کہ حواریوں کی کیا حالت ہے مگر پھر ان کو سوتا پاتے۔ آخر حضرت مسیحؑ ان پر ناراض ہوئے اور کہا کہ ''کیا تم میرے ساتھ ایک گھنٹہ نہیں جاگ سکے'' (متی باب ۲۶ آیت ۴۰) مگر شاگردوں پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اس دوران میں حضرت مسیحؑ نے جس بے قراری اور اضطراب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کیں ان کا ذکر انجیل میں اس طرح آتا ہے۔

''پھر یسوع ان کے ساتھ گتسمنی نامی ایک مقام میں آیا اور شاگردوں سے کہا یہاں بیٹھو جب تک میں وہاں جا کر دعا مانگوں۔ تب اس نے پطرس اور زبدی کے دو بیٹے ساتھ لیے اور غمگین اور نہایت دلگیر ہونے لگا۔ تب اس نے ان سے کہا کہ میرا دل نہایت غمگین ہے بلکہ میری موت کی سی حالت ہے تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو اور کچھ آگے بڑھ کے مونہہ کے بل گرا اور دعا مانگتے ہوئے کہا کہ اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے گذر جائے تو بھی میری خواہش نہیں بلکہ تیری خواہش کے مطابق ہو۔ تب شاگردوں کے پاس آیا اور انہیں سوتے پا کر پطرس سے کہا۔ کیا تم میرے ساتھ ایک گھنٹہ نہیں جاگ سکے۔ جاگو اور دعا مانگو تا کہ امتحان میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد پر جسم سست ہے پھر اس نے دوبارہ جا کر دعا مانگی اور کہا اے میرے باپ! اگر میرے پینے کے بغیر یہ پیالہ مجھ سے نہیں گذر سکتا تو تیری مرضی ہو۔ اس نے آ کے پھر انہیں سوتے پایا۔ کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھاری تھیں اور انہیں چھوڑ کے پھر گیا اور وہی بات کہہ کر تیسری بار دعا مانگی۔ تب اپنے شاگردوں کے پاس آ کر ان سے کہا۔ اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وہ گھڑی آ پہنچی کہ

ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ حوالے کیا جاتا ہے۔‘‘ (متی باب ۲۶ آیت ۳۶ تا ۴۵)

اگر واقعہ میں حضرت مسیحؑ اس لئے آئے تھے کہ وہ لوگوں کے گناہ اٹھائیں اور ان کی خاطر اپنی جان قربان کردیں تو کیا یہ ہوسکتا تھا کہ وہ صلیب کے وقت گڑگڑا گڑگڑا کر یہ دعا مانگتے کہ ’’اے میرے باپ اگر ہوسکے تو یہ پیالہ مجھ سے گذر جائے‘‘۔ (متی باب ۲۶ آیت ۳۹) پھر تو چاہیے تھا کہ وہ روزانہ یہ دعا مانگتے کہ اے خدا یہ پیالہ مجھے جلد پلا تا کہ بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ہو۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ یہ دعا کرتے کہ الٰہی موت کا پیالہ مجھے جلد پلا تا کہ میں لوگوں کے گناہ اٹھا کر ان کی نجات کا باعث بنوں وہ ساری رات گڑگڑا گڑگڑا کر یہ دعا کرتے رہے کہ الٰہی مجھے صلیب سے بچا اور نہ صرف آپ یہ دعا کرتے رہے بلکہ حواریوں کو بھی بار بار دعا کرنے کی تاکید کرتے رہے اور بار بار آ کر دیکھتے رہے کہ وہ سو رہے ہیں یا اٹھ کر دعائیں کر رہے ہیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ حواری سستی سے کام لے رہے ہیں اور دعا کی طرف ان کی توجہ نہیں تو انہوں نے ان کو ڈانٹا اور کہا کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ ایک گھنٹہ جاگ سکو اور خدا سے دعائیں کرو۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ حضرت مسیحؑ کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی کفارہ کا وہ مسئلہ نہ تھا جو آج کل عیسائیوں نے ایجاد کیا ہوا ہے اور نہ کفارہ کے لئے وہ دنیا میں تشریف لائے تھے ورنہ صلیب کی رات نہ آپ خود یہ دعا کرتے اور نہ اپنے حواریوں سے کہتے کہ دعا کرو کہ یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ کفارہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ حضرت مسیحؑ نے صلیب پر جان دی۔ مگر جب اناجیل پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ حضرت مسیحؑ صلیب پر لٹک کر فوت ہوئے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انجیل میں لکھا ہے ’’تب بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں کہا کہ اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں‘‘ یعنی حضرت مسیحؑ نے اپنی صداقت کے متعلق جب مختلف دلائل ان کے سامنے پیش کئے تھے تو ان کو سننے کے بعد فقیہوں اور فریسیوں نے کہا یہ تو زبانی باتیں ہوئیں آپ ہمیں کوئی ایسا نشان دکھائیں جس سے آپ کی صداقت کے ہم بھی قائل ہو جائیں۔ اس پر ’’اس نے انہیں جواب دیا اور کہا کہ اس زمانہ کے بد اور حرام کار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں پر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان انہیں دکھایا نہ جائے گا۔ کیونکہ جیسا یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا‘‘ (متی باب ۱۲ آیت ۳۸ تا ۴۱) ان الفاظ میں حضرت مسیح علیہ السلام نے واقعہ صلیب کی خبر دی ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس میں ہمارا اور عیسائیوں کا اتفاق ہے۔ عیسائی بھی یہی کہتے ہیں کہ مسیحؑ کی یہ پیش گوئی واقعہ صلیب پر چسپاں ہوتی ہے اور ہم بھی کہتے ہیں کہ اس پیشگوئی کا اطلاق صلیب کے واقعات پر ہوتا ہے۔ فریقین کے اس اتحاد کے بعد جب ہم نفس پیشگوئی پر غور کرتے

ہیں تو ہمیں اس میں بعض عظیم الشان خبریں معلوم ہوتی ہیں۔اوّل حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں کہ یہود کو یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان نہ دکھایا جائے گا۔دوم وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جیسا یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔ان الفاظ میں خاص طور پر یونس نبی کی مماثلت پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جیسا یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔گویا تین دن کی مشابہت پر زور نہیں بلکہ اصل زور یونس نبی کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے اور ابن آدم کے زمین میں رہنے پر ہے۔یعنی جس رنگ میں یونس نبی تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا اسی رنگ میں ابن آدم بھی تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔جیسا اور ویسا کے الفاظ جو اس پیش گوئی میں استعمال کئے گئے ہیں بالصراحت بتلاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ اپنی صداقت کی ایک قطعی اور حتمی دلیل یہ بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں گیا اور تین رات دن اس میں رہا اسی طرح ابن آدم کے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آئے گا اور اسے بھی اسی طرح تین رات دن زمین کے پیٹ میں رہنا پڑے گا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یونس نبی کا کیا واقعہ ہے؟ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یونہ نبی کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ نینوہ والوں کے پاس جائیں اور انہیں خدا تعالیٰ کے عذاب کی خبر دیں۔(بائیبل میں آپ کا نام یونہ ہے لیکن انجیل میں آپ کا نام یونس آتا ہے۔)وہ لوگوں کی مخالفت سے ڈر کر بھاگے اور کسی اور علاقہ میں جانے کے لئے جہاز پر سوار ہو گئے۔جہاز پر طوفان آیا۔لوگوں نے سمجھا کہ خدا تعالیٰ کے غضب سے یہ عذاب نازل ہوا ہے۔اس پر انہوں نے قرعہ ڈالا کہ کس کے سبب سے یہ عذاب آیا ہے اور نام یونہ کا نکلا۔انہوں نے یونہ سے پوچھا کہ قرعہ میں تمہارا نام نکلا ہے بتاؤ کیا بات ہے؟انہوں نے سارا حال سنایا کہ مجھے اس اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا تھا مگر میں نے سمجھا کہ اگر لوگوں کو میں نے عذاب کی خبر دی تو وہ میری مخالفت کریں گے اس لئے میں وہاں سے بھاگا اور جہاز میں آ کر سوار ہو گیا۔انہوں نے کہا اب آپ ہی بتائیں کہ اس مصیبت کا ہم کیا علاج کریں۔یونہ نے کہا کہ تم مجھے سمندر میں پھینک دو۔یہ عذاب ٹل جائے گا۔پہلے تو وہ لوگ اس پر آمادہ نہ ہوئے اور انہوں نے پورا زور لگایا کہ کس طرح طوفان سے جہاز کو سلامتی کے ساتھ نکال کر لے جائیں مگر جب وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوئے اور طوفان بھی کسی طرح تھمنے میں نہ آیا تو انہوں نے یہ دعا کرتے ہوئے کہ الٰہی اس شخص کا سمندر میں پھینکنا ہمارے لئے کسی عذاب کا موجب نہ ہو۔یونہ کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد بائیبل میں لکھا ہے ”پر خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ یونہ کو

نگل جائے اور یونہ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا۔‘‘ (یوناہ باب ۱ آیت ۱۷) اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یونہ نبی مچھلی کے پیٹ میں کس طرح رہا؟ اس کے متعلق یونہ باب ۲ میں لکھا ہے کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں گیا ’’تب یونہ نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند اپنے خدا سے دعا مانگی اور کہا کہ میں نے اپنی مصیبت میں خداوند کو پکارا اور اس نے میری سنی۔‘‘ (یوناہ باب ۲ آیت ۱، ۲) اس دعا سے جو مچھلی کے پیٹ میں یونہ نے کی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ زندہ ہونے کی حالت میں مچھلی کے پیٹ میں گئے اور پھر اس کے پیٹ میں بھی زندہ رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے۔ چنانچہ یونہ باب ۲ میں ایک لمبی دعا درج ہے جو مچھلی کے پیٹ میں انہوں نے مانگی اور جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ الٰہی مجھ پر اب تک کئی مصیبتیں آئی ہیں جن سے تو نے مجھے بچایا۔ اب اس مصیبت سے بھی مجھے بچا اور نجات بخش۔ آخر خدا نے ان کی دعا کو سنا۔ ’’اور خداوند نے مچھلی سے کہا اور اس نے یونہ کو خشکی پر اُگل دیا۔‘‘ (یونہ باب ۲ آیت ۱۰) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ یونہ نبی کا معجزہ یہ تھا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات زندہ رہا نہ یہ کہ مرنے کے بعد جی اٹھا۔ یعنی بائیبل اس امر کو پیش نہیں کرتی کہ دیکھو یونہ خدا کا سچا نبی تھا کیونکہ وہ مر کر زندہ ہو گیا بلکہ بائیبل یونہ نبی کا معجزہ یہ پیش کرتی ہے کہ وہ زندہ ہونے کی حالت میں مچھلی کے پیٹ میں گیا اور پھر زندہ ہونے کی حالت میں ہی اس کے پیٹ میں رہا۔ حالانکہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں گیا ہے ہوسکتا تھا کہ مچھلی اسے چبانے کی کوشش کرتی اور وہ مر جاتے۔ اگر مچھلی اس وقت یونہ کو چبا لیتی تو وہ زندہ کس طرح رہتا؟ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ بغیر چبانے کے وہ آپ کو نگل گئی۔ پھر دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ گو وہ زندہ اس کے پیٹ میں چلے جاتے مگر اندر جا کر ہلاک ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے پیٹ میں بھی ان کے لئے ہوا کا ایسا ذخیرہ رکھا کہ باوجود تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے وہ زندہ رہے اور پھر زندہ ہونے کی حالت میں ہی مچھلی کے پیٹ سے باہر آ گئے۔ حالانکہ مچھلی کے اُگلتے وقت بھی یہ خطرہ ہوسکتا تھا کہ اس کے گلے کے دباؤ سے آپ مر جاتے مگر خدا تعالیٰ نے ہر مرحلہ پر آپ کی حفاظت کی اور جب مچھلی نے آپ کو اُگلا اس وقت بھی خدا نے آپ کی حفاظت کی نہ نگلتے وقت اس نے آپ کو چبایا نہ اگلتے وقت اس نے آپ کو چبایا۔ نہ پیٹ میں رہتے وقت ہوا کا ذخیرہ کم ہوا۔ پس یونہ نبی کا معجزہ کیا ہے؟ اس کا یہ معجزہ نہیں کہ وہ مر کر زندہ ہو گیا بلکہ اس کا معجزہ یہ ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں جانے سے پہلے جو خطرناک حادثہ ہوسکتا تھا اس سے بچے رہے پھر پیٹ میں جا کر یہ خطرہ ہوسکتا تھا کہ آپ کو ہوا نہ پہنچتی اور دم گھٹ جانے کی وجہ سے آپ ہلاک ہو جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی ایسا

سامان کیا کہ آپ بچے رہے۔اس کے بعد جب مچھلی نے آپ کو اُگلا اس وقت بھی یہ خطرہ ہوسکتا تھا کہ آپ ہلاک ہوجاتے۔اُگلتے وقت بھی خدا تعالیٰ نے آپ کو اس حادثہ سے بچالیا۔پس مرکر زندہ ہونا یونہ نبی کا معجزہ نہیں بلکہ ان تین مقامات پر یونہ نبی کا زندہ رہنا اس کی صداقت کا عظیم الشان نشان تھا۔پس مسیحؑ اگر یہی معجزہ اپنی قوم کو دکھانا چاہتا تھا تو اس کے معنے یہ تھے کہ وہ یونہ کی طرح زندہ ہی قبر میں جائے گا۔زندہ ہی وہاں رہے گا اور زندہ ہی قبر سے نکلے گا۔ بہرحال اس کی صداقت اس بات سے وابستہ تھی کہ وہ ان تین مقامات پر موت سے محفوظ رہتا اور یہی وہ نشان تھا جس کے دکھائے جانے کا آپ نے یہود کے سامنے اعلان کیا اور بتایا کہ جس چیز کے ذریعہ میں قبر میں جاؤں گا وہ ہمیشہ موت کا موجب ہوتی ہے مگر میرے لئے وہ موت کا موجب نہیں ہوگی۔ پھر قبر میں رکھا جانا موت کا موجب ہوتا ہے۔مگر باوجود اس کے کہ مجھے قبر میں رکھا جائے گا پھر بھی میں نہیں مروں گا۔ بلکہ جس طرح یونہ مچھلی کے پیٹ میں تین رات دن رہنے کے باوجود بچ گیا اسی طرح میں بھی قبر میں تین رات دن رہنے کے باوجود زندہ رہوں گا۔ پھر تیسرا نشان یہ ہوگا کہ میں اس قبر میں سے زندہ نکل آؤں گا۔حالانکہ کسی سرکاری مجرم کا جسے پھانسی کا حکم دیا جاچکا ہو زندہ نکل کر بھاگ جانا اس کے لئے بہت بڑے خطرات کا موجب ہوسکتا ہے اور گورنمنٹ اسے پھر گرفتار کرکے سزا دے سکتی ہے۔مگر آپ فرماتے ہیں جس طرح یوناہ نبی کو مچھلی نے زندہ اُگلا اسی طرح میں بھی قبر میں سے زندہ نکل آؤں گا۔ یونہ نبی کے متعلق بھی یہ خطرہ تھا کہ اُگلتے وقت مچھلی اسے ہلاک کردے مگر خدا تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا اور وہ سلامتی کے ساتھ اس کے پیٹ میں سے نکل آیا۔اسی طرح میرے متعلق بظاہر یہ خطرہ ہوگا کہ گورنمنٹ مجھے گرفتار کرلے مگر یونہ نبی کی طرح خدا میرے لئے ایسے سامان پیدا کردے گا کہ میں بغیر کسی خطرہ کے زندہ نکل آؤں گا اور کوئی شخص مجھے پکڑ کر مار نہیں سکے گا۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مسیحؑ کے قبر میں جانے کا راستہ اس کا صلیب پر کھینچا جانا تھا۔ پس اگر مسیحؑ کی یہ پیشگوئی صحیح تھی تو اس کے معنے صرف یہ تھے کہ مسیحؑ یہ پیشگوئی کرتا ہے کہ صلیب جو موت کا ذریعہ ہے اس پر لٹک کر بھی میں زندہ بچ رہوں گا اور جس طرح مچھلی نے یونہ کو چبا کر مارا نہیں بلکہ اسے زندہ پیٹ میں اتار دیا اسی طرح صلیب مجھے مارے گی نہیں بلکہ زندہ ہی مجھے قبر میں بھجوادے گی۔ دوسرا ذریعہ موت کا قبر ہوتی ہے۔اس کے متعلق مسیح یہ پیشگوئی کرتا ہے کہ جس طرح یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا میں زمین کے پیٹ میں زندہ رہوں گا اور پھر تیسری پیشگوئی مسیح یہ کرتا ہے کہ جس طرح یونہ نبی مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا اور خدا نے آخری مرتبہ بھی اسے موت سے محفوظ رکھا۔اسی طرح میرے ساتھ واقعہ ہوگا میں بھی

زمین کے پیٹ میں سے زندہ نکلوں گا اور کوئی شخص مجھے گرفتار کر کے ہلاک نہیں کر سکتا۔

چونکہ یہ مضمون مسیحؑ کی وفات کا نہیں میں تفصیل میں نہیں جاتا مگر اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ مسیحی روایات کے مطابق مسیحؑ کو صرف دو تین گھنٹے صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ چنانچہ انجیل سے ثابت ہے کہ چھٹے پہر سے نویں پہر تک ان کو صلیب پر رکھا گیا (متی باب ۲۷ آیت ۴۵ تا ۵۴) اور یہ صرف تین گھنٹے بنتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ اندازہ بھی پورے طور پر صحیح نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ آپ کو صلیب پر لٹکانے کے بعد بڑے زور سے آندھی آ گئی تھی اور چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی تھی اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ آندھی اور تاریکی کی وجہ سے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر سے اتارنے کا وقت لوگوں پر پوشیدہ رہا ہو اور انہوں نے قیاس سے کام لے کر وقت کی تعیین نویں پہر تک کر دی ہو۔ لیکن بہرحال اگر اس کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ صرف تین گھنٹے بنتے ہیں حالانکہ صلیب پر تین دن سے سات دن تک لٹکانے سے بھی لوگ نہیں مرتے تھے۔

ہمارے ملک میں عام طور پر لوگ صلیب کے یہ معنے سمجھتے ہیں کہ سینہ کی ہڈیوں اور ہاتھوں اور پاؤں کی ہڈیوں میں میخیں گاڑ دی جاتی تھیں اور انسان فوری طور پر ہلاک ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ صلیب جس پر انسان کو لٹکایا جاتا تھا اس شکل کی ہوا کرتی تھی۔

✞

جب کسی شخص کو صلیب پر لٹکانا ہوتا تھا تو اسے کھڑا کر کے اس کے بازوؤں کو دائیں بائیں دو ڈنڈوں کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور پھر اس کے بازوؤں کے نرم عضلات میں کیل گاڑ دیئے جاتے تھے۔ اسی طرح ٹانگوں کی ہڈیوں میں نہیں بلکہ ان کے گوشت میں میخیں گاڑ دیتے تھے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ٹانگوں، ہاتھوں اور سینہ کی ہڈیوں میں کیل گاڑے جاتے تھے اور چونکہ ہڈیوں میں کیل گاڑنا واقعہ میں ایسا خطرناک امر ہے کہ انسان اس کے بعد زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے وہ خیال کرتے ہیں کہ جو شخص صلیب پر لٹکایا جاتا ہوگا وہ جلدی ہی ہلاک ہو جاتا ہوگا۔ مگر یہ درست نہیں۔ جسم کی ہڈیوں میں نہیں بلکہ بازوؤں کے نرم عضلات میں کیل گاڑے جاتے تھے۔ اسی طرح ٹانگوں کی ہڈیوں کے نیچے جو گوشت ہوتا ہے اس میں کیل گاڑے جاتے تھے۔ بے شک یہ ایک تکلیف دہ چیز تھی مگر فوری طور پر موت کا موجب نہیں ہوسکتی تھی۔ بلکہ جو لوگ قوی اور مضبوط ہوتے تھے وہ بعض دفعہ سات سات دن تک بھی نہیں مرتے تھے اور جو لوگ مرتے تھے ان میں سے اکثر فاقہ کی وجہ سے مرا کرتے تھے یا اس وجہ سے کہ زخموں میں کیڑے پڑ جاتے اور ان کا زہر ہلاکت کا موجب بن جاتا۔ وہ ڈاکو یا باغی وغیرہ جو ساتویں دن تک بھی زندہ رہتے

تھے ان کے متعلق دستور یہ تھا کہ ہتھوڑے مار مار کر ان کی ہڈیاں توڑی جاتی تھیں۔ اور اس طرح ان کو ہلاک کیا جاتا۔ دراصل صلیب کے معنے بھی یہی ہیں کہ ہڈی توڑ کر گودا باہر نکال دینا اور یہ نام اس لئے رکھا گیا تھا کہ اکثر لوگ صلیب پر مرتے نہیں تھے بلکہ بعد میں ان کی ہڈیاں توڑ کر گودا نکالا جاتا تھا۔ یہ لفظ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ صلیب پر جلدی موت واقعہ ہو جاتی تھی۔

پھر مسیحؑ کی صلیب کے وقت اور بھی کئی غیر معمولی واقعات ہوئے۔ اوّل جب مسیحؑ پر مقدمہ ہوا تو پیلاطوس جس کے پاس فیصلہ کے لئے یہ مقدمہ تھا اس کی بیوی نے ایک منذر رؤیا دیکھا جس کی بنا پر اس نے پیلاطوس کو کہلا بھیجا کہ ’’تو اس راستباز سے کچھ کام نہ رکھ کیونکہ میں نے آج خواب میں اس کے سبب بہت دکھ اٹھایا ہے‘‘ (متی باب ۲۷ آیت ۱۹)۔ پیلاطوس نے حضرت مسیحؑ کو چھوڑنے کی بہت کوشش کی مگر یہودیوں نے اصرار کیا کہ ہم اسے ضرور سزا دلوائیں گے اور چونکہ حضرت مسیحؑ پر باغی ہونے کا الزام تھا۔ یہودیوں نے اسے دھمکی دی کہ اگر تم نے اسے چھوڑ دیا تو ہم تم پر یہ الزام لگائیں گے کہ تم نے ایک باغی کا ساتھ دیا ہے۔ جب اسے سخت مجبور کیا گیا تو اس نے ’’پانی لے کر بھیڑ کے آگے اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں اس راستباز کے خون سے پاک ہوں۔ تم جانو۔ تب سب لوگوں نے جواب میں کہا اس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد پر ہو‘‘ (متی باب ۲۷ آیت ۲۴، ۲۵)۔

دوسرے پیلاطوس نے مسیحؑ کو ایسے وقت میں پھانسی کا حکم دیا جبکہ دوسرے دن سبت تھا۔ (مرقس باب ۱۵ آیت ۴۲) میں بتا چکا ہوں کہ جس شخص کو صلیب پر لٹکایا جاتا تھا وہ جلدی نہیں مرتا تھا بلکہ تین سے سات دن تک زندہ رہتا تھا اور بعض لوگ سات دن کے بعد بھی زندہ رہتے تھے۔ ایسے لوگوں کی ہڈیاں توڑ کر ان کو ہلاک کیا جاتا تھا۔ بہرحال ایک دو دن تک صلیب پر لٹکنے کی وجہ سے کوئی شخص مرتا نہیں تھا۔ بے شک زخموں کی وجہ سے انہیں تکلیف ہوتی تھی مگر یہ تکلیف ان کی موت کا موجب نہ بنتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چوروں اور ڈاکوؤں سے بعض دفعہ مقابلہ ہوتا ہے تو کئی لوگوں کے سر پھٹ جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ پانچ پانچ سات سات دن تک زیر علاج رہتے ہیں اور پھر ان میں سے بھی کئی بچ جاتے ہیں۔ بہرحال اس قسم کے زخم فوری ہلاکت کا موجب نہیں ہوتے۔ حضرت مسیحؑ اسی صورت میں صلیب پر فوت ہو سکتے تھے جب انہیں ساتؔ دن تک صلیب پر لٹکا رہنے دیا جاتا اور پھر ان کی ہڈیاں بھی توڑی جاتیں۔ مگر پیلاطوس چونکہ مسیحؑ کے ساتھ تھا اس لئے اس نے مسیحؑ کی صلیب کے لئے ایسا وقت مقرر کیا جبکہ دوسرے دن سبت تھا اور یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر سبت کے دن کوئی شخص پھانسی پر لٹکا رہے تو ساری قوم لعنتی ہو جاتی ہے (استثناء باب ۲۱ آیت ۲۲، ۲۳)۔ بہرحال جب پیلاطوس سے اصرار کیا گیا کہ مسیحؑ کو ضروری پھانسی دی جائے۔ تو

اس نے حکم دے دیا کہ اس کو ابھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور ظہر کے قریب کا وقت تھا۔ بلکہ ظہر کا وقت بھی ڈھل چکا تھا جب حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ عصر کے قریب تیز آندھی آ گئی۔ وہ اتنی تیز تھی کہ اس نے تمام جوّ کو اندھیرا کر دیا۔ اس وقت بعض نے کہا کہ اگر اسی حالت میں شام ہو گئی اور ہمیں وقت کا علم نہ ہو سکا تو چونکہ شام سے سبت کا آغاز ہو جائے گا اس لئے ساری قوم لعنتی ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ ان کو جلدی صلیب سے اتار لیا جائے ایسا نہ ہو کہ شام کا وقت ہو جائے یسوع صلیب پر لٹکا رہے اور ساری قوم پر لعنت پڑ جائے۔

اس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہودیوں نے کیوں یہ اعتراض نہ کیا کہ مسیحؑ کو جمعہ کے دن صلیب پر لٹکایا نہ جائے بلکہ کسی اور دن اسے صلیب دیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہود کا پہلو کمزور تھا اگر وہ کہتے کہ جمعہ کے دن مسیحؑ کو صلیب نہ دی جائے تو چونکہ مسیحؑ پر بغاوت کا الزام تھا پیلاطوس ان کو کہہ سکتا تھا کہ اگر اس دوران میں یہ شخص بھاگ گیا یا اس کو ماننے والے اس کو چھڑا کر لے گئے تو اس کا کون ذمہ دار ہو گا اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کا یہود کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔ دوسرے چونکہ قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص صلیب پر نہ مرتا تو اس کی ہڈیاں توڑ کر اس کو مار دیا جاتا تھا۔ اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ صلیب پر زندہ رہا تب بھی اس کی ہڈیاں توڑی جائیں گی۔ ہمیں اس وقت یہ سوال نہیں اٹھانا چاہیے کہ جمعہ کو اسے صلیب پر نہ لٹکایا جائے کیونکہ ہم نے اس پر الزام یہ لگایا ہے کہ یہ حکومت کا باغی ہے اگر ہم نے سزا کی التواء کے متعلق کوئی سوال اٹھایا تو پیلاطوس کہے گا کہ حکومت کے باغی کو تو فوراً مارنا چاہیے تم یہ سوال کیوں اٹھاتے ہو کہ اسے ابھی زندہ رہنے دیا جائے اور ایک دو دن گزرنے کے بعد اسے صلیب پر لٹکایا جائے۔ بہرحال یہود نے کوئی مزاحمت نہ کی اور حضرت مسیحؑ کو جمعہ کے دن پچھلے پہر صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ مگر چونکہ پیلاطوس دل سے مسیحؑ کا خیر خواہ تھا اور اپنی بیوی کے خواب کی وجہ سے وہ ڈر بھی چکا تھا اس لئے اس نے مسیحؑ کو صلیب دیتے وقت فوج کا ایک ایسا دستہ مقرر کیا جس کا افسر خود مسیحؑ کا مرید تھا۔ اسی طرح پہرہ داروں اور پولیس کے حاضر الوقت سپاہیوں میں سے بھی بعض حضرت مسیحؑ کے مرید تھے۔ چنانچہ اس کا ظاہری ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ درد کی شدت کی وجہ سے چلائے تو پہرہ داروں میں سے ایک نے جلدی سے اسفنج کا ایک ٹکڑا لیا اور اسے شراب اور مُر سے بھگو کر حضرت مسیحؑ کو چوسنے کے لئے دیا۔ پادری لوگ دانستہ یا ناواقفیت سے جب واقعہ صلیب کے متعلق تقریر کرتے ہیں تو جس طرح شیعہ لوگ واقعات کربلا کو زیادہ سے زیادہ دردناک رنگ میں پیش کرتے ہیں اور معمولی باتوں کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کر دیتے ہیں اسی طرح وہ بھی بعض دفعہ تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں دیکھو خدا کے بیٹے سے کس قدر دشمنی کی گئی کہ جب وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھا اور شدت درد کی وجہ سے کراہ

رہا تھا تو اس وقت کم بخت ظالموں نے شراب اور مُر میں اسفنج بھگو کر اس کے مونہہ میں ڈالا اور اس طرح آخری وقت میں اسے اور زیادہ تکلیف اور دکھ میں ڈالا۔ حالانکہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ صلیب پر لٹکائے جانے والوں میں سے جب کسی کی رعایت منظور ہوتی اور اس کی تکلیف کو کم کرنا مناسب سمجھا جاتا تو اسے شراب اور مُر کا مرکب پلایا جاتا تھا (Jewish Encyclopedia under the word Crucifixion)۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ اناجیل میں شراب اور مُر کا ذکر نہیں آتا بلکہ اتنا ذکر آتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ شدت درد کی وجہ سے چلائے تو ’’ایک نے دوڑ کر اسفنج کو سرکے میں بھگو کر اور ایک نرکٹ پر رکھ کے اسے چسایا‘‘ (مرقس باب ۱۵ آیت ۳۶)۔ مگر سرکہ میں بھگو کر اسفنج منہ میں دینا اس زمانہ کے دستوروں میں کہیں ثابت نہیں۔ پھر وجہ کیا ہے کہ وہاں سرکہ اور اسفنج رکھا تھا۔ کیا لوگ بلا وجہ سرکہ اور اسفنج ساتھ رکھا کرتے ہیں؟ کیا کسی مجلس میں سرکہ اور اسفنج طلب کیا جائے تو فوراً مل جائے گا؟ پس یہ روایت دیدہ و دانستہ یا حقیقت سے ناواقفی کی وجہ سے بیان کی گئی ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ اس زمانہ کے خیال کے مطابق کہ زخموں کی تکلیف دور کرنے کے لئے مُر اور شراب دینی چاہیے حضرت مسیحؑ کے مریدوں نے اس جگہ شراب اور مُر رکھے ہوئے تھے۔ جب وہ شدت درد سے چلائے تو انہوں نے دوڑ کر اسفنج اس میں بھگو کر چسا دیا (دیکھو جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۴ زیر لفظ صلیب)۔ اس حوالہ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

The details given in the New Testament accounts (Matt. XXVII) of the crucifixion of Jesus agree on the whole with the procedure in vogue under Roman Law. Two modifications are worthy of note:

(1) In order to make him insensible to pain a drink (Matt. XXVII) was given him. This was in accordance with the humane Jewish provision (Maimonides, "Yad, Sanh XIII, Sanh 43A)

(2) The Beverage was a mixture of Myrrh and wine, given "so that the delinquent might lose clear, consciousness through the ensuing intoxication".

(Jewish Encyclopedia under the word Crucifixion)

یعنی انجیل میں یسوع کے صلیب پر لٹکائے جانے کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ عام طور پر اس رومن قانون

کے مطابق معلوم ہوتی ہے جو ان دنوں رائج تھا۔ صرف دو فرق ایسے ہیں جو خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔ پہلا فرق یہ ہے کہ یسوع مسیحؑ کو درد کی طرف سے بے حس کرنے کے لئے ایک دوائی دی گئی جس کا پلایا جانا یہودیوں کے ایک ہمدردانہ قانون کے مطابق تھا۔ یہ دوا جو پلائی جاتی تھی مُر اور شراب کا ایک مرکب ہوتی تھی اور اس لئے دی جاتی تھی تاکہ سزا پانے والے مجرم میں احساس درد باقی نہ رہے اور نشہ کی وجہ سے اسے تکلیف محسوس نہ ہو۔ پس گو انجیل میں یہ لکھا ہے کہ اسفنج کو سرکہ میں بھگو کر حضرت مسیحؑ کو چوسنے کے لئے دیا گیا مگر دراصل یہ سرکہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک دوا تھی جو شراب اور مُر کو ملا کر تیار کی جاتی تھی اور یہ مرکب خاص اور اہم لوگوں کو زخموں کی تکلیف کم کرنے کے لئے دیا جاتا تھا۔ حضرت مسیحؑ کو بھی پہرہ دار نے یہ مرکب دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہرہ دار جو کہ اس موقعہ پر پیلاطوس کی طرف سے مقرر کئے گئے تھے حضرت مسیحؑ کے مرید تھے اور وہ چاہتے تھے کہ حضرت مسیحؑ کی تکلیف کو جس قدر ہو سکے کم کیا جائے۔ اسی طرح پیلاطوس کا حضرت مسیحؑ کو جمعہ کے دن کے آخری حصہ میں صلیب پر لٹکانا اس بات کا ایک بین ثبوت ہے کہ پیلاطوس دل سے چاہتا تھا کہ حضرت مسیحؑ صلیب سے بچ جائیں۔ اس لئے اس نے سبت کے قریب کے دن کے آخری حصہ میں آپ کو صلیب دینے کا حکم دیا تاکہ قلیل سے قلیل عرصہ آپ صلیب پر رہیں اور اس طرح آپ ہلاکت سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا نے بھی اس بات کو لیا ہے کہ یہ بالکل غیر معمولی اور خلاف قاعدہ فعل تھا جس کا پیلاطوس نے ارتکاب کیا۔ لکھا ہے۔

"The greatest difficulty from the point of view of the Jewish Panel procedure is presented by the day and time of the execution. According to the Gospels, Jesus died on Friday the eve of Sabbath. Yet on that day, in view of the approach of the Sabbath (or holiday), executions lasting until late in the afternoon were almost impossible. (Sifre, II-221: Sanh. 35B: Mekilta to Wayakhel).

(Jewish Encyclopedia Under Word Crucifixion)

یعنی سب سے بڑی مشکل جو یہودی قانونِ تعزیر کے سلسلہ میں ہمارے سامنے پیش آتی ہے وہ اس وقت اور دن کی تعیین سے تعلق رکھتی ہے جس میں یسوع مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ انجیل کے رو سے یسوع جمعہ کے دن سبت کی شام کو مرا حالانکہ یہودی قانون کے مطابق اس دن کوئی شخص صلیب پر لٹکایا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ سبت کے قرب کی

وجہ سے بعد دو پہر مجرموں کو کافی دیر تک صلیب پر لٹکائے رکھنا قریباً ناممکن تھا۔

گویا جیوش انسائیکلو پیڈیا والا نہ صرف جمعہ کے دن حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکانا ایک عجیب بات سمجھتا ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ صلیب پر اس دن زیادہ دیر تک کوئی شخص لٹکایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس بنا پر ہمارا حق ہے کہ اگر انجیل یہ کہتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کو تین گھنٹے صلیب پر لٹکایا گیا تو ہم یہ کہیں کہ آپ کو صرف ڈیڑھ دو گھنٹے لٹکایا گیا تھا۔ کیونکہ سبت کے قرب کی وجہ سے زیادہ دیر تک کسی شخص کو صلیب پر لٹکایا نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال اگر دو یا تین گھنٹے آپ کو لٹکایا گیا تب بھی اس سے آپ کی موت واقع نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ صلیب پر بعض دفعہ سات سات دن تک بھی لوگ زندہ رہتے تھے اور وہ اس وقت تک نہیں مرتے تھے جب تک ہتھوڑے مار مار کر ان کی ہڈیوں کا گودا نہ نکالا جاتا۔

دوسرا ثبوت اس امر کا کہ پیلاطوس نے حضرت مسیحؑ کو بچانے کے لئے صلیب کے وقت بعض ایسے افسروں کی وہاں ڈیوٹیاں مقرر کر دی تھیں جو حضرت مسیحؑ پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ ہے کہ انجیل میں لکھا ہے جب حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا تو ''وے جو ادھر سے جاتے تھے سر ہلاتے تھے اور یہ کہہ کے اسے ملامت کرتے تھے کہ واہ تو جو ہیکل کو ڈھاتا اور تین دن میں بناتا تھا اپنے تئیں بچا اور صلیب پر سے اتر آ۔ اسی طرح سردار کاہنوں نے بھی آپس میں فقیہوں کے ساتھ ٹھٹھے کرتے ہوئے کہا اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں بچا نہیں سکتا۔ بنی اسرائیل کا بادشاہ مسیحؑ اب صلیب پر سے اتر آوے تا کہ ہم دیکھیں اور ایمان لاویں''۔ (مرقس باب ۱۵ آیت ۲۹ تا ۳۲)۔ غرض بقول انجیل اس وقت لوگ آپ پر مذاق کر رہے تھے اسی دوران میں حضرت مسیحؑ شدت درد کی وجہ سے چلائے اور بقول بائیبل انہوں نے ''دم توڑ دیا''۔ اس وقت کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے انجیل میں لکھا ہے ''اس صوبہ دار نے جو اس کے سامنے کھڑا تھا اسے یوں چلاتے اور دم چھوڑتے دیکھ کے کہا کہ یہ شخص سچ مچ خدا کا بیٹا تھا'' (مرقس باب ۱۵ آیت ۳۹)۔ اب بتاؤ کیا یہ الفاظ کوئی ایسا شخص کہہ سکتا تھا جو حضرت مسیحؑ کا مخالف ہوتا۔ اگر وہ آپ کو فقیہوں اور فریسیوں کی طرح جھوٹا سمجھتا تو اسے کہنا چاہیے تھا کہ دیکھو آج ثابت ہو گیا ہے کہ یہ شخص خدا کا بیٹا نہیں تھا۔ ہم نے اسے صلیب پر لٹکایا اور اس کی جان لے لی۔ مگر وہ یہ نہیں کہتا وہ آپ پر ہنسی نہیں اُڑاتا، وہ آپ کے دعویٰ کی تکذیب نہیں کرتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ ''یہ شخص سچ مچ خدا کا بیٹا تھا''۔ یہ اس امر کا ایک واضح اور کھلا ثبوت ہے کہ صلیب کے وقت پیلاطوس نے ارادتاً ایسے افسر اور سپاہی مقرر کئے تھے جو حضرت مسیحؑ پر ایمان لا چکے تھے تا کہ آپ کی تکلیف کو وہ زیادہ سے زیادہ کم کر سکیں اور صلیب سے اتارنے کے بعد آپ کی حفاظت اور علاج میں وہ حصہ لے سکیں۔ بہرحال مسیحؑ بوجہ نازک

بدن ہونے کے بے ہوش ہو گئے۔ اتنے میں آندھی آئی اور مسیحؑ کو اتار لیا گیا تا کہ کہیں سبت نہ آ جائے۔ جب آپ کو اور ان چوروں کو بھی اتار لیا گیا جن کو آپ کے ساتھ ہی صلیب پر لٹکایا گیا تھا تو قاعدہ کے مطابق ساتھ کے چوروں کی ہڈیاں توڑ دی گئیں مگر افسر پولیس چونکہ حضرت مسیحؑ کا مرید تھا جیسا کہ مرقس باب ۱۵ آیت ۳۹ اور متی باب ۲۷ آیت ۵۴ سے ظاہر ہے۔ اس نے یہ چالاکی کی کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق کہہ دیا یہ تو مر گیا ہے اس کی ہڈیاں توڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ انجیل میں صاف لکھا ہے کہ ''سپاہیوں میں سے ایک نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے لہو اور پانی نکلا'' (یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۴)۔ لہو اور پانی کا نکلنا بتا رہا ہے کہ آپ زندہ تھے اگر فوت ہو چکے ہوتے تو آپ کا خون جم جانا چاہیے تھا۔ لیکن لہو اور پانی نکلنے کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ درحقیقت ان کے جسم میں سے بہتا ہوا خون نکلا۔ مگر حضرت مسیحؑ چونکہ اس وقت بے ہوش تھے اس سپاہی نے لوگوں کو دھوکا میں مبتلا رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ آپ فوت ہو چکے ہیں۔

اس کے فوراً بعد یوسف آریمتا جو حضرت مسیحؑ کے مرید تھے پیلاطوس کے پاس گئے اور اس سے اجازت لی کہ لاش میرے حوالے کی جائے چنانچہ پیلاطوس نے حکم دے دیا کہ لاش یوسف آرمیتہ کو دے دی جائے (متی باب ۲۷ آیت ۵۸) لاش پر قبضہ کرنے کے بعد یوسف آرمیتہ نے ایک کھلی کوٹھڑی جیسی قبر میں ان کو بند رکھا جو زمین میں کھودی ہوئی نہ تھی بلکہ کوٹھڑی کی طرح چٹان میں کھدی ہوئی تھی اس میں ان کے جسم کو رکھ کر اس کے سامنے پتھر رکھ دیا گیا۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ہوا کا راستہ کھلا رکھا گیا۔ چنانچہ لکھا ہے: ''یوسف نے لاش لے کر سوتی صاف چادر میں لپیٹی اور اپنی نئی قبر میں جو چٹان میں کھودی تھی رکھی اور ایک بھاری پتھر قبر کے مونہہ پر ڈھلکا کے چلا گیا'' (متی باب ۲۷ آیت ۵۹، ۶۰) ''جیوش انسائیکلو پیڈیا'' نے بھی اس سوال کو خاص طور پر اٹھایا ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے۔

Bodies of delinquents were not buried in private graves (snah:vi:5) while that of Jesus was buried in a sepulcher belonging to Joseph of Arimathea.(Jewish Encyclopaedia vol.4, p.373)

(Jewish Encyclopedia Under Word Crucifixion)

یعنی مجرموں کی لاشیں خاص قبروں میں نہیں دفنائی جاتی تھیں لیکن یسوع مسیحؑ کے ساتھ یہ امتیازی سلوک روا رکھا گیا کہ اس کی نعش یوسف آریمتا کی مملوکہ ایک کھلی کوٹھڑی میں رکھی گئی۔ یہود کو اس پر شبہ ہوا اور انہوں نے پیلاطوس سے

شکایت کی کہ تیسرے دن تک قبر کی نگرانی کی جائے چنانچہ لکھا ہے ’’دوسرے روز جو تیاری کے دن کے بعد ہے سردار کاہنوں اور فریسیوں نے مل کر پیلاطوس کے پاس جمع ہو کے کہا کہ اے خداوند ہمیں یاد ہے کہ وہ دغاباز اپنے جیتے جی کہتا تھا کہ میں تین دن بعد جی اٹھوں گا۔ اس لئے حکم کر کہ تیسرے دن تک قبر کی نگہبانی کریں‘‘ (متی باب ۲۷ آیت ۶۲ تا ۶۴) اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی یہ پیشگوئی کہ یہود کو وہی نشان دکھایا جائے گا جو یونس نبی کے ذریعہ ظاہر ہوا لوگوں میں خوب مشہور ہو چکی تھی اور حواری اس پیشگوئی کے مطابق ہر ایک سے یہ کہتے پھرتے تھے کہ جس طرح یونس تین رات دن کے بعد مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکل آیا اسی طرح مسیحؑ بھی تین رات اور دن کے بعد زندہ ہو جائے گا۔ اس پیشگوئی کی بناء پر یہود سمجھتے تھے کہ تین دن اور رات گذرنے کے بعد حواریوں نے کہہ دینا ہے کہ دیکھو مسیحؑ زندہ ہو گیا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ پیلاطوس کو ابھی سے کہہ دیا جائے کہ جس کوٹھڑی میں مسیحؑ کی لاش کو رکھا گیا ہے اس پر تین دن تک پہرہ لگا دیا جائے تاکہ مسیحؑ کی یہ بات پوری نہ ہو سکے کہ میں یونس نبی کی طرح تین رات اور دن گذرنے کے بعد زندہ نکل آؤں گا۔ مگر پیلاطوس چونکہ اندر سے مسیحؑ کے ساتھ تھا۔ اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں سرکاری پہرے دار مقرر نہیں کر سکتا ’’تمہارے پاس پہرے والے ہیں جا کے مقدور بھر اس کی نگہبانی کرو‘‘ (متی باب ۲۷ آیت ۶۵) یعنی تم خود پہرہ دیتے رہو میں سرکاری طور پر اس بارہ میں کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ پیلاطوس کی اس انکار سے غرض یہ تھی کہ اگر حکومت کی طرف سے وہاں پہرے دار مقرر کئے گئے تو اس صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکل نہیں سکیں گے اور اگر پہرے داروں کا مقابلہ کر کے نکلے تو چونکہ وہ حکومت کی طرف سے مقرر ہوں گے ان کا مقابلہ حکومت کا مقابلہ سمجھا جائے گا اور انہیں اور زیادہ مشکلات پیش آ جائیں گی۔ لیکن اگر عام لوگ پہرہ پر ہوئے تو ان کا مقابلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ مسیحؑ کے حواری ان سے لڑیں گے اور مسیحؑ کو نکال کر لے جائیں گے۔ اس حکمت کے ماتحت اس نے سرکاری پہرہ لگانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں پولیس مقرر نہیں کر سکتا۔ اگر تم اس کی نگرانی کرنا ضروری سمجھتے ہو تو خود پہرہ لگا لو۔ جب اتوار کی صبح کو پو پھٹتے وقت کچھ عورتیں وہاں گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں مسیحؑ نہیں ہیں اور ایک فرشتہ چٹان پر بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے ’’سبت کے بعد جب ہفتہ کے پہلے دن پو پھٹنے لگی مریم مگدلینی اور دوسری مریم قبر کو دیکھنے آئیں اور دیکھو کہ ایک بڑا بھونچال آیا تھا کیونکہ خداوند کا فرشتہ آسمان سے اتر کے آیا اور اس پتھر کو قبر سے ڈھلکا کے اس پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بجلی کا سا اور اس کی پوشاک سفید برف کی سی تھی۔‘‘ (متی باب ۲۸ آیت ۱ تا ۳) میں سمجھتا ہوں فرشتہ کوئی نہ تھا یہ حضرت مسیحؑ تھے جو باہر نکل کر چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے کفن پہنا ہوا تھا۔ بہر حال انجیل کے بیان کے

مطابق فرشتہ نے ان عورتوں سے کہا کہ مسیحؑ جسے تم دیکھنے کے لئے آئی ہو وہ یہاں نہیں ہے بلکہ اپنے حواریوں کے پاس جلیل کو گیا ہے تم جاؤ اور دوسرے حواریوں کو بھی اس امر کی اطلاع دے دو چنانچہ انجیل میں لکھا ہے ”فرشتے نے مخاطب ہو کر ان عورتوں سے کہا تم مت ڈرو میں جانتا ہوں کہ تم یسوع کو جو صلیب پر کھینچا گیا ڈھونڈتی ہو۔ وہ یہاں نہیں ہے کیونکہ جیسا اس نے کہا تھا وہ جی اٹھا ہے آؤ یہ جگہ جہاں خداوند پڑا تھا دیکھو اور جلد جا کے اس کے شاگردوں سے کہو کہ وہ مردوں میں سے جی اٹھا ہے اور دیکھو وہ تمہارے آگے جلیل کو جاتا ہے وہاں تم اسے دیکھو گے دیکھو میں نے تمہیں جتا دیا“ (متی باب ۲۸ آیت ۵ تا ۷) یہ بھی لکھا ہے کہ یہود میں یہ مشہور تھا کہ پہرہ داروں کو رشوت دے کر یہ مشہور کیا گیا کہ وہ زندہ ہو کر چلا گیا ہے (متی باب ۲۸ آیت ۱۱ تا ۱۵) اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ پہرہ داروں نے یہی خبر دی تھی کہ مسیحؑ کے شاگرد زبردستی مسیحؑ کو کوٹھڑی میں سے نکال کر لے گئے ہیں مگر چونکہ یہود حضرت مسیحؑ کو لعنتی ثابت کرنا چاہتے تھے انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پہرہ دار ٹھیک نہیں کہتے ان کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ مسیحؑ زندہ ہو کر چلا گیا ہے۔

پھر لکھا ہے مسیحؑ حواریوں پر ظاہر ہوا اور انہیں کہا کہ ”میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھو کہ میں ہی ہوں اور مجھے چھوؤ۔ اور دیکھو کیونکہ روح کو جسم اور ہڈی نہیں جیسا مجھ میں دیکھتے ہو اور یہ کہہ کے انہیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے“ (لوقا باب ۲۴ آیت ۳۹، ۴۰) اسی طرح لکھا ہے ”جب وے مارے خوشی کے اعتبار نہ کرتے اور متعجب تھے اس نے ان سے کہا کہ کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے تب انہوں نے بھونی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اور شہد کا ایک چھتہ اس کو دیا اس نے لے کے ان کے سامنے کھایا“ (لوقا باب ۲۴ آیت ۴۱ تا ۴۳) یوحنا میں لکھا ہے کہ تھوما حواری نے جب یہ بات سنی کہ حضرت مسیحؑ صلیب سے بچ گئے ہیں تو اسے یقین نہ آیا اور اس نے کہا ”جب تک کہ میں اس کے ہاتھوں میں کیلوں کے نشان نہ دیکھوں اور کیلوں کے نشانوں میں اپنی انگلی نہ ڈالوں اور اپنے ہاتھ کو اس کے پہلو میں بھی نہ ڈالوں ہرگز یقین نہ کروں گا“ (یوحنا باب ۲۰ آیت ۲۵) حضرت مسیحؑ نے یہ بات سنی تو انہوں نے تھوما کو کہا۔ اپنی انگلی پاس لا اور میرے ہاتھوں کو دیکھ اور اپنا ہاتھ پاس لا اور اسے میرے پہلو میں ڈال اور بے ایمان مت ہو بلکہ ایمان لا“ (یوحنا باب ۲۰ آیت ۲۷)

ان دلائل سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق یہ خیال کہ وہ صلیب پر لٹک کر مر گئے تھے بالکل باطل اور بے بنیاد ہے۔ بے شک حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ مگر خدا نے ان کو بچا لیا اور اس طرح وہ نشان ظاہر ہوا جس کا انہوں نے قبل از وقت اعلان کر دیا تھا کہ جس طرح یونہ نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا، زندہ رہا اور زندہ ہی

باہر نکلا۔اسی طرح میں بھی صلیب پر سے زندہ اتروں گا۔زندگی کی حالت میں قبر میں جاؤں گا اور پھر زندہ ہونے کی حالت میں ہی قبر سے باہر نکلوں گا۔

پھر کفارہ کے خلاف ایک اور دلیل یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ جب صلیب سے بچ گئے تو اس کے بعد وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کہیں دوبارہ دشمن ان کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔حالانکہ اگر وہ سچ مچ خدا کے بیٹے تھے یا حواریوں پر حضرت مسیحؑ کی روح ظاہر ہوئی تھی تو روح کو چھپنے کی کوئی ضرورت نہ تھی وہ ہر ایک کے سامنے آتی اور کہتی کہ اگر تم میں طاقت ہے تو مجھے اب مار کر دکھاؤ۔مگر انجیل اس بات پر گواہ ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد وہ دشمن سے چھپتے پھرے۔پس حضرت مسیحؑ کے متعلق عیسائیوں کا یہ خیال کہ وہ بنی نوع انسان کے گناہوں کے لیے کفارہ ہو گئے تھے شروع سے لے کر آخر تک باطل ہے۔

انسانی پیدائش کے متعلق تیسرے نظریے کا رد انسانی پیدائش کے متعلق تیسرا خیال دنیا میں یہ پایا جاتا ہے کہ انسان کسی خاص ملکہ کو لے کر پیدا نہیں ہوا۔وہ اپنی تعلیم و تربیت سے متاثر ہوتا اور اس کے مطابق ہو جاتا ہے گویا وہ حالات سے مجبور ہے۔یہ فرائیڈ اور دوسرے یورپین فلسفیوں کا خیال ہے ان کے نزدیک پیدائشی لحاظ سے انسان جانوروں کی سی حالت رکھتا ہے۔نہ اس میں نیکی کا ملکہ ہوتا ہے اور نہ بدی کا ملکہ ہوتا ہے ہاں جب وہ پیدا ہو جاتا ہے تو اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اگر وہ حالات نیک ہوں تو نیک ہو جاتا ہے اور اگر بد ہوں تو بد ہو جاتا ہے۔بہرحال حالات سے مجبور ہو کر اس میں نیکی اور بدی کی مختلف کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ہم کہتے ہیں اگر تو اس کا یہ مفہوم ہے کہ ہر بچہ اپنی ذات میں بغیر کسی گناہ کے اثر کے پیدا ہوتا ہے لیکن بعد میں حالات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ ان کے نتیجہ میں گندہ اور خراب ہو جاتا ہے تو اسلام کا بھی یہی عقیدہ ہے۔چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ عَلٰی فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ حَتّٰی یُعْرِبَ عَنْهُ لِسَانُهٗ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ (المعجم الکبیر لطبرانی حدیث الاسود بن سریع) ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔اس کے بعد ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔پس اگر فرائیڈ اور دوسرے یورپین فلسفیوں کی تھیوری یہ ہے کہ ہر بچہ فطرت صحیحہ لے کر دنیا میں آتا ہے لیکن اس کے بعد وہ حالات سے مجبور ہو کر بعض دفعہ گندہ اور ناپاک ہو جاتا ہے تو اس نتیجہ کے ہم بھی قائل ہیں اور یہ عین قرآن اور حدیث کے مطابق عقیدہ ہے۔مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا اس کی اصلاح ہو سکتی ہے یا نہیں۔اگر اصلاح نہیں ہو سکتی تو احسن تقویم بے کار ہو گئی لیکن اگر اصلاح ہو سکتی ہے تو پھر خواہ خراب حالات کے اثر سے انسان بگڑ جائے اس کی پیدائش کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا

کہ اس میں نیکی کا کوئی ملکہ ودیعت نہیں کیا گیا۔ اس نقطۂ نگاہ کے ماتحت جب ہم اس تھیوری پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فرائیڈ اور دوسرے یورپین فلسفی خود تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ چنانچہ سائیکو انیلسس (تجزیہ شہوات) ان کا ایک خاص مسئلہ ہے جس کے ماتحت یہ ان لوگوں کا علاج کرنے کے بھی دعوے دار ہیں جو مختلف قسم کے گندے خیالات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

درحقیقت فرائیڈ کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی فطرت کی خرابی اس وقت سے شروع نہیں ہوتی جب وہ کسی فعل کا ارتکاب کرتا ہے بلکہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اسی وقت سے اس کی فطرت کے اندر بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ اور اس کی مختلف حرکات اور سکنات اس کے دل میں غلط یا صحیح جذبات پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً شہوت کا مادہ جو انسان میں پایا جاتا ہے اس کے متعلق فرائیڈ کا نظریہ یہ ہے کہ یہ اس وقت سے پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے جب بچہ ماں کے پستانوں سے دودھ چوستا ہے۔ وہ کہتا ہے ماں کا دودھ چوسنے اور جسم کی باہمی رگڑ سے اسے خاص قسم کا حظ محسوس ہوتا ہے اور شہوانی مادہ اس میں پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ دوسرے پیشاب پاخانہ کرنے کے بعد جب اعضاء کی صفائی کی جاتی ہے تو ہاتھوں کی رگڑ سے اس کے قلب میں شہوانی خیالات کا احساس بڑھنا شروع ہوجاتا ہے۔ پس یہ صحیح نہیں کہ پندرھویں یا سولھویں سال میں بچہ کے اندر شہوانی مادہ پیدا ہوتا ہے بلکہ بقول اس کے بچہ کی پیدائش کے ساتھ ہی یہ احساس مختلف حرکات وسکنات کے نتیجہ میں اس کے قلب میں پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے جو جوانی کے قریب زیادہ مکمل صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس نتیجہ میں بھی ہم فرائیڈ کی تائید کرتے ہیں کیونکہ اسلام بھی یہی نظریہ پیش کرتا ہے کہ بدی اور نیکی کا احساس بچپن میں ہی پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت دی ہے کہ جب بچہ پیدا ہو اسی وقت اس کے کان میں اذان دو کیونکہ اس کی تعلیم اور تربیت کا زمانہ پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے۔ پس اگر فرائیڈ کی اتنی ہی تھیوری ہو تو ہم کہیں گے میاں فرائیڈ اس تھیوری کے تم موجد نہیں بلکہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجد ہیں۔ لیکن ان نتائج کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود ہمارا سوال اس تھیوری کے ماننے والوں سے یہ ہے کہ خواہ تمام خرابیاں بچپن سے ہی انسانی قلب میں پیدا ہو جاتی ہوں سوال یہ ہے کہ جب کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کی اصلاح ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یا فطرت کا وہ بگاڑ جو ماحول کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے کسی اور طریق سے دور ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اگر دور ہوسکتا ہے تو یہ خیال بالکل باطل ہو گیا کہ فطرت نیکی لے کر پیدا نہیں ہوئی۔ بالخصوص سائیکو انیلسس (تجزیۂ شہوات) کے ذریعہ اس تھیوری کے ماننے والوں نے جو طریق علاج تجویز کیا ہے وہ خود اپنی ذات میں اس عقیدہ کو باطل ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

یہ تھیوری جس کا فرائیڈ کو موجد قرار دیا جاتا ہے اس رنگ میں بیان کی جاتی ہے کہ بچے کو پہلا عشق اپنی ماں سے ہوتا ہے لیکن بڑے ہو کر گردوپیش کے حالات کی وجہ سے یا مذہبی لوگوں کی باتیں سن سن کر اس کا یہ خیال دب جاتا ہے اور اس کی بجائے بیوی کی محبت اس کے سامنے آ جاتی ہے لیکن بعض لوگوں کے اندر یہ جذبہ اتنی طاقت پکڑ جاتا ہے کہ بعد میں کوئی اور محبت ان کے جذبۂ محبت پر غالب نہیں آ سکتی۔ ادھر وہ مذہبی لوگوں سے باتیں سنتے ہیں تو انہیں یہ کہتا ہوا پاتے ہیں کہ ماں بیوی نہیں بن سکتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے مذہب کہتا ہے کہ ماں بیوی نہیں بن سکتی اور ادھر وہ محبت جو دودھ چوستے وقت بچہ کے دل میں اپنی ماں کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے اسے ماں کے ساتھ محبت کرنے پر مجبور کر رہی ہوتی ہے۔ ان متضاد خیالات کا اس کی طبیعت مقابلہ نہیں کر سکتی اور وہ کئی قسم کی دماغی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ بے شک بعض دفعہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ اس کی بیماری کی کیا وجہ ہے۔ لیکن سائیکوانیلسس (تجزیۂ شہوات) کے ذریعہ اگر اس کا علاج کیا جائے تو اس کی مخفی مرض کا پتہ چل جاتا ہے اور اس کی بیماری کو آسانی کے ساتھ دور کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ غور کرتے ہوئے انہوں نے سنوٗ کے قریب ایسی باتیں جمع کی ہیں جو ان کے نزدیک بچے پر اثر ڈال کر اسے مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار بنا دیتی ہیں۔ جب کوئی مریض اس طریق علاج کے ماہر کے پاس آتا ہے تو وہ اسے لٹا کر اور اس کے جسم کو ڈھیلا کر کے اس کی نبض پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور ایک ایک کر کے مختلف باتیں اس کے سامنے بیان کرتا چلا جاتا ہے کبھی ماں کی محبت کا ذکر کرتا ہے کبھی باپ کی محبت کا ذکر کرتا ہے۔ کبھی ماں کی محبت کا ذکر کرتا ہے کبھی کسی امر کا اور کبھی کسی امر کا ذکر کرتا ہے اور نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس بات پر اس کی نبض میں غیر معمولی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یہ صاف بات ہے کہ جب کسی ایسی بات کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے انسان کو خاص طور پر دلچسپی ہوتی ہے تو اس کے دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے اور نبض بھی زیادہ جلدی جلدی حرکت کرنے لگتی ہے اس طرح ڈاکٹر معلوم کر لیتا ہے کہ مریض کی بیماری کا اصل باعث کیا ہے اور وہ کیوں بیمار چلا آ رہا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ خیال جائز ہو تو وہ اسے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرے اور اگر نا جائز ہو تو اس خواہش کی قباحت پر اس کے سامنے متواتر لیکچر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کے دل اور دماغ سے وہ خواہش بالکل نکل جاتی ہے اور چونکہ بیماری کا اصل سبب دور ہو جاتا ہے اس کی بیماری جاتی رہتی ہے اور وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ اس طریق علاج کے ماتحت کئی قسم کے تجارب کئے گئے ہیں اور قطعی طور پر ایسے کئی کیس پیش کئے جاتے ہیں جو اور کسی ذریعہ سے اچھے نہ ہوئے لیکن سائیکوانیلسس (تجزیۂ شہوات) کے ماتحت جب ان کا علاج کیا گیا اور ان کی مخفی خواہشات کا علم حاصل کر کے ان کو

پورا کرنے یا ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بالکل اچھے ہو گئے۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ہزاروں لوگ ایسے تھے جو گولہ باری کے صدمات کے نتیجہ میں پاگل ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض تو اور علاجوں سے اچھے ہو گئے مگر بعض ایسے تھے جو کسی علاج سے بھی اچھے نہ ہوئے۔ آخر گورنمنٹ کو خیال پیدا ہوا کہ ان مریضوں کا سائیکو انیلسس (تجزیۂ شہوات) کے ذریعہ کیوں نہ علاج کرایا جائے۔ چنانچہ اس طرح ان کی تشخیص کروائی گئی تو کئی بیماروں کی نسبت معلوم ہوا کہ بظاہر وہ گولہ باری کے صدمہ کے نتیجہ میں پاگل ہوئے تھے۔ لیکن دراصل ان کی بیماری کی وجہ بعض جذباتِ شدیدہ کا پورا نہ ہونا تھا۔ جب ان کی بیماری کی اصل وجہ کا پتہ چل گیا تو اس کے مطابق علاج کرنے پر وہ بالکل اچھے ہو گئے حالانکہ اس سے پیشتر ان کے علاج کے لئے ہر قسم کی دوائیں استعمال کی جا چکی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو اس طریق علاج سے تندرست ہوئے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ بے شک یورپ میں ایسے ہزاروں لوگ ہوں مگر ہمارے ملک میں تو اس قسم کا کوئی مریض نظر نہیں آتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی بیماری نہیں بلکہ ایک مقامی بیماری ہے جو یورپ میں پیدا ہو چکی ہے۔ اگر انسانی بیماری ہوتی تو ہندوستان میں بھی ہوتی۔ مصر میں بھی ہوتی۔ شام میں بھی ہوتی۔ فلسطین میں بھی ہوتی۔ چین اور جاپان میں بھی ہوتی مگر ہمیں دنیا کے اور کسی ملک میں یہ بیماری نظر نہیں آتی اگر آتی ہے تو صرف یورپ میں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یورپ کا مخصوص مرض ہے۔ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یورپ میں عام طور پر چونکہ گند اور خرابی میں لوگ مبتلا رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کے خیالات بھی ناپاک ہوتے ہیں اس لئے وہ اس قسم کے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور خواہشات کے پورا ہو جانے پر وہ اچھے ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں چونکہ عام طور پر خیالات میں پاکیزگی پائی جاتی ہے اور وہ گند یہاں نہیں جو یورپ میں نظر آتا ہے اس لئے یہاں کسی کو سائیکو انیلسس کے ذریعہ اپنا علاج کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پس اگر یوروپین فلسفیوں کی یہ تھیوری درست ہے تب بھی ہم انہیں کہیں گے کہ یہ تمہاری مقامی بیماری ہے بنی نوع انسان کی بیماری نہیں لیکن بفرض محال اگر اسے بنی نوع انسان کی مرض سمجھ لیا جائے۔ تب بھی ہم کہتے ہیں کہ تم نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ خرابی کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ جب تم نے یہ تسلیم کر لیا تو قرآن کی اس آیت کی صداقت ثابت ہو گئی کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ یعنی ہماری سنت یہ ہے کہ ہم انسانی روح کے بیمار ہونے پر اس کو اچھا کرنے کے سامان مہیا کیا کرتے ہیں اور یہی فطرت انسانی کے پاک ہونے کے معنے ہیں کہ خدا نے اس کی ہدایت اور اصلاح کے سامان پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اگر انسان ان سے فائدہ اٹھالے تو وہ پاکیزگی کا جامہ پہن لیتا ہے اور اگر فائدہ نہ

اٹھائے تو حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ بہر حال اسلام یہ کہتا ہے کہ فطرت انسانی کو مستقل طور پر خراب قرار دینا اور اس کے لئے خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ دائمی طور پر مسدود قرار دینا قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد امر ہے۔ خدا نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ خواہ اس میں کتنی ہی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ کتنی کمزوریاں اس میں رونما ہو جائیں پھر بھی اس کے دل کو صیقل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی خرابیوں کو دور کیا جا سکتا ہے اور اسے خدا تعالیٰ کے آستانہ پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ آخر اسلام یہ تو نہیں کہتا کہ فطرتِ انسانی کے نیک ہونے کے یہ معنے ہیں کہ انسان ہمیشہ نیک رہتا ہے۔ اسلام خود حالات کی خرابی کی وجہ سے فطرت کا مسخ ہو جانا تسلیم کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اصلاح کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی شخص اپنی حالت کو بدلنا چاہے۔ برائیوں کو ترک کرنا چاہے۔ نیکیوں کو حاصل کرنا چاہے وہ ایسا کر سکتا ہے کیونکہ خدا نے اس کی فطرت میں نیکی کی استعدادیں رکھی ہوئی ہیں۔ اگر وہ ان سے کام نہیں لیتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ لیکن اگر وہ کام لے گا تو فطرت کی نیکی بہر حال ظاہر ہو کر رہے گی۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوشش کے باوجود اسے ہدایت حاصل نہ ہو یا قربِ الٰہی کے مقام سے وہ دور رہے۔

غرض اسلام ماحول کے اثرات کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلام یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ بچپن سے ہی نیک اور بد اثرات بچہ پر شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ ہر شخص کی اصلاح ممکن ہے۔ فرائیڈ نے جس تھیوری کو پیش کیا ہے اس کے ماننے والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی اصلاح ہو سکتی ہے اور جب وہ اس نکتہ کو تسلیم کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہو گیا کہ فطرت میں خدا نے نیکی کا ملکہ رکھا ہوا ہے اگر نیکی کا ملکہ اس میں نہ ہوتا تو اس کی اصلاح کس طرح ہوتی؟ اسی طرح ہمارا مشاہدہ ہے کہ اکثر لوگ وعظ کا اثر قبول کرتے ہیں اور بڑی بڑی برائیوں کو چھوڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان میں نیکی کا ملکہ نہ ہوتا تو وعظ سے اس پر کیوں اثر ہوتا اور کیوں وہ اپنی برائیوں کو ترک کر کے نیکیوں کے حصول میں مشغول ہو جاتا؟ یہی حال دعا کا ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو خدا کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتے جو ہر قسم کی برائیوں میں لذت محسوس کرتے ہیں جو اپنی زندگی کا مقصد محض دنیوی لذائذ سے لطف اندوز ہونا قرار دیتے ہیں وہ انبیاء پر ایمان لانے اور ان کی دعاؤں اور قوتِ قدسیہ کی برکات سے ایسے بدل جاتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت آتی ہے۔ یہ دونوں راستے جو روحانی اور جسمانی جدوجہد پر مشتمل ہیں دنیا میں ہمیشہ سے کھلے ہیں اور کھلے رہیں گے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا نے انسانی فطرت کو پاکیزہ بنایا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ جن کو نیکی میں ترقی کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملا ان کا کیا حال ہوگا؟ تو یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی فطرت کو خارجی اثرات سے پنپنے کا موقعہ نہیں ملے گا تو اسے پھر موقعہ

دیا جائے گا۔ بہرحال اس سے فطرت کی خرابی نہیں بلکہ حالات کی خرابی ثابت ہوتی ہے اور یہ آیت اسی خیال کو پیش کرتی ہے کہ انسان کی پیدائش احسن تقویم میں ہے یہ نہیں کہتی کہ وہ بدحالات کے ماتحت بھی بدنہیں ہوتا۔

غرض یہ آیات بتاتی ہیں کہ آدمؑ کا آنا۔نوحؑ کا آنا۔موسیٰؑ کا آنا اور ان کا اپنی اصلاحی کوششوں میں کامیاب ہوجانا اور دنیا کا ایک نئے رنگ میں بدل جانا ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے یعنی انسانی پیدائش ایسے اصول پر ہوئی ہے کہ وہ اعتدال کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچ سکتا ہے جیسا کہ اوپر کے واقعات سے ثابت ہے۔ آدمؑ،نوحؑ،موسیٰؑ اور ان کے متبع اس امر کا ثبوت ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئندہ اس بات کا ثبوت بننے والے ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔

انسانی پیدائش کے متعلق چوتھا نظریہ اور اس کا رد چوتھا عقیدہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ گویا وہ قانونِ الٰہی کی وجہ سے برے افعال کرنے پر مجبور ہے اس میں انسان کا کوئی قصور نہیں۔ اسلام اس عقیدہ کو کلی طور پر رد کرتا ہے اور چونکہ اس کو مذہبی لوگ پیش کرتے ہیں۔خصوصاً مسلمانوں کی طرف یہ عقیدہ منسوب ہے اس لیے قرآن کریم سے ہی اس کا رد پیش کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (الفرقان:۶۳) یعنی وہ خدا تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے رات اور دن کو آگے پیچھے آنے والا بنایا ہے۔ مگر اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس بات کا ارادہ کرلیں کہ وہ نصیحت حاصل کریں گے یا ان کے اندر شکر گذاری کا مادہ پایا جاتا ہو۔ اس آیت میں یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی نیکی کا پہلو اتنا کمزور ہوتا ہے کہ وہ شیطانی راہوں پر چلتے چلے جاتے ہیں اور اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں انتباہ کیا جائے اور انہیں برے افعال سے بچنے کی نصیحت کی جائے۔ دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو گو اس روشنی اور نور سے محروم ہوتے ہیں جو مذہب کی اتباع میں انسان کو حاصل ہوتا ہے مگر ان کے اندر جذبۂ شکر گذاری پایا جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی نعماء اور اس کی عطا کردہ قوتوں کا غلط استعمال نہیں کرتے بلکہ ان سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو نیکی اور اخلاق سے حصہ رکھتے ہیں۔ فرماتا ہے ہم نے دنیا میں لیل اور نہار کا جو چکر رکھا ہوا ہے یعنی کبھی خدا کے نبی اور رسول دنیا کی اصلاح کے لیے آتے ہیں اور کبھی تاریکی اور ظلمت کا دور دورہ ہوتا ہے تم جانتے ہو اس روحانی رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے جانے میں کیا حکمت ہے؟ ہم کیوں رات کے بعد دن لاتے

ہیں پھر کیوں تاریکی کے بعد آفتاب ہدایت کا طلوع کرتے ہیں۔ ہماری غرض اس سے یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں جو لوگ بداور گنہگار رہوں اور جو ہدایت اور وعظ وتذکیر کے محتاج ہوں ان کو اس سلسلۂ رسالت کے نتیجہ میں نیک بنایا جائے اور جو لوگ فطری نیکی کے مقام پر کھڑے ہیں انہیں خدا کا کلام اور الہام اس سے بھی اعلیٰ مقام یعنی شکر کی طرف لے جائے۔ غرض قرآن اس بات کو پیش کرتا ہے کہ ہر شخص کی اصلاح ہو سکتی ہے اگر اس نے انسان کو خرابی کے لئے ہی پیدا کیا ہوتا تو لیل ونہار کا یہ چکر جو تمہیں دنیا میں نظر آتا ہے نہ ہوتا۔ اس کی بڑی اہم غرض یہی ہے کہ بدوں کو نیکی کی طرف لایا جائے اور نیکوں کو اعلیٰ درجہ کے روحانی مقام کی طرف کھینچا جائے۔

اسی طرح فرماتا ہے۔ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ (فاطر:۳۸) یعنی قیامت کے دن جب دوزخیوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا تو وہ چیختے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ اے خدا ہمیں اس جہنم میں سے نکال نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اب اپنے سابق اعمال کے خلاف نہایت اعلیٰ درجہ کے کام کریں گے اور نیکی اور تقویٰ میں پوری طرح حصہ لیں گے۔ پہلے ہم چوری کیا کرتے تھے مگر اب ہم چوری نہیں کریں گے۔ پہلے ہم ڈاکہ ڈالا کرتے تھے مگر اب ہم ڈاکہ نہیں ڈالیں گے۔ پہلے ہم جھوٹ بولا کرتے تھے مگر اب ہم جھوٹ نہیں بولیں گے۔ پہلے ہم نبیوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے مگر اب ہم ان کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ اگر یہ صحیح ہوتا کہ انسان پیدائشی طور پر گندہ اور ناپاک ہے تو اللہ تعالیٰ کو جواب یہ دینا چاہیے تھا کہ کم بختو تم یہ کیا کہہ رہے ہو کہ ہم آئندہ نیک اعمال بجالائیں گے میں نے تو تمہیں پیدا ہی اس لیے کیا تھا کہ تم چوری کرتے تم ڈاکہ ڈالتے تم جھوٹ اور فریب سے کام لیتے۔ تم نبیوں کا مقابلہ کرتے یا یہ جواب دینا چاہیے تھا کہ تم نیکی کر ہی کس طرح سکتے ہو میں نے تو تمہاری فطرت میں خرابی رکھ دی ہے اور تم اس بات پر مجبور ہو کہ گناہوں اور بدیوں کا ارتکاب کرو مگر اللہ تعالیٰ یہ جواب نہیں دیتا بلکہ جواب یہ دیتا ہے کہ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ کیا ہم نے تم کو اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ جس میں انسان اگر نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو آسانی سے نصیحت حاصل کر سکتا تھا۔ ہم نے تمہیں مہلت بھی دی تمہیں کافی عمر بھی عطا کی مگر تم نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور اپنی عادات کی اصلاح کی طرف تم نے کوئی توجہ نہ کی۔ اب تمہارا یہ کہنا کیا حقیقت رکھتا ہے کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس لوٹا دیا جائے تو ہم ہمیشہ نیک عمل کریں گے۔ تمہیں ہماری طرف سے ایک بہت بڑا موقعہ دیا جا چکا ہے مگر تم نے اس کو ضائع کر دیا۔

اب دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ جرم کو ان کی طرف منسوب کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تم کو اتنی عمر دی گئی تھی کہ اگر تم

نصیحت حاصل کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے مگر تم نے نصیحت حاصل نہ کی۔ حالانکہ اگر یہ درست ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی فطرت میں خرابی رکھی گئی ہے اور وہ قانونِ الٰہی کی وجہ سے برے افعال کرنے پر مجبور ہے تو یہ جواب بالکل غلط تھا۔ خدا تعالیٰ کو تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ میاں تم تو نیک ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ میں نے تمہیں پیدا ہی اس غرض کے لئے کیا تھا کہ تمہیں دوزخ میں ڈالا جائے۔ دوسرا عذر یہ ہوسکتا تھا کہ ہم تو نصیحت حاصل کر لیتے مگر چونکہ خدا نے ہماری ہدایت کا کوئی سامان نہ کیا اس لئے ہم نیکی سے محروم رہے! اللہ تعالیٰ اس عذر کو بھی توڑتا ہے اور فرماتا ہے وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ تم یہ عذر بھی نہیں کر سکتے کہ ہم نے تمہاری ہدایت کا کوئی سامان نہیں کیا کیونکہ ہماری طرف سے متواتر تمہارے پاس نذیر آئے اور وہ تمہیں خدا تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اور اس کی ناراضگی کے برے نتائج سے ڈراتے رہے مگر تم نے پھر بھی کوئی توجہ نہ کی۔ یہ دونوں جواب جبر کے عقیدہ کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں اور ثابت ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو مجبور پیدا نہیں کیا ورنہ جب کفار نے کہا تھا کہ ہمیں واپس کیا جائے ہم اعلیٰ درجہ کے اعمال بجالانے کا وعدہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں کہتا تم کس طرح نیک اعمال کر سکتے ہو میں نے تو تم کو مجبور پیدا کیا تھا اور خود تمہاری فطرت میں ایسا بگاڑ رکھ دیا تھا کہ تم نیک اعمال پر مقدرت ہی نہیں رکھ سکتے تھے مگر وہ یہ جواب نہیں دیتا بلکہ جواب دیتا ہے تو یہ کہ میں نے تمہیں اتنی عمر دی تھی کہ جس میں اگر تم فائدہ اٹھانا چاہتے اور نصیحت حاصل کر کے اپنے اعمال میں اصلاح کرنا چاہتے تو آسانی سے کر سکتے تھے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ تم مجبور نہیں تھے بلکہ تمہارا اختیار تھا کہ تم جو رنگ چاہو اپنے اوپر چڑھا لو اور تمہیں اس کا موقعہ بھی دے دیا گیا تھا۔

دوسرا سوال یہ ہوسکتا تھا کہ ہم نصیحت تو حاصل کر لیتے مگر ذرائع بھی تو مہیا ہوتے۔ ہم اپنی عقلوں کی کوتاہی اور باپ دادا کی جہالت کی وجہ سے اگر ہدایت کو اختیار نہیں کر سکے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اللہ تعالیٰ اس عذر کو بھی رد کرتا ہے اور فرماتا ہے تم یہ بات بھی ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکتے کیونکہ ہم نے تمہارے پاس نذیر بھجوا دیئے تھے اور اس طرح ہدایت اور ضلالت کی راہیں تم پر پوری طرح واضح کر دی تھیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ تم ہمارے عذاب کو چکھو اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ یہ تیسرا جواب ہے جو جبر کے عقیدہ کو رد کر رہا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے جبری طور پر لوگوں کو برے افعال کے لئے پیدا کیا ہے تو ظالم نعوذ باللہ خدا قرار پاتا ہے وہ شخص ظالم نہیں کہلا سکتا جس سے جبری طور پر کوئی کام لیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں لوگوں کو ظالم قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم ظالم نہیں تھے بلکہ ظالم تم تھے کہ ہدایت کے سامانوں اور مواقع کے حصول کے باوجود تم نے خدا کی طرف توجہ نہ کی اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑے رہے۔

یہ آیات اس امر کا قطعی ثبوت ہیں کہ بعض مسلمانوں کا یہ خیال کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ انسان کو خدا نے اختیار دیا ہے کہ وہ اگر چاہے تو نیک بن جائے اور اگر چاہے تے شیطان کے پیچھے چل پڑے۔

فطرت انسانی کے متعلق پانچواں نظریہ اور اس کی تردید پانچواں خیال انسانی فطرت کے متعلق یہ پایا جاتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنے کرموں کا پھل بھگتنے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ بعض کرم برے ہوتے ہیں اس لئے ان کے کرنے والے بداخلاق اور غریب کمزور اور برے بنائے گئے ہیں مگر جو لوگ اچھے اور تندرست اور امیر ہیں وہ بھی درحقیقت بدی سے پوری طرح آزاد نہیں ہیں کیونکہ ان کا ایک دوسری جون میں آنا بتاتا ہے کہ گناہ کے اثر سے وہ پوری طرح آزاد نہیں ورنہ وہ جونوں کے چکر سے آزاد کر دیئے جاتے۔ (ستیارتھ پرکاش باب ۹ صفحہ ۲۴۷)

عقیدہ تناسخ اور اس کی تردید یہ خیال جسے تناسخ کہتے ہیں اس پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ اس خیال کی بنیاد ظن اور تخمین پر ہے۔ تناسخ کے ماننے والے کہتے ہیں دنیا میں ایک شخص اندھا کیوں پیدا ہوتا ہے۔ لنگڑا لولا کیوں پیدا ہوتا ہے۔ غریب اور نادار کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یا ایک بچہ پیدا ہوتے ہی مر کیوں جاتا ہے؟ اور کیوں دنیا میں ہمیں یہ اختلاف نظر آتا ہے کہ ایک شخص امیر ہے تو دوسرا غریب ایک شخص صحیح سلامت ہے تو دوسرا لنگڑا لولا۔ ایک شخص عقلمند ہے تو دوسرا بیوقوف۔ ایک شخص طاقتور ہے تو دوسرا کمزور۔ یہ اعتراض اٹھا کر تناسخ کے معتقد کہتے ہیں کہ چونکہ خدا کی طرف یہ ظلم منسوب نہیں ہوسکتا اس لئے معلوم ہوا کہ پچھلے جنم کے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے انسان اس دنیا میں آتا ہے چونکہ گزشتہ جنم میں بعض نے اچھے اعمال کئے تھے اور بعض نے برے اس لئے اس جہان میں بعض لوگ دکھوں میں مبتلا نظر آتے ہیں اور بعض لوگ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر تناسخ کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ سوال کہ دنیا میں بعض لوگ اندھے کیوں پیدا ہوتے ہیں بعض لولے لنگڑے کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ بعض غریب اور مفلس اور نادار کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اس کے کئی جواب ہوسکتے ہیں۔ فرض کرو ایک شخص خدا کے انصاف کا قائل نہیں وہ اس اعتراض کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ خدا ظالم ہے۔ ایک دوسرا شخص یہ جواب دے سکتا ہے کہ کسی کا اندھا یا لولا لنگڑا ہونا قانون شریعت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ قانون نیچر سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک شخص چلتے چلتے ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہے تو اس وقت یہ نہیں کہا جائے گا کہ اسے اپنے کسی سابق کرم کی سزا ملی ہے بلکہ یہ نتیجہ ہوگا کسی طبعی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اندھا پیدا ہوتا ہے یا لنگڑا پیدا ہوتا ہے یا بیمار پیدا ہوتا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اسے اپنی کسی سابق بدعملی کی سزا مل رہی ہے بلکہ درحقیقت یہ کسی طبعی قانون کے وہ اثرات ہوں گے جو مختلف حالات کے نتیجہ میں اس کے جسم پر

ظاہر ہوئے۔ بہرحال جس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہوں۔ ان میں سے کسی ایک جواب کو بلا وجہ ترجیح دے دینا عقل کے بالکل خلاف ہے کوئی وجہ ہونی چاہیے جس کی بنا پر اس جواب کو ترجیح دی جاسکتی ہو۔ مگر ایسی کوئی وجہ آج تک قائلین تناسخ کی طرف سے پیش نہیں کی جاسکی۔

دوسرے ہم قائلین تناسخ سے کہتے ہیں کہ تم جس سوال کو تناسخ کی تائید میں پیش کرتے ہو ہم اسی سوال کو تناسخ کی تردید میں پیش کر دیتے ہیں۔ اصل سوال یہ تھا کہ دنیا میں اختلاف کیوں ہے؟ تم نے اس کا یہ جواب دیا کہ انسان کے سابق کرموں کا یہ نتیجہ ہے۔ ہم کہتے ہیں اگر اس دنیا کی زندگی کسی سابق جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے اور انسان اپنے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آیا ہے تو یہ کیا بات ہے کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے اسے کون سی سزا ملی جس کے لئے اسے دنیا میں بھیجا گیا تھا؟ اگر ایک بچہ پیدا ہونے کے بعد بڑا ہو تکلیفیں اٹھائے مصیبتیں جھیلے مختلف قسم کے دکھ برداشت کرے تب تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیکھ لو اسے اپنے پچھلے اعمال کی سزا مل رہی ہے لیکن ہم تو دیکھتے ہیں دنیا میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ادھر بچہ پیدا ہوتا ہے اور ادھر مر جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوتا کہ اسقاط ہو جاتا ہے اگر انسان اپنے کرموں کی سزا کے لئے پیدا ہوتا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ بچہ جو پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے یا وقت پورا ہونے سے پہلے جو ماں کے پیٹ سے گر جاتا ہے اسے کون سی سزا ملی؟ اس نے تو دنیا میں آ کر کوئی تکلیف ہی نہیں اٹھائی۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گورنمنٹ کسی کو قید خانہ میں بھیجے مگر قید خانہ کی ڈیوڑھی سے ہی اسے گھسیٹ کر واپس لے آئے۔ ایسا فعل یقیناً عقل کے خلاف ہوگا۔ پس جہاں اس قسم کے حوادثات تناسخ کے خیال کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں وہاں یہ حوادث تناسخ کے خلاف بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ کا عقیدہ درست ہے تو کیوں انسان کے موجودہ اعمال اس پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ اگر دنیا میں وہ سزا بھگتنے کے لئے آیا ہے تو یقیناً دنیا سے اسے کسی طرح چھٹکارا نہیں ہونا چاہیے۔ فرض کرو ایک شخص کو اس کے سابق جنم کے برے اعمال کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سزا ملی ہے کہ وہ ۳۵ سال تک شدائد و مصائب میں مبتلا رہے تو اس کے بعد ضروری ہے کہ ۳۵ سال تک وہ اس سزا کو برداشت کرے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں دنیا میں بعض دفعہ جب ایک شخص تکالیف کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا تو وہ زہر کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے حالانکہ اگر تناسخ درست تھا اور اگر وہ ایک معین عرصہ کی قید بھگتنے کے لئے دنیا میں آیا تھا تو زہر کا اس پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے تھا خواہ وہ لاکھ دفعہ زہر کھاتا اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا کیونکہ خدا نے اسے ایک معین سزا کے لئے دنیا میں بھیجا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں زہر کھا کر وہ اپنی تکالیف کا فوراً خاتمہ کر لیتا ہے۔ اسی طرح

اگر کوئی شخص اپنے گلے میں پتھر باندھ کر دریا میں غرق ہونا چاہے تو اس عقیدہ کے مطابق اسے غرق نہیں ہونا چاہیے کیونکہ خدا نے اسے چالیس یا پچاس سال تک سزا بھگتنے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے اگر ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جب کوئی شخص خود کشی کے ارادہ سے دریا میں غرق ہونا چاہے تو تناسخ کا عقیدہ اسے غرق ہونے سے نہیں بچاتا وہ خواہ چالیس سال کی قید لے کر دنیا میں آیا ہو زہر کھا کر یا دریا میں غرق ہو کر کئی سال پہلے اس عذاب سے نجات حاصل کر لیتا ہے اسی طرح وہ شخص جو ایک غریب گھر میں پیدا ہوا ہے اگر اسے اپنے سابق اعمال کی سزا میں ایک غریب شخص کے گھر پیدا کیا گیا ہے تو پھر اسے کبھی امیر نہیں ہونا چاہیے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کئی غریب دنیا میں ترقی کرتے کرتے کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔ پنجاب ہندوستان اور ولایت میں ایسے کئی لوگ موجود ہیں جنہوں نے نہایت غربت کی حالت سے ترقی کرتے کرتے اعلیٰ درجہ کی امارت حاصل کر لی۔ وہ ادنیٰ حالت سے اٹھے اور ترقی کے اعلیٰ معیار پر جا پہنچے۔ پس اگر پچھلے جنم کے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے انسان اس دنیا میں آیا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ زہر سے کیوں مرتا ہے؟ وہ تو ایک خاص مدت کی قید کے لئے آیا تھا۔ محنت سے کیوں مالدار ہو جاتا ہے وہ تو سزا کے طور پر ایک غریب شخص کے گھر میں پیدا کیا گیا تھا؟ پھر تو چاہیے تھا کہ کوئی عمل اس کی حالت کو تبدیل نہ کر سکتا۔ آخر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ایک شخص کو قیدی بنا کر بھیجے اور وہ اس دنیا میں آ کر بادشاہ بن جائے۔ دنیوی حکومتوں کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی تو خدائی گورنمنٹ کے احکام کو بدلنے کی کوئی شخص کس طرح طاقت رکھتا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ خدا تو ایک شخص کو سزا کے طور پر بیمار کرے اور وہ علاج سے اچھا ہو جائے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے گا کہ خدا نے سزا کے طور پر کسی شخص کو بیمار بنایا ہے تو بہرحال یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ وہ علاج سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ مگر دنیا کے نظارے جو ہمیں روزانہ دکھائی دیتے ہیں اس حقیقت کو باطل ثابت کر رہے ہیں۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں اور علاج سے اچھے ہو جاتے ہیں۔ غریب ہوتے ہیں اور محنت سے امیر ہو جاتے ہیں۔ زہر کھاتے ہیں اور اس کے اثر سے مر جاتے ہیں حالانکہ اگر ہم گذشتہ جنم کو مانیں تو پھر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نہ بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے نہ کوئی غریب سے امیر ہو سکتا ہے نہ زہر سے ہلاک ہو سکتا ہے اور نہ دنیا کا کوئی اور عمل اس پر اثر کر سکتا ہے۔ سابق جنم کے کرم ماننے کے نتیجہ میں صرف ایک ہی زندگی آزاد رہ سکتی ہے اور وہ انسان کی سب سے پہلی زندگی ہے۔ باقی ساری زندگیاں اس سزا کے ماتحت جبری طور پر لانی پڑیں گی جو پہلے جنم کے اعمال کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو وباؤں سے لوگ یا جانور کیوں مرتے ہیں؟ آخر یہ کیا ہوتا ہے کہ یک دم ایک وبا پھیلتی ہے اور اس سے لاکھوں انسان اور جانور ہلاک ہو جاتے ہیں وہ کونسا جرم ہے جس کے نتیجہ میں

سب کو اکٹھی سزا ملتی ہے۔ سزا تو الگ الگ وقت کی ہوتی ہے مگر وباؤں کے نتیجہ میں ایک ہی وقت میں ملکوں کا صفایا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر تناسخ درست ہے تو جنگوں اور زلزلوں سے کیوں لاکھوں کا صفایا ہو جاتا ہے اور یہ آزادی کس خوشی کی تقریب پر دی جاتی ہے؟ دنیا میں تو کہا جاتا ہے آج بادشاہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اس خوشی میں سَو قیدی چھوڑے جاتے ہیں۔ آج شاہی خاندان میں فلاں شادی ہوئی ہے اس خوشی کی تقریب میں اتنے لوگوں کو رہا کیا جاتا ہے۔ کیا اسی قسم کی خوشی کی تقاریب اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی ہوتی ہیں؟ کہ وہ ایک وبا بھیج دیتا ہے جس کی وجہ سے لاکھوں انسان مر کر دنیا کی تکالیف سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ زلزلہ بھیج دیتا ہے اور اس سے لاکھوں انسان ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی طاعون، کبھی ہیضہ، کبھی انفلوئنزا اور کبھی ملیریا بھیج دیتا ہے۔ گویا یہ وبائیں کیا ہیں انسپکٹر جنرل آف پرزنرز ہیں جو قیدیوں کو رہائی کی خوشخبری دیتی ہیں۔ بہرحال اگر تناسخ درست ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آزادی کس خوشی کی تقریب پر دی جاتی ہے؟ اور کیوں دنیا میں وباؤں سے کبھی کم آدمی ہلاک ہوتے ہیں اور کبھی زیادہ آدمی ہلاک ہوتے ہیں؟ کیا اس کے یہ معنے سمجھے جائیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کبھی خوشی کی کوئی معمولی تقریب پیدا ہوتی ہے اور کبھی بڑی۔ معمولی تقریب میں صرف چند قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا جاتا ہے مگر جب خوشی کی کوئی بہت بڑی تقریب پیدا ہو جائے تو زلزلہ بھیج دیا جاتا ہے یا طاعون نازل کر دی جاتی ہے یا ہیضہ اور ملیریا پیدا کر دیا جاتا ہے اور اس خوشی میں لاکھوں انسانوں کو رہا کر دیا جاتا ہے آخر اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہیے جس طرح انہوں نے دنیا کے اختلاف کو دیکھ کر ایک توجیہ پیدا کر لی تھی اسی طرح ہمارا حق ہے کہ ہم ان سے پوچھیں کہ طاعون اور ہیضہ اور زلزلہ اور لڑائیوں وغیرہ سے یک دم لاکھوں لوگوں کا صفایا کس بنا پر ہوتا ہے؟ اور کون سی خوشی کی تقریب پر ارواح کی آزادی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے؟

پانچواں سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو ہندو لوگ وباؤں اور زلزلوں سے بچنے کی تدابیر کیوں کرتے ہیں اور کیوں طاعون اور ہیضہ کے ٹیکے کراتے ہیں؟ کیونکہ ان کے نزدیک تو یہ جون ایک سزا ہے پس طاعون اور ہیضہ تو معافی کا پیغام ہے اس سے بچنے کے تو کوئی معنے ہی نہیں۔ کیا کوئی قیدی آزادی کے پروانے سے بچنے کی کوشش کیا کرتا ہے؟ اگر تناسخ ماننے والوں کے پاس کوئی شخص آئے اور ان سے سوال کرے کہ طاعون یا ہیضہ کا ٹیکہ مجھے کروانا چاہیے یا نہیں تو وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں؟ کیا یہ کہتے ہیں کہ تم ٹیکہ مت کرواؤ۔ یہ زندگی تو قید خانہ ہے۔ یہ وبائیں تو پرمیشور کی طرف سے آزادی کا پروانہ ہیں ان کے آنے پر تو تم کو خوش ہونا چاہیے۔ یا وہ یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ بے شک ٹیکہ کراؤ یہ ایک کامیاب علاج ہے اس سے تم اپنی زندگی کو بچا لو گے۔

غرض ہندوؤں کا یہ عمل کہ وہ وباؤں اور زلزلوں سے بچنے کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک یہ زندگی ایک قید نہیں جس سے آزاد ہونے کی کوشش ہونی چاہیے بلکہ یہ نیکی کمانے کا ذریعہ ہے جسے لمبا کرنا نیک کام ہے۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ برسات میں بعض دفعہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر کروڑوں کیڑے مکوڑے کیوں پیدا ہو جاتے ہیں اور اس وقت کون سے گناہ خاص طور پر زائد ہو جاتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں ایک ایک گاؤں اور ایک ایک شہر میں برسات کے موسم میں اربوں ارب کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں پس سوال یہ ہے کہ یہ اربوں ارب کیڑا کس جرم کے نتیجہ میں ایک گھنٹہ بھر میں پیدا کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ سزا کیا ہوئی کہ ابھی ان کی زندگی پر ایک گھنٹہ بھی نہیں گذرتا کہ ان میں سے بہت سے کیڑے مر جاتے ہیں گویا اربوں ارب ارواح کو قید میں ڈالا جاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی ان سب کو آزاد کر دیا جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان کیڑوں کا آناً فاناً کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں پیدا ہو جانا کس گناہ کا نتیجہ ہوتا ہے؟ جو خاص طور پر موسم برسات میں زیادہ ہو جاتا ہے اور پھر ان کی تھوڑی دیر کے بعد ہی رہائی کس خوشی کی تقریب میں ہوتی ہے کیا اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی شادی کی تقریب پیدا ہو جاتی ہے؟ کہ اربوں ارب ارواح کو یک دم قید خانہ سے رہا کر دیا جاتا ہے۔

ساتواں سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ کو درست مانا جائے تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تمام کارخانۂ عالم نعوذ باللہ گناہ پر چل رہا ہے کیونکہ تناسخ کے قائلین کہتے ہیں کہ دنیا میں جانوروں کی پیدائش گناہ کی وجہ سے ہے۔ کسی گناہ کی وجہ سے انسان بھینس کی جون میں جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے انسان گائے کی جون میں جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے انسان گھوڑے کی جون میں جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے انسان گدھے کی جون میں جاتا ہے (ستیارتھ پرکاش باب ۸ صفحہ ۲۲۱، ۲۲۲)۔ اسی طرح سبزیاں اور ترکاریاں وغیرہ جو نظر آتی ہیں چونکہ ان میں بھی جیو ہے اس لئے سبزیوں اور ترکاریوں کی جون میں بھی انسان کسی گناہ کی وجہ سے جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ گناہ کی پیدائش ہے تو معلوم ہوا کہ دنیا کا کارخانہ محض گناہوں کے سہارے قائم ہے اگر گناہ کا وجود مٹ جائے تو وہ گائے اور بھینسیں جن کا انسان دودھ پیتا ہے وہ گھوڑے جن پر انسان سواری کرتا ہے وہ سبزیاں اور ترکاریاں جن کو انسان کھانے کے کام میں لاتا ہے سب کی سب معدوم ہو جائیں اور کارخانۂ عالم بالکل باطل ہو جائے پھر یہ چیزیں ایسی نہیں جن کو صرف بدلوگ استعمال کرتے ہوں بلکہ نیک لوگ بھی جانوروں کے بغیر گذارہ نہیں کر سکتے وہ بھی اس بات پر مجبور ہیں کہ دودھ پئیں۔ گھوڑوں کی سواری کریں فصل کے لئے ہل چلائیں اور اس طرح گائیوں

اور بھینسوں اور گھوڑوں اور بیلوں کی احتیاج کو تسلیم کریں گو یا اس عقیدہ کے ماتحت نیک لوگ بھی اس دنیا میں گناہ کے بغیر گذر اوقات نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ارواح جو مختلف جونوں کی شکل میں اس دنیا میں آئی ہوئی ہیں عقیدہ تناسخ کے ماتحت انہیں سے دنیا چل رہی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو انسان پہلی دفعہ پیدا ہوئے تھے وہ کیا کھاتے تھے اور پینے کے لئے کیا چیز استعمال کرتے تھے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ علم نباتات کے متعلق موجودہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ گیہوں اور سبزیاں وغیرہ اپنے اندر حس رکھتی ہیں جس کے دوسرے یہ معنے ہیں کہ قائلین تناسخ کے نزدیک ان میں بھی جیو ہے اور جب تمام جیو والی اشیاء کی پیدائش قائلین تناسخ کے نزدیک گناہوں کی وجہ سے ہے تو طبعی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے انسان کیا کھاتے تھے؟ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سوال تو یہ ہے کہ پانی کو پانی اور ہوا کو ہوا خدا تعالیٰ نے کیوں بنایا ہے؟ یہ فرق کرنا اس کے لئے کس طرح جائز ہو گیا ہے پس پانی بھی درحقیقت کسی سزا میں پانی بنا ہے اور ہوا بھی کسی سزا میں ہوا بنی ہے اور اگر یہ امر درست ہے تو سوال یہ ہے کہ جب پہلی دفعہ انسان پیدا ہوا تھا اور ابھی کرموں کے نتائج ظاہر نہیں ہوئے تھے اس وقت انسان کیا پیتے تھے اور کس چیز کی مدد سے سانس لیتے تھے؟ یہ بھی ایک ایسا سوال ہے جس کا قائلین تناسخ کے پاس کوئی جواب نہیں۔

آٹھواں سوال یہ ہے کہ اگر گائیں بھینسیں گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں تو علم الحیوانات کے ماہرین کی تجاویز جانوروں کی ترقی کی نسبت کیوں کامیاب ہوتی ہیں؟ کیا گائیں بھینسیں اگر اس محکمہ کی نگرانی میں رہیں تو لوگ اس قسم کے گناہ زیادہ کرنے لگ جاتے ہیں جن سے یہ جانور زیادہ پیدا ہوں؟

تھوڑا ہی عرصہ ہوا گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ گذشتہ چھبیس۲۶ سال میں ہندوستان کی گائیں بھینسیں آدھی رہ گئی ہیں ان کی تعداد بڑھانے کے لئے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جانور پالنے کی کوشش کرنی چاہیے تا کہ اس کمی کا ازالہ ہو۔ اس اعلان پر ہندوؤں کو چاہیے تھا کہ گورنمنٹ کو نوٹس دے دیتے کہ جانور بڑھانے کا یہ طریق بالکل غلط ہے۔ گائیں بھینسیں فلاں فلاں گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر گورنمنٹ ان کی تعداد کو بڑھانا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ملک میں ان گناہوں کو رائج کر دے گائیں بھینسیں خود بخود زیادہ ہو جائیں گی۔ مگر نہ ہندوؤں نے گورنمنٹ کو اس وقت کوئی ایسا نوٹس دیا اور نہ وہ آئندہ دینے کے لئے کبھی تیار ہو سکتے ہیں۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ علم حیوانات کی تجاویز پر اگر عمل کیا جائے تو جانوروں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے اور جب محض بعض مادی تدابیر پر عمل کرنے کے نتیجہ میں ان کی تعداد بڑھ سکتی ہے تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کسی گناہ کے نتیجہ

میں پیدا نہیں ہوتے۔

نواں سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو حکومتیں شکار کی حفاظت کی تدابیر کیوں کرتی ہیں؟ انہیں تو چاہیے تھا کہ بجائے اس کے کہ شکار کی حفاظت کے ذرائع اختیار کرتیں لوگوں کو خاص خاص گناہوں کا حکم دے دیتیں۔ مثلاً کہا جاتا کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ آج کل فلاں فلاں گناہ کریں کیونکہ بٹیر کم ہو گئے ہیں یا فلاں فلاں گناہ کریں کیونکہ تیتر کم ہو گئے ہیں کیونکہ تناسخ کے ماتحت بعض خاص قسم کے گناہ ہی ان کی پیدائش کا باعث بن سکتے ہیں۔ کسی اور ذریعہ سے ان میں زیادتی نہیں ہوسکتی۔

دسواں سوال یہ ہے کہ اگر تناسخ درست ہے تو اوّل تو قتل ہو ہی نہیں سکتا۔ جس شخص کے متعلق خدا نے یہ کہا ہے کہ اسے چالیس سال تک دنیا میں رکھا جائے کوئی شخص اسے تیس۳۰ یا پینتیس۳۵ سال کی عمر میں ہلاک کس طرح کر سکتا ہے؟ بے شک وہ اپنی طرف سے اس کی گردن پر تلوار کا وار کرے پھر بھی جب خدا نے اسے چالیس سال کے لئے دنیا میں بھیجا ہے وہ اس سے قبل دنیا کے قید خانہ سے رہا نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی شخص دوسرے کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ اس نے خدا تعالیٰ کے منشا اور اس کے حکم کے ماتحت دوسرے کو قید سے آزاد کیا ہے۔ اس صورت میں اسے قتل کی سزا دینا بالکل غیر معقول بات ہے اسے تو پھولوں کے ہار پہنانے چاہئیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کر دیا۔ جیسے جلاد جب کسی کو پھانسی دیتا ہے تو وہ زیر الزام نہیں آتا کیونکہ وہ افسر کے حکم کے مطابق پھانسی دیتا ہے اپنی مرضی سے نہیں دیتا۔ اسی طرح جس کو خدا نے قید کیا ہے اوّل تو اسے آزاد کرنے کی کسی میں طاقت نہیں ہوسکتی اور اگر کسی نے آزاد کر دیا ہے تو یقیناً اس نے خدا تعالیٰ کے منشاء سے کیا ہے ایسی صورت میں اسے سزا کیوں ملے پھر تو قاتل کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے چاہئیں کہ اس نے ایک شخص کو قید خانہ سے الٰہی مشیئت کے ماتحت رہا کر دیا۔ غرض یہ عقیدہ بھی بدھوں کے عقیدہ کی طرح عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اصل حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم نے بتائی ہے کہ انسان کو معتدل القویٰ پیدا کیا گیا ہے اس میں کوئی خاصیت ایسی نہیں جسے خالص طور پر برا کہا جا سکے اور کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ خالص طور پر نیکی کے لئے ہی استعمال ہوسکتی ہے۔ معتدل القویٰ ہونے کے معنے درحقیقت یہی ہیں کہ بعض حالات میں وہ بدی کی طرف چلا جاتا ہے اور بعض حالات میں نیکی کی طرف چلا جاتا ہے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ جب انسان بدی کی طرف بھی جا سکتا ہے تو انسان کو احسن تقویم میں پیدا کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی غرض کے لئے تو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء بھیجتا اور لوگوں کی ہدایت کے لئے شریعت کا نزول کرتا ہے۔ جیسے آدمؑ اور نوحؑ اور موسیٰؑ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سب اسی لئے آئے کہ گرے ہوئے لوگوں کو اٹھا کر آستانۂ الوہیت پر پہنچا دیں بے شک بنی نوع انسان اپنی قوتوں کا غلط استعمال کر کے بعض دفعہ خدا تعالیٰ سے دور جا پڑتے ہیں اور وہ ہوا و ہوس کی اتباع کر کے شیطان کے غلام بن جاتے ہیں مگر انبیاء ان کی تربیت کر کے پھر ان کو خدا تک پہنچاتے ہیں پھر ان کے قلوب کو صیقل کرتے ہیں اور پھر ان کی استعدادوں کو ابھار کر انہیں صفات الٰہیہ کا مظہر بنا دیتے ہیں۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۶

پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجوں سے (بھی) بدتر درجہ کی طرف لوٹا دیا۔

تفسیر۔ رَدَدْنٰهُ میں ضمیر خدا تعالیٰ کی طرف پھرتی ہے اور یہ اس امر کے اظہار کے لئے کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ بدکار کو بطور سزا کے اس کے مقام سے گرا دیتا ہے یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ اس سے بدی کرواتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے کہ آدم کو جنت میں سے ہم نے نکالا (البقرۃ:۳۹)۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ آدم کو جنت میں سے شیطان نے نکالا۔ چنانچہ فرماتا ہے يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ (الاعراف:۲۸) یہ ظاہر ہے کہ آدمؑ کو جنت میں سے شیطان کا نکالنا اور آدمؑ کو جنت میں سے اللہ تعالیٰ کا نکالنا ایک معنوں میں نہیں آسکتا۔ بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کا نکالنا اور رنگ رکھتا ہے اور شیطان کا نکالنا اور رنگ رکھتا ہے اور ان دونوں میں کوئی نہ کوئی فرق پایا جاتا ہے۔ وہ فرق یہی ہے کہ شیطان چونکہ اس غلطی کا باعث بنا تھا جس کے نتیجہ میں آدمؑ کو جنت میں سے نکلنا پڑا اس لئے شیطان کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس نے آدمؑ کو جنت میں سے نکالا تھا۔ لیکن چونکہ نتیجہ خدا نے پیدا کیا تھا اس لئے دوسرے مقام پر یہ کہہ دیا گیا کہ آدمؑ کو خدا تعالیٰ نے جنت میں سے نکالا تھا۔ گویا شیطان کا نکالنا بلحاظ فعل بد کے ہے اور اللہ تعالیٰ کا نکالنا بلحاظ اس سزا کے ہے جو اس فعل کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئی اسی طرح رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ کے یہ معنے نہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو بگاڑتا ہے۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب انسان بگڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سزا کے طور پر اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ میں بھیج دیتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ سَارِقًا یا ثُمَّ رَدَدْنَاهُ قَاتِلًا یا ثُمَّ رَدَدْنَاهُ مُذْنِبًا بلکہ فرمایا ہے ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ پھر ہم اس کو ادنیٰ ترین جگہ کی طرف لے جاتے ہیں وہ ایک جرم کرتا ہے ہم اُسے اس کی سزا دیتے ہیں وہ پھر جرم کرتا ہے ہم اسے پھر سزا دیتے ہیں اور اس طرح اسے ذلیل

اور ادنیٰ حالت کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ہٗ ضمیر کا حال واقع ہوا ہو یعنی ذوالحال فاعل نہ ہو بلکہ مفعول ذوالحال ہو۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ پھر انسان کو ہم نے اپنے دروازہ سے لوٹایا اس حال میں کہ وہ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ تھا۔ ان معنوں کے لحاظ سے وہ اعتراض واقع نہیں ہو سکتا جو پہلے معنوں پر عائد ہوتا ہے اور ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کا یہ مفہوم ہوگا کہ ہم انسان کو اس کے مقام سے ہٹا دیتے ہیں ایسے حال میں کہ وہ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ہوتا ہے۔ یعنی جب وہ گنہگار ہو کر ہماری نظروں سے گر جاتا ہے تو ہم اسے اپنے دربار سے واپس کر دیتے ہیں۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کے معنے فردی اور اجتماعی لحاظ سے اس آیت کے ایک معنے فردی لحاظ سے ہیں اور ایک معنے اجتماعی لحاظ سے۔ اجتماعی لحاظ سے اس کے یہ معنے ہیں کہ ہدایت پہلے ہے اور ضلالت بعد میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ پہلے ہم انسان کے لئے اس کی ہدایت کے سامان مہیا کرتے ہیں بعد میں بگڑ کر وہ ضلالت اور گمراہی کی راہیں اختیار کر لیتا ہے۔ یہی اسلام اور ارتقائیوں کا مابہ الاختلاف ہے۔ ارتقائی لوگ ضلالت کو پہلے بتا کر پھر ارتقائی طور پر مذہب کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ جب انسان نے عقل کامل حاصل کی تو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو بھجوایا۔ پھر بگڑ گئے تو نوحؑ کو بھجوایا۔ پھر بگڑے تو موسیٰؑ کو، اب پھر بگڑے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ گویا ابتداء میں احسن تقویم کا نمونہ ہوتا ہے اور بگاڑ ہمیشہ بعد میں آتا ہے۔ پس جن معنوں میں ارتقاء کو فلسفی پیش کرتے ہیں وہ غلط ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ پہلے مظاہرہ تین پھر زیتون پھر طور اور پھر بلد الامین ہوا اور اس طرح ہر مظاہرہ نیکی کا پہلے سے بڑا تھا۔ یہ ارتقاء درست ہے مگر یہ کہ پہلے ضلالت تھی پھر ترقی کر کے ہدایت آئی یہ غلط اور سراسر غلط ہے۔

یوروپین فلسفی مسئلہ ارتقاء کو اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا خیال قوموں میں آہستہ آہستہ پیدا ہوا ہے۔ سب سے پہلے مختلف اقوام میں ان اشیاء کی پرستش شروع ہوئی ہے جن سے انسان خائف ہوا۔ جس طرح ایک بچہ ڈر کر لجاجت اور گریہ زاری شروع کر دیتا ہے اسی طرح جب انسان بعض چیزوں سے مرعوب ہوا تو اس نے ان کی پرستش شروع کر دی۔ اس نے دیکھا کہ آسمان سے بجلی گری ہے اور اس سے چند آدمی ہلاک ہو گئے ہیں وہ ڈرا اور اس نے سمجھا کہ یہ ڈرنے کی چیز ہے اور اس کی عبادت شروع کر دی۔ پھر اس نے سانپ کو دیکھا کہ اس کے ڈسنے سے فلاں شخص مر گیا ہے تو اسے خیال پیدا ہوا کہ یہ ڈرنے کی چیز ہے اور اس کی عبادت شروع کر دی۔ پھر اس نے

دریا میں کسی کو ڈوبتے دیکھا تو خیال کرلیا کہ یہ ڈرنے کی چیز ہے اور اس کی عبادت شروع کردی۔ پھر پہاڑ کی کھڈ میں کسی کو گرکر ہلاک ہوتے دیکھا تو خیال کرنا شروع کردیا کہ پہاڑ بھی ڈرنے کی چیز ہے اور اس کی عبادت شروع کردی۔ غرض جس جس چیز سے ڈرا اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا مگر پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا انسان نے ادنیٰ چیزوں سے نظر اٹھا کر بالا ہستیوں کو پوجنا شروع کردیا۔ پھر کچھ اور عرصہ کے بعد یہ بالا ہستیاں غیر مادی قرار پا گئیں اور آخر ایک واحد ہستی جو سب پر فائق تھی تجویز ہوئی۔ پس ان کے نزدیک ارتقاء اس رنگ میں ہوا ہے کہ مادیات سے نظر اٹھاتے ہوئے انسان آخر ایک غیر مرئی خدا کی پرستش میں مصروف ہوگیا۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے یہ غلط ہے کہ پہلے ضلالت تھی اور ہدایت بعد میں آئی بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نیکی پہلے تھی اور بدی بعد میں آئی۔ پہلے آدمؑ آئے اور انہوں نے تمدّن کی بنیاد رکھی پھر خرابی پیدا ہوئی تو نوحؑ آئے، پھر خرابی پیدا ہوئی تو موسیٰؑ آئے، پھر خرابی پیدا ہوئی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔ غرض نیکی کا دور پہلے ہے اور بدی کا بعد میں۔ یہی فلسفی ارتقاء اور قرآنی ارتقاء میں فرق ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک دورِ حسنات پہلے ہے اور دورِ سیئات بعد میں۔ لیکن فلسفی اصول کے ماتحت دَورِ سیئات پہلے ہے اور دَورِ حسنات بعد میں۔

فرد کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہیں کہ انسان کو ہم نے ہدایت دی اور اعلیٰ درجہ کی طاقتیں نیکی میں ترقی کرنے کے لئے بخشیں۔ لیکن جب اس نے ان کا غلط استعمال کیا تو وہ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ میں گر گیا۔ یعنی انسان کی دونوں حالتیں دوسری مخلوق سے بڑی ہیں۔ جب نیکی کی طرف آتا ہے تو سب مخلوق سے بڑھ جاتا ہے اور جب بدی کی طرف گرتا ہے تو ساری مخلوق سے گرجاتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اضداد کا مالک بنایا ہے۔ نیکی میں حصہ لیتا ہے تو ساری مخلوق سے بڑھ جاتا ہے اور بدی میں حصہ لیتا ہے تو کتوں اور سؤروں سے بھی گر جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ وہ ترقی کرتا ہے تو فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے اور گرتا ہے تو شیطانوں سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ گویا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ میں بالقوّہ قویٰ کا ذکر ہے اور ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اور اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں بالظہور قویٰ کا ذکر ہے۔ یعنی بالقوّہ تو سب کو اچھے قویٰ ملے ہیں مگر جب ان کا ظہور ہوتا ہے تو دو طرح ہوتا ہے۔ یا تو انسان مومن بن جاتا ہے اور یا کافر بن جاتا ہے۔ مومن بن کر اوپر کو نکل جاتا ہے اور کافر بن کر نیچے کی طرف گر جاتا ہے۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ

باستثناء ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے مناسب حال عمل کئے سو ان کے لئے ایک نہ ختم ہونے والا

غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ﴿۷﴾

(نیک) بدلہ ہوگا۔

تفسیر ۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا استثنٰی کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لاتے اور اعمال صالحہ کی بجا آوری میں ہمیشہ مشغول رہتے ہیں ان کو ہم اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ میں نہیں لوٹاتے کیونکہ وہ فطرت کو صحیح راستہ پر چلاتے اور اپنی قوتوں کا جائز اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم کے ذکر میں ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ کو پہلے کیوں رکھا ہے اور اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا ذکر پیچھے کیوں کیا ہے؟ اور اس تقدیم و تاخیر میں کیا حکمت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ چونکہ طبعی اور فطری قویٰ کے صحیح استعمال کا نام ہے اور جو شخص احکام الٰہیہ پر ایمان لاتا ہے اور پھر ان کے مطابق اعمال صالحہ بھی بجالاتا ہے وہ درحقیقت اس راستہ پر چلتا چلا جاتا ہے جو فطرت کا راستہ ہے اور اس کے نتیجہ میں اسے مذہب جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے اور وہ ایمان اور اعمال کی برکات سے متمتع ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا اِلَّا کہہ کر علیحدہ طور پر ذکر فرماتا اور اس طرح اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ میں جانے والوں اور فطری استعدادوں سے صحیح طور پر کام لینے والوں میں ایک مابہ الامتیاز قائم ہوجاتا۔ رہا یہ سوال کہ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ میں گرنے والوں کا پہلے کیوں ذکر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ لوگ اپنی پیدائش کے مقصد کو فراموش کرنے والے تھے اس لئے ضروری تھا کہ جب یہ ذکر کیا گیا تھا کہ ہم نے انسان کو معتدل القویٰ پیدا کیا ہے اور اس کی فطرت میں نیکی اور بھلائی کی قوتیں رکھ دی ہیں وہاں ساتھ ہی اس شبہ کا ازالہ بھی کر دیا جاتا کہ اگر ایسا ہے تو بعض لوگ بد کیوں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ گو ہم نے انسان کو اسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے مگر پھر بھی بعض لوگ چونکہ اپنی فطرت کو مسخ کر دیتے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں کا ناجائز استعمال کرتے ہیں وہ مقام رفعت سے گر کر ذلت اور ادبار کے گڑھے میں جا پڑتے ہیں اور انسانیت کے لئے ان کا وجود ننگ و عار کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ ان کا اپنا قصور ہوتا ہے خدا تعالیٰ اس کا ذمہ دار نہیں۔ اس کے بعد اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ

کہہ کر ایمان لانے والوں اور عمل صالح کی بجا آوری میں مشغول رہنے والوں کا استثنیٰ کر دیا اور بتادیا کہ جو لوگ احسن تقویم پر قائم رہتے اور اس راستہ پر چلتے چلے جاتے ہیں جو فطرت صحیحہ کا ہے اللہ تعالیٰ ان کو دولت ایمان سے مشرف کر دیتا ہے۔ اور انہیں اس بات کی بھی توفیق عطا فرما دیتا ہے کہ وہ اعمال صالحہ بجالائیں۔ گویا ایمان اور عمل صالح کا راستہ فطرت صحیحہ کی لائن کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ جو لوگ فطرت کو بگاڑ لیتے ہیں اور اپنے قوائے استعداد یہ سے صحیح رنگ میں کام نہیں لیتے وہ تو اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ میں جا گرتے ہیں لیکن وہ لوگ جو فطری اور طبعی راستہ پر چلتے چلے جاتے ہیں اپنی قوتوں کو برمحل استعمال کرتے ہیں اور فطرت کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کرتے ان کو ایمان بھی عطا کیا جاتا ہے اور ان میں اعمال صالحہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ میں نہیں لوٹائے جاتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو غَیْرُ مَمْنُوْنٍ یعنی جزائے غیر مقطوع حاصل ہوتی ہے اور اس طرح صحیح علم اور اس کے صحیح استعمال کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے اعلیٰ انعامات کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اٰمَنُوْا میں صحیح علم کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ علم جو مناسب حال ہو اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں اس علم کے صحیح استعمال یعنی صحیح عمل کی طرف اشارہ ہے اور یہی دو چیزیں ہیں جو روحانی ترقی میں کام آیا کرتی ہیں۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ؕ۸

پس اس (حقیقت کے کھل جانے) کے بعد کون سی چیز تجھ کو جزاء سزا کے معاملے میں جھٹلاتی ہے۔

حلّ لُغات۔ كَذَّبَهٗ كَذَّبَهٗ کے معنے ہوتے ہیں نَسَبَهٗ اِلَى الْكِذْبِ اس کی طرف کذب کا ارتکاب منسوب کیا۔ قَالَ لَهٗ اَنْتَ كَاذِبٌ یعنی اس کی نسبت کہا کہ تو جھوٹا ہے وَجَعَلَهٗ كَاذِبًا یا اس کو کاذب قرار دیا (اقرب)۔

اَلدِّيْن اَلدِّيْنُ کے معنے ہیں اَلْجَزَاءُ وَالْمُكَافَاةُ جزا سزا۔ اَلطَّاعَةُ اطاعت۔ اَلْحِسَابُ حساب۔ اَلْقَهْرُ وَالْغَلَبَةُ وَالْاِسْتِعْلَاءُ غلبہ۔ اَلسُّلْطَانُ وَالْمُلْكُ وَالْحُكْمُ بادشاہت۔ اَلتَّدْبِيْرُ تدبیر۔ اِسْمٌ لِّجَمِيْعِ مَّا يُعْبَدُ بِهِ اللهُ مختلف مذاہب کا عبادت کا طریق۔ اَلْوَرَعُ پاکیزگی۔ اَلْمَعْصِيَةُ گناہ۔ اَلْاِكْرَاهُ جبر۔ اَلْمِلَّةُ مذہب۔ اَلْعَادَةُ عادت۔ اَلْقَضَاءُ قضاء۔ اَلْحَالُ حال۔ اَلشَّاْنُ شان (اقرب)۔

تفسیر۔ کشاف کے نزدیک فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ سے مراد یہ ہے کہ کون سی چیز تجھے ان دلائل کے بعد اس بات پر ابھارتی ہے کہ جزا سزا کا انکار کر کے تو کاذب ہو جائے۔ گویا ان کے نزدیک يُكَذِّبُكَ کا خطاب کفار

سے ہے اور اس کے معنے جھٹلانے کے نہیں بلکہ اپنے آپ کو جھوٹا اور کاذب بنانے کے ہیں۔ عام طور پر ان معنوں کو قبول کیا گیا ہے۔ مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتے۔ یہاں خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور قاضی اور فراء کا یہی قول ہے اور مراد یہ ہے کہ جزا سزا کے متعلق اب تیری کون تکذیب کر سکتا ہے۔ (فتح البیان زیر آیت فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ)

فَمَا یُکَذِّبُکَ میں مَا کے معنے یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ مَا اپنے معروف معنوں کے سوا کبھی مصدریہ ہوتا ہے اور کبھی مَنْ کے معنے بھی دیتا ہے یہاں مصدری معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ یا تو اپنے معروف معنوں میں یعنی غیر ذوی الارواح کے لئے استعمال ہوا ہے یا مَنْ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (منجد)۔ اگر یہاں مَا کا استعمال غیر ذی روح کے لئے سمجھا جائے تو فَمَا یُکَذِّبُکَ کے معنے ہوں گے وہ کون سی چیز ہے جو تجھے جھٹلاتی ہے اور اگر مَا کو مَنْ کے معنوں میں سمجھا جائے تو فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ کے معنے ہوں گے وہ کون سا شخص ہے جو تجھے جھٹلاتا ہے۔

فَمَا یُکَذِّبُکَ کے چھ معنے اس دلیل کے بعد اور بِالدِّیْنِ کے معنے ہوں گے دین یا جزا سزا کے متعلق (با کے معنے اس صورت میں فِیْ کے کئے جائیں گے) یا دین کے ذریعہ سے یعنی یہ تین مثالیں جو اوپر پیش کی جا چکی ہیں کہ آدمؑ آئے شیطان نے ان کا مقابلہ کیا اور اس نے سمجھا کہ میں آدمؑ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر آخر شیطان نے ہی شکست کھائی اور آدمؑ کامیاب و بامراد ہوا۔ پھر نوحؑ آئے دشمن نے ان کا مقابلہ کیا ان کو ناکام کرنے کے لئے اس نے پورا زور لگایا اور سمجھا کہ میں نوحؑ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر آخر نوحؑ ہی کامیاب ہوئے اور ان کا دشمن ناکامی کی حالت میں تباہ ہو گیا۔ اس کے بعد موسیٰؑ آئے ان کے مقابل میں بھی دشمن اپنے لشکر سمیت اٹھا اور اس نے موسیٰؑ کو ناکام کرنے کے لئے پورا زور لگایا مگر آخر موسیٰؑ ہی کامیاب ہوئے اور دشمن ناکام ہوا۔ ان تین مثالوں کے بعد تیرے دشمن کس دلیل کی بنا پر تجھے جھٹلا سکتے ہیں اور کون سی بات ہے جو وہ تیرے خلاف پیش کر سکتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ تو کمزور اور ناتواں ہے تو ہمارے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا مگر کیا وہ نہیں دیکھتے کہ آدمؑ بھی کمزور تھا۔ نوحؑ بھی کمزور تھا۔ موسیٰؑ بھی کمزور تھا۔ اور ان کے متعلق بھی یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہوں گے پھر اگر وہ اپنی کمزوری کے باوجود کامیاب ہو گئے تو تو کمزور ہونے کے باوجود ان پر کیوں غالب نہیں آ سکتا۔ وہ کہیں گے تو نہتہ ہے اس لئے ہمارے مقابلہ میں تو جیت نہیں سکتا۔ مگر وہ اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ آدم بھی نہتہ تھا۔ نوح بھی نہتہ تھا، موسیٰ بھی نہتہ تھا۔ پس وہ اگر نہتے ہو کر دنیا پر غالب آ گئے تو تُو نہتہ ہو کر کیوں دنیا پر

غالب نہیں آ سکتا؟ غرض فرماتا ہے فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مثالوں کے بعد یہ لوگ تیرے انعام پانے اور اپنے ہلاک ہونے میں دین حقہ کی بناء پر کس طرح شک کر سکتے ہیں۔ان مثالوں کے بعد کون سی دلیل ہے جو ان کو شبہ میں مبتلا رکھ سکتی ہے یا کون سا انسان ہے جو دین کی بناء پر تیری تکذیب کر سکتا ہے۔گذشتہ انبیاء کے واقعات تیری صداقت کو روز روشن کی طرح واضح کر رہے ہیں اور ہر شخص جو تعصّب سے خالی ہو کر ان پر غور کرے وہ یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوگا کہ فطرت صحیحہ آخر بنی نوع انسان کی مدد کے لئے ابھر آتی ہے اور بنی نوع انسان دیر تک صداقت کا انکار نہیں کر سکتے۔پس جس فطرت کے ہتھیار سے سابق انبیاء اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اسی طرح تو بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔دنیا بے شک مخالفت کرے وہ جس قدر منصوبے سوچنا چاہتی ہے سوچ لے۔آخر وہی ہوگا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ فطرت صحیحہ خدا کے رسول کی مدد کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ غالب آ گیا۔اور اس کے دشمن ذلت اور ناکامی کی موت مرے۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ان پہلی تین مثالوں کی موجودگی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے دین یعنی الہامی دین کا یہ لوگ کس طرح انکار کر سکتے ہیں۔ان معنوں کے رو سے یہاں دین کے معنے جزا سزا کے نہیں ہوں گے بلکہ دین کے معنے شریعت کے ہوں گے اور آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ ان دلائل کے بعد دین کے معاملہ میں کون شخص تیرا انکار کر سکتا ہے جب وہ مانتے ہیں کہ آدمؑ کو بھی الہام ہوا۔نوحؑ کو بھی الہام ہوا۔موسیٰؑ کو بھی الہام ہوا اور یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے لئے دین لائے تو اب یہ کس طرح کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام نہیں ہو سکتا یا اس کی طرف سے کوئی نیا دین لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل نہیں ہو سکتا۔

تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ان دلائل کے بعد آیا کوئی بھی مذہبی دلیل تیرے خلاف پیش کی جا سکتی ہے یقیناً اگر وہ غور کریں تو انہیں تیری تکذیب کے لئے کسی مذہبی دلیل کا سہارا نہیں مل سکتا کیونکہ آدمؑ، نوحؑ اور ابراہیمؑ کی سنت تجھ سے پہلے موجود ہے جس معیار پر ان نبیوں کو پرکھا گیا اگر انہی دلائل پر تجھے پرکھا جائے تو تیری صداقت یقیناً ثابت ہوگی۔تکذیب کا موجب وہی دلیل ہو سکتی ہے جس کی زَد ان کے مسلمہ نبیوں پر نہ پڑتی ہو اور یہ ایسی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ان کے عقلی ڈھکوسلے تیرے ہی خلاف نہیں پڑتے بلکہ سب سابقہ انبیاء کے خلاف بھی پڑتے ہیں۔

چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ کیا اس کے بعد کوئی شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ میں تدبیر کر کے تجھے جھوٹا

ثابت کر دوں گا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ دین کے ایک معنے تدبیر کے بھی ہوتے ہیں۔ پس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ کیا اتنے بڑے نشانوں کے بعد جو ہم نے تیری صداقت میں ظاہر کئے ہیں کوئی شخص یہ خیال بھی کر سکتا ہے کہ تو ہار جائے گا اور دشمن جیت جائے گا۔

آدمؑ آیا تو دشمن نے اس کے خلاف کتنی تدابیر کی تھیں نوحؑ آیا تو اس کو ناکام بنانے کے لئے دشمن نے کیسی کیسی تدابیر اختیار کی تھیں۔ موسیٰؑ آیا تو اس کی شکست کے لئے فرعون اور اس کے ساتھیوں نے کیسی کیسی کوششوں سے کام لیا تھا۔ پھر اگر پہلے انبیاء کے دشمن ناکام ہو گئے اور ان کی تدابیر کسی کام نہ آئیں تو یہ لوگ کس طرح خیال کر سکتے ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنی تدابیر سے غالب آجائیں گے۔

پانچویں معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ تقویٰ قائم رکھتے ہوئے کون شخص تیری مخالفت کرے گا۔ کیونکہ دین کے ایک معنے ورع یعنی تقویٰ اور روحانیت کے بھی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی خشیت اور اس کی سزا کا خوف اپنے دل میں رکھتے ہوئے اور تقویٰ اور روحانیت کی راہوں پر چلتے ہوئے کوئی شخص تیری مخالفت نہیں کر سکتا۔ صرف وہی گندے اور ناپاک طبع دشمن تیری مخالفت میں کھڑے ہو سکتے ہیں جن کے اندر تقویٰ کا ایک شائبہ بھی نہ ہو اور جو نیکی اور روحانیت کے مقام سے ایسے ہی دور ہوں جیسے مشرق سے مغرب دور ہوتا ہے۔

چھٹے معنے یہ ہیں کہ اب اس کے بعد کون اِکراہ کے ساتھ تیری تکذیب کرے گا یعنی سابق دشمنوں کا انجام دیکھ کر پھر کون بدنیت ہوگا جو جبر کے ہتھیار سے تیرا مقابلہ کرنا چاہے اور یہ خیال کرے کہ میں مار پیٹ کر سیدھا کر لوں گا پہلے نبیوں کو بھی مارنے پیٹنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں مگر کیا ان کے دشمن کامیاب ہو گئے دشمن کا اکراہ اس کے کسی کام نہ آیا اور اس کا جبر خدا تعالیٰ کے دین کی اشاعت کو روک نہ سکا۔ ان مثالوں کے بعد اب ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال کس طرح آسکتا ہے کہ ہم نے اگر جبر و تشدد سے کام لیا تو ہم کامیاب ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ کا دین بہر حال پھیل کر رہے گا۔ اسلام دنیا پر غالب آئے گا اور کسی قسم کی روک اس کی ترقی میں حائل نہیں ہو سکے گی۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ؑ۝۹

ع ۹ / ۲

کیا (اب بھی کوئی خیال کر سکتا ہے کہ) اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟

تفسیر۔ فرماتا ہے کیا ان سارے دلائل اور نصیحتوں کو سن کر بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ

سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کوئی نہیں۔ جس بات کا وہ فیصلہ کر دے اس کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی روک نہیں سکتی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آدمؑ کامیاب ہو سو وہ کامیاب ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ نوحؑ کو اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو سو اسے غلبہ حاصل ہو گیا اس نے فیصلہ کیا کہ موسیٰؑ کو ترقی حاصل ہو سو اسے ترقی حاصل ہو گئی اب اس نے فیصلہ کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترقی دے سو اسے ترقی حاصل ہو جائے گی۔ اور مکہ والوں کی ہوائی باتیں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکیں گی اور دنیا دیکھ لے گی کہ آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

سُوْرَۃُ الْعَلَقِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ العلق۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَ هِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَ فِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا انیس آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے

سورۃ العلق مکی سورت ہے یہ سورۃ بلا خلاف مکی ہے امام احمد اپنی مسند میں عن عروہ عن عائشہؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ قَالَتْ اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَأْتِي الْحِرَاءَ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ وَ هُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ وَيَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى خَدِيْجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْوَحْيُ وَ هُوَ فِيْ غَارِ حِرَاءٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فِيْهِ فَقَالَ اقْرَأْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ حَتّٰى بَلَغَ مَا لَمْ يَعْلَمْ قَالَ فَرَجَعَ بِهَا تَرْجُفُ بَوَادِرُهٗ حَتّٰى دَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ فَقَالَ زَمِّلُوْنِيْ۔ زَمِّلُوْنِيْ۔ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ يَا خَدِيْجَةُ مَالِيْ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ وَ قَالَ قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ فَقَالَتْ لَهٗ كَلَّا اَبْشِرْ فَوَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَصْدُقُ الْحَدِيْثَ وَ تَحْمِلُ الْكَلَّ وَ تَقْرِي الضَّيْفَ وَ تُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ ثُمَّ انْطَلَقَتْ لَهُ الْخَدِيْجَةُ حَتّٰى اَتَتْ بِهٖ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ اَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰى بْنِ قُصَيٍّ وَ هُوَ ابْنُ عَمِّ خَدِيْجَةَ اَخِيْ اَبِيْهَا وَ كَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَ كَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ وَ كَتَبَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مِنَ الْاِنْجِيْلِ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّكْتُبَ وَ كَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا قَدْ عَمِيَ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ اَيِ ابْنَ عَمِّ اِسْمَعْ مِنَ ابْنِ اَخِيْكَ فَقَالَ وَرَقَةُ اِبْنَ اَخِيْ مَا تَرٰى فَاَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا رَاٰى فَقَالَ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ اُنْزِلَ عَلٰى عِيْسٰى لَيْتَنِيْ فِيْهِ جَذَعًا

لَيْتَنِيْ اَكُوْنُ حَيًّا حِيْنَ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ فَقَالَ وَرَقَةُ نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِيَ وَاِنْ يُّدْرِكْنِيْ يَوْمُكَ اَنْصُرْكَ نَصْرًا مُّؤَزَّرًا ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ اَنْ تُوُفِّيَ وَ فَتَرَ الْوَحْيُ فَتْرَةً حَتّٰى حَزِنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا بَلَغَنَا حَزَنًا غَدَا مِّنْهُ مِرَارًا كَيْ يَتَرَدّٰى مِنْ رُّءُوْسِ شَوَاهِقِ الْجِبَالِ فَكُلَّمَا اَوْفٰى بِذِرْوَةِ جَبَلٍ لِكَيْ يُلْقِيَ نَفْسَهٗ مِنْهُ تَبَدّٰى لَهٗ جِبْرِيْلُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا فَيَسْكُنُ بِذَالِكَ جَأْشُهٗ وَ تَقِرُّ بِهٖ نَفْسُهٗ فَيَرْجِعُ فَاِذَا اَطَالَتْ عَلَيْهِ فَتْرَةُ الْوَحْيِ غَدَا لِمِثْلِ ذَالِكَ فَاِذَا اَوْفٰى بِذِرْوَةِ الْجَبَلِ تَبَدّٰى لَهٗ جِبْرِيْلُ فَقَالَ لَهٗ مِثْلَ ذَالِكَ وَهٰذَا الْحَدِيْثُ مُخْرَجٌ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ الزُّهْرِي۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ابتداء میں جو وحی نازل ہوئی وہ رؤیا صادقہ کی صورت میں نازل ہوئی تھی۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے وہ ایسے واضح رنگ میں پوری ہوجاتی جیسے فجر کا طلوع ہوتا ہے اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ رغبت پیدا ہوئی کہ آپ خلوت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ بعض دوسری حدیثوں میں آتا ہے کہ ان دنوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے زیادہ اور کوئی چیز پیاری نہیں تھی۔ چنانچہ آپ غارِ حراء میں جاتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ عبادت کا یہ طریق تھا کہ آپ کئی کئی راتیں غارِ حراء میں بسر کر دیتے اور دن رات اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی عبادت میں مشغول رہتے۔ جتنا عرصہ آپ نے عبادت کا ارادہ کیا ہوتا تھا اتنے عرصہ کے لئے آپ حراء میں ہی اپنا زاد لے جاتے تھے اور جب وہ ختم ہوجاتا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے وہ اتنا ہی اور زاد تیار کر کے دے دیتیں اور آپ پھر اس کو ساتھ لے کر عبادت کے لئے غارِ حراء میں چلے جاتے۔ ایک دن آپ اسی طرح غارِ حراء میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے تھے کہ آپؐ پر وحی الٰہی کا آغاز ہوگیا۔ ایک فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا اِقْرَاْ یعنی پڑھ! رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ قَالَ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب میں نے یہ جواب دیا تو اس نے مجھے پکڑا اور بھینچنا شروع کر دیا۔ غطّی کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو پانی میں ڈبو دینا۔ لیکن محاورہ میں غطّی بھینچنے کو کہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں اس نے مجھے بھینچا اور اتنا بھینچا کہ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ میری مقابلہ کی طاقت ختم ہوگئی۔ یعنی میں نے سمجھا کہ اگر اس نے اب مجھے زیادہ بھینچا تو میں مرجاؤں گا۔ اس کے بعد اس نے مجھے چھوڑ دیا اور پھر کہا پڑھ! میں نے کہا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے پھر مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری مقابلہ کی طاقت ختم ہوگئی۔ اس پر اس نے پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَاْ۔ پڑھ! میں

نے کہا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے تیسری دفعہ پھر مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری مقابلہ کی طاقت ختم ہوگئی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور (اس سورۃ کی یہ آیات پڑھنے کو) کہا اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ۔

اس کے بعد راوی کے اپنے الفاظ میں حدیث آتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے فوراً بعد اپنے گھر واپس آئے اور آپ کی حالت یہ تھی کہ اس وقت آپ کے کندھے خوف سے کانپ رہے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر پہنچے تو آپ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا زَمِّلُوۡنِیۡ۔ زَمِّلُوۡنِیۡ مجھے کپڑا اوڑھادو۔ مجھے کپڑا اوڑھادو۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں سے ڈھانک دیا یہاں تک کہ آپ کا خوف دور ہوگیا۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدیجہ! مجھے کیا ہوگیا ہے؟ پھر آپ نے ساری بات سنائی اور فرمایا کہ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہوگیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا ایسا خیال مت کیجئے بلکہ آپ خوش ہوجایئے۔ مجھے اللہ ہی کی قسم وہ آپ کو کبھی نہیں چھوڑے گا کیونکہ آپ اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں، ہر سچی بات کی آپ تصدیق کرتے ہیں، خدا تعالیٰ کی کسی بات کا انکار نہیں کرتے، جو لوگ اپنا بوجھ نہیں اٹھاسکتے ان کے بوجھ آپ خود اٹھاتے ہیں، ہر آنے جانے والے کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور جو لوگ ایسی مصائب میں مبتلا ہوں کہ اس میں ان کی شرارت کا دخل نہ ہو بلکہ حوادثِ زمانہ کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچی ہو آپ ان کا بوجھ بٹاتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لیا اور آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو حضرت خدیجہؓ کے ابن عم یعنی چچازاد بھائی تھے۔ یہ ورقہ بن نوفل ان لوگوں میں سے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہوگئے تھے۔ وہ تورات کو عربی زبان میں لکھوایا کرتے تھے (یا اندھا ہونے سے پہلے لکھا کرتے تھے) اور جتنی خدا تعالیٰ توفیق دیتا تھا عبرانی زبان سے انجیل بھی لکھوایا کرتے تھے (یعنی اس کا عربی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے تھے) وَكَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا قَدْ عَمِيَ اور وہ ایک بوڑھے آدمی تھے جو بڑھاپے میں آ کر نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے مختصراً سب حال کہا اور کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے! اپنے بھائی کے بیٹے کے منہ سے سب بات سن لو۔ ورقہ نے کہا اے میرے بھائی کے بیٹے تو نے کیا دیکھا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ تفصیلاً بتایا۔ ورقہ نے تمام باتیں سن کر کہا یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ کاش! میں اس وقت جوان ہوتا۔ کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب تیری قوم تجھے نکال دے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ ورقہ نے کہا ہاں

ہاں تیری قوم تجھے نکال دے گی کیونکہ آج تک کوئی شخص اس تعلیم کو لے کر نہیں آیا جس تعلیم کو تو لے کر کھڑا ہوا ہے۔ مگر اس کی قوم نے اس سے ضرور دشمنی کی ہے۔ اگر مجھے بھی وہ دن دیکھنا نصیب ہوا جب تو اپنی قوم کے سامنے اس تعلیم کا اعلان کرے گا اور قوم تیری شدید مخالفت کرے گی یہاں تک کہ وہ تجھے اس شہر میں سے نکال دے گی تو میں کمر باندھ کر تیری مدد کروں گا۔ مگر اس واقعہ کے تھوڑے دنوں کے بعد ورقہ بن نوفل فوت ہو گئے اور وحی میں وقفہ پڑ گیا۔ ہمیں لوگوں کی طرف سے جو خبریں پہنچیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فترۃ وحی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی غم ہوا۔ کئی دفعہ آپ باہر جاتے اور ارادہ کرتے کہ کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی سے اپنے آپ کو نیچے گرا دیں مگر جب کبھی آپ پہاڑ کی کسی چوٹی پر اس ارادہ کے ساتھ جاتے کہ اپنے آپ کو نیچے پھینک دیں تو جبریل آتے اور کہتے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ اس سے آپ کا جوش تھم جاتا، آپ کا نفس ٹھنڈا ہو جاتا اور آپ واپس لوٹ آتے۔ مگر جب فترۃ وحی کا زمانہ لمبا ہو گیا تو ایک دفعہ پھر آپ اسی ارادہ سے نکلے اور پہاڑ کی چوٹی پر گئے مگر وہاں آپ کو پھر جبریل نظر آئے اور انہوں نے پھر اسی قسم کی بات کی۔

یہ روایت ابتداء وحی کے متعلق مسند احمد بن حنبل میں آتی ہے۔ امام بخاری نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب کے ابتدائی باب یعنی بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ میں درج کیا ہے۔ اسی طرح بخاری جلد ۴ باب علم التعبیر میں بھی یہ حدیث آتی ہے مگر مسند احمد بن حنبل اور بخاری کی اس روایت میں کسی قدر فرق پایا جاتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ اس حدیث میں آتا ہے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تَصْدُقُ الْحَدِيْثَ مگر بخاری بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ میں جو حدیث درج ہے اس میں تَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی وہ خوبیاں جو دنیا سے معدوم ہو چکی ہیں وہ آپ کما رہے ہیں مطلب یہ کہ وہ اخلاقِ فاضلہ جن پر دنیا عمل نہیں کرتی ان پر آپ کا عمل پایا جاتا ہے۔

دوسرے بخاری کی ابتدائی حدیث میں ورقہ بن نوفل کے متعلق یہ ذکر نہیں آتا کہ كَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ وہ تورات کو عربی زبان میں لکھوایا کرتے تھے (اصل الفاظ یَكْتُبُ کے ہیں جس کے معنے لکھنے کے ہیں لیکن چونکہ وہ اندھے ہو گئے تھے اس لئے اس کے معنے یہاں لکھوانے کے ہیں۔ ان معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے یا پھر اس کے یہ معنے ہیں کہ اندھا ہونے سے پہلے ایسا کیا کرتے تھے)۔

تیسرے اس حدیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ پہاڑ سے اپنے آپ کو نیچے گرا دینے کا ارادہ کیا لیکن بخاری کی وہ حدیث جو بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ میں آتی ہے۔ اس میں اس واقعہ کا

ذکر نہیں آتا لیکن بخاری جلد ۴ باب التعبیر میں جو حدیث آتی ہے اس میں تَصْدُقُ الْحَدِیْثَ کے بھی الفاظ ہیں۔ کَانَ یَکْتُبُ الْکِتَابَ الْعَرَبِیَّ کے بھی الفاظ ہیں اور اس واقعہ کا بھی ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ پہاڑ کی چوٹی سے اپنے آپ کو گرانے کا ارادہ کیا۔

چوتھے اس حدیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ ورقہ بن نوفل نے کہا یہ وہی ناموس ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا۔لیکن بخاری میں یہ ذکر آتا ہے کہ اس نے کہا ھٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِیْ اُنْزِلَ عَلٰی مُوْسٰی یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔

بہرحال اس معمولی فرق کے باوجود نفسِ مضمون دونوں حدیثوں کا ایک ہی ہے۔ چنانچہ اسی حدیث کی بناء پر شراح اور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ پہلی وحی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ فَاَوَّلُ شَیْءٍ نَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ھٰذِہِ الْاٰیَاتُ الْکَرِیْمَاتُ الْمُبَارَکَاتُ وَ ھُنَّ اَوَّلُ رَحْمَۃٍ رَحِمَ اللّٰہُ بِھَا الْعِبَادَ وَ اَوَّلُ نِعْمَۃٍ اَنْعَمَ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْھِمْ (تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ العلق)۔یعنی یہ قرآن کریم کی پہلی بزرگ اور مبارک آیات ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں۔ یہ پہلی رحمت ہیں جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا اور پہلی نعمت ہیں جس کے ذریعہ اس نے اپنے فضل سے انہیں سرفراز فرمایا۔

اس جگہ ضمنی طور پر میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی بعض آیات میں بعض انبیاء کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ وہ خوبیاں ان میں ساری دنیا کے مقابلہ میں ممتاز طور پر پائی جاتی تھیں حالانکہ یہ درست نہیں ہوتا۔ زبان کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی کی خاص طور پر کوئی خوبی بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اسے ساری دنیا کے مقابلہ میں اس خوبی کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہے بلکہ مراد محض اس زمانہ یا اس کی قوم یا خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً اسی جگہ ابن کثیر یہ نہیں کہتے کہ ھُنَّ اَوَّلُ رَحْمَۃٍ رَحِمَ اللّٰہُ بِھَا عَلٰی اُمَّۃِ الْمُحَمَّدِیَّۃِ یہ وہ پہلی رحمت ہے جو امت محمدیہ پر نازل ہوئی بلکہ کہتے ہیں ھُنَّ اَوَّلُ رَحْمَۃٍ رَحِمَ اللّٰہُ بِھَا الْعِبَادَ۔ یہ آیات وہ پہلی رحمت ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم وکرم کی بارش کا آغاز فرمایا۔ پھر وہ کہتے ہیں وَ اَوَّلُ نِعْمَۃٍ اَنْعَمَ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْھِمْ۔ یہ پہلی نعمت ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آئی اور جس کے ذریعہ اس نے اپنے بندوں پر بہت بڑا انعام نازل فرمایا۔ حالانکہ عیسیٰؑ کا کلام اس سے پہلے آچکا تھا۔ موسیٰؑ کی کتاب اس سے پہلے آچکی تھی، ابراہیمؑ کے صحف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو چکے تھے۔ درحقیقت یہ ایک

محاورہ ہے جو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ سننے والا پاگل نہیں۔ جب ہم کہیں گے کہ فلاں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے تو لازماً وہ اسے ایک زمانہ کے لوگوں تک محدود رکھے گا۔ یہ نہیں سمجھے گا کہ شروع سے لے کر قیامت تک کے لوگوں پر اسے فضیلت حاصل ہوگئی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں بعض انبیاء کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہ بھی اسی طرح اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے ہیں نہ کہ ساری دنیا کے لحاظ سے۔ جس طرح اس جگہ ابن کثیر نے قرآن کریم کی ان آیات کو پہلی رحمت اور پہلی نعمت قرار دیا ہے حالانکہ عیسٰیؑ اور موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ سب اللہ تعالیٰ کا کلام لا چکے تھے۔ بہرحال چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر یہ پہلی رحمت تھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی اس لئے انہوں نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے اسے پہلی رحمت قرار دے دیا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں هِیَ اَوَّلُ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (فتح البیان زیر سورۃ العلق)۔ یہ قرآن میں سے پہلا حصہ ہے جو نازل ہوا۔ ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں هٰذِهٖ اَوَّلُ سُوْرَةٍ اُنْزِلَتْ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (فتح البیان زیر سورۃ العلق) یہ پہلی سورۃ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہی روایت ہے۔ پھر لکھا ہے وَقَدْ ذَهَبَ الْجُمْهُوْرُ اِلٰی اَنَّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ اَوَّلُ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ بَعْدَهٗ نٓ وَالْقَلَمِ ثُمَّ الْمُزَّمِّلُ ثُمَّ الْمُدَّثِّرُ (فتح البیان زیر سورۃ العلق) کہ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ یہ پہلی سورۃ ہے جو قرآن کریم میں سے نازل ہوئی۔ اس کے بعد نون والقلم نازل ہوئی پھر مزمل نازل ہوئی اور پھر مدثر نازل ہوئی۔

اسی سلسلہ میں بخاری میں کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ کے باب کے ماتحت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ایک دفعہ گھر سے باہر جا رہا تھا کہ میں نے آسمان پر اسی فرشتہ کو دیکھا جو غارِ حرا میں آیا تھا کہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس سے میں بہت مرعوب ہوا۔ میں گھر آیا اور کہا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ۔ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ فَحَمِیَ الْوَحْیُ وَ تَتَابَعَ (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) یعنی جب میں گھر آیا اور مجھ پر کپڑا اوڑھا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ مدثر کی یہ آیات نازل کیں کہ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ اس کے بعد وحی جلد جلد نازل ہونی شروع ہوگئی۔ ان دونوں اقوال میں بظاہر کچھ اختلاف نظر آتا ہے یعنی خازن نے دوسری روایت کو نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اِقْرَاْ کے بعد سورۂ نون والقلم نازل ہوئی۔ پھر سورۂ مزمل نازل ہوئی اور پھر سورۂ مدثر نازل ہوئی اور بخاری کی روایت سے

یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِقْرَاْ کے بعد مدثر نازل ہوئی۔لیکن یہ اختلاف حقیقی نہیں درحقیقت ایک امر کے نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ اختلاف پیدا ہوا ہے۔

فترۃ وحی کا زمانہ لوگ عام طور پر خیال کرتے ہیں کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کے بعد فترۃ وحی ہوئی ہے حالانکہ جو حدیث بخاری میں بیان ہوئی ہے اس سے یہ پتہ نہیں لگتا۔اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی اس کے کچھ عرصہ بعد ورقہ بن نوفل فوت ہوئے اور پھر فترۃ کا زمانہ آ گیا۔درمیانی عرصہ کا اس حدیث میں ذکر نہیں کیا گیا۔فترۃ وحی چونکہ ایک اہم مسئلہ تھا اس لئے اس کا ذکر کر دیا گیا مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اِقْرَاْ کے بعد فترۃ ہوئی ہے بلکہ اِقْرَاْ کے بعد کچھ اور کلام نازل ہوا تھا اور اس کے بعد فترۃ ہوئی ہے اور یہی بات قرین قیاس بھی ہے۔چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ تو اس میں تو کوئی حکم بیان نہیں ہوا پھر کیا حکم دیا تھا جس کے متعلق اِقْرَاْ کہا گیا تھا۔اِقْرَاْ کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ کوئی باتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہنی ہیں۔وہ کہنے والی باتیں بہرحال اِقْرَاْ کے بعد نازل ہونی چاہیے تھیں۔چنانچہ اِقْرَاْ کے بعد نون والقلم نازل ہوئی اس کے بعد سورۃ مزمل نازل ہوئی اور پھر فترۃ کا زمانہ آ گیا۔پس میرے نزدیک اصل واقعہ یہ ہے کہ اِقْرَاْ کی ابتدائی آیات اور اسی طرح نون والقلم اور سورۃ المزمل کی کچھ آیات پہلے نازل ہوئیں پھر فترۃ وحی ہوئی اور اس کے ختم ہونے پر سورۃ المدثر نازل ہوئی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ اس کا یہ مفہوم نہیں تھا کہ میں کتاب نہیں پڑھ سکتا کیونکہ کتاب تو اس جگہ کوئی پیش ہی نہیں تھی۔ایک حدیث میں بے شک آتا ہے کہ جبریل کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔مگر اس حدیث میں یہ ذکر نہیں آتا کہ جبریل نے وہ کپڑا دکھا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا ہو کہ اس پر جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھو کیونکہ اسی حدیث میں یہ ذکر بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کیا پڑھوں۔اگر اس نے کپڑا دکھا کر کچھ پڑھانا ہوتا تو آپ یہ نہ کہہ سکتے کہ میں کیا پڑھوں (دُرّ منثور زیر سورۃ علق)۔حقیقت یہ ہے کہ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ کے الفاظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکسار کے طور پر استعمال فرمائے تھے اور آپ ڈرتے تھے کہ میں عہدۂ نبوت کی اہم ذمہ داریوں کو پوری خوش اسلوبی سے ادا بھی کر سکوں گا یا نہیں۔یہی حال ہر نبی کا ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انہیں فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض

کیا کہ میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصاحت رکھتا ہے اسے بھی میرے ساتھ بھجوا دیجئے ایسا نہ ہو کہ میں اپنے ما فی الضمیر کو وہاں عمدگی سے بیان نہ کرسکوں اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر جاؤں (القصص:۳۵)۔ یہ تو قرآن کریم کا بیان ہے تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون کا نام نہیں لیا بلکہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا کام ان کے سپرد کیا گیا تو انہوں نے کہا

''اے میرے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں۔جس کو چاہے تو اس کے وسیلہ سے بھیج''۔

(خروج باب ۴ آیت ۱۳)

یعنی میں اس خدمت کا اہل نہیں کسی اور شخص کو اس عہدہ پر کھڑا کر دے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی یہ کام سپرد کر دیا۔مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چالیس دن کے لئے پہاڑ پر گئے تو بعد میں حضرت ہارونؑ بنی اسرائیل کو سنبھال نہ سکے۔باوجود ان کے منع کرنے کے وہ شرک میں مبتلا ہو گئے اور بچھڑے کی پرستش کرنے لگ گئے (الاعراف: ۱۴۳ تا ۱۵۱)۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا کہ دیکھ لو انتخاب وہی صحیح تھا جو ہم نے کیا۔تم نے اپنے لئے ہارونؑ کا انتخاب کیا تھا مگر ہارون قوم کی نگرانی نہ کرسکا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب نبوت کا کام کسی عظیم الشان انسان کے سپرد کیا جاتا ہے تو طبعی طور پر وہ گھبراتا اور ہچکچاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں میں اپنے فرائض کی بجاآوری میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہ ہوجاؤں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں حجاب بھی تھا، انکسار بھی تھا، اپنے اہم فرائض کو دیکھتے ہوئے خوف بھی تھا۔اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے استغناء کا بھی آپ کو احساس تھا اور ادب کی وجہ سے آپ یہ کہنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ میری جگہ کسی اور کو مقرر کر دیں میں اس کام کے قابل نہیں۔ان وجوہ کی بناء پر جیسے تجاہل عارفانہ کے طور پر کوئی بات کہہ دی جاتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں پڑھنا نہیں جانتا۔حالانکہ اس وقت آپ کو پڑھنے کے لئے نہیں کہا گیا تھا۔درحقیقت یہ ایک ادب کا طریق تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے اختیار فرمایا۔آپ نے سمجھا کہ براہ راست انکار کرنا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہوگی اور اگر میں نے کہا کہ میں اس کام کے قابل نہیں تو یہ بھی ادب کے خلاف ہوگا اس لئے میں کوئی اور رنگ اختیار کروں۔چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رنگ اختیار کیا کہ آپ نے فرمایا مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ میں تو پڑھے لکھے آدمیوں میں سے نہیں ہوں۔میں نے کیا کام کرنا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ خود فرشتہ نے بھی آخر میں

ظاہر کر دیا تھا کہ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ پڑھو بلکہ مطلب یہ تھا کہ جو کچھ میں کہتا جاؤں اسے ساتھ ساتھ دہراتے جاؤ۔ قَرَاَ کے دونوں معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو دہرانا یا لکھے ہوئے کو پڑھنا۔ پس جب فرشتے نے کہا اِقْرَاْ تو درحقیقت اس کے یہ معنے نہ تھے کہ لکھے ہوئے کو پڑھو۔ کیونکہ لکھا ہوا پڑھنا اس وقت مدنظر ہی نہیں تھا۔ فرشتے کا مقصد صرف یہ تھا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے زبانی دہراتے جاؤ چنانچہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کو دہرا دیا تو چونکہ اس کا مقصد حاصل ہو گیا اس لئے وہ واپس چلا گیا۔

ابتداء وحی ایک نہایت اہم مسئلہ ہے جیسا کہ ابن کثیر نے کہا ہے یہ پہلی رحمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نوازا اور پہلی نعمت ہے جس سے اس نے اپنے فضل سے انہیں حصہ عطا فرمایا۔ پس اس سورۃ کی ابتدائی آیات اس لحاظ سے خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں کہ یہ قرآن کریم کے لئے بمنزلہ بیج اور گٹھلی کے ہیں اور ان آیات کے نزول کے بعد باقی قرآن نازل ہوا ہے۔ یوں تو سارا قرآن ہی اہمیت رکھتا ہے مگر جذباتی طور پر اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ ایسی اہمیت رکھنے والی آیات ہیں کہ جب انسان ان کو پڑھتا ہے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے یہ وہ آیات ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے قرآن سے روشناس کرایا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے دوست آپس میں ملتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے بعض دفعہ خاص طور پر اس امر کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کی دوستی کا آغاز کس طرح ہوا یا میاں بیوی آپس میں مذاکرہ کرتے ہیں تو وہ بھی بعض دفعہ بڑے شوق سے یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہمارا نکاح کس طرح ہوا۔ اگر معمولی دنیوی واقعات ایسی اہمیت رکھتے ہیں کہ انسان ان کا ذکر کرنے پر مجبور ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا وہ آخری کلام جس کے ذریعہ دنیا قیامت تک ہدایت پاتی رہے گی، جس کے ذریعہ انسانی پیدائش کا مقصد پورا ہوا، جس کے ذریعہ انسان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا جس کے ذریعہ خالق اور مخلوق کا تعلق آپس میں قائم کیا گیا، اس کی بنیاد جن آیات پر ہے ان کی اہمیت اور عظمت سے کون شخص انکار کر سکتا ہے۔ جس طرح میاں بیوی شوق سے باہم ذکر کرتے ہیں کہ ہمارا نکاح کس طرح ہوا یا دوست شوق سے یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہماری دوستی کا آغاز کس طرح ہوا اسی طرح اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ وہ الفاظ ہیں جن کو پڑھتے ہی انسان کا دل فرطِ محبت سے اُچھلنے لگتا ہے، اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے، اُس کے خوابیدہ جذبات میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے یہ وہ آیات ہیں جن کے ذریعہ مجھے اپنے رب کا وصال حاصل ہوا۔ جن کے ذریعہ انسان اور خدا کا باہمی رشتہ جوڑا گیا اور دوستی کا وہ آخری مرحلہ قائم کیا گیا جو خدا اور بندے کے درمیان ہونا چاہیے۔

بدء الوحی کے واقعات پر دشمنوں کے اعتراضات پس ابتداء وحی ایک نہایت ہی اہمیت رکھنے اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی چیز ہے۔ اسی وجہ سے دشمنوں کی بھی اس پر خاص طور پر نظر پڑی ہے اور انہوں نے ان آیات اور ابتداء وحی سے تعلق رکھنے والے واقعات سے قسم قسم کے استدلال کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وحی کی تنقیص کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی کہتا ہے وحی ایک ڈھکونسلا ہے، کوئی کہتا ہے وحی ایک بیماری کا حملہ تھی۔ چنانچہ آپ کا زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ کہنا اس پر شاہد ہے۔ کئی کہتے ہیں یہ بیماری اور جھوٹ دونوں کا اجتماع تھا۔ پھر واقعہ پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ آپ کے گھبرانے پر بھی اعتراض ہے کہ آپ کو وحی پر شک تھا یا یہ اعتراض ہے کہ اپنی قالبیت پر شک تھا یا یہ کہ آپ نے خدا تعالیٰ کا حکم ماننے سے پہلو تہی کی۔ یہ بھی اعتراض ہے کہ اس وحی کی نوعیت کیا تھی۔ آیا یہ مادی نظارہ یا خواب تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آئی۔
(The Life of Muhammad, by W. Muir p:38,44,54,56. A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry, vol:4 p:191,259) غرض مختلف دشمنوں نے اپنے اپنے رنگ میں استدلال کیا ہے۔

غیر مسلم مصنفین کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات اُٹھائیں جس سے قرآن کریم پر حملہ ہو سکے۔ چنانچہ بعض نے یہ طریق اختیار کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں یہ وحی ایک نظارہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور چونکہ انسانی دماغ اس قسم کا نظارہ دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا اس لئے یہ غیر معمولی اور مافوق الطبیعات نظارہ درحقیقت علامت تھی اس بات کی کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں خشکی پیدا ہو کر جنون رونما ہو گیا تھا۔ لیکن بعض دوسرے مخالفین کا دماغ اس طرف گیا ہے کہ ممکن ہے کچھ لوگ جنون کی تھیوری کو تسلیم نہ کریں اور وہ اس بات کو مان لیں کہ سچ مچ اس قسم کا واقعہ ہو سکتا ہے اور اگر انہوں نے مان لیا تو فرشتے دیکھنے یا اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے میں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسرائیل کے نبیوں کے مشابہ قرار دے دیں گے اور یہ بڑی تکلیف دہ بات ہوگی۔ پس انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ یہ کوئی نظارہ نہیں تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا بلکہ ایک خواب تھی جو آپ کو آئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بات ہماری روایات میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ ابن ہشام لکھتے ہیں حَتّٰی اِذَا کَانَتِ اللَّیْلَةُ الَّتِیْ اَکْرَمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْهَا بِرِسَالَتِهٖ وَ رَحِمَ الْعِبَادَ بِهَا جَاءَهٗ جِبْرِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ بِاَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰی یعنی جب وہ رات آ گئی جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی رسالت سے مفتخر فرمایا اور اپنے بندوں پر رحم کیا تو جبریل اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آگے لکھا ہے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَنِیْ جِبْرِیْلُ وَ اَنَا نَائِمٌ بِنَمَطٍ مِّنْ دِیْبَاجٍ فِیْهِ کِتَابٌ فَقَالَ اِقْرَاْ۔

قَالَ قُلْتُ مَا اَقْرَاُ۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میرے پاس جبریل آیا وَ اَنَا نَائِمٌ اور اس وقت میں سو رہا تھا ایک ریشمی کپڑا ان کے پاس تھا جس میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا پڑھو! میں نے کہا مجھے تو پڑھنا نہیں آتا۔ قَالَ فَغَطَّنِیْ بِہٖ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّہُ الْمَوْتُ انہوں نے مجھے خوب بھینچا یہاں تک کہ میں نے سمجھا میں مرنے لگا ہوں۔ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اِقْرَاْ قُلْتُ مَا اَقْرَاُ۔ پھر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو! میں نے کہا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ فَغَطَّنِیْ بِہٖ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّہُ الْمَوْتُ انہوں نے پھر مجھے ڈھانپ لیا یہاں تک کہ میں نے سمجھا میں اب مرنے لگا ہوں۔ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اِقْرَاْ قُلْتُ مَا اَقْرَاُ۔ پھر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو! میں نے کہا میں کیا پڑھوں؟ مَا اَقُوْلُ ذَالِكَ اِلَّا افْتِدَاءً مِّنْہُ اَنْ یَّعُوْدَ لِیْ بِمِثْلِ مَا صَنَعَ بِیْ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے یہ فقرہ کہ میں کیا پڑھوں اس لئے کہا تھا تا اس ذریعہ سے میں اس صدمہ سے بچ جاؤں جو ان کے بھینچنے سے مجھے پہنچا تھا۔ اس پر انہوں نے کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ قَالَ فَقَرَاْتُھَا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس پر میں نے یہ فقرے دہرائے ثُمَّ انْتَھٰی فَانْصَرَفَ عَنِّیْ وَھَبَبْتُ مِنْ نَّوْمِیْ۔ پھر انہوں نے بس کر دیا اور مجھ سے لوٹ کر چلے گئے اور میں اپنی نیند سے بیدار ہو گیا۔ فَكَاَنَّمَا كُتِبَتْ فِیْ قَلْبِیْ كِتَابًا۔ اس وقت مجھے یوں معلوم ہوا کہ میرے دل پر یہ تمام الفاظ نقش کر دیے گئے ہیں۔

بدء الوحی پر مخالفین کا اعتراض کہ یہ خواب کا واقعہ تھا اس حوالہ میں صاف طور پر نیند کا لفظ آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم اس روایت پر بنیاد رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ درحقیقت یہ ایک خواب تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھی۔ اس تاویل سے ان کا منشاء یہ ہے کہ بائبل کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے انسان کو بالمشافہ نظر آتے ہیں اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اگر ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ نظر نہیں آیا بلکہ ایک خواب تھی جو آپ نے دیکھی تو بائبل کے نبیوں سے آپ کی مشابہت ثابت نہیں ہو سکے گی۔ گو بخاری اور مسند احمد بن حنبل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جو حدیث آتی ہے اس میں صاف طور پر یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں کے سامنے جبریل کو دیکھا۔ مگر چونکہ یہ حدیث ان کے منشاء کے خلاف ہے اس لئے وہ بخاری یا مسند احمد بن حنبل کی حدیث کی بجائے ابن ہشام کی اس روایت پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فرشتہ اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آیا صرف ایک خواب تھی جو حراء میں آپ کو آئی۔ اگر اس خواب کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی انبیاء بنی اسرائیل

سے آپ کی مشابہت ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کو خدا تعالیٰ کے فرشتے آمنے سامنے نظر آتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک خواب تھی۔

جن لوگوں نے اس بات پر زور دینا چاہا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں نعوذ باللہ کوئی نقص واقعہ ہو گیا تھا انہوں نے ابن ہشام کی روایت کو نظر انداز کر کے بخاری اور مسند احمد بن حنبل کی وہ حدیث لے لی ہے جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرشتہ کو دیکھا۔ وہ کہتے ہیں چونکہ انسانی دماغ اس قسم کا نظارہ نہیں دیکھ سکتا اس لئے یہ نظارہ علامت تھی اس بات کی کہ آپ کا دماغ نعوذ باللہ خراب ہو گیا تھا۔

بدء الوحی پر یوروپین مصنفین کے اعتراض کی اصل وجہ میرے نزدیک یوروپین مصنّفین کی نیت خواہ کچھ ہو اس بارہ میں اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نظارۂ کشف کی حقیقت کو سمجھتے ہی نہیں۔ وہ اس قدر مذہب سے دور جا پڑے ہیں کہ کشفی نظارے ان کو بہت ہی کم نظر آتے ہیں بلکہ خوابیں بھی ان کو بہت کم آتی ہیں۔ گو خدائی سنت یہ ہے کہ ہر قسم کے طبقہ کو خوابیں دکھائی جاتی ہیں مگر پھر بھی یوروپین لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کو ساری عمر میں بھی کبھی کوئی خواب نہیں آئی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن کو کام کرتے ہیں اور رات کو ناچتے ہیں پھر شراب پی کر یا نیند کی دوائیں کھا کر سو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے انہیں ایسی خوابیں بھی نہیں آتیں جن کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لکھا ہے کہ وہ کنچنیوں کو بھی آ جاتی ہیں (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۵)۔ کیونکہ شراب کا نشہ ان کے دماغ کو بالکل معطل کر دیتا ہے۔ پس میرے نزدیک اس بارہ میں اختلاف نظارۂ کشف کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے اور مغربی لوگ اس علم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

کشف کی حقیقت بات یہ ہے کہ جب کشف کی حالت انسان پر طاری ہوتی ہے تو جیسا کہ صاحب تجربہ لوگ جانتے ہیں اس وقت انسان اپنے آپ پر ایک ربودیت کی حالت محسوس کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس دنیا سے کھینچ کر کسی اور دنیا میں لے جایا گیا ہے۔ اسے اپنے اردگرد کی سب چیزیں نظر آتی ہیں، مکان کی دیواریں نظر آتی ہیں، گھر کا سامان نظر آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی اور حالت اس پر طاری ہو گئی ہے جو اسے اس دنیا سے الگ لے گئی ہے۔ اسی طرح اس حالت کے جاتے وقت بھی انسان یوں معلوم کرتا ہے کہ وہ گویا ایک غیر معمولی حالت سے پھر حواس میں آ گیا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ریڈیو کو ایک میٹر سے دوسرے میٹر پر تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ پہلے وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے اس دنیا سے کھینچ کر کسی اور دنیا میں لے جایا گیا ہے اور جب وہ حالت جاتی ہے تو وہ یک دم محسوس کرتا ہے کہ اسے کسی اور دنیا سے اس دنیا میں واپس لوٹا دیا گیا ہے۔ اگر ایسا

نہ ہوتو انسان کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے یا اس کے نفس کا خیال ہے۔ پس بوجہ اس کے کہ وہ حالت کامل نیند کی نہیں ہوتی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میں نے جاگتے ہوئے ایسا دیکھا اور بوجہ اس کے کہ جاگنے کی حالت پر ایک خاص تصرف کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نیند طاری ہوئی اور اس میں یہ یہ دیکھا اور میں نے خود اس کا تجربہ کیا ہے اس لئے مجھے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نظر نہیں آتی۔

پس یہ مادی نظارہ نہیں تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا۔ مگر بوجہ اس کے کہ آپ کے حواس ظاہری کام کر رہے تھے۔ ہم اسے یقظہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ درحقیقت کشف ایک ما بین النوم والیقظہ کیفیت کا نام ہے چونکہ وہ حالت کامل نیند کی نہیں ہوتی اس لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جاگتے ہوئے فلاں نظارہ دیکھا گیا اور چونکہ جاگنے کی حالت پر خاص تصرف کیا جاتا ہے اس لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نیند کی حالت میں ہم نے ایسا نظارہ دیکھا۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی موقع پر یہ فرمادیا کہ میں نے جاگتے ہوئے ایسا نظارہ دیکھا تھا اور کسی موقع پر آپ نے یہ فرمادیا ہوگا کہ میں نے نیند کی حالت میں ایسا نظارہ دیکھا۔ جو لوگ صاحب کشوف ہیں وہ ہمیشہ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں میں یہ نظارہ دیکھ کر جاگ پڑا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میں ربودگی کی کیفیت سے عام حالت میں آ گیا اور کبھی کہتے ہیں میں نے جاگتے ہوئے فلاں نظارہ دیکھا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میرے حواس ظاہری بھی اس وقت کام کر رہے تھے۔ پس یہ دونوں باتیں آپس میں کوئی اختلاف نہیں رکھتیں۔ محض کشف کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یوروپین مصنفین کو یہ غلطی لگی ہے۔

مسند احمد بن حنبل اور بخاری کی حدیث کو یوں بھی حل کیا جا سکتا ہے کہ بعض دفعہ خواب کا لفظ نہیں بولا جاتا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں قرآن کریم حضرت یوسف علیہ السلام کی رؤیا کی نسبت فرماتا ہے کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ (یوسف:۵) کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں یہاں خواب کا کوئی لفظ نہیں صرف اتنا ذکر ہے کہ میں نے دیکھا۔ مگر اگلی آیت میں ہی حضرت یعقوب علیہ السلام یہ بات سن کر فرماتے ہیں یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ (یوسف:۶) اے میرے بیٹے تو اس رؤیا کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کیجیو۔ اب دیکھو ایک آیت میں اسے ظاہری نظارہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری میں اسے رؤیا قرار دیا گیا ہے پس یہ ایک طریقِ بیان ہے جو عربی زبان میں رائج ہے اس سے کسی اختلاف کا ثبوت نہیں نکل سکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں الگ الگ محاورات رائج ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں ایسے نظاروں

کے لئے رؤیا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنے دیکھنے کے ہیں۔ گو محاورہ میں ایسے نظارہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نیند کی حالت میں دیکھا جائے۔لیکن فارسی نے اس کے لئے خواب کا لفظ تجویز کیا ہے جس کے معنے نیند کے ہیں۔ یہ بھی ایک فرق ہے جو عربی زبان کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے قرآن کریم نے ہر جگہ رؤیا کا لفظ ہی خواب کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ درحقیقت وہی حالت اصل بیداری کی ہوتی ہے جس میں انسان خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہو گو ظاہری طور پر اس پر نیند یا ربودگی کی کیفیت طاری ہو۔لیکن ایرانی لوگ چونکہ ماہر نہیں تھے انہوں نے خواب کا لفظ ایجاد کر لیا حالانکہ خواب کے معنے محض نیند کے ہیں پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر کسی جگہ یہ فرمایا ہے کہ میں نیند سے بیدار ہو گیا اور دوسری جگہ آپ نے صرف اتنا فرمایا ہے کہ میں نے ایسا نظارہ دیکھا تو اس میں اختلاف کی کوئی بات نہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ ذکر کیا کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو سجدہ کرتے دیکھا ہے تو اس میں خواب کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسی نظارہ کے متعلق رؤیا کا لفظ استعمال کر دیا جو محاورہ میں نیند کی حالت میں دیکھے ہوئے نظارہ کے متعلق بولا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی ان معنوں میں رؤیا کا لفظ استعمال کیا ہے آپ فرماتی ہیں اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی کا آغاز رؤیا صالحہ سے ہوا۔ یہاں رؤیا کا لفظ صرف انہی نظاروں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو انسان سوتے ہوئے دیکھتا ہے پس یوروپین مصنفین کی طرف سے جو اختلاف پیش کیا جاتا ہے وہ درحقیقت اختلاف نہیں بلکہ محاورہ زبان کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔اگر یہ رؤیا ہی تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھی تو بہرحال جیسا کہ ہمیں یقین اور وثوق ہے یہ رؤیا اس قسم کی نہیں تھی جس میں انسان پر کامل نیند طاری ہوتی ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی فرق کرتی ہیں۔آپ ایک طرف تو یہ فرماتی ہیں کہ اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا رؤیا صادقہ سے ہوئی جو آپ سوتے ہوئے دیکھتے مگر اس دوسری وحی کے متعلق جس میں جبریل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔آپ فرماتی ہیں فَجَاءَهُ الْمَلَكُ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتہ آیا۔

بدء الوحی کا واقعہ خواب کا واقعہ نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نظاروں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

فرق کر رہی ہیں جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ غارحراء میں آپ کو جو نظارہ دکھایا گیا وہ گہری نیند والا نہ تھا بلکہ کشفی نیند والا تھا اور ابن ہشام والی روایت کے معنے گہری نیند کے نہیں بلکہ کشفی نیند کے ہیں اور آپ کے ان الفاظ کا کہ پھر میں جاگ اٹھا صرف اتنا مفہوم ہے کہ پھر میری کشفی حالت جاتی رہی۔ پس ابن ہشام کی روایت اور بخاری و مسند احمد بن حنبل کی حدیث میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

یوروپین مصنفین کا بدء الوحی پر دوسرا اعتراض دوسرا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رؤیا پر شک تھا۔ اس سوال کی بنیاد اس امر پر رکھی جاتی ہے کہ

الف۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھبرائے ہوئے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔

باء۔ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے۔

ج۔ فترۃ وحی پر آپ نے اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہا جیسا کہ بخاری اور مسند احمد بن حنبل دونوں میں اس واقعہ کا ذکر آتا ہے۔

بدء الوحی پر آنحضرتؐ کے گھبرانے کی وجہ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گھبرانا اور خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ کہنا تو اس وجہ سے تھا کہ ہر انسانِ کامل کے اندر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے فرض کو ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ جو شخص چھچھورا ہوتا ہے یا ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والا ہوتا ہے اس کے سپرد جب کوئی کام کیا جاتا ہے تو بغیر اس کے کہ وہ عواقب پر نگاہ دوڑائے اور اپنے کام کی اہمیت کو سمجھے کہہ دیتا ہے کہ اس کام کی کیا حقیقت ہے میں اسے فوراً کر لوں گا۔ لیکن عقلمند انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے دل میں فوراً گھبراہٹ پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم میں اپنے فرض کو ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ قابل اور نا قابل میں یہی فرق ہوتا ہے کہ قابل کو فوراً اپنے کام کا فکر پڑ جاتا ہے مگر نا قابل کو کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ کام بالکل آسان ہے۔ میں سمجھتا ہوں موجودہ جنگ میں ہی جو کام جنرل الیگزنڈر یا جنرل منٹگمری یا لارڈ مونٹ بیٹن کے سپرد کیا گیا ہے اگر یہی کام کسی ہندوستانی صوبیدار کے سپرد کیا جاتا اور اس سے پوچھا جاتا کہ کیا تم فوجوں کی کمان کر سکو گے؟ تو بغیر سوچے سمجھے وہ فوراً جواب دے دیتا کہ میں اس کام کو اچھی طرح سرانجام دے سکوں گا۔ مگر یہ وہ لوگ تھے جن کے سپرد جب کام ہوا تو ذمہ داری کا احساس رکھنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں خوف پیدا ہوا کہ نہ معلوم ہم اپنے فرائض کو کما حقہ ادا کر سکیں گے یا نہیں۔ پس کسی کام کے سپرد ہونے پر دل میں گھبراہٹ پیدا ہونا علم کامل کی علامت ہوتی ہے نہ اس بات کی علامت کہ وہ کام کی اہلیت نہیں رکھتا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی نزول وحی پر گھبرانا اور آپ کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اپنی گھبراہٹ اور

اضطراب کا اظہار کرنا درحقیقت یہی معنے رکھتا ہے کہ آپ اپنے کام کی اہمیت کو سمجھتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دنیا کی اصلاح کا کام آپ کے سپرد کیا تو فوراً آپ کو فکر شروع ہو گیا کہ اتنا بڑا کام جو میرے سپرد کیا گیا ہے نہ معلوم میں اس کو الٰہی منشاء کے مطابق سرانجام دے سکوں گا یا نہیں۔ آپ کے سپرد جو کام کیا گیا اور جس کا پہلی وحی میں ہی بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا آج جن لوگوں کے ہاتھوں میں قلمیں ہیں جو بڑے بڑے علوم کے ماہر سمجھے جاتے ہیں جن کو اپنے تجربہ اور اپنی علمی نگاہ کی وسعت پر ناز ہے۔ تو ان کو وہ علم سکھا جو ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی نہیں اور ان علوم اور معارف سے انہیں بہرہ ورفرما جو آج دنیا کی کسی کتاب میں بھی نہیں ملتے۔ یہ سیدھی بات ہے کہ جب ایک اُمّی کو یہ کہا جائے گا کہ دنیا نے کتابیں لکھیں مگر بے کار ثابت ہوئیں اور وہ دنیا کی ہدایت کا موجب نہ بن سکیں۔ اب اے شخص ہم تیرے سپرد یہ کام کرتے ہیں کہ جو علوم آج تک بڑی بڑی کتابیں لوگوں کو سکھا نہیں سکیں وہ علوم تو ہمارے حکم سے لوگوں کو سکھا۔ تو لازماً اس سے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جائے گی کہ اتنا بڑا کام میں کس طرح کر سکوں گا۔ بے شک ایک پاگل کو جب یہ کہا جائے گا تو وہ خوش ہو جائے گا اور کہے گا کہ یہ کون سا بڑا کام ہے مگر عقلمند کا دل خوف سے بھر جائے گا اور وہ کہے گا اتنا بڑا کام میں کس طرح کر سکوں گا۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ آپ کے علم کامل پر ایک زبردست گواہ ہے۔ وہ لوگ جو اس واقعہ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں نقص واقع ہو گیا تھا انہیں غور کرنا چاہیے کہ کیا پاگل بھی کبھی گھبراتا ہے؟ اسے تو اگر کہا جائے کہ کیا تم ساری دنیا فتح کر سکتے ہو تو وہ فوراً کہہ دے گا یہ کون سی مشکل بات ہے۔ مگر وہ جسے اپنی ذمہ واری کا احساس ہوتا ہے، جو کام کی اہمیت کو سمجھتا ہے، جو فرائض کی بجا آوری کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے وہ کام کے سپرد ہونے پر لرز جاتا ہے۔ اس کا جسم کانپ اٹھتا ہے اور اس کے دل میں بار بار یہ خیال آنا شروع ہو جاتا ہے کہ ایسا نہ ہو میں اپنی کسی غفلت کی وجہ سے ناکام ہو جاؤں اور جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے اس کو سرانجام دینے سے قاصر رہوں۔

تاریخ اسلام میں اس کی ایک موٹی مثال موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے آٹھ سالہ عرصہ میں دنیا کی کایا پلٹ دیتے ہیں، روم اور ایران کو شکست دے دیتے ہیں، عرب کی سرحدوں پر اسلامی فوجیں بھجوا کر اسے ہر قسم کے خطرات سے محفوظ کر دیتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے وہ کام کرتے ہیں جو قیامت تک

ایک زندہ یادگار کی حیثیت میں قائم رہنے والا ہے۔مگر جب آپ روم کو شکست دے دیتے ہیں، جب ایران کو شکست دے دیتے ہیں، جب یہ دوزبردست ایمپائر اسلامی فوجوں کے متواتر حملوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہیں، جب عمرؓ کا نام ساری دنیا میں گونجنے لگتا ہے، جب دشمن سے دشمن بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ عمرؓ نے بہت بڑا کام کیا۔اس وقت خود عمرؓ کی کیا حالت تھی۔تاریخ میں لکھا ہے کہ جب آپ وفات پانے لگے تو اس وقت آپ کی زبان پر بار بار یہ الفاظ آتے تھے کہ رَبِّ لَا عَلَيَّ وَلَا لِيْ (الطبقات الکبرٰی لابن سعد ذکر استخلاف عمر) اے میرے رب! میں سخت کمزور اور خطار کار ہوں۔میں نہیں جانتا مجھ سے اپنے کام کے دوران میں کیا کیا غلطیاں سرزد ہوچکی ہیں۔الٰہی میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوں۔میں اپنی خطاؤں پر شرمندہ ہوں اور میں اپنے آپ کو کسی انعام کا مستحق نہیں سمجھتا۔صرف اتنی التجا کرتا ہوں کہ تو اپنے عذاب سے مجھے محفوظ رکھ۔

غور کرو اور سوچو کہ ان الفاظ سے حضرت عمرؓ کی کتنی بلند شان ظاہر ہوتی ہے۔آپ کے سپرد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کام کیا گیا اور آپ نے اس کو ایسی عمدگی سے سرانجام دیا کہ یورپ کے شدید سے شدید دشمن بھی اس کام کی اہمیت کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے۔مگر چونکہ آپ کے دل پر خدا کا خوف طاری تھا آپ نے سمجھا کہ بے شک میں نے کام کیا ہے مگر ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ کام چاہتا ہو اور میں جس کام کو اپنی خوبی سمجھتا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں خوبی نہ ہو۔اس لئے باوجود اتنا بڑا کام کرنے کے وفات کے وقت آپ تڑپتے تھے اور بار بار آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوتے تھے کہ رَبِّ لَا عَلَيَّ وَلَا لِيْ۔خدایا میں تجھ سے کسی انعام کا طالب نہیں صرف اتنی درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھے اپنی سزا سے محفوظ رکھ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے کوئی کام نہیں کیا۔مجھے خدمت کا حق جس رنگ میں ادا کرنا چاہیے تھا اس رنگ میں ادا نہیں کیا۔اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے بعد جو گھبراہٹ طاری ہوئی اس کی وجہ درحقیقت یہی تھی کہ آپ کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ میرے سپرد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عظیم الشان کام کیا گیا ہے نہ معلوم میں اس کو ادا کرسکتا ہوں یا نہیں۔پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل وحی الٰہی پر شک کی وجہ سے نہ تھا بلکہ خدا تعالیٰ کی شان کے انسانی دماغوں سے بالاتر ہونے پر یقین کامل کے نتیجہ میں تھا اور آپ کو یہ فکر لگ گیا تھا کہ میں اس کام کے لئے خواہ کتنی بھی قربانی کروں نہ معلوم اللہ تعالیٰ کے ارادوں کے مطابق میں بلند ہوسکوں گا یا نہیں اور اللہ تعالیٰ کی بلند شان سے خوف کرنا جرم نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے اور خدا تعالیٰ کے علو مرتبت کو مدنظر رکھتے ہوئے برا نہیں بلکہ اس بے نظیر خشیت الٰہی کا ایک بین ثبوت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قلب مطہر میں پائی جاتی تھی۔

فترۃ وحی کے وقت آنحضرت صلعم کا اپنے آپ کو پہاڑ سے گرانا ایک کشفی واقعہ ہے

باقی رہا یہ کہ آپ نے خودکشی کا ارادہ کیا سو اوّل تو دوسری احادیث سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو صاف پتہ لگتا ہے کہ آپ نے جو فعل کیا وہ وحی الٰہی کے رکنے کے بعد کیا۔ اگر آپ کے دل میں یہ خیال ہوتا کہ نعوذ باللہ مجھ پر شیطان نے اپنا کلام نازل کیا ہے یا کلام الٰہی کے بارہ میں آپ کو کوئی شبہ ہوتا تو چاہیے تھا کہ اس وحی کے نزول کے وقت آپ خودکشی کا ارادہ فرماتے۔ مگر حدیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ آپ نے فترت کے بعد خودکشی کا ارادہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو گھبراہٹ یہ تھی کہ کیا میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر مجھ سے بولنا چھوڑ بیٹھا ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا اور مجھ پر اس کا کلام نازل نہیں ہوا۔ اگر وحی کے متعلق آپ کو شبہ ہوتا تو چاہیے تھا کہ جب کچھ عرصہ کے لئے وحی کا نزول رک گیا تھا آپ خوش ہوتے اور کہتے الحمدللہ میں ایک بلا سے بچ گیا۔ مگر تمام حدیثیں متفقہ طور پر یہ واقعہ بیان کرتی ہیں کہ وحی کے رک جانے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وحی یا الہامات کی صداقت میں شبہ نہیں تھا۔ آپ کو صرف یہ خوف تھا کہ میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔ پس یہ واقعہ بھی وحی الٰہی کے متعلق آپ کے کسی شبہ کو ظاہر نہیں کرتا۔

میں اس جگہ یہ بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ گو اس واقعہ کی میں نے ایک توجیہ کی ہے اور اس اعتراض کو رد کیا ہے جو یوروپین مصنّفین کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک چونکہ صحیح احادیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ پہاڑ کی چوٹیوں سے اپنے آپ کو گرانا چاہا اس لئے ہم اس واقعہ سے کلیۃً انکار نہیں کر سکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو اس واقعہ کے سمجھنے میں سخت غلطی لگی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک ظاہری واقعہ ہے جس کا احادیث میں ذکر آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ خودکشی کے ارادہ سے پہاڑ پر چڑھ جاتے اور اپنے آپ کو نیچے گرانا چاہتے مگر معاً جبریل آپ کو آواز دیتا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ آپ واقعہ میں خدا کے رسول ہیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رک جاتے اور اپنے گھر میں واپس آ جاتے۔ لوگ اس واقعہ کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں اور اس طرح خود بھی ٹھوکر کھاتے اور دوسروں کے لئے بھی ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں حالانکہ یہ ظاہری واقعہ نہیں بلکہ کشفی واقعہ ہے۔ کشف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ دیکھتے تھے کہ میں پہاڑوں پر پھر رہا ہوں اور اپنے آپ کو گرانا چاہتا ہوں مگر فرشتہ مجھے آواز دیتا ہے کہ ایسا مت کریں آپ واقعہ میں خدا تعالیٰ کے رسول ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل میں بار بار یہ خیالات اُٹھتے تھے کہ میں اتنا بڑا کام کس طرح کرسکوں گا ایسا نہ ہو کہ میں خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بن جاؤں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے ان خیالات کو کشفی صورت میں اس رنگ میں ظاہر کیا کہ آپ پہاڑ کی چوٹیوں سے اپنے آپ کو نیچے گرانا چاہتے ہیں مگر فرشتہ آواز دیتا ہے یَا مُحَمَّدُ اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے کھڑا کیا ہے۔ پس میرے نزدیک یہ کوئی ظاہری واقعہ نہیں بلکہ ایک کشف ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ درحقیقت رؤیا میں اگر کوئی شخص دیکھے کہ وہ پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا رہا ہے تو اگر وہ دیکھے کہ وہ پہاڑ سے گر گیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کوئی بری بات ظاہر ہوگی اور وہ تباہ ہوجائے گا لیکن اگر وہ رؤیا میں پہاڑ سے گرا تو ہے مگر مرا نہیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس سے کوئی بڑی بھاری غلطی ہوگی یا کوئی بڑا بھاری کام کرے گا جس کے نتیجہ میں اسے صدمہ پہنچے گا مگر اس کے باوجود وہ ہلاک نہیں ہوگا اور اگر کوئی شخص دیکھے کہ وہ پہاڑ سے گرنے لگا تھا مگر فرشتہ نے اسے کہا کہ گھبراتے کیوں ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والا ہے جس میں بظاہر تباہی ہوگی مگر وہ تباہ نہیں ہوگا بلکہ کامیاب و بامراد ہوگا۔

اگر ہم اس واقعہ کو ظاہری قرار دیں تب بھی یہ اس خشیت الٰہی کا ثبوت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پائی جاتی تھی کیونکہ آپ نے ایسا فعل نزول وحی پر نہیں کیا بلکہ وحی کے رکنے پر کیا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ گھبراہٹ تھی کہ کیا میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ناراض ہوکر مجھ سے بولنا تو ترک نہیں کر دیا۔ لیکن میرے نزدیک یہ ظاہری واقعہ نہیں جس کا ایک ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ہر دفعہ فرشتہ ظاہر ہوجاتا اور وہ آپ کو آپ کی کامیابی کی بشارت دیتا۔ فرشتہ کا آنا خود اپنی ذات میں اس بات کی ایک دلیل ہے کہ ہم اسے ظاہری واقعہ قرار نہیں دے سکتے۔ دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس واقعہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔

اب رہا وحی کا سوال۔ دشمن کہتا ہے کہ آپ کا اس وقت زَمِّلُوْنِيْ۔ زَمِّلُوْنِيْ کہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک بیماری کا حملہ تھا۔ ہسٹیریا کا دورہ آپ کو ہوا اور آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جلدی مجھ پر کپڑا ڈال دو۔ مگر یہ سوال بھی وحی الٰہی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسا کہ اصحاب وحی جانتے ہیں وحی الٰہی کے نزول کے وقت اس قدر خشیت کا نزول ہوتا ہے کہ جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مقام قرب ہے۔ دربار کی شمولیت کا حال

تو دربار ی ہی جانتا ہے دوسرے کو کیا خبر ہوسکتی ہے۔پس یہ حالت اس قرب کی وجہ سے تھی جو اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کو حاصل تھا۔مگر اس حقیقت کو وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو روحانیت کے اس کوچہ سے قطعی طور پر نا آشنا ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے قرب سے ویسے ہی دور ہیں جیسے مشرق سے مغرب دور ہوتا ہے۔پھر سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو جنون ہوتا ہے کیا ان کا حال صرف کپڑا اوڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کیا یہ بھی کوئی طبی مسئلہ ہے کہ جو شخص کپڑا اوڑھ لے وہ پاگل ہوتا ہے؟ یا کیا ڈاکٹر یہ پوچھا کرتا ہے کہ فلاں نظارہ کے وقت تم کپڑا اوڑھتے ہو یا نہیں؟ پس محض زَمِّلُوۡنِیۡ۔ زَمِّلُوۡنِیۡ کے الفاظ سے مخالفین اسلام کا یہ استدلال کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں نعوذ باللہ نقص واقعہ ہو گیا تھا بالکل احمقانہ استدلال ہے۔بے شک اس وقت آپ پر گھبراہٹ طاری ہوئی مگر گھبراہٹ کا طاری ہونا ہرگز آپ کے اندر روحانی دماغی یا جسمانی نقص کے پائے جانے کا ثبوت نہیں۔بلکہ اس خشیت الٰہی کا ثبوت ہے جو آپ کے دل میں پائی جاتی تھی۔ہم نے تو دیکھا ہے معمولی دنیوی واقعات پر بعض لوگ دوسروں سے اس قدر مرعوب ہوتے ہیں کہ ان کا پسینہ بہنے لگ جاتا ہے۔افسر کسی غلطی پر تنبیہ کرے یا کسی معاملہ کے متعلق ان سے باز پُرس کی جائے تو اس قدر ان پر رعب طاری ہوتا ہے کہ ہاتھ پاؤں کانپنے لگ جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو پسینہ جاری ہو جاتا ہے۔جب معمولی افسروں کے رعب کی وجہ سے انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے تو سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال اور اس کی جبروت کا آپ پر کس قدر اثر ہوسکتا تھا۔

نزولِ وحی کے بعد آنحضرت صلعم کے کپڑا اوڑھنے کی وجہ

پس آپ نے اگر زَمِّلُوۡنِیۡ۔ زَمِّلُوۡنِیۡ کہا تو اس کی وجہ درحقیقت یہی تھی کہ آپ پر الٰہی کلام کا رعب طاری ہو گیا۔آپ نے چاہا کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ لیٹ جائیں تا کہ آپ کے قویٰ کو سکون حاصل ہو جائے۔وہ لوگ جو اس کو جنون کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کپڑا اوڑھنا جنون کی علامت ہوتی ہے؟ ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ کوئی ڈاکٹر کسی ایسے مریض کے پاس گیا ہو جس میں جنون کے آثار پائے جاتے ہوں تو اس نے مریض کے لواحقین سے یہ سوال کیا ہو کہ کیا یہ مریض کبھی کپڑا بھی اوڑھتا ہے یا نہیں؟ اگر کپڑا اوڑھتا ہے تو ضرور پاگل ہے اور اگر کپڑا نہیں اوڑھتا تو پاگل نہیں۔ایسا سوال آج تک کبھی کسی ڈاکٹر نے نہیں کیا۔پس محض کپڑا اوڑھنے سے مخالفین اسلام کا یہ نتیجہ نکالنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جنون ہو گیا تھا خود ان کے مجنون ہونے کی علامت ہے۔دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی حالتیں بھی مجنونانہ تھیں یا نہیں۔یہ بات ظاہر ہے کہ ہر غیر معمولی قابلیت والے شخص کی حالت دوسروں سے الگ ہوتی ہے۔ایک شخص جو غیر معمولی طور پر حساب کی قابلیت رکھتا ہے وہ ان دوسرے لوگوں سے جو معمولی حساب جانتے

ہیں بالکل ممتاز طور پر نظر آتا ہے۔ایک شخص جو غیر معمولی طور پر تاریخ کی واقفیت رکھتا ہے وہ ان دوسرے لوگوں سے جو معمولی تاریخ جانتے ہیں بالکل علیحدہ نظر آتا ہے۔ایک شخص جو غیر معمولی طور پر طب کی واقفیت رکھتا ہے وہ ان دوسرے لوگوں سے جو معمولی طب جانتے ہیں اپنے فن میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔بعض دفعہ مرض معمولی معلوم ہوتا ہے عام ڈاکٹر اس کا عام علاج کرتا ہے مگر ماہر فن ڈاکٹر اس مرض کی شدت کو سمجھ کر فوراً اس کا دوسرا علاج بتاتا ہے یا عام ڈاکٹر مرض کو شدید بتاتا ہے۔مگر ماہر فن اس کے معمولی مرض ہونے کو فوراً بھانپ جاتا ہے۔یہی حال سائنس کے مسائل کا ہے۔ایک شخص معمولی مسائل جانتا ہے مگر دوسرا شخص سائنس کی بڑی بڑی باریکیوں تک پہنچ جاتا اور دنیا میں کئی اہم ایجادات کا موجب بن جاتا ہے۔غرض الگ الگ قابلیتیں ہیں جو الگ الگ لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔کسی شخص کی قابلیت بہت معمولی ہوتی ہے اور کسی شخص کی قابلیت بالکل غیر معمولی ہوتی ہے اور وہ دوسروں سے اپنے کام میں بالکل علیحدہ نظر آتا ہے۔مگر بہر حال کسی شخص میں غیر معمولی قابلیت کا پایا جانا یہ معنے نہیں رکھتا کہ اسے جنون ہو گیا ہے۔اسی طرح غیر معمولی صحت والے کی حالت بھی دوسروں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔پس محض غیر معمولی قابلیت کے نتیجہ میں کسی کی الگ حالت ہونے سے اس پر مجنون ہونے کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا اور جو ایسا کرتا ہے وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کی تمام ترقی مجنونوں سے وابستہ ہے،کیا ایسا شخص خود پاگل نہیں؟

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں عقل کس لئے رکھی ہے۔اگر عقل کی غرض کوئی اعلیٰ کام کرنا ہے تو پھر اعلیٰ کام کرنا تو عقل کی علامت ہوا نہ کہ جنون کی علامت؟اگر کسی شخص کی حالت دوسروں سے غیر ہے تو دیکھا یہ جائے گا کہ اس شخص کے حالات بنی نوع انسان کی ترقی کا موجب ہیں یا تنزل کا۔اگر اس کا اپنی قابلیت میں غیر معمولی ہونا بنی نوع انسان کی ترقی کا موجب ہو تو ماننا پڑے گا کہ اس کے حالات کا تغیر عقل کی زیادتی کی وجہ سے ہے اور اگر اس کے حالات بنی نوع انسان کی تباہی اور خرابی کا موجب نظر آئیں تو ماننا پڑے گا کہ اس کا تغیر جنون کی وجہ سے ہے۔بہر حال محض کسی کے حالات کا تغیر یا کسی میں غیر معمولی قابلیت کا پایا جانا اس کے جنون کی علامت نہیں ہو سکتا۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ دشمن نے تو آج یہ اعتراض کیا ہے کہ نزول وحی کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دماغ میں نعوذ باللہ نقص واقعہ ہو گیا تھا مگر قرآن کریم نے اپنی ابتدائی آیات میں ہی اس سوال کا جواب پوری تفصیل کے ساتھ دے دیا تھا اور دنیا کو بتا دیا تھا کہ اس کا یہ اعتراض سراسر حماقت پر مبنی ہے چنانچہ سورۂ نون والقلم میں اس اعتراض کا جواب موجود ہے۔یہ بتایا جا چکا ہے کہ مفسرین اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے نزول کے معاً بعد سورۂ نون والقلم کی آیات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئیں اور

یہ آیات اسی مضمون کی حامل ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لوگوں کا یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ ان کے دماغ میں کوئی نقص واقعہ ہوگیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک ایسا اعجاز ہے کہ جس پر غیر مسلم اگر دیانتداری کے ساتھ غور کریں تو انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ کلام کسی انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے۔ دیکھو ابھی دنیا نے یہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ نزول وحی کے واقعات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنون کی علامت ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے عرش سے دیکھ لیا کہ ایک دن آنے والا ہے جب دشمن نزول وحی کی کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے یہ اعتراض کرے گا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ مجنون تھے۔ چنانچہ دوسری ہی وحی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا ازالہ کیا اور فرمایا نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ۔ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (القلم: ۲، ۳) ہم قسم کھا کر پیش کرتے ہیں دوات اور قلم کو اور ان تمام تحریروں کو جو قلم اور دوات سے لکھی گئی ہیں کہ اگر دنیا کی تمام تحریروں کو جمع کیا جائے تو ان سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ تو اپنے رب کی نعمت سے پاگل نہیں ہے۔ یہ دوسری سورۃ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور جس کے ابتداء میں ہی اس اعتراض کا اللہ تعالیٰ نے جواب دے دیا ہے جو پہلی وحی سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوسکتا تھا اور وہ جواب یہ ہے کہ قلم اور دوات نے جس قدر علوم لکھے ہیں وہ سب اس امر کے شاہد ہیں کہ تو مجنون نہیں۔ یعنی اگر علوم عالموں کے لکھے ہوئے ہیں تو تُو ان سے بڑھ کر علم بیان کرتا ہے۔ اگر وہ ادنیٰ علوم سے عالم کہلاتے ہیں تو تُو اعلیٰ علم سے مجنون کیوں کہلانے لگا۔ بہرحال ان سے بڑا عالم کہلائے گا اور تیرا ان سے اختلاف علم کی زیادتی کی وجہ سے کہلائے گا نہ کہ علم کی کمی کی وجہ سے۔

تیرے مجنون نہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر روحانی ترقیات یا دین سے تعلق رکھنے والے علوم پائے جاتے ہیں ان سب کے مقابلہ میں تو دنیا کو وہ کچھ سکھائے گا جو اس نے پہلے نہیں سیکھا اور یہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ تو پاگل نہیں۔ تیرے دماغ میں کوئی نقص نہیں اور اگر تجھے پاگل قرار دیا جاسکتا ہے تو پھر ان سب لوگوں کو پاگل قرار دینا پڑے گا جنہوں نے دنیا میں علوم کو پھیلایا اور بنی نوع انسان پر علمی اور روحانی رنگ میں احسانِ عظیم کیا۔ لیکن اگر وہ ان کو پاگل قرار نہیں دیتے تو تجھے کس منہ سے پاگل کہہ سکتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ دنیا میں جب کوئی شخص کسی علم پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو لوگ اس کو پاگل قرار نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں وہ بڑا فاضل ہے۔ بڑا عالم اور سمجھدار ہے۔ اس نے اس علم کی باریکیوں پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے مگر تو وہ ہے جو ہر علم کے ایسے نکات کو بیان کرتا ہے جن کی طرف اس علم کے بڑے بڑے ماہرین کی بھی آج تک نظر نہیں گئی پھر اگر وہ ایک علم پر معمولی روشنی

ڈال کر عالم سمجھے جا سکتے ہیں تو تُو تمام روحانی، اخلاقی، اقتصادی، قضائی، سیاسی، عائلی علوم کے متعلق ان کے ماہرین سے زیادہ روشنی ڈال کر مجنون کیونکر سمجھا جائے گا۔ آخر مجنون کہنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ اگر تو کام وہ کر رہا ہے جو بڑے بڑے عالموں نے بھی نہیں کیا تو تجھے مجنون کس طرح کہا جا سکتا ہے اور لوگوں کی کیسی حماقت ہے کہ وہ اتنی موٹی بات کو بھی نہیں سمجھتے کہ عقل اور جنون میں اور علم اور جہالت میں بُعد المشرقین ہے۔ جب دنیا میں تو علوم کے وہ خزانے تقسیم کر رہا ہے جو بڑے بڑے عالموں کے واہمہ میں بھی کبھی نہیں آئے تو بہر حال اسے یہی کہنا پڑے گا کہ تو بڑا عالم ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ تو مجنون ہے یا تیرے دماغ میں فتور واقعہ ہو گیا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ۔ مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ اے لوگو آج تک قلم اور دوات سے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور اس کے مجنون نہ ہونے کے ثبوت کے طور پر تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ جب دنیا میں علم الاخلاق پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم العقائد پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم سیاست میں کوئی شخص نئی راہ پیدا کرتا ہے تو تم کہتے وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم الاقتصاد میں کوئی شخص نیا مسئلہ نکالتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم العائلہ پر کوئی شخص نئے رنگ میں روشنی ڈالتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ شخص ہیں کہ آج تک جس علم میں بھی کوئی کتاب لکھی گئی ہے وہ ان کے علم کے مقابل میں بالکل ہیچ ہے۔ قلمیں ان کے مقابلہ میں ٹوٹ چکی ہیں۔ عالم ان کے مقابلہ میں گنگ ہو چکے ہیں۔ معارف کا ایک سمندر ہے جو انہوں نے دنیا میں بہا دیا ہے اور علوم کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے جو انہوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر تم تعصب سے کام نہ لو تو بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی قابلیت ان کے غیر معمولی علم اور آسمانی تائید اور ہدایت کے نتیجہ میں ہے نہ کہ نعوذ باللہ غیر معمولی جہالت کے نتیجہ میں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاگل اور غیر معمولی عقلمند اور بڑے عالم اور بڑے جاہل میں یہ اشتراک ہوتا ہے کہ یہ بھی اپنے اندر غیر معمولی طاقت رکھتا ہے اور وہ بھی اپنے اندر غیر معمولی طاقت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فرق ہوتا ہے کہ ایک شخص نیچے کی طرف غیر معمولی طور پر گرتا ہے اور دوسرا شخص اوپر کی طرف غیر معمولی طور پر جاتا ہے۔ غیر معمولی علم رکھنے والا وہ باتیں بتاتا ہے جو بڑے بڑے عالموں کو بھی نہیں سوجھتیں اور غیر معمولی جہالت رکھنے والا وہ باتیں بتاتا ہے جو بڑے بڑے بیوقوفوں اور جاہلوں سے بھی صادر نہیں ہوتیں۔ بہر حال محض کسی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے دوسروں سے الگ ہونا اس کے جنون کی علامت نہیں ہوتا۔ بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ اس

کے حالات کا تغیر بنی نوع انسان کے فائدہ کا موجب ہوا ہے یا نقصان کا موجب ہوا ہے۔ اگر فائدہ کا موجب ہو تو کوئی شخص اس تغیر کو جنون کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتا۔

یہ کتنی سچی اور پختہ دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کی گئی اور پیش بھی ایسے موقع پر کی گئی جب ابھی وحی کے نزول کا ابتداء ہی ہوا تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ بھی قرآن کریم کا ایک زبردست معجزہ ہے کہ اس نے ابتداء وحی میں ہی اس اعتراض کا جواب دے دیا جو دشمنان اسلام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کے متعلق کرنا تھا اور ایسی حالت میں دے دیا جبکہ خود مکہ والوں کے سامنے بھی ابھی آپ نے اپنا دعویٰ پیش نہیں کیا تھا۔ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد مکہ والوں کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کیا ہے۔ مگر نٓ وَالْقَلَمِ کی ابتدائی آیات وہ ہیں جو اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کے معاً بعد نازل ہوئیں گویا ابھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنی نبوت کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت یہ خبر دے دی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر مجنون ہونے کا اعتراض کیا جائے گا اور اگر پہلی وحی کے بعد کسی نے یہ اعتراض کیا بھی تھا تب بھی قرآن کریم نے پہلی وحی کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دشمنوں کے اس اعتراض کا جواب دے دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جنون ہو گیا ہے اور جواب بھی ایسا زبردست دیا کہ جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔

آج کل کے سائیکالوجسٹ کہتے ہیں کہ غیر معمولی قابلیت جنون کی علامت ہوتی ہے۔ میں اس کا جواب اوپر دے چکا ہوں لیکن اگر اس جواب سے کسی کی تسلی نہ ہو تو میں کہتا ہوں اگر غیر معمولی قابلیت جنون سے حاصل ہوتی ہے تو پھر ہم بھی خواہش کرتے ہیں کہ خدا کرے ہم بھی ایسے پاگل بن جائیں کیونکہ جب دنیا کی ترقی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ ہے اور غیر معمولی قابلیت جنون کی علامت ہے تو پھر دنیا کی ترقی عقلمندوں سے نہیں بلکہ پاگلوں سے وابستہ ہے اور وہی لوگ اس قابل ہیں کہ ان کا نمونہ بننے کی کوشش کی جائے۔

میور کا لفظ اِقْرَاْ پر اعتراض کہ اس سے پہلے پڑھی جانے والی چیز ہونی چاہیے میور نے اس موقعہ پر اعتراض کیا ہے کہ جب اس سورۃ میں اِقْرَاْ کہا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محادثہ بالنفس والی سورتیں اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں (A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry, vol:4 p:260)۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہا گیا کہ اِقْرَاْ یعنی پڑھ تو ضروری ہے کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ اس سے پہلے کچھ سورتیں نازل ہو چکی تھیں۔ جن کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ انہیں لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں۔ وہ محادثہ بالنفس والی سورتیں سورۃ الیل اور سورۃ الضحیٰ کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ قوم کے حالات پر غور کرتے کرتے جب ان سورتوں میں آپ نے اپنی قوم کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تو اس کے بعد آپ کو یہ خیال ہوا کہ یہ سورتیں درحقیقت الہامی ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں یہ سورتیں لوگوں کو پڑھ کر سناؤں۔

میور کے اعتراض کا جواب اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی سوال ہے اس کا قیاس سے تعلق نہیں۔ تاریخی امور میں ہمیشہ تاریخ کا حوالہ چاہیے نہ کہ قیاس کا۔ اگر تاریخ سورۃ الیل اور سورۃ الضحیٰ کو بعد کی نازل شدہ قرار دیتی ہے تو قیاس کا اس میں کیا دخل ہے۔ بے شک کچھ لوگ اِقْرَاْ کے بعد سورۂ نٓ وَالْقَلَمِ پھر مزمل اور پھر مدثر کا نزول بتاتے ہیں اور کچھ لوگ اِقْرَاْ کے بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کا نازل ہونا بتاتے ہیں۔ مگر وہ سورتیں جن کو سر میور محادثہ بالنفس والی سورتیں قرار دیتے ہیں ان کا نزول کسی ایک شخص نے بھی اِقْرَاْ سے پہلے قرار نہیں دیا۔

دوسرے خود ان سورتوں میں کوئی ایسی بات نہیں کہ ان کو پہلے کی قرار دیا جائے۔ کیا وہ خیالات جو ان سورتوں میں مذکور ہیں بعد میں ظاہر نہیں کئے جا سکتے تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے خلاف قیاس اسی مقام پر پیش کیا جا سکتا ہے جہاں تاریخی واقعہ ناممکن نظر آئے۔ مگر جہاں تاریخی واقعہ چسپاں ہو سکتا ہو وہاں قیاس سے کام لینا محض ایک زبردستی ہے اور اس زبردستی کی علم اجازت نہیں دیتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گو سر میور کہتے ہیں کہ یہ سورۃ بعد کی ہے اور محادثہ بالنفس والی سورتیں پہلے کی ہیں اور بعض نے گو محادثہ بالنفس والی (بقول سر میور) سورتوں کو مخصوص نہیں کیا صرف اتنا کہا ہے کہ یہ سورۃ بعد کی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اس میں اِقْرَاْ کہا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بعض سورتیں نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن نولڈکے وغیرہ نے تسلیم کیا ہے کہ یہ سورۃ سب سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں جب تاریخ سے ثابت ہے کہ سب سے پہلے اس سورۃ کی آیات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں تو ہم تاریخ کے مقابلہ میں قیاس سے کس طرح کام لے سکتے ہیں۔

(A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry, vol:4 p:260)

میں اس موقعہ پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مستشرقین یورپ کو زیادہ تر دھوکا اس بات سے لگا ہے کہ بعض جگہ کفار کی مخالفت کی جو خبریں آ جاتی ہیں ان سے وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ الہام واقعہ کے بعد ہونا چاہیے اس لئے جس زمانہ میں مخالفت نہیں تھی اس زمانہ میں کسی سورۃ کے اس حصہ کا نزول تسلیم نہیں کیا جا سکتا جس میں مخالفت کی خبر دی گئی ہو۔ گویا ان کے نزدیک جن سورتوں میں مخالفت کا ذکر ہو وہ ہمیشہ مخالفت کے بعد کی ہوتی ہیں۔ اس خیال پر بنیاد رکھتے ہوئے

وہ بعض دفعہ مکی سورتوں کو مدنی قرار دے دیتے ہیں یا ابتداء میں نازل ہونے والی آیات کو بعد کے زمانہ میں نازل ہونے والی آیات قرار دے دیتے ہیں۔ جب اسلام اور مسلمانوں کی پُرزور مخالفت شروع ہوگئی تھی مگر اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود نے اس خیال کا بطلان خوب اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ جب قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اس وقت تو نہ صحابہ کے دل میں یہ خیال آ سکتا تھا اور نہ کسی اور مسلمان کے دل میں کہ کل دشمن قرآن کریم کے متعلق کیا کیا اعتراض کرے گا۔ اکثر اعتراضات موجودہ زمانہ میں ہوئے ہیں جن کے ہم جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض باتیں ایسی ہیں جو صحابہؓ کے زمانہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ مثلاً سورتوں کے نزول کی ترتیب معلوم کرنے میں اس وقت کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی تھی۔ صحابہؓ زندہ موجود تھے اور اگر کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تو اسے کہا جا سکتا تھا کہ زید سے پوچھ لو۔ بکر سے دریافت کر لو۔ عمرو اور خالد سے اپنی تسلی کرا لو۔ مگر جب جواب دینے والے فوت ہو گئے تو اس وقت قدرتی طور پر بعض لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونا شروع ہوا کہ فلاں سورۃ کب اتری تھی یا فلاں سورۃ کا فلاں حصہ کب نازل ہوا تھا؟ اس وقت دشمن نے اس قسم کے خیالات سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ کہ جہاں کسی پیشگوئی کا ذکر آتا وہ کہہ دیتا کہ یہ حصہ تو وقوعہ کے بعد کا ہے۔ حالانکہ وہ حصہ وقوعہ سے مدتوں پہلے نازل ہو چکا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور پیشگوئی ان میں یہ خبریں موجود ہوتی تھیں کہ کفارِ مکہ میں سے کوئی فرعون کا مثیل ہوگا۔ کوئی ہامان کا قائم مقام ہوگا اور نبی کریمؐ کی مثال یوسفؑ کی سی ہوگی۔ جس طرح یوسفؑ کو اس کے اپنے بھائیوں نے نکال دیا تھا اسی طرح آپ کے بھائی آپ کو اپنے شہر میں سے نکال دیں گے۔ غرض کئی قسم کی پیشگوئیاں تھیں جو اللہ تعالیٰ کے اس کلام میں موجود تھیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور جو بعد میں حرف بحرف پوری ہو گئیں۔ مگر چونکہ صحابہؓ کا زمانہ گزر چکا تھا اور وہ لوگ فوت ہو چکے تھے جن کے سامنے قرآن کریم کا نزول ہوا۔ اس لئے دشمن نے اس رنگ میں فائدہ اٹھانا شروع کر دیا کہ جہاں کہیں کوئی امر بطور پیشگوئی ملتا وہ جھٹ کہہ دیتا کہ یہ حصہ وقوعہ کے بعد کا ہے۔ جب واقعات اس رنگ میں ظاہر ہو چکے تھے۔ یہی طریق یورو پین مصنفین نے اختیار کیا ہے۔ وہ قرآن کریم کی ہر پیشگوئی کو واقعہ کے بعد نازل شدہ بتاتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ دیکھو لوگ کہتے ہیں یہ آیت مکی ہے حالانکہ اس میں فلاں واقعہ کی خبر ہے جو مدینہ میں ہوا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ آیت مکی نہیں مدنی ہے۔ اس سے ان کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے جو کہا جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی پیشگوئیاں کیں اور وہ وقت پر پوری ہوئیں یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ آپ نے کوئی پیشگوئی نہیں کی بلکہ واقعہ کے بعد آپ نے اس رنگ کی آیات ڈھال کر قرآن کریم میں شامل کر دی تھیں۔

اس اعتراض کا جواب صحابہؓ تو دے نہیں سکتے کیونکہ وہ فوت ہو چکے ہیں اور صحابہؓ کے زمانہ میں یہ سوال نہیں اٹھا کہ وہ اس پر کوئی روشنی ڈال جاتے۔ مگر چونکہ اس اعتراض کا جواب ضروری تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے جہاں اسلام کے اور بہت سے مسائل کو حل کیا وہاں اس ترتیب کے سوال کو بھی اللہ تعالیٰ نے بالکل حل کر دیا ہے۔

جب قرآن کریم نازل ہوا ہے اس وقت ساتھ ہی ساتھ اس رنگ میں کتابت نہیں ہوتی تھی کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ فلاں آیت کس سال میں نازل ہوئی ہے اور فلاں آیت کس سال میں۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے زمانہ میں پیدا کیا جب کتابت کا زور تھا، پریس جاری تھے اور ہر چیز شائع ہو کر فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آجاتی تھی اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ چونکہ الہام میں فلاں واقعہ کا ذکر ہے جو اتنے سال بعد پورا ہوا اس لئے یہ الہام اس واقعہ کے بعد کا ہے پہلے کا نہیں۔ غرض حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وجود اس اعتراض کے باطل ہونے پر ایک زبردست گواہ ہے۔ چنانچہ میں اس کے ثبوت میں ''براہین احمدیہ'' کے بعض الہامات پیش کرتا ہوں۔

براہین احمدیہ انگریزی مطبع میں چھپی ہے ۱۸۸۰ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی اور ۱۸۸۴ء میں چوتھی جلد چھپنے کے بعد اس کتاب کی دو جلدیں قانون کے مطابق گورنمنٹ کو بھجوادی گئی تھیں بلکہ لنڈن میوزیم میں بھی اس کی کاپیاں محفوظ ہیں۔ اس لئے دشمن یہ نہیں کہہ سکتا کہ براہین احمدیہ میں جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ ۱۸۸۴ء کے بعد کی ہیں۔

جب یہ کتاب شائع ہوئی ہے اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام بے شک لوگوں میں معروف تھے مگر صرف بطور مباحث کے ہزار دو ہزار آدمی آپ کو جانتے تھے۔ مگر اس لئے کہ آپ عیسائیوں یا ہندوؤں وغیرہ کے ان مضامین کا جواب دیتے رہتے تھے جو وہ اسلام کے خلاف لکھتے تھے یا ایسے لوگ جانتے تھے جو آپ کے تقویٰ کے قائل تھے اور آپ سے محبت اور اخلاص رکھتے تھے۔ مثلاً لالہ بھیم سین صاحب سیالکوٹ کے ایک وکیل تھے وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس قدر تعلق رکھتے تھے کہ جب آپ پر کرم دین والا مقدمہ ہوا تو اس وقت ان کے بیٹے لالہ کنور سین صاحب ایم۔ اے جو لاء کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے ہیں اور بعد میں جموں ہائی کورٹ کے جج بن گئے تھے ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے آئے تھے۔ لالہ بھیم سین صاحب کو جب کرم دین والے مقدمہ کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ تمہاری پڑھائی کا کوئی فائدہ ہونا چاہیے مرزا صاحب بڑے

مہاتما ہیں ان پر اس وقت ایک مقدمہ دائر ہے تم جاؤ اور اس مقدمہ کی مفت پیروی کرو تا کہ مرزا صاحب کی برکت سے تمہاری زندگی سنور جائے (مکتوبات احمد جلد اوّل صفحہ ۱۸۶ ایڈیشن ۲۰۰۸ء)۔ اب دیکھو ایک شخص ہندو ہے وہ یہ جانتا ہے کہ آپ ہندوؤں سے ہمیشہ مباحثات کرتے رہتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ آپ سے محبت رکھتا ہے، آپ سے عقیدت اور اخلاص رکھتا ہے اور اپنے بیٹے کو آپ کے مقدمہ کی مفت پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو مرزا صاحب کی برکت سے تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ اسی طرح گو عیسائیوں سے آپ مباحثے کرتے رہتے تھے مگر ان میں بھی ہم یہ رنگ دیکھتے ہیں کہ باوجود بحث مباحثہ کے وہ آپ سے محبت اور اخلاص رکھتے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جن دنوں آپ سیالکوٹ میں ملازم تھے ایک بہت بڑے انگریز پادری سے جس کا نام پادری بٹلر تھا آپ اکثر مباحثات کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ پادری کچہری میں آیا اور چونکہ اس زمانہ میں پادریوں کا خاص طور پر احترام کیا جاتا تھا ڈپٹی کمشنر نے سمجھا کہ پادری صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہیں چنانچہ وہ اٹھا، بڑے احترام سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر کہا کہ فرمایئے میرے لائق کون سی خدمت ہے۔ پادری صاحب نے کہا میں آپ سے ملنے نہیں آیا میں تو مرزا غلام احمد صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ میں اب ولایت جا رہا ہوں اور چونکہ میرے ساتھ ان کے اکثر مباحثات ہوتے رہے ہیں میرے دل میں ان کی بڑی عقیدت ہے۔ میں نے چاہا کہ ولایت جانے سے پہلے ان سے آخری ملاقات کرلوں۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جہاں تشریف رکھتے تھے پادری وہیں چلا گیا، فرش پر بیٹھ گیا اور دیر تک آپ سے باتیں کرتا رہا (سیرت المہدی جلد اول روایت نمبر ۱۵۰ صفحہ ۱۴۱)۔ اب دیکھو ایک انگریز پادری جس سے ملنے میں ڈپٹی کمشنر تک اپنی عزت محسوس کرتا تھا ہندوستان سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے رخصت ہونے کے لئے کچہری گیا جبکہ آپ ایک معمولی کلرکی کا کام کرتے تھے اور جبکہ آپ کی عمر اس پادری کے پوتوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

پھر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی مسلمانوں کے چوٹی کے علماء میں سے تھے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہین احمدیہ لکھی تو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے اس پر ریویو لکھا۔

''ہماری رائے میں یہ کتاب اس زمانہ میں اور موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی اور آئندہ کی خبر نہیں۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔ اور اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی، جانی و قلمی و لسانی و حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت کم پائی گئی ہے''۔ (اشاعۃ السنۃ جون تا اگست ۱۸۸۴ء جلد ۷ نمبر ۶)

لوگ جب کسی کتاب کے متعلق تعریفی ریویو لکھتے ہیں تو کہتے ہیں اس سال کی یہ عظیم الشان کتاب ہے اور وہ کتاب بڑی بھاری سمجھی جاتی ہے۔ اگر کہہ دیا جائے کہ دس سال میں ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تو اس کی شہرت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اگر کہا جائے کہ ایک صدی کے اندر اندر ایسی عظیم الشان کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی تو یہ اس کتاب کی انتہائی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ مگر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی یہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی۔ گویا ایک صدی کا سوال نہیں دو صدیوں کا سوال نہیں، تیرہ سو سال میں مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے فضائل کے متعلق ایسی شاندار کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی۔

غرض مسلمان کیا اور ہندو کیا اور عیسائی کیا سب براہین احمدیہ کی اشاعت کے وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعریف کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد ہندوؤں میں مخالفت کا کچھ چرچا شروع ہو گیا تھا مگر اس سے پہلے ہندوؤں میں بھی آپ کی کوئی مخالفت نہیں تھی بلکہ ان میں سے کئی آپ سے بہت اخلاص رکھتے تھے جیسے لالہ بھیم سین صاحب۔ اسی طرح اور بہت سے ہندو تھے جو آپ سے خط وکتابت رکھتے تھے اور آپ کی نیکی اور تقویٰ کو تسلیم کرتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ احتمال ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص آپ کی مخالفت کرے گا کیونکہ سب کے سب لوگ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں آپ کے مداح تھے اور جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعویٰ نبوت سے پہلے لوگ امین اور صدیق کہا کرتے تھے اسی طرح لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی راستبازی کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ غرض مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں تینوں میں سے جو لوگ آپ کے واقف تھے وہ آپ کا ادب اور احترام کرتے تھے اور جو لوگ واقف نہیں تھے وہ نہ دوستی کا اظہار کرتے تھے نہ دشمنی کا۔ ایسی حالت میں براہین احمدیہ شائع ہوئی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے زمانہ میں جب نہ آپ کی مخالفت کا کوئی سوال تھا نہ موافقت کا۔ نہ آپ پر ایمان لانے والے دنیا میں موجود تھے اور نہ مخالفت کرنے والے۔ براہین احمدیہ میں اللہ تعالیٰ کے کیا الہامات شائع ہوئے اور وہ کس قسم کی اخبار غیبیہ پر مشتمل تھے۔ اس غرض کے لئے جب ہم براہین احمدیہ کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں ایک الہام یہ نظر آتا ہے کہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۲)۔ یعنی تو اپنے مومنوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں اور اپنے سوراخوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ پاکیزگی کے لحاظ سے ان کے لئے بہت بہتر ہوگا۔ اگر یہ کتاب چھپی ہوئی نہ ہوتی یا اس پر اشاعت کی تاریخ درج نہ ہوتی اور یہ سوال اٹھتا کہ یہ الہام کب کا ہے تو پادری وہیری کا

کوئی بھائی کہتا کہ یہ الہام ۱۹۰۱ء کا معلوم ہوتا ہے جب ایک جماعت آپ پر ایمان لا چکی تھی۔ حالانکہ یہ ۱۸۸۴ء کی کتاب ہے اور گورنمنٹ کے پاس بھی اس کی کاپی موجود ہے۔ پھر اس زمانہ میں جب دنیا میں آپ کی نہ کوئی مخالف تھی اور نہ مخالفت کا کوئی امکان تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرآن کریم کی یہ آیت بہ تغیر قلیل الہام ہوئی کہ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَ الْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ۔ وَ کَانَ کَیْدُھُمْ عَظِیْمًا (براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد اول صفحہ ۶۰۳) یعنی اے شخص لوگ تیری مخالفت کریں گے اور اس مخالفت میں اہل کتاب اور مشرکین دونوں شریک ہوں گے یعنی یہودی بھی تیری مخالفت کریں گے، عیسائی بھی تیری مخالفت کریں گے، مسلمان بھی تیری مخالفت کریں گے، ہندو بھی تیری مخالفت کریں گے اور وہ اس مخالفت سے کبھی باز نہیں آئیں گے جب تک کہ ہماری طرف سے نشان پر نشان ظاہر نہ ہوں۔ ان نشانوں کے ظاہر ہونے کے بعد ان کو معلوم ہوگا کہ تو ہماری طرف سے کھڑا کیا گیا ہے۔ وَ کَانَ کَیْدُھُمْ عَظِیْمًا اور جن مکروں اور فریبوں سے وہ تجھے مغلوب کرنا چاہیں گے وہ بڑے عظیم الشان ہوں گے مگر ہم ان کے تمام منصوبوں کو باطل کر دیں گے اور تجھے غلبہ اور کامیابی عطا کریں گے۔

اس الہام میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی زبردست مخالفت کی خبر دی گئی ہے حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ اس وقت ہندو آپ کی عزت کرتے تھے، عیسائی آپ کی عزت کرتے تھے، مسلمان آپ کی عزت کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت فرما دیا کہ یہودی اور عیسائی اور مسلمان اور ہندو اور سکھ سب کے سب تیری مخالفت کریں گے اور تیرے خلاف بڑے بڑے منصوبے کریں گے۔ وہ چاہیں گے کہ تجھے مٹا دیں، تیرے نام کو دنیا سے ناپید کر دیں مگر ہم تیری تائید میں اپنے عظیم الشان نشان دکھائیں گے اور آخر نتیجہ یہ نکلے گا کہ تو غالب آ جائے گا اور تیرے مخالف مغلوب ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہود اور دوسرے غیر ملکی مذاہب کے لوگوں کو آپ کے متعلق کوئی علم ہی نہ تھا۔ پھر فرمایا وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۶۰۴) یہ مدنی آیات ہیں اور منافقوں کے متعلق قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور منافق اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک طرف جماعت کے غلبہ کے آثار ہوں اور دوسری طرف دشمن بھی ابھی طاقتور ہو۔ اس حالت کے نتیجہ میں جو پیدائش ہوتی ہے اس کا منافق نام ہوتا ہے۔ جس طرح ہر زمین کی پیداوار الگ الگ ہوتی ہے اسی طرح دینی منافقت کی پیداوار اس موسم ہوتی ہیں جب دین دنیا کے ایک حصہ پر غالب آ جاتا ہے مگر کفر ابھی پوری طرح مغلوب نہیں ہوتا۔ انہیں کفر کا بھی ڈر

ہوتا ہے اور دین کا بھی ڈر ہوتا ہے .... اور چونکہ اس وقت دو کشتیاں تیار ہوجاتی ہیں منافق چاہتا ہے کہ دونوں کشتیوں میں سوار ہوکر سفر کرتا چلا جائے نہ وہ پوری طرح دین کی طرف آتا ہے اور نہ وہ پوری طرح کفر کی طرف جاتا ہے۔ یہ بھی جرأت نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرے کیونکہ ڈرتا ہے کہ وہ جیت نہ جائیں اور یہ بھی جرأت نہیں کرسکتا کہ کفار کا مقابلہ کرے کیونکہ ان کے متعلق بھی اسے خوف ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو وہ جیت جائیں۔ پس فرماتا ہے ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب تیری جماعت ترقی کرتے کرتے کفار کے مقابلہ میں ایک ترازو پر آجائے گی جیسے اس وقت قادیان میں حالت ہے۔ اس وقت تیری جماعت میں منافقوں کا ایک گروہ پیدا ہوجائے گا جو ادھر تجھ سے تعلق رکھے گا اور ادھر کفار سے تعلق رکھے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں نفاق کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ قادیان میں وہی شخص آتا تھا جو لوگوں سے ماریں کھانے کے لئے تیار ہوتا تھا مگر اب چونکہ جماعت ترقی کر کے دشمن کے مقابلہ میں ترازو کے تول کی مانند کھڑی ہوگئی ہے اس لئے منافقین کا بھی ایک عنصر پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب احرار نے شورش برپا کی اور گورنمنٹ کے بعض افسروں نے بھی ان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کردی تو اس وقت ہماری جماعت میں سے بعض منافق احرار سے جاکر ملتے تھے اور ہمیں ان کی نگرانی کرنی پڑتی تھی اور ابھی تو یہ پیشگوئی صرف قادیان میں پوری ہوئی ہے جب بیرونی مقامات پر بھی جماعت نے ترقی کی اور کفر کے مقابلہ میں اس نے طاقت پکڑنی شروع کردی تو اس وقت وہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہوجائیں گے۔ پھر اور ترقی ہوگی تو بیرونی ممالک میں اس پیشگوئی کا ظہور شروع ہوجائے گا۔ کبھی یورپ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی، کبھی امریکہ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی، کبھی چین اور جاپان میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی اور کبھی مصر اور شام اور فلسطین وغیرہ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی۔ غرض ۱۸۸۴ء میں جب نہ لوگوں کی مخالفت کا کوئی خیال تھا نہ یہ خیال تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ کسی دن دنیا میں ایک بہت بڑی جماعت قائم ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا کہ تیرے ذریعہ جماعت قائم ہوگی وہ جماعت ترقی کرے گی اور جب وہ کفار کے مقابل میں ایک ترازو کے تول پر آجائے گی تو اس وقت بعض منافق پیدا ہوجائیں گے۔ حالانکہ یہ باتیں اس وقت کسی کے وہم اور گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔

پھر فرماتا ہے تَلَطَّفْ بِالنَّاسِ وَ تَرَحَّمْ عَلَيْهِمْ اَنْتَ فِيْهِمْ بِمَنْزِلَةِ مُوْسٰى وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد اول صفحہ ۶۰۵) تو لوگوں کے ساتھ رفق اور نرمی سے پیش آ اور تو ان پر رحم کر۔ تو ان میں ایسا ہے جیسے موسیٰؑ اپنی قوم میں تھا اور جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کر۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جو حالات

موسیٰؑ کے ساتھ پیش آئے تھے وہی تیرے ساتھ پیش آنے والے ہیں۔ تیری مخالفت میں بھی لوگوں کی طرف سے بہت کچھ کہا جائے گا تیرا فرض ہے کہ تو صبر سے کام لے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر الہامات واقعہ کے بعد بنا لئے جاتے ہیں تو براہین احمدیہ میں یہ بات کس طرح چھپ گئی۔

پھر الہام ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد اوّل صفحہ ۶۰۷) کیا تیرے ماننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض اتنی بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور وہ آزمائش میں نہیں ڈالے جائیں گے اگر وہ ایسا خیال کرتے ہیں تو یہ بالکل غلط ہے۔ ان پر بڑے بڑے مظالم کئے جائیں گے، بڑے بڑے مصائب ان کو برداشت کرنے پڑیں گے اور جب وہ ان امتحانات میں پورے اتریں گے تب انہیں خدا تعالیٰ کے حضور مومن سمجھا جائے گا۔

یہ تمام الہامات جن کو اوپر پیش کیا گیا ہے ان میں سے کوئی ایک الہام بھی ایسا نہیں جو ۱۸۸۴ء کے واقعات پر چسپاں ہو سکتا ہو بلکہ یہ تمام الہامات وہ ہیں جن میں آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی خبر دی گئی ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی الہامات ہیں جو آئندہ واقعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۱۹۰۳ء میں رؤیا میں دیکھا کہ

''زار روس کا سونٹا میرے ہاتھ میں ہے'' (تذکرہ صفحہ ۴۲۷ ایڈیشن ۲۰۲۲ء)

اب اگر یوروپین مستشرقین کی یہ بات صحیح ہے کہ الہامات ہمیشہ واقعات کے بعد گھڑ لئے جاتے ہیں تو اس الہام کی بناء کن واقعات پر ہے؟ ۱۹۰۳ء میں کون سے ایسے حالات تھے جن کی بناء پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ روس کی حکومت ہمارے قبضہ میں آ جائے گی۔ اس وقت تو ظاہری حالات کی بناء پر یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ گورداسپور کے ضلع میں ہمیں غلبہ حاصل ہو جائے گا کجا یہ کہ روس کی حکومت ملنے کا دعویٰ کیا جاتا اور یہ وہ پیشگوئی ہے کہ اب تک بھی اس کا خفیف سے خفیف اثر نہیں ظاہر ہوا لیکن جب یہ پوری ہوگی دشمن ہزاروں بہانے یہ ثابت کرنے کے لئے بنائے گا کہ یہ بعد میں بنائی گئی۔

غرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتاب براہین احمدیہ ان تمام اعتراضات کا جواب ہے جو مستشرقین یورپ قرآن کریم کے متعلق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ آیات جن میں پیشگوئیوں کا ذکر پایا جاتا ہے اس زمانہ کی ہیں جب وہ واقعات دنیا میں ظاہر ہو چکے تھے۔ ہم کہتے ہیں اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے تو تم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ثابت کرو کہ آپ نے جو پیشگوئیاں کی ہیں وہ واقعات کے ظہور کے بعد کی ہیں اور اگر تم

یہ ثابت نہیں کر سکتے تو تمہیں غور کرنا چاہیے کہ اگر ایک شخص جو اپنے آپ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام کہتا ہے اللہ تعالیٰ سے الہام پا کر قبل از وقت غیب کی خبروں سے دنیا کو اطلاع دے سکتا ہے تو اس کا آقا کیوں ایسی خبریں نہیں دے سکتا تھا؟ اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہامات میں دنیا کی تمام مخالفتوں، منصوبوں اور شرارتوں کا ایسی حالت میں ذکر کر دیا گیا ہے جب سب دنیا آپ کی تائید میں تھی تو قرآن کریم میں کیوں ایسے مضامین قبل از وقت نہیں آ سکتے تھے؟ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود سے ان تمام حملوں کا ایسا جواب دے دیا ہے کہ اب دشمن کو منہ کھولنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدء وحی اور پہلے انبیاء کی بدء وحی میں کیا فرق ہے۔ مستشرقین یورپ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ابتدائی وحی پر تو اعتراض کر دیا مگر انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ جن انبیاء کو وہ خود تسلیم کرتے ہیں ان کی کیفیت وحی الٰہی کے نزول کے وقت کیا ہوئی۔ بنی اسرائیل میں سب سے بڑے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوئے ہیں ان کے متعلق بائبل میں لکھا ہے کہ وہ اپنے خسر یترو کے گلہ کی نگہبانی کر رہے تھے کہ انہوں نے حورب پہاڑ پر ایک درخت آگ میں روشن دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حیران ہوئے کہ یہ عجیب بات ہے کہ درخت کے اردگرد آگ بھی ہے اور وہ جلتا بھی نہیں۔ چنانچہ وہ اس نظارہ کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھے تب

> ''خدا نے اسی بوٹے کے اندر سے پکارا اور کہا کہ اے موسیٰ اے موسیٰ! وہ بولا میں یہاں ہوں۔ تب اس نے کہا یہاں نزدیک مت آ اپنے پاؤں سے جوتا اتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے۔ پھر اس نے کہا میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔ موسیٰ نے اپنا منہ چھپایا کیونکہ وہ خدا پر نظر ڈالنے سے ڈرتا تھا'' (خروج باب ۳ آیت ۴ تا ۷)

اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بدء وحی میں کتنا بڑا فرق ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ جب انہوں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا تو دَنَا فَتَدَلّٰی (النّجم:۹)۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف دوڑے اور خدا تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑا اور یہی عشق کامل کی علامت ہوتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

بعد مدت کے گلے ملتے ہوئے آتی ہے شرم
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

محبت صادق میں یہی ہوتا ہے کہ کچھ وہ بڑھتا ہے اور کچھ یہ بڑھتا ہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے کہ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی رویت ہوئی تو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑے اور اللہ تعالیٰ آپ کی طرف دوڑا۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا واقعہ ہوا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو خدا تعالیٰ نے ان سے کہا

''یہاں نزدیک مت آ''

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ موسیٰؑ کی تجلی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلی میں کتنا بڑا فرق تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ وہ میری طرف بڑھے اور میں ان کی طرف بڑھا تا کہ ہم دونوں آپس میں جلدی مل جائیں مگر موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا

''یہاں نزدیک مت آ''

اور پھر ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا کہ

''اپنے پاؤں سے جوتا اتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے۔''

مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوتا اتارنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے راجاؤں سے کوئی بڑا آدمی ملنے کے لئے جاتا ہے تو وہ جوتا پہنے رہتا ہے لیکن اگر کوئی زمیندار ان سے ملنے کے لئے جائے تو اسے دروازہ میں ہی جوتا اتار دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ چونکہ موسیٰؑ کا مقام وہ نہیں تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تھا اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہیں کہا گیا کہ تو اپنا جوتا اتار۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کو جیسے معمولی زمینداروں کو ڈانٹ کر جوتا اتارنے کا حکم دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ

''اپنے پاؤں سے جوتا اتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے''۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس وقت جو کچھ کہا گیا وہ یہ ہے کہ

''میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔''

اس میں کون سا معرفت کا نکتہ بیان ہے یا کون سا کمال ہے جو اس کلام میں پایا جاتا ہے؟ ایک موٹی بات ہے جو ہر شخص جانتا ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہا گیا اس کے متعلق آگے چل کر بتایا جائے گا کہ وہ کلام اپنے اندر کس قدر خوبیاں رکھتا ہے۔

بدءِ وحی کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حالت پھر وہیری اور اس کے ساتھی یہ تو اعتراض کرتے ہیں

کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو وہ ڈر گئے اور ان کے کندھے کانپنے لگ گئے۔ مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہاں صاف لکھا ہے کہ

’’موسیٰ نے اپنا منہ چھپایا کیونکہ وہ خدا پر نظر ڈالنے سے ڈرتا تھا۔‘‘

اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کے ڈرنے کی وجہ سے اعتراض کیا جا سکتا ہے تو موسیٰ علیہ السلام پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے بلکہ موسیٰ علیہ السلام پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے وہ زیادہ سخت ہے کیونکہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ڈر کر اپنا منہ چھپا لیا۔ لیکن رسول کریم کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ آپ کے کندھے کانپنے لگ گئے اور یہ امر ظاہر ہے کہ بڑا آدمی اگر کسی بات سے گھبراتا ہے تو اس کے کندھے کانپنے لگ جاتے ہیں لیکن بچے جب کسی بات سے ڈرتے ہیں تو اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی بڑا آدمی ڈرے تو وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لے۔ لیکن بچوں کو تم روزانہ دیکھو گے کہ جب وہ ڈرتے ہیں فوراً اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔ یہی بچوں والی حرکت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی کہ خدا تعالیٰ کو دیکھا تو ڈر کر اپنا منہ چھپا لیا۔ یا کبوتر والی حرکت کی جو بلی سے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ روحانی لحاظ سے ایک جوان اور مضبوط آدمی کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے آپ نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں صرف گھبراہٹ سے آپ کے کندھے ہلنے شروع ہو گئے۔ پس جو اعتراض مستشرقین یورپ کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا ہے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے اور وارد بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک شکل میں ہوتا ہے۔ پھر لکھا ہے۔

’’موسیٰ نے خدا کو کہا میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکالوں‘‘

(خروج باب ۳ آیت ۱۱)

عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی وحی پر شک کیا اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کیا حال تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیتا ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں اس کی نصرت اور تائید پر بھروسہ رکھیں اور سمجھیں کہ جب اللہ تعالیٰ مجھے اس کام کے لئے بھیج رہا ہے تو وہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا اس قدر شک کا اظہار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ میری حیثیت ہی کیا ہے کہ میں فرعون کے پاس جاؤں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اور فرعون بڑا بادشاہ ہے۔ میں تو اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حکم کا اس قدر انکار کرنے کے باوجود مسیحی پادریوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے مقرب ہی رہتے ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر صرف اتنا فرماتے ہیں کہ

قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ ۔ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے تو عیسائی یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وحی الٰہی پر یقین نہیں تھا۔

پھر لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جا اور اپنی قوم کو مصر سے نکال کر اس پہاڑ پر عبادت کرنے کے لئے لا۔ مگر موسیٰ نے اس کا بھی انکار کیا۔ چنانچہ لکھا ہے۔

''تب موسیٰ نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھ وے مجھ پر ایمان نہ لائیں گے نہ میری بات سنیں گے وہ کہیں گے کہ خداوند تجھے دکھائی نہیں دیا'' (خروج باب ۴ آیت ۱)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ جو بالکل عقل کے مطابق ہے اس کے متعلق تو عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شک کا اظہار کیا۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کے متعلق نہیں دیکھتے کہ انہوں نے کس طرح اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ اپنی قوم کو یہاں عبادت کرنے کے لئے لا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اس حکم کی فوری طور پر تعمیل کرتے اللہ تعالیٰ سے یہ کہنے لگ گئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائیں گے نہ میری بات سنیں گے وہ کہیں گے کہ خداوند تجھے دکھائی نہیں دیا۔ اس لیے میں ان کے پاس کس کس طرح جا سکتا ہوں۔

''تب خدا نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ وہ بولا عصا۔ پھر اس نے کہا اسے زمین پر پھینک دے۔ اس نے زمین پر پھینک دیا اور وہ سانپ بن گیا اور موسیٰ اس کے آگے سے بھاگا''۔ (خروج باب ۴ آیت ۲، ۳)

کیسی عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو دیکھا تو ڈر کر بھاگنے لگ گئے حالانکہ سانپ کو ہر شخص مار سکتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی سمجھدار طاقتور انسان سانپ دیکھے تو ڈر کر بھاگنا شروع کر دے وہ فوراً لاٹھی اٹھاتا اور اسے مار ڈالتا ہے۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو دیکھا تو ڈر کر بھاگنا شروع کر دیا۔ عیسائی اس واقعہ کو پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں کوئی نقص واقعہ نہیں ہوتا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھاگتے نہیں وحی الٰہی کے نازل ہونے پر صرف اتنا فرماتے ہیں کہ نہ معلوم میں اس اہم ذمہ واری کو ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ تو عیسائی کہتے ہیں آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شک اور تردّد کا اظہار کر دیا۔ پھر لکھا ہے۔

''تب موسیٰ نے خداوند سے کہا کہ اے میرے خداوند میں فصاحت نہیں رکھتا نہ تو آگے سے اور نہ جب سے کہ تو نے اپنے بندے سے کلام کیا اور میری زبان اور باتوں میں لکنت ہے۔''

(خروج باب ۴ آیت ۱۰)

دیکھو کتنا بڑا نشان تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کا عصا سانپ بن گیا اور جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سانپ کو پکڑا تو وہ پھر عصا بن گیا۔ اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی اڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں میری زبان میں فصاحت نہیں۔ نہ پہلے فصاحت تھی اور نہ اب تجھے دیکھنے کے بعد میری زبان میں کوئی فرق پیدا ہوا ہے۔ یعنی پہلے تو میں بے شک ایک معمولی آدمی تھا مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیرے جلال کو دیکھنے کے بعد بھی میری زبان ویسی کی ویسی ہے جس طرح پہلے میری زبان میں لکنت تھی اسی طرح اب ہے جس طرح پہلے غیر فصیح تھا اُسی طرح اب غیر فصیح ہوں۔

''تب خدا نے اسے کہا کہ آدمی کو زبان کس نے دی اور کون گونگا یا بہرا یا بینا یا اندھا کرتا ہے کیا میں نہیں کرتا جو خداوند ہوں پس اب تو جا اور میں تیری بات کے ساتھ ہوں اور تجھ کو سکھاؤں گا جو کچھ تو کہے گا''۔ (خروج باب ۴ آیت ۱۱، ۱۲)

اس حکم اور نصیحت کو سن کر بھی موسیٰ علیہ السلام کے طریق میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ چنانچہ آگے لکھا ہے۔

''تب اس نے کہا کہ اے میرے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں جس کو چاہے تو اس کے وسیلہ سے بھیج'' (خروج باب ۴ آیت ۱۳)

یعنی میں جانے کے لئے تیار نہیں۔ میری جگہ کسی اور کو بھیج دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کے حکم کا بار بار انکار کیا پھر بھی مسیحی علماء کے نزدیک ان کے عظیم الشان نبی ہونے میں کوئی شک پیدا نہیں ہوا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اتنا کہنے پر کہ نہ معلوم میں اس ذمہ واری کو ادا کر سکوں گا یا نہیں، انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان میں یا عقل میں شبہ نظر آنے لگا حالانکہ موسیٰ کا واقعہ ان کی الہامی کتاب میں مذکور ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فقرہ قرآن کریم میں نہیں بلکہ صرف حدیث میں بیان ہے جو کلام اللہ کے برابر شہادت نہیں ہو سکتا۔

تورات میں آگے چل کر لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار خدا تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کیا

''تب خداوند کا غصہ موسیٰ پر بھڑکا'' (خروج باب ۴ آیت ۱۴)

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھ کر کہ وہ انکار پر اصرار ہی کئے جاتے ہیں انہیں ڈانٹا۔ پھر لکھا ہے۔

''کیا نہیں ہے لاویوں میں سے ہارون تیرا بھائی؟ میں جانتا ہوں کہ وہ فصیح ہے اور دیکھ کہ وہ بھی تیری ملاقات کو آتا ہے اور تجھے دیکھ کے دل میں خوش ہوگا اور تو اسے کہے گا اور اسے باتیں بتائے گا

اور میں تیری اور اس کی بات کے ساتھ ہوں گا اور تم جو کچھ کرو گے تم کو بتاؤں گا''

(خروج باب ۴ آیت ۱۴،۱۵)

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدء وحی پر عیسائیوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ تمام کے تمام اعتراضات اس وحی پر بھی واقعہ ہوتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ ہم تو عیسائیوں کے اعتراضات کو درست تسلیم نہیں کرتے اور ان کے جوابات بھی اوپر درج کئے جا چکے ہیں لیکن پھر بھی الزامی رنگ میں ہم عیسائیوں سے کہتے ہیں اگر تمہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اعتراض ہے کہ وحی کے متعلق آپؐ نے تردّد کا اظہار فرمایا تو یہ اعتراض بدرجۂ اتم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے اور وارد بھی ایسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔

حضرت عیسیٰؑ کی بدء الوحی کا مقابلہ آنحضرت صلعم کی بدء الوحی سے اس کے بعد ہم حضرت مسیح علیہ السلام کی بدء وحی کے واقعات کو دیکھتے ہیں۔ متی باب ۳ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام یوحنا کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ مجھے بپتسمہ دو پہلے تو انہوں نے انکار کیا مگر آخر مان لیا اور حضرت مسیحؑ نے یوحنا سے بپتسمہ پایا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے متعلق انجیل کہتی ہے۔

''اور یسوع بپتسمہ پا کے وہیں پانی سے نکل کے اوپر آیا اور دیکھو کہ اس کے لئے آسمان کھل گیا اور اس نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اترتے دیکھا۔ اور دیکھو کہ آسمان سے ایک آواز یہ کہتی آئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں۔'' (متی باب ۳ آیت ۱۶،۱۷)

اس نظارہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدء وحی کے مقابلہ میں رکھو اور پھر سوچو کہ کیا ان دونوں واقعات میں کوئی بھی نسبت ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام فرشتہ کے ذریعہ بھیجا اور مسیحؑ پر ایک کبوتر کی شکل میں روح القدس نازل ہوا۔ کبوتر سے انہوں نے کیا ڈرنا تھا کبوتر تو وہ جانور ہے جس کی ہڈیاں بھی انسان چبا جاتا ہے۔ یہی عیسوی اور محمدیؐ تجلی کا فرق ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے قرآنی تعلیم کو شرک سے محفوظ رکھا لیکن عیسائیت پر شیطان غالب آ گیا کیونکہ عیسائی مذہب کے پیشوا پر روح القدس ایک نہایت ہی کمزور شکل میں نازل ہوا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو روح القدس کی تجلی ہوئی تھی وہ ہر ایک تجلی سے بڑھ کر ہے۔ روح القدس کبھی کسی نبی پر کبوتر کی شکل پر ظاہر ہوا اور کبھی کسی نبی یا اوتار پر گائے کی شکل پر

ظاہر ہوا اور کسی پر کچھ یا مچھ کی شکل پر ظاہر ہوا اور انسان کی شکل کا وقت نہ آیا جب تک انسان کامل یعنی ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو گئے تو روح القدس بھی آپ پر بوجہ کامل انسان ہونے کے انسان کی شکل پر ہی ظاہر ہوا اور چونکہ روح القدس کی قوی تجلی تھی جس نے زمین سے لے کر آسمان کا افق بھر دیا تھا اس لئے قرآنی تعلیم شرک سے محفوظ رہی۔ لیکن چونکہ عیسائی مذہب کے پیشوا پر روح القدس نہایت کمزور شکل میں ظاہر ہوا تھا یعنی کبوتر کی شکل پر۔ اس لئے ناپاک روح یعنی شیطان اس مذہب پر فتح یاب ہو گیا۔‘‘

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۸۳، ۸۴)

اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ جن کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجتا ہے وہ اس کے رسول کہلاتے ہیں اور رسول دنیا میں دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا کام صرف خط دے دینا ہوتا ہے اس سے زیادہ ان کا کام کچھ نہیں ہوتا۔ اور ایک وہ جن کا کام ان احکام کو نافذ کرنا بھی ہوتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام پر تجلی الٰہی کا کبوتر کی صورت میں نازل ہونا بتاتا ہے کہ مسیحؑ کی حیثیت صرف اس پیغامبر کی تھی جو پیغام سنا دیتا ہے اور اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلی الٰہی کا نزول ایک مرد کامل کی شکل میں ظاہر ہوا جس سے اس طرف اشارہ تھا کہ آپ صرف پیغامبر نہ ہوں گے بلکہ ایک کامل نمونہ بھی اپنے مخاطبین کے لئے ہوں گے۔

انجیل میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔

’’تب یسوع روح کے وسیلے بیابان میں لایا گیا تا کہ شیطان اسے آزمائے اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہوا تب آزمائش کرنے والے نے اس پاس آ کے کہا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ یہ پتھر روٹی بن جائیں اس نے جواب میں کہا لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر اک بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے جیتا ہے۔ تب شیطان اسے مقدس شہر میں اپنے ساتھ لے گیا اور ہیکل کے کنگورے پر کھڑا کر کے اس سے کہا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرا دے کیونکہ لکھا ہے کہ وہ تیرے لئے اپنے فرشتوں کو فرمائے گا اور وے تجھے ہاتھوں پر اٹھالیں گے ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر سے ٹھیس لگے۔ یسوع نے اس سے کہا یہ بھی لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو مت آزما۔ پھر شیطان اسے ایک بڑے اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی ساری بادشاہتیں اور ان کی شان وشوکت اسے دکھائیں اور اس سے کہا اگر تو گر کے مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دوں گا۔

تب یسوع نے اسے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر۔‘‘ (متی باب ۴ آیت ۱ تا ۱۰)

دیکھو عیسائیوں کو تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض تھا کہ آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شبہ کا اظہار کیا مگر یہاں یہ لکھا ہے کہ شیطان حضرت مسیحؑ کو اپنے ساتھ لئے پھرا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ واقعہ میں ایسا ہوا ہے ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ پر کامل یقین تھا تو انجیل کے بیان کے مطابق وہ شیطان کے پیچھے پیچھے کیوں بھاگے پھرتے تھے اور کیا وجہ ہے کہ جس طرف شیطان ان کی انگلی پکڑ کر لے جاتا اسی طرف وہ نہایت اطمینان کے ساتھ چلنا شروع کر دیتے؟ بیت المقدس میں لے جاتا ہے تو وہاں چلے جاتے ہیں۔ ہیکل کے کنگورے پر کھڑا کرتا ہے تو وہاں کھڑے ہو جاتے ہیں گویا جس طرح کوئی بے بس ہوتا ہے۔ شیطان کی ہر بات مانتے چلے جاتے ہیں۔ بہرحال عیسائیوں کو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور تسلیم کرنی پڑے گی۔ یا تو ان کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک ظاہری واقعہ ہے اور یا ان کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ظاہری واقعہ نہیں بلکہ خواب ہے۔ اگر اسے ظاہری واقعہ تسلیم کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان حضرت مسیحؑ کے پاس آیا کیوں؟ کیا وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کو دھوکا دے سکتا تھا؟ اگر نہیں تو اس کا ظاہری صورت میں حضرت مسیحؑ کے پاس آنا بالکل بے معنی بات تھی جس کی کوئی بھی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر اس واقعہ کو حضرت مسیحؑ کی خواب قرار دے دیا جائے تو ایسا ہو سکتا ہے مگر اس صورت میں بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے دل میں یہ خیالات آنے شروع ہو گئے تھے کہ کیا مجھے شیطان کی طرف سے تو الہام نہیں ہوا۔ حضرت مسیحؑ کا رؤیا کی حالت میں شیطان کے پیچھے چلنا اور اسے نہ دھتکارنا ان کے قلب کی اس حالت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس کے شیطان ہونے پر یقین نہ رکھتے تھے اور اس وقت تک شیطانی اور رحمانی رؤیا میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

غرض انجیل کی آیات سے یہ امر ظاہر ہے کہ یسوع کو ایک کبوتری کے نظارہ میں پہلا جلوہ ہوا جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کامل القویٰ انسان کی شکل میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگ کی صورت میں۔ پھر موسیٰ کا شک اور خوف بھی ثابت ہے اور مسیحؑ کا بھی۔ کیونکہ شیطان کا ملنا اور مسیحؑ کا اس کے پیچھے جانا تردد اور شک پر ہی دلالت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کے دل میں اس وقت تک الٰہی کلام پر وہ یقین اور وثوق پیدا نہیں ہوا تھا جو بعد میں جا کر پیدا ہوا۔

پھر سوال یہ ہے کہ جب کبوتر کی شکل میں روح القدس نازل ہوا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ انجیل میں صرف اتنا لکھا ہے

’’آسمان سے ایک آواز یہ کہتی آئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں۔‘‘

(متی باب ۳ آیت ۱۷)

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کون سا نیا علم بخشا گیا ہے یا کون سا معرفت کا نیا نکتہ تھا جو آپ پر نازل کیا گیا۔ محض کسی آواز کا آجانا تو کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ آواز تو ایک پاگل کو بھی آجاتی ہے یا جب موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ ’’میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔‘‘ تو موسیٰؑ کو اس سے کیا لطف آیا ہوگا یا کون سا عرفان ان کو حاصل ہوا ہوگا۔ کیا اس کلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کہہ سکتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسی بات بتائی گئی ہے جو پہلے میرے علم میں نہیں تھی یا عرفان کا ایک نیا باب میرے لئے کھول دیا گیا ہے یقیناً وہ ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ پر اگر ایک کبوتری کی شکل میں روح القدس نازل ہو گیا اور آسمان سے یہ آواز آ گئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے تو کیا ہو گیا۔ یہ محض ایک بیان ہے اس سے زیادہ ان الفاظ کی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ ان میں عرفان کی کوئی بات ہے نہ علم و حکمت کا کوئی نکتہ ہے۔ نہ تعلق باللہ کا کوئی راز ان میں منکشف کیا گیا ہے اور نہ کوئی اور ایسی بات بیان کی گئی ہے جو علم اور معرفت کی زیادتی کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ پھر یہ بھی قابل غور بات ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کبوتر کی شکل میں روح القدس کے نازل ہونے کا جو نظارہ دیکھا اس کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی حقیقی نظارہ نہیں تھا بلکہ دماغ کی خرابی کا ایک کرشمہ تھا کیونکہ جن لوگوں کو وہم ہو جاتا ہے وہ بعض دفعہ معمولی معمولی باتوں سے ایسے نتائج اخذ کر لیتے ہیں جو کسی اور انسان کے واہمہ میں بھی نہیں آتے۔ مولوی یار محمد صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک صحابی تھے ان کے دماغ میں نقص تھا۔ بعض دفعہ باتیں کرتے وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے تو مولوی یار محمد صاحب جھٹ کود کر آگے آ جاتے اور سمجھتے کہ یہ اشارہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے میرے لئے کیا تھا۔ اسی طرح جن میں وہم کا مرض پیدا ہو جاتا ہے وہ بعض دفعہ پرندوں کی پرواز سے فال لینا شروع کر دیتے ہیں۔ دائیں طرف سے کوئی پرندہ گزر جائے تو سمجھتے ہیں کہ ہمیں کام میں کامیابی ہو جائے گی اور اگر بائیں طرف سے گزر جائے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں نحوست کا سامنا کرنا ہوگا۔ اسی رنگ میں ہو سکتا ہے کہ جب یوحنا سے بپتسمہ پانے کے بعد حضرت مسیحؑ پانی سے باہر آئے ہوں تو کوئی کبوتر اڑ کر ان کے پاس آ بیٹھا ہو اور انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ یہ آسمان سے میرے پاس آیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بدءِ وحی کا واقعہ بے شک ایک حقیقی نظارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپ سے ہم کلام ہوا۔ مگر اس کلام میں کوئی ایسی بات نہیں جس میں علم و عرفان کا کوئی خاص راز منکشف کیا گیا ہو یا کوئی ایسی بات بتائی گئی ہو جو دنیا کے لئے ایک نرالے پیغام کی حیثیت رکھتی ہو۔ صرف موسیٰؑ کو یہ کہا گیا کہ تو فرعون کے پاس جا اور بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نکال۔ یہ محض ایک دنیوی بات ہے زیادہ سے زیادہ اسے سیاسی لحاظ سے اہمیت دی

جا سکتی ہے مگر مذہبی اور روحانی نقطۂ نگاہ سے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو دنیا کے لئے جدید پیغام ہو یا اس پر کوئی نئی حقیقت روشن کرنے والا ہو۔ بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سابق انبیاء کی بدءِ وحی کے واقعات کا جب آپس میں مقابلہ کیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی باقی تمام انبیاء کی وحیوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی محبت اور پیار کا سلوک آپ سے کیا ہے اس قسم کی محبت اور پیار کا سلوک اس نے اور کسی نبی سے نہیں کیا۔

ترتیب: سورۃ علق کا پہلی سورتوں سے تعلق یہ سورۃ بھی پہلی سورۃ کے مضمون کے مطابق ہے۔ یعنی وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ میں جو مضمون تھا اسی کو ایک نئے پیرایہ میں اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ میں اللہ تعالیٰ نے وحی کا ایک تسلسل بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ تسلسل ابتدائے عالم سے جاری ہے۔ پہلے آدمؑ کے ذریعہ اس کا ظہور ہوا، پھر نوحؑ کے ذریعہ اس کا ظہور ہوا، پھر موسیٰؑ کے ذریعہ اس کا ظہور ہوا۔ اب قرآن کریم کے ذریعہ اس کا ظہور ہو رہا ہے۔ یہی مضمون اس جگہ بیان کیا گیا ہے کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ یعنی انسانی پیدائش کو تم دیکھ لو جس طرح ایک فرد علقہ سے مضغہ بنتا ہے اور مضغہ کے بعد درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے آخر جاندار بن کر رحمِ مادر سے باہر آتا ہے۔ اسی طرح جماعتی طور پر انسان کی ترقی ہوئی ہے۔ پہلے روحانی لحاظ سے انسان علقہ کی طرح تھا پھر ترقی کر کے مضغہ بنا پھر اس نے اور ترقی کی، پھر اور ترقی کی یہاں تک کہ وہ انسانِ کامل کے مقام تک آ پہنچا اور یہ پیدائش محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ہوئی ہے۔ پس خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جو وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ میں بیان کیا گیا تھا اور بتایا گیا ہے کہ ابتدائے عالم سے ایک سکیم ہمارے مدنظر تھی اور ہم چاہتے تھے کہ روحانی لحاظ سے انسان کو درجہ بدرجہ ترقی دیتے دیتے آخر دنیا میں ایک انسان کامل پیدا کریں۔ جب یہ سکیم ابتدائے عالم سے ہمارے مدنظر تھی تو ضروری تھا کہ انسان کو اس کا مقصود حاصل ہوتا۔ ورنہ خلق انسانی عبث ٹھہرتی ہے اور اللہ تعالیٰ زیر الزام آتا ہے کہ جس سکیم کے ماتحت بنی نوع انسان کی پیدائش کی گئی تھی وہ نعوذ باللہ کامیاب نہ ہوئی۔ پس یہ سورۃ گزشتہ سورۃ کے مضمون کے تسلسل میں ہے اور اسی مضمون کو ایک نئے انداز میں اس جگہ بیان کیا گیا ہے۔

اس جگہ شاید کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب سورۂ علق ابتدائی سورۃ ہے تو سورۂ تین سے اس کا تعلق ثابت کرنا کیا معنے؟ تین بعد میں نازل ہوئی اور علق پہلے۔ سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی دو ترتیبیں ہیں۔ ایک نزول کے لحاظ سے۔ سو اس لحاظ سے تین بعد میں ہے اور علق پہلے۔ لیکن اس کی جو ترتیب تمام زمانوں کو

مدنظر رکھ کر ہے اسی کے مطابق قرآن کریم میں سورتیں رکھی گئی ہیں اور اسی کے لحاظ سے بعض بعد میں نازل ہونے والی سورتیں پہلے آ گئی ہیں اور پہلے نازل ہونے والی بعد میں آ گئی ہیں۔

اب میں قرآنی آیات کی تشریح کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام ملا وہ اپنے اندر کس قدر علوم رکھتا تھا اور کتنے عظیم الشان معارف تھے جو اس میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ②

اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے (سب اشیاء کو) پیدا کیا۔

تفسیر۔ اِقْرَاْ کے معنے اِقْرَاْ وہ پہلا لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور جس میں اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی بعض عظیم الشان پیشگوئیوں کا اعلان کر دیا گیا۔ اِقْرَاْ کے اصل معنے گو کسی لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کے ہیں مگر اس کے ایک معنی اعلان کرنے کے بھی ہیں اور یہ دونوں معنے ایسے ہیں جو اس مقام پر نہایت عمدگی کے ساتھ چسپاں ہوتے ہیں۔ اگر اِقْرَاْ کے معنے اعلان کرنے کے لئے جائیں تو اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کے یہ معنے ہوں گے کہ تو اس کتاب کا اعلان اپنے اس رب کے نام کے ساتھ کر جس نے تجھے پیدا کیا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم وہ کتاب ہے جس میں پہلے دن ہی یہ خبر دے دی گئی ہے کہ یہ کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی ساری قوموں اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلا الہام دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پہلے دن جو الہام ہوا وہ صرف اس قدر تھا کہ

"میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔"

(خروج باب ۳ آیت ۱۰)

حالانکہ انبیاء کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ قلوب کی صفائی کریں شیطان کی غلامی سے لوگوں کو چھڑائیں اور تقویٰ

اور پاکیزگی کی راہیں ان پر روشن کریں مگر وہاں ایسا کوئی پیغام نہیں دیا گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو پیغام ملا اس میں بھی اس بنیادی چیز کا کوئی ذکر نہیں صرف اتنا بیان کیا جاتا ہے کہ ایک کبوتری اتری اور آسمان سے یہ آواز آئی کہ تو میرا پیارا بیٹا ہے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر پہلا فقرہ یہی نازل ہوتا ہے کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو دنیا کے سامنے اعلان کر اور اسے بتا کہ اسے اس کا خالق رب اپنی طرف بلاتا ہے اس طرح پہلے لفظ کے ذریعہ ہی اس حقیقت کو روشن کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ساری دنیا کے لئے ہے۔ اسود اور احمر اس پیغام کے مخاطب ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ہے کہ وہ تمام لوگوں تک اس پیغام کو پہنچائیں اور وہ لوگ جو آستانۂ الٰہی سے بھٹک چکے ہیں ان کو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف واپس لائیں۔

اِقْرَاْ میں پیشگوئی کہ قرآن مجید لکھا جائے گا اِقْرَاْ کے دوسرے معنے کسی لکھی ہوئی چیز کو پڑھنے کے ہوتے ہیں۔ ان معنوں کے لحاظ سے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو لکھی جائے گی اور پھر یہ لکھی ہوئی کتاب بار بار پڑھی جائے گی۔ چنانچہ اگر واقعات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن دنیا میں وہ پہلی کتاب ہے جو ابتدائے نزول کے ساتھ ہی لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں اور جس قدر الہامی کتابیں پائی جاتی ہیں ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو نازل ہونے کے وقت ہی لکھ لی گئی ہو۔ صرف قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جس کے متعلق یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ اسے لکھا جائے گا اور اس طرح شروع سے ہی اس کی حفاظت کا سامان کیا جائے گا اور وہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری بھی ہوگئی۔ چنانچہ نولڈکے، وہیری اور میور تک نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سوائے قرآن کریم کے اور کوئی کتاب ایسی نہیں جو ابتدائے ایام میں لکھی گئی ہو۔ (The Life of Muhammad by Sir William Muir P:561-563 - A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry vol:1 p:109) انجیلیں بے شک آج دنیا میں موجود ہیں مگر کوئی عیسائی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کتابیں حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی میں لکھی گئی ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا نے حضرت مسیحؑ کی وفات کے ایک لمبے عرصہ بعد ان باتوں کو جمع کیا چنانچہ ''لوقا'' خود اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ ان کاموں کا جو فی الواقع ہمارے درمیان انجام ہوئے بیان کریں جس طرح سے انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کی خدمت کرنے والے تھے

ہم سے روایت کی۔ میں نے بھی مناسب جانا کہ سب کو سرے سے صحیح طور پر دریافت کر کے تیرے لئے اے بزرگ تھیوفلس بترتیب لکھوں تا کہ تو ان باتوں کی حقیقت کو جن کی تو نے تعلیم پائی جانے‘‘۔

(لوقا باب ۱ آیت ۱ تا ۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اناجیل حواریوں نے نہیں بلکہ ان سے ملنے والوں اور شاید ملنے والوں کے ملنے والوں نے لکھی ہیں۔

غرض دنیا میں سوائے قرآن کریم کے اور کوئی کتاب ایسی نہیں جو شروع سے ہی لکھوائی گئی ہو اور جس کو بار بار پڑھنا لوگوں کا فرض قرار دیا گیا ہو۔ پس اِقْرَاْ میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ یہ کتاب دنیا میں لکھی جائے گی اور لوگوں سے کہا جائے گا کہ اسے پڑھو اور بار بار پڑھو۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ میں شرک کا ردّ پھر فرمایا بِاسْمِ رَبِّكَ اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھ۔ یہاں رَبِّكَ کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک نئے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ درحقیقت رب ایک ایسی ذات ہے جس کو مشرک بھی مانتے تھے اور یہودی اور عیسائی بھی اس کے متعلق اپنے ایمان کا اظہار کرتے تھے مگر وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے تھے۔ مثلاً مشرکین یہ تو کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان لاتے ہیں مگر وہ اس کے ساتھ ہی لات اور عزیٰ کی بھی پرستش کرتے تھے۔ یا عیسائی یہ تو کہتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا وجود تسلیم کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ یہی حال یہود کا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر تو ایمان رکھتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہود کے سوا اللہ تعالیٰ اور کسی پر الہام نازل نہیں کر سکتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت ان تمام امور کا نہایت سختی کے ساتھ انکار کرتی تھی۔ وہ یہودیت کے نظریہ کو بھی تسلیم نہ کرتی تھی۔ عیسائیت کے فلسفہ کو بھی رد کرتی تھی اور مشرکین مکہ کے خیالات کو بھی ناقابل قبول قرار دیتی تھی۔ آپ غار حرا کی تاریکیوں میں جب اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اس کو سوز اور گداز کے ساتھ پکارتے تو یہ تمام خیالات ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آتے۔ آپ دیکھتے کہ یہود گو اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں مگر یہ کیسا گھناؤنا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس نے اپنی محبت یہود کے ساتھ وابستہ کر دی ہے۔ دنیا کا اور کوئی انسان اس کے کلام اور الہام کا مورد نہیں ہو سکتا۔ آپ عیسائیت کی تعلیم پر غور کرتے اور سوچتے کہ بے شک عیسائیت بھی اللہ تعالیٰ کی ہستی کو تسلیم کرتی ہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دے کر مقام الوہیت کی خطرناک توہین کر رہی ہے۔ آپ مشرکین مکہ کے عقائد پر نگاہ دوڑاتے تو آپ کی فطرت

صحیحہ ان کے عقائد کو بھی باطل قرار دیتی اور کہتی کہ ایک خدا کو چھوڑ کر لات اور منات اور عزیٰ کی پرستش کسی صورت میں بھی درست نہیں ہوسکتی۔ غرض آپ یہودیوں کے عقیدہ کا بھی انکار کرتے تھے۔ عیسائیت کے عقیدہ کا بھی انکار کرتے تھے اور مشرکین کے عقیدہ کا بھی انکار کرتے تھے۔ یہودیت آپ کے سامنے پیش ہوتی تو آپ کی فطرت کہتی کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس خدا کو مان لوں جو یہود کے سوا اور کسی کو اپنا پیارا بنانے کے لئے تیار نہیں۔ عیسائیت آپ کے سامنے پیش ہوتی تو آپ کی فطرت اس کا انکار کرتی اور کہتی وہ مذہب کس طرح سچا تسلیم کیا جا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو بیٹے کا محتاج قرار دیتا ہے۔ مشرکین مکہ کے خیالات آپ کے سامنے پیش ہوتے تو آپ کی فطرت ان کو ناقابل تسلیم قرار دے دیتی اور کہتی کہ لات اور منات اور عزیٰ کو قابل پرستش نہیں سمجھا جا سکتا۔ غرض آپ کسی شرک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آپ چاروں طرف سے ایسے لوگوں میں گھرے ہونے کے باوجود جو مشرکانہ خیالات میں ملوث تھے اپنی فطرت صحیحہ کی بناء پر اس خدا کو مانتے تھے جو ایک ہے جو قادر اور قیوم ہے۔ جو اپنی صفات میں ازلی ابدی اور غیر متغیر ہے۔ جو نہ کسی کا بیٹا ہے نہ کوئی اس کا بیٹا۔ جو خالق الکل ہے۔ جو دکھ اٹھانے اور صلیب پر چڑھنے سے پاک ہے اور جو اپنے کلام کے لئے کسی خاص گروہ کو مخصوص نہیں کرتا بلکہ دنیا کے ہر ایسے فرد کو اپنے قرب میں جگہ عطا کرتا ہے جو اس کی محبت کا متلاشی ہوتا ہے۔ پس فرمایا اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ۔ جا اور دنیا میں اپنے رب کے نام کا اعلان کر یعنی کفار کے ارباب نہیں بلکہ تیرا رب یعنی تو نے جس رب کو سمجھا ہے وہی سچا رب ہے اور اسی کے نام سے برکات ملتی ہیں تو دنیا میں اس کا بار بار اعلان کر اور لوگوں کو اس رب کی طرف بلا جس کو تو تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح پہلے الہام میں ہی اللہ تعالیٰ نے شرک کا ردّ کر دیا اور بتا دیا کہ گو اور لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا عقیدہ ہر قسم کے مشرکانہ خیالات سے منزہ ہو صرف وہ خدا جس کی حقیقت کو تو نے سمجھا ہے جس پر غار حرا کی دن رات کی عبادت میں تجھے یقین حاصل ہوا ہے وہی دنیا کا حقیقی رب ہے اور ہم تجھے اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ تو دنیا کے سامنے ''اپنے ربّ'' کا اعلان کر اور لوگوں کو بتا کہ جس طرح میں نے اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو سمجھا ہے مجھے میرے رب نے بتایا ہے کہ وہی درست ہے باقی تمام اعتقادات باطل اور الوہیت کی شان سے بہت بعید ہیں۔ غرض رَبِّكَ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتقاد کی درستی کے متعلق الٰہی تصدیق کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسیحی جو یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ خدا کا بیٹا ہے بالکل غلط ہے۔ تو نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کے متعلق سمجھا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اسی طرح مشرکین مکہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ لات اور منات اور عزیٰ بھی اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ صحیح عقیدہ وہی ہے جو تو نے سمجھا ہے یا مثلاً یہود جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف یہود سے

کلام کرتا ہے اور کسی سے نہیں یہ بالکل غلط ہے۔ تو جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بولتا ہے یہ بالکل صحیح اور درست عقیدہ ہے۔ پس تو جا اور دنیا میں اپنے رب کا اعلان کر گویا تو غار حرا میں غور و فکر کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں اور تجھے ہدایت دیتے ہیں کہ اب تو لوگوں میں کھڑا ہو اور انہیں اپنے رب کی طرف بُلا۔ غرض اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ میں ایک طرف تو شرک کا ردّ کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد کی درستی کا اعلان کر دیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ ہم اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ صحیح عقائد اور صحیح خیالات وہی ہیں جو اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے متعلق رکھتا ہے۔ لوگوں کے خیالات درست نہیں ہیں۔

آیت اِقْرَاْ سے اس بات کی تردید کہ آنحضرت صلعم گمراہ نہیں تھے بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضُّحیٰ:۸) میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نعوذ باللہ پہلے گمراہ تھے بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت دی۔ ان معنوں کا غلط ہونا تو آیت مذکورہ کی تفسیر میں بتایا جا چکا ہے لیکن اس کی ایک تردید آیت اِقْرَاْ سے بھی نکلتی ہے۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گمراہ ہوتے تو خدا تعالیٰ کو پہلی وحی میں یہ کہنا چاہیے تھا کہ جو کچھ تو میرے متعلق سمجھ رہا تھا وہ غلط ہے اب میں تجھے بتاتا ہوں کہ صحیح عقیدہ کون سا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی خیال کی تردید نہیں فرمائی۔ آپ کے کسی عقیدہ کو باطل قرار نہیں دیا بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا کہ جو کچھ تو نے ہمارے متعلق سمجھا ہے وہ درست ہے اور جو کچھ لوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ پس اس آیت نے بھی بتادیا کہ وَجَدَكَ ضَآلًّا کے وہ معنے بالکل غلط ہیں جو دشمنانِ اسلام کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ پس یہاں رَبِّكَ کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے دونوں باتیں بیان کر دیں۔ شرک کا بھی ردّ کر دیا اور یہ بھی بتادیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیدہ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نزول الہام کے متعلق تھا وہی درست تھا۔ تبھی فرمایا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔ جا اور ''اپنے ربّ'' کے نام کا دنیا میں اعلان کر۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں اسم کے ساتھ باء ملانے کی وجہ بعض لوگوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ اس جگہ اِقْرَاْ اِسْمَ رَبِّكَ کہنا چاہیے تھا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کیوں کہا گیا ہے۔ اس کا جواب نحوی یہ دیتے ہیں کہ باء یہاں زائدہ ہے یعنی تاکید کی باء ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان میں باء بعض دفعہ زائد بھی آجاتی ہے اور اگر ہم اس کو زائدہ قرار دیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ جب کسی فقرہ میں باء زائدہ آجاتی ہے تو اس کے معنوں میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کے یہ معنے ہوں گے کہ تو اپنے رب کا نام خوب اچھی طرح

لے اور خوب اچھی طرح دنیا میں اس کا اعلان کر۔مگر میرے نزدیک یہاں باءزائدہ نہیں بلکہ استعانت کے لئے استعمال ہوئی ہے یعنی تو اپنے رب کے نام کی مدد کے ساتھ جس نے دنیا کو پیدا کیا ہے ایسا کر۔

پولیس جب کسی کی خانہ تلاشی کے لئے آتی ہے تو کہتی ہے حاکم کے نام پر دروازہ کھولا جاتا ہے۔مطلب یہ ہوتا ہے کہ حاکم وقت نے ہم کو اتھارٹی Authority دی ہے جس کے ماتحت ہم یہ کام کر رہے ہیں۔اگر تم ہمارے اس کام میں روک بنو گے تو حکومت کے مجرم قرار پاؤ گے۔چنانچہ پولیس اگر کسی چوری کی تفتیش کے سلسلہ میں کسی کے مکان کی تلاشی لینا چاہے اور مالک مکان انکار کر دے تو اس پر مقدمہ دائر ہو جاتا ہے کہ اس نے سرکاری افسروں کے کام میں رکاوٹ ڈالی اور حاکم وقت کی اتھارٹی کے باوجود اپنے گھر کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔جس طرح دنیا میں پولیس حاکم وقت کی طرف سے اختیارات حاصل کر کے کسی کے مکان پر جاتی ہے اسی طرح فرماتا ہے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔ تو اپنے رب کے نام کے ساتھ دنیا میں کھڑا ہو اور ان سے کہہ کہ مجھے ان باتوں کے پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اگر تم انکار کرو گے تو تم میرا انکار نہیں کرو گے بلکہ اس خدا کا انکار کرو گے جس نے مجھے بھیجا ہے اور جس کے نام کے ساتھ تمہارے سامنے میں اپنی رسالت کا اعلان کر رہا ہوں۔گو رَبِّكَ کا لفظ استعمال کر کے جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد کی صحت کا اعلان کیا گیا وہاں بِاسْمِ رَبِّكَ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔رسول یہی کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے کھڑا کیا گیا ہے اور میں اسی کے نام کے ساتھ اپنے دعاوی تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔

غرض پہلی وحی میں ہی بِاسْمِ رَبِّكَ کہہ کر ایک طرف تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد کی درستی کا اعلان کر دیا اور دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی اعلان کر دیا اور بتا دیا کہ یہ جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ ہماری طرف سے کہتا ہے۔اس تشریح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کے یہ معنے ہوں گے کہ تو اپنے اس رب کے نام کا جس کو صرف تو ہی اس زمانہ میں صحیح طور پر سمجھتا ہے دنیا میں اعلان کر اور لوگوں کو بتا کہ باقی تمام تشریحات رب کی اس کے مقابل میں باطل ہیں۔اسی طرح تو دنیا میں اس تعلیم کا اعلان کر جو ہم تجھ پر نازل کر رہے ہیں کیونکہ یہ تعلیم صرف تیرے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔یہ تعلیم لکھی جائے گی، پڑھی جائے گی اور بار بار پڑھی جائے گی۔پس تو ایک فرد کی حیثیت سے اس کو نہ پڑھ بلکہ اس حیثیت سے پڑھ کہ خدا نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں یہ تعلیم ساری دنیا کے سامنے پیش کروں۔ہم تیرے ساتھ ہیں اور ہم اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ تو ہمارا سچا رسول ہے۔گویا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ میں وہ تمام مفہوم

آ گیا جو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ میں بیان کیا گیا ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ تو دوسرے الفاظ میں اس کلمۂ شہادت کا اعلان کر دیا گیا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ یعنی میں اس خدائے واحد کو تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں جس کا علم مجھے حاصل ہے اور جو صحیح اور سچا علم ہے۔ میں اس کے نام پر تمہیں اس کی وحدانیت پر ایمان لانے کا پیغام دیتا ہوں۔ اگر تم میری اس بات کو نہیں مانو گے تو اللہ تعالیٰ کے حضور مجرم اور گنہگار قرار پاؤ گے کیونکہ میں اس کا رسول ہوں اور میں اس کے نام پر کھڑا ہوا ہوں مجھے کہا گیا ہے کہ میں اس تعلیم کو چھپا کر نہ رکھوں بلکہ دنیا میں پھیلاؤں اور ہر فرد کے کان تک اللہ تعالیٰ کی اس آواز کو پہنچاؤں۔غرض پہلے دن ہی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کلمہ شہادت کو پوشیدہ رکھ دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ تو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا ہے دنیا میں یہ اعلان کر کہ تو خدا تعالیٰ کا رسول ہے۔ تیرا نظریۂ ربوبیت الٰہی ہی سچا نظریہ ہے اور اس کلام کو دنیا تک پہنچانا تیرا فرض ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کے بعد الَّذِيْ خَلَقَ کے لانے میں حکمت یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کے بعد الَّذِيْ خَلَقَ کے الفاظ کا اضافہ اللہ تعالیٰ نے کیوں کیا ہے؟ اگر خالی اتنا ہی کہا جاتا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ تب بھی رب کے مفہوم میں خَلَقَ کے معنے آ جاتے کیونکہ عربی زبان میں رب کے معنے اس ذات کے ہیں جو انسان کو پیدا کر کے اسے ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جاتی ہے۔ پس چونکہ یہ مفہوم رب کے لفظ نے ادا کر دیا تھا اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ الَّذِيْ خَلَقَ کے الفاظ کا اضافہ اپنے اندر کیا حکمت رکھتا ہے؟

عربی زبان میں لفظ رب کا استعمال اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گو ربوبیت کے معنے انسان کو پیدا کر کے اسے ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جانے کے ہیں مگر یہ بھی ہر زبان میں قاعدہ ہے کہ کبھی الفاظ اپنے پورے معنوں میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ جزوی معنوں میں بھی استعمال ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ باوجود ان معنوں کے عرب دوسروں کو بھی رَبٌّ کہہ دیا کرتے تھے۔ مثلاً عربی زبان میں سردار کو بھی رَبٌّ کہہ دیتے ہیں اس لئے کہ جزوی طور پر وہ قوم کی ربوبیت کرتا ہے یا مثلاً رَبِّیْ کا لفظ عبرانی زبان میں عالم دین کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے (اقرب)۔اسی طرح ماں باپ اور استاد وغیرہ بھی ایک قسم کے رَبّ ہوتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی جسمانی یا علمی تربیت کا موجب بنتے ہیں۔ پس اگر صرف اتنا ہی کہا جاتا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ تو انسانی ذہن اس طرف جا سکتا تھا کہ ممکن ہے رَبّ کا لفظ یہاں جزوی معنوں میں استعمال ہوا ہو اور اگر اس طرف ذہن نہ جاتا تو بہر حال ایک شبہ سا

رہتا کہ نہ معلوم رَبّ کا لفظ یہاں جزوی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا اصل معنوں میں۔ کیونکہ ماں باپ بھی رَبّ ہوتے ہیں۔ استاد بھی رَبّ ہوتا ہے، بادشاہ بھی رَبّ ہوتا ہے، پھر پیر بھی ایک قسم کا رَبّ ہوتا ہے اور عربی زبان میں ان سب کے لئے رَبّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پس چونکہ یہ شبہ پیدا ہوسکتا تھا کہ نہ معلوم یہاں رَبّ کا لفظ جزوی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا اپنے وسیع معنوں میں۔ اس لئے خَلَقَ کا لفظ بڑھا کر بتادیا کہ ہم ربوبیت کو اس کے وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو اس رَبّ کا نام لے جس نے خَلَقَ کے مقام سے مخلوق کو اٹھا کر ترقی دینی شروع کی ہے۔

ربّ کے معنے پیدا کرکے آہستہ آہستہ ترقی تک پہنچانے والے کے ہوتے ہیں۔ لیکن جزوی معنوں میں جب ربّ کا لفظ بولا جائے تو طبیعت میں ایک خلجان سا رہتا ہے کہ اس میں ربوبیت کی کس سٹیج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ابتدائی سٹیج کی طرف یا درمیانی یا آخری سٹیج کی طرف۔ مثلاً جب ایک یہودی کسی عالم دین کو رَبِّیْ کہے گا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جس دن سے مجھے دین کی سمجھ آئی ہے اس دن سے یہ شخص مجھے دین کی باتیں بتانے والا اور میری روحانی رنگ میں پرورش کرنے والا ہے۔ اگر دایہ کو کوئی رَبَّۃٌ کہہ دے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اس وقت سے ربوبیت کرنے والی جبکہ میں پیدا ہو چکا تھا اور اس وقت تک اس کی ربوبیت رہی جب تک میں چلنے پھرنے لگا۔ پس چونکہ ربوبیتیں مختلف ہوتی ہیں اس لئے یہاں الَّذِیْ خَلَقَ کا اضافہ کیا گیا۔ باپ کی ربوبیت اغذیہ کے وقت سے ہوتی ہے، باپ گوشت اور سبزی ترکاری استعمال کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کا جسم ایک چیز تیار کرتا ہے جسے نطفہ کہتے ہیں۔ پس باپ کی ربوبیت غذا کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد ماں کی ربوبیت نطفہ کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور وہ بچے کو اپنے پیٹ میں پالنا شروع کردیتی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوجاتا ہے تو وہ اسے دودھ پلاتی ہے اور اگر کسی بیماری کی وجہ سے وہ دودھ نہیں پلاسکتی یا اس کا دودھ نہیں ہوتا تو دایہ کی ربوبیت شروع ہوجاتی ہے۔ پھر ہوش سنبھالنے کے بعد استاد کی ربوبیت کا وقت آجاتا ہے اور جب کچھ اور بڑا ہوتا ہے تو کوئی بڑا عالم اس کی تربیت شروع کردیتا ہے۔ اس کے بعد جوان ہونے پر پیر کی ربوبیت کا وقت آجاتا ہے۔ پھر بادشاہ انسان کی ربوبیت کرتا ہے۔ غرض ربوبیت کی مختلف سٹیجز ہیں۔ کوئی چھوٹی سٹیج ہے اور کوئی بڑی مگر بہرحال ان میں سے کسی ایک سٹیج کے لئے بھی ربّ کا لفظ بول لیا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں الَّذِیْ خَلَقَ کا اضافہ کیا اور فرمایا کہ ہماری مراد اس سے وہ ربّ نہیں جن کی ربوبیت غذا کے وقت سے شروع ہوتی ہے وہ ربّ بھی مراد نہیں جن کی ربوبیت نطفہ کے وقت سے شروع ہوتی ہے، وہ ربّ بھی مراد نہیں جن کی ربوبیت پیدائش کے وقت سے شروع ہوتی ہے، وہ ربّ بھی

مراد نہیں جن کی ربوبیت بولنے کے وقت سے شروع ہوتی ہے، وہ ربّ بھی مراد نہیں جن کی ربوبیت بالغ اور جوان ہونے کے وقت سے شروع ہوتی ہے بلکہ وہ ربّ مراد ہے جس کی ربوبیت خَلَقَ کے وقت سے شروع ہوتی ہے یعنی جب سے کہ مخلوق کا وجود ظاہر ہوا۔ بے شک مختلف لوگوں کے لئے مختلف نسبتوں کی بناء پر ربّ کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے مگر ہم تجھے کہتے ہیں تو اس ربّ کے نام سے شروع کر جس کی ربوبیت خَلَقَ کے وقت سے شروع ہوتی ہے کہ جہاں سے وہ تیرا ساتھ دے رہا ہے۔ کوئی تیرا عزیز اور ساتھی وہاں سے تیرا ساتھ نہیں دے رہا۔ اس کی ربوبیت کے مقابلہ میں باقی تمام ربوبیتیں باطل اور ہیچ ہیں اور کسی کو اس کی ربوبیت میں شریک ہونے کا دعویٰ نہیں ہوسکتا (ہاں مسلمان مولویوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ امر منسوب کر دیا ہے کہ وہ پرندے پیدا کیا کرتے تھے (معارف القرآن سورۃ اٰلِ عمران زیر آیت رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ) اور اس طرح انہوں نے اپنی کج فہمی سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شریک بنا دیا ہے)۔

اس آیت میں ایک اور عجیب بات بھی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے صرف ربّ کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا بلکہ رَبِّكَ کا لفظ استعمال کیا تھا مگر آگے خَلَقَكَ کہنے کی بجائے صرف خَلَقَ کہہ دیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ رَبِّكَ میں كَ ضمیر کے بڑھانے سے چونکہ شرک کی تردید اور اس عقیدہ کی تائید ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رکھتے تھے۔ اس لئے وہاں تو كَ ضمیر کو بڑھا دیا لیکن اگر یہاں بھی خَلَقَ کی بجائے خَلَقَكَ کہہ دیا جاتا تو ایک وسیع مضمون محدود ہو کر رہ جاتا۔ الَّذِیْ خَلَقَكَ کے معنے صرف اتنے ہوتے کہ وہ خدا جس نے تجھ کو پیدا کیا مگر الَّذِیْ خَلَقَ کے یہ معنے بن گئے کہ وہ خدا جس نے تجھ کو بھی پیدا کیا اور باقی تمام مخلوق کو بھی پیدا کیا ہے۔ گویا الَّذِیْ خَلَقَ کے معنے یہ ہیں کہ الَّذِیْ خَلَقَكَ وَخَلَقَ اٰبَآءَكَ وَجَدَّكَ وَاٰبَآءَ جَدِّكَ اس طرح یہ سلسلہ چلتے چلتے حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچ جاتا ہے اور ان سے اوپر عناصر اور پھر اجزائے عناصر تک چلا جاتا ہے۔ پس الَّذِیْ خَلَقَ کو بغیر کسی قید کے مطلق بیان کر کے اللہ تعالیٰ کی صفت خلق کی غیر محدود وسعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تو اس خدا کو پیش کر جس نے خالق اور مخلوق کا رشتہ آپس میں جوڑا اور جس کی صفت خلق کا آغاز تجھ سے نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ سے دنیا اس کی صفت خلق کا نظارہ دیکھتی چلی آئی ہے۔ دیکھو یہ قرآن کریم کا کتنا کمال ہے کہ ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کو مقید کر کے اس کے معنوں میں وسعت پیدا کر دی ہے اور دوسری صفت کو مطلق رکھ کر اس کے معنوں میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ ایسی بالغ نظری انسانی کلام میں کہاں ہوتی ہے۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ میں علاوہ اور مضامین کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کاملہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ تو اس رب کے نام کے ساتھ اس تعلیم کا دنیا میں اعلان کر جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کا مفہوم یہ نکلا کہ پیدائش عالم کے زمانہ سے اللہ تعالیٰ نے تیرے اس کام کی بنیاد رکھی تھی اس لئے وہ خدا جس نے اس مقصد عظیم کے لئے ساری دنیا کو پیدا کیا تھا اس کی مدد اور تائید ونصرت کے ساتھ تو دنیا میں اپنی نبوت کا اعلان کر۔ کیونکہ پیدائش عالم کی غرض صرف تیرے وجود کو دنیا میں ظاہر کرنا تھا۔ پس جس طرح بِاسۡمِ رَبِّكَ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اظہار کیا گیا تھا اسی طرح الَّذِیۡ خَلَقَ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کاملہ کا اعلان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس دن سے مخلوق پیدا ہوئی ہے اس دن سے صرف تو ہمارا مقصود تھا اور جب سے ہم نے پہلا انسان دنیا میں پیدا کیا ہے اسی دن سے وہ کلام ہمارے مدنظر تھا جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اب جبکہ تو جو دنیا کا حقیقی مقصود ہے پیدا ہو چکا ہے ہم تجھے کہتے ہیں کہ تو دنیا کے پاس جا اور اسے کہہ کہ مجھ پر جو کلام نازل ہوا ہے وہ اتنی بڑی عظمت اور شان رکھتا ہے کہ جب سے اس دنیا کا پہلا ذرّہ بنا ہے اسی وقت سے یہ کلام اللہ تعالیٰ کے مدنظر تھا۔ اگر آج کا پیغام ہوتا تب بھی تم اسے ٹھکرا کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے تھے لیکن یہ تو وہ پیغام ہے جس کے لئے اس نے دنیا کی بنیاد رکھی اور یہی وہ پیغام ہے جو پیدائش عالم کا موجب ہوا۔ اتنے بڑے پیغام کو ٹھکرا کر تم خدا تعالیٰ کے عذاب سے کہاں بچ سکتے ہو۔ پس فرمایا تو اس کلام کو میرا نام لے کر پیش کر یعنی بحیثیت رسول ہونے کے اسے دنیا کے سامنے رکھ۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ سرکاری حیثیت سے تو ہماری طرف سے جا اور لوگوں سے کہہ کہ جس خدا نے شروع سے لے کر اب تک تمام مخلوق پیدا کی ہے اس نے مجھے بھیجا ہے یعنی پیدائش عالم کی جو غرض تھی وہ آج میرے ذریعہ سے پوری ہوئی ہے۔ اس لئے اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو دنیا کی پیدائش کو لغو قرار دیتے ہو۔ اسی امر کی طرف اس حدیث قدسی میں اشارہ ہے کہ لَوۡلَاكَ لَمَا خَلَقۡتُ الۡاَفۡلَاكَ (الموضوعات الکبریٰ لملا علی قاری حدیث نمبر ۷۵۴) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تو نہ ہوتا تو میں زمین اور آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔ الَّذِیۡ خَلَقَ میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے کہ تو اس خدا کا نام لے کر دنیا میں اپنی نبوت کا اعلان کر جس نے پیدائش عالم کے زمانہ سے تیرے اس کام کی بنیاد رکھی تھی۔ گویا وہ مضمون جو حدیث قدسی میں آتا ہے درحقیقت نہایت لطیف پیرایہ میں قرآن کریم میں بھی بیان کیا جا چکا ہے اور وہ حدیث اس آیت کی تشریح ہے۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ تو اس خدا کا نام لے کر پڑھ جس نے

مخلوق کو پیدا کیا ہے یعنی اس کی اس صفت کو جو پیدائش عالم کا موجب ہے اپنی مدد کے لئے بلا اور اس سے کہہ کہ یَا رَبِّ الَّذِیْ خَلَقْتَ الْخَلْقَ۔ اے میرے رب اگر تو نے مخلوق کو اس کمال کے لئے پیدا کیا ہے جس کے ظہور کا مجھ سے واسطہ ہے تو پھر اس مقصد کو پورا کر جس کے لئے تو نے مجھے دنیا میں کھڑا کیا ہے۔ گویا علاوہ پبلک میں اپنی رسالت کاملہ کا اعلان کرنے کے اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی ہدایت دیتا ہے کہ جب تو ہم سے اپنی ترقی کے لئے دعا مانگنے لگے تو ہمیشہ اس طرح مانگ کہ اے خدا جس نے تمام مخلوق کو اس دن کے لئے پیدا کیا تھا میں تجھے تیری اس صفت خلق کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ جب اس دن کے لئے تو نے ساری دنیا کو پیدا کیا تھا اور اس قدر دیر سے تیرا یہ ارادہ تھا جو اب پورا ہونے لگا ہے تو اب اس وقت میری خاص مدد فرما اور میرے اعلانِ نبوت میں برکت ڈال۔ غرض اِدھر پبلک میں یہ اعلان کر کہ جس مقصد کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے وہ معمولی نہیں بلکہ جس دن سے دنیا پیدا ہوئی ہے اسی دن سے یہ مقصد اللہ تعالیٰ کے مدنظر تھا۔ اُدھر خدا سے یہ دعا مانگ کہ جس مقصد کے لئے تو نے مجھے کھڑا کیا ہے اس میں مجھے کامیابی عطا فرما کیونکہ اگر مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو سلسلۂ مخلوق کا مقصد حقیقی باطل ہو جائے گا۔ اس لئے میں تجھے اسی صفت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں جو مخلوق کی پیدائش کا باعث ہوئی کہ تو مجھے کامیاب کر۔ مجھے ناکامی سے بچا۔ کیونکہ میری ناکامی میں تمام مخلوق کی ناکامی ہے۔ اس طرح ایک طرف اللہ تعالیٰ نے اس پیغام کی عظمت کو ظاہر کر دیا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل ہوا تھا اور دوسری طرف دعا کی قبولیت کا ایک لطیف طریق اس نے آپ کو سکھا دیا۔

پیدائش انسانی کا مقصود کون سا ہے میں اوپر مضمون میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ الَّذِیْ خَلَقَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کو ایک مقصد عظیم کے لئے پیدا کیا گیا تھا مگر وہ مقصد اب تک پورا نہیں ہوا تھا اب اس مقصد کو تیرے ذریعہ سے پورا کیا جا رہا ہے۔ اس کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص جو کسی مذہب کا قائل ہے وہ تسلیم کرتا ہے کہ پیدائش انسانی کسی خاص مقصد کے لئے ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبث پیدا نہیں کیا۔ بہرحال کوئی نہ کوئی مقصد تھا جس کے ماتحت انسانی پیدائش عمل میں آئی۔ پس جہاں تک مقصد کا سوال ہے مذہبیات سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ اس سے متفق ہیں۔ لیکن یہ کہ وہ مقصد کس رنگ میں پورا ہوا اس کے متعلق دنیا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مقصد ابتدائے عالم میں ہی پورا ہو گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے جو وحی نازل کی وہ تمام ضروریات کے لئے کافی تھی۔ یہ عقیدہ آریہ ہندوؤں کا ہے۔ یہ لوگ ویدوں کو اپنی الہامی کتاب کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ کامل تعلیم ابتدائے زمانہ میں ہی نازل ہو جانی

چاہیے (ستیارتھ پرکاش از چھوپتی ایم۔اے صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۴)۔اس کے مقابل میں بعض اور لوگ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ بے شک انسان کو اس کا مقصد حاصل ہوا مگر وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مقصد انبیاء کے ذریعہ بتدریج انسان کو حاصل ہوا ہے۔جیسے یہودی کہ وہ کہتے ہیں پہلے آدمؑ آئے پھر نوحؑ آئے پھر ابراہیمؑ آئے پھر اسحاقؑ آئے پھر اسماعیلؑ آئے پھر یعقوب آئے پھر یوسفؑ آئے پھر موسیٰؑ آئے پھر اور انبیاء آئے یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وحی الٰہی کا یہ سلسلہ ملاکی نبی تک پہنچا اور اس کے بعد وحی الٰہی کا یہ سلسلہ بند ہو گیا۔یہود کے اس عقیدہ پر اگر غور کیا جائے تو کسی چیز کا جو انتہائی نقطہ ہوتا ہے وہ نہ موسیٰؑ میں نظر آتا ہے اور نہ ملاکی نبی میں۔کیونکہ موسیٰؑ خود اپنے کسی مقام کو آخری مقام قرار نہیں دیتے جیسا کہ آگے بتایا جائے گا اور ملاکی کو تو یہود بھی موسیٰؑ سے بڑا قرار نہیں دیتے۔پھر سوال یہ ہے کہ پیدائش انسانی کا جو آخری نقطہ تھا وہ کہاں گیا۔کیا اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ اس مقصد کو بھول گیا جس کے ماتحت اس نے بنی نوع انسان کو پیدا کیا تھا۔

پیدائش انسانی کا مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدائش انسانی کا آخری نقطہ ہیں لیکن یہ بات بھی دو طرح بالبداہت باطل ہے۔اوّل تو اس طرح کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ انسان کے بیٹے نہیں تھے بلکہ خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے۔(یوحنا باب ۱ آیت ۴۹) جب وہ آدم کے بیٹے ہی نہیں تھے تو پیدائش انسانی کا آخری نقطہ کس طرح ہو گئے؟ یہاں سوال تو آدم کے بیٹوں کے متعلق ہے کہ ان میں سے کون پیدائش انسانی کا اصل مقصود ہے۔اللہ تعالیٰ کے بیٹے کا تو یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔پس جبکہ یہاں نسل آدمؑ کی پیدائش کا سوال ہے تو ہمیں بہرحال آدمؑ کی نسل میں سے ہی کسی ایسے شخص کا پتہ لگانا پڑے گا جو پیدائش انسانی کا مقصود ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کسی چیز کا انتہائی نقطہ اس کے آخری سرے کا نام ہوتا ہے مثلاً ایک لکیر کھینچی گئی ہو تو اس لکیر کا جو آخری سرا ہو گا وہ اس کا آخری نقطہ قرار دیا جائے گا۔لیکن جب ہم مسیحؑ کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخری نقطہ کسی صورت میں بھی قرار نہیں دیئے جاسکتے کیونکہ وہ اس خط کا آخری سرا ثابت نہیں ہوتے جو آدمؑ سے شروع ہوا تھا۔آدمؑ نے شریعت کی بنیاد رکھی تھی۔نوحؑ نے اس میں اضافہ کیا۔ابراہیمؑ آئے تو انہوں نے اور زیادتی کی،موسیٰؑ آئے تو انہوں نے اور زیادہ شریعت کو مکمل طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔غرض شریعت کا ایک دور ہے جو آدمؑ سے شروع ہوا اور اس میں زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔پس پیدائش انسانی کا آخری نقطہ وہی ہو سکتا ہے جو پہلی شریعت پر زیادتی کرے۔وہ کس طرح ہو سکتا ہے جو شریعت کو لعنت قرار دے کر اس سے دور

بھاگ جائے۔ مثلاً لکڑی کا آخری سرا لکڑی کا ہی ہوگا اگر کوئی کہے کہ لکڑی کا آخری سرا پانی یا ہوا ہے تو یہ بالکل بے جوڑ بات ہوگی۔ بہرحال آخری سرا اپنے پہلے سرے سے وابستہ ہوتا ہے۔ سونے کا آخری سرا سونے کا ہوگا۔ چاندی کا آخری سرا چاندی کا ہوگا۔ لوہے کا آخری سرا لوہے کا ہوگا۔ اگر کوئی کہے کہ سونے یا چاندی یا لوہے کا آخری سرا لکڑی کا ہے تو سب لوگ ہنسنے لگ جائیں گے کہ کیسی بیوقوفی کی بات کر رہا ہے۔ اسی طرح جب آدمؑ سے شریعت کا ایک تسلسل چل رہا تھا آدمؑ سے بہتر شریعت نوحؑ نے پیش کی، نوحؑ سے بہتر شریعت موسیٰؑ نے پیش کی تو بہرحال آخری نقطہ وہ ہوگا جو موسیٰؑ سے بھی بہتر شریعت پیش کرے۔ وہ نہیں ہوسکتا جو شریعت کو لعنت قرار دے۔ پس عیسائیوں کا یہ دعویٰ بھی بالکل باطل ہے کہ پیدائش انسانی کا آخری نقطہ حضرت مسیحؑ ہیں۔

ابتدائے عالم میں کامل شریعت نازل نہیں ہوسکتی تھی ہندو جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ابتدائے عالم میں ہی کامل شریعت نازل ہوگئی تھی (نسخہ خبط احمدیہ مصنفہ پنڈت لیکھرام صفحہ ۳۴۵) ان کے اس دعویٰ کو قرآن کریم نے عقلی دلائل سے اسی سورۃ میں ردّ کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اپنی پیدائش کی طرف تم دیکھو کہ وہ کس طرح ہوئی ہے۔ کیا پہلے دن ہی تم عاقل بالغ اور سمجھدار بن جاتے ہو یا آہستہ آہستہ اور بتدریج ترقی کرتے کرتے اپنے انتہائی مقام تک پہنچتے ہو؟ اگر فرد کی پیدائش میں ترتیب اور تدریج کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پہلے دن ہی ایک کامل انسان پیدا ہوجائے تو روحانی امور میں تم تدریج کا کیوں انکار کرتے ہو؟ جس طرح جسمانیات میں تدریج کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح روحانیات میں بھی ارتقاء کئی تدریجی منازل کو طے کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ارتقائی منازل کو طے کئے بغیر پہلے دن ہی کوئی چیز کامل بن جائے۔ ارتقاء کا یہ قانون نہ صرف پیدائش انسانی میں نظر آتا ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی ہر پیدا کردہ چیز میں ہے۔ یہاں تک کہ مادیات میں بھی ارتقاء کا قانون جاری ہے۔ سورج اور چاند بھی ایک دن میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ جیسا کہ علم ہیئت نے ثابت کیا ہے پہلے یہ دخانی ذرات کی شکل میں تھے پھر ان میں دوری حرکت پیدا ہوئی پھر یہ ذرات ایک دوسرے سے ملنے شروع ہوئے پھر انہوں نے ایک ٹھوس وجود کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد پھر ایک لمبا دوران پر گزرا یہاں تک کہ لاکھوں سال کے بعد انہوں نے سورج یا چاند کی شکل اختیار کی۔ یہی حال لوہے اور چاندی کا ہے کہ وہ بھی ایک لمبے ارتقاء کے بعد ظاہر ہوئے۔ کوئلہ کتنی معمولی چیز ہے مگر یہ بھی ایک دن میں نہیں بنا بلکہ ہزاروں سال کے بعد بنا ہے۔ اسی طرح ہیرا لاکھوں سال کے تغیرات کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ہیرے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کوئلہ میں سے پیدا ہوتا ہے گویا پہلے درختوں سے جو مدتوں تک زمین میں دبے رہتے ہیں کوئلہ تیار ہوتا ہے اور پھر کوئلہ سے ہیرا بنتا ہے۔

غرض کوئی چیز لے لو ارتقائی تغیرات میں سے گزرے بغیر وہ عالم وجود میں نہیں آئی۔ جب اللہ تعالیٰ کا جسمانیات میں تمہیں یہ قانون نظر آتا ہے تو تم الہام کے متعلق یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ پیدائش عالم کے ساتھ ہی کامل الہام نازل ہو گیا جس طرح اللہ تعالیٰ کی ظاہری پیدائش میں ارتقاء کا قانون جاری ہے اسی طرح وحی اور الہام بھی اس قانون سے وابستہ ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اور چیزوں میں تو ارتقاء ہو اور الہام میں ارتقاء نہ ہو۔ پس خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ نے ہندوؤں کے اس خیال کو ردّ کر دیا کہ شریعت پہلے دن ہی مکمل طور پر نازل ہو گئی تھی فرماتا ہے تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے انسان نے بہرحال ترقی کرتے کرتے کامل شریعت کے مقام تک پہنچنا تھا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پہلے دن ہی اسے کامل شریعت عطا کر دی جاتی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عیسائیوں کی تھیوری بھی باطل ہے، یہودیوں کا خیال بھی غلط ہے اور ہندوؤں کا نظریہ بھی ناقابل قبول ہے تو پیدائش انسانی کا مقصد کس رنگ میں پورا ہوا؟ تم کہتے ہو کہ یہودیوں کا خیال اس لئے صحیح نہیں کہ وہ ملاکی نبی پر وحی الٰہی کے سلسلہ کو بند قرار دے رہے ہیں جو ایک معمولی حیثیت کے نبی تھے۔ حالانکہ آخری نقطہ وہ ہونا چاہیے تھا جو موسیٰؑ سے بڑھ کر ہوتا۔ عیسائیوں کا خیال اس لئے صحیح نہیں کہ وہ شریعت سے بھاگ رہے ہیں اور ہندوؤں کا خیال اس لئے صحیح نہیں کہ وہ ابتدائے عالم میں ہی کامل شریعت کا نزول تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ابتدائی نہیں بلکہ آخری نقطہ ہونا چاہیے۔ جب یہ تمام خیالات باطل ہیں تو پھر تم خود ہی بتاؤ کہ پیدائش انسانی کا مقصد کس نبی کے ذریعہ پورا ہوا؟

اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ گو آج تک اللہ تعالیٰ کے ہزاروں انبیاء دنیا میں آ چکے ہیں مگر بہت سے نبی ایسے گزرے ہیں جن کے ناموں کا بھی ہمیں علم نہیں کجا یہ کہ ہم کہہ سکیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا کیا کلام نازل ہوا تھا۔ مثلاً ہندو گو ابتدائے عالم میں ویدوں کا نزول تسلیم کرتے ہیں مگر یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وید کن رشیوں پر نازل ہوئے تھے۔ جب اتنی معمولی بات کا بھی انہیں علم نہیں تو ان کے متعلق یہ بحث کس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ پیدائش انسانی کا مقصود تھے یا نہیں۔

زرتشت پیدائش انسانی کا مقصد نہیں زرتشتی بے شک حضرت زرتشتؑ کو اللہ تعالیٰ کا نبی مانتے ہیں مگر ان کی کتاب میں صاف طور پر آئندہ آنے والے ایک نبی کی پیشگوئی پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زرتشتؑ پیدائش انسانی کا آخری نقطہ نہیں تھے ورنہ وہ اپنے بعد کسی اور صاحب شریعت نبی کی خبر نہ دیتے۔ (سفرنگ دساتیر صفحہ ۱۹۰) ہندوؤں اور زرتشتیوں کے انبیاء کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہ ان میں سے حضرت زرتشتؑ نے خود اپنے آپ کو آخری نقطہ

قرار نہیں دیا اور ویدوں کے متعلق ہندوؤں میں اختلاف ہے کہ وہ کن رشیوں پر نازل ہوئے تھے۔ ہم انبیاء بنی اسرائیل کے متعلق غور کرتے ہیں کہ آیا پیدائش انسانی کا وہ مقصود تھے یا نہیں۔ انبیاء بنی اسرائیل میں سے وہ نبی جن کی تعلیم سب سے زیادہ واضح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کسی قدر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم بھی موجود ہے جو بائبل نے پیش کی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدائش انسانی کا آخری نقطہ نہیں اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام مخلوق کے نقطۂ مرکزی تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوگی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پاویں گی''۔ (پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷، ۱۸)

یعنی تیرے ذریعہ سے نہیں بلکہ تیری نسل کے ذریعہ سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی۔ تو محدود زمانہ کے لئے اور محدود لوگوں کی ہدایت کے لئے نبی بنایا گیا ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ زمین کی ساری قومیں برکت پائیں۔ ہمارا یہ مدعا تیرے ذریعہ سے پورا نہیں ہوگا بلکہ تیری نسل کے ذریعہ سے پورا ہوگا۔ اس سوال کو جانے دو کہ وہ کون سی نسل ہے جس کے ذریعہ یہ وعدہ پورا ہوا۔ بہرحال ان الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدائش عالم کا آخری نقطہ نہیں تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ تو نہیں بلکہ تیری نسل کے ذریعہ سے میں ایسا سامان کروں گا کہ زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ آخری نقطہ نے عالمگیر مذہب کا بانی ہونا تھا کیونکہ اس کے متعلق مقدر یہ تھا کہ زمین کی ساری قومیں اس سے برکت حاصل کریں اور زمین کی ساری قومیں اسی سے برکت حاصل کرسکتی تھیں جو عالمگیر مذہب کا بانی ہوتا۔ پس ابراہیمؑ پیدائش انسانی کے ارتقاء کا آخری نقطہ نہیں تھے۔ ان کی اپنی پیشگوئی یہ ہے کہ میری نسل میں سے ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جس کے ذریعہ دنیا کی ساری قوموں کو دعوت دی جائے گی، دنیا کی ساری قوموں کو برکت دی جائے گی اور دنیا کی ساری قوموں کو ہدایت اور قرب کی راہیں بتائی جائیں گی۔ بالفاظ دیگر یہ پیشگوئی ایک عالمگیر مذہب کے بارہ میں تھی اور وہ شخص جس سے دنیا کی ساری قوموں نے برکت حاصل کرنی تھی وہی انبیاء کا منتہائے نظر تھا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یہ مقصد حاصل نہیں ہوا تھا۔

اگر کہا جائے کہ یہ پیشگوئی موسیٰؑ کے ذریعہ پوری ہوچکی ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ یہودی مذہب مختص القوم تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے صرف یہود کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو

جو کچھ کہا گیا وہ یہ تھا کہ تیری نسل سے ساری قومیں برکت پائیں گی۔ موسیٰ سے صرف بنی اسرائیل نے برکت حاصل کی تھی لیکن ابراہیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ تھا کہ میں تیری نسل کو بڑھاؤں گا اور بڑھاتا چلا جاؤں گا یہاں تک کہ ارتقاء کی منازل طے کرتے کرتے ایک دن آئے گا کہ ساری دنیا کو دعوت حقہ دی جائے گی اور ساری دنیا کو خدائی آواز پہنچائی جائے گی۔ پس موسوی مذہب نے چونکہ ساری دنیا کو دعوت نہیں دی بلکہ موسیٰ کا پیغام مخصوص تھا بنی اسرائیل سے۔ اس لئے یہودی مذہب کو اس پیشگوئی کا مصداق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوم حضرت موسیٰؑ خود ایک اور نبی کی خبر دیتے ہیں جو ان کے بعد آنے والا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے الہام کے ذریعہ یہ خبر دی ہے کہ

”میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے“۔ (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ تا ۲۰)

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ پیشگوئی فرما رہے ہیں کہ میرے بعد ایک اور نبی آنے والا ہے جو اپنے ساتھ نئی شریعت لائے گا۔ کیونکہ الفاظ یہ ہیں ”میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا“۔ ”تجھ سا نبی“ کے معنے یہی ہیں کہ جس طرح تو صاحبِ شریعت ہے اسی طرح وہ صاحب شریعت ہوگا۔ اگر صرف اتنے الفاظ ہوتے کہ میں ان کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا تو اس کے معنے یہ ہو سکتے تھے کہ جس طرح بنی اسرائیل میں اور کئی غیر شرعی انبیاء آئے اسی طرح ایک غیر شرعی نبی کی آپ نے اس جگہ خاص طور پر خبر دی ہے مگر ”تجھ سا“ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہاں وہ دوسرے نبی مراد نہیں ہو سکتے جو بنی اسرائیل میں آئے کیونکہ وہ موسیٰ جیسے نہیں تھے۔ موسیٰ صاحبِ شریعت نبی تھے اور وہ صاحبِ شریعت نبی نہیں تھے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو پیشگوئی فرمائی ہے اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ نبی موسیٰ کی طرح صاحبِ شریعت ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کے مطابق ایک اور صاحبِ شریعت نبی ابھی دنیا میں آنے والا تھا۔ پس موسیٰ ارتقاءِ روحانی کا آخری نقطہ نہیں ہو سکتے۔ پھر کہتے ہیں۔

”خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔

دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی‘‘۔

(استثناء باب ۳۳ آیت ۲)

پیدائش انسانی کے آخری نقطہ کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام تین جلوہ گریوں کا ذکر فرماتے ہیں۔

’’خداوند سینا سے آیا‘‘ اس سے مراد موسوی ظہور ہے۔ ’’شعیر سے ان پر طلوع ہوا‘‘ اس سے مراد عیسوی ظہور ہے۔ ان دونوں ظہوروں کے بعد ایک تیسرے ظہور کی بھی اس پیشگوئی میں خبر دی گئی ہے وہ ظہور فاران سے ظاہر ہوگا اور آتشی شریعت اس کے ساتھ ہی ہوگی۔ اس پیشگوئی سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ دورِ نبوت کے آخری نقطے نہ تھے بلکہ سینا اور شعیر کے ظہوروں کے بعد ایک اور ظہور ہونے والا تھا جو اپنے ساتھ شریعت بھی رکھے گا۔ فاران سے جلوہ گر ہونے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ فاران ان پہاڑیوں کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہیں۔ بائبل سے بھی اس کا ثبوت اس رنگ میں ملتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے بائبل میں لکھا ہے ’’وہ فاران کے بیابان میں رہا‘‘ (پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۱) اور اہل مکہ بھی وہ قوم ہیں جو اپنے آپ کو نسل ابراہیم سے قرار دیتے ہیں۔ پس فاران کی چوٹیوں سے ظاہر ہونے والا وجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کے ذریعہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔

پھر اس پیشگوئی میں یہ ذکر ہے کہ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا۔ یہ پیشگوئی بھی ایسی ہے جو سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پر چسپاں نہیں ہوتی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو صرف بارہ حواری ملے تھے جن میں سے ایک نے تیس روپوں کے بدلے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا (متی باب ۲۶ آیت ۱۵) اور باقی صلیب کے وقت ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ دنیا میں صرف ایک ہی انسان ہے جس کے متعلق تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے لئے آئے تو اس وقت آپ کے لشکر کی تعداد دس ہزار ہی تھی (صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الفتح فی رمضان) اور آپؐ انہی پہاڑیوں سے چڑھ کر آئے تھے جو فاران کی پہاڑیاں ہیں اور جن کے متعلق بائبل میں پیشگوئی پائی جاتی تھی۔ بہرحال اس سے اتنا پتہ لگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو آخری نقطہ قرار نہیں دیا۔ پھر اس پیشگوئی میں صاف لکھا ہے کہ ایک آتشی شریعت اس کے ہاتھ میں ہوگی جس کے معنے یہ ہیں کہ ابھی ایک اور شریعت آنے والی ہے اور جب آخری شریعت ابھی باقی تھی تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بعد کی شریعت پہلی شریعت سے بہتر ہوگی۔ پس

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے آپ کو ارتقائے روحانی کا آخری نقطہ قرار نہیں دیا۔

پیدائش انسانی کے آخری نقطہ کے متعلق حضرت داؤد علیہ السلام کی پیشگوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو انبیاء آئے ان میں ایک اہم نبی حضرت داؤد علیہ السلام ہیں جن کو بہت بڑی عظمت دی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آیا انہوں نے اس مقصد کو پورا کیا۔ اس کا جواب بھی ہمیں نفی میں ملتا ہے کیونکہ وہ خود کہتے ہیں۔

''اس کا منہ شیرینی ہے ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔ اے یروشلم کی بیٹیو! یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے'' (غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۶)

اردو بائبل میں تو ''سراپا عشق انگیز'' کے الفاظ آتے ہیں مگر عبرانی بائبل میں یہاں لفظ ''محمدیم'' لکھا ہوا ہے یعنی محمدؐ۔ کئی مترجموں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کا ترجمہ ''عشق انگیز'' کر دیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص کہے محمدؐ نے یوں کہا تو اس کا ذکر ان الفاظ میں کر دیا جائے کہ ایک صاحب تعریف آدمی نے یوں کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نام پر پردہ ڈالنے اور دوسرے کو دھوکا دینے والی بات ہوگی۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی بائبل کا اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے ''محمدیم'' کا ترجمہ ''عشق انگیز'' کر دیا حالانکہ عبرانی بائبلیں دنیا میں اب تک موجود ہیں اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ وہاں ''محمدیم'' لکھا ہوا ہے یعنی وہ محمدؐ ہے۔ (اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد کے بعد یم کے حروف بھی ہیں جو جمع کے لئے آئے ہیں مگر ساری عبارت سے ظاہر ہے کہ یہاں ایک شخص کا ذکر ہے۔ پس جمع کا صیغہ ادب اور احترام کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے نہ کہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کسی جماعت کی خبر دی جارہی ہے)۔ پھر اس کی علامت حضرت داؤدؑ نے یہ بھی بتائی ہے کہ ''دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے'' (غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۰)۔ یہ وہی علامت ہے جس کا موسیٰؑ کی پیشگوئی میں ذکر آتا ہے اور جو فتح مکہ کے وقت پوری ہوئی۔

غرض حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ تک ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ تمام انبیاء یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ ایک اور نبی ابھی آنے والا ہے جو کامل شریعت اپنے ساتھ لائے گا اور جو تمام نبیوں کا محبوب اور پیارا ہوگا۔

یسعیاہ نبی کے کلام میں آخری نقطہ انسانی کی پیشگوئی حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد جو انبیاء آئے ان میں سے ایک بڑے نبی حضرت یسعیاہ ہیں۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یسعیاہ نبی کو بہت بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یسعیاہ نبی پیدائش انسانی کا آخری نقطہ تھے؟ اور کیا ان کے آنے سے وہ مقصد پورا ہو گیا جو اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں۔

’’اور ایک نام جو بیٹوں اور بیٹیوں کے نام سے بہتر ہے بخشوں گا۔ میں ہر ایک کو ابدی نام دوں گا جو مٹایا نہ جائے گا اور بیگانے کی اولاد جنہوں نے اپنے تئیں خداوند سے پیوستہ کیا ہے کہ اس کی بندگی کریں اور خداوند کے نام کو عزیز رکھیں اور اس کے بندے ہوویں۔ وہ سب جو سبت کو حفظ کر کے اسے ناپاک نہ کریں اور میرے عہد کو لئے رہیں میں ان کو بھی اس مقدس پہاڑ پر لاؤں گا اور اپنی عبادت گاہ میں انہیں شادمان کروں گا‘‘۔ (یسعیاہ باب ۵۶ آیت ۵ تا ۷)

یسعیاہ نبی یہ پیشگوئی کرتے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے الٰہی قوم کو ایک نیا نام دیا جائے گا اور وہ اتنا پیارا ہوگا کہ لوگ اسے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں سے بھی زیادہ پسند کریں گے۔ یہ تو پسند کرلیں گے کہ ان کا بیٹا مرجائے یا ان کی بیٹی مرجائے مگر وہ اس نام کو چھوڑنا پسند نہیں کریں گے۔ یہ اسلام کا نام ہے جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا اور جس کے متعلق یسعیاہ نبی یہ خبر دے رہے ہیں کہ وہ نام اتنا پیارا ہوگا کہ لوگ اپنے بیٹوں اور اپنی بیٹیوں کو چھوڑنا اور ان کا اپنی آنکھوں کے سامنے مارا جانا گوارا کرلیں گے مگر یہ برداشت نہیں کریں گے کہ اسلام چھوٹ جائے اور یہ پیارا نام ان کے ساتھ نہ رہے۔

پھر یہ کہ وہ مذہب ایسا ہوگا جس میں غیر قومیں بھی شامل ہوں گی اور ’’اپنے تئیں خداوند سے پیوستہ‘‘ کریں گی۔ یہ وہی بات ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی بتائی گئی تھی کہ زمین کی ساری قومیں تیری نسل سے برکت پائیں گی۔ یسعیاہ نبی بھی یہی کہتے ہیں کہ غیر قومیں اس مذہب میں داخل ہوں گی اور خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق پیدا کر کے اس کا قرب حاصل کریں گی۔

پھر فرمایا کہ وہ لوگ سبت کی بے حرمتی نہ کریں گے۔ اسی طرح فرمایا ’’میں ان کو بھی اس مقدس پہاڑ پر لاؤں گا اور اپنی عبادت گاہ میں انہیں شادمان کروں گا‘‘۔ یعنی وہ لوگ اس ملک پر آ کر قابض ہوجائیں گے۔

یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی پر اگر غور کیا جائے تو اس میں پانچ باتیں نظر آتی ہیں۔

اوّل۔ ان کو ایک نیا نام ملے گا۔

دوم۔ وہ نام ابدی ہوگا جو کبھی مٹایا نہیں جائے گا۔

سوم۔ غیر اقوام کے لوگ بھی ان کے مذہب میں شامل ہوں گے۔

چہارم۔ وہ سبت کی حفاظت کریں گے۔

پنجم۔ ان کو بھی بنی اسرائیل کے علاقہ میں لا کر قابض کر دیا جائے گا۔

یہ پانچ چیزیں جس مذہب میں پائی جائیں گی وہی اس پیشگوئی کا مصداق قرار دیا جاسکے گا۔ یسعیاہ کے بعد بنی اسرائیل میں سب سے بڑے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام گزرے ہیں مگر سوائے فلسطین پر قابض ہونے کے اور کوئی بات بھی ان کے ذریعہ پوری نہیں ہوئی۔ مثلاً یسعیاہ نبی کو یہ بتایا گیا تھا کہ میں ان کو ایک نیا نام بخشوں گا جو بیٹوں اور بیٹیوں کے نام سے بہتر ہوگا۔ یہ نام صرف مسلمانوں کو ملا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا (الحج:۷۹) کہ پرانے زمانہ سے تمہارا نام مسلم رکھا گیا ہے لیکن عیسائیوں کا کوئی نام ہی نہیں وہ کبھی نصاریٰ کہلاتے ہیں، کبھی مسیحی اور کبھی عیسائی یعنی عیسیٰ کی طرف نسبت پانے والے۔ انگریز اپنے آپ کو کرسچنز کہتے ہیں مگر یہ بھی کوئی نام نہیں بلکہ اس کے معنے صرف مسیحؑ کی طرف منسوب ہونے والوں کے ہیں۔ غرض عیسائیوں کا کوئی نام ہی نہیں۔ پہلے زمانہ میں وہ کچھ کہلاتے تھے پھر کچھ اور کہلانے لگ گئے اور اسی طرح ان کے نام میں تبدیلی ہوتی چلی گئی۔ وہ قوم جس کا ایک نام رکھا گیا ہے اور جس کا نام کسی انسان نے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے وہ صرف مسلمان ہیں اور اسی نام کے متعلق یسعیاہ نبی نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ

''ایک نام جو بیٹوں اور بیٹیوں کے نام سے بہتر ہے بخشوں گا''۔

اگر عیسائی اپنے آپ کو اس پیشگوئی کا مصداق قرار دیتے ہیں تو کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا عیسائی نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ اگر وہ ایسا دعویٰ کریں تو یہ بالکل بے بنیاد ہوگا کیونکہ بائبل سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام عیسائی رکھا ہے۔

پھر یہ خبر دی گئی تھی کہ ان کو ابدی نام دیا جائے گا جو کبھی مٹایا نہیں جائے گا۔ یعنی زمانہ کے تغیرات اور ملکوں اور علاقوں کے اختلاف کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا جو نام رکھا جائے گا وہ ہمیشہ قائم رہے گا اس میں کبھی کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئے گی۔ پیشگوئی کا یہ حصہ بھی ایسا ہے جو عیسائیوں پر چسپاں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اوّل تو ان کا کوئی نام ہی نہیں اور پھر جو کچھ وہ اپنے آپ کو کہتے ہیں اس میں بھی تبدیلی ہوتی چلی آئی ہے۔

تیسری خبر یہ دی گئی تھی کہ بیگانے کی اولاد اس مذہب میں داخل ہوگی۔ لیکن حضرت مسیحؑ اپنے حواریوں سے کہتے ہیں کہ تمہیں غیر قوموں کو تبلیغ کرنے اور انہیں اپنے مذہب میں داخل کرنے کی اجازت ہی نہیں۔

چوتھی خبر یہ دی گئی تھی کہ وہ سبت کی حفاظت کریں گے لیکن عیسائی وہ ہیں جنہوں نے سبت کی حفاظت کرنے کی بجائے روم کے بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے ہفتہ کو اتوار سے بدل دیا اور اس طرح سبت کی بے حرمتی کا ارتکاب کیا۔ یہ چار شرطیں جس قوم میں پائی جائیں گی اسی کا فلسطین پر قبضہ اس بات کی علامت سمجھا جاسکتا ہے کہ یسعیاہ کی

پیشگوئی اس کے ذریعہ پوری ہوئی ورنہ محض فلسطین پر قبضہ کوئی چیز نہیں اس پر قبضہ تو رومیوں نے بھی کر لیا تھا۔

(Encyclopedia of Religion and Ethics under the word (Sunday) in the Primitive Church)

یہ چار شرطیں اگر کسی قوم میں پائی جاتی ہیں تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ چنانچہ

اوّل۔ مسلمانوں کا خود اللہ تعالیٰ نے نام رکھا وہ فرماتا ہے هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا (الحج:۷۹) تمہارا مسلم نام اللہ تعالیٰ نے آپ رکھا ہے۔

دوم۔ یہ نام ایسا ہے جو ابدی ہے کوئی شخص اس کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایک مسلمان ہر وقت مسلمان ہی کہلائے گا۔ خواہ وہ دنیا کے کسی خطہ میں رہتا ہو۔

سوم۔ بیگانے کی اولاد یعنی غیر اقوام کا داخلہ صرف اسلام میں جائز ہے اور یہی وہ مذہب ہے جس نے اپنی دعوت کو کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں کیا بلکہ دنیا کی ہر قوم تک خدائے واحد کا پیغام پہنچایا ہے۔

چہارم۔ سبت کے محافظ بھی مسلمان ہی ہیں کیونکہ انہوں نے جمعہ کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور کبھی اس کو بدلنے کا خیال تک بھی ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔

پنجم۔ فلسطین پر بھی مسلمان قابض ہوئے یہاں تک کہ تیرہ سو سال ان کے قبضہ پر گذر گئے اور اب تک وہ فلسطین پر قابض ہیں۔ بہر حال یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی نے بتادیا کہ دنیا کے روحانی ارتقاء کا آخری نقطہ یسعیاہ نہیں تھے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کی پیدائش کا مقصود ان کے ذریعہ پورا ہوا کیونکہ وہ خود اپنے بعد ایک اور عظیم الشان نبی کی بعثت کی خبر دے چکے ہیں۔

پھر حضرت مسیحؑ آئے۔ کیا پیدائش انسانی کا وہ مقصود تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ کیونکہ

اوّل۔ مسیحی مذہب نسل ابراہیمؑ سے نہ تھا بلکہ عیسائی تو الگ رہے خود مسیحؑ ہی نسل ابراہیمؑ سے نہ تھے کیونکہ وہ عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے تھے تو ابراہیمؑ کی نسل میں سے کس طرح ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت ابراہیمؑ سے یہ کہا تھا کہ ”تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پاویں گی“ پس اگر کسی شخص کے ذریعہ یہ پیش گوئی پوری ہوسکتی ہے تو وہ وہی ہوسکتا ہے جو ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہو نہ وہ جو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہتا ہو۔ اگر عیسائی کہہ دیں کہ حضرت مسیحؑ سے زمین کی ساری قوموں نے برکت حاصل کر لی ہے تب بھی ہم کہیں گے کہ یہ پیشگوئی ابھی پوری ہونی باقی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں خبر یہ دی ہے کہ

پیدائش انسانی کا آخری نقطہ ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہوگا اور اس کا نشان یہ ہوگا کہ وہ ایک عالمگیر مذہب کا بانی ہوگا اور دنیا کی ساری قوموں کو دعوت حقہ دے گا۔ پس مسیحؑ نے اگر ساری قوموں کو دعوت دے بھی دی ہے تب بھی ابراہیمی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی کیونکہ ابراہیمی پیشگوئی کا تعلق اس شخص سے ہے جو ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہو۔ لیکن اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ گو حضرت مسیحؑ کا کوئی باپ نہیں تھا مگر تھے وہ ابراہیمؑ ہی کی نسل سے۔ تب بھی ہم کہتے ہیں کہ یہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ مسیحی مذہب عالمگیر نہیں۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ خود اپنی نسبت فرماتے ہیں۔

''ابن آدم آیا ہے کہ کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈ کے بچائے''۔ (متی باب ۱۸ آیت ۱۱)

یعنی مسیحؑ کی آمد کی غرض صرف اتنی تھی کہ بنی اسرائیل جو بخت نصر کے زمانہ میں منتشر ہو کر افغانستان اور کشمیر وغیرہ علاقوں میں پھیل گئے تھے ان کو اکٹھا کریں۔ پس ان کا پیغام کسی اور کے لئے نہیں تھا صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے تھا۔ دوسرے تورات خود مسیحیوں کے نزدیک یہود کے لئے ہے اور عیسائی اس بات پر متفق ہیں کہ تورات غیر قوموں کے لئے نہیں تھی صرف یہود کے لئے تھی۔ دوسری طرف انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے نزدیک تورات منسوخ نہیں تھی چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

''یہ خیال مت کرو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتاب کو منسوخ کرنے کو آیا۔ میں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو''۔

(متی باب ۵ آیت ۱۷، ۱۸)

اس جگہ حضرت مسیحؑ صاف طور پر فرماتے ہیں کہ میں تورات کو منسوخ کرنے کے لئے نہیں آیا۔ جب وہ منسوخ کرنے کے لیے نہیں آئے تو معلوم ہوا کہ زمانہ مسیحؑ میں تورات قائم رہی تھی اور جب وہ قائم رہی جیسا کہ عیسائی بھی مانتے ہیں تو چونکہ تورات ساری دنیا کے لئے نہیں تھی بلکہ صرف یہود کے لیے تھی اس لیے معلوم ہوا کہ حضرت مسیحؑ پیدائش انسانی کا آخری نقطہ نہیں تھے۔

پھر حضرت مسیحؑ نے جب اپنے بارہ حواریوں کو تبلیغ کے لیے بھیجا تو انہیں یہ ہدایت دی کہ

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو اور کہو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آ گئی''۔ (متی باب ۱۰ آیت ۶، ۷)

ان الفاظ میں حضرت مسیحؑ نے نہ صرف غیر قوموں کو تبلیغ کرنے کی ممانعت کی ہے بلکہ یہ بھی فرمایا ہے کہ سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ سامری وہ لوگ تھے جو بنی اسرائیل سے مخلوط تھے اور آدھے بنی اسرائیل کہلاتے تھے مگر حضرت مسیحؑ ان کو بھی تبلیغ کرنا جائز نہیں سمجھتے کجا یہ کہ غیر قوموں کو اپنے مذہب میں داخل کرنا آپ جائز سمجھتے۔ پس وہ پیشگوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی مسیحی مذہب کے ذریعہ بھی پوری نہیں ہوئی۔ وہاں یہ خبر تھی کہ ابراہیمی نسل سے ساری قومیں برکت پائیں گی اور مسیحی مذہب کے بانی نے اپنے بارہ حواریوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ غیر قوموں کو تبلیغ نہ کریں اور صرف یہود کو تبلیغ کریں۔ پس مسیحی مذہب کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سب قوموں کو برکت دینے کے لئے آیا تھا۔

مذکورہ بالا حوالہ میں ''پہلے'' کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ بعض عیسائی کہہ دیا کرتے ہیں کہ پہلے بنی اسرائیل کو تبلیغ کرنے کا حکم تھا۔ یہ حکم نہیں تھا کہ بنی اسرائیل کے علاوہ اور کسی قوم کو تبلیغ ہی نہ کی جائے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اوّل تو یہ واضح ہے کہ جب تک سب بنی اسرائیل ایمان نہ لائیں دوسروں کو تبلیغ کرنا منع ہے اور چونکہ یہودی ابھی تک موجود ہیں اس لئے عیسائیوں کو غیر قوموں میں تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہوسکتی۔ دوسرے خود حضرت مسیحؑ نے اپنے اس حکم کی تشریح کر دی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم بنی اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے جب تک کہ ابن آدم نہ آئے''۔ (متی باب ۱۰ آیت ۲۳)

ان الفاظ میں حضرت مسیحؑ کی طرف سے یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک میں دوبارہ واپس نہ آ جاؤں تم بنی اسرائیل کی تبلیغ کو ختم نہیں کر سکو گے۔ گویا مسیح کے دوبارہ آنے تک ان کی قوم کے لئے صرف بنی اسرائیل میں تبلیغ مقدر ہے کسی اور قوم کو تبلیغ کرنا ان کے لئے جائز نہیں۔ ہاں بعثت ثانیہ میں سب دنیا کو تبلیغ ہوگی۔ پس اس جگہ ''پہلے'' کے وہی معنے لئے جائیں گے جو حضرت مسیحؑ کے دوسرے کلام سے ثابت ہیں اور وہ معنے یہی ہیں کہ مسیحؑ کی بعثت ثانیہ سے پہلے عیسائیوں کو یہود کے علاوہ اور کسی کو تبلیغ کی اجازت نہیں۔ حضرت مسیحؑ صاف طور پر فرماتے ہیں کہ جب تک میں دوبارہ نہ آ جاؤں تم یہود کی تبلیغ سے فارغ نہیں ہوسکو گے جس کے معنے یہ ہیں کہ میرے دوبارہ آنے تک تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اپنی تبلیغ صرف یہود تک محدود رکھو۔ جب میں دوبارہ آ جاؤں گا تو پھر تمہیں اس بات کی اجازت ہوگی کہ تم ساری دنیا کو تبلیغ کرو۔ پھر مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی پاس نہیں بھیجا گیا''۔

(متی باب ۱۵ آیت ۲۴)

اس میں اور زیادہ وضاحت سے انہوں نے قوموں کی نسبت سے اپنے حلقہ کی تعیین کر دی اور بتا دیا کہ میرا تعلق بنی اسرائیل کے علاوہ اور کسی قوم سے نہیں۔

جب حضرت مسیحؑ کی بعثت صرف اسرائیلی قبائل کے لئے مخصوص تھی تو وہ حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئی کے مصداق ثابت نہ ہوئے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ کہا گیا تھا کہ تیری نسل کے ذریعہ زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی اور حضرت مسیحؑ کہتے ہیں کہ میں ساری دنیا کو برکت دینے کے لئے نہیں۔ بلکہ صرف بنی اسرائیل کو برکت دینے کے لئے آیا ہوں۔

دوم۔ وہ شریعت نہیں لائے۔ حالانکہ تمام پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا شریعت لائے گا۔ پس چونکہ وہ شریعت نہیں لائے اس لئے انہیں دنیا کا مقصود قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سوم۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ’’وہ نبی‘‘ ان کی پہلی بعثت کے بعد اور دوسری بعثت سے پہلے آئے گا۔ چنانچہ لکھا ہے۔

> ’’ضرور ہے کہ آسمان اسے لئے رہے (یعنی مسیح کو) اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں سے تمہارے لئے ایک نبی میری مانند اٹھاوے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اس نبی کی نہ سنے وہ قوم میں سے نیست کیا جائے گا۔ بلکہ سب نبیوں نے سموئیل سے لے کر پچھلوں تک جتنوں نے کلام کیا ان دنوں کی خبر دی ہے‘‘۔
>
> (اعمال باب ۳ آیت ۲۱ تا ۲۴)

ان الفاظ میں حواری حضرت مسیحؑ سے خبر پا کر بتاتے ہیں کہ مسیح کے دوبارہ آنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ نبی آ جائے جس کی تمام انبیاء خبر دیتے چلے آئے ہیں۔ وہ صاف الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ پیشگوئیوں میں ایک شریعت لانے والے نبی کے متعلق جو خبر دی گئی تھی مسیحؑ کی دوبارہ بعثت اس کے بعد ہوگی جس کے معنے یہ ہیں کہ مسیحؑ اس پیشگوئی کا مصداق نہیں بلکہ آنے والا نبی جو اپنے ساتھ شریعت رکھتا ہوگا جو مسیحؑ کی بعثت اوّل اور بعثت ثانیہ کے درمیان آئے گا وہ اس کا مصداق ہوگا۔ اس موقعہ پر عیسائی کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدائش عالم کا نقطہ مرکزی قرار دینا غلط ہے۔ نقطہ مرکزی بہرحال مسیحؑ ہے جس نے صاحب شریعت نبی کے بعد آنا ہے۔ مگر یہ سوال بھی حل ہو چکا ہے کیونکہ مسیح ثانی جس نے مبعوث ہونا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہو چکا ہے

اوراس نے صاف اور کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے آپؐ سے ہی حاصل کیا ہے۔ پس یہ سوال جاتا رہا کہ نقطہ مرکزی ابھی باقی ہے۔ کیونکہ جسے سب سے آخر میں نقطہ مرکزی قرار دیا جاسکتا تھا اس نے خود آکر کہہ دیا ہے کہ میں نقطہ مرکزی نہیں بلکہ نقطہ مرکزی وہ ہے جو مجھ سے پہلے آچکا ہے۔ بہرحال اعمال باب ۳ کی تصریحات سے جو حضرت مسیحؑ کی پیشگوئیوں پر مبنی ہیں یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ مقصود جہاں حضرت مسیحؑ کی بعثت اوّل کے بعد اور بعثت ثانیہ سے پہلے آنا تھا اور وہ ہمارے پیارے سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تھا اسے یاد کرتے ہوئے کھڑا ہو اور تبلیغ کر کہ تو اس غرض کو پورا کرنے والا ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ تو پڑھ یعنی دنیا کے سامنے میرا نام لے کر اعلان کر کہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ بات کہتا ہوں مگر ساتھ ہی کہہ کہ اس رب سے مسیحیوں کا رب مراد نہیں جو بیٹے کا محتاج ہے، یہودیوں کا رب مراد نہیں جو ایک قوم سے وابستہ ہے، مشرکوں کا رب مراد نہیں جو کسی چیز کو پیدا کرنے سے قاصر ہے بلکہ الَّذِيْ خَلَقَ تو اس خدا کا نام لے کر اعلان کر جس نے مخلوق کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا مگر ابھی تک وہ مقصد پورا نہیں ہوا تھا اب تیرے ذریعہ وہ مقصد پورا ہوا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۳﴾

(اور جس نے) انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔

حلّ لُغات۔ عَلَقٌ عَلَقٌ کے معنے خون کے ہوتے ہیں خصوصاً اس خون کے جو گاڑھا اور جما ہوا ہو۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو لٹکی ہوئی ہو اسے بھی عَلَقٌ کہتے ہیں اور عَلَقٌ اس مٹی کو بھی کہتے ہیں جو بعض دفعہ کام کرنے کے بعد ہاتھ کے ساتھ لگی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح عَلَقٌ دشمنی اور محبت کو بھی کہتے ہیں (اقرب)۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی دل میں جم جاتی ہیں۔ نفرت پیدا ہو جائے تو وہ بھی دیر تک رہتی ہے اور محبت پیدا ہو جائے تو وہ بھی عرصہ تک قائم رہتی ہے۔ عَلَقٌ عَلَقَةٌ کی جمع بھی ہو سکتا ہے اور عَلَقَةٌ کے معنے ہیں اَلْقِطْعَةُ مِنَ الْعَلَقِ لِلدَّمِ۔ خون کا لوتھڑا (اقرب)۔ اگر عَلَقٌ کو جمع قرار دیا جائے تو اس کے جمع لانے میں یہ حکمت ہوگی کہ اَلْاِنْسَانُ سے مراد بھی جنس انسانی ہے کوئی ایک فرد مراد نہیں۔ یعنی خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے یہ معنے نہیں کہ ہم نے ایک انسان کو عَلَقَةٌ سے پیدا کیا ہے بلکہ

اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے ہر انسان کو ایک ایک علقہ سے پیدا کیا ہے۔

تفسیر - یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ خُلِقَ مِنْ فُلَانٍ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ امر فلاں شخص کی طبیعت میں داخل ہے (تفسیر البغوی المسمی معالم التنزیل بغوی سورۃ الانبیاء زیر آیت خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ)۔ قرآن کریم نے بعض اور مقامات پر اس محاورہ کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر فرماتا ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (الروم: ۵۵) اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا ہے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ ضعف کوئی مادہ ہے جس سے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت میں ضعف پایا جاتا ہے۔ یا مثلاً آتا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: ۳۸) انسان عجلت سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ جلد بازی کوئی مادہ ہے جس سے انسان کو بنایا گیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں جلد بازی کا مادہ بھی ہے۔ اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے علق سے پیدا کیا ہے یعنی انسان کو فطرتاً اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس میں علق پایا جاتا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ سے یہ مراد کہ انسان کے اندر جذبات محبت رکھے گئے ہیں عَلَقٌ کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے محبت کے بھی ہوتے ہیں اور دشمنی اور عداوت کے بھی ہوتے ہیں۔ پس خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے معنے یہ ہوئے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جذبات کا ایک طوفان پیدا کیا ہے اس کے اندر محبت بھی پیدا کی ہے اور اس کے اندر نفرت بھی پیدا کی ہے۔ انہی دو فطری مادوں کو پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم انسانی فطرت کو دیکھو تو تم پر یہ حقیقت روشن ہوگی کہ ہم نے جذباتِ محبت اور جذباتِ نفرت دونوں اس میں پیدا کئے ہیں اور جب ہم نے اس میں جذبات محبت بھی پیدا کئے ہیں اور جذبات نفرت بھی تو ضروری تھا کہ یہ جذبات ایک دن اپنی تکمیل کو پہنچتے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ انسان جذبات کے ادھورے ظہور پر قانع نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے اندر جو جذبات بھی پائے جاتے ہیں ان کا مکمل ظہور ہو۔ وہ فطرت کی پیاس بجھانے اور اپنے جذبات کی سیری کے لئے ایک تکمیل کی احتیاج محسوس کرتا ہے اور اس بات کے لئے بے تاب رہتا ہے کہ اس کا ہر فطری جذبہ اپنی کامل صورت میں رونما ہو اور صانع فطرت نے جس غرض کے لئے انسان کو مختلف جذبات میں ڈھالا ہے وہ غرض اسے حاصل ہو۔ انسان کی اس طبعی اور فطری خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے غور کرو جب اللہ تعالیٰ نے پیدائش انسانی کے ساتھ ہی اس کی فطرت میں جذبۂ محبت بھی رکھ دیا تھا اور جذبۂ نفرت بھی تو جب تک ان دونوں جذبات کی تکمیل نہ ہو جاتی، جب تک ایسا انسان دنیا میں پیدا نہ ہوتا جو اللہ تعالیٰ سے اتنی محبت کرتا کہ اس سے بڑھ کر اور کسی سے محبت نہ

کرتا اور شیطان سے اتنی نفرت کرتا کہ اس سے بڑھ کر اور کسی سے نفرت نہ کرتا اس وقت تک یہ کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ انسان اپنے ارتقاء کو پہنچ گیا ہے۔ تم اگر یہ کہتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی دنیا اپنے ارتقائی نقطہ کو حاصل کر چکی تھی تو یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ابھی تک نہ تعلیم ایسی آئی تھی جو خدا تعالیٰ سے کامل محبت اور شیطان سے کامل نفرت کا سبق دیتی اور نہ کوئی انسان ایسا مبعوث ہوا تھا جس نے ان جذبات کو اپنے کمال تک پہنچا دیا ہو اور جس نے خدا تعالیٰ سے ایسی محبت کی ہو جو اپنی ذات میں بے مثال ہو اور شیطان سے ایسی نفرت کی ہو جو اپنی ذات میں بے مثال ہو۔ اس لئے تم نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کا مقصود پورا ہو چکا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس خدا نے انسان کو ان دو طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے، جس نے کامل درجہ کی محبت اور کامل درجہ کی نفرت کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کیا ہے اے محمد رسول اللہ اس کا نام لے کر پڑھ یعنی دنیا میں اعلان کر کہ آج میرے ذریعہ خدا تعالیٰ سے کامل محبت اور شیطان سے کامل نفرت کا ظہور ہونے والا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے دوسرے معنے کہ انسان نے تدریجاً ترقی کی دوسرے معنے اس کے یہ ہو سکتے ہیں کہ انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا گیا ہے یعنی ادنیٰ حالت سے ترقی دے کر بڑھایا گیا ہے۔ جس طرح انسانی فرد کو ہم نے اس رنگ میں بنایا ہے کہ وہ ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے کمال تک پہنچتا ہے اسی طرح ہم نے تمام مخلوق کو بنایا ہے اور وہ اپنے کمال کے ظہور کے لئے ایک تدریج کی محتاج ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو اگر کسی عورت کے پیٹ میں بچہ ہو اور اس کا پانچویں یا چھٹے مہینے اسقاط ہو جائے تو تم ایسی عورت کو بچہ والی عورت نہیں کہتے۔ بچے والی عورت تم اسی کو کہو گے جس کا بچہ پورے دنوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی طرح اگر مخلوق تدریجی رنگ میں ترقی کرتے کرتے اپنے ارتقاء کے آخری نقطہ تک نہ پہنچتی تو یہ ایسا ہی ہوتا جیسے کسی بچے کا پانچویں یا چھٹے ماہ اسقاط ہو جاتا ہے۔ اگر موسیٰؑ پر دنیا ختم ہو جاتی تو کہا جاتا کہ وہ مخلوق جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنی چاہی تھی اس کا اسقاط ہو گیا۔ اگر عیسیٰؑ پر دنیا ختم ہو جاتی تو کہا جاتا کہ وہ مخلوق جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنی چاہی تھی اس کا اسقاط ہو گیا۔ اگر پیدائش عالم کے نتیجہ میں ایک کامل وجود پیدا نہ ہوتا اور اس سے پہلے ہی یہ سب دنیا فنا ہو جاتی تو کہا جاتا کہ وہ مخلوق جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنی چاہی تھی اس کا اسقاط ہو گیا۔ جیسے حمل کے پانچویں یا چھٹے مہینہ میں بعض دفعہ بچہ گر جاتا ہے اور عورت کو کوئی شخص صاحبِ اولاد نہیں کہتا۔ یہی حال دنیا کا ہوتا اگر نویں مہینہ کا کامل وجود اس دنیا میں پیدا نہ ہوتا تو بنی نوع انسان کی پیدائش بالکل اکارت چلی جاتی۔ دنیا بانجھ تو کہلا سکتی تھی مگر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ جس مقصد کے لئے اس دنیا کو پیدا کیا گیا تھا وہ حاصل ہو گیا ہے۔ بے شک اس سے پہلے عیسیٰؑ بھی آئے اور موسیٰؑ بھی آئے اور

ابراہیمؑ بھی آئے اور نوحؑ بھی آئے مگر موسیٰ اور عیسیٰ اور ابراہیم اور نوح کی مثال پانچویں یا چھٹے ماہ کے بچہ کی سی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال اس نویں ماہ کے بچہ کی سی ہے جو تندرستی کی حالت میں پیدا ہوا۔ تم پانچویں ماہ کے بچہ کو بچہ نہیں کہتے کیونکہ وہ کامل نہیں ہوتا۔ تم چھٹے ماہ کے بچہ کو بچہ نہیں کہتے کیونکہ وہ کامل نہیں ہوتا تم صرف نویں ماہ کے بچہ کو بچہ کہتے ہو کیونکہ وہ کامل ہوتا ہے۔ اسی طرح موسیٰ اور عیسیٰ کے ساتھ تمہاری تکمیل نہیں ہوسکتی۔ تمہاری تکمیل وابستہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے۔ ان کے بغیر دنیا اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر سکتی۔

غرض یہاں دونوں معنے ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ سے مراد خون کا لوتھڑا ہے اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ انسان کو ادنیٰ حالت سے ترقی دی ہے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے محبت اور نفرت کے جذبات دے کر پیدا کیا ہے۔ جب تک محبت اور نفرت کے جذبات اس میں کامل طور پر ظاہر نہ ہوجائیں اس وقت تک پیدائش انسانی کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ پس ایسی شریعت کا آنا ضروری تھا جو ایک طرف خدا تعالیٰ سے کامل محبت کی تعلیم دیتی اور دوسری طرف شیطان سے کامل نفرت کی تعلیم دیتی یا ایسا انسان ظاہر ہوتا جو ایک طرف اللہ تعالیٰ سے کامل اتصال رکھتا اور دوسری طرف شیطان سے کامل بُعد اس کی طبیعت میں پایا جاتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ دونوں دعوے قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (النجم:۹،۱۰) یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق اس قدر بڑھا کہ آپ خدا تعالیٰ کی طرف تیزی سے بڑھے اور خدا تعالیٰ آپ کی طرف تیزی سے بڑھا۔ یہ اس کامل اتصال کا ثبوت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ سے تھا۔ دوسری طرف آپ کو شیطان سے اس قدر بُعد تھا کہ آپ فرماتے ہیں وَلٰكِنَّهُ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ (صحيح مسلم كتاب صفات المنافقين و احكامهم باب تحريش الشيطان) کہ میرے شیطان کو مسلمان بنادیا گیا ہے یعنی اگر شیطان بھی میرے پاس آئے تو وہ مسلمان ہوجاتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ مجھے کوئی بری تحریک کرے میرا رنگ اس پر چڑھ جاتا ہے اور مجھے برائی میں ملوث کرنے کی بجائے خود نیکی سے حصہ لینے لگ جاتا ہے۔ یہ اس انتہاء درجہ کی محبت کا ثبوت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ تعالیٰ کے متعلق پائی جاتی تھی کہ آپ کے پاس جو جو چیز آتی وہ اپنی خاصیت کو بدل کر اسی رنگ میں رنگین ہوجاتی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا تھا۔ جیسے کہتے ہیں

ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خدا تعالیٰ کی اتنی شدید محبت تھی اور شیطان کی اتنی شدید نفرت آپ کے قلب میں پائی جاتی تھی کہ آپ فرماتے ہیں کہ اگر شیطان بھی میرے پاس آئے تو مجھ پر شیطان کا رنگ نہیں چڑھے گا بلکہ میرا رنگ اس پر چڑھ جائے گا۔ یہ کمال درجہ کی نفرت ہے کہ شیطان کا آپ سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو شیطان آپ پر غالب نہیں آسکتا بلکہ آپ شیطان پر غالب آجاتے ہیں اور نہ صرف اس رنگ میں غالب آتے ہیں کہ اس کے برے اثر کو قبول نہیں کرتے بلکہ خود اس پر اپنا رنگ چڑھا کر اسے مسلمان بنا دیتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ پر غور کر کے دیکھ لو صرف ایک ہی وجود ایسا نظر آئے گا جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں خدا تعالیٰ سے ایسا کامل تعلق رکھتا ہوں کہ مجھ میں اور اس میں کوئی دوئی نہیں رہی اور شیطان سے مجھے اتنی کامل نفرت ہے کہ وہ کسی رنگ میں بھی مجھ پر غالب نہیں آسکتا۔ اگر وہ میرے پاس آئے تو میں ہی اس پر غالب آؤں گا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ مجھے مغلوب کر لے یا مجھے برائیوں میں ملوث کر سکے۔ پس تعلق کا کمال دنیا میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے اور تعلق پیدا کرنے والی تعلیم کا کمال قرآن کریم نے پیش کیا ہے کہ اس کے لفظ لفظ اور حرف حرف سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کا عشق پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہا ہے۔ دشمن سے دشمن عیسائیوں کی کتابیں جب ہم پڑھتے ہیں تو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی محبت پر جتنا زور قرآن کریم نے دیا ہے اتنا زور دنیا کی اور کسی کتاب میں نظر نہیں آتا۔ کوئی صفحہ اُٹھا کر دیکھ لو اس میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کا ذکر آئے گا اور بات بات میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ کیا جائے گا اور یہ کیفیت کسی ایک سورۃ یا ایک پارہ سے مخصوص نہیں۔ بِسْمِ اللّٰہِ سے لے کر وَالنَّاسِ تک قرآن کریم پڑھ جاؤ اس کا کوئی صفحہ ایسا نظر نہیں آئے گا جس میں بار بار اللہ تعالیٰ کا نام نہ آتا ہو اور بار بار اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور نہ دیا گیا ہو۔ باقی کتابوں کی یہ حالت ہے کہ ان میں کہیں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں شخص پہاڑ پر گیا اور لوگوں نے اسے بھونی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اور شہد کا چھتہ کھانے کو دیا (لوقا باب ۲۴ آیت ۴۱، ۴۲)۔ کہیں لکھا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں پر جن بھوت سوار تھے وہ حضرت مسیحؑ کے پاس آئے انہوں نے ان جنات کو نکال کر سؤروں کے غول میں ڈال دیا اور وہ سؤر سب کے سب پانی میں ڈوب کر مر گئے (متی باب ۸ آیت ۲۸ تا ۳۳)۔ غرض ایسی ایسی باتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے مگر قرآن کریم کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کے نام سے خالی ہو۔ تورات کے صفحوں کے صفحے، بقیہ بائبل کے صفحوں کے صفحے اور انجیل کے صفحوں کے صفحے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی ہیں۔ لیکن قرآن وہ کتاب ہے جس کا کوئی ایک صفحہ بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی نہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ الگ مضمون بھی ہوسکتا ہے اور پہلے خَلَقَ یعنی

الَّذِیْ خَلَقَ کا یہ بدل بھی ہوسکتا ہے۔ اگر اس خَلَقَ کو پہلے خَلَقَ کا بدل سمجھا جائے تو اس صورت میں اس کے وہی معنے ہوں گے جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں یعنی خَلَقَ سے عام پیدائش مراد نہیں بلکہ انسان کی پیدائش مراد ہے۔ لیکن اگر اس کو علیحدہ مضمون قرار دیا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا کہ تو پیدا کرنے والے رب کے نام سے پڑھ خصوصاً اس رب کے نام سے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تمام پیدائش ہی انسان کی پیدائش کے تابع ہے۔ گویا انسانی پیدائش ہی اصل مقصود تھی۔ پھر اس پیدائش میں سے پیدائش محمدی ہی مقصود تھی۔ پس اے محمد رسول اللہ تو اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ مقصد یاد دلا کر کام شروع کر۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ خود ہی اس کام کو شروع کرنے والا ہے اور اس نے پیدائش عالم کے وقت سے ایک مقصد اپنے سامنے رکھا تھا اور وہ مقصد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی تو پھر بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کہنے کا کیا فائدہ تھا۔ کیا خدا تعالیٰ کو اپنا مقصد نعوذ باللہ بھول گیا تھا کہ اس ذریعہ سے اسے یاد دلانا ضروری سمجھا گیا؟ اس کا ایک جواب تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تو رسول ہونے کی حیثیت سے اس کام کو شروع کر ہماری تائید تیرے ساتھ ہوگی اور ہماری نصرت تیرے شامل حال ہوگی۔ پس باوجود اس حقیقت کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہان کا مقصود تھے اور پیدائش عالم کے روحانی ارتقاء کا آخری نقطہ صرف آپ کی ذات تھی پھر بھی ان الفاظ کی زیادتی بلا وجہ نہیں کی گئی بلکہ ان میں بہت بڑی حکمت ہے اور وہ یہ کہ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کہہ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان کیا گیا ہے اور آپ کو کہا گیا ہے کہ تو ہمارے نام کے ساتھ دنیا کو یہ پیغام سنا۔ جو لوگ تجھ پر ایمان لائیں گے انہیں میری رضاء حاصل ہوگی اور جو انکار کریں گے وہ میرے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور جواب بھی ہے اور وہ یہ کہ دعا کے بھی کئی طریق ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی اسی صفت سے دعا مانگنی جو مقصد کے ساتھ متعلق ہو زیادہ بابرکت ہوتی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ دعا کا صحیح طریق یہ ہے کہ جس صفت سے دعا کا تعلق ہو اس کا نام لے کر دعا کی جائے۔ اگر کسی شخص کے ہاں اولاد نہیں ہوتی اور وہ یہ دعا کرے کہ اے خالق مجھے بچہ دے تو یہ دعا کا ایک صحیح طریق ہوگا۔ لیکن اگر وہ یہ دعا کرے کہ اے جبار مجھے بچہ دے یا اے قہار مجھے بچہ دے یا اے ممیت مجھے اولاد عطا کر۔ تو گو ممکن ہے اللہ تعالیٰ پھر بھی اس کے تضرع کو دیکھ کر اسے اولاد عطا کر دے۔ مگر ہر سننے والا شخص یہی کہے گا کہ یہ بڑی رڈی قسم کی دعا ہے۔ وہ دعا تو یہ مانگ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاں اولاد پیدا کرے اور وہ اپنی مدد کے لئے اس صفت کو پکار رہا ہے جس کا تعلق پیدا کرنے سے نہیں بلکہ مارنے کے ساتھ ہے یا قہر اور غضب کے ساتھ

ہے یا مثلاً ایک شخص اگر اس رنگ میں دعا کرتا ہے کہ اے ممیت خدا میرے دشمن نے مجھے سخت تنگ کر رکھا ہے تو میرے دشمن کو ہلاک کر اور مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھ تو یہ بالکل صحیح دعا ہوگی۔لیکن اگر وہ اس طرح دعا کرے کہ اے محی خدا، اے خالق خدا میرے دشمن کو ہلاک کر دے تو یہ کیسی بیوقوفی والی بات ہوگی۔پس اگر اس صفت کو ملحوظ رکھ کر دعا کی جائے جو دعا کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو تو انسان کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔اسی حکمت کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے یہاں بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کا اضافہ کیا اور فرمایا جب تو دعا مانگنے لگے تو اس رنگ میں دعا مانگ کہ اے خدا جس نے پیدائش عالم سے میری بعثت کو اپنی دنیا کا مقصد قرار دیا ہوا ہے میں تجھ سے اسی ارادہ کا واسطہ دے کر التجاء کرتا ہوں کہ تو مجھے کامیاب کر۔اگر تو اس رنگ میں دعا مانگے گا تو تیری دعا بہت جلد قبول ہوگی اور تو قلیل سے قلیل عرصہ میں اپنے مقاصد کو حاصل کر لے گا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جب متعلقہ صفت کو ملحوظ رکھ کر دعا مانگی جائے تو خود انسان کی امید بڑھ جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میرا کام ضرور ہو جائے گا۔مثلاً جب یہ دعا کی جائے کہ اے خدا تو نے کہا تھا کہ میں ساری دنیا کو ایک ہاتھ پر جمع کروں گا اور تو نے اسی مقصد کے لئے ساری دنیا کو پیدا کیا تھا اب میں تجھ کو تیری اسی صفت کا واسطہ دے کر جو تمام پیدائش عالم کا موجب ہوئی التجا اور دعا کرتا ہوں کہ دنیا کو ایک ہاتھ پر جمع کر دے اور اس مقصد کو پورا کر جو پیدائش عالم کا موجب تھا۔تو ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فضل زیادہ زور کے ساتھ نازل ہونا شروع ہو جائے گا اور دوسری طرف خود دعا مانگنے والے کی اپنی امید بڑھ جائے گی اور اس کے سامنے یہ امر رہے گا کہ میری کامیابی میں کوئی شبہ نہیں۔جس کام کے لئے میں کھڑا ہوا ہوں وہ ضرور ہو جائے گا کیونکہ وہ مقصود ہے اللہ تعالیٰ کا۔بلکہ اگر مجھ سے کوئی کمزوری بھی ہوئی تب بھی ہو جائے گا۔پس دوسرا فائدہ دعا کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے سامنے رکھنے کا یہ ہوتا ہے کہ خود انسان کے اندر امید پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میرا کام اب ضرور ہو جائے گا۔

تیسری حکمت اس طریق میں یہ تھی کہ اس سلسلہ پر نظر کر کے جو ایک لمبے عرصہ سے چلا آتا تھا آپ کا ایمان بھی اور جوش عمل بھی ترقی کرتا جائے گا۔جب آپ یہ کہیں گے کہ اے خدا جس نے آدمؑ کو دنیا کی ترقی کے لئے بھیجا پھر اسے اور ترقی دینے کے لئے نوحؑ کو بھیجا پھر اور ترقی دینے کے لئے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھیجا اور پھر اور ترقی دینے کے لئے مجھے بھیجا تو اسلام کو فتح دے تو آپ کے دل میں اسلام کے غلبہ اور اس کی کامیابی کے متعلق جو یقین پیدا ہوگا ظاہر ہے اس طرح ہر وقت آپ کے سامنے یہ امر رکھا گیا کہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو باطل

کر دے اور اس غرض کو پورا نہ کرے جس کی بنیاد اس نے آدم کے وقت سے رکھ دی تھی۔ غرض ایک طرف اس ذریعہ سے آپ کے دل میں یقین کامل پیدا کیا گیا۔ دوسری طرف ایمان اور جوش عمل میں ترقی بخشی گئی اور تیسری طرف خدائی فضل کو خود اس کے مقصد کا واسطہ دے کر جوش دلایا گیا۔ پس بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کا اضافہ بے فائدہ نہیں بلکہ اپنے اندر بہت بڑے فوائد اور حکمتیں رکھتا ہے۔

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۴

(پھر ہم کہتے ہیں کہ) پڑھ درآنحالیکہ تیرا رب (اتنا) بڑا اکریم (ہونا ظاہر کر رہا) ہے۔

حلّ لُغات۔ اَکْرَمُ اَکْرَمُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور کَرِیْمٌ کے معنے سخی کے بھی ہوتے ہیں اور کَرِیْمٌ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس سے زیادہ نفع پہنچے۔ اسی طرح ہر چیز میں سے جو زیادہ اچھی ہو اسے بھی کَرِیْمٌ کہتے ہیں (اقرب)۔ گویا ہر چیز کے آخری نقطہ کو عربی زبان میں کَرِیْمٌ کہا جاتا ہے۔ جب کَرِیْمٌ کے معنے اَحْسَنَ کے ہوئے تو اَکْرَمُ کے معنے ہوئے احسنوں کا احسن۔ پس رَبُّكَ الْاَكْرَمُ کے یہ معنے ہیں کہ تیرا رب وہ ہے جو اچھی سے اچھی چیزوں سے بھی احسن ہے۔

تفسیر۔ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ کے اَکْرَم ہونے کا حق دنیا نے تلف کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اَکْرَم ہے مگر دنیا میں اس کے اَکْرَم ہونے کا حق ادنیٰ معبودوں کو دے دیا گیا ہے۔ کوئی بتوں کو پوجتا ہے۔ کوئی عیسیٰ کی پرستش کرتا ہے اور کوئی کسی اور کے آگے اپنے سر کو جھکا رہا ہے۔ تو اٹھ اور خدا تعالیٰ کا حق اسے واپس دلا۔ دنیا نے اللہ تعالیٰ کی شان کو نہیں پہچانا۔ اس نے خدائی کا حق کچھ بتوں کو دے دیا ہے اور کچھ انسانوں کو۔ اب تیرا کام یہ ہے کہ تو دنیا پر خدا تعالیٰ کے اَکْرَم ہونے کی شان کو ظاہر کرتا آستانہ الوہیئت سے بھولی بھٹکی مخلوق پھر اس کی طرف واپس آئے اور پھر اس کے اَکْرَم ہونے کی شان دنیا میں تسلیم ہونے لگے۔

دوسرے اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تو اپنے آپ کو کمزور نہ سمجھ جس خدا نے تجھے کھڑا کیا ہے وہ اَکْرَم ہے۔ وہ احسنوں کا بھی احسن ہے تجھے اپنی تعلیم کے متعلق یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس وقت خدا تعالیٰ کے اَکْرَم ہونے کا جلوہ ظاہر ہونے والا ہے۔ بے شک موسیٰؑ کے وقت بھی خدا تعالیٰ کا جلوہ ظاہر ہوا مگر وہ جلوہ اس کے اَکْرَم ہونے کا نہیں تھا۔ اسی طرح داؤدؑ اور سلیمانؑ اور عیسیٰؑ وغیرہ کے زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ کا جلوہ ظاہر ہوا مگر وہ

جلوہ خدا تعالیٰ کے آکْرَم ہونے کا نہیں تھا۔ اب تیرے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے آکْرَم ہونے کا جلوہ ظاہر کرنے والا ہے اور اس کی صفات کا ایسا ظہور ہوگا جس کی مثال دنیا میں اس سے پہلے نہیں مل سکتی۔ اس لئے تیرے لیے مایوسی اور گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۵﴾

جس نے قلم کے ساتھ سکھایا (ہے اور آئندہ بھی سکھائے گا)۔

تفسیر۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ نے قلم سے بندہ کو سکھایا ہے کیونکہ یہ خلاف واقعہ ہے۔ کب قلم لے کر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو الف اور با سکھلائی ہے جب ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تو یہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے قلم سے بندے کو سکھایا۔ اسی طرح اس سے یہ مراد بھی نہیں ہو سکتی کہ بندہ جو کچھ قلم سے سکھاتا ہے وہ سب خدا تعالیٰ کا سکھایا ہوا ہوتا ہے کیونکہ بندے دوسروں کو جھوٹ بھی سکھاتے ہیں۔ دغا اور فریب بھی سکھاتے ہیں۔ اخلاق اور روحانیت سے گری ہوئی باتیں بھی سکھاتے ہیں۔ گندے اور ناپاک اشعار بھی سکھاتے ہیں الف لیلیٰ کے قصے بھی سکھاتے ہیں۔ ہزاروں افراد دنیا میں ایسے پائے جاتے ہیں جو لغویات لکھتے اور لغویات شائع کرتے رہتے ہیں۔ پھر قلم سے کام لینے والے وہ لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کے منکر ہیں۔ وہ لوگ بھی موجود ہیں جو اخلاق کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے۔ وہ لوگ بھی موجود ہیں جو مذہب کے خلاف ہیں۔ غرض ہر سچی تعلیم کا منکر دنیا میں موجود ہے۔ اس لئے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ بندہ جو کچھ قلم سے سکھاتا ہے وہ سب خدا تعالیٰ کا سکھایا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اس میں ہزاروں افتراء ہوتے ہیں۔

ماضی کے صیغہ کا استعمال قطعی معنوں میں عَلَّمَ بِالْقَلَمِ میں گو ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مگر مراد مستقبل ہے۔ یہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ کبھی ماضی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور مراد استقبال ہوتا ہے قرآن کریم میں یہ محاورہ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح الہامات میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ درحقیقت ماضی کو استقبال کے معنوں میں اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ ماضی سب سے زیادہ قطعی اور یقینی ہوتی ہے۔ جب انسان کوئی کام کر رہا ہو تو ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس کام کو پوری طرح کر بھی سکے گا یا نہیں۔ مثلاً زید پڑھ رہا ہو تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اسی طرح پڑھتا چلا جائے گا یا مر جائے گا۔ لیکن جب ہم کہیں زید پڑھ چکا ہے تو اس میں کوئی

تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ واقعہ ماضی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے الہامات میں جب قطعی اور یقینی طور پر کسی بات کو بیان کرنا ہو تو وہ ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ تم اس بات کو ایسا سمجھو کہ گویا ہو چکی ہے اور اس کا وقوع بالکل قطعی اور یقینی ہے ایسا ہی قطعی اور یقینی جیسے ماضی ہوتی ہے۔

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ میں اس بات کی پیشگوئی کہ قرآن کریم کے ذریعہ علوم پھیلیں گے اسی طرح گو اس جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مگر الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے علوم کو قطعی اور یقینی اور غیر متبدل طور پر قلم کے ذریعہ سکھائے گا یعنی یہ قرآن لکھا جائے گا۔ لکھ کر قائم کیا جائے گا اور اس کی تائید میں لوگوں کی قلمیں چلا کریں گی۔ اب دیکھو قرآن کریم کی یہ پیش گوئی کیسے بیّن طریق پر پوری ہوئی ہے۔ دنیا میں صرف یہی ایک کتاب ہے جو قلم سے محفوظ کی گئی ہے اس کے علاوہ اور کوئی کتاب قلم سے محفوظ نہیں ہوئی۔ موسیٰؑ کی کتاب اس وقت نہیں لکھی گئی جب وہ موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ ابراہیمؑ کے صحف اس وقت نہیں لکھے گئے جب وہ ابراہیمؑ پر نازل ہوئے تھے۔ وید اس وقت نہیں لکھے گئے جب وہ رشیوں پر نازل ہوئے تھے۔ ژند اور اوستا اس وقت نہیں لکھی گئیں جب وہ زرتشت پر نازل ہوئی تھیں انجیل اس وقت نہیں لکھی گئی تھی جب حضرت مسیحؑ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ بتازہ الہامات ہوتے تھے۔ غرض دنیا میں کوئی ایک الہامی کتاب بھی ایسی نہیں جو ابتداء میں لکھی گئی ہو۔ صرف قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو شروع سے لکھی گئی ہے اور آج تک انہی الفاظ میں محفوظ ہے جن الفاظ میں یہ کتاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور یہ بات ایسی پختہ اور یقینی ہے کہ دشمنان اسلام تک یہ لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ دنیا میں اگر کوئی کتاب ایسی ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شروع سے لے کر اب تک ایک حرف اور ایک زبر اور ایک زیر کے تغیر کے بغیر اسی رنگ میں محفوظ ہے جس رنگ میں وہ دنیا کے سامنے پیش ہوئی تو وہ صرف قرآن کریم ہے۔ میور، نولڈکے اور سپرنگر جو مشہور یوروپین مستشرق ہیں اور جنہوں نے اسلام کی مخالفت میں اپنی تمام عمر بسر کی ہے انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ شروع سے لے کر اب تک ہر قسم کے تغیر اور انسانی دستبرد سے محفوظ چلا آ رہا ہے۔

(The Life of Muhammad by Sir William Muir p:561 - A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry, vol:1 p:109)

پھر عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ قرآن کریم کے ذریعہ آئندہ سارے علوم دنیا میں پھیلیں گے۔ چنانچہ آج جس قدر علوم نظر آتے ہیں یہ سب قرآن کریم کے طفیل معرض وجود میں آئے ہیں۔

قرآن کریم عربوں میں نازل ہوا اور عرب بالکل جاہل تھے۔انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ تاریخ کس علم کا نام ہے یا صرف اور نحو کون سے علوم ہیں یا فقہ اور اصول فقہ کس چیز کا نام ہے۔مگر جب قرآن کریم پر ایمان لانے کی سعادت ان کو حاصل ہو گئی تو قرآن کریم کی وجہ سے انہیں ان تمام علوم کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔مثلاً جب انہوں نے قرآن کریم میں پڑھا کہ پہلے زمانوں میں فلاں فلاں انبیاء آئے ہیں اور ان کے ساتھ یہ یہ واقعات پیش آئے تھے تو قرآن کریم کی صداقت ثابت کرنے کے لئے انہیں گذشتہ واقعات کی چھان بین کرنی پڑی اور اس طرح علم تاریخ کی ایجاد عمل میں آئی۔پھر بے شک قرآن کریم عربی زبان میں تھا اور اہل عرب کے لئے اس کا سمجھنا یا اس کی صحیح تلاوت کرنا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔مگر جب اسلام نے عرب کی سرزمین سے باہر قدم رکھا تو غیر اقوام کے میل جول کی وجہ سے عربوں میں بھی اعراب کی غلطیاں شروع ہو گئیں جس پر انہیں اس زبان کے قواعد جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح علم صرف اور نحو کی ایجاد ہو گئی۔مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ابوالاسود اپنے گھر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیٹی قرآن کریم کی آیت اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ کو اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلِهٖ پڑھ رہی ہے۔آیت کے معنے تو یہ ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول دونوں ہی مشرکوں سے بیزار ہیں مگر رَسُوْلُهٗ کی بجائے رَسُوْلِهٖ پڑھنے سے آیت کے یہ معنے بن جاتے ہیں کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اپنے رسول سے بھی گویا پیش کی جگہ زیر پڑھنے سے آیت کے کچھ کے کچھ معنے ہو گئے۔وہ گھبرائے ہوئے حضرت علیؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا ہمارے ملک میں اب بہت سے عجمی لوگ آ گئے ہیں اور ہماری بیٹیاں بھی ان سے بیاہی گئی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری زبان خراب ہو گئی ہے۔میں ابھی اپنے گھر گیا تھا تو میں نے اپنی بیٹی کو اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ کی بجائے اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلِهٖ پڑھتے سنا۔اگر اسی طرح غلطیاں شروع ہو گئیں تو طوفان برپا ہو جائے گا۔اس کے انسداد کے لئے ہمیں عربی زبان کے متعلق قواعد مدون کرنے چاہئیں تا کہ لوگ اس قسم کی غلطیوں کے مرتکب نہ ہوں۔حضرت علیؓ اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں باہر تشریف لے جا رہے تھے آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔چنانچہ اسی وقت آپ نے بعض قواعد بتلائے اور پھر فرمایا اُنْحُ نَحْوَهٗ وَ نَحْوَهٗ اس بنیاد پر اور بھی قواعد بنا لو چنانچہ اسی بناء پر اس کو علم نحو کہا جاتا ہے۔پس قرآن کریم کی صحت کے لئے علم صرف اور نحو ایجاد ہوئے۔پھر قرآن کریم کے معنے کے لئے لغت لکھی گئی۔کیونکہ عربوں کو خیال آیا کہ جب عجمی لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو وہ قرآن کریم کے معنے کس طرح سمجھیں گے پس لغت بھی قرآن کریم کی خدمت کے لئے لکھی گئی۔اس کے بعد قرآن کریم کی تشریح کے لئے علم فقہ اور اصول فقہ کی ایجاد عمل میں آئی۔اسی طرح علم معانی

اور علم بیان محض قرآن کریم کے طفیل ایجاد ہوئے۔ پھر قرآن کریم کے محاورات اور اس کے استعارات کی حقیقت واضح کرنے کے لئے بلاغت کی بنیاد پڑی کیونکہ اس کے بغیر قرآنی محاورات کی حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

اس فن کے متعلق لغت کی کتب میں ایک لطیفہ بیان ہوا ہے لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی شخص نے مجلس میں اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ قرآن کریم میں بعض ایسی باتیں آتی ہیں جو عقل کے بالکل خلاف ہیں۔ مثلاً لکھا ہے يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ (الکھف:۷۸) کہ دیوار یہ ارادہ کر رہی تھی کہ گر جائے بھلا دیوار بھی کبھی گرنے کا ارادہ کیا کرتی ہے یہ کیسی جاہلوں والی بات ہے جو قرآن کریم نے کہی ہے ایک اور عالم شخص وہاں موجود تھے مگر انہیں اس اعتراض کا جواب نہ آیا وہ حیران تھے کہ میں کیا کہوں کہ تھوڑی دیر کے بعد ہی اس شخص نے اپنے نوکر کو جو کسی اچھے قبیلہ میں سے تھا بلایا اور اسے کہا میر افلاں دوست بیمار ہے جاؤ اور اس کا حال دریافت کر کے آؤ۔ وہ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی آ کر کہنے لگا حضور میں کیا عرض کروں يُرِيْدُ اَنْ يَّمُوْتَ وہ تو مرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی اس پر گھڑوں پانی پھر گیا کہ میں جو کچھ اعتراض کر رہا تھا اس کا جواب مجھے اپنے نوکر کے ذریعہ مل گیا۔ اس کا اعتراض یہ تھا کہ دیوار بھی کبھی ارادہ کیا کرتی ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اسے اس رنگ میں دیا کہ اس کے اپنے نوکر نے اسے آ کر کہہ دیا کہ يُرِيْدُ اَنْ يَّمُوْتَ وہ مرنے کا ارادہ کر رہا ہے حالانکہ مرنے کا کوئی شخص ارادہ نہیں کیا کرتا۔ دراصل یہ ایک استعارہ تھا اور اس کے معنے یہ تھے کہ وہ مرنے پر تیار ہے۔ اسی طرح يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ کے معنے یہ ہیں کہ وہ دیوار گرنے پر تیار تھی نہ یہ کہ دیوار کوئی جاندار چیز ہے جو گرنے کا ارادہ کیا کرتی ہے۔ (فقهه اللغة باب فی اضافة الفعل الی ما لیس بفاعل علی الحقیقة)

غرض یہ علوم جو دنیا میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئے محض قرآن کریم کے طفیل اور اس کی تائید کے لئے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمائے ہیں۔ اگر یہ علوم پیدا نہ ہوتے تو قرآن کریم کی حقیقت اور اس کی اعلیٰ درجہ کی شان کو لوگ پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتے۔ یہی حال علم اقتصادیات کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآنی اقتصادیات کی توضیح کے لئے دنیا میں قائم کیا غرض صرف کیا اور نحو کیا اور تاریخ کیا اور ادب کیا اور کلام کیا اور فقہ کیا سب علوم قرآن کریم کی خدمت کے لئے نکلے ورنہ عرب تو محض جاہل تھے۔ انہیں ان علوم کی طرف توجہ ہی کس طرح پیدا ہو سکتی تھی۔ ان کو توجہ محض اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے قرآن کو مانا اور پھر قرآن کریم سے دنیا کو روشناس کرانے کے لئے انہیں ان علوم کی ایجاد یا ان کے پھیلانے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اب رہی باقی دنیا سو اس نے بھی قرآن کریم سے ہی ان تمام علوم کو سیکھا ہے کیونکہ یہ علوم وہ ہیں جو عربوں نے ایجاد کئے یا زندہ کئے اور پھر عربوں سے باقی دنیا نے لئے۔

سارا یورپ مسلمانوں کا شاگرد ہے یورپ نے ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں کے اس احسان کو چھپانے کی کوشش کی ہے مگر اب خود یورپ میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی کتابوں میں بڑے زور سے لکھتے ہیں کہ یہ کیسی بے شرمی اور بے حیائی ہے کہ علم تو مسلمانوں سے سیکھا جائے مگر اپنی کتابوں میں ان کا ذکر تک نہ کیا جائے اور اس رنگ میں اپنے آپ کو پیش کیا جائے کہ گویا ان علوم کے موجد ہم ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ احسان فراموشی کی بدترین مثال ہے کہ جنہوں نے ہم کو علم سکھایا ہے ہم ان کا ذکر تک نہیں کرتے اور اپنی طرف تمام علوم کو منسوب کرتے چلے جاتے ہیں۔ میرے پاس اس قسم کی کئی کتابیں ہیں اور میں نے دیکھا ہے ان کتابوں کے مصنف اتنی شدت سے بحث کرتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے اپنی قوم کے اس فعل کے خلاف ان کے قلوب غیض و غضب سے بھرے پڑے ہیں۔ جب ایک طرف وہ مسلمانوں کے احسانات کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف وہ اپنی قوم کی ڈھٹائی کو دیکھتے ہیں کہ ایک ایک چیز مسلمانوں سے حاصل کرنے کے بعد وہ مسلمانوں کا نام تک نہیں لیتی تو ان کے دلوں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ سخت نمک حرامی ہے کہ مسلمانوں کی ایک ایک چیز کو اپنا لیا جائے مگر ان کے علم و فضل اور احسان کا اشارۃً بھی ذکر نہ کیا جائے۔

تھوڑا ہی عرصہ ہوا میں نے ایک کتاب پڑھی جس میں موسیقی پر بحث کی گئی تھی۔ موسیقی کا آغاز بھی مسلمانوں سے ہی ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ترتیل کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کا حکم دیا تھا اسی سے ان کو موسیقی کی طرف توجہ ہوئی جس نے رفتہ رفتہ ایک بہت بڑے علم کی صورت اختیار کر لی۔ یورپ دعویٰ کرتا ہے کہ موجودہ موسیقی کا علم اس نے ایجاد کیا ہے مگر جس کتاب کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کے مصنف نے بڑے زور سے یہ بات پیش کی ہے کہ یورپ کا یہ ادّعا محض دھوکہ اور فریب ہے۔ موسیقی کا علم یورپ نے مسلمانوں سے سیکھا ہے اور پھر وہ اس کا ثبوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ برٹش میوزیم میں فلاں نمبر پر فلاں کتاب موجود ہے اس میں فلاں پادری کے نام کا ایک خط درج ہے جو کسی عیسائی نے اسے لکھا اور اس خط کا مضمون یہ ہے کہ میں سپین گیا تھا وہاں مسلمانوں کی موسیقی کا کمال دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ مسلمانوں کی موسیقی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے اور ان کے مقابلہ میں ہماری موسیقی بہت ادنیٰ معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں اور یہ امر دین نصرانیت کے خلاف نہ ہو تو میں چاہتا ہوں کہ ان کی موسیقی کا ترجمہ یوروپین لوگوں کے لئے کردوں تا کہ ہمارے گرجاؤں میں بھی یہ اعلیٰ درجہ کی موسیقی رائج ہو جائے اور عیسائیت زیادہ محبوب ہو جائے۔ وہ کہتا ہے اس خط کا پادری صاحب نے جو جواب دیا وہ بھی آج تک برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ پادری صاحب نے جواب یہ دیا کہ کوئی حرج نہیں آپ سپین کی موسیقی کا بے شک ترجمہ کریں مگر دیکھنا

مسلمانوں کا نام نہ لینا۔ اگر تم نے نیچے حوالہ دے دیا اور یہ ذکر کر دیا کہ یہ موسیقی مسلمانوں سے لی گئی ہے تو ان کی عظمت قائم ہو جائے گی۔ اس لئے نقل تو بے شک کرو مگر مسلمانوں کا نام نہ لو تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ تم یہ علم اپنی طرف سے بیان کر رہے ہو۔

غرض یورپ نے چاہا کہ یہ بات پوشیدہ رہے کہ اس نے مسلمانوں سے تمام علوم حاصل کئے ہیں مگر یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ آج خود عیسائیوں میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے ہیں جو بڑے زور سے اپنی قوم کی اس احسان فراموشی کا کتابوں میں اعلان کرتے ہیں۔ اسی طرح فن تعمیر، قالین بافی اور عمارتوں پر رنگ دار بیل بوٹے بنانے یہ تمام علوم وہ ہیں جو یورپ نے مسلمانوں سے سیکھے۔ چنانچہ اس کا ایک ثبوت میں خود ولایت میں دیکھ کر آیا ہوں۔ برائٹن میں ایک پرانا شاہی قلعہ ہے اس کی دیواروں پر بیل بوٹے بنانے کے لئے عیسائیوں کو سارے یورپ میں کوئی آدمی نہ ملا۔ آخر انہوں نے مسلمان ماہرین کو بلایا اور وہ وہاں بیل بوٹوں کی بجائے جگہ جگہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لکھ کر آ گئے۔ یہی ان کا عمارت کو سجانا تھا اور یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ اس فن کی ایجاد کا سہرا مسلمانوں کے سر پر ہے۔

غرض یورپ کے پاس کوئی ایک چیز بھی نہیں تھی اس نے جو کچھ سیکھا سپین کے مسلمانوں سے سیکھا اور سپین نے جو کچھ سیکھا شام سے سیکھا اور شام والوں نے جو کچھ سیکھا قرآن سے سیکھا۔ پس دنیا کے تمام علوم قرآن سے ہی ظاہر ہوئے ہیں اور اب قیامت تک جس قدر قلمیں چلیں گی قرآن کریم کی خدمت اور اس کے بیان کردہ علوم کی ترویج کے لئے ہی چلیں گی۔ آج یورپ میں جتنی کتابیں نکل رہی ہیں وہ سب کی سب عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کی تصدیق کر رہی اور اللہ تعالیٰ کی اس پیشگوئی کو سچا ثابت کر رہی ہیں کہ قلم کے ذریعہ قرآن کریم کو پھیلایا جائے گا۔ عرب ہر قسم کے علوم سے نابلد تھے لیکن قرآن کریم پر ایمان لانے کے بعد وہ تمام دنیا کے استاد بن گئے اور فلسفہ جس پر یورپ کو آج بہت بڑا ناز ہے اس کے بھی وہی موجد قرار پائے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلسفہ یورپ کی ایجاد ہے لیکن ایک یوروپین فلاسفر نے اس کو بالکل غلط قرار دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے فلسفہ ہم نے شروع سے لے کر آخر تک اشعری سے لیا ہے۔ اگر ہمارے فلسفہ میں کسی کو کوئی اچھی بات نظر آتی ہے تو اس تعریف کے مستحق ہم نہیں بلکہ اشعری اس تعریف کا مستحق ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علوم میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل کوشش کرتی ہے کہ اس کا علمی مقام پہلے سے بلند ہو جائے لیکن اس کے باوجود بیج اپنی ذات میں جو قیمت رکھتا ہے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ درخت کا پھیلاؤ خواہ کس قدر بڑھ جائے بیج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح علوم خواہ

کس قدر ترقی کر جائیں سہرا مسلمانوں کے سر ہی رہے گا اور مسلمانوں کا سر قرآن کریم کے آگے جھکا رہے گا کیونکہ یہی وہ کتاب ہے جس نے اعلان کیا کہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ اب دنیا کو قلم کے ذریعہ علوم سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔

پس حقیقت یہی ہے کہ دنیا کو تمام علوم قرآن کریم نے ہی سکھائے ہیں۔ اگر قرآن نہ آیا ہوتا تو دنیا ایک ظلمت کدہ ہوتی، جہالت اور بربریت کا نظارہ پیش کر رہی ہوتی۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے دنیا کو تاریکی سے نکالا اور علم کے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۶

اس نے انسان کو (وہ کچھ) سکھایا ہے جو وہ (پہلے) نہیں جانتا تھا۔

تفسیر۔ پیدائش انسانی کے متعلق اوپر کی آیات میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس کی مزید وضاحت اور تائید اس آیت سے ہوتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسان کو وہ باتیں سکھائیں گے جو اس سے پہلے اس کے علم میں نہیں تھیں۔ چنانچہ قرآن ایسے علوم سے بھرا پڑا ہے جو اسلام سے قبل نہ فلسفہ کی مدد سے حل ہو سکتے تھے اور نہ عیسائیت اور یہودیت نے ان کو حل کیا تھا۔ مثلاً توحید کے متعلق اسلام نے جو تعلیم پیش کی ہے وہ ایسی شاندار ہے کہ آج تک دنیا کا کوئی مذہب توحید کے متعلق ایسی جامع اور مکمل تعلیم پیش نہیں کر سکا۔ اسی طرح نبوت کے متعلق قرآن کریم نے اس تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ جس کی نظیر دنیا کا اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ باوجود اس بات کے کہ قرآن اس قوم میں نازل ہوا تھا جس میں ایک لمبے عرصہ سے کوئی نبی نہیں آیا تھا اور باوجود اس بات کے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم بھی اس قوم میں محفوظ نہیں تھی اور وہ قطعی طور پر نبوت اور اس کی تفصیلات سے ناواقف تھے پھر بھی نبوت کے متعلق اسلام نے جس قدر سیر کن بحث کی ہے اس کی مثال نہ عیسائیت پیش کر سکتی ہے اور نہ یہودیت پیش کر سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس قوم میں مبعوث ہوئے تھے جس میں آپ سے قبل درجنوں نہیں سینکڑوں انبیاء آ چکے تھے اور نبوت کے متعلق اپنے اپنے رنگ میں روشنی ڈال چکے تھے۔ پھر بھی عیسائی آج انجیل سے یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ نبی کی کیا تعریف ہوتی ہے۔

جن دنوں غیر مبایعین سے ہمارا مقابلہ زوروں پر تھا میں نے بڑے بڑے بشپوں، سکھ گیانیوں، پنڈتوں اور یہودیوں کے فقیہوں سے خط لکھ کر دریافت کیا کہ آپ کے مذہب میں نبی کی کیا تعریف ہے؟ اس کا جواب بعض نے

تو دیا ہی نہ اور بعض نے صاف طور پر اعتراف کیا کہ ہمارا مذہب اس بارہ میں بالکل خاموش ہے۔ چنانچہ ایک بڑے بشپ کی طرف سے بھی یہی جواب آیا کہ اس مضمون کے متعلق ہماری کتب میں کوئی تفصیل نظر نہیں آتی۔ مگر اسلام نے ان امور پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ نبی کی کیا تعریف ہے۔ نبی کب آتے ہیں۔ لوگ نبیوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ نبیوں کی صداقت کے کیا معیار ہیں یہ اور اسی قسم کے اور تمام مسائل اسلام میں پوری وضاحت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ پس فرماتا ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ اللہ تعالیٰ تمام علوم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعہ کرے گا۔ بے شک توحید کا عقیدہ دنیا میں موجود ہے مگر ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اسی طرح بے شک ملائکہ کو لوگ مانتے ہیں، کتب پر ایمان رکھتے ہیں، رسولوں کو تسلیم کرتے ہیں مگر ملائکہ، کتب الٰہیہ اور ایمان بالرسل کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ خدا کے ایک ہونے کا کیا مفہوم ہے تو وہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ لیکن قرآن دنیا کو بتلائے گا کہ توحید کا کیا مفہوم ہے اور کون کون سی باتیں انسان کو شرک میں مبتلا کرنے والی ہیں یا مثلاً اگر کوئی شخص سوال کرے کہ ملائکہ کیا چیز ہیں، وہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں، کیا کیا کام ان کے ذمہ ہیں، اگر ملائکہ نہ ہوتے تو کیا نقص واقعہ ہوتا؟ تو ان سوالات کا تمام بائبل سے جواب نظر نہیں آئے گا۔ بائبل یہ تو بتادے گی کہ خدا تعالیٰ نے فرشتے پیدا کئے ہیں اور وہ انبیاء کی طرف اس کا کلام لاتے ہیں مگر ملائکہ کی حقیقت یا ان پر ایمان لانے کے فوائد بیان نہیں کرے گی۔ لیکن قرآن صرف یہی نہیں بتائے گا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں بلکہ یہ بھی بتائے گا کہ اس نے ملائکہ کو کیوں پیدا کیا۔ ملائکہ کے کیا کام ہیں۔ انسان ملائکہ سے اپنا تعلق کس طرح بڑھا سکتا ہے۔ کن امور کے نتیجہ میں ملائکہ سے انسانی تعلق کم ہوجاتا ہے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص سوال کرے کہ مرنے کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے تو اسلام کے سوا اور کوئی مذہب اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈال سکے گا۔ نہ یہودیت مرنے کے بعد کے حالات بتاتی ہے نہ عیسائیت مرنے کے بعد کے حالات بتاتی ہے اور نہ کوئی اور مذہب مرنے کے بعد کے حالات بتاتا ہے۔ صرف اسلام دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے جو اس پر ایسی سیر کن بحث کرتا ہے کہ انسانی قلب مطمئن ہوجاتا ہے اور اس کی روح اپنے اندر سکینت محسوس کرتی ہے۔ اسی طرح اگر یہ سوال ہو کہ اخلاق فاضلہ کیا چیز ہیں۔ کس بناء پر بعض اخلاق کو اچھا کہا جاتا ہے اور بعض کو برا۔ اخلاق کی تعریف کیا ہے۔ اخلاق اور روحانیت میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟ تو اس کو ان تمام امور کا جواب صرف قرآن سے ہی مل سکتا ہے اور کتب کی ورق گردانی یا اور مذاہب کی کاسہ لیسی انسانی قلب کو مطمئن نہیں کرسکتی۔ اسی حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ یعنی قرآن اور اسلام کے ذریعہ دنیا کو وہ وہ علوم سکھائے جائیں

گے جو اس سے پہلے اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئے۔ چنانچہ اس کا عملی ثبوت موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے جلسہ اعظم مذاہب لاہور کے ذریعہ ظاہر کر دیا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں منتظمین کی طرف سے پانچ اہم سوالات پیش کئے گئے تھے اور مختلف مذاہب کے نمائندگان کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے رو سے ان سوالات کا جواب دیں۔ اس جلسہ کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مضمون لکھا اور جو ’’اسلامی اصول کی فلاسفی‘‘ کے نام سے چھپا ہوا موجود ہے اس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان تمام سوالات کا قرآن کریم سے جواب دیا اور ایسی سیر کن بحث کی کہ جب وہ مضمون جلسہ میں پڑھا گیا تو متفقہ طور پر لوگوں نے اس مضمون کو باقی تمام مضامین سے بالا قرار دیا اور اخبارات نے اعتراف کیا کہ اس جلسہ میں سب سے بالا مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کا مضمون رہا ہے جس کے دوسرے معنے یہ تھے کہ سب سے بالا قرآن کا مضمون رہا کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو کچھ لکھا تھا قرآنی آیات کے حوالہ اور ان کی روشنی میں لکھا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی بات پیش نہیں کی تھی۔ یہ عملی ثبوت اس بات کا تھا کہ دنیا قرآنی علوم کا مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز ہے۔ باوجود اس بات کے کہ یہ قید حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے مضمون کے لئے خود ہی بڑھا لی تھی کہ میں جو کچھ بیان کروں گا قرآن کریم کی روشنی میں بیان کروں گا اور باوجود اس کے کہ دوسرے لوگ آزاد تھے اور وہ اختیار رکھتے تھے کہ عقلی دلائل اپنی تائید میں پیش کر دیں یا فلسفہ کے رو سے اپنے مذہب کو غالب ثابت کر دیں پھر بھی وہ اس مقابلہ میں ناکام رہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک زائد قید اپنے اوپر لگا کر قرآن کریم میں سے وہ علوم نکال کر رکھ دیئے جن کا عشر عشیر بھی اور کسی مذہب کے نمائندہ نے بیان نہ کیا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ﴿۷﴾

(ان شبہات کے مطابق) نہیں۔ انسان یقیناً حد سے گذر رہا ہے۔

تفسیر۔ جیسا کہ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان میں کَلَّا اس غرض کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ کوئی مضمون جو پہلے گزر چکا ہے یا کوئی مفہوم جو پہلے مضمون سے پیدا ہوتا ہے اس کو تسلیم کرنے سے جو شخص انکار

کرتا ہے اس کی تردید کی جائے اور اسے بتایا جائے کہ تمہارا خیال درست نہیں۔ گویا کَلَّا کے معنے ہیں اے مخاطب ’’یوں نہیں۔ یوں نہیں‘‘ جیسا تم سمجھتے ہو ہمارے ملک میں بھی رواج ہے کہ جب کسی بات کو ردّ کرنا مقصود ہو تو کہتے ہیں ’’نہیں نہیں۔نہیں نہیں‘‘۔ پس کَلَّا کیا ہے درحقیت ’’نہیں نہیں‘‘ کا ایک مترادف لفظ ہے جو عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھتے ہو وہ درست نہیں بات دراصل کچھ اور ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے مضمون میں وہ کون سی بات تھی جس پر دشمن اعتراض کرسکتا تھا اور جس کی یہاں نفی کی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ اللہ تعالیٰ انسان کو وہ کچھ سکھائے گا جسے وہ اب تک نہیں جانتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے الہام کے ذریعہ دنیا کی راہنمائی فرمائے گا اور خود اپنے پاس سے وہ تعلیم نازل کرے گا جو اسے روحانیت کے بلندترین مقامات پر پہنچانے والی ہو۔ اس پر اعتراض پیدا ہوتا تھا کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہیں۔ انسان خود اپنی عقل سے کام لے کر ترقی کرسکتا ہے۔ چنانچہ یہ سوال ایسا ہے جو موجودہ زمانہ میں تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کا سامان کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم خود اپنی عقل اور فہم سے کام لے سکتے اور اپنی ترقی کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تدابیر اختیار کرسکتے ہیں۔ یہی اعتراض ہے جو عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا تھا اور انسان کہہ سکتا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کی ضرورت نہیں۔ کَلَّا نے اس خیال کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ قطعی طور پر غلط بات ہے کہ انسان اپنی ہدایت اور بچاؤ کا سامان اپنے لئے خود بخود تجویز کرسکتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نازل نہ ہو تو دنیا کبھی ترقی کی طرف ایک قدم بھی بڑھا نہیں سکتی۔ اس کی ترقی وابستہ ہے اللہ تعالیٰ کے الہام اور اس کے کلام سے۔ اس کی ہدایت کے بغیر نہ انسان نے پہلے کبھی روحانی اصلاح کی اور نہ آئندہ کرسکتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس خیال کی بنیاد پر روشنی ڈالتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ خیال انسان کے دل میں کیوں پیدا ہوتا ہے فرماتا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی یہ خیال کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہیں ہم اپنی ہدایت کا سامان خود بخود کرلیں گے۔ یہ بغاوت اور سرکشی کا خیال ہے۔ طَغٰی کے معنے جَاوَزَ الْقَدْرَ وَالْحَدَّ کے ہوتے ہیں یعنی فلاں شخص حد سے گزر گیا۔ پس اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی کے یہ معنے ہوئے کہ یقیناً انسان حد سے باہر نکل جانے والا ہے۔ ہم نے بے شک انسان کو قوتیں دی ہیں مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنی ہدایت

کا آپ سامان کرسکتا ہے الٰہی مدد کا محتاج نہیں۔

پہلی سورتوں میں اللہ تعالیٰ یہ مضمون بیان کر چکا ہے کہ اس نے انسان کو بہت بڑی طاقتیں دے کر بھیجا ہے چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ہم نے انسان کو اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ میں پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان کیا ہے کہ ہم نے انسان میں بڑی بڑی طاقتیں اور قوتیں رکھی ہیں اور انہی قوتوں کی بناء پر یہ استدلال کیا گیا ہے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ایسی اعلیٰ درجہ کی قوتیں دینے کے بعد ہم انسان کو چھوڑ دیں اور اسے تاریکی اور ضلالت کے گڑھوں میں گرنے دیں۔ جب ہم نے انسان کو معتدل القویٰ بنایا ہے اور اسے اعلیٰ درجہ کی روحانی طاقتیں دے کر بھیجا ہے تو ضروری ہے کہ ہم اعلیٰ درجہ کی منزلِ مقصود بھی اس کے سامنے رکھیں اور اسے اکیلا نہ چھوڑیں۔ یہ مضمون ہے جو پہلی سورتوں میں بیان ہو چکا ہے مگر یہاں یہ فرماتا ہے کہ انسان ہماری مدد کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں اختلاف نظر آتا ہے۔ پہلے تو یہ فرمایا تھا کہ انسان میں بڑی بڑی طاقتیں رکھی گئی ہیں اور یہاں آ کر کہہ دیا ہے کہ بغیر ہماری مدد کے بنی نوع انسان ہدایت پا ہی نہیں سکتے۔ پس سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ بات کیا ہے کہ خود ہی پہلے ایک بات کہی اور خود ہی بعد میں آ کر اس کی تردید کردی۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى میں دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ بے شک ہم نے انسان میں بڑی طاقتیں رکھی ہیں مگر طاقت رکھنے کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنے دائرۂ عمل سے بھی باہر نکل سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو انسان بڑی طاقت رکھتا ہے لیکن اگر بدپرہیزی کرتا ہے تو بیمار ہوجاتا ہے۔ اسی طرح انسان میں اللہ تعالیٰ نے برداشت کی بڑی طاقت رکھی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سترہ اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھ جائے تو ہوا کے دباؤ کی کمی کی وجہ سے اس میں جنون کا سا رنگ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ دوست کو دشمن سمجھنے لگ جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے متعلق ثابت ہے کہ ان میں تیس تیس چالیس چالیس سال سے دوستیاں چلی آتی تھیں اور بڑے بڑے نازک حالات میں بھی ان کی دوستیاں نہ ٹوٹیں مگر جب وہ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے لئے گئے تو وہ ایسی حالت میں واپس آئے جب ایک دوسرے کے شدید دشمن تھے۔ چنانچہ وہ مختلف وفود جو ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے لئے جاتے رہے ہیں ان کے متعلق یہ امر ثابت ہے کہ ان میں سے کثیر طبقہ ایسا تھا جو دوست بن کر گیا اور دشمن بن کر واپس آیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ سترہ ہزار فٹ سے اوپر جا کر انسان کی دماغی کیفیت متزلزل ہوجاتی ہے اور بعض لوگوں کی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ وہ آپس میں نرمی اور محبت سے نہیں رہ سکتے بلکہ بات بات پر لڑائی کرنے لگتے ہیں۔

انگلستان میں ایک دفعہ ایک پائلٹ کے ساتھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ جب وہ سترہ ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر گیا تو یک دم اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھی نے زور سے اس کی گردن پکڑ لی ہے اور وہ اس کے گلے کو دبا کر اسے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اس نے چونکہ ہمالیہ پہاڑ کے واقعات اکثر سنے ہوئے تھے اور وہ جانتا تھا کہ اوپر پہنچ کر ہوا کے ہلکا ہونے کی وجہ سے انسان اپنے دماغی توازن کو قائم نہیں رکھ سکتا اس لئے وہ جھٹ اپنے جہاز کو نیچے کی طرف لے آیا۔ جب وہ سات آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر آ پہنچا تو اس کا دوست ہوش میں آ گیا اور اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔

غرض ہر چیز کا ایک دائرہ عمل ہوتا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتی۔ یہی حال انسان کا ہے بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے خاص طور پر اعلیٰ درجہ کی طاقتیں دے کر بھیجا گیا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنی لائن کے علاوہ دوسری لائن میں بھی قابلیت کے جوہر دکھا سکتا ہے۔ گھوڑا ساٹھ ساٹھ بلکہ سو سو میل تک بعض دفعہ ایک سانس میں دوڑ سکتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ عقلی کاموں میں بھی انسان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بے شک دوڑنے کے کام میں ایک گھوڑا بہتر سے بہتر تیز رفتار انسان سے بھی زیادہ تیز دوڑے گا مگر جہاں عقل کا سوال آئے گا وہاں ایک گھوڑا ادنیٰ سے ادنیٰ اور بیوقوف سے بیوقوف انسان جتنا کام بھی نہیں کر سکے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ تو درست ہے کہ ہم نے انسان کو طاقتیں دی ہیں مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنی حد سے آگے نکل سکتا ہے۔ جو کام اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے وہاں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ وہ کام اگر کرے گا تو اللہ تعالیٰ ہی کرے گا انسان اپنی عقل سے اسے سرانجام نہیں دے سکتا۔ پس كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ وسوسہ جو بعض قلوب میں پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کوئی تعلیم بھیجنے کی کیا ضرورت ہے ہم اپنے لئے آپ ہی ایک مذہب بنا لیں گے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ ایسے خیالات اسی شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں جو اپنی حد سے آگے نکل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کام بہرحال اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ بندے کا کام نہیں کہ وہ اس میں دخل دے سکے۔ بے شک اس نے تمہیں طاقتیں دی ہیں مگر وہ غیر محدود نہیں بلکہ ایک حد کے اندر ہیں۔ اسی طرح بے شک اس نے تمہیں عقل دی ہے مگر وہ بھی تمہاری ذاتی طاقتوں تک محدود ہے۔ تم میں یہ طاقت نہیں کہ اپنے لئے خود بخود کوئی مذہب بنا لو یا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے وسائل اپنی عقل سے تجویز کر سکو۔

اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی ؕ﴿۸﴾

اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے۔

حلّ لُغات۔رَاٰی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی جملہ مفعول لہٗ واقعہ ہوا ہے یعنی طَغٰی اس وجہ سے ہے کہ انسان اپنے نفس کو مستغنی سمجھتا ہے رَاٰی کے معنے دیکھنے کے بھی ہوتے ہیں اور سمجھنے اور پانے کے بھی۔ اس جگہ رَاٰی رویئت قلبی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے کیونکہ دو ضمیریں اس کی طرف جاتی ہیں اور رویئت قلبی کے ہمیشہ دو مفعول ہوا کرتے ہیں۔(تاج العروس)

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ بتاتا ہے کہ ہم انسان کو حد سے گذرنے والا کیوں کہتے ہیں اور کیوں وہ ہمارے مقابلہ میں سرکشی اختیار کرتا ہے۔فرماتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے۔ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ اور عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ کا جو فاعل ہے یعنی خدا جس نے انسان کو قلم سے سکھایا اور جو انسان کو وہ کچھ سکھانے والا ہے جو وہ نہیں جانتا اس کی مدد سے وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ میں اپنے اخلاق کو بھی درست کرلوں گا، اپنے عقائد کو بھی درست کرلوں گا، اپنی روحانیت کو بھی درست کرلوں گا، اپنے تمدن اور سیاست کو بھی درست کرلوں گا، اپنی عائلی زندگی کو بھی درست کرلوں گا، اپنے اقتصادی معاملات کو بھی درست کرلوں گا، اللہ تعالیٰ کو میرے کاموں میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا ہے کالجوں کے لڑکوں سے جب بھی مذہبی معاملات پر گفتگو کی جائے تھوڑی دیر کے بعد ہی ان کی زبان سے اس قسم کے فقرے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں کہ اوّل تو ہم مانتے ہی نہیں کہ دنیا کا کوئی خدا ہے اور اگر ہے تو اسے انسانی کاموں میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے یہ ہمارا اختیار ہے کہ ہم اپنے لئے جو طریق پسند کریں اسے اختیار کرلیں پس فرمایا اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی۔ طغیان اور سرکشی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مدد سے بے نیاز قرار دے دیتا ہے اس لئے وہ اس روحانی کوچہ میں داخل نہیں ہوسکتا جس کا دروازہ اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے بغیر کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش سے نہیں کھول سکتا۔

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۹

تیرے رب ہی کی طرف یقیناً لوٹ کر جانا ہے۔

تفسیر ۔ یہاں مفسرین نے بالعموم رَبِّكَ کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ضمیر انسان کی طرف پھیری گئی ہے (روح المعانی زیر آیت اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى، تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى) مگر میرے نزدیک یہاں رَبِّكَ سے وہی رب مراد ہے جس کا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ میں ذکر آتا ہے اور جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ فرماتا ہے یہ انسان اپنے آپ کو مستغنی کس طرح سمجھ سکتا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے آخر تیرے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف ہی جانا ہے تو پھر وہی بتا سکتا ہے کہ وہاں کن اعمال کی ضرورت ہے، یہ لوگ اپنی عقل سے وہاں کے حالات کس طرح معلوم کر سکتے ہیں؟ آخر یہ ایک موٹی بات ہے کہ اگر ایک شخص انگلستان جانا چاہتا ہے تو اسی شخص سے وہاں کے حالات دریافت کرے گا جو انگلینڈ سے واپس آ چکا ہوگا۔ وہ اس کے پاس جائے گا اور کہے گا کہ میں انگلینڈ جانا چاہتا ہوں مگر مجھے علم نہیں کہ وہاں کی آب و ہوا کیسی ہے وہاں مجھے کیسے کپڑوں کی ضرورت ہے، کتنا روپیہ مجھے ساتھ لے جانا چاہیے کیا کیا باتیں مجھے سفر میں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ آپ چونکہ انگلینڈ میں رہ چکے ہیں اور وہاں کے حالات سے آپ کو ذاتی طور پر واقفیت ہے اس لئے آپ مجھے بتائیں کہ وہاں کی آب و ہوا کے لحاظ سے مجھے کیسے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ آیا سرد کپڑے میں اپنے ساتھ لے جاؤں یا گرم اور اگر گرم لے جاؤں تو وہ کس قدر گرم ہونے چاہئیں۔ کیونکہ محض ٹھنڈک یا سردی کے ذکر سے یہ پتہ نہیں لگ سکتا کہ وہاں کس قسم کی سردی پڑتی ہے۔ خفیف پڑتی ہے یا شدید۔ میں ۱۹۲۴ء میں جب انگلستان سے واپس آیا ہوں اس وقت نومبر کا مہینہ تھا اور نومبر کے دنوں میں یہاں بہت معمولی سردی ہوتی ہے مگر انگلستان میں جس قدر سردی پڑتی ہے اس کی شدت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن اکتوبر کے مہینہ میں رات کے گیارہ بجے میں بند موٹر میں سفر کر رہا تھا اور میری حالت یہ تھی کہ میں نے گرم بنیان پہنی ہوئی تھی اس پر گرم کرتہ تھا اس پر گرم صدری تھی اس کے اوپر گرم کوٹ تھا پھر اس کے اوپر اوورکوٹ تھا اور اوورکوٹ بھی ہندوستان کا نہیں بلکہ وہ جو انگلستان کے لئے بنوایا گیا تھا اور جو ہندوستانی اوورکوٹ سے دوگنا تگنا موٹا ہوتا ہے مگر اتنے گرم کپڑوں کے باوجود اور پھر بند موٹر میں سفر کرنے کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ پر کوئی کپڑا نہیں یہ تو انگلستان کی سردی کا حال ہے۔ اس کے بعد آرکٹک میں چلے جاؤ تو وہاں انگلستان سے بھی زیادہ ٹھنڈ ہوگی۔ اس کے مقابل میں امریکہ کے

بعض حصے ایسے ہیں جہاں منٹ منٹ کے بعد موسم بدلتا رہتا ہے۔ ابھی گرمی ہوتی ہے اور ابھی تھوڑی دیر کے بعد ہی سردی شروع ہو جاتی ہے۔ سردی ہوتی ہے تو معاً گرمی شروع ہو جاتی ہے وہاں یہی حالت رہتی ہے کہ جرسی پہنی اور اتاردی پھر پہنی اور اتاردی۔ غرض دنیا میں یہ طریق ہے کہ جب کوئی شخص انگلستان جانا چاہے گا تو وہ پہلے واقف حال لوگوں سے پوچھے گا کہ مجھے وہاں کیسے کپڑوں کی ضرورت ہے یا امریکہ جانا چاہے گا تو وہاں سے آنے والے لوگوں سے پوچھے گا کہ مجھے امریکہ میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً ہندوستانیوں کو عام طور پر مرچیں کھانے کی عادت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی ایسا شخص امریکہ جانا چاہے گا جسے مرچیں کھانے کی عادت ہوگی تو وہ یہ ضرور دریافت کرے گا کہ مجھے وہاں مرچیں مل سکتی ہیں یا نہیں اور جب نفی میں جواب ملے گا اور اسے مرچیں کھانے کا زیادہ شوق ہوگا تو وہ اپنے ساتھ مرچیں لے جائے گا تا کہ وہاں اسے تکلیف نہ ہو۔ یا مثلاً عرب میں کوئی ہندوستانی جسے پان کا شوق ہو جانا چاہے گا تو وہ پہلے واقف حال لوگوں سے پتہ لگائے گا کہ وہاں پان ملتا ہے یا نہیں۔ تا کہ اسے حالات کا صحیح علم ہو جائے اور وہ ان کے مطابق اپنی تیاری کو مکمل کرے غرض یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب انسان نے کہیں جانا ہوتا ہے وہ پہلے واقف لوگوں سے مشورہ لیتا اور اس جگہ کے حالات کو معلوم کرتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ وہ واقف لوگوں سے تو نہ پوچھے اور اپنے عقلی ڈھکونسلوں پر تیاری کی بنیاد رکھ دے۔ اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ اس جگہ بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ان لوگوں کی عقل ماری ہوئی ہے انہوں نے جانا خدا کے پاس ہے لیکن کہتے یہ ہیں کہ ہمیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے قرب کے راستے بتلائے۔ ان نادانوں سے کوئی کہے کہ تم معمولی معمولی سفر اختیار کرتے ہو تو پہلے تمام حالات دریافت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہو۔ تم پوچھتے ہو کہ جہاں میں جانا چاہتا ہوں وہاں گرمی ہے یا سردی۔ کپڑے اپنے ساتھ کیسے لے جاؤں۔ کون کون سی ضروریات کا خیال رکھوں۔ بوٹ اپنے ساتھ لے جاؤں تو وہ کیسے ہوں۔ بعض ملکوں میں اس کثرت سے بارشیں ہوتی ہیں کہ معمولی بوٹ اگر انسان نے پہنا ہوا ہو تو شام تک وہ تھیلا بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح بعض ملک ایسے ہیں جن میں اتنا مچھر ہوتا ہے کہ انسان بغیر مچھر دانی کے ایک رات بھی گذار نہیں سکتا۔ غرض مختلف ملکوں کے مختلف حالات ہوتے ہیں اور انسان کو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا جب تک وہ ان تمام حالات کو دریافت نہ کر لے۔ غرض اس محدود دنیا میں جو صرف ۲۵ ہزار میل میں پھیلی ہوئی ہے ایسے زمانہ میں جبکہ ریل اور تار اور ڈاک کے وسائل موجود ہیں ایک ملک سے دوسرے ملک جانے میں کئی قسم کی دقتیں حائل ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے واقف حال لوگوں سے حالات دریافت کرتا ہے اور اگر کوئی واقف نہیں ملتا تو کسی کمپنی کو لکھتا ہے کہ میں فلاں ملک میں جانا چاہتا ہوں مہربانی فرما کر مجھے بتایا جائے

کہ میں کہاں کا ٹکٹ لوں، کتنا روپیہ اپنے پاس رکھوں اور کیا کیا چیزیں ساتھ لے جاؤں۔ ہندوستان میں کسی سفر کے لئے گھر سے نکلو اور بستر ساتھ نہ ہو تو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہوٹلوں میں اوّل تو بستر ملتا ہی نہیں اور اگر ملے گا تو ایسا گندہ اور غلیظ اور ناپاک اور بدبودار کہ کئی قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خوف لاحق ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی خیال کے ماتحت اگر کوئی انگلستان جاتے ہوئے بستر اپنے ساتھ لے جائے تو ہر مرد عورت اور بچہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگ جائے گا کہ یہ کیسا انسان ہے سفر میں اپنے ساتھ بستر لئے پھرتا ہے۔ انگلستان میں یہ دستور ہے کہ انسان جس جگہ ٹھہرے وہاں سونے کے لئے اسے مالک مکان کی طرف سے بستر دیا جاتا ہے۔ ہر ہوٹل میں روزانہ بستر تبدیل کئے جاتے ہیں اور چادر پر ایک معمولی داغ بھی رہنے نہیں دیا جاتا۔ وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہوٹل کا بستر اگر استعمال کیا گیا تو وہ گندہ ہوگا کیونکہ ہر اچھے ہوٹل میں ایسا انتظام ہوتا ہے کہ روزانہ اوپر نیچے کی چادریں بدلی جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک مریض کا کمبل دوسرے کو دے دیا جائے اور دوسرے کی میلی کچیلی چادر تیسرے کے نیچے بچھا دی جائے وہاں روزانہ دھوبی سے دھلی دھلائی چادریں آتی ہیں اور بستروں پر بچھا دی جاتی ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک کا کپڑا دوسرے کو دے دیں۔ یہی رواج ہزارہ میں بھی ہے وہاں غریب سے غریب آدمی بھی دس پندرہ بستر ضرور رکھ لیتا ہے تا کہ مہمانوں کو تکلیف نہ ہو اگر وہاں کوئی شخص بستر اپنے ساتھ لائے تو میزبان سخت برا مناتا ہے کہ تم نے مجھ پر بے اعتباری کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزارہ کے لوگ ہمارے سالانہ جلسہ پر آتے ہیں تو اپنے بستر ساتھ نہیں لاتے وہ سمجھتے ہیں بستر ساتھ لے جانا بڑی کمینگی ہے مگر یہاں آ کر انہیں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ یہاں یہ رواج ہے کہ ہر شخص بستر اپنے ساتھ رکھتا ہے اسی طرح ہزارہ میں یہ رواج ہے کہ لوگ روپیہ اپنے ساتھ نہیں رکھتے جس کسی کے ہاں ٹھہرتے ہیں اس کا فرض ہوتا ہے کہ کرایہ ادا کرے۔ چنانچہ چلتے ہوئے وہ بڑے اطمینان سے کہتے ہیں کہ اب کرایہ لاؤ ہم واپس جانا چاہتے ہیں۔ اب دیکھو ہزارہ کوئی زیادہ دور نہیں۔ چند گھنٹوں کے سفر کے بعد انسان وہاں پہنچ جاتا ہے مگر عادات اور رسوم و رواج میں کس قدر فرق ہے کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے اگر ان حالات کو معلوم کئے بغیر کوئی شخص دوسرے مقام پر چلا جائے تو یہ لازمی بات ہے کہ اسے سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا ان لوگوں کو اتنی بھی سمجھ نہیں آتی کہ مذہب اور دین کا اصل تعلق موت کے بعد کی زندگی سے ہے اور یہ زندگی وہ ہے جس کے حالات سے یہ لوگ محض بے خبر ہیں ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس زندگی کو دیکھ کر آیا ہوں اس لئے مجھے کسی اور کی راہنمائی کی ضرورت نہیں۔ جب ان لوگوں کو اس زندگی کے

حالات کا جو مرنے کے بعد حاصل ہونے والی ہے کچھ بھی علم نہیں اور انہوں نے لوٹ کر آخر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی جانا ہے تو اگر اللہ تعالیٰ ان کو اس زندگی میں کام آنے والی باتیں نہیں بتائے گا تو ان کو پتہ کس طرح لگے گا کہ وہاں کون سے اخلاق کام آ سکتے ہیں۔ کون سے اعمال ان کی اخروی حیات کو سنوار سکتے ہیں، کون سے عقائد اختیار کر کے وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن سکتے ہیں۔ یہ باتیں تو اللہ تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے خود اپنی عقل سے یہ لوگ وہاں کے حالات معلوم نہیں کر سکتے اس لئے ان کی سرکشی اور اپنے آپ کو ہدایت کے متعلق خدا تعالیٰ کی مدد سے مستغنی سمجھنا حماقت کی بات ہے بغیر الٰہی امداد کے اس بارہ میں نہ انسان نے پہلے کامیابی حاصل کی ہے اور نہ اب کر سکتا ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ﴿۱۰﴾

(اے مخاطب) تو (مجھے) اس (شخص) کی (حالت کی) خبر دے جو روکتا ہے۔

عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ﴿۱۱﴾

ایک (عبادت گذار) بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایک مثال کے ذریعہ کفار کو ملزم کرتا ہے۔ فرماتا ہے مجھے اس شخص کا حال تو بتاؤ یعنی ذرا اس شخص کی معقولیت تو مجھ پر ظاہر کرو۔ اَرَءَيْتَ کے لفظی معنے ہوتے ہیں ''کیا دیکھا تو نے''۔ لیکن محاورہ میں اس کے معنے ہوتے ہیں اَخْبِرْنِیْ مجھے بتاؤ تو سہی (مفردات)۔ چونکہ یہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں اس لئے اَرَءَيْتَ کے معنے ہوں گے اے محمد رسول اللہ مجھے بتا تو سہی۔ دراصل یہ زجر کا ایک طریق ہے کہ بات تو ہم دوسرے کی کرتے ہیں۔ لیکن ہم اس کو مخاطب کرنا نہیں چاہتے۔ وہ سنے گا تو آپ ہی دل میں شرمندہ ہوگا کہ میں کیسی لغو حرکت کر رہا ہوں۔ ہم اس کی بجائے تجھے مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذرا اس شخص کا حال تو بتاؤ يَنْهٰى جو روکتا ہے مگر کس کو؟ کسی جھگڑالو کو نہیں، کسی لڑاکے کو نہیں، کسی فریبی کو نہیں، کسی ڈاکو کو نہیں بلکہ عَبْدًا ہمارے ایک مسکین اور عاجز بندے کو۔ اور روکتا کس بات پر ہے۔ اس پر نہیں کہ اس نے فلاں قانون کو پورا نہ کیا یا فلاں سیاسی مسئلہ میں اس نے ہم سے اختلاف رکھا بلکہ اِذَا صَلّٰى۔ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور یہ دوڑ کر اس کا گلا پکڑ لیتا ہے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی معقول انسان اس امر کو جائز اور درست قرار دے سکتا ہے؟ کوئی سیاسی اختلاف نہیں، کوئی اقتصادی اختلاف نہیں، کوئی تمدنی اختلاف نہیں، کوئی حاکم اور محکوم

کا اختلاف نہیں۔ایک شخص اپنے گھر میں خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور دوسرا شخص اسے پکڑ کے عبادت سے روکنا شروع کر دیتا ہے۔کیا اس میں کوئی بھی معقولیت پائی جاتی ہے۔کیا یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ خدا تعالیٰ کا بندہ خدا تعالیٰ کے سامنے عبادت کر رہا ہے اور ابوجہل اپنے گھر میں بیٹھے یونہی اچھل کود رہا ہے نہ لینا نہ دینا۔نہ تعلق نہ واسطہ اور وہ یونہی سیخ پا ہو رہا ہے۔یہ نہیں کہ نماز پڑھتے وقت کوئی ابوجہل کا گھوڑا کھول کر لے جاتا ہے یا اس کا اسباب اٹھا کر لے جاتا ہے جس کی بناء پر اسے غصہ پیدا ہوتا ہے۔ایک شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے اور ابوجہل صفت شور مچانا شروع کر دیتا ہے کہ مار دیا، مار دیا۔کیا اتنی غیر معقول حرکتیں کرنے والا انسان بھی یہ سمجھتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہیں۔

چونکہ پہلی آیات میں اس امر کا ذکر تھا کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں دینی معاملات میں الٰہی راہنمائی کی ضرورت نہیں وہ اپنی عقل سے اپنے لئے خود بخود ایک راہ تجویز کر سکتے ہیں۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ملزم کرنے کے لئے یہ مثال پیش کی ہے اور فرمایا ہے کہ تم جو دن رات یہ رٹ لگا رہے ہو کہ ہمیں دینی معاملات میں اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہیں۔تم اپنے حالات پر غور کرو اور دیکھو کہ تمہارا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے۔تم اگر کسی اور کی طرف نہیں دیکھ سکتے تو ابوجہل یا دوسرے لیڈروں کو ہی دیکھ لو۔وہ قوم کے سردار ہیں، دنیوی معاملات میں لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں، فوجوں کی کمان کرتے ہیں اور لوگوں پر ان کی دانائی کا سکہ بیٹھا ہوا ہے مگر دین کے معاملہ میں ان کی عقل اس قدر ماری ہوئی ہے کہ ایک بندہ اکیلا اپنے گھر میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو وہ اچھلنے کودنے لگ جاتے ہیں۔جن لوگوں کی نابینائی اس قدر بڑھ چکی ہو اور جو دینی معاملات میں اس قدر حماقت اور جہالت کے کاموں پر اتر آئے ہوں ان کے متعلق تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ اس روحانی میدان میں اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانے کی طاقت رکھتے ہیں۔

اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى ﴿۱۲﴾

(اے مخاطب) تو (مجھے) بتا تو سہی کہ اگر وہ (نماز پڑھنے والا بندہ) ہدایت پر ہو؟

تفسیر ۔اس موقعہ پر ابوجہل صفات والوں کی طرف سے کہا جا سکتا تھا کہ تم جو اعتراض کرتے ہو کہ ہم نے عبادت میں کیوں دخل دیا یہ درست نہیں۔بے شک اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں تھا۔ہماری قوم کا کوئی نقصان نہیں تھا۔

حکومت اور نظام کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ مگر چونکہ اس میں عبادت کرنے والے کا اپنا نقصان تھا اور ہم نے دیکھا کہ وہ ایک برا کام کر رہا ہے ہم نے ہمدردی اور محبت کے پیش نظر اسے روک دیا تا کہ اس کام کے برے نتائج سے وہ محفوظ رہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰى۔ مجھے بتاؤ تو سہی اگر ہمارا وہ بندہ ہدایت پر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے۔ یہ بھی گفتگو کا ایک طریق ہوتا ہے کہ الفاظ شک کے استعمال کئے جاتے ہیں مگر مراد الٹ ہوتی ہے۔ ہر زبان کا یہ طریقہ ہے مثلاً اردو میں بھی بولتے ہیں شاید میں نے اسی طرح کرنا ہو اور مراد ہوتی ہے اسی طرح کرنا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰى یعنی اِنْ كَانَ مُحَمَّدٌ اَوْ اِنْ كَانَ الْعَبْدُ الْمُصَلِّيْ عَلَى الْهُدٰى۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا ہمارا وہ بندہ جو ہماری عبادت کر رہا ہے سچا ہوا تو پھر اس کو روکنے والے کا کیا حال ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے فعل کے جواز میں یہ کہہ رہے ہو کہ ہم اسے عبادت سے اس لئے روک رہے ہیں کہ یہ کہیں دوزخ میں نہ جا پڑے۔ کہیں اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی ناراضگی کا مورد نہ بن جائے۔ حالانکہ جب یہ معاملہ اگلے جہان سے تعلق رکھتا ہے اور اگلا جہان وہ ہے جو نہ تم نے دیکھا اور نہ تمہارے باپ دادا نے۔ تو تمہیں کیونکر پتہ لگا کہ اس فعل کا نتیجہ ضرور خراب نکلے گا۔ اگر ذاتی طور پر تم سمجھتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچائی پر قائم نہیں تب بھی تمہیں عبادت سے روکنے کا کوئی حق نہیں تھا کیونکہ تم کسی یقین کی بناء پر ایسا نہیں کہہ رہے۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کہ شاید یہ حق پر نہ ہو۔ اس لئے ہم اسے روکنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس کے مقابلہ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حق پر ہو اور تم اسے روک کر ظالم بن رہے ہو۔ بہر حال جب یہ معاملہ اگلے جہان سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق تمہارا علم کسی قطعی بنیاد پر قائم نہیں بلکہ ایک ڈھکونسلہ ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ شاید یہ جھوٹا ہو۔ شاید یہ برا کام کر رہا ہو۔ تو محض ایک ظن کی بنا پر تمہیں اس کو روکنے کا حق کہاں سے پیدا ہو گیا۔ جبکہ ہوسکتا ہے کہ یہ ہدایت پر ہو اور تم جو اسے روک رہے ہو گمراہی اور ضلالت میں پڑے ہوئے ہو۔

دوسرے کو انسان اسی وقت کسی کام سے روک سکتا ہے جب اس کے علم کی بنیاد یقین پر ہو۔ مثلاً اگر کوئی بچہ کنوئیں میں گرنے لگے اور ماں باپ پاس نہ ہوں تو ہر شخص حق رکھتا ہے کہ اسے روکے کیونکہ اس کا نتیجہ یقیناً ہلاکت ہے۔ لیکن اگر ایک شخص تجارت کرنے لگے، زید کا خیال ہو کہ مجھے نفع ہوگا اور بکر کا خیال ہو کہ نفع نہیں ہوگا تو ایسی صورت میں اگر بکر زید سے لڑ پڑے اور اسے تجارت سے روک دے تو ہر شخص بکر کو ملزم قرار دے گا اور اگر مجسٹریٹ کے پاس مقدمہ جائے گا تو وہ یقیناً بکر کو سزا دے گا اور کہے گا کہ یہ کون سی بدیہی بات تھی جس کی بناء پر تم نے

دوسرے کو تجارت کرنے سے روک دیا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص زہر کی پڑیا کھانے لگے تو ہم اسے روک دیں کیونکہ یہ بدیہی بات ہے کہ زہر کا نتیجہ ہلاکت ہے۔لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم کسی کو کھانے سے اس لئے روک دیں کہ ممکن ہے کہ اس کے نتیجہ میں تمہیں ہیضہ ہوجائے یا پیچش شروع ہوجائے۔ بہرحال جہاں قطعی اور یقینی نقصان ہو وہاں ہر دوست اور ہمسایہ حق رکھتا ہے کہ دوسرے کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرے۔مگر جس امر کے متعلق یقین نہ ہو اس معاملہ میں کسی دوسرے کا دخل دینا اوّل درجہ کی حماقت ہوتی ہے۔ چونکہ یہاں عبادت کا معاملہ ہے جس کے متعلق کفار کسی یقین پر قائم نہیں تھے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہاری یہ دلیل قطعی طور پر غلط ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان سے بچانے کے لئے عبادت سے روک رہے ہیں۔تم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ شاید یہ ہدایت پر نہ ہو۔شاید یہ گمراہی میں مبتلا ہو حالانکہ اس کے مقابلہ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ہدایت پر ہو اور تم گمراہی میں مبتلا ہو۔ جب یہ معاملہ ایسا ہے جس میں تمہیں صرف شبہ ہی شبہ ہے اور دوسری طرف ایک جوان اور بالغ انسان اپنی مرضی سے ایک قدم اٹھا رہا ہے تو تم اس کو روکنے والے کون ہو۔ دنیا میں یہی طریق رائج ہے کہ جب کوئی بالغ، جوان اور سمجھدار انسان کوئی ایسا کام شروع کرتا ہے جس کے دونوں پہلو ہوسکتے ہوں مفید بھی اور مضر بھی تو کوئی شخص اس کو روکا نہیں کرتا ایک شخص سفر پر جاتا ہے تو وہ نقصان بھی اٹھا سکتا ہے اور فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ ایک شخص تجارت کرتا ہے تو وہ نقصان بھی اٹھا سکتا ہے اور فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے مگر کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ سفر یا تجارت سے کسی کو اس لئے روک دے کہ میرا خیال ہے تمہیں نقصان ہوگا۔ یا چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا بمبئی جانا مفید نہیں اس لئے میں تمہیں گھر سے نکلنے نہیں دیتا۔ ہر شخص ایسے انسان کو پاگل قرار دے گا اور کہے گا کہ تمہیں کیا پتہ کہ اس سفر یا تجارت کا نتیجہ اچھا ہے یا برا۔تم زیادہ سے زیادہ ایک قیاس کر رہے ہو حالانکہ اس کے مقابلہ میں یہ بھی قیاس ہوسکتا ہے کہ اسے فائدہ ہو۔ اس لئے تمہارا روکنا جنون کی علامت ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ اس جگہ بیان کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جوان، عاقل اور سمجھدار انسان ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہی انسان کا فائدہ ہے۔ اگر وہ عبادت کرتے ہیں تو تمہارا کوئی حق نہیں کہ تم انہیں عبادت سے روکو۔ہم مانتے ہیں کہ تم عبادت کی اہمیت تسلیم نہیں کرتے۔مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کی بنیاد محض شک پر ہے۔ اس لئے خواہ تم عبادت کو اچھا نہیں سمجھتے تب بھی عقلی طور پر تمہیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں تھا کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت سے روکتے اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا صحیح نتیجہ مشکوک ہے تو تمہارے اس فعل بد کا اچھا نتیجہ کیونکر نکلے گا۔

اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ؕ﴿۱۳﴾

یا تقویٰ کا حکم دیتا ہو (تو پھر اس روکنے والے کا کیا بنے گا)

تفسیر۔ یہاں ایک زائد بات بیان کر کے پہلے استدلال کو مضبوط کر دیا گیا ہے اِنْ کَانَ عَلَی الْھُدٰٓی تک تو شبہ کے انداز میں یہ بات بیان کی تھی کہ تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت سے روکنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر تمہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں شبہ ہے تو تم خود بھی کسی یقین پر قائم نہیں۔ جب تمہارا دعویٰ بھی شک والا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کے متعلق بھی تم شک کر رہے ہو تو محض شک کی بناء پر تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت سے روکنا کسی صورت میں قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آنحضرت صلعم اور آپ کے مخالفین کے عمل میں فرق اب ایک اور بات بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے ہدایت تو دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ہم نہیں جانتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت پر ہیں یا نہیں۔ لیکن کیا تم اس کے تقویٰ کو نہیں دیکھتے۔ تقویٰ تو عمل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ جس کے متعلق یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نہیں جانتے فلاں شخص میں تقویٰ پایا جاتا ہے یا نہیں۔ اگر دل کی بات کو پہچاننا تمہارے لئے مشکل تھا اور تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدایت یافتہ ہونا پہچان نہیں سکتے تھے تو کیا تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو بھی دیکھنے سے قاصر ہو اور کیا تم اس کو دیکھ کر یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ تم غلطی پر ہو یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلطی پر ہیں۔ تم یہ تو کہہ سکتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بتوں کی بجائے اللہ تعالیٰ کی پرستش کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک غلطی ہے اس لئے ہم انہیں اس غلطی سے بچانے کے لئے عبادت سے روکتے ہیں۔ لیکن کیا تم اس تعلیم کی طرف نہیں دیکھتے جو یہ اپنی زبان سے بیان کر رہا ہے اور اس عمل کو نہیں دیکھتے جو یہ اپنے جوارح سے ظاہر کر رہا ہے اور کیا اس کی تعلیم اور اپنی تعلیم اور اس کے عمل اور اپنے عمل کو دیکھنے کے بعد تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کون ہدایت پر ہے؟ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ٹھگی کرتے ہو، فریب کرتے ہو، جھوٹ بولتے ہو، قسم قسم کی بداخلاقیوں میں ملوث ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، سچائی سے کام لیتے ہیں، غرباء کی مدد کرتے ہیں، ظلم سے روکتے ہیں، نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں، اکرام ضیف کی عادت رکھتے ہیں، امانت اور دیانت میں نہایت اعلیٰ درجہ کا نمونہ دکھاتے ہیں اور دوسروں کو اپنی

باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ تم جو دن رات ٹھگی میں مشغول رہتے ہو، جو جھوٹ اور فریب کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ تم تو سچے ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تقویٰ کے پیکر ہیں اور دوسروں کو بھی تقویٰ کی راہوں پر چلنے کا حکم دیتے ہیں وہ جھوٹے ہوں۔ غرض یہ ایک زائد دلیل اللہ تعالیٰ نے پیش کی ہے اور اس طرح پہلی دلیل کو مضبوط کر دیا ہے۔ فرماتا ہے اگر تم یہ کہو کہ ہمیں چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں شبہ ہے اس لئے ہم اسے عبادت سے روک رہے ہیں تب بھی تمہارا کوئی حق نہیں کہ ایسا کرو۔ کیونکہ اگر تمہیں یہ شبہ ہے کہ شاید محمدؐ رسول اللہ سچا نہ ہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور تم اس کو جھٹلانے میں ناراستی سے کام لے رہے ہو۔ لیکن اگر یہ زائد بات بھی اس میں پائی جاتی ہے کہ وہ نیک اعمال اور تقویٰ وعبادت کی باتوں کا دوسروں کو حکم دیتا ہے اور تم بداعمالی میں مستغرق رہتے ہو تو یہ ایک پختہ دلیل اس امر کی ہے کہ تم صداقت سے بہت دور جا رہے ہو۔

سورۃ العلق چونکہ بالکل ابتدائی سورۃ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں نتائج کو بیان نہیں کیا۔ بلکہ ہر جگہ ان کو چھوڑتا چلا گیا ہے کیونکہ ابھی مکہ والوں کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کھلی مخالفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ ابتدائی ایام تھے اور کفار کو خواہ مخواہ بھڑکانا مقصود نہیں تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے صرف اَرَءَیْتَ اَرَءَیْتَ کہہ کر اشاروں اشاروں میں ہی حقیقت حال کو بیان کر دیا ہے یعنی صرف اتنا ہی کہا ہے کہ مجھے اس شخص کا حال تو بتاؤ۔ لیکن آگے اس شخص کا نام نہیں لیا۔

اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ؕ﴿۱۴﴾

پھر (یہ بھی) بتا کہ اگر یہ روکنے والا جھٹلاتا ہے اور (سچائی سے) منہ پھیر لیتا ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰى ؕ﴿۱۵﴾

تو کیا وہ (یہ) نہیں جانتا کہ اللہ سب کچھ دیکھتا ہے۔

تفسیر۔ جس طرح اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى میں گو روئے سخن کفار کی طرف تھا مگر مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کیا گیا تھا۔ اسی طرح اس جگہ گو خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مراد کفار پر اتمام حجت کرنا ہے۔ فرماتا ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو بتاؤ جس طرح کفار کو ہماری عبادت کرنے والے بندے کے متعلق یہ احتمال تھا کہ وہ غلط عبادت نہ کر رہا ہو کیونکہ وہ اپنی قوم اور اپنے رشتہ داروں کے خلاف

بتوں کی پرستش ترک کر کے اللہ تعالیٰ کے آگے سربسجود ہورہا ہے۔ اسی طرح یہ بھی تو احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ عبادت سے روکنے والا شخص ہی سچائی کو جھٹلانے والا اور ہدایت سے منہ موڑنے والا ہو اور جس کو عبادت سے روکا جاتا ہو وہ ہدایت پر ہو اور یہ اس کی تکذیب کر رہا ہو۔ وہ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی کر رہا ہو اور یہ تَوَلّٰی اختیار کر رہا ہو۔ وہ کہہ رہا ہو کہ سچائی اختیار کرو۔ نیکی اور تقدس کا جامہ پہنو اور یہ اس سے پیٹھ پھیر رہا ہو۔ جب یہ بھی احتمال ہے تو اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی کیا اس قسم کے افعال کرنے والے کو یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے اور وہ میرے اعمال کے مطابق نتیجہ نکالنے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں نہایت لطیف بات کہی ہے فرماتا ہے وہ ہمارے بندے کو عبادت سے روکتا ہے اور پھر کہتا ہے میں کیوں نہ روکوں یہ میرا دوست تھا، میرا ہم وطن تھا اور میرا حق تھا کہ میں اُسے غلط راستہ پر چلنے سے روکوں۔ حالانکہ ہوسکتا تھا کہ وہ خود غلطی کر رہا ہو۔ اگر احتمال اور شبہ پر قائم ہوتے ہوئے اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے بندے کو روک دے تو کیا اسے یہ خیال نہیں آتا کہ آسمان پر ایک خدا اس نظارہ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر میں اپنی طاقت اور قوت کے گھمنڈ میں دوسرے کو روک رہا ہوں تو زمین و آسمان کا طاقتور بادشاہ جو میرے اس ظلم کو دیکھ رہا ہے وہ بھی طاقت رکھتا ہے کہ مجھے اس ظلم کی سزا دے۔ اگر ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت میں دخل دیں اور کہیں ہم نے اس لئے دخل دیا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں یہ غلطی کر رہا ہے تو اگر اس کے مقابلہ میں تم غلطی کر رہے ہو تو یقیناً اس اصول کے مطابق خدا تعالیٰ کو بھی حق حاصل ہوگا کہ وہ تمہیں پکڑے۔ آج تم ہمارے بندے کو عبادت سے روک رہے ہو اور کہتے ہو کہ ہم سمجھتے ہیں یہ غلطی کر رہا ہے اگر تم ایک فرضی قیاس سے کام لینے کے بعد ہمارے بندے کو روکنے کا حق رکھتے ہو تو پھر یاد رکھو اگر تمہاری تکذیب اور تَوَلّٰی پر اللہ تعالیٰ نے بھی تم کو پکڑ لیا تو شکوہ نہ کرنا۔ اگر تمہیں جہالت اور قیاس سے دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کو علم اور حقیقت حال سے واقف ہونے کے نتیجہ میں تمہارے معاملات میں دخل دینے کا بدرجۂ اولیٰ حق حاصل ہے۔ پھر یہ شکوہ نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔ پس اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی میں کفار کے انجام کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک دن یہ لوگ خدائی گرفت میں آنے والے ہیں۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۙ﴿۱۶﴾

یوں نہیں (ہوگا جیسے وہ چاہتا ہے بلکہ) اگر وہ (ان کاموں سے) باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کے گھسیٹیں گے۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ﴿۱۷﴾

ایک جھوٹی پیشانی (اور) خطا کار پیشانی (کے)۔

حلّ لُغات۔ **نَسْفَعُ** نَسْفَعُ: سَفَعَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور سَفْعٌ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو پکڑ کر سختی سے گھسیٹنا اور نَاصِيَة سر کے اگلے حصہ یا سر کے اگلے بالوں کو کہا جاتا ہے (اقرب)۔

تفسیر۔ فرماتا ہے کَلَّا ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں تم جو یہ خیال کرتے ہو کہ ہمارے اس بندے کو کمزور اور ناتوان سمجھ کر اور بے یارومددگار خیال کر کے عبادت سے روک دو گے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ تمہارے سارے خیالات باطل ثابت ہوں گے اور تمہاری اپنی طاقت اور قوت کے متعلق گھمنڈ سب جاتا رہے گا۔ چنانچہ آج ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ جو ملک کا بادشاہ کہلاتا ہے جو لیڈر اور سردار قوم کہلاتا ہے اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئے گا تو ہم اسے سختی سے گھسیٹ کر اس کا انتقام لیں گے۔ سَفْعٌ کے معنے عربی زبان میں کسی چیز کو پکڑ کر زور سے گھسیٹتے لئے جانے کے ہوتے ہیں۔ کفار میں بھی یہ عادت تھی کہ جب مسلمان غلام نماز کے لئے جاتے یا اپنے کسی اور کام کے لئے باہر نکلتے تو وہ انہیں کبھی ٹانگوں سے پکڑ کر اور کبھی سر کے بالوں سے پکڑ کر نہایت سختی کے ساتھ گھسیٹنا شروع کر دیتے اور کہتے کہ تم بتوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیوں کرتے ہو۔

غلاموں پر کفارِ مکہ کی سختی ایک غلام صحابی نے جو لمبے عرصہ تک کفار کے مظالم کا تختۂ مشق بنے رہے تھے ایک دفعہ اسلام کی فتوحات کے زمانہ میں اپنی قمیص اتاری تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کی پیٹھ کا چمڑا ایسا ہے جیسے بھینسے کا چمڑا ہوتا ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ غالباً یہ کوئی مرض ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس صحابی سے پوچھا کہ آپ کو یہ کیا بیماری ہے کہ آپ کی پیٹھ کا چمڑا بالکل ایسا ہے جیسے کسی جانور کا چمڑا ہوتا ہے۔ وہ صحابی ہنس پڑے اور کہا تم کیا جانو کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ بیماری نہیں بلکہ ان مظالم کا نشان ہے جو کفار مکہ کی طرف سے ہم پر ڈھائے جاتے تھے۔ پھر انہوں نے سنایا کہ جب ہم نے اسلام قبول کیا تو چونکہ ہم غلام تھے اور مالک کو اس ملک کے قانون کے مطابق ہم پر ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے۔ جب وہ دیکھتے کہ ہم شرک نہیں کرتے تو بعض دفعہ وہ ہمارے پاؤں میں رسیاں

باندھ کر ہمیں گلیوں میں گھسیٹنا شروع کر دیتے اور بعض دفعہ رسیاں باندھنے کی بجائے سر کے بالوں کو پکڑ کر گھسیٹنے لگ جاتے۔ گلیوں میں پتھر پڑے ہوئے ہوتے تھے مگر وہ اس بات کی کوئی پروا نہ کرتے اور ہمیں بے دردی کے ساتھ ان پتھروں پر گھسیٹتے چلے جاتے یہاں تک کہ ہمارے چمڑے چھل جاتے اور چونکہ یہ مظالم ان کی طرف سے متواتر ہوئے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے چمڑے اپنی شکل کھو بیٹھے اور اس شکل میں آ گئے جس شکل میں آج تم دیکھ رہے ہو (الطبقات الکبریٰ باب فی ذکر خباب بن الارت)۔ انہی واقعات کی طرف جو مکہ میں پیش آنے والے تھے اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت اشارہ کر دیا اور بتا دیا کہ ابھی تو یہ لوگ صرف عبادت سے روک رہے ہیں پھر وہ بھی وقت آنے والا ہے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے مکہ کی گلیوں میں گھسیٹے جائیں گے اور ان کی کمریں چھیلی جائیں گی اور چونکہ مسلمانوں کے ساتھ یہ واقعات پیش آنے والے ہیں اور کفار مکہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر ان کو قسم قسم کے مصائب میں مبتلا کرنے والے ہیں اس لئے ہم کہتے ہیں کہ تم آج اس شخص کو جو ان میں خاص اثر رکھتا ہے اور جو اپنی طاقت اور قوت کا دعویدار ہے یہ سنا دو کہ اگر ان کو گھسیٹنا آتا ہے تو ہم کو بھی گھسیٹنا آتا ہے ہم ان کے سر کے بالوں سے نہایت سختی کے ساتھ گھسیٹیں گے۔ اگر یہ اس ناصیہ کو گھسیٹا کرتے تھے جو خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتی تھی تو ہم اس ناصیہ کو کیوں نہیں گھسیٹیں گے جو جھوٹی اور خطا کار ہے اگر خدائے واحد کے آگے عبادت کرنے والی ناصیہ گھسیٹی جا سکتی ہے تو وہ ناصیہ جو بتوں کے آگے جھکتی ہے وہ گھسیٹے جانے کی کیوں مستحق نہیں۔

نَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ کی پیشگوئی کا وقوع ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابوجہل سے ایسا ہی سلوک کیا۔ چنانچہ بدر کی جنگ جب ختم ہوئی اور دشمن مارا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسی حکم کے مطابق کہ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ابوجہل کو سر کے بالوں سے گھسیٹ کر اس گڑھے میں گرایا گیا جو اس کے لئے قبر کے طور پر تیار کیا گیا تھا (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ)۔ کہنے والا کہے گا یہ وحشت تھی کہ مردہ کو بالوں سے گھسیٹا گیا مگر یہ وحشت نہیں تھی بلکہ بدلہ تھا ان مظالم کا جو مسلمانوں پر ڈھائے جاتے تھے اور بدلہ بھی نہایت معمولی۔ کیونکہ اس نے تو زندوں کو گھسیٹا تھا جب انہیں تکلیف ہوتی تھی۔ مگر ابوجہل کو مردہ ہونے کی حالت میں گھسیٹا گیا جبکہ اسے کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ ایک انگریز جرنیل میرے پاس آیا ہے اور وہ مجھ سے کہتا ہے کہ آپ کا کیا فتویٰ ہے آیا قتل کے بدلہ میں قتل ہی ہے یا قاتل کو کوئی اور سزا بھی دی جا سکتی ہے؟ پھر اس نے کہا ہمارے بعض آدمیوں کو جب سرحد پر مارا جاتا ہے تو ان کی لاشوں کو چونہ میں ڈال کر جلا دیا جاتا ہے یا ان کو مختلف قسم کے عذاب

دے دے کر مارا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں قاتل کو صرف قتل کی سزا ہی دی جائے گی یا تعذیب کی سزا بھی اسے ملے گی؟ میں نے اسے جواب میں کہا قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:۴۱) یعنی بدی کی سزا برے فعل کے مطابق دی جانی چاہیے۔ پس میرا فتویٰ یہی ہے کہ قتل کے بدلہ میں قتل اور تعذیب کے بدلہ میں تعذیب۔ گو عام حالات میں قتل کے بدلہ میں قتل ہی کیا جائے گا لیکن اگر کسی وقت مصلحت کے ماتحت لوگوں کو تعذیب اور شرارت سے روکنے کے لئے یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ قتل کے بدلہ میں قتل ہوگا اور تعذیب کے بدلہ میں تعذیب تو یہ بالکل جائز ہوگا۔

بے شک وہ لوگ جنہوں نے اس زمانہ کے حالات پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ بڑی سختی کی گئی کہ ایک مردہ کو بالوں سے گھسیٹ کر گڑھے میں پھینکا گیا۔ مگر انہیں بھول جاتا ہے کہ یہاں تو کسی مردہ کو صرف ایک دفعہ گھسیٹا گیا ہے اور وہ لوگ سالہا سال زندوں کو پتھروں پر گھسیٹا کرتے تھے اور ابھی ان کے زخم تازہ ہی ہوتے تھے کہ دوسرے دن پھر ان کو پتھروں پر گھسیٹنا شروع کر دیا جاتا اور پھر وہ صرف پتھروں پر گھسیٹتے ہی نہیں تھے بلکہ بسا اوقات ان کے سینہ پر بڑے بڑے وزنی پتھر رکھ دیتے، ان پر کھڑے ہو کر خود ناچنا کودنا شروع کر دیتے اور کہتے کہو کہ ہم لات اور عزّیٰ کو اپنا معبود مانتے ہیں۔ یہی وہ چیز تھی جس کی بناء پر ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کی خاص طور پر تعریف کی اور لوگوں سے فرمایا کہ بلال جب اذان دیتا ہے اور اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی بجائے اَسْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بلال کے اس س پر خاص طور پر خوش ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ میں آئے اور بلالؓ نے اذان دی تو چونکہ مدینہ کے لوگ بلالؓ سے ناواقف تھے جب انہوں نے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی بجائے اَسْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا تو لوگ ہنسنے لگ گئے۔ بلالؓ حبشی تھے اور اس وجہ سے وہ تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے مجلس میں فرمایا لوگ بلال کے سین پر ہنستے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر اس سین کو سن کر خوش ہوتا ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہی ہے کہ مکہ میں بلال کے سینہ پر جب بڑے بڑے پتھر رکھ کر کہا جاتا کہ کہو لات اور مناۃ اور عزیٰ سچے معبود ہیں تو بلال خاموش نہ رہتے بلکہ پتھروں کے نیچے سخت تکلیف کی حالت میں بھی یہی کہتے کہ اَسْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ چونکہ اس وقت وہ سین کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھا کرتے تھے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بلال اَسْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ عرش پر خوش ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بلال سے وہ سین سنا ہوا تھا جو پتھروں کے نیچے اور مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے ہوئے اس کی زبان سے نکلا

کرتا تھا۔ پس خالی بلالؓ کی اذان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہوتا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کو بلالؓ کا وہ واقعہ یاد تھا جب اسے پتھروں کے نیچے کچلا جاتا مگر وہ پھر بھی یہی کہتا کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں تو آج کا سین نظر آتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو وہ سین یاد ہے جو پتھروں کے نیچے بلالؓ کی زبان سے نکلا کرتا تھا۔ اس لئے بلالؓ جب اذان دیتا اور اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس آواز کو سن کر عرش پر خوش ہو جاتا ہے۔

ان حالات کو اگر مدنظر رکھا جائے تو پھر کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ ابوجہل کے سر کے بالوں سے گھسیٹ کر گڑھے میں ڈالنا ظلم تھا۔ میں سمجھتا ہوں وہ مؤرخ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے نعوذ باللہ وحشت سے کام لیا وہ کبھی حقیقت حال پر غور نہیں کرتے۔ اگر وہ مسلمانوں کی جگہ اپنے باپ یا اپنی بیوی یا اپنے بچہ کو رکھیں اور عالم تصور میں ان مظالم کا نقشہ اپنے ذہنوں میں لائیں جو مسلمانوں پر ڈھائے جاتے تھے تو اس کے بعد یقیناً وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کو ظلم قرار نہ دیں بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نہایت ہی نرم سلوک کیا ہے۔ موجودہ جنگ یورپ کو ہی دیکھ لو کیا کیا مظالم ہیں جو ایک دوسرے پر ڈھائے گئے ہیں اور کس طرح دشمن سے انتقام لینے کے لئے بربریت کے نظارے پیش کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اس زمانہ کے لوگ اپنے آپ کو تہذیب وتمدن کے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے تصور کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں نے تو کوئی ظلم بھی نہیں کیا۔ صرف بدر کے موقعہ پر چند ایسے مردوں کو گھسیٹ کر گڑھے میں ڈال دیا جو مسلمانوں کو سالہا سال تک تپتی ریت اور سخت پتھروں پر گھسیٹتے اور گھسٹواتے رہے تھے۔ پس فرمایا جس طرح یہ لوگ ہمارے بندوں کو ان کے بال پکڑ پکڑ کر گھسیٹتے ہیں اسی طرح ہم بھی ان کے بالوں سے ان کو گھسیٹیں گے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ ہم ظلماً ایسا کریں گے۔ کیونکہ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ نَاصِیَةٍ کَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ایسی نَاصِیَةٍ گھسیٹی جائے گی جو کَاذِبَةٍ جھوٹی تھی خَاطِئَةٍ خطا کار تھی اور مجرم کو سزا دینا ظلم نہیں کہ تم یہ کہہ سکو کہ انہیں کیوں گھسیٹا جائے گا۔ گھسیٹا اس لئے جائے گا کہ وہ مجرم اور خطا کار ہیں اور دنیا کا کوئی قانون مجرم کو سزا دینا ظلم قرار نہیں دیتا۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿۱۸﴾

پس (کافر کو) چاہیے کہ وہ اپنی مجلس کو بلائے۔

حلّ لُغات۔ اَلنَّادِیْ اَلنَّادِیْ عربی زبان میں اس مجلس کو کہتے ہیں جس میں دن کے وقت لوگ بیٹھ کر

مختلف امور کے متعلق باہم مشورہ کرتے ہیں (اقرب) جس طرح مائدہ اس دسترخوان کو کہا جاتا ہے جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ اسی طرح اَلنَّادِی مجلس کو کہا جاتا ہے مگر اس مجلس کو جس میں آدمی بیٹھے ہوئے ہوں خالی کمرہ کو نہیں کہتے۔ (اقرب)

تفسیر۔ کفارمکہ آپس میں کہا کرتے تھے آج بڑا مشورہ ہوا۔ آج محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اوران کے ساتھیوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر دیا گیا ہے آج ان کو مارنے پیٹنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آج ان کے قتل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے لوگ جس مجلس کے حوالے دیا کریں گے اور کہیں گے کہ آج یہ فیصلہ ہوا۔ کل وہ فیصلہ ہوا۔ ہم اسی مجلس کے متعلق اس دن کفار سے کہیں گے کہ اب کیوں کسی کو اپنی مدد کے لئے نہیں بلاتے۔ جاؤ اور اپنے اُن ساتھیوں کو بلاؤ جن کے ساتھ مل کر تم مسلمانوں کے خلاف دن رات منصوبے کیا کرتے تھے اور دیکھو کہ اس موقعہ پر وہ تمہارے کام آتے ہیں یا نہیں تم نے مسلمانوں کے خلاف تو منصوبے کر لئے اب تم ہماری گرفت میں آچکے ہو۔ اگر تم میں طاقت ہے تو اب اپنے مشیروں کو بلاؤ اور ان سے کہو کہ وہ تمہاری مدد کریں۔

سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَۃَ ﴿۱۹﴾

ہم بھی اپنی پولیس کو بلائیں گے۔

حلّ لُغات۔ اَلزَّبَانِیَۃ اَلزَّبَانِیَۃ: زَبَنَ سے ہے اور زَبَنَہٗ (یَزْبَنُ زَبَنًا) کے معنے ہوتے ہیں دَفَعَہٗ اس کو دور کر دیا۔ صَدَمَہٗ اس سے ٹکرایا (اقرب) اسی طرح لکھا ہے اَلزَّبَانِیَۃُ عِنْدَ الْعَرَبِ اَلشُّرَطُ یعنی زَبَانِیَۃ کے معنے عربی زبان میں پولیس کے ہوتے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ زَبَانِیَۃ سے مراد صحابہ کرام فرماتا ہے وہ بھی اپنے ساتھیوں کو بلاتے اور مسلمانوں کے خلاف مجالس منعقد کیا کرتے تھے اس کے مقابل میں ہم بھی اپنی پولیس کو بلانے والے ہیں۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ زبانیہ سے مراد دوزخ کے فرشتے ہیں (فتح البیان زیر آیت سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَۃَ) مگر میرے نزدیک یہ دوزخ کے نہیں بلکہ جنت کے فرشتے ہیں اور اس سے مراد وہ صحابہؓ ہیں جنہوں نے بدر کی جنگ میں کفار کو ان کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور انہیں ان کے کیفر کردار تک پہنچایا انہی صحابہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ مظلوم، کمزور اور بے بس مسلمان جنہیں تم نے اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنایا ہوا ہے ہماری پولیس کے سپاہی ہیں۔ پولیس والا کبھی اکیلا پکڑا جاتا ہے اور چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ آجاتا ہے تو وہ اسے خوب مارتے پیٹتے ہیں مگر جب گارد آتی ہے تو اس

کا مقابلہ کرنے کی اس میں طاقت نہیں رہتی۔اسی طرح تم آج ایک ایک دو دو مسلمانوں کو پکڑتے اوران کو مصائب وآلام میں مبتلا رکھتے ہواور خیال کرتے ہو کہ ہمارا ان لوگوں نے کیا بگاڑ لینا ہے۔ہم طاقتور ہیں اور یہ کمزور۔ہم جتھے والے اور یہ انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد۔لیکن تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ یہ کمزور اور اکیلے نظر آنے والے ہماری پولیس کے آدمی ہیں۔جب تمہارے مظالم کا انتقام لینے کے لئے ہماری گارد آئی تو اس وقت دنیا دیکھے گی کہ تمہارا کیسا عبرتناک انجام ہوتا ہے۔جب ہماری گارد آئی تو اس وقت تم میں سے کسی ایک میں بھی یہ طاقت نہیں ہوگی کہ اپنی انگلی تک مقابلہ میں اٹھا سکے۔چنانچہ دیکھ لو مکہ کے کتنے بڑے بڑے سردار تھے مگر مسلمانوں کی شوکت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسا ذلیل کر دیا۔

حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک دفعہ مکہ میں آئے تو وہی غلام جن کو سر کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر لوگ گھسیٹا کرتے تھے ایک ایک کر کے حضرت عمرؓ کی ملاقات کے لئے آنے شروع ہوئے۔وہ عید کا دن تھا اور ان غلاموں کے آنے سے پہلے مکہ کے بڑے بڑے رؤساء کے بیٹے آپ کو سلام کرنے کے لئے حاضر ہو چکے تھے۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ بلالؓ آئے۔وہی بلال جو غلام رہ چکے تھے جن کو لوگ مارا پیٹا کرتے تھے جن کو کھردرے اور نوکیلے پتھروں پر ننگے جسم سے گھسیٹا کرتے تھے جن کے سینہ پر بڑے بڑے وزنی پتھر رکھ کر کہا کرتے تھے کہ کہو میں لات اور عزیٰ کی پرستش کروں گا مگر وہ یہی کہتے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔حضرت عمرؓ نے جب بلال کو دیکھا تو ان رؤساء سے فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور بلال کو بیٹھنے کی جگہ دو۔ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ ایک اور غلام صحابی آ گئے۔حضرت عمرؓ نے پھر ان رؤساء سے فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اوران کو بیٹھنے دو۔تھوڑی دیر گذری تو ایک اور غلام صحابی آ گئے۔حضرت عمرؓ نے حسب معمول ان رؤساء سے پھر فرمایا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اوران کو بیٹھنے کی جگہ دو۔ اتفاق کی بات ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کرنا تھا اس لئے یکے بعد دیگرے آٹھ دس غلام آ گئے اور ہر دفعہ حضرت عمرؓ ان رؤساء سے یہی کہتے چلے گئے کہ پیچھے ہٹ جاؤ اوران کو بیٹھنے کی جگہ دو۔ان دنوں بڑے بڑے ہال نہیں بنائے جاتے تھے بلکہ معمولی کوٹھڑیاں ہوتی تھیں جن میں زیادہ آدمی نہیں بیٹھ سکتے تھے۔جب تمام غلام صحابہؓ کمرے میں بھر گئے تو مجبوراً ان رؤسا کو جوتیوں والی جگہ میں بیٹھنا پڑا۔یہ ذلت ان کے لئے نا قابل برداشت ہوگئی وہ اسی وقت اٹھے اور باہر آ کر ایک دوسرے سے کہنے لگے دیکھا آج ہمیں کیسا ذلیل کیا گیا ہے یہ غلام جو ہماری خدمتیں کیا کرتے تھے ان کو تو اوپر بٹھایا گیا ہے مگر ہمیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا گیا یہاں تک کہ ہٹتے ہٹتے ہم جوتیوں والی جگہ پر جا پہنچے اور سب لوگوں کی نگاہ میں ذلیل اور رسوا ہوئے۔ایک شخص جو ان میں سے زیادہ سمجھدار تھا جب اس

نے یہ باتیں سنی تو کہا یہ تو ٹھیک ہے کہ ہماری رسوائی ہوئی لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کس کی کرتوتوں سے ہوا؟ ہمارے باپ بھائی جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو مارا پیٹا کرتے تھے اس وقت یہ غلام آپ پر اپنی جانیں فدا کیا کرتے تھے۔ آج چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت ہے اس لئے تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ ان کو ماننے والے کن لوگوں کو عزت دیں گے آیا تم کو جو مارا کرتے تھے یا ان غلاموں کو جو اپنی جانیں اسلام کے لئے قربان کیا کرتے تھے۔ اگر انہی کو عزت ملنی چاہیے تو پھر تمہیں آج کے سلوک پر شکوہ کیوں پیدا ہوا؟ تمہارے اپنے باپ دادا کے اعمال کا یہ نتیجہ ہے کہ تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں ہو رہا جو غلاموں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور کہنے لگے ہم حقیقت تو سمجھ گئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس رسوائی کا کوئی علاج نہیں؟ بے شک ہمارے باپ دادا سے بڑا قصور ہوا مگر آخر اس قصور کا کوئی علاج بھی ہونا چاہیے جس سے یہ ذلت کا داغ ہماری پیشانی پر سے دُھل سکے۔ اس پر سب نے فیصلہ کیا کہ ہماری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی۔ چلو حضرت عمرؓ سے ہی پوچھیں کہ اس رسوائی کا کیا علاج ہے؟ جب وہ دوبارہ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اس وقت تک مجلس برخاست ہو چکی تھی اور صحابہؓ سب جا چکے تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آج ہمیں اس مجلس میں آ کر جو دکھ پہنچا ہے اس کے متعلق ہم آپ سے مشورہ کرنے آئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا دیکھو برا نہ منانا۔ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہمیشہ آگے بیٹھا کرتے تھے اس لئے میں بھی مجبور تھا کہ انہیں آگے بٹھاتا۔ بے شک تمہیں میرے اس فعل سے تکلیف ہوئی ہوگی مگر میں مجبور تھا۔ انہوں نے کہا ہم آپ کی اس مجبوری کو سمجھتے ہیں ہم صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اس ذلت کا کوئی علاج ہے؟ اور کیا کوئی پانی ایسا ہے جس سے یہ داغ دھویا جا سکے؟ حضرت عمرؓ جو ان نوجوانوں کے باپ دادا کی شان و شوکت اور ان کے رعب اور دبدبہ کو دیکھ چکے تھے جب انہوں نے یہ بات سنی تو آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے کہاں سے کہاں آ گرے ہیں اور آپ پر رقت اس قدر غالب آئی کہ آپ ان کی بات کا جواب تک نہ دے سکے صرف ہاتھ اٹھا کر شام کی طرف جہاں ان دنوں قیصر کی فوجوں سے لڑائی ہو رہی تھی اشارہ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اب ذلت کا یہ داغ اسی طرح دُھل سکتا ہے کہ اس لڑائی میں شامل ہو کر اپنی جان دے دو۔ چنانچہ وہ اسی وقت باہر نکلے اپنے اونٹوں پر سوار ہوئے اور شام کی طرف روانہ ہو گئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ ان میں سے ایک شخص بھی زندہ واپس نہیں آیا۔ اس طرح انہوں نے اپنے خون کے ساتھ اس ذلت کے داغ کو مٹایا جو ان کی پیشانی پر اپنے باپ دادا کے افعال کی وجہ سے لگ گیا تھا۔ (مناقب امیر المؤمنین عمر بن الخطاب لابن جوزی صفحة ۹۸) پس فرماتا ہے وہ

بے شک اپنی مجلس کے آدمیوں کو بلالیں ہم بھی اپنی پولیس کے آدمیوں کو بلائیں گے اور ان سے چوروں اور ڈاکوؤں والا سلوک کریں گے۔

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ ﴿۲۰﴾

یوں نہیں (ہوگا جس طرح دشمن چاہتا ہے) (اے نبی اور اس کے متبع) تو اس (کافر) کی اطاعت نہ کر اور اپنے رب کے حضور میں (ضرور) سجدہ کر اور اس سجدہ کے نتیجہ میں اپنے رب کے قریب تر ہو جا۔

تفسیر۔ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ۔ یعنی خبردار جس طرح تو خیال کرتا ہے اس طرح نہیں ہوگا۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے تو دشمن کی بات نہ مانیو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے کبھی نہ رکیو بلکہ وَاسْجُدْ یہ لوگ تجھے جتنا زیادہ روکیں تو اتنے ہی زیادہ زور کے ساتھ ہمارے حضور سجدہ میں گر جا۔ نتیجہ کیا ہوگا تو سجدہ میں جائے گا تو یہ تجھے ماریں گے مگر اس کے نتیجہ میں تو خدا تعالیٰ کے اور بھی زیادہ قریب ہو جائے گا۔

ایک سجدہ وہ ہوتا ہے جو امن کی حالت میں کیا جاتا ہے اور ایک سجدہ وہ ہوتا ہے جو لڑائی اور بدامنی کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ وہ سجدہ جو ایسی حالت میں کیا جائے جب انسان کو عبادت سے روکا جاتا ہو اور اسے اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہونے کی وجہ سے قسم قسم کے مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہو وہ سجدہ انسان کو آناً فاناً کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔ ایک سجدہ وہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھا ہوتا ہے، اٹھتا ہے وضو کرتا ہے اور مصلّے پر کھڑا ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر جاتا ہے۔ لیکن ایک سجدہ وہ ہوتا ہے جب محض سجدہ کی وجہ سے انسان کو مارا اور پیٹا جاتا ہے یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے حضور جو قدر و قیمت رکھتا ہے وہ سجدہ نہیں رکھتا جو امن کی حالت میں کیا جاتا ہے۔

آج سے سو سال پہلے بھی اسلام کی تبلیغ کرنے والے مسلمان دنیا میں موجود تھے۔ آج سے سو سال پہلے بھی اسلام کے لئے روپیہ خرچ کرنے والے لوگ دنیا میں موجود تھے۔ آج سے سو سال پہلے بھی اسلام کے ہمدرد دنیا میں موجود تھے مگر ان کی تو تعریف کی جاتی تھی اور ہماری مذمت کی جاتی ہے۔ ان کے متعلق تو یہ کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ اسلام کے بڑے ہمدرد ہیں۔ مگر ہمارے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہم اسلام کے بہت بڑے دشمن ہیں حالانکہ ہمارا جرم کیا ہے؟ ہماری جماعت کے لوگ وہ ہیں جو اشاعت اسلام کے لئے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر روپیہ بھجواتے ہیں۔ خدائے واحد کا نام بلند کرنے کے لئے آٹھ آٹھ دس دس سال تک ممالک غیر میں اپنے بیوی بچوں سے جدا رہتے ہیں۔ جہاں بھی اسلام اور کفر کا ٹکراؤ ہو وہاں ایک بہادر پہلوان کی طرح پہنچ کر کفر کے مقابلہ میں اپنا سینہ تان کر

کھڑے ہوجاتے ہیں۔اسی طرح نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، قرآن بھی پڑھتے ہیں، کلمۂ طیبہ پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اسلام کے ہر حکم پر بدل وجان عمل کرنا جزوِایمان سمجھتے ہیں۔مگر ہمیں تو گالیاں دی جاتی ہیں اور پہلے لوگوں کی تعریفیں کی جاتی ہیں حالانکہ ان کا کام ہمارے کام کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔

غرض جس قسم کی قربانی پر پہلے تعریفیں ہوتی تھیں اسی قسم کی قربانی پر آج ہمیں ماریں پڑتی ہیں۔اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے سجدے اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کے سجدے میں فرق ہے۔ بعد میں سجدہ کرنے والے وہ تھے جن کی چاروں طرف سے تعریفیں ہوتی تھیں اور کہا جاتا کہ دیکھو فلاں شخص کتنا بزرگ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کتنے سوز وگداز کے ساتھ عبادت کرتا ہے۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس سجدہ کی کیا قیمت تھی۔اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جس کا تاریخ میں ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں پڑے ہوئے تھے کہ کفار مکہ اونٹ کی ایک بڑی سی اوجھری اٹھالائے اور آپ کے سر پر پھینک کر ہنسنے لگ گئے۔اس کا بوجھ اس قدر زیادہ تھا کہ آپ سجدہ میں سے اپنا سر نہ اٹھا سکتے تھے۔آخر حضرت فاطمہؓ کو کسی طرح اس بات کا علم ہوگیا وہ اس وقت چھوٹی بچی تھیں دوڑتی ہوئی آئیں اور انہوں نے وہ غلاظت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر سے دور کی (السیرة الحلبیة باب استخفائه صلی الله علیه وسلم وأصحابه في دار الأرقم بن أبي الأرقم)۔ یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں جو قدر و قیمت رکھتا ہے وہ دوسرے سجدے کہاں رکھ سکتے ہیں۔ایسا ایک سجدہ بھی خدا تعالیٰ کے قرب کی انتہائی منازل انسان کو اک آن میں طے کرادیتا ہے جبکہ امن کے زمانہ کے ہزاروں ہزار سجدے بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کے قرب کے دروازہ تک نہیں پہنچاتے۔پس فرمایا لَا تُطِعۡهُ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی! تو ان لوگوں کی بات مت مان۔یہ تجھے عبادت سے جتنا زیادہ روکیں تو اتنے ہی زور کے ساتھ ہمارے حضور سجدہ میں گر جا کیونکہ اس روک کے باوجود تیری طرف سے جو سجدہ ہوگا وہ تجھے سیدھا اللہ تعالیٰ تک پہنچادے گا۔

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ القدر۔ یہ سورۃ مکّی ہے۔

وَھِیَ خَمْسُ اٰیَاتٍ دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَ فِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اوراس کی بسم اللہ کے سوا پانچ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ القدر مکی ہے سورۃ القدر مکی سورۃ ہے (فتح البیان زیر سورۃ القدر) لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مدنی ہے چنانچہ واحدی کا قول ہے کہ ھِیَ اَوَّلُ سُوْرَۃٍ نَزَلَتْ بِالْمَدِیْنَۃِ یہ پہلی سورۃ ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی (روح المعانی زیر سورۃ القدر)۔

مفسرین کے نزدیک لفظ جمہور کا خلاف اصول استعمال اس سورۃ پر بحث کرتے ہوئے مفسرین نے جمہور کی عجیب تعریف کی ہے بعض کہتے ہیں عِنْدَ الْجُمْھُوْرِ مَکِّیَّۃٌ اور بعض کہتے ہیں عِنْدَ الْجُمْھُوْرِ مَدَنِیَّۃٌ۔ معلوم نہیں وہ کون سے جمہور ہیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے کہ جمہور کے نزدیک یہ مکی بھی ہے اور جمہور کے نزدیک یہ مدنی بھی ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ مفسرین یہ تو کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یہ سورۃ مدنی ہے مگر کسی صحابی کا نام نہیں لیتے کہ فلاں فلاں نے اس سورۃ کو مدنی قرار دیا ہے آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہی تھے جو اس کو مکی یا مدنی قرار دے سکتے تھے پس جب ان کے نزدیک جمہور نے اسے مدنی قرار دیا ہے تو چاہیے تھا کہ وہ کچھ صحابہ کا ذکر کرتے اور کہتے کہ فلاں فلاں صحابی نے اسے مدنی قرار دیا ہے مگر باوجود یہ لکھنے کے کہ عِنْدَ الْجُمْھُوْرِ مَدَنِیَّۃٌ پھر اس قسم کی روایتوں کا بھی تفاسیر میں ذکر آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ کے نزدیک یہ مکی ہے (فتح البیان زیر سورۃ القدر)۔ جب صحابہؓ اسے مکی قرار دیتے ہیں تو پھر یہ لکھنے کے کیا معنے ہوئے کہ عِنْدَ الْجُمْھُوْرِ مَدَنِیَّۃٌ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جمہور کا محاورہ جو ہماری کتب میں استعمال کیا جاتا ہے کیسا خلافِ اصول ہے کہ ہر لکھنے والا جب اپنی رائے کے مطابق دو چار لوگوں کی آراء دیکھ لیتا ہے تو فوراً کہنا شروع کر دیتا ہے کہ جمہور کے نزدیک فلاں بات یوں ہے حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ ہر صحابی اس امر کا ذکر نہیں کیا کرتا کہ فلاں سورۃ مکی ہے یا مدنی۔ صرف چند صحابہ ایسے امور کا ذکر کیا کرتے ہیں اور جب انہوں نے کھلے لفظوں میں اسے مکی قرار

دیا ہے اور مفسرین خود بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر نہ معلوم ان کو کیا خیال آ گیا کہ صحابہؓ کی اس قطعی رائے کے باوجود انہوں نے اسے مدنی قرار دے دیا۔ مستشرقین جن میں سے بعض تو دیانتدارانہ طور پر حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض پادری یا پادری نما جان بوجھ کر یا تعصب سے واقعات کو بدل دیتے ہیں۔ انہوں نے بھی اسے مکی ہی قرار دیا ہے۔ نولڈ کے مشہور مستشرق بھی اسے سورۂ ضُحیٰ کے معاً بعد کی قرار دیتا ہے۔

(A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry vol:4 p:263)

بعض احادیث میں اس کے نزول کی عجیب وجہ بیان کی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ چار نبیوں کے متعلق یہود میں یہ خیال تھا کہ انہوں نے اسّی ۸۰ سال بلا ناغہ بغیر گناہ کے ارتکاب کے خدا تعالیٰ کی عبادت کی ہے اور وہ چار نبی یہ ہیں ایوب، زکریا، حزقیل، یوشع، جب یہودیوں کا یہ قول صحابہؓ نے سنا تو ان کو رشک پیدا ہوا کہ چار آدمی ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اسّی سال تک بغیر کسی غلطی کے ارتکاب کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہے اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ یعنی تم تو اسّی سال کی عبادت پر رشک کرتے ہو اور اسلام کی یہ کیفیت ہے کہ اگر کسی کو لیلۃ القدر میں اللہ تعالیٰ کی عبادت نصیب ہو جائے تو اس ایک رات کی عبادت ہی ہزار مہینوں یعنی تراسی ۸۳ سال کی عبادت سے بڑھ جاتی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ روایت قابلِ قبول نہیں اور اسے تسلیم کرنا عقلی طور پر ناممکن ہے کیونکہ اگر واقعہ میں کسی کو اسّی ۸۰ سال عبادت کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو اس پر کسی شخص کو محض ایک رات میں عبادت کرنے کی وجہ سے کس طرح فضیلت دی جا سکتی ہے۔ اگر کہو کہ ایک رات کی عبادت اتنے سوز و گداز سے لبریز ہوگی، اتنی محبت اور اللہ تعالیٰ کے اتنے عشق کو ظاہر کرنے والی ہوگی کہ باوجود ایک رات کی عبادت ہونے کے اپنی شان اور عظمت میں اسّی سال کی عبادتوں سے بڑھ جائے گی تو یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے خاص طور پر بیان کیا جاتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک رات کا بھی سوال نہیں اگر ایک گھنٹہ میں بھی کوئی شخص اپنے اخلاص اور اپنی محبت کا کوئی ایسا ثبوت دے دیتا ہے جو دوسرے کی اسّی ۸۰ سالہ زندگی میں بھی نہیں ملتا تو یقیناً اس کے ایک گھنٹے کا اخلاص دوسرے کی اسّی ۸۰ سالہ کوششوں کے نتائج سے بڑھ جائے گا بلکہ میں کہتا ہوں ایک گھنٹے کا بھی سوال نہیں اگر کسی پر ایک منٹ بھی ایسا آ جائے تو اس کا وہ ایک منٹ دوسرے شخص کی اسّی ۸۰ یا نوّے ۹۰ سالہ عبادت سے بڑھ جائے گا۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر ایک وقت آیا جبکہ اسّی سال کی عمر کے بعد ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا اور پھر جیسا کہ بائبل اور قرآن کریم دونوں سے ثابت ہے جب وہ بڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ اپنے اس بیٹے کو خدا کی راہ میں ذبح کر دو۔ (الصّٰفّٰت: ۱۰۳۔ پیدائش باب ۲۲ آیت ۱ تا ۱۴)

گو میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ تھی کہ اپنے بیٹے کو اس وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ جہاں نہ کھانے کو کچھ ملتا ہے نہ پینے کو۔ اور اس طرح ظاہری رنگ میں اپنی طرف سے اس پر موت وارد کردو۔ مگر چونکہ اس وقت تک انسانی قربانی کا بھی رواج تھا اللہ تعالیٰ نے اس رنگ میں ان کو یہ نظارہ دکھا دیا تا کہ ساتھ ہی اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے دستور کو دیکھتے ہوئے سمجھا کہ یہ میرا امتحان ہے اور غالباً اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے کہ اسّی سال کے بعد میرے ہاں جو بیٹا پیدا ہوا ہے میں اسے عملاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح کر دوں۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے ذکر کیا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے (کہ ہمارے نزدیک وہی تھے جنہوں نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا اس اچھی تربیت کے ماتحت جو اپنے ماں باپ سے انہیں حاصل ہو رہی تھی) اس بات پر آمادگی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ مجھے ذبح کر دیا جائے تو پھر مجھے اس حکم کی تعمیل میں کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے جنگل میں لے گئے اور انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ماتھے کے بل گرا دیا وہ چھری پھیرنے کے لئے تیار ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا یٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا (الصّٰفّٰت:۱۰۵،۱۰۶) اے ابراہیم تم نے اس رؤیا کو اپنی طرف سے پورا کر دیا ہے لیکن ہمارا منشاء یہ نہ تھا تم اس واقعہ کی یادگار میں ایک بکرا ذبح کر دو۔ یہ خواب کسی اور صورت میں پورا ہونے والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ گھڑی جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے یقیناً کئی لوگوں کی اسّی اسّی بلکہ سو سو سال کی عبادت سے بھی بڑھ کر تھی۔ آخر دنیا میں ایسے کئی لوگ موجود ہوتے ہیں جو اسّی سال کی عمر پاتے ہیں بلکہ سو سو سال تک زندہ رہنے والے لوگ بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جنہوں نے ایک سو بیس، ایک سو تیس۔ ایک سو چالیس یا ایک سو پچاس سال کی عمر پائی۔ میں نے خود ایک شخص کو دیکھا ہے جنہوں نے ایک سو چالیس سال سے اوپر عمر پائی تھی۔ وہ جب میری بیعت کے لئے آئے تو لاہور سے پیدل چل کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنی عمر کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب ایک دفعہ میرے استاد کے پاس کسی کام کے متعلق دعا کرانے کے لئے آئے تھے اور انہوں نے ایک بھینس ان کو تحفہ کے طور پر دی تھی میں اس وقت اتنا جوان تھا کہ وہ بھینس جو مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب نے میرے استاد کو دی اس کے متعلق میرے استاد نے مجھے کہا کہ جاؤ اور اس کو نہلا لاؤ۔ یہ روایت انہوں نے آج سے بیس سال پہلے بیان کی تھی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس وقت وہ صاحب بیس پچیس سال کے تھے جب یہ واقعہ ہوا تو چونکہ بیعت

کے وقت تک اندازاً سو سال کا عرصہ اس واقعہ پر گذر چکا تھا اس لئے جب وہ میری بیعت کے لئے آئے اس وقت وہ ایک سو بیس سال کے تھے اور مجھے دوستوں نے بتایا کہ اس کے بعد بھی وہ پندرہ بیس سال زندہ رہے تھے گویا ایک سو چالیس سال سے اوپر عمر انہوں نے پائی اور ایک سو بیس سال کی عمر میں وہ اتنے مضبوط تھے کہ لاہور سے پیدل چل کر قادیان آئے۔ اب اگر وہ ساری عمر دین کی طرف متوجہ رہے ہوں اور انہوں نے ایک سو بیس سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہو تب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ ایک گھڑی کی عبادت ان کی ایک سو بیس سالہ عبادت سے بڑھ گئی اور خدا تعالیٰ کے فعل نے بھی نتیجہ ظاہر کر دیا کیونکہ جو سلوک اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا ہے وہ ان سے نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ تو کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا وہ خود فرماتا ہے فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ (الزلزال: ۸) جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کرتا ہے وہ اس کے اچھے نتیجہ کو ضرور دیکھ لیتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کی ایک ذرہ کے برابر نیکی بھی ضائع نہیں کرتا تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی ایک سو بیس سال کی عبادت کو ضائع کر دے اور یہ کہنا کہ سوز و گداز اور اخلاص کی وجہ سے بعض دفعہ ایک رات کی عبادت تراسی[۸۳] سال کی عبادت سے بڑھ جاتی ہے۔ یہ جواب بھی اس موقعہ پر چسپاں نہیں ہو سکتا کیونکہ روایت میں ہے کہ پہلے نبیوں نے اسّی سال عبادت کی تھی جس کی خبر سن کر صحابہ کو افسوس ہوا کہ ہم اس کے مقابل پر کیا پیش کریں گے۔ اگر یہ روایت اس جگہ چسپاں کی جائے تو پھر اس کے یہ معنے ہوں گے کہ نبیوں کی اسّی سالہ عبادت سے غیر نبی کی ایک رات کی عبادت بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس میں زیادہ سوز و گداز ہوتا ہے اور یہ دعویٰ بالبداہت باطل ہے۔ بفرض محال یہ درست بھی ہو تو پھر اس مضمون کو ان الفاظ میں بیان کرنا تو بلاغت کے خلاف ہے اس صورت میں تو یوں کہنا چاہیے تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے دل اس قدر پاک ہیں کہ ان کے ایک لحہ کی عبادت یا ان کی ایک رات کی عبادت ان لوگوں کی اسّی سال کی عبادت سے بہتر ہے مگر اس کی بجائے فرمایا یہ گیا ہے کہ ایک خاص رات کی عبادت دوسرے اسّی[۸۰] سال کی عبادت سے اچھی ہے اور یہ بات یقیناً اس یہودی روایت کا جواب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ صرف ایک رات کو بغیر اور کسی خصوصیت کے دوسرے سالوں پر ترجیح دے دینا عقل کے خلاف ہے اور صرف زبردستی اور دھینگا مشتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔

یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ایک معمولی مومن اور متقی انسان اگر ایک رات عبادت میں گزار دے تو وہ پہلے انبیاء کی اسّی سالہ عبادتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے تو اس سے بڑھ کر ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان انبیاء کو اسّی سال عبادت کرنے کے بعد بھی اتنا انعام نہ ملے جتنا انعام ایک معمولی مسلمان کو محض ایک رات عبادت

کرنے کی وجہ سے دے دیا جائے۔ پس اس حدیث کا یہ مفہوم قرآنی تعلیم اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔

ترتیب۔ سورۃ القدر کا سورۃ العلق سے تعلق اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق ظاہر ہے وہاں فرمایا تھا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے پیدا کیا ہے اور مطلب یہ تھا کہ قرآن پڑھ۔ اب اس سورۃ میں قرآن کریم کی فضیلت اور اس کی عظمت کا اظہار کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ یہ قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا ہے یعنی یہ وہ کتاب ہے جو دنیا کی ترقی اور اس کے تنزل کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام فیصلوں پر حاوی ہے یا یوں کہہ لو کہ قرآن کریم دنیا کی ترقی اور اس کے تنزّل کے تمام سامانوں کی تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ آئندہ دنیا کن اصول کے مطابق چل کر ترقی کر سکتی ہے اور کن امور کی پیروی کر کے تباہ ہو سکتی ہے۔ جو چیز ایسی اہم ہو کہ اس کو قبول کرنے میں دنیا کی نجات اور اس کو رد کرنے میں دنیا کی تباہی ہو اس کا پڑھنا اور بار بار لوگوں کو سنانا جس قدر ضروری ہو سکتا ہے وہ ایک ظاہر امر ہے ہم تو دیکھتے ہیں دنیا میں لوگ معمولی معمولی باتوں پر ڈھنڈورا پیٹ دیتے ہیں۔ عید کا چاند دیکھتے ہیں تو ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ کل عید ہوگی۔ نیا مال آتا ہے تو تاجر اور دکاندار لوگوں میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں مال ہمارے پاس آیا ہے آؤ اور اسے لے جاؤ۔ کسی بادشاہ کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو اعلانات کے ذریعہ اس خبر کی خوب تشہیر کی جاتی ہے حالانکہ بعض دفعہ وہ چند دنوں کے بعد ہی مر جاتا ہے اور بعض دفعہ بڑے ہو کر وہ ایسا نالائق ثابت ہوتا ہے کہ باپ دادا کی ساری سلطنت کو کھو دیتا ہے۔ اسی طرح ٹِڈی سے ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو گورنمنٹ اخباروں میں اعلانات کراتی ہے کہ ٹڈّی دَل آیا ہوا ہے اس سے بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر پر فوری طور پر عمل کرنا چاہیے یا مثلاً گورنمنٹ کو معلوم ہو جائے کہ اس دفعہ غلہ کی اچھی قیمت ہوگی یا کپاس کا نرخ بڑھ جائے گا یا بارشیں زیادہ ہوں گی تو گورنمنٹ بار باران باتوں کا اعلان کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ ہر شخص کے کان تک یہ باتیں پہنچ جائیں۔ جب معمولی معمولی چیزوں کے متعلق ڈھنڈورے پیٹے جاتے اور بڑے جوش سے اعلان کئے جاتے ہیں تو وہ چیز جو بنی نوع انسان کی تقدیر کو لے کر آئی ہو، جو اپنے اندر دنیا کی ترقی اور اس کے تنزل کے سامانوں کی تفصیل رکھتی ہو، جس پر عمل لوگوں کو نجات دلانے والا اور جس سے انحراف ان کو تباہی کے گڑھے میں گرانے والا ہے اس کا زور و شور سے اعلان کرنا کیوں ضروری نہیں؟

پس اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ میں جو یہ کہا گیا تھا کہ قرآن کریم کا دنیا میں خوب ڈھنڈورا پیٹو اور اس کی تعلیم کا بار بار اعلان کرو۔ اس سورۃ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ قرآن کریم کا دنیا میں

شائع کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ہم نے اس کو ایک اندازہ والے زمانہ میں اتارا ہے یعنی یہ کتاب دنیا کی ترقی اور اس کے تنزل کے متعلق تمام اندازے اپنے اندر رکھتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴿۲﴾

ہم نے یقیناً اس (قرآن یا محمد رسول اللہ) کو ایک (عظیم الشان) تقدیر والی رات میں اتارا ہے۔

حلّ لُغات۔ لَيْلَةٌ لَيْلَةٌ اَللَّيْلُ: مِنْ مَّغْرَبِ الشَّمْسِ اِلٰى طُلُوْعِ الْفَجْرِ الصَّادِقِ اَوْ اِلٰى طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ هُوَ خِلَافُ النَّهَارِ۔ یعنی سورج کے غروب ہونے کے وقت سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے کے وقت کو لَیْل کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک سورج کے نکلنے تک کے وقت کو اور لَیْل کا لفظ نَهَار یعنی دن کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔ بعض علماء لغت کا خیال ہے کہ لَیْلٌ اور لَيْلَةٌ ایک ہی چیز ہے۔ جیسے عربی میں عَشِيٌّ اور عَشِيَّةٌ ہم معنے ہیں۔ لیکن مرزوقی عالم لغت کہتے ہیں کہ لَیْل کا لفظ نَهَار کے مقابل پر بولا جاتا ہے اور لَيْلَة کا يَوْم کے مقابل پر۔ (اقرب)

قَدْرٌ قَدْرٌ کے معنے مَبْلَغُ الشَّيْءِ کے ہوتے ہیں یعنی کسی چیز کی جو قیمت ہوتی ہے اس کو قَدْرٌ کہتے ہیں۔ اسی طرح قَدْرٌ ایک چیز کے دوسری چیز سے مساوی ہونے کو بھی کہتے ہیں چنانچہ عرب کہتے ہیں هٰذَا قَدْرُ هٰذَا اَيْ مُمَاثِلُهٗ وَمُسَاوِلَهٗ یعنی فلاں چیز فلاں کے مساوی ہے۔ اسی طرح طاقت کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور قَدْرٌ کے معنے حرمت کے بھی ہوتے ہیں اور وقار کے بھی ہوتے ہیں اور غِنَاءٌ کے بھی ہوتے ہیں اور قوت کے بھی ہوتے ہیں اور قَدْرٌ کے معنے اَلْوَقْتُ الَّذِيْ يَلْزَمُ لِفِعْلِهٖ کے بھی ہوتے ہیں یعنی جتنے وقت میں کوئی کام ہو سکتا ہو اس کو بھی قَدْرٌ کہتے ہیں اور چونکہ یہ مصدر ہے اس لئے سارے مصدری معنے بھی اس میں پائے جائیں گے۔ اس لحاظ سے اس کے معنے تنگی کے بھی ہیں اور حکم کے بھی اور اقتدار کے بھی اور تعظیم کے بھی اور تدبیر کے بھی اور لیلۃ القدر وہ رات بھی ہے جو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کسی ایک رات میں آتی ہے (اقرب)

قرآن کریم میں بعض اور مقامات پر بھی اس رات کا ذکر آتا ہے مگر وہاں الفاظ اس آیت سے مختلف ہیں۔

ایک جگہ فرماتا ہے اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (الدخان:۴) یعنی ہم نے اسے ایک مبارک رات میں اتارا ہے۔ پس لیلۃ القدر لیلۃ المبارکہ بھی ہے ایک دوسری جگہ فرماتا ہے شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰى وَ الۡفُرۡقَانِ (البقرۃ:۱۸۶) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن اتارا گیا۔ ان دونوں آیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کی کسی رات میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور اس وجہ سے اس رات کو خاص طور پر مبارک قرار دیا گیا۔

تفسیر۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ میں ہٗ کی ضمیر سے مراد قرآن کریم اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے۔ چونکہ پہلی سورۃ میں قرآن کریم کا ذکر آچکا تھا اس لئے یہاں بجائے یہ کہنے کے کہ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا الۡقُرۡاٰنَ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ اللہ تعالیٰ نے صرف اس کی طرف ضمیر پھیر دی اور کہہ دیا کہ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ۔ کیونکہ یہ بات ہر شخص پہلی سورۃ پر نظر ڈال کر آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا تھا اور اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ قرآن کریم کا خاص طور پر نام لیا جاتا۔

لفظ لَیۡل اور لَیۡلَة کے استعمال میں ایک فرق لَیۡلَة اور لَیۡل کے معنے رات کے ہوتے ہیں۔ مرزوقی عالمِ لغت کا قول ہے کہ لَیۡل کا لفظ نَهَار کے مقابل استعمال ہوتا ہے اور لَیۡلَة کا لفظ یَوۡم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے (اقرب) قرآن کریم میں لَیۡل اور لَیۡلَة دونوں الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن لَیۡل کا لفظ زیادہ استعمال ہوا ہے اور لَیۡلَة کا کم۔ میری گنتی کے مطابق لَیۡل کا لفظ ۹۷ دفعہ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے اور لَیۡلَة کا لفظ صرف آٹھ دفعہ اور عجیب بات یہ ہے کہ لفظ لَیۡلَة کا استعمال نزول کلام الٰہی یا اس کے متعلقات کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ رمضان کی رات کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے فرماتا ہے اُحِلَّ لَكُمۡ لَیۡلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمۡ (البقرۃ:۱۸۸) یعنی تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں سے بے تکلف ہونا جائز ہے اور روزوں کے مہینہ یعنی رمضان کے متعلق آتا ہے شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ (البقرۃ:۱۸۶) یعنی رمضان میں قرآن اترنا شروع ہوا تھا۔ پس رمضان کی راتوں کو لَیۡلَة کے لفظ سے یاد کرنا لَیۡلَةٌ کا تعلق کلام الٰہی والے مہینہ سے ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح تین جگہ لَیۡلَة کا لفظ حضرت موسیٰؑ کی موعود چالیس راتوں کے متعلق استعمال ہوا ہے اور یہ وہ عرصہ ہے جس میں تورات کے اہم احکام نازل کئے گئے تھے اور جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے وَ اِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤى اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَةً (البقرۃ:۵۲) اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔ پھر سورۂ اعراف میں آتا ہے وَ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰى ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَةً وَّ اَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ

فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (الاعراف:۱۴۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے موسیٰ سے تیس راتیں کلام کرنے کا وعدہ کیا مگر بعد میں دس راتیں اور بڑھادیں اور اس طرح اپنے وعدہ کو مکمل کر دیا۔ ان تینوں آیتوں میں بھی لَيْلَة کا لفظ کلام الٰہی کے نزول کے لئے استعمال ہوا ہے۔

ان کے علاوہ چار اور مقام پر لَيْلَة کا لفظ استعمال ہوا ہے اور چاروں مقامات میں ہی نزولِ قرآن کے متعلق نازل ہوا ہے سورۂ دخان میں آتا ہے اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (الدّخان:۴) ہم نے اس قرآن کو مبارک رات میں اتارا ہے اور دوسرے اسی سورۃ زیر تفسیر میں ہے۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ہم نے قرآن کریم کو بڑے اندازہ والی رات میں اتارا ہے پھر اسی سورہ میں اس سے اگلی آیت میں فرماتا ہے وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ لیلۃ القدر کیا ہے۔ پھر اس آیت سے اگلی آیت میں فرماتا ہے لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ۬ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ لیلۃ القدر ہزار راتوں سے بھی اچھی ہے۔ گویا آٹھ مقامات پر لَيْلَة کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ نزول کلام الٰہی یا اس کے متعلقات کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ یہ امر اتفاق نہیں کہلا سکتا ضرور اس میں کوئی حکمت ہے اور لَيْل اور لَيْلَة کے استعمال کا یہ فرق بے معنی نہیں ہے۔

میرے نزدیک کلام الٰہی والی راتوں کے متعلق لَيْلَة کا استعمال اور دوسری راتوں کے متعلق لَيْلٌ کا استعمال عربی زبان کے اس قاعدہ کی وجہ سے ہے کہ حروف کی زیادتی یا بعد میں آنے والے حروف کی تبدیلی ہمیشہ معنوں میں زور اور قوت پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے مثلاً رَبَس اور رَبَض کے ملتے جلتے معنے ہیں لیکن رَبَس سے رَبَض میں زیادہ زور ہے رَبَس کے معنے مارنے کے ہوتے ہیں اور رَبَض کے معنے ہیں شیر کا اپنے شکار کو دبوچ کر دبالینا۔ یہ ظاہر ہے کہ صرف مارنے سے شیر کا اس طرح جھپٹا مار کر دبوچ لینا اور اپنے نیچے دبالینا زیادہ سخت ہے۔ اسی طرح قصم اور قضم دونوں کے معنے توڑنے کے ہیں مگر قصم کے معنے خالی توڑنے کے ہیں اور قضم کے معنے توڑ کر کھا جانے کے ہیں اس لئے کہ ص سے ض بعد میں آتا ہے۔ پس ص کا حرف جس لفظ میں آئے گا اسی مفہوم کے اس لفظ کے معنے زیادہ زوردار ہوں گے جس میں ص کی جگہ ض آجائے گا۔ اسی طرح مسّ اور مصّ کے الفاظ ہیں مسّ کے معنے چھونے کے ہیں اور مصّ کے معنے او پر منہ رکھ کر چوسنے کے ہیں یعنی خالی چھونا نہیں بلکہ اُسے اپنی طرف کھینچنا اسی طرح نَسَّ النَّاقَةَ کے معنی ہیں اسے چلایا اور ڈانٹا اور نَصَّ النَّاقَةَ کے معنے ہیں اسے چلنے پر خوب انگیخت کیا اور اسے اتنا مجبور کیا کہ وہ اپنی انتہائی طاقت کے مطابق دوڑنے لگی۔ اسی طرح فسل اور فصل دونوں لفظ جدائی پر دلالت کرتے ہیں لیکن فصل کی جدائی فسل سے زیادہ ہے کیونکہ ص س کے بعد آتا ہے۔ اسی طرح حروف کی

زیادتی سے بھی معنوں میں فرق پڑ جاتا ہے مثلاً لَبَبٌ کے معنے ہیں کھلے سینہ والا۔ لیکن لَبْلَبٌ جس میں ایک کی جگہ دو لام آجاتے ہیں اس کے معنے ہیں اَلْبَرُّ بِاَهْلِهٖ وَالْمُحْسِنُ اِلٰی جِيْرَانِهٖ (اقرب) اپنے اہل سے حد سے زیادہ نیک سلوک کرنے والا اور اپنے ہمسائیوں پر احسان کرنے والا۔ گویا خالی سینہ کی وسعت کے معنے ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا سلوک عملاً کرنے والا لَبْلَبٌ کہلاتا ہے اس لئے کہ لَبَبٌ میں تین حرف ہیں اور لَبْلَبٌ میں چار ہیں۔

عربی قواعد میں یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض دفعہ تاء اسم فاعل کے آخر میں مبالغہ کے لئے لگا دی جاتی ہے اور بطور قاعدہ صفت مشبہ کے آخر میں لگائی جاتی ہے اور اس میں مبالغہ کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً راوی عام روایت کرنے والے کو کہتے ہیں اور شعراء کے شعر بیان کرنے والے کو راویة کہتے ہیں کیونکہ وہ بالعموم ہزاروں لاکھوں شعروں کی روایت کرتے تھے۔ اسی طرح نَسَّاب نسب بیان کرنے والے کو کہتے ہیں اور نَسَّابة مبالغہ کے لئے آتا ہے یعنی خوب اچھی طرح نسب بیان کرنے والا (اقرب) پس لَيْل اور لَيْلة میں چونکہ لَيْلَة کے حروف لَيْل سے زیادہ ہیں اس لئے اس کے معنوں میں لَيْل سے زیادہ وسعت ہے اور یہی وجہ ہے کہ لَيْلَة يَوْم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنے نَهَار سے زیادہ وسیع ہیں اور لَيْل نَهَار کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنے يَوْم سے محدود ہیں۔ پس لَيْلَة کا لفظ ان راتوں یا اس زمانہ کی نسبت استعمال کر کے جن میں کلام الٰہی نازل ہوتا ہے ان راتوں کی بزرگی اور عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

چونکہ الٰہی کلام میں اعلیٰ ادب کے قواعد کے مطابق کبھی الفاظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی مجازی معنوں میں۔ اس آیت کے متعلق بھی یہ سوال ہے کہ آیا اس میں لَيْلَة کا لفظ محض رات کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یا ایک لمبے تاریک زمانہ کے متعلق۔ تمام گزشتہ مفسرین اسی طرف گئے ہیں کہ اس آیت میں لَيْلَة کے معنے محض رات کے ہیں اور لَيْلَةُ الْقَدْرِ کے معنے ہیں اندازہ کی رات۔ مفسرین کے نزدیک سورۂ دخان میں جو اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ آیا ہے اس سے بھی یہی رات مراد ہے اور یہ رات رمضان کے مہینہ کی رات ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں آتا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ پس لیلۃ القدر سے مراد رمضان کی وہ رات ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا وہ رات مبارک تھی اور اندازہ کی رات تھی یعنی آئندہ خیر و شر کا اندازہ اللہ تعالیٰ نے اس میں کیا (الکشّاف زیر آیت اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ فتح البیان زیر آیت اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ الجامع لاحکام القراٰن زیر آیت وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ)۔ قرآن شریف کے نازل ہونے کے متعلق اختلاف ہے بعض کے نزدیک سارا قرآن اسی رات کو لوحِ محفوظ سے اتر کر بیت العزۃ نامی مقام پر آ گیا اس کے بعد آہستہ آہستہ تیئیس سال تک

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا (تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر) اسی طرح ابن عباس سے ابن مردویہ نے روایت کی ہے کہ ان سے مقسم نے سوال کیا کہ میرے دل میں ایک شک پیدا ہوگیا ہے۔ قرآن کریم میں تو آتا ہے کہ قرآن رمضان کے مہینہ میں نازل ہوا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک لمبے عرصہ میں کچھ کسی مہینہ میں کچھ کسی مہینہ میں اور کچھ کسی مہینہ میں اترا ہے۔ اس پر ابن عباس نے جواب دیا کہ اِنَّهٗ اُنْزِلَ فِيْ رَمَضَانَ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَفِيْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ثُمَّ اُنْزِلَ عَلٰى مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ تَرْتِيْلًا فِي الشُّهُوْرِ وَالْاَيَّامِ (تفسیر ابن کثیر زیر آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ)۔ یعنی قرآن کریم سب کا سب ایک ہی بار رمضان کے مہینہ اور لیلۃ القدر کی رات میں جو لیلہ مبارکہ بھی کہلاتی ہے اترا تھا۔ مگر زمین پر مختلف مہینوں اور دنوں میں آہستہ آہستہ نازل ہوا۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک قرآن کریم کے لیلۃ القدر میں اترنے کے معنے یہ ہیں کہ اس رات کو لوح محفوظ سے (یعنی اس مقام سے جہاں ان کے نزدیک ازل سے قرآن کریم لکھا پڑا تھا) قرآن کریم اترا تھا۔

بعض کے نزدیک شہر رمضان میں قرآن کریم اترنے سے مراد اس کے نزول کی ابتداء ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حیان لکھتے ہیں وَقِيْلَ الْاِنْزَالُ هُنَا هُوَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَكُوْنُ الْقُرْاٰنُ مِمَّا عُبِّرَ بِكُلِّهٖ عَنْ بَعْضِهٖ وَالْمَعْنٰى بُدِئَ بِاِنْزَالِهٖ فِيْهِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (تفسیر البحر المحیط زیر آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ) یعنی بعض علماء اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ قرآن کے اترنے سے مراد اس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنا ہے نہ کہ بیت العزت پر۔ اور قرآن کریم اترنے سے مراد اس کے کچھ حصہ کا اترنا ہے۔ پس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اس مہینہ میں قرآن کریم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترنا شروع ہوا تھا۔

بعض نے اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے یہ معنے کئے ہیں کہ رمضان کے بارہ میں قرآن اترا ہے نہ یہ کہ رمضان کے مہینہ میں قرآن اترا ہے۔ چنانچہ تفسیر فتح البیان میں لکھا ہے وَ قِيْلَ فِيْ مَعْنَى الْاٰيَةِ الَّذِيْ نَزَلَ بِفَرْضِ صِيَامِهِ الْقُرْاٰنُ كَمَا تَقُوْلُ نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فِي الصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَ نَحْوَ ذَالِكَ (فتح البیان زیر آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ) یعنی بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ قرآن کریم کی وحی روزوں کی فرضیت کے بارہ میں نازل ہوئی ہے یہ اسی طرح کا استعمال ہے جیسے کہتے ہیں یہ آیت فِي الصَّلٰوةِ ہے یعنی یہ آیت نماز کے بارہ میں ہے۔

عربی لغت سے ثابت ہے کہ فِيْ کے معنے بارہ کے بھی ہوتے ہیں اور اسے فِيْ تعلیلیہ کہتے ہیں یعنی فِيْ کے بعد میں آنے والی چیز فِيْ سے پہلے کے مضمون کا سبب ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ

لُمْتُنَّنِیْ فِیْہِ (یوسف : ۳۳) یہ وہ یوسف ہے جس کے بارہ میں یا جس کے سبب سے تم مجھ پر الزام دھرتی تھیں۔ اسی طرح حدیث میں ہے عُذِّبَتِ امْرَاَۃٌ فِیْ ھِرَّۃٍ حَبَسَتْھَا (بخاری کتاب المساقاۃ باب فضل سقی الماء) یعنی ایک عورت ایک بلی کو بے کھلائے پلائے باندھ دینے کی وجہ سے دوزخ میں ڈالی گئی۔ انہی معنوں میں فِیْ کا حرف آیت اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ میں استعمال ہوا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ رمضان ایسا مہتم بالشان مہینہ ہے کہ اس کے بارہ میں قرآنی حکم نازل ہوا ہے یعنی قرآن میں جو احکام نازل ہوئے ہیں وہ اہم اور ضروری احکام ہیں۔ جس بارہ میں قرآن میں حکم آیا ہو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اہم حکم ہے۔

صحفِ ابراہیم، توراۃ، انجیل کے رمضان میں اترنے کے متعلق ایک روایت اور اس کا صحیح مطلب

جن لوگوں کے نزدیک اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ رمضان کی ایک خاص رات میں سارا قرآن لوح محفوظ سے سماء الدنیا کے بیت العزۃ میں اترا یا جن کے نزدیک اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ رمضان کی ایک خاص رات کو قرآن کریم کی پہلی وحی نازل ہوئی۔ ان میں اس خاص رات کے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کے متعلق مختلف احادیث بھی بیان کی جاتی ہیں۔ چنانچہ مسند احمد حنبل میں ابن الاسقع سے روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اُنْزِلَتْ صُحُفُ اِبْرَاھِیْمَ فِیْ اَوَّلِ لَیْلَۃٍ مِّنْ رَّمَضَانَ وَ اُنْزِلَتِ التَّوْرَاۃُ لِسِتٍّ مَّضَیْنَ مِنْ رَمَضَانَ وَالْاِنْجِیْلُ لِثَلَاثَ عَشْرَۃَ خَلَتْ مِنْ رَّمَضَانَ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ الْقُرْاٰنَ لِاَرْبَعٍ وَّعِشْرِیْنَ خَلَتْ مِنْ رَّمَضَانَ (مسند احمد بن حنبل عن واثلۃ ابن الاسقع)۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیمؑ کے صحیفے تو رمضان کی پہلی رات میں اترے تھے اور موسیٰؑ کی کتاب تورات رمضان کے چھ دن گزرنے کے بعد یعنی ساتویں تاریخ کو اور انجیل تیرھویں کے گزرنے پر یعنی چودھویں رمضان کو اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم رمضان کی چوبیس راتیں گزرنے پر نازل کیا۔ بعض لوگوں نے اس سے مراد چھٹی تیرھویں اور چوبیسویں راتیں لی ہیں مگر میرے نزدیک چونکہ گذرنے کے بعد کے الفاظ ہیں اس لئے ساتویں، چودھویں اور پچیسویں راتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔ بہر حال اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ نہ صرف قرآن کریم بلکہ پہلی کتب بھی رمضان کی خاص خاص راتوں میں اتری تھیں ایک روایت جابر بن عبداللہ سے ابن مردویہ میں بھی مروی ہے اس میں یہ زائد بات بھی بیان ہے کہ زبور رمضان کی بارہ تاریخوں کے گزرنے پر نازل ہوئی اور انجیل کی نسبت لکھا ہے کہ وہ اٹھارہ دن گزرنے پر نازل ہوئی۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) قرآن کریم ہی نہیں دوسری کتب بھی رمضان میں ہی اتری ہیں (۲) ان کے

نزول میں ایک ترتیب مدنظر رکھی گئی ہے پہلے شروع رمضان میں کتاب اتری پھر ہفتہ بعد پھر ہفتہ بعد پھر کچھ دنوں بعد آخری چوبیسویں یا پچیسویں کو قرآن کریم نازل ہوا۔ اگر ان احادیث کو ظاہر پر محمول کیا جائے تو ان کا مفہوم قرآن کریم، عقل اور نقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے خلاف اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرۃ:۱۸۶) یعنی رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ جس میں قرآن کریم اترا ہے۔ اگر پہلے انبیاء کا کلام بھی رمضان میں ہی اترا تھا تو رمضان کی فضیلت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور چاہیے تھا کہ قرآن کریم فرماتا کہ رمضان کا مہینہ تو وہ ہے جس میں ہم نے سب کتب سماویہ اتاری ہیں لیکن قرآن کریم ان کا ذکر تک نہیں کرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی امر کا ذکر نہ کرنے سے اس کا انکار واجب نہیں آتا لیکن چونکہ ان معنوں کے رو سے ماننا پڑتا ہے کہ رمضان کے مہینہ کی فضیلت بتانی مقصود ہے اور پہلی کتب کا بھی رمضان میں اترنا اس کی فضیلت کو بڑھا دیتا ہے اس لئے اس امر کا اس جگہ بیان کرنا نہایت ضروری تھا لیکن قرآن کریم نے یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا اور نہ کسی اور جگہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ حدیث درست ہے تو اس کے معنے ظاہری الفاظ کے مطابق نہیں ہیں۔

دوسرا اعتراض ان روایات پر عقلی طور پر پڑتا ہے اور وہ یہ کہ رمضان قرآن کریم کے نزول کی وجہ سے مبارک ہو گیا۔ یہ امر تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن یہ امر کہ جو کلام بھی اترے وہ رمضان میں اترے اس کی کوئی وجہ عقل سے معلوم نہیں ہوتی۔ دوسرا عقلی اعتراض اس پر یہ پڑتا ہے کہ رمضان قمری مہینہ ہے اور اپنی جگہ بدلتا رہتا ہے اگر ایک خاص وقت کو کلام الٰہی سے کوئی خاص تعلق ہو تو یہ امر بھی سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن جبکہ یہ مہینہ یہود میں رائج نہ تھا وہ یہ سمجھ بھی نہ سکتے تھے کہ ابراہیمؑ یا موسیٰؑ یا داوٗدؑ یا مسیحؑ کے الہامات کب نازل ہوئے ہیں اور اگر کوئی خاص فائدہ اس نزول میں تھا تو اس سے نفع نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ انہیں اس امر کا نہ علم تھا اور نہ علم ہو سکتا تھا۔ پھر اس بات کی تعیین سے کیا فائدہ کہ کلام الٰہی ضرور رمضان میں اترے۔ الٰہی فعل کسی حکمت سے خالی کس طرح ہو سکتا ہے؟

تیسرا عقلی اعتراض ان روایات پر یہ پڑتا ہے کہ ان میں حضرت ابراہیم، موسیٰ، داوٗد اور عیسیٰ کا ذکر تو آتا ہے لیکن اور نبیوں کا ذکر نہیں آتا۔ روایات بتاتی ہیں کہ پہلی رمضان کو حضرت ابراہیمؑ پر کتاب اتری۔ ساتویں کو حضرت موسیٰؑ پر۔ بارھویں کو حضرت داوٗدؑ پر اور اٹھارھویں کو حضرت مسیحؑ پر۔ اس سے ظاہر ہے پہلے نبی پر رمضان کی پہلی تاریخ میں۔ دوسرے نبی پر اس کے بعد کی تاریخ میں۔ تیسرے نبی پر اس کے بعد کی تاریخ میں۔ چوتھے نبی پر اس کے بعد کی تاریخ میں کتاب نازل ہوئی گویا صرف رمضان میں کتاب کا اترنا ہی مقدر نہ کیا گیا تھا بلکہ رمضان کی

تاریخوں کا بھی خاص خیال رکھا گیا تھا کہ جو نبی پہلے آئے اس پر رمضان کی پہلی تاریخوں میں کلام اتارا جائے اور بعد میں آنے والوں پر بعد میں اتارا جائے۔ اگر یہ بات ہے تو حضرت نوحؑ اور دیگر انبیاء جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں ان پر کس ماہ اور کس تاریخ میں کلام اترا۔ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ پر پہلی رمضان کو کلام اترا تھا پس حضرت نوحؑ کے لئے کوئی رات رمضان میں کلام اترنے کی باقی نہیں رہتی۔ اگر تو آگے پیچھے کلام اتر سکتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ان پر پہلی کے بعد کی کسی تاریخ میں کلام اترا ہوگا۔ لیکن حدیث بتاتی ہے کہ تقدم زمانی کے مطابق رمضان کی تاریخوں میں کلام اتارا گیا ہے پس حضرت نوحؑ چونکہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گذرے ہیں اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جس رات کو کلام اترا اس سے پہلے کسی رات میں ان پر کلام اترنا چاہیے تھا مگر پہلی رات سے پہلے تو اور کوئی رات ہوتی نہیں پس اگر رمضان ہی میں کلام اترنا چاہیے تو حضرت نوحؑ کے لئے کوئی جگہ انبیاء کی صف میں باقی نہیں رہتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس جگہ شارع نبیوں کا ذکر ہے اور حضرت نوحؑ شارع نبی نہ تھے مگر یہ جواب نقل وکلام الٰہی دونوں کے خلاف ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ داؤد اور نہ حضرت عیسٰیؑ شریعت لانے والے تھے۔ ان کی کتب جیسی بھلی بری بھی موجود ہیں ان میں دیکھ لو شریعت کا نام ونشان نہیں۔ حضرت داؤدؑ کی زبور میں تو صرف عشقِ الٰہی کا اظہار اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں ہیں اور کچھ اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے دعائیں ہیں۔ شریعت سے ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی انجیل کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں صرف حضرت عیسٰی کی زندگی کے حالات ہیں اور کچھ معجزات کا ذکر ہے باقی اس امر پر زور ہے کہ موسٰیؑ کی شریعت پر عمل کرو۔ اگر داؤدؑ کوئی نئی شریعت لائے تھے یا حضرت عیسٰیؑ کوئی نئی شریعت لائے تھے تو موسٰیؑ کی کتاب کو منسوخ قرار دینا پڑے گا۔ اس صورت میں اگر عیسٰی علیہ السلام صاحب شریعت نہ تھے تو انہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ داؤدؑ کی کتاب پر عمل کرو اور اگر وہ صاحب شریعت تھے تو انہیں یوں کہنا چاہیے تھا کہ میری شریعت پر عمل کرو مگر انجیل تو شریعت سے اس قدر خالی تھی اور ہے کہ یہود کے اعتراض سے بچنے کے لئے حضرت مسیحؑ کے حواریوں کو یہ اعلان کئے بغیر چارہ نہ ہوا کہ شریعت لعنت ہے (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) کیونکہ اگر وہ اسے رحمت قرار دیتے تو یہود کے اس سوال کا کیا جواب دیتے کہ مسیحؑ کی شریعت کہاں ہے کیونکہ وہ نصارٰی کے زعم میں پہلے نبیوں سے بڑا تھا اور اس وجہ سے اسے دوسروں کی شریعت کا ناسخ بھی ہونا چاہیے تھا۔

قرآن کریم کی رو سے اس دعوٰی پر یہ اعتراض آتا ہے کہ قرآن کریم حضرت موسٰی علیہ السلام کے بعد

آنے والے تمام نبیوں کی نسبت فرماتا ہے وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ٘ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرۃ:۸۸) یعنی ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے پیچھے اور رسول اس کی پیروی کرنے والے بھیجتے رہے آخر میں عیسیٰ بن مریم آئے انہیں بھی کوئی شریعت کی کتاب نہیں ملی صرف نشانات اور تائید روح القدس انہیں حاصل تھی۔

اس آیت اور اس مضمون کی دوسری آیات کے ہوتے ہوئے اور خود ان نبیوں کی کتابوں کو دیکھتے ہوئے ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اس روایت میں صرف صاحب کتاب نبیوں کا ذکر ہے اس وجہ سے حضرت نوحؑ کا ذکر نہیں۔

قرآن کریم کی ایک اور آیت بھی اس مفہوم کو رد کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ اور ابراہیمؑ کی نسبت فرماتا ہے وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (الصّٰفّٰت:۸۴) نوح ہی کی جماعت میں سے ابراہیم بھی تھا یعنی حضرت ابراہیمؑ شارع نبی نہ تھے شارع نبی حضرت نوحؑ تھے اور حضرت ابراہیم ان کی شریعت کے اسی طرح تابع تھے جس طرح اسرائیلی نبی حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے تابع تھے۔ اس حقیقت پر آگاہ ہو کر کوئی شخص کس طرح کہہ سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم کا ذکر اس لئے آیا ہے کہ وہ شارع نبی تھے اور حضرت نوح کا اس لئے ذکر نہیں آیا کہ وہ شارع نبی نہ تھے۔

علاوہ ازیں یہ اعتراض بھی اسی توجیہ پر پڑتا ہے کہ اس حدیث میں جس قدر نبیوں کا ذکر ہے وہ اسرائیلی ہیں یہ سوچنے والی بات ہے کہ اسرائیلی نبیوں کا خاص طور پر رمضان سے کیا تعلق تھا بظاہر کوئی نہیں اور اگر اسرائیلی نبیوں کو رمضان سے کوئی خصوصیت نہ تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے رو سے تو اور اقوام میں بھی نبی گزرے ہیں ان کے لئے رمضان میں کون سی جگہ ہوگی؟ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے نبی تو حضرت نوحؑ کی طرح اس لئے محروم ہو جائیں گے کہ حضرت ابراہیمؑ پر پہلی رمضان کو کلام نازل ہوا تھا اس سے پہلے رمضان کی اور کوئی تاریخ نہیں اور بعد کے اس لئے کہ نبی تو کثیر تعداد میں ہوئے ہیں اور رمضان کے دن صرف تیس[۳۰] ہیں بلکہ انتیس[۲۹]۔ کیونکہ چوبیسویں یا پچیسویں کو قرآن کریم نازل ہوا تو باقی نبیوں کو اس تاریخ سے پہلے کی کوئی تاریخ ملنی چاہیے۔

غرض اگر اس روایت کے معنے ظاہری الفاظ کے مطابق لئے جائیں تو عقلاً بھی اس کے معنے قابل قبول نہیں ہیں۔

ان روایات کی تردید جن میں بتایا گیا ہے کہ سب کتب ایک ہی رات نازل ہوئیں اب میں نقل کو لیتا ہوں۔ اس روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ سب کتب ایک ہی تاریخ میں یک دم نازل ہوئی ہیں۔ یہ امر دونوں سروں سے باطل ہوتا ہے۔ آخری نقطہ اس روایت کا قرآن کریم ہے قرآن کریم کی نسبت واضح طور پر معلوم ہے کہ یہ ایک

دن میں نازل نہیں ہوا بلکہ تیئیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے حتیٰ کہ کفار نے اعتراض کیا کہ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (الفرقان:۳۳) یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن اس پر یک دم کیوں نازل نہ ہوا۔ جو اعتراض وہ کرتے ہیں درست ہے واقعہ میں وہ یک دم نازل نہیں ہوا لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آہستہ آہستہ اتار کر تیرے دل کو مضبوط کرنا چاہتے تھے (تا پہلے حصہ کی پیشگوئیاں پوری ہو کر دوسرے حصہ میں اس کی طرف اشارہ ہو اور ایمان کی تقویت کی ایک دائمی بنیاد رکھ دی جائے) اور ہم نے اس کی ترتیب نہایت اعلیٰ درجہ کی بنائی ہے یعنی نزول قرآن اس رنگ میں ہوا ہے کہ موجودہ وقت کے مومنوں کے ذہن نشین قرآن ہو جائے اور موجودہ وقت کے کافروں کے لئے بہترین طریقہ تبلیغ کا پیدا ہو اور بعد کی دائمی ترتیب ہم نے اور طرح رکھی ہے تا کہ وہ بعد میں آنے والوں کی ضرورت کے مطابق ہو۔ غرض نزول و ترتیب قرآن نہایت اہم حکمتوں پر مبنی ہے اور اس وجہ سے اس کا ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمانہ کی ضرورت کے مطابق اترنا نہایت اہم حکمتوں پر مبنی تھا اب اس آیت کی موجودگی اور تاریخ کی گواہی کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ سارا قرآن ایک رات میں اتر آیا تھا۔

پہلے نبیوں کے متعلق بھی یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ایک رات میں ان پر کلام اترا تھا حضرت ابراہیمؑ کی تاریخ تو ہمارے سامنے نہیں اس لئے ان کے بارہ میں تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے حضرت موسیٰؑ، داؤدؑ اور حضرت مسیحؑ کی تاریخ تو ہمارے سامنے ہے ان کی کتب کو دیکھ کر کوئی شخص شبہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ایک وقت میں نازل ہوئی تھیں۔ حضرت موسیٰ کی کتب چالیس پچاس سال میں جا کر مدوّن ہوئی ہیں۔ ان میں راستوں سفروں، مقاموں اور لڑائیوں کا بالترتیب ذکر ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ذکر ہے کہ کس طرح موسیٰؑ نے اپنی قوم کی تنظیم کی اور کس طرح وہ جوانی سے ادھیڑ عمر کے ہوئے اور کس طرح بوڑھے ہوئے اور کھڑے ہو کر کام کرنے کے ناقابل ہو گئے۔ کیا اس مضمون کو ایک رات کا اترا ہوا مضمون کہا جا سکتا ہے؟ بالکل اسی طرح انا جیل کا مضمون ہے اس میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے دوروں، لیکچروں، نشانوں، خدا کی ہدایتوں کا ترتیب وار ذکر ہے اور کوئی شخص انہیں ایک دن کی اتری ہوئی کتاب نہیں کہہ سکتا۔ حضرت داؤدؑ کی زبور بھی اسی طرح ہے کہیں اس میں دشمن فوج کے نرغہ میں گھر جانے کا ذکر ہے اور پھر اس سے نجات پانے کا۔ کبھی بیمار پڑ جانے کا اور پھر اس سے صحت پانے کا۔ کبھی دشمنوں کی شرارتوں کا ذکر آتا ہے اور پھر ان کے غم سے نجات پانے کا۔ غرض داؤد کی زبور اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی ایک تاریخ ہے اور اس کی زندگی کے حالات اس سے منعکس ہوتے ہیں پھر اسے ایک دن کا کلام کس طرح کہا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ نبی کی زندگی اس کے کلام سے الگ نہیں کی جاسکتی بغیر ایک نبی کی زندگی کے حالات معلوم ہونے کے ہم اس کی تعلیم کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ۔ نبی اپنے الہام کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہے اور اس کا الہام اس کی زندگی کے لئے بطور ایک آئینہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو روشن کرتے ہیں اور اس دوہری روشنی ہی سے دنیا ہدایت پاتی ہے اس لئے ہر نبی کا کلام اس کی زندگی کے مختلف حالات پر روشنی ڈالتا ہوا ایک لمبے عرصہ میں ختم ہوتا ہے ایک طرف وہ خدا تعالیٰ کی صفات کے تازہ ظہور پر روشنی ڈالتا ہے دوسری طرف اس کی حالت جو اس کے دشمنوں کی نسبت سے ہوتی ہے اس کے تغیرات پر روشنی ڈال کر خدا تعالیٰ کی تائید اور نصرت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ تیسری طرف وہ ان مختلف حالات میں نبی کے ایمان اور اس کے یقین کے مختلف اظہاروں کو پیش کر کے اس کی دیانتداری، اس کے ایثار اور اس کے روحانی کمالات کو پیش کرتا ہے۔ اگر شروع میں ہی ایک ہی رات میں کلام نازل ہو جائے تو اس میں یہ باتیں کب جمع ہوسکتی ہیں اور اگر یہ باتیں کسی کلام میں جمع نہ ہوں تو وہ دنیا کی ہدایت اور رشد کا سامان پیدا ہی کب کر سکتا ہے پس ضروری ہے کہ سب نبیوں پر آہستہ آہستہ کلام نازل ہو جس میں اس تمام روحانی رفعت کی جھلک ملتی ہو۔ جو وہ نبی اپنے نبوت کے راستہ پر چلتے ہوئے حاصل کرتا گیا۔ تا دنیا کے سامنے اس کی ابتداء بھی ہو اور درمیانی زمانہ بھی اور اس کی انتہا بھی۔

یہ خیال کہ پہلے سب نبیوں پر یک دم کلام الٰہی نازل ہوا تھا سورۂ فرقان کی آیت لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (الفرقان:۳۳) سے پیدا ہوا ہے۔ مسلمان مفسروں نے اس سے یہ استدلال کیا کہ شاید سب نبیوں پر پہلے جُمْلَةً وَّاحِدَةً کلام نازل ہوتا تھا (تفسیر البغوی المسمّی معالم التنزیل زیر آیت وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً) تبھی دشمنوں نے یہ اعتراض کیا۔ حالانکہ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ قرآن کریم میں یہ اعتراض کفار مکہ کی طرف سے نقل کیا گیا ہے اور کفار مکہ تو کسی کتاب کے قائل ہی نہ تھے کجا یہ کہ وہ اس بات کے قائل ہوں کہ سب پہلے کلام الٰہی یک دم نازل ہوئے تھے اگر یہود و نصاریٰ کی طرف سے یہ اعتراض نقل کیا جاتا تب تو یہ شبہ پیدا بھی ہوسکتا تھا لیکن انہوں نے یہ اعتراض نہیں کیا اس لئے اس اعتراض کی وجہ سے یہ قیاس کرنا کہ پہلے چونکہ یک دم کلام نازل ہوتا تھا اس لئے قرآن کریم پر اعتراض کیا گیا کہ کیوں یہ ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا بالکل درست نہیں اور قیاس مع الفارق ہے کفار مکہ کے اعتراض کا یہ باعث نہ تھا کہ پہلے نبیوں پر تو ایک دن ہی سب کلام نازل ہو جاتا تھا اور آپ پر آہستہ آہستہ کلام اتر رہا ہے کیونکہ وہ تو نہ نبوت کے قائل تھے نہ کلام الٰہی کے۔ ان کے اعتراض کی بناء تو محض عقلی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر خدا تعالیٰ نے کلام نازل کیا ہوتا تو یک دم کر دیتا کیونکہ وہ عالم الغیب ہے۔ کلام کے

آہستہ آہستہ نازل ہونے کے تو یہ معنے ہیں کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ من ذالک) نئے اور بدلنے والے حالات کے مطابق اور نئی ضرورتوں کے پیش آنے پر ایک نیا کلام بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ چونکہ ان کے اعتراض کی بنیاد عقلی تھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پہلے نبیوں پر کلام اکٹھا نازل ہوجاتا تھا اور فرض کرو کہ کفار مکہ ایسا کہتے بھی تھے تو کیا ان کے خیال کو ہم کوئی بھی اہمیت اور قیمت دے سکتے ہیں۔ کیا وہ علوم آسمانی کے ماہر تھے یا مذہبی تاریخ کا علم ان کو حاصل تھا کہ ہم ان کے اعتراض کو تاریخ مذہب کے لئے کوئی قیمت دیں؟

اس غلطی کے پیدا ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آتا ہے کہ انہیں چالیس راتوں کے وعدہ میں الواح ملی تھیں (الاعراف: ۱۴۳)۔ مسلمان مفسرین چونکہ اسرائیلی کتب سے واقف نہ تھے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ الواح اور تورات ایک شے ہیں۔ حالانکہ الواح صرف دس احکام کا نام ہے اور تورات ان احکام سے سینکڑوں گنے زیادہ امور پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کہ طُور پر موسیٰؑ کو مکمل تورات ملی تھی۔ صرف الواح کا ذکر آتا ہے اور تورات بھی اسی کی مصدق ہے سو اوّل تو طُور پر جو کچھ نازل ہوا یک دم نازل نہیں ہوا چالیس راتوں میں نازل ہوا دوسرے وہاں جو کچھ نازل ہوا اس اندازہ کے مطابق وحی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کئی راتوں میں ہوئی ہے کئی کئی رکوع کا ٹکڑا آپ پر یک دم نازل ہوجایا کرتا تھا چنانچہ سورۂ یوسف کی نسبت آتا ہے کہ ساری سورۃ ایک ہی وقت میں نازل ہوئی تھی (فتح البیان زیر سورۃ یوسف)۔ حضرت موسیٰؑ پر جو کلام طُور پہاڑ پر چالیس دن میں نازل ہوا اس سے تو سورۂ یوسف یقیناً بڑی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی وحی کے علاوہ دوسرے نبیوں کی وحی کی نسبت تو کوئی قوی یا ضعیف روایت بھی نہیں جس سے معلوم ہو کہ پہلے نبیوں پر کلام الٰہی یک دم نازل ہوجاتا تھا اور اگر ایسا لکھا بھی ہوتا تو ہم اسے خلاف عقل کہہ کر رد کر دیتے کیونکہ کلام الٰہی تو نبی اور خدا کے تعلق کو روشن کرتا رہتا ہے۔ کیا ہم خیال کر سکتے ہیں کہ کسی نبی پر ایک رات میں سب کلام نازل کر کے خدا تعالیٰ خاموش ہوجائے گا کلام الٰہی تو الٰہی تعلق پر شہادت ہوتا ہے کیا اس شہادت کے پیدا ہوجانے سے نبی کی قلبی کیفیت اطمینان والی رہ سکتی ہے؟ کیا وہ اس محجوب اور محبوب سے دور زندگی کو راحت سے گذار سکتا ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چند دن کے وحی کے وقفہ سے کیا حال ہوا تھا۔ اگر ایک دن کلام کر کے خدا تعالیٰ دوسرے نبیوں سے بقیہ ساری عمر خاموش رہتا تو میں سمجھتا ہوں دشمن تو ان کو مارنے میں ناکام رہتے لیکن یہ خدائی فعل ان کو مارنے میں ضرور کامیاب ہوجاتا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی آیت اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ کا یا دوسری آیات جو اوپر لکھی گئی ہیں ان کا ہرگز یہ

منشاء نہیں کہ قرآن کسی ایک رات میں سب کا سب اتار دیا گیا تھا یا یہ کہ الٰہی کلام اکٹھا اترا کرتا ہے۔ کلام الٰہی کسی نبی پر یک دم نہیں اترا بلکہ آہستہ آہستہ نبوت کے زمانہ سے اس کی موت تک اترتا رہتا ہے تا نبی کے دل کو بھی زیادہ سے زیادہ روشنی ملتی جائے اور اس کے اتباع کا نور ایمان بھی بڑھتا رہے اور اس کے منکروں پر بھی نت نئی حجت تمام ہوتی رہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اکٹھا کلام نازل نہیں ہوتا تو پھر کیا احادیث مذکورہ بالا کا یہ دعویٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اجمالاً اور پہلے انبیاء پر تفصیلاً کلام الٰہی رمضان کی مختلف راتوں میں نازل ہوا درست نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ احادیث صحاح ستہ کی نہیں۔ مسند احمد بن حنبل، سعید بن جبیر اور ابن مردویہ کی ہیں اور ان کو وہ درجہ نہیں دیا جا سکتا جو بخاری مسلم کی احادیث کو دیا جا سکتا ہے۔ مسند احمد بن حنبل بے شک ایک مستند کتاب ہے لیکن اس کے متعلق یہ امر محقق ہے کہ اس کی روایات مختلف قسم کی ہیں اور اس کے ان راویوں کی وجہ سے جو امام احمد بن حنبل کے بعد اس کی کتاب کو نقل کرتے ہیں اس میں ایسی بہت سی روایات شامل ہو گئی ہیں جو خود امام احمد بن حنبل کی بتائی ہوئی نہیں ہیں اور بعض ایسی بھی ہیں جن کو امام احمد بن حنبل نے خود مستند قرار نہیں دیا۔ لیکن اگر امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ حدیث مستند بھی ہو تب بھی حدیث قرآن کریم کے مقام پر رکھی نہیں جا سکتی۔ جو حدیث قرآن کریم، واقعات یا عقل کے خلاف ہو بہر حال یا اسے غلط قرار دینا پڑے گا یا پھر اس کے معنے مجاز کے اصول پر کرنے ہوں گے۔ چونکہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ ان احادیث کے ظاہری معنے قرآن کریم، کتب سابقہ اور عقل کے خلاف ہیں۔ اس لئے لازماً یا تو ان احادیث کو غلط کہنا ہو گا یا ان کے معنے مجاز و استعارہ کے اصول پر کرنے پڑیں گے۔

اب میں دیکھتا ہوں کہ کیا مجاز و استعارہ کے رُو سے ان احادیث کے کوئی معنے ہو سکتے ہیں؟ میرے نزدیک ایک بات ان روایتوں میں ایسی ہے جو ہماری توجہ کو مجاز و استعارہ کی طرف پھیرتی ہے اور وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ نوح علیہ السلام کو قرآن کریم نے ایک بہت بڑا نبی قرار دیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کو ان کا تابع نبی قرار دیا ہے اور باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے ہر قوم میں نبی ہونے کی خبر دی ہے۔ اس روایت میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت مسیحؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور پھر باوجود اس کے کہ مسلمانوں میں عام طور پر گو غلط طور پر یہ عقیدہ مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار کتابیں اتاری ہیں (درحقیقت نہ یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف چار کتابیں اتاری ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ ان چار کتابوں میں سے داؤدؑ اور حضرت مسیحؑ کی کتب شریعت کی کتب ہیں۔ یقیناً چار سے بہت زیادہ کتب مختلف اقوام کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہیں اور ان بہت سی کتب میں زبور اور انجیل شامل نہیں کیونکہ یہ شریعت کی کتب نہیں ہیں۔ محض اصلاحی اور روحانی ترقی کے متعلق الہامات پر مشتمل

ہیں یا چند پیشگوئیاں ان میں مذکور ہیں)۔ان روایتوں میں پانچ کتابوں کا ذکر معلوم ہوتا ہے کہ غلط العام عقیدہ سے متاثر ہوئے بغیر یہ روایات نقل کی گئی ہیں اس لئے غالب احتمال یہ ہے کہ یہ احادیث درست ہیں ہاں ظاہر معنوں میں نہیں ہیں بلکہ مجاز واستعارہ کا استعمال ان میں کیا گیا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ ، حضرت موسیٰؑ ، حضرت داؤدؑ، حضرت مسیحؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیمی خاندان کے درخشندہ ستارے ہیں اور گو ابراہیم موسوی سلسلہ سے پہلے اور حضرت نوحؑ کے تابع نبیوں میں سے تھے۔موسیٰؑ ، داؤد اور مسیحؑ اسرائیلی سلسلہ کے نبی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محمدی سلسلہ کے بانی تھے اور نبوت کے سلسلہ کے لحاظ سے یہ پانچوں نبی تین مختلف سلسلوں سے متعلق تھے مگر خاندان کے لحاظ سے یہ پانچوں نبی ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔پس ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں کلام الٰہی کے سلسلہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ ابراہیمی خاندان کے لحاظ سے ایک حکمت بیان کی گئی ہو۔اگر یہ درست ہے تو نہ حضرت نوحؑ کے ذکر کی اس حدیث میں ضرورت تھی اور نہ دوسری اقوام کے نبیوں کے ذکر کی ضرورت تھی۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان پانچ نبیوں کو رمضان میں الہام ہوا خواہ جُزْءً ا خواہ کُلًّا ۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں اس خیال کو اوپر تفصیل سے ردّ کر آیا ہوں۔ پس رمضان سے رمضان کا مہینہ مراد نہیں بلکہ مجازاً سلسلہء الہام کا نام رمضان رکھ دیا گیا ہے۔

رمضان رَمَضَ سے نکلا ہے اور رَمَضَ کے معنے عربی زبان میں شدید گرمی یا سورج کی شدید تپش کے ہوتے ہیں اور رَمَضَاءُ کے معنے اس میدان کے ہوتے ہیں جو گرمی کے موسم میں سورج کی براہ راست شعاعوں کی وجہ سے تپ اٹھا ہو۔چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

اَلْمُسْتَجِيْرُ بِعَمْرٍو عِنْدَ كُرْبَتِهٖ
كَالْمُسْتَجِيْرِ مِنَ الرَّمْضَاءِ بِالنَّارِ (اقرب)

یعنی عمرو (اس کا مخالف) سے مصیبت کے وقت مدد مانگنا ایسا ہی ہے جیسا کہ شدید گرم میدان سے بچنے کے لئے کوئی آگ کی پناہ ڈھونڈے یعنی رَمَضَاء کی گرمی آگ کے قریب قریب ہوتی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ جب رمضان نام اس مہینہ کا رکھا گیا ہے اس وقت یہ مہینہ سخت گرمی کے موسم میں آیا ہوگا۔بہرحال رمضان کے روزے تو اسلام میں فرض ہوئے اور اس مہینہ کا نام رمضان بہت پہلے رکھا گیا ہے۔پس رکھنے والے نے یہ نام شدت گرما کی وجہ سے ہی رکھا ہوگا اور کلام الٰہی ہمیشہ اسی وقت آتا ہے جبکہ دنیا میں گناہ اور فسق و فجور کی وجہ سے لوگ غضب الٰہی کی آگ میں جل رہے ہوتے ہیں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیمی نسل

پر جو ابتدائی زمانہ روحانی گرمی کا آیا اس میں ابراہیم علیہ السلام پر کلام نازل ہوا اور جب دوسرا زمانہ روحانی تپش اور گرمی کا آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بھیج دیا اور جب تیسرا زمانہ آیا تو داؤد علیہ السلام کو بھیج دیا اور جب چوتھا زمانہ آیا تو حضرت مسیحؑ کو بھیج دیا اور جب پانچواں زمانہ آیا تو مجھے بھیج دیا۔ اس صورت میں یہ ایک نصیحت ہے اور زمانہ کے حالات سے ایک سبق دیا گیا ہے اور اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ رمضان میں ان لوگوں پر کلام نازل ہوا سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کے بارہ میں قوی تاریخی شہادت ملتی ہے کہ آپ پر رمضان میں قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تھا۔

صحفِ ابراہیم، توراۃ، انجیل کے رمضان میں اترنے کی ایک لطیف تشریح ان مجازی معنوں کے رو سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں متواتر تاریخوں میں نزول کلام کا ذکر نہیں بلکہ یوں ہے کہ پہلی رمضان کو ابراہیمؑ پر کلام نازل ہوا۔ چھٹی کو موسیٰؑ پر اور بارھویں کو داؤدؑ پر اور اٹھارھویں کو مسیحؑ پر اور چوبیسویں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو تاریخ سے ابراہیمی نسل کے انبیاء کا ظہور جن صدیوں میں معلوم ہوتا ہے یہ تاریخیں اس سے ملتی ہیں۔ حضرت ابراہیم ابراہیمی نسل کے انبیاء کے سب سے پہلے نبی تھے اس لئے لازماً کہنا ہوگا کہ ان پر وحی ابراہیمی سلسلہ کی تاریخ کی پہلی صدی میں ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے متعلق اختلاف ہے۔ مروجہ بائبل میں اسے ۴۲۰ سال کے قریب بتایا گیا ہے مگر بعض اسرائیلی روایتوں میں حضرت موسیٰؑ کا ظہور چھٹی صدی میں بھی بتایا گیا ہے۔ اگر اسے درست سمجھا جائے تو موسیٰؑ پر چھٹی رمضان کو کلام نازل ہونا درست آتا ہے۔ اس کے بعد حضرت داؤدؑ کا ذکر ہے کہ ان پر بارھویں رمضان کو کلام نازل ہوا۔ حضرت داؤدؑ کا وجود اس کڑی کے لحاظ سے خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل اہم وجود اس کڑی میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ ابراہیم باپ ہیں اور موسیٰ عیسیٰ ایک بیٹے کے سلسلہ کی کڑی ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح موعودؑ دوسرے بیٹے کے سلسلہ کی کڑی ہیں۔ مسند احمد بن حنبل کی روایت میں حضرت داؤد کا ذکر بھی نہیں۔ بہرحال یہ جو دوسری روایت میں ہے کہ داؤدؑ پر بارھویں تاریخ کو کلام نازل ہوا یہ مروجہ تاریخوں کے مطابق صحیح نہیں اُترتا کیونکہ مروجہ تاریخوں میں حضرت داؤد کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ کے نوسو سال بعد ہوا ہے مگر پرانی تاریخوں کا کوئی ایسا اعتبار بھی نہیں ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی غلطی ہو اور حضرت داؤدؑ گیارہ سو سال بعد بارھویں صدی میں ہی ہوئے ہوں۔ اس کے بعد حضرت مسیح کا ذکر آتا ہے بائبل کے رو سے واقعہ صلیب حضرت ابراہیم کی بعثت کے ۱۹۲۰ سال بعد ہوا ہے اور ان کی وفات کے لحاظ سے ۱۸۰۰ کچھ سال بعد۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ اٹھارھویں رمضان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ پر کلام نازل ہوا۔ گویا ایک سو سے ڈیڑھ سو سال کا فرق ہے مگر یہ فرق اس طرح نکل جاتا ہے کہ اسرائیلی تاریخ کے رو سے موسیٰؑ اور عیسیٰ کے درمیان کا فاصلہ تیرہ سو سال کا بھی ثابت ہے۔ اگر اس عرصہ کو تسلیم کیا جائے اور قرائن بھی یہی بتاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تیرہ سو سال بعد ہوئے ہیں (مگر اس جگہ اس مضمون پر بحث کا موقعہ نہیں)۔ تو حضرت ابراہیم اور حضرت مسیحؑ کا فاصلہ اٹھارہ صد اور کچھ سال کا بن جاتا ہے اور حدیث کے بتائے ہوئے وقت کے عین مطابق حضرت مسیح کی بعثت بنتی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چوبیسویں رمضان کو کلام نازل ہوا۔ حضرت عیسیٰ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا فاصلہ چھ سو آٹھ سال کا ہے۔ اٹھارہ سو کچھ سال میں ۶۰۸ سال جمع کریں تو چوبیس سو کچھ سال ہوتے ہیں۔ گویا حضرت ابراہیمؑ کے بعد چوبیسویں صدی کے ختم ہونے پر اور پچیسویں صدی کے شروع میں آپ مبعوث ہوئے اور یہ زمانہ حدیث کے عین مطابق ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس حدیث میں رمضان سے مراد وہ تاریک زمانے ہیں جو نسل ابراہیم پر آنے والے تھے اور دنوں سے مراد وہ صدیاں ہیں جن میں حدیث میں مذکور انبیاء کا ظہور ہوا اور ان احادیث میں استعارہ کی زبان میں بات کی گئی ہے ظاہر مفہوم لینا ان کا نقل اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

<u>لیلۃ القدر سے مراد</u> اب سوال یہ ہے کہ لیلۃ القدر سے مراد اس آیت میں کیا ہے کیا حقیقی لَیۡلَۃ یا مجازی؟ اس بارہ میں پہلے مفسرین کا رجحان اسی طرف ہے کہ اس سے مراد حقیقی رات ہے جس میں ان کے نزدیک سارا قرآن لوح محفوظ سے بیت العزۃ پر اترا۔ یا یہ کہ اس رات کو نزول قرآن کی ابتداء ہوئی (فتح البیان زیر آیت شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ)۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ قرآن کریم رمضان میں اترنا شروع ہوا یہ تو تاریخی شہادتوں سے یقینی امر معلوم ہوتا ہے اس لئے شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ کے ایک یہ معنے ضرور ہیں کہ قرآن کریم رمضان میں اترنا شروع ہوا۔ باقی رہا کہ وہ کس رات کو اترا اس کے بارہ میں تاریخ میں اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ قرآن کریم نصف رمضان میں نازل ہوا (تفسیر ابن کثیر زیر آیت شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ)۔ گویا پندرہ یا سولہ کو اس کا نزول ہوا۔ جو روایات اوپر بیان کی گئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ بعض کا خیال ہے کہ بدر کی جنگ سترہ رمضان کو ہوئی تھی (دُرِّ منثور زیر سورۃ القدر) اس لئے یہی رات قرآن کریم کے نزول کی بھی ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قرآن کریم کی آیت یَوۡمَ الۡفُرۡقَانِ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ (الانفال: ۴۲) اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ غرض اس رات کے متعلق جسے لیلۃ القدر کہا گیا ہے اختلاف ہے

اور اس کی اہمیت تاریخی تحقیق سے زیادہ ہے بھی نہیں ۔ کیونکہ جس تاریخ کو قرآن کریم نازل ہوا اس کے معلوم ہونے سے روحانیت کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔ محدثین عام طور پر چوبیس تاریخ کی روایت کو مقدم بتاتے ہیں چنانچہ ابن حجر عسقلانی بخاری کی مشہور شرح کے مصنف اور علامہ زرقانی مواہب اللدنیہ سیرۃ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شارح جنہوں نے شرح مواہب اللدنیہ آٹھ جلدوں میں لکھی ہے دونوں نے اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ قرآن کریم رمضان کی چوبیسویں تاریخ کو اترنا شروع ہوا (شرح الزرقانی باب اول فیما کان یخص صلی اللہ علیہ وسلم به رمضان من العبادات ۔ فتح الباری الجزء التاسع حدیث ۴۹۷۸)۔ اس کے برخلاف مورخ زیادہ تر سترھویں رمضان کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں (تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)۔ اور قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ ہم نے قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے اور اس کی یاد میں رمضان کے آخری عشرہ میں لیلۃ القدر کا مقرر کیا جانا یہ دونوں باتیں مل کر اس امر کو ثابت کر دیتی ہیں کہ قرآن کریم کا نزول بہر حال رمضان میں شروع ہوا۔ پس اگر اس آیت کے یہ معنے کئے جائیں کہ قرآن کریم کے نازل ہونے والی مخصوص رات لیلۃ القدر تھی تو اس لحاظ سے محدثین کے فیصلہ کے مطابق یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ لیلۃ القدر سے مراد اس جگہ چوبیسویں رمضان ہے اور آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے چوبیسویں رمضان کو قرآن کریم نازل کیا ہے جو نزول قرآن کی وجہ سے لیلۃ القدر کہلانی چاہیے۔ لیکن تاریخی تحقیق کے مطابق صرف اتنا معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کے نزول کا زمانہ رمضان کی کسی تاریخ کو تھا۔

لفظ قدر کے لغوی معنی اس رات کو جس میں قرآن کریم نازل ہوا لیلۃ القدر کیوں کہا گیا ہے اس کی وجہ خود لفظ قدر سے ظاہر ہے۔ حل لغات میں قدر کے معنے لکھے جا چکے ہیں لیکن یاد کو تازہ کرنے کے لئے دو لغات کی کتابوں میں سے کہ ایک قرآن کریم کی لغت کی خاص تفسیر ہے اور ایک عام عربی زبان کی لغت کی اہم کتاب ہے قدر کے معنے دوبارہ یہاں لکھ دیئے جاتے ہیں۔

مفردات راغب میں جو قرآن کریم کی لغت کی ایک معتبر کتاب ہے لکھا ہے اَلْقَدْرُ وَالتَّقْدِيْرُ تَبْيِيْنُ كَمِيَّةِ الشَّيْءِ ۔قدر اور تقدیر کے معنے کسی چیز کے اندازہ کا ظاہر کرنا ہوتے ہیں۔ پھر لکھا ہے تَقْدِيْرُ اللهِ الْاَشْيَاءَ عَلٰى وَجْهَيْنِ اَحَدُهُمَا بِاِعْطَاءِ الْقُدْرَةِ وَالثَّانِيْ بِاَنْ يَّجْعَلَهَا عَلٰى مِقْدَارٍ مَّخْصُوْصٍ وَّ وَجْهٍ مَّخْصُوْصٍ حَسْبَمَا اقْتَضَتِ الْحِكْمَةُ وَ ذٰلِكَ اَنَّ فِعْلَ اللهِ تَعَالٰى ضَرْبَانِ ضَرْبٌ اَوْجَدَهٗ بِالْفِعْلِ وَ مَعْنٰى اِيْجَادِهٖ بِالْفِعْلِ اَنْ اَبْدَعَهٗ كَامِلًا دَفْعَةً وَّاحِدَةً لَا تَعْتَرِيْهِ الزِّيَادَةُ وَالنُّقْصَانُ اِلٰى اَنْ يَّشَاءَ اَنْ يُّفْنِيَهٗ اَوْ يُبَدِّلَهٗ كَالسَّمٰوٰتِ وَمَا فِيْهَا وَمِنْهَا مَا جَعَلَ اُصُوْلَهٗ مَوْجُوْدَةً بِالْفِعْلِ وَاَجْزَاءَهٗ بِالْقُوَّةِ وَقَدَّرَهٗ عَلٰى وَجْهٍ لَّا

يَتَأَتّٰى مِنْهُ غَيْرُ مَاقَدَّرَهٗ فِيْهِ كَتَقْدِيْرِهٖ فِي النَّوَاةِ اَنْ يَّنْبُتَ مِنْهَا النَّخْلُ دُوْنَ التُّفَّاحِ وَالزَّيْتُوْنِ...... فَتَقْدِيْرُاللّٰهِ عَلٰى وَجْهَيْنِ اَحَدُهُمَا بِالْحُكْمِ مِنْهُ اَنْ يَّكُوْنَ كَذَا اَوْ لَا يَكُوْنَ كَذَا اِمَّا عَلٰى سَبِيْلِ الْوُجُوْبِ وَاِمَّا عَلٰى سَبِيْلِ الْاِمْكَانِ وَعَلٰى ذٰلِكَ قَوْلُهٗ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق:۴) وَالثَّانِيْ بِاِعْطَاءِ الْقُدْرَةِ عَلَيْهِ .... وَقَوْلُهٗ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ..... اَيْ لَيْلَةً قَيَّضَهَا لِاُمُوْرٍ مَّخْصُوْصَةٍ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی تقدیر دو طرح ظاہر ہوتی ہے (۱) کسی کو قدرت دے کر (۲) دوسرے اس طرح کہ کسی چیز کو حکمت کے تقاضی کے مطابق مخصوص اندازہ پر بناتا ہے اور مخصوص طریق پر اس کی ساخت کی بناء رکھتا ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک تو یہ کہ کسی چیز کو ایک ہی بار مکمل طور پر پیدا کر دیتا ہے۔پھر اس کے بعد اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی جب تک کہ اسے خدا تعالیٰ فنا نہ کر دے یا بدل نہ ڈالے جیسے کہ زمین وآسمان کی پیدائش ہے اور ایک تقدیر اس کی اس طرح ہوتی ہے کہ ایک چیز کو اس طرح پیدا کرتا ہے کہ اصولی طور پر تو وہ موجود ہوتی ہے مگر اس کے تفصیلی خواص پوشیدہ ہوتے ہیں مگر ہوتے موجود ہیں۔ان کے خلاف اس چیز سے کچھ ظاہر نہیں ہوسکتا۔مثلاً کھجور کی گٹھلی ہے اس گٹھلی میں اصولی طور پر کھجور کی خاصیتیں موجود ہیں مگر کھجور کی تفصیلات اس سے گٹھلی ہونے کی حالت میں ظاہر نہیں مگر جب بھی اسے بوؤ اس میں سے کھجور ہی نکلے گی۔سیب یا زیتون نہیں نکلے گا۔پس اس کی تقدیر اجمالی ہے مگر وہ اجمال ایک تفصیل کو اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے جب وہ اجمال کھلنا شروع ہوگا اس سے وہی تفصیل پیدا ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے اس میں مخفی رکھی ہے اس کے خلاف اور کوئی تفصیل پیدا نہ ہوگی۔غرض تقدیر الٰہی دو طرح ظاہر ہوتی ہے یا تو حکم سے کہ وہ فرما دیتا ہے کہ ایسا ہو یا ایسا نہ ہو۔پس جسے کہتا ہے ہوجا وہ ضرور ہوتا ہے اور جس کی نسبت کہتا ہے ایسا نہ ہو اس کے لئے ہونا ممکن نہیں ہوتا۔اسی معنوں میں قرآن کریم میں آتا ہے قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق:۴) کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے جو مثبت خواص اس میں رکھے ہیں ان کے سوا اس سے ظاہر نہیں ہوتے اور جن باتوں کی اس سے نفی کی ہے وہ اس سے ظاہر نہیں ہوسکتیں۔زبان ضرور میٹھے کھٹے کے فرق کو محسوس کرتی ہے مگر سن نہیں سکتی۔کان کو کتنا کہو نہ سن وہ ضرور سنتا ہے مگر اس سے کہو کہ چکھ تو کبھی نہیں چکھتا۔دوسرے خدا تعالیٰ کی قدرت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے قدرت بعض اشیاء میں پیدا کر دی ہے مگر وہ فوراً ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتی رہتی ہے گویا یوں کہہ لو کہ اس کی قدرت کے کچھ درخت ہیں اور کچھ گٹھلیاں۔قدرت کے درخت تو اپنی کامل شان سے شروع سے ہی مقررہ پھل دیتے ہیں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔قدرت کی گٹھلیاں اپنے اندر مخفی مادہ رکھتی ہیں جب گٹھلی لگاؤ گے وہی ظاہر ہوگا جو

خدا تعالیٰ نے اس میں طاقت رکھی ہے مگر گٹھلی نہ لگاؤ تو خدا تعالیٰ کی تقدیر اس گٹھلی کے ساتھ ہی غائب ہو جائے گی گویا یہ قدرت ضرور نہیں کہ ظاہر ہو مگر جب ظاہر ہو گی تو اسی طرح ظاہر ہو گی جس طرح خدا تعالیٰ نے اس کے لئے ظاہر ہونا مقدر کیا ہے۔ انسان کے نطفہ میں انسان بننے کی قدرت ہے مگر ضروری نہیں کہ ہر نطفہ بچہ بن جائے کئی نطفے منی کے ساتھ ہی ضائع ہو جاتے ہیں۔ کئی ماں کے پیٹ سے قبل از وقت نکل جاتے ہیں۔ کئی مردہ پیدا ہوتے ہیں۔ کئی ناقص پیدا ہوتے ہیں ہاں جو بچہ بھی پیدا ہو گا، ہو گا انہی خواص سے جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں رکھے ہیں غیر انسانی خواص لے کر پیدا نہ ہو گا۔ گویا اس تقدیر کے لئے ایک نقطہ مقرر نہیں ایک دائرہ مقرر ہے اس کے اندر یہ آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ پھر لکھا ہے اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ سے یہ مراد ہے کہ ہم نے قرآن اسی رات میں اتارا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خاص امور کے لئے مخصوص کر چھوڑا تھا۔

مفردات کی اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے کہ قَدۡرٌ کے معنے اظہار قدرت کے ہیں جو دو طرح ہوتی ہے۔ اوّل اسی تقدیر سے جو ایک مخصوص شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ صاحب مفردات نے آسمان و زمین کی مثال دی ہے مگر یہ مثال کامل نہیں بہر حال اس سے اس قسم کی تقدیر کا ایک موٹا اندازہ ہو جاتا ہے ورنہ اصل مثال اس کی وہ تقدیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق ظاہر ہوتی ہے جسے قانون قدرت کہتے ہیں یعنی وہ قانون جو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے ظہور کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ مثلاً یہ کہ مردے اس دنیا میں جسمانی طور پر زندہ ہو کر نہیں آتے۔ یا غیب کامل کا علم خدا تعالیٰ کے بتائے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ تُک بندی ٹھیک ہو جائے تو یہ اور بات ہے علم کی بناء پر کوئی شخص غیب کامل کو اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر نہیں جان سکتا وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے ایسی تقدیر سے جو بالاجمال ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ہی وقت میں ساری تقدیر کا اظہار نہیں ہو جاتا آہستہ آہستہ وہ تقدیر ظاہر ہوتی ہے اور ایک مقرر قانون کے مطابق ظاہر ہوتی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ لیلۃ القدر سے مراد وہ رات ہے جسے خاص امور کے لئے اللہ تعالیٰ نے مخصوص کر چھوڑا تھا۔

ان معنوں کے بتانے کے بعد میں باری باری دونوں معنوں کے رو سے اس آیت کے معنے کرتا ہوں۔ پہلے معنے یہ تھے کہ قَدۡر سے خدا تعالیٰ کی دو قسم کی قدرتوں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدر کا لفظ خدا تعالیٰ کی دونوں قدرتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ضرور دونوں قدرتوں میں سے ایک ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک نہ ایک قسم کی قدرت کی طرف اس سے ضرور اشارہ ہوتا ہے مگر ایک ہی وقت میں دونوں قدرتوں کی طرف بھی اشارہ ہوتا

ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ قدیر آتا ہے یعنی قدرت والا تو اس کے یہ معنے تو نہیں ہوتے کہ اس سے نمبر اوّل قسم کی قدرت ظاہر ہوتی ہے یا نمبر ۲ قسم کی قدرت ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس سے دونوں قسم کی قدرتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر کسی جگہ قدر کا لفظ آئے تو گو کبھی اس سے قسم اوّل کی قدرت مراد ہو گی اور کبھی قسم دوم کی۔ یا کبھی اور کسی تیسری قسم کی قدر مراد ہو گی لیکن کبھی وہ سب قسم کی قدروں کی طرف ایک ہی وقت میں اشارہ کرتا ہوگا۔ اس جگہ بھی یہی معنے ہیں اور اَلْقَدْر میں اَلْ جنسی استغراقی ہے یعنی جتنی قسم کی قدریں ہیں وہ سب اس رات میں جمع تھیں۔ مفردات راغب نے دو قدریں لکھی ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ یہ دو قسمیں پھر آگے دو قدروں میں تقسیم ہوتی ہیں یعنی اوّل قسم کی روحانی قدر اور اوّل قسم کی جسمانی قدر۔ اور دوم قسم کی روحانی قدر اور دوم قسم کی جسمانی قدر۔ اسی طرح اور کئی قسم کی قدریں ان سے نکلتی چلی آئیں گی۔ پس قَدْر کے لفظ پر اَلْ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس رات میں قرآن کریم نازل ہوا اس میں سب قسم کی قدریں جمع ہو گئی تھیں اور وہ رات تمام قدروں کا مجموعہ تھی۔

دو قسم کی قدریں جیسا کہ مفردات راغب والوں نے بتایا ہے پہلی تقسیم قدر کی یہ ہے کہ وہ دفعۃً پیدائش کاملہ والی قدر اور آہستہ آہستہ ظاہر ہونے والی اجمالی قدر کی دو قسموں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ان معنوں کے رو سے اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یہ دونوں قدریں اس رات میں جمع کر دی تھیں۔ پھر یہ دونوں قدریں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں آگے جسمانی اور روحانی قدروں میں تقسیم ہو جاتی ہیں اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم جس رات میں نازل ہوا تھا اس میں یہ چاروں قسم کی قدریں جمع تھیں۔ دفعۃً کامل ظہور والی جسمانی قدر بھی اور روحانی قدر بھی اور آہستہ آہستہ مناسب موقعہ اپنے وجود کو ظاہر کرنے والی جسمانی قدر بھی اور روحانی قدر بھی۔ اب ہم ان قدروں میں سے ایک کو لے کر دیکھتے ہیں کہ کیا نزول قرآن کی رات میں اس کا وجود پایا جاتا تھا۔ پہلی قدر یک دم ظاہر ہونے والی جسمانی قدر ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ سورج یا چاند کی پیدائش کہ شروع دن سے ایک مقصد کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں اور جب تک مقدر ہے اپنے کام کو ایک ہی شان سے کرتے جائیں گے۔ اس قدر کے مشابہ قدر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تھا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا۔ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا (الاحزاب: ۴۶، ۴۷) یعنی اے نبی ہم نے تجھے گواہ اور بشارت دینے والا اور ہوشیار کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن سورج بنا کر بھیجا ہے۔ اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے ایک یہ

بھی ہے کہ آپ سورج کی طرح ہیں۔ یعنی آپ کے بعض وصف شروع دن سے کامل بنائے گئے تھے اور ان کا ظہور آپ کی روحانی پیدائش کے ساتھ ہی مکمل ہو گیا تھا۔ وہ وصف کیا تھے؟ ان کی طرف اشارہ لفظ سورج سے کر دیا گیا ہے۔ سورج کے اندر اپنی پیدائش کے لحاظ سے دو خاص وصف ہیں (۱) اوّل یہ کہ سب اجرام اس کے گرد چکر لگاتے ہیں (۲) دوم یہ کہ وہ اپنے گرد کی اشیاء کو روشن کرتا ہے۔ جہاں تک اس کے گرد چکر لگانے کا سوال ہے تمام اجرام بغیر استثناء اس کے گرد چکر لگاتے ہیں اور جہاں تک روشنی دینے کا سوال ہے وہ چیزیں جو اس کے سامنے آ جاتی ہیں انہیں وہ روشنی دیتا ہے اس کی پہلی صفت کو جسمانی کہنا چاہیے اور دوسری کو روحانی۔ کیونکہ روحانی صفت کی یہ خصوصیت کہ اس کا ظہور تعلق کی بناء پر ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی مادی نصرتیں تو ہر شخص کو خواہ مومن ہو خواہ کافر ملتی ہیں لیکن روحانی نصرتیں صرف انہی کو ملتی ہیں جو اس کے نور کے سامنے اپنی روح اور اپنے دل کو کر دیتے ہیں۔

جس دن قرآن کریم نازل ہوا اسی کے مشابہ جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی قدرتیں ظاہر ہوئیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جونہی پہلا کلام نازل ہوا آپ دنیا کے لئے سورج قرار دے دیئے گئے اور دنیا کے لئے یہ مقرر کر دیا گیا کہ وہ آپ کے گرد چکر لگائے بے شک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی ارتقاء ہوتا چلا گیا اور اب تک ہو رہا ہے مگر جہاں تک آپ کے گرد تمام دینی اجرام کے چکر لگانے کا سوال ہے اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس رات کو آپ پر خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوا اس رات کو بھی آپ پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری تھا جتنا کہ آپ کی زندگی کی آخری گھڑی میں ضروری تھا گویا جو شخص بھی خدا تعالیٰ کے فضل کو حاصل کرنا چاہے اس کے لئے ضروری تھا کہ آپ کے گرد گھومے۔ کیونکہ آپ اپنی بعثت کی گھڑی سے دنیا کے لئے سورج کی طرح ہو گئے تھے۔ تمام نظام عالم کا مدار آپ پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کا ظاہری نشان خدا تعالیٰ نے یہ مقرر فرمایا کہ جس طرح سورج کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی توڑ نہیں سکتا اسی طرح آپ کی ذات کو بھی پہلے کلام کے نزول کے وقت سے دنیا کی دستبرد سے محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ شروع سے لے کر آخر تک آپ کے دشمنوں نے آپ کو قتل کرنے کے لئے بے حد زور لگایا، سینکڑوں منصوبے کئے مگر آپ کی ذات پر آنچ نہ آئی کیونکہ آپ کا وجود سورج تھا اور سورج کو فنا کرنے پر کوئی انسان قادر نہیں ہو سکتا۔

پہلی قدرت کی دوسری قسم روحانی ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ سورج کا روشنی دینا روحانی ظہور کے مشابہ ہے کیونکہ روشنی سے وہی فائدہ اٹھاتا ہے جو اس کی طرف منہ کرتا ہے اور روحانی امور کی ہی خصوصیت ہے کہ ہر شخص ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ وہی فائدہ اٹھاتا ہے جو ان کی طرف رغبت کرتا ہے۔ یہ قدرت بھی کامل طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں پائی جاتی تھی کلام الٰہی کے نازل ہونے کے ساتھ ہی آپ کو فیض روحانی پہنچانے کی قدرت اسی رنگ میں عطا کی

گئی جس رنگ میں کہ سورج کو روشنی دینے کی قدرت حاصل ہے جب سے سورج بنا ہے وہ روشنی دیتا ہے اور یکساں روشنی دیتا ہے لیکن اسی کو دیتا ہے جو اس کے لئے اپنے دروازے کھول دیتا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے روحانیت کا نور بخشنے کی طاقت بخشی ہے اور اسی دن سے بخشی ہے جب سے کہ آپ نبی ہوئے ہیں اور یہ طاقت گھٹتی بڑھتی نہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے دن آپ کا فیض کم تھا اور بعد میں زیادہ ہو گیا جس طرح سورج کی روشنی پہلے دن سے ایک سی ہے اسی طرح آپ کا فیضان نبوت کی پہلی گھڑی سے یکساں ہے نہ اس وقت زیادہ اور اب کم۔ نہ اس وقت کم تھا اور اب زیادہ ہے۔ صرف روشنی لینے والے کے ظرف کا فرق ہے۔ جس طرح زیادہ کھلے دروازوں والے مکان میں روشنی زیادہ پڑتی ہے اور تنگ دروازوں والے مکان میں کم روشنی پڑتی ہے اسی طرح جو اپنے دل کو وسیع کرتا ہے آپ کے فیض مبارک سے زیادہ حصہ پا لیتا ہے اور جو اپنے دل کو تنگ کرتا ہے وہ کم حصہ پاتا ہے۔ لیکن جہاں تک آپ کے فیضان کا تعلق ہے وہ شروع سے اس وقت تک یکساں رہا ہے اور قیامت تک یکساں رہے گا۔

غرض جس رات قرآن کریم نازل ہوا اسی رات یک دم کامل طور پر ظاہر ہونے والی جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی قدرتیں ظاہر ہوئیں اور ایسے کامل طور پر ظاہر ہوئیں کہ اس سے پہلے کبھی ظاہر نہ ہوئی تھیں۔

دوسری قسم قدرت کی وہ ہے جو بیج کی طرح پیدا ہو کر آہستہ آہستہ پھیلتی ہے۔ اس قدرت کی جسمانی اور روحانی دونوں قسموں کا ظہور اس رات میں ہوا۔ چنانچہ انہی آیات میں جو اس دن آپؐ پر نازل ہوئیں یہ آیت ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ جس کے ایک یہ معنے ہیں کہ انسان کی پیدائش یک دم نہیں ہوئی بلکہ وہ پہلے خون کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ ترقی کر کے کمال کو پہنچتا ہے اسی طرح اسلام کی جسمانی اور روحانی ترقی ہوگی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے دن اسلام کی گٹھلی جو سورۂ علق کے ذریعہ سے رکھی گئی بڑھتے بڑھتے قرآن کریم کے درخت کی شکل اختیار کر گئی جو اس کا جسمانی ارتقاء تھا۔ درحقیقت سارا قرآن ان چند آیتوں کی تفسیر ہے جو پہلے دن نازل ہوئیں کیا ہی لطیف خلاصہ قرآنی تعلیم کا یہ آیات ہیں اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ اپنے رب کے نام سے پڑھ۔ یعنی ان صفات الٰہیہ کا اظہار کر جو اس وقت تک تجھ پر روشن ہو چکی ہیں کیونکہ وہ انکشاف جو تجھ پر صفات الٰہیہ کا ہوا ہے وہی درست ہے اور اس کے سوا سب تشریحیں صفات الٰہیہ کی غلط ہیں۔ الَّذِیْ خَلَقَ یعنی جس نے سب مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ اس لئے سب مخلوق پر اس کا تصرف ہے اور وہ اس کے قبضہ میں ہے تو حید باری کا اعلان کرنے کے بعد دنیا تیری مخالفت کرے گی مگر گھبرانے کی بات نہیں آخر مخلوق اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہے جب تو خالق کی فرمانبرداری میں لگا ہو گا تو مخلوق تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اور یاد رکھ کہ گو تیری باتیں اس وقت تیرے مخاطبوں کو

کتنی بری لگیں کتنی عجیب لگیں لیکن انسان کے اندر خدا تعالیٰ کو ملنے اور بنی نوع انسان سے نیکی کرنے کی خواہش مخفی طور پر رکھی گئی ہے۔ پہلے لوگ تیرے دشمن ہوں گے، خدا تعالیٰ سے منہ موڑنے والے ہوں گے، بنی نوع انسان پر ظلم توڑنے والے ہوں گے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کی اصلاح ہوتی جائے گی اور وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی صلح کر لیں گے اور بنی نوع انسان سے بھی ان کے تعلقات اچھے ہو جائیں گے۔ پھر فرماتا ہے اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۔ہاں ہاں پڑھ اپنے معزز ترین رب کی مدد سے یعنی ایسی تعلیم کے پیش کرنے پر ضرور مخالفت ہوتی ہے اور خصوصاً روحانی اور جسمانی لیڈر شرارت پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن خواہ دنیاوی لیڈر ہوں یا مذہبی، تو ان کی پرواہ نہ کیجیو کیونکہ ان سب معززوں سے زیادہ معزز خدا تعالیٰ کی ذات ہے وہ تیرے ساتھ ہوگی۔ کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب انسان کو ارتقاء کی آخری منازل تک پہنچا دے اور آئندہ علوم زبان کی بجائے قلم کے ذریعہ سے سکھائے جائیں یعنی علوم کی حفاظت کے لئے قلم کا استعمال اب بڑھ جائے گا۔ پھر فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ اب ایسے مادی اور روحانی علوم دنیا کو سکھائے گا کہ اس سے پہلے انسان ان سے آگاہ نہ تھا۔

غور کرو جو کچھ قرآن کریم میں نازل ہوا ہے سب انہی آیات کی تشریح ہے۔ آخر قرآن کیا ہے؟ خدا تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان صحیح تعلقات کی تعلیم۔ یہ دونوں باتیں اجمالاً ان آیات میں آ گئی ہیں اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ آیات تو ایسی ہیں جیسے کہ ماں کے پیٹ میں نطفہ کی ابتدائی حالت ہوتی ہے۔ ان آیات میں بتائی ہوئی تفسیر ترقی کرے گی اور بڑھتے بڑھتے جاندار بچہ اور پھر عالم و فاضل مرد کی طرح ہو جائے گی جو قلم سے کام لیتا ہے اور علوم و فنون کا مخزن ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان آیات میں دو باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم کی یہ آیات بڑھ کر ایک مکمل کتاب ہو جائیں گی اور دوسرے یہ کہ اس کتاب کی رو سے انسان علقہ کی حالت سے ترقی کر کے مرد کامل ہو جایا کریں گے قرآن کی تکمیل جسمانی قدرت کا ظہور ہے اور انسانوں کی روحانیت کی تکمیل روحانی قدرت کے ظہور کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ دونوں قدرتیں ایسی نہیں کہ یک دم ظاہر ہوئی ہوں یا ہوتی ہوں۔ قرآن کریم جب نازل ہوا تو آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور اب بھی جو اسے پڑھتے ہیں آہستہ آہستہ ہی پڑھتے ہیں۔ نہ پہلے یک دم نازل ہوا نہ اب کوئی یک دم اس سے واقف ہوتا ہے۔ اسی طرح روحانی ترقیات جو اسلام کے ذریعہ سے ملتی ہیں وہ بھی گو مبنی تو اسی پیغام پر ہیں جو پہلی رات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا مگر ایمان کے مطابق آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں اور اس طرح دوسری قسم کی قدرت کے روحانی ظہور کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

دوسرے معنے قدر کے مفرادت راغب نے یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو اس رات میں اتارا ہے جسے اس نے اپنی خاص قدرتوں کے لئے مخصوص کر چھوڑا تھا۔ یہ معنے بھی درست ہیں کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی خبریں پہلی کتب میں بکثرت موجود تھیں اور آپ کے زمانہ کے نشانات اور اس کی علامات نبیوں کے منہ سے خدا تعالیٰ بیان کروا چکا تھا۔ عین اس بیان کے مطابق قرآن کریم نازل ہوا۔ پس اس آیت میں فرماتا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو اسی زمانہ میں اتارا ہے جس میں اس کے اترنے کی پہلے انبیاء خبر دے چکے ہیں۔ پھر اس کے ماننے میں تم کو کیا تردّد ہو سکتا ہے۔ جب زمانہ وہی ہے جس میں اس موعود نبی اور موعود شریعت نے آنا تھا۔ اور یہ مدعی تمہارے نزدیک جھوٹا ہے اور اس کی کتاب خدا تعالیٰ پر نعوذ باللہ افتراء ہے تو پھر تم بتاؤ کہ سچا موعود اور سچی شریعت ہے کہاں؟ اگر کہو کہ کہیں بھی نہیں تو پھر تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والے نہ ہو گے بلکہ ساتھ ہی اپنے نبیوں کا انکار کرنے والے بھی بنو گے۔ کیونکہ انہوں نے اس زمانہ میں ایک نبی اور ایک شریعت کے آنے کی خبر دی ہے۔ اگر یہ جھوٹا ہے اور دوسرا کوئی سچا موعود موجود نہیں تو پھر تمہاری کتابیں بھی جھوٹی ہیں اور تمہارے انبیاء بھی جھوٹے ہیں۔

لیلۃ القدر کے لغت کے لحاظ سے چھ معنی اقرب الموارد نے قدر کے مندرجہ ذیل معنے کئے ہیں۔

(۱) برابر کی چیز کہتے ہیں ھٰذَا قَدْرُ ھٰذَا۔ یہ چیز اس کے برابر کی ہے (۲) حرمت (۳) وقار (۴) غناء (۵) قوت (۶) سہولت (اقرب)۔ ان معنوں کے رو سے اس آیت کے معنے یوں بنیں گے۔

۱۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو قیمت میں برابر کی ہے۔

۲۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو حرمت والی ہے۔

۳۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو وقار والی رات ہے۔

۴۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو غناء والی رات ہے۔

۵۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو قوت والی رات ہے۔

۶۔ ہم نے قرآن کریم کو ایک ایسی رات میں اتارا ہے جو سہولت والی رات ہے۔

اب ہم ان چھٹوں معنوں کے متعلق دیکھتے ہیں کہ آیا یہ قرآن کریم پر صادق آتے ہیں یا نہیں۔

پہلے معنے پہلے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ برابر قیمت والی رات میں ہم نے قرآن کریم کو اتارا ہے چونکہ جس چیز کے وہ برابر ہے اس کا یہاں ذکر نہیں۔ اس لئے ہم مقابل والی چیز کو محدود نہیں قرار دے سکتے اور ہمیں اس

کے یہی معنے کرنے پڑیں گے کہ ہم نے قرآن کریم کو اس رات میں اتارا ہے جو قیمت میں باقی ساری راتوں کے برابر ہے یعنی یہ رات باقی تمام دنیا کی عمر کے برابر قیمت رکھتی ہے۔ یہ معنے قرآن کریم پر چسپاں ہوتے ہیں۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور قرآن کریم خاتم الکتب ہے۔ قرآن کریم میں انسان کی ترقیات کے لئے سب تعلیمات آ گئی ہیں اور قرآن کریم ہی روحانی ارتقاء کا آخری نقطہ ہے پس جب قرآن کریم آخری تعلیم ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری شارع نبی ہیں تو یہ ثابت ہوا کہ باقی تمام انبیاء اور باقی تمام کتب مقصود نہیں بلکہ صرف ذریعہ ہیں اور ذرائع خواہ کتنے بھی زیادہ ہوں وہ مقصود سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔ پس یہ کہنا کہ ہم نے اس قرآن کریم کو برابر والی رات میں اتارا ہے درحقیقت اس کے یہی معنے ہیں کہ یہ قرآن آخری کتاب ہے اور یہ اکیلی ان تمام شریعتوں کے مقابلہ میں ہے جو اس وقت تک اتر چکی ہیں اور قرآن کریم کے نزول کا زمانہ اپنی برکات کے لحاظ سے ان تمام انبیاء کے زمانوں کے برابر ہے جو کبھی بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے تھے پس اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ میں درحقیقت قرآن کریم کے آخری اور سب سے مکمل کتاب ہونے کا دعویٰ بیان کیا گیا ہے اور ان چھوٹے سے الفاظ میں قرآن کریم کی ان ہزاروں خوبیوں کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے جو خدا تعالیٰ نے اس کے الفاظ میں مخفی رکھی ہیں۔ اس مضمون کو اگر تفصیل سے بیان کیا جائے تو اس کے لئے کئی ہزار صفحات کی ایک مستقل کتاب چاہیے اس لئے میں تفصیل میں نہیں جاتا اسی قدر مضمون کا بیان کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

دوسرے معنے دوسرے معنے اس آیت کے لغت کے لحاظ سے یہ بتائے گئے تھے کہ قرآن کریم حرمت والی رات میں اترا ہے یعنی قرآن کریم کا نزول ایک ایسی رات میں ہوا ہے یا ایسے تاریک زمانہ میں ہوا ہے جس کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جو چیز عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے وہ کبھی مٹائی نہیں جاتی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (الرّعد:۱۸) جو چیز نفع رساں ہوتی ہے وہ ہمیشہ کے لئے قائم رکھی جاتی ہے۔ بیت اللہ کو بھی بیت الحرام کہا جاتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اس کی حفاظت کی جاتی ہے اور اس کے اعزاز کو ہمیشہ قائم رکھا جاتا ہے پس حرمت والی رات کے معنے یہ ہیں کہ جس کے حقوق کو ہمیشہ قائم رکھا جائے گا۔ ان معنوں کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ قرآن کریم اس زمانہ میں اترا ہے جو آخری زمانہ ہے اور جس زمانہ کو کوئی اور زمانہ بدلے گا نہیں اور ہمیشہ اس زمانہ کی عزت کو قائم اور اس کی حکومت کو استوار رکھا جائے گا۔ یہ معنے بھی قرآن کریم پر چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کے نزول کا زمانہ ہمیشہ کے لئے دنیا کی راہنمائی کا

زمانہ قرار دیا گیا ہے۔ جب بھی کوئی شخص ہدایت اور راہنمائی حاصل کرنا چاہے اس کو اسی رات کی طرف نظر اٹھانی پڑتی ہے اور اسی رات کی برکتیں انسان کو ہدایت اور راستی پر لاسکتی ہیں اور کبھی بھی اس رات سے نکلی ہوئی ہدایت اور راستی کی راہیں مسدود نہیں ہوتیں۔ وہ چلی آتی ہیں اور چلی جائیں گی اور قیامت تک ان کا سلسلہ ممتد رہے گا۔

تیسرے معنے تیسرے معنے اس آیت کے یہ تھے کہ قرآن کریم وقار کی رات میں اتارا گیا ہے۔ وقار کے معنے بوجھ، سمجھ اور عقل کے ہوتے ہیں۔ پس اس آیت کے یہ معنے ہوئے کہ قرآن کریم ایک ایسی رات میں اتارا گیا ہے جو عقل اور سمجھ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور بوجھل ہے یعنی جس کی تعلیمات دشمن کے حملہ اور اس کی تنقید سے اپنی جگہ سے ہل نہیں جاتیں۔ یہ معنے بھی قرآن شریف پر پوری طرح چسپاں ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی حکمتوں پر مبنی ہے اور ہر ایک حکم جو دیا جاتا ہے اس کی وجہ بھی بتائی جاتی ہے۔ کیوں اس حکم پر عمل کرنا چاہیے، اس کے کیا فوائد ہیں، اس کو چھوڑا جائے تو اس کے کیا نقصانات ہوں گے اور اس طرح وزنی دلائل سے اسے ثابت کیا جاتا ہے کہ کسی فلسفہ کی تنقید بھی اس کے دلائل کو رد نہیں کرسکتی۔ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ ایسی وزنی چیز ہوتی ہے کہ دشمن خواہ اس کو کتنا بھی دھکیلنے کی کوشش کرے آخر اسے شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

چوتھے معنے چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کریم ایک ایسی رات میں نازل ہوا ہے جو غناء والی رات ہے۔ غناء کے معنے عربی زبان میں ضرورت کے پورا ہونے اور سہولت کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم اس رات میں نازل ہوا ہے یا اس تاریک زمانہ میں نازل ہوا ہے جو ضرورتوں کو پورا کرنے والا تھا۔ یہ معنے بھی قرآن کریم پر صادق آتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر قسم کی روحانی اور دینی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (العنکبوت:۵۲) کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ مکمل کتاب اتاری ہے جو سنائی جاتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ ہے (یونس:۳۸) یعنی شریعت کی تمام تفصیلات کو بیان کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (یوسف:۱۱۲) یعنی قرآن کریم تمام ضروری دینی امور کی تفصیل بیان کرتا ہے اور ہر قسم کے مومنوں کے لئے اس میں ہدایت اور رحمت ہے۔ خود اسی آیت زیر تفسیر میں بھی اس مضمون پر روشنی ڈالی گئی ہے چنانچہ فرمایا تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ہر قسم کی باتیں اللہ تعالیٰ کے اذن سے ملائکہ..... لیلۃ القدر کی رات میں لے کر نازل ہوتے ہیں۔ پس قرآن کریم وہ کتاب ہے جو تمام دوسری مذہبی کتب سے انسان کو مستغنی بنا

دیتی ہے اور تمام ضروری امور اس میں بیان ہوئے ہیں پس اس کا نزول غناء والے زمانہ میں ہوا ہے۔

پانچویں معنے پانچویں معنے اس لفظ کے قوت کے ہیں جس کے رو سے اس آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ قرآن کریم قوت والی رات میں نازل ہوا ہے یعنی اس رات کے ساتھ خدا تعالیٰ کی قوت اور اس کی طاقت وابستہ ہے۔ چنانچہ یہ معنے بھی قرآن کریم پر صادق آتے ہیں اور یہ معنے مفردات امام راغب کے معنوں کے سلسلہ میں اوپر بیان ہو چکے ہیں اس لئے اس جگہ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

چھٹے معنے چھٹے معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم سہولت والی رات میں نازل ہوا ہے۔ یہ معنے بھی قرآن کریم اور اس کے زمانہ پر صادق آتے ہیں۔ پہلی کتابوں کو دیکھو ان کے اندر مذہب کو بھول بھلیاں بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ نہ عقائد سمجھ میں آ سکتے ہیں نہ اعمال قابل اتباع ہیں۔ یہودیوں اور ہندوؤں کی تعلیم عبادت کے متعلق اگر لی جائے تو اتنی اتنی شرطیں بلا وجہ عبادت کے ساتھ لگا دی گئی ہیں کہ اوّل تو سارے آدمی اس طرح عبادت کر ہی نہیں سکتے اور اگر کریں تو تکلیف مالا یطاق میں پڑتے ہیں۔ دوسرے ایسے وہموں میں مبتلا ہوتے ہیں جن کو تسلیم کرنا انسانی دماغ کے لئے بڑا دوبھر اور مشکل ہوتا ہے۔ قرآن کریم ہی ایک ایسی تعلیم ہے جس کا ماننا انسان کے لئے آسان اور جس پر عمل کرنا بھی انسان کے لئے آسان ہے۔ چنانچہ قرآن کریم خود یہ دعویٰ فرماتا ہے کہ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر:۱۸) ہم نے قرآن کریم کو کیا بلحاظ دماغ کے اور کیا بلحاظ عمل کے آسان کر دیا ہے۔ پس کیا کوئی شخص ایسا ہے جو نصیحت حاصل کرے یا عمل کرے۔ اس جگہ پر لفظ ذکر استعمال کر کے دونوں معنے لے لئے گئے ہیں۔ ذکر کے معنے یاد کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور عمل کرنے کے بھی ہوتے ہیں پس اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیمات کا دماغ سے گذرنا بھی انسان پر آسان رہتا ہے یعنی ان کا ماننا انسان کو دوبھر معلوم نہیں ہوتا اور قرآن کریم کی تعلیموں پر عمل کرنا بھی انسان کے لئے آسان ہوتا ہے کیونکہ اس میں ہر طاقت اور قوت اور ضعف اور کمزوری کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً نماز کا حکم ہے اس کے لئے ارشاد ہے کہ نماز مسجدوں میں پڑھنی چاہیے (ابوداؤد کتاب الصلاۃ باب فی الجمع فی المسجد) لیکن ساتھ ہی یہ ارشاد ہے کہ ساری زمین ہی خدا تعالیٰ کی مسجد ہے (بخاری کتاب الصلاۃ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجدا) گویا نہ کسی خاص قسم کے مکان کی ضرورت ہے نہ خاص قسم کے سامان کی ضرورت ہے نہ نماز پڑھانے کے لئے کسی خاص قسم کے پادری یا پنڈت کی ضرورت ہے۔ جس زمین کو چاہو صاف کر لو اور مومنوں میں سے جس کو چاہو آگے کھڑا کر کے نماز پڑھ لو۔ لیکن اگر کوئی شخص بیمار ہے یا سفر پر ہے تو جماعت کے بغیر بھی نماز ہو سکتی ہے۔ نماز کے لئے وضو کی شرط ہے لیکن اگر انسان

بیمار ہو یا پانی نہ ملے تو وہ بغیر وضو کے تیمم سے بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر اتنا بیمار ہے کہ کھڑا نہیں ہوسکتا تو گھر میں بیٹھ کر بھی نماز پڑھ سکتا ہے اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں تو لیٹے ہوئے سر کے اشارہ سے بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر اس حالت سے بھی گیا گذرا مریض ہے تو وہ انگلی یا آنکھ کے اشارہ سے بھی نماز ادا کرسکتا ہے اور جو اس کی بھی طاقت نہ رکھے وہ صرف دل میں ہی نماز کے مضمون کو دہرا کر اپنی نماز ادا کرسکتا ہے۔ بیہوش ہو جائے تو وہی نماز دوسرے وقت میں ادا کرسکتا ہے اور یہ ایک ہی مثال نہیں بلکہ ہر حکم کے متعلق اسی طرح ضرورت اور طاقت کے مطابق تبدیلی پیدا کی گئی ہے۔ پس قرآن کریم کی تعلیم سہولت والی تعلیم ہے۔

اگر کوئی کہے کہ یہاں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ اس رات میں قرآن کریم نازل ہوا ہے یہ کیوں نہ کہا گیا کہ قرآن ایسا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ پر خالی قرآن کا مضمون بیان نہیں بلکہ اس سے زیادہ مضامین کی طرف اشارہ کرنا مدنظر ہے۔ جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔ یہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع اظلال کا بھی ذکر ہے۔ اگر آیت کے یہ الفاظ ہوتے کہ قرآن کریم ایسی ایسی شان کا ہے تو یہ مضمون باہر رہ جاتے۔ پس زمانہ کی طرف وہ صفات منسوب کردی گئی ہیں تا کہ یہ مضمون یکساں طور پر کتاب پر بھی چسپاں ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی چسپاں ہو اور دوسرے معموروں پر بھی چسپاں ہو۔

لیلۃ القدر سے مراد خاص رات یا تاریک زمانہ جیسا کہ اوپر کے مضمون سے ظاہر ہے میں نے لیلۃ القدر کے دونوں معنے لئے ہیں (۱) یہ بھی کہ وہ معین رات جس میں قرآن کریم نازل ہوا قرآن کریم کے نزول کی وجہ سے ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ اسے لیلۃ القدر کہنا چاہیے (۲) اور یہ معنے بھی میں نے لئے ہیں کہ لیلہ سے مراد وہ رات نہیں جس میں قرآن کریم نازل ہوا بلکہ وہ تاریک زمانہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایسے تاریک زمانوں میں ہی خدا تعالیٰ کی غیرت جوش میں آ کر آئندہ نیکی اور تقویٰ کی بنیاد رکھا کرتی ہے اور جب تاریکی بڑھتے بڑھتے خدا تعالیٰ کے فضل کو کھینچتی ہے تو اس وقت وہ تاریکی کا زمانہ بظاہر تاریک ہوتا ہے لیکن بالقوہ اس کے اندر قدرت خداوندی پائی جاتی ہے گویا لیلۃ القدر ایک جہت سے رات ہے اور ایک جہت سے دن سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ وہ اظہار قدرت کا وقت بھی ہے اور وہ تاریک وقت بھی ہے۔ دنیا کی نگاہوں میں وہ تاریکی کی انتہاء کو ظاہر کرنے والا وقت ہے اور خدا تعالیٰ کی نظر میں وہ آئندہ آنے والی عظیم الشان روشنی کے لئے ایک بیج کا کام دے رہی ہے گویا اس رات کی مشابہت رحم مادر کے ساتھ ہے جبکہ اس کے اندر نطفہ پڑ چکا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ

الْمُلْكُ (الزمر:۷) یعنی خدا تعالیٰ تمہاری ماؤں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ تین قسم کی ظلمتوں میں سے گذارتے ہوئے تمہیں پیدا کرتا ہے جس کے بعد تم ایک مکمل انسان بن جاتے ہو۔ تمہارا رب ایسا ہے سب اختیار اسی کے قبضہ میں ہے۔ پس جس طرح رحم مادر جس کے اندر نطفہ ٹھہر گیا ہو گو ایک تاریک کوٹھڑی کی طرح ہوتا ہے اس میں انسانی پیدائش کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اسی طرح لیلۃ القدر رحم مادر کی طرح بظاہر تاریک ہے لیکن قوم اور نسل کی پیدائش کی بنیاد اس میں رکھی جاتی ہے۔

(۳) تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا ہے یعنی اس زمانہ میں پیدا کیا گیا ہے جس میں لوگ اللہ تعالیٰ سے دور چلے جاتے ہیں اور آسمانی نور بالکل کھینچ لیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں سے انسان محروم رہ جاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص بندہ نازل ہوتا ہے جو دوبارہ دنیا کو روشنی اور ہدایت کی طرف لاتا ہے۔ یہی رات نبی کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے۔ اگر دنیا پر تاریک روحانی رات نہ آئی ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصلاحی نبی نہیں آیا کرتا۔

انبیاء کی دو قسمیں تعمیری و اصلاحی

انبیاء کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تعمیری اور ایک اصلاحی۔ تعمیری انبیاء وہ ہوتے ہیں جو عقائد یا مسائل مہمہ میں خرابی کے وقت نازل ہوتے ہیں اور ایک نئے دین کی تعمیر کرتے ہیں یا ایک نئی تشریع کی بنیاد رکھتے ہیں اور اصلاحی وہ جو بغیر خرابی کے وقوع کے نبی کے کام کو جاری رکھنے کے لئے آتے ہیں۔ تعمیری نبی ایسے ہیں جیسے حضرت موسیٰ، حضرت مسیحؑ اور آنحضرت صلعم کہ یہ اس وقت آئے جب شرائع مٹ چکی تھیں یا ان کے معنے لوگوں کی نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ اور اصلاحی نبی ایسے ہیں جیسے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد اسحاقؑ ان کے بعد یعقوبؑ ان کے بعد یوسفؑ۔ ان نبیوں کے وقت میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی تھی جسے مٹانے اور پھر شریعت کو قائم کرنے کے لئے وہ آئے ہوں بلکہ ان کی بعثت کی غرض صرف یہ تھی کہ تعلیم الٰہی جو آ چکی تھی اسے اپنے عمل اور نگرانی سے وہ مزید راسخ کریں یا جو اب تک نہیں مانے ان میں پھیلائیں۔ اصل میں تو یہ دونوں قسم کے نبی ایک نسبتی رات کے وقت میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن تعمیری نبیوں کے زمانہ کی تاریکی ظاہر و باہر ہوتی ہے اور اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الروم:۴۲) یعنی یقیناً خشکی اور تری میں یعنی نبیوں کو ماننے والی اور نہ ماننے والی قوموں میں فساد ظاہر ہو چکا ہے اور یہ سب کچھ انسانوں کے اعمال سے ہوا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کا کلام چھوڑ دینے کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے

بعض اعمال کی سزا جن کی سزا اس دنیا میں مقدر ہے ان کو یہاں دے گا تا اس عذاب کی وجہ سے ان کے دل میں توبہ کی طرف توجہ پیدا ہو اور وہ دوبارہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔

اللہ تعالیٰ اسی تاریکی کی حالت کی طرف اشارہ کر کے اس آیت میں فرماتا ہے اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقیناً لیلۃ القدر میں مبعوث فرمایا یعنی ایسی روحانی رات میں جو تقاضا کرتی ہے کہ اس میں کوئی رسول نازل کیا جائے جو لوگوں کی اصلاح کرے اور انہیں تاریکی سے نکالے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتا ہے یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمۡ كَثِیۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِیۡرٍ ۬ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ یَّهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَ یَهۡدِیۡهِمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (المائدۃ:۱۶، ۱۷) یعنی اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس اس لئے آیا ہے کہ بہت سے انوار بائبل کے جو تمہاری بدعملیوں کی وجہ سے ظاہر نہ ہو سکتے تھے تم پر دوبارہ ظاہر کرے اور تمہاری کمزوریوں سے در گذر کرے سنو! تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور (یعنی رسول) اور سب باتیں کھول کر بیان کرنے والی ایک کتاب آئی ہے ان میں سے ہر ایک کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انہیں جو اس کی بات پر چلتے ہیں سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت بخشتا ہے اور اللہ کا رسول اللہ کے حکم سے انہیں جو اس کی بات مانتے ہیں موجودہ ظلمت سے نکال کر خاص نور کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور انہیں صراط مستقیم کی طرف لے جاتا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریکی کا زمانہ تھا یعنی ایک روحانی رات تھی اور ایسے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کو نازل کر کے بنی نوع انسان کو پھر سے سلامتی کی راہیں دکھائیں اور ترقیات کے راستے ان کے لئے کھولے۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ میں ضمیر کا مرجع آنحضرتؐ پس اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ میں ہٗ کی ضمیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی جا سکتی ہے اور اس کا قرینہ بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ جس طرح سورۃ العلق میں جو اس سے سے پہلی سورۃ ہے اِقۡرَاۡ کے الفاظ سے قرآن کریم کو پیش کیا گیا تھا اسی طرح اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر تھا۔ چنانچہ اس سورۃ کی مندرجہ ذیل آیات میں آپ ہی کا ذکر ہے۔ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡهٰی عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی یعنی تو مجھے اس شخص کا حال تو بتا جو ایک ''عظیم الشان بندہ'' کو جب وہ نماز پڑھتا ہے نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ پس جس طرح اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ میں قرآن کریم کی طرف ضمیر جا سکتی ہے جیسا کہ پہلے بیان کردہ معنوں میں مَیں نے اس طرف ضمیر

پھیری ہے اسی طرح اَنْزَلْنٰهُ کی ضمیر اَرَءَیْتَ کی تاء کی طرف اور عَبْدًا کی طرف بھی جاسکتی ہے۔ پس اس آیت کے دوسرے معنے یہ بھی ہیں کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ القدر میں اتارا ہے۔

انبیاء کبار کے دنیا میں آنے کے اوقات جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں تمام انبیاء کبار اسی زمانہ میں نازل ہوتے ہیں جب دنیا میں تاریکی اور ظلمت کا دور دورہ ہوتا ہے اور ایسے وقت میں اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی نہ آئے تو یقیناً لوگوں کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی ہستی کے بارہ میں شبہ پیدا ہوگا قرآن کریم بار بار اس دلیل کو پیش کرتا ہے کہ ضرورت کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ یٰسٓ میں آتا ہے وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۖۚ اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ (یٰس: ۳۴) یعنی تمہارے لئے مردہ زمین میں ایک نشان ہے خدا تعالیٰ اسے زندہ کرتا ہے اور پھر اس میں سے دانے نکالتا ہے جس میں سے تم کھاتے ہو۔ یعنی جب بھی زمین مردہ ہوجاتی ہے ذخائر کو ختم ہونے سے بچانے کے لئے خدا تعالیٰ ہمیشہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور زمین کو دوبارہ زندہ کردیتا ہے یعنی کیا کفار یہ خیال نہیں کرتے کہ جو خدا ان کی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے وہ ان کی روحانی ضرورتوں کو پورا نہ کرے گا اور بوقت ضرورت نبی نہ بھیجے گا۔ سورۂ روم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ۔ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (الروم: ۴۹ تا ۵۱) یعنی اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے پھر وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر ان بادلوں کو جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے (یعنی ہر ملک کے لئے ہواؤں کے الگ الگ رخ مقرر ہیں جن کے مطابق بادل پھیل جاتے ہیں) پھر جب ان بادلوں کو اپنے جن بندوں تک چاہتا ہے پہنچاتا ہے تو وہ اچانک (بعد مایوسی کے) خوش ہوجاتے ہیں اور گو وہ بہت عرصہ سے اس بارش کے نزول سے ناامید ہوچکے تھے۔ پس تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار کو دیکھ کس طرح وہ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کردیتا ہے یہی خدا مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں تو مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر ہے کیونکہ گمراہوں کو ہدایت بخشنا یا دینی علوم سے ناواقفوں کو علوم الٰہی کی خبر دینا بھی مردہ زندہ کرنا کہلاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال: ۲۵) یعنی اے مومنو! جب خدا اور اس کا رسول تم کو بلائیں تو ان کی بات مانا کرو کیونکہ تم مردہ ہو وہ تم کو زندہ کرنے کے لئے

بلاتے ہیں اور تمہارا اپنا فائدہ اس میں ہے کہ تم ان کی آواز سنو۔ انہی مردوں کی نسبت یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یعنی ان پر رات طاری ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الانعام:۴۰) یعنی وہ لوگ جو ہمارے نشانوں کا انکار کرتے ہیں بہرے اور گونگے ہیں اور اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ خدا تعالیٰ جس کی نسبت چاہتا ہے گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے اور جس کی نسبت چاہتا ہے اسے سیدھے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (المائدۃ:۱۷) یعنی یہ رسول لوگوں کو تاریکیوں میں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔

آنحضرت صلعم کا بروقت دعویٰ نبوت

مذکورہ بالا آیات سے ظاہر و ثابت ہے کہ جب بھی دنیا پر روحانی تاریکی چھا جاتی ہے اور لوگ روحانی طور پر مرجاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رسول ضرور مبعوث ہوتا ہے۔ پس ان معنوں کی رو سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین جو شدید ترین تاریکیوں کا زمانہ تھا ایک نبی کا مبعوث ہونا ضروری تھا اور آپ کا دعویٰ بالکل مناسب وقت پر تھا۔ دنیا پیاسی ہو رہی تھی اسے آسمانی پانی کی ضرورت تھی اس پر موت طاری تھی اسے ایک زندہ کرنے والی ہستی کی احتیاج تھی۔ دنیا پر ایک تاریک رات طاری تھی اسے ایک روحانی سورج کی ضرورت تھی جو رات کی ظلمت کو دور کرے اور اسے ایمان کی روشنی بخشے۔ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ایک دوسری آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب:۴۷) قرار دیا ہے۔ غرض یہ فرما کر کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے آپ کی صداقت کی ایک ایسی زبردست دلیل دی گئی ہے جس کا کوئی مذہب انکار نہیں کر سکتا۔ کون سا مذہب ہے جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دنیا پر جب جب بھی ظلمت اور تاریکی کا دورہ آتا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک مامور اسے روشنی بخشنے کے لئے ضرور اس زمانہ میں مبعوث ہوتا ہے۔ بائبل بھی اس پر متفق ہے۔ مسیحؑ کیوں آیا؟ اسی لئے کہ بنی اسرائیل پر ایک رات طاری ہوگئی تھی۔ ہندو مذہب کرشن جی کی دوبارہ بعثت کا کیوں امیدوار ہے؟ اس لئے کہ وہ زمانہ کلجگ کا ہوگا۔ بدھ مت اور زردشت مذہب بھی اسی امر کے مدعی ہیں کہ جب جب تاریکی کا زمانہ دنیا میں آئے گا خدا تعالیٰ کے مامور بھی ظاہر ہوتے رہیں گے۔ پھر کس طرح ہو سکتا تھا کہ سب سے زیادہ تاریک زمانہ جس میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا گذر رہی تھی اس میں کوئی مامور مبعوث نہ ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو سب مذاہب جھوٹے ثابت ہو جاتے۔ خدا تعالیٰ کا وجود ایک واہمہ بن کر رہ جاتا۔ پس

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ کی آیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ اس تاریک رات کو روشن کرنے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سوا اور کون آیا؟ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ نعوذ باللہ جھوٹا تھا تو پھر سب مذاہب ہی جھوٹے ہوئے کہ جو اس امر پر متفق ہیں کہ تاریکی اور ظلمت کے وقت کے لمبا ہو جانے کی صورت میں ضرور خدا تعالیٰ کا روحانی سورج چڑھتا ہے جس طرح جسمانی رات کے بعد خدا تعالیٰ کا جسمانی سورج چڑھتا ہے۔

اس جگہ ایک لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ مسیحی مصنف جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کی کامیابی کی یہ دلیل دیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے زمانے میں آئے تھے جب سارے مذاہب بگڑ چکے تھے اس لئے آپ کی تعلیم کامیاب ہوگئی (میزان الحق پادری فنڈر فصل ۵ صفحہ ۳۴۲)۔ انہیں یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ ہم اس دلیل سے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔ اگر اس زمانہ میں سارے مذاہب بگڑ چکے تھے اور اس وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف عیسائیوں اور دوسری طرف ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو گیا تو سوال یہ ہے کہ ایسے ہی زمانہ میں تو خدا تعالیٰ کے رسول آیا کرتے ہیں۔ اگر وہ زمانہ واقعہ میں ایسا تھا کہ دنیا کے مذاہب بگڑ چکے تھے اور لوگ اپنے مذاہب کی تعلیمات سے دور جا چکے تھے تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے یا تکذیب؟ کیا نبی دنیا میں ایسے زمانہ میں بھی آیا کرتا ہے جب سارے لوگ راستی اور صداقت پر قائم ہوں اور وہ نیک اور با اخلاق ہوں۔ کیا مسیحؑ کی کامیابی کی وجہ یہ نہ تھی کہ لوگ بگڑ چکے تھے اور وہ نیکی اور تقویٰ کو ترک کر چکے تھے اس لئے صداقت جھوٹ پر غالب آ گئی؟ کیا موسیٰؑ کی کامیابی کی یہی وجہ نہیں تھی؟ کیا کرشنؑ اور رام چندرؑ اور زرتشتؑ اور بدھ کی کامیابی کی یہی وجہ نہیں تھی بلکہ ان کے نزول کی یہی وجہ تھی۔ اگر اس وجہ سے کسی نبی کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے تو پھر تمام نبیوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ کوئی نبی بھی ایسے زمانہ میں نہیں آیا جب لوگ درست حالت میں ہوں۔ ہمیشہ ہی بد اخلاقی، بے ایمانی اور گندگی کے پھیل جانے کی صورت میں ہی نبی آیا کرتے ہیں۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ میں محمد رسول اللہ کے بار بار دنیا میں آنے کی پیشگوئی چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کو لیلۃ القدر میں اتارتے رہتے ہیں یعنی نہ صرف قرآن کا پہلا نزول ایک تاریک زمانہ میں ہوا ہے بلکہ آئندہ بھی جب دنیا میں تاریکی کا زمانہ آئے گا قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ دنیا میں اتریں گے اور پھر بنی نوع انسان کی راہنمائی اور ہدایت کا موجب

ہوں گے۔ یعنی ایسا زمانہ کوئی نہ آئے گا کہ دنیا میں خرابی ہو اور قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم اس کی ہدایت کا موجب نہ ہو سکیں اور کسی نئی شریعت کی ضرورت پیش آجائے بلکہ جب کبھی قرآن کا نور دنیا سے مٹنے لگے گا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی پر پردہ پڑ جائے گا خدا تعالیٰ دوبارہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مثیل روحانی وجودوں کو دنیا میں مبعوث فرمائے گا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو بھی ظاہر کریں گے اور قرآن کریم کی تعلیم کو بھی دوبارہ روشن کر دیں گے اور ثابت کر دیں گے کہ خرابی نہ قرآن میں تھی نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی بلکہ بنی نوع انسان کے فہموں میں خرابی تھی کہ وہ قرآن کریم کے معانی کے سمجھنے سے قاصر ہو گئے تھے یا ان کے دلوں میں خرابی تھی کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اپنے اندر لینے سے محروم ہو گئے تھے۔

دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الجمعة: ۳، ۴) ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس زمانہ میں بھی نازل فرمایا تھا جس زمانہ میں کہ آپ کی جسمانی بعثت ہوئی تھی اور آئندہ پھر اس زمانہ میں بھی نازل فرمائے گا جبکہ ایسے ہی حالات پیدا ہو جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ آپ کا ایک مثیل ظاہر فرمائے گا جو آپ کی نیابت میں دنیا کو پھر اسلام کی طرف واپس لائے گا اور اسلام کی شوکت کو دنیا میں قائم کرے گا۔ اسی زمانہ کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس زمانہ میں قرآن کریم بھی آسمان پر اٹھ جائے گا اور وہ موعود پھر قرآن کو واپس لائے گا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم) قرآن کریم کا صرف نام اور اس کے الفاظ باقی رہ جائیں گے اس کے معانی سے لوگ ناواقف ہو جائیں گے۔ پس وہ موعود پھر قرآن کو آسمان سے واپس لائے گا اور قرآن اپنے کامل علوم اور معرفت سمیت پھر دنیا میں آجائے گا اور یہی نہ ہوگا کہ دنیا کے پاس فقط اس کا نام اور نشان باقی ہو۔ خود اس سورۃ میں بھی اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر بیان فرمایا گیا ہے تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا جو ایک استمرار کا صیغہ ہے یعنی ایسی لیلۃ القدر کی راتیں کئی آنے والی ہیں اور ان میں خدا تعالیٰ کے ملائکہ اور روح اترا کریں گے۔ پس جب لیلۃ القدر کئی آنے والی ہیں اور ان میں ملائکہ اور روح اترنے والے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آیت زیر تفسیر میں اَنْزَلْنَا کے معنے صرف ماضی کے نہیں بلکہ مستقبل کے بھی ہیں اور قرآن کریم میں ماضی بمعنے مستقبل کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل بروزوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن چونکہ ناقص بروز بھی بروز ہی ہوتا ہے اس لئے یہ آیت ناقص بروزوں کے متعلق بھی اشارہ کرتی ہے یعنی ایسے زمانہ کے مصلحین کی نسبت بھی جبکہ کامل تاریکی تو نہیں آئے گی لیکن ایک نئی زندگی کی ضرورت انسان کو محسوس ہوگی۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ ہر صدی کے سر پر دنیا کو ایک ہوشیار کرنے والے کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور اسلام میں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر مجدد بھیجتا رہے گا (ابی داؤد، کتاب الملاحم باب ما یذکر فی قرن المائۃ)۔ ان مجددوں کے متعلق بھی اس آیت میں پیشگوئی موجود ہے کیونکہ وہ بھی جزوی طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہوتے ہیں اور ایک جزوی تاریک رات میں ان کا ظہور ہوتا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ کے یہ معنے کہ قرآن کریم لیلۃ القدر کے بارہ میں نازل ہوا ہے

پانچویں معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم لیلۃ القدر کی بزرگی میں نازل فرمایا ہے۔ ان معنوں کے رو سے فِيْ کے معنے متعلق کے ہوں گے۔ یعنی یہ معنے نہیں ہوں گے کہ لیلۃ القدر میں قرآن نازل ہوا ہے بلکہ یہ معنے ہوں گے کہ لیلۃ القدر کے بارہ میں قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ بالعموم مفسرین نے یہی معنے لئے ہیں اور وہ اس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ قرآن کریم اس لیلۃ القدر کی جو رمضان کے آخر میں آتی ہے۔ بڑائی اور بزرگی بیان کرتا ہے (فتح البیان زیر آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ)۔ اگر آیت کے یہ معنے کئے جائیں تو سوال پیدا ہوگا کہ وہ لیلۃ القدر جس کی طرف اس سورۃ میں توجہ دلائی گئی ہے کیا چیز ہے؟ مفسرین کا خیال ہے کہ لیلۃ القدر سے مراد اس جگہ پر رمضان کی راتوں میں سے وہ رات ہے جس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں متعدد جگہ پر ذکر آتا ہے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ لَمَّا حَضَرَ رَمَضَانُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَآءَكُمْ شَهْرُ رَمَضَانَ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ اِفْتَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهٗ تُفْتَحُ فِيْهِ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَتُغْلَقُ فِيْهِ اَبْوَابُ الْجَحِيْمِ وَتُغَلُّ فِيْهِ الشَّيَاطِيْنُ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ مَنْ حُرِمَ خَيْرُهَا فِيْهِ فَقَدْ حُرِمَ (مسند احمد بن حنبل مسند ابو ہریرۃ) یعنی اے لوگو رمضان کا مہینہ آ گیا ہے یہ مبارک مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اس مہینہ کے روزے فرض کئے ہیں۔ اس مہینہ میں جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں (یعنی نیکیوں کی زیادتی ہو جاتی ہے اور مومن روزوں کے اثر کی وجہ سے گناہوں سے بہت اجتناب کرنے لگتے ہیں) اور شیطانوں کو اس مہینہ میں بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں (یعنی جو مسلمان بدیوں کے ارتکاب کے عادی ہو جاتے ہیں وہ بھی اپنے بھائیوں کی

قربانیوں کو دیکھ کر احتیاط کرنے لگ جاتے ہیں) اس مہینہ میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینہ سے بہتر ہے جو رمضان میں بھی اس رات کی برکات سے محروم رہے وہ بڑا محروم آدمی ہے۔

نسائی نے بھی ابوایوب انصاریؓ سے اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے بخاری اور مسلم میں ابوہریرہ سے روایت ہے اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَامَ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ (بخاری کتاب فضل لیلۃ القدر باب فضل لیلۃ القدر) یعنی جو شخص لیلۃ القدر کو خوب جاگے اور عبادت کرے اور یہ اس کی عبادت رسماً یا ریا کے طور پر نہ ہو بلکہ ایمان اور خدا تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے ہو تو اس کے وہ سب گناہ جو وہ پہلے کر چکا ہے معاف ہو جاتے ہیں۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی ایک رات کا نام لیلۃ القدر رکھا ہے اور اس کی نسبت ایسی صفات بیان فرمائی ہیں جو قرآن کریم کی بیان کردہ لیلۃ القدر سے ملتی ہیں۔ مثلاً اس کا ہزار مہینوں سے اچھا ہونا یا گناہوں کی بخشش کی صورت میں سلامتی لانا۔ یہ تشابہ ضرور اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس سورۃ میں جس لیلۃ القدر کا ذکر ہے اسی کا ذکر احادیث میں ہے یا کم سے کم یہ کہ اس لیلۃ القدر کی طرف بھی اس سورۃ میں اشارہ ہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عقل اور انصاف کے مطابق ہے کہ ایک رات کو جو دوسری راتوں کی طرح کی ایک رات ہے ایسی برکات کا موجب سمجھ لیا جائے اور کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ اس ایک رات میں عبادت کرنے والا سب گذشتہ گناہوں سے نجات پا جائے۔ کیا اس سے نیک اعمال سے استغناء پیدا نہیں ہوتا؟

اس شبہ کا یہ جواب ہے کہ اگر صرف یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں رات میں عبادت کر لو تمام گناہ بخشے جائیں گے تو یہ بات ضرور خلاف عقل اور قوم میں وہم پیدا کرنے والی ہے۔ لیکن لیلۃ القدر کے ساتھ جو شرائط اور جو امور وابستہ ہیں ان کے ہوتے ہوئے یہ شبہ درست نہیں رہتا۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے بلکہ انسانی دماغ کی اہم خصوصیتوں میں سے ہے کہ خیالات کا انتقال Association of ideas انسانی اعمال پر ایک نہایت ہی گہرا اثر رکھتا ہے۔ ایک انسان اپنے عزیز کی قبر پر جاتا ہے تو گو اس کے سامنے صرف ایک مٹی کا ڈھیر ہوتا ہے مگر اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ قبر اسے اپنے عزیز کی یاد دلاتی ہے اور اس یاد کے ساتھ ہی حافظہ ان تعلقات کو سامنے لا کھڑا کرتا ہے جو اس مرحوم کی زندگی میں اس کے اور اس عزیز کے درمیان تھے ایک ایک کر کے واقعات اس کے حافظہ میں

تازہ ہونے شروع ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ احساس مل کر کہ اب وہ باتیں پھر نہیں ہو سکتیں اس کے دل کی کیفیت عجیب قسم کی ہو جاتی ہے حالانکہ اس عزیز کی موت کوئی نیا واقعہ نہیں ہوتا اور نہ گذشتہ واقعات کوئی نیا علم پیدا کرتے ہیں مگر وہی پرانی قبر اور پرانے واقعات قبر کو دیکھ کر مردہ جذبات کو زندہ کر دیتے ہیں اور سوئے ہوئے احساسات کو جگا دیتے ہیں۔ اسی طرح لوگ پیدائش کے دن مناتے ہیں، شادی کے دن مناتے ہیں اس لئے کہ گو شادی اور پیدائش کا علم تو ہر روز ہی ہوتا ہے خاص دنوں میں ان کا علم نیا نہیں پیدا ہوتا لیکن انتقال خیالات کا بہترین موقعہ وہی دن پیدا کرتا ہے جس دن کوئی پیدا ہوا ہوتا ہے یا جس دن ایک جوڑے کی شادی ہوئی ہوتی ہے۔

مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ کا ایک عہد اور اس عہد کی یاد میں لیلۃ القدر کا قیام اسی حکمت کو مدنظر رکھتے ہوئے رمضان کے مہینہ میں جس میں قرآن کریم جیسی اہم اور ہدایت دینے والی کتاب نازل ہونی شروع ہوئی تھی۔ اگر ایک رات اس کی یاد تازہ کرنے کے لئے مقرر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے کہ چونکہ اس مہینہ میں ہم نے بنی نوع انسان سے ایک نیا عہد باندھا تھا دائمی اور نہ فراموش ہونے والا عہد۔ اس لئے مومنوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اور اس بات کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے کہ ہم اب تک اس عہد پر قائم ہیں ہم اس مہینہ کی ایک رات کو دعاؤں کی قبولیت کے لحاظ سے خاص فضیلت اور برتری بخشتے ہیں تو اس میں کیا حرج کی بات ہے یہ تو عین صواب ہے۔

خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے ایک عہد باندھا اور اس کی ظاہری علامت کے طور پر ختنہ مقرر فرمایا (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۰)۔ صرف ایک جسمانی علامت جس سے روحانیت کا کوئی بھی تعلق نہیں۔ ایک حفظان صحت کا اصول، ایک بدنی صفائی کا نشان۔ یہود نے اسے قائم رکھا مگر مسیحیوں نے اسے بھلا دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر نسل ابراہیم اس عہد کو ختنہ کے ذریعہ سے دہراتی چلی آئی ہے تو خدا تعالیٰ نے اپنے عہد کو کس طرح دہرایا؟ تورات اس پر بالکل خاموش ہے۔ فرض کر لو کہ خدا تعالیٰ کا عہد یہ تھا کہ کنعان کا ملک ہمیشہ بنو ابراہیمؑ کے پاس رہے گا تو یہ بھی تو نہ ہوا۔ کیونکہ بائبل کے ماننے والوں کے نزدیک ابراہیمی وعدوں کے حقدار صرف بنو اسحاق تھے (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹ تا ۲۱)۔ مگر بنو اسحاق تو تیرہ سو سال سے اس ملک کی حکومت سے محروم ہیں۔ آخر خدا تعالیٰ نے اپنا عہد کیوں بھلا دیا۔ مسیحیوں نے بے شک ختنہ چھوڑ دیا لیکن یہود نے تو ختنہ نہیں چھوڑا تھا ان کو کیوں اللہ تعالیٰ نے بھلا دیا۔ عہد کے زندہ اور قائم ہونے کی تو یہی علامت ہو سکتی ہے کہ دونوں طرف سے اس کے قائم ہونے کا اعلان ہوتا رہے۔ مگر بائبل کے عہد کا تو یہ حال ہے کہ یہود اب تک ختنہ کرتے چلے آتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اس باہمی عہد کے اپنے حصہ کو ادا کرنے کا نام

نہیں لیتا۔

خدا تعالیٰ نے مسلمانوں سے بھی ایک نیا عہد باندھا اور اس کی علامت رمضان کے روزے مقرر فرمائے۔ اس عہد کے مقابل پر مسلمانوں سے بھی ایک عہد اللہ تعالیٰ نے باندھا اور اس عہد کا اعلان رمضان کے مہینہ میں ہوا۔ اس عہد کی علامت ختنہ کو نہیں مقرر کیا گیا کیونکہ ختنہ تو عرب پہلے ہی ابراہیم کی یاد میں کرتے چلے آتے تھے۔ بلکہ اس عہد کی علامت مومنوں کے لئے یہ مقرر کی گئی کہ وہ اس سارے مہینہ کے روزے رکھیں جس میں خدا تعالیٰ نے ان سے عہد باندھا تھا اس کے مقابل پر اللہ تعالیٰ نے بھی اس عہد کے نباہنے کی ایک علامت اپنے لئے مقرر فرمائی اور وہ یہ کہ جب تم رمضان کا مہینہ اس عہد کی یاد میں روزوں میں گزارو گے تو میں اس کے جواب میں رمضان کی آخری راتوں میں سے ایک رات تمہارے لئے آسمان سے اتروں گا۔ اور اعلان کروں گا کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (البقرۃ:۱۸۷) یعنی بندوں کی طرف سے جب اس عہد کی یادگار رمضان کی صورت میں منائی جائے گی تو میں بھی اس عہد کی یادگار لیلۃ القدر کی صورت میں مناؤں گا۔ آسمان سے اپنے بندوں کے لئے اتروں گا اور اعلان کروں گا کہ مانگو تو تمہیں دیا جائے گا، ایمان لاؤ تو تمہیں ہدایت بخشی جائے گی کیونکہ تم میرے معاہد ہو۔ تم نے اپنے عہد کی رمضان سے یاد تازہ کی، میں اپنے عہد کی لیلۃ القدر سے یاد تازہ کرتا ہوں۔ یہ کیسی مبارک علامت ہے۔ ختنہ بھی اچھی چیز ہے لیکن ایک مہینہ بھر خدا تعالیٰ کے لئے روزے رکھنے یہ اس علامت کی نسبت کس قدر زیادہ شاندار اور کس قدر زیادہ روحانیت کو زندہ کرنے والی علامت ہے۔ اس کے مقابل پر خدا تعالیٰ کا جواب بھی کیسا شاندار ہے۔ روپیہ نہیں، چاندی نہیں، ملک نہیں، دولت نہیں، وہ اپنے عہد کی یادگار کے طور پر مسلمانوں سے لیلۃ القدر جیسی چیز کا وعدہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ جب تم میرے آخری کلام کے نازل ہونے کی خوشی میں ہمیشہ رمضان کے مہینہ کے روزے رکھا کرو گے اور اس طرح اپنے عہد کو تازہ کرتے رہو گے تو میں بھی تم سے لیلۃ القدر کے ذریعہ سے اپنا عہد تازہ کرتا رہوں گا۔ یعنی اس دن تم پر خاص فضل کیا کروں گا اور تمہاری دعائیں سنا کروں گا، تم کو نیا اور زندہ ایمان بخشا کروں گا تا تم کو معلوم ہوتا رہے کہ میں زندہ خدا ہوں اور اپنے عہد کی نگہداشت میں تم سے پیچھے نہیں بلکہ تم سے زیادہ اپنے عہد کی نگہداشت کرنے والا ہوں۔

یہ دونوں نشان باہمی عہد کے تازہ رکھنے کے کیسے شاندار ہیں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے عہد کا نشان روحانی مقرر کیا جبکہ بنو اسحاق کے لئے عہد کا نشان جسمانی یعنی ختنہ تھا اور خدا تعالیٰ نے اپنے لئے بھی مسلمانوں سے کئے ہوئے عہد کا نشان روحانی مقرر کیا یعنی لیلۃ القدر۔ جبکہ بنو اسحاق کے عہد کے مقابل میں خدا تعالیٰ نے اپنے عہد

کی نشانی جسمانی مقرر کی تھی۔یعنی فلسطین کا یہود کے قبضہ میں رہنا۔ساری عمر ایک ماہ کے روزے رکھنے کے مقابلہ میں ختنہ کا فعل کتنا چھوٹا ہے (پھر وہ فعل بھی مسلمان ابراہیم علیہ السلام کی یادگار کے طور پر کرتے چلے آتے ہیں) اور کنعان کی زمین لیلۃ القدر کے مقابلہ پر کتنی حقیر ہے۔ بلکہ وہ تو لیلۃ القدر کے ایک ایک سیکنڈ کے مقابل پر حقیر ہے (اور پھر لطف یہ کہ وہ زمین بھی اور پیشگوئیوں کے مطابق مسلمانوں ہی کو مل گئی ہے)۔

خلاصہ یہ کہ رمضان اور لیلۃ القدر محمدی عہد کی علامات ہیں اسی طرح جس طرح ختنہ اور فلسطین کی بادشاہت ابراہیمی عہد کی علامات ہیں۔رمضان بندہ کی طرف سے عہد کو تازہ رکھنے کا نشان ہے اور لیلۃ القدر خدا تعالیٰ کی طرف سے عہد کو تازہ رکھنے کا نشان ہے اور ہر عقلمند انسان ادنیٰ تدبر سے معلوم کر سکتا ہے کہ مسلمانوں سے جو عہد خدا تعالیٰ نے باندھا ہے اس کے نشان بہت شاندار ہیں اور روحانی ہیں اور زندہ خدا کی قدرتوں کا اظہار کرتے ہیں۔کئی قومیں اپنے ملکوں میں ہزاروں سال سے بیٹھی ہیں اور یہ اس بات کی لازمی علامت نہیں کہ خدا تعالیٰ ان کے ساتھ ہے مگر کسی قوم کو اگر لیلۃ القدر مل جائے ایسی رات جس میں خدا تعالیٰ قریب آجائے جس میں خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنے۔جس میں اللہ تعالیٰ علیٰ قدر مراتب اپنے بندوں پر اپنی مرضی ظاہر کرے تو یہ یقیناً اس بات کا روشن ثبوت ہوگا کہ خدا تعالیٰ اس قوم سے خوش ہے اور اس سے اپنے عہد کو اس نے بھلا یا نہیں۔

حضرت اسحاق کی اولاد سے عہد کے مقابل حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے اللہ تعالیٰ کا عہد

ایک اور بات بھی اسی سلسلہ میں یاد رکھنے والی ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے ان کے دونوں بیٹوں کی نسبت عہد کیا تھا اور دونوں کو ختنہ کا پابند کیا تھا (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۵۔ پیدائش باب ۲۱ آیت ۴)۔ بائبل کہتی ہے کہ اسحاقؑ کی اولاد کی نسبت اس نے کہا کہ میں کنعان کا ملک ہمیشہ کے لئے انہیں دوں گا۔ چنانچہ لکھا ہے ’’تب خدا تعالیٰ نے کہا کہ بے شک تیری جورو سرہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی تو اس کا نام اسحاق رکھنا اور میں اس سے اور بعد اس کے اس کی اولاد سے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے قائم کروں گا‘‘ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹) اس جگہ عہد کے قیام سے مراد کنعان کے ملک پر دائمی قبضہ لیا جاتا ہے اور بائبل کے کئی مقامات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے (پیدائش باب ۱۷ آیت ۷،۸) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عہد بنو اسمٰعیل کے بارہ میں بھی تھا کیونکہ ختنہ کا حکم انہیں بھی دیا گیا تھا اور برکت کا وعدہ ان سے بھی تھا۔ چنانچہ لکھا ہے ’’جب اس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا وہ تیرہ برس کا تھا‘‘ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۵) نیز لکھا ہے ابراہیم نے دعا کی ’’اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے‘‘ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۸) اس کے بعد لکھا ہے ’’اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند

کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا‘‘ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰) پھر پیدائش ۲۱ میں لکھا ہے ’’میں اس (اسمٰعیل) کو ایک بڑی قوم بناؤں گا‘‘ (پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۸) ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ اسمٰعیل بھی وعدہ میں شامل تھا گو وہ اس وعدہ میں شامل نہ تھا جو کنعان کے قبضہ کے متعلق تھا کیونکہ وہ عہد اسحاق کی نسل کے ساتھ پورا ہونا تھا۔

یہود و نصاریٰ کو یہ غلطی لگی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ عہد صرف اسحاق کی اولاد سے تھا۔ اوپر کی عبارتوں سے ظاہر ہے کہ عہد اسمٰعیل اور اسحاق دونوں سے تھا۔ پھر یہ غلطی بنو اسرائیل کو کس طرح لگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابراہیمی عہد کی دو شکلیں ہیں ایک مجمل اور ایک مفصل۔ مجمل عہد یہ تھا کہ میں تیری نسل کو برکت دوں گا اور نسل سے مراد اسمٰعیل اور اسحاق دونوں ہیں جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے۔ مفصل عہد آگے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اسحاق کی نسبت عہد یہ تھا کہ کنعان کی حکومت اسے نسلاً بعد نسلٍ حاصل ہوگی۔ بائبل نے جو بنو اسحاق کی کتاب ہے لازماً اسی عہد کو یاد رکھنا تھا اس کتاب میں بنو اسمٰعیل کے عہد کا ذکر نہ ہونے کے یہ معنے نہیں کہ بنو اسمٰعیل سے کوئی عہد تھا ہی نہیں۔ کیونکہ بائبل مجمل عہد میں دونوں بیٹوں کو شریک کرتی ہے۔ اسحاق کی نسبت بھی ہے کہ میں اسے برکت دوں گا اور اس برکت کی تشریح یوں کی ہے کہ کنعان کا ملک نسلاً بعد نسلٍ اسے ملے گا اور اسمٰعیل کی نسبت بھی کہا ہے کہ میں اسے برکت دوں گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے کس رنگ میں برکت دی جائے گی؟ اس سوال کا جواب بائبل میں تلاش کرنا عبث ہے کیونکہ وہ تو اسرائیلی نسل کی تاریخ ہے اس کا جواب تو اسمٰعیلی نسل کی روایات سے معلوم کرنا چاہیے یا اسمٰعیلی نسل کے انبیاء کے الہام سے کیونکہ اسمٰعیل کی نسبت تفصیلی عہد انہی سے ہمیں معلوم ہوسکتا ہے۔ سو ہم اسمٰعیل کی نسل کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یہ روایت چلی آتی تھی کہ اسمٰعیل کو خدا تعالیٰ نے مکہ مکرمہ مرکز کے طور پر دیا اور عرب رہائش کے لئے دیا جس پر وہ اسمٰعیل کے وقت سے اس وقت تک قابض ہیں چنانچہ قرآن کریم میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا جو حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے اس تفصیلی عہد کا یوں ذکر ہے وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (البقرۃ:۱۲۶، ۱۲۷) یعنی یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع بنایا اور امن کا موجب بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیمؑ جیسا خلوص اپنی نمازوں اور عبادتوں میں پیدا کرو اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو تاکید کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں

کے لئے پاک رکھو اور جب ابراہیم نے بھی ہم سے دعا کی کہ میرے رب جس طرح تو نے اس مکان کو امن والا بنانے کا وعدہ کیا ہے میں تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ تو اس مکان کو امن دینے والا بھی بنا (اس طرح کہ یہ خود ہی پُر امن نہ ہو بلکہ دوسرے شہروں اور ملکوں کو بھی امن دینے والا ہو) اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرۃ پر ایمان لانے والے ہوں ان کے ایمان کو تازہ کرنے کے لئے اسی وادی غیر ذی زرع میں ہر قسم کے تازہ بتازہ پھل بھی مہیا کرتا رہ۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہاری دعا قبول کی گئی مگر اس اصلاح کے ساتھ کہ جو کافر ہوں گے انہیں بھی ہم دنیوی انعامات سے محروم نہیں کریں گے ہاں بوجہ کفر کے انہیں اخروی عذاب ملے گا۔ یہ عہد کیسا لطیف عہد ہے اسمٰعیل سے اللہ تعالیٰ نے ختنہ کے علاوہ یہ عہد لیا کہ وہ اور اس کی اولاد خانہ کعبہ کی خدمت کرے اور خدائے واحد کی عبادت کے لئے ایک ایسی پاک عبادت گاہ تیار رکھے جس میں اللہ تعالیٰ کے بندے جمع ہو کر خدائے واحد کی تسبیح و تحمید کریں۔

بنو اسمٰعیل کے لیے عرب کا ملک ملنے کا وعدہ

ختنہ کا عہد تو اسمٰعیل کے ساتھ بھی تھا مگر اس کے ساتھ کیا لطیف روحانی عہد بھی شامل کر دیا گیا اور اس کے جواب میں اپنی طرف سے عہد کا نشان یہ مقرر کیا کہ میں خانہ کعبہ اور اس کے گرد کا علاقہ ان کو دوں گا اور وہ ہمیشہ کے لئے امن میں رہے گا کوئی دشمن اسے فتح نہ کر سکے گا اور لوگ حج کے لئے سارے ملک سے (اور آخری زمانہ میں سب دنیا سے) وہاں آتے رہیں گے۔

یہ عہد کا نشان جو اسمٰعیلؑ اور اس کی نسل سے ہوا کیسا شاندار ہے۔ اسحٰق سے صرف دنیوی وعدہ تھا کہ کنعان کا ملک اسے اور اس کی اولاد کو ملے گا جو محض ایک سیاسی وعدہ تھا اور پھر اس ملک کو امن میں رکھنے کا کوئی وعدہ نہ تھا۔ چنانچہ کئی دفعہ یوروشلم اسرائیلی دین کے منکروں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ لیکن اسمٰعیل سے یہ وعدہ کیا کہ اسے اور اس کی اولاد کو مکہ اور اس کے گردونواح پر تلوار کے ذریعہ سے نہیں بلکہ محبت اور حسن عقیدت کے ذریعہ سے حکومت بخشی جائے گی اور خدا تعالیٰ ان کے مرکز کو ہمیشہ دشمن کے ہاتھ سے بچائے گا اور تمام علاقہ پر ان کی روحانی اور ظاہری حکومت ہوگی۔ روحانی اس طرح کہ لوگ مکہ سے عقیدت رکھیں گے اور وہاں حج کے لئے آئیں گے اور ظاہری اس طرح کہ وہ ملک کے لئے مرکز امن بنا دیا جائے گا اور مکہ کے لوگوں کو سیاسی تصرف بھی اپنے گرد کے علاقہ پر دیا جائے گا۔

ادنیٰ غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسمٰعیل کا عہد اسحٰق کے عہد سے کہیں زیادہ شاندار ہے۔ اسحٰق اور اس کی اولاد نے جو عہد کا نشان اپنے لئے مقرر کر لیا وہ اسمٰعیل اور اس کی اولاد نے بھی اپنے لئے مقرر کیا یعنی ختنہ۔ لیکن اس کے علاوہ یہ نشان بھی اپنے عہد کا خدا تعالیٰ کے حکم سے مقرر کیا کہ اسمٰعیل اور اس کی نسل خدائے واحد کی پرستش کو قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرتی رہے گی اور دنیا سے الگ ہو کر وادی غیر ذی زرع میں ذکر الٰہی کی شمع کو جلائے رکھنے

کی ذمہ واری اپنے اوپر اٹھائے گی۔ اس کے مقابل پر اللہ تعالیٰ نے جو اپنے لئے عہد کا نشان مقرر کیا وہ بھی بنواسحٰق کے مقابل کتنا شاندار ہے۔ وہاں تو صرف یہ وعدہ تھا کہ کنعان پر انہیں حکومت ملے گی مگر یہاں یہ عہد بھی ہے کہ (۱) بنواسمٰعیل کے مرکز کو ہمیشہ دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھا جائے گا (۲) بنواسمٰعیل کو بھی مکہ کے گردوپیش پر حکومت ملے گی مگر وہ صرف سیاسی نہ ہوگی بلکہ روحانی بھی ہوگی۔ گویا بنواسحٰق سے صرف ایک وعدہ تھا کہ کنعان پر انہیں حکومت ملے گی مگر بنواسمٰعیل سے تین وعدے تھے یعنی مکہ کی حفاظت کا، عرب پر حکومت کا، عرب پر روحانی اقتدار ہمیشہ قائم رہنے کا۔ چونکہ یہ عہد بنواسمٰعیل سے مخصوص تھا اس لئے لازماً انہوں نے ہی اسے محفوظ رکھا۔ جس طرح بنواسحٰق نے اپنے عہد کو بائبل میں محفوظ رکھا۔ یہ وہ لطیف نقطہ ہے جو خدا تعالیٰ نے خاص طور پر مجھے سمجھایا ہے اور جس سے عہد ابراہیم کی نسبت وہ سب کشمکش جو بنواسحٰق اور بنواسمٰعیل میں چلی آتی ہے دور ہو جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ کنعان کا ملک خدا تعالیٰ نے عہد ابراہیم کے مطابق بنواسحٰق کو دیا تھا مگر یہ بھی درست ہے کہ ویسا ہی بلکہ اس سے شان میں بہت بڑھ کر عہد بنواسمٰعیل سے کیا گیا تھا اور وہ بنواسحٰق کے عہد سے بھی زیادہ شاندار طور پر پورا ہوا۔ جیسا کہ آگے سورۂ قریش اور سورۂ فیل میں ان امور کی تفصیل آئے گی۔

مسلمانوں کو کنعان کا ملک ملنے کی پیشگوئی داؤد کے کلام میں اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ابراہیمی عہد میں بنواسحٰق سے ہی کنعان کا وعدہ تھا تو پھر بنواسمٰعیل کو یہ ملک کیوں ملا اور سورۂ انبیاء میں یہ پیشگوئی کیوں کی گئی ہے کہ یہ ملک مسلمانوں کو ملے گا جیسا کہ فرماتا ہے وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (الانبياء: ۱۰۶، ۱۰۷) یعنی ہم زبور میں ذکر کے بعد لکھ چکے ہیں کہ کنعان کا ملک میرے نیک بندوں کو ملے گا۔ یہ بات ہم عبادت گذار قوم (یعنی مسلمانوں) کو توجہ دلانے کے لئے بیان کر رہے ہیں اور ان کا حق انہیں پہنچاتے ہیں یعنی جب جائز موقعہ آئے تم فلسطین پر حملہ کر دینا اللہ تعالیٰ تم کو فتح دے گا کیونکہ داؤدؑ نے یہ خبر دے رکھی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس اشارہ کو سمجھ لیا اور باوجود اس کے کہ قیصر کی حکومت دنیا کی سب سے طاقتور حکومت تھی چند مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ مسلمان جرنیل اس سے جا بھڑے اور اسے بری طرح شکست دے کر ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کنعان کے متعلق دو الگ الگ وعدے تھے ایک ابراہیم سے کہ یہ ملک بنواسحٰق کو ملے گا اور ایک داؤدؑ سے کہ یہ اس قوم کو ملے گا جو راستباز اور خدا تعالیٰ کی عبادت گذار ہوگی۔ حضرت داؤد، حضرت ابراہیمؑ کے ہزار بارہ سو سال بعد مبعوث ہوئے تھے ان کے زمانہ میں وہ وقت قریب آ رہا تھا کہ بنواسحٰق کا

عہد ختم کیا جائے اس قوم کی قیامت قریب تھی اور اس کی ہلاکت کے راستے کھلنے والے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور پیشگوئی حضرت داؤد سے کروا دی جس میں یہ بتایا گیا کہ عہد ابراہیمی جو حضرت اسحٰق کی نسل سے پورا ہونا تھا اب ختم ہو رہا ہے اب اسے نیا رنگ دے دیا جائے گا اور اب کنعان اسحٰق کی اولاد کی بجائے سچے دین کے متبعوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ سو مسلمانوں کا قبضہ فلسطین پر حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئی کے ماتحت نہیں بلکہ حضرت داؤدؑ کی پیشگوئی کے مطابق ہے (زبور باب ۳۷ آیت ۲۹)۔ حضرت ابراہیمؑ کے عہد کے مطابق تو ان کا قبضہ مکہ اور حجاز پر ہے اور داؤد کی پیشگوئی کے مطابق ان کا قبضہ کنعان یعنی فلسطین پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ کنعان پر مسلمانوں کے قبضہ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئی کا حوالہ نہیں دیا بلکہ حضرت داؤدؑ کی پیشگوئی کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اگر حضرت داؤد کی پیشگوئی حضرت ابراہیمؑ ہی کی پیشگوئی کی تکرار ہوتی تو جو مقدم پیشگوئی تھی اس کا ذکر کرنا چاہیے تھا اس سلسلہ میں یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم اور احادیث کی بعض دوسری پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ عارضی طور پر یہود کا غلبہ اس زمین میں پھر مقدر ہے جس کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔

کیا لیلۃ القدر کوئی معین رات ہے؟ اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ کیا لیلۃ القدر کوئی معین رات ہے اور کیا یہ وہی رات ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔

یہ امر تو ثابت شدہ ہے کہ قرآن کریم رمضان میں نازل ہونا شروع ہوا لیکن یہ امر واقعی طور پر ثابت نہیں کہ رمضان کی کس رات میں قرآن کریم کے نزول کی ابتداء ہوئی۔ بعض سترہ[۱۷] رمضان کی بتاتے ہیں اور بعض انیس[۱۹] رمضان کی اور بعض چوبیسویں[۲۴] رمضان کی قرار دیتے ہیں (تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)۔ غرض اس بارہ میں اس کے سوا کہ آخری پندرہ تاریخوں میں سے کسی تاریخ قرآن کریم اترا تھا اور کوئی یقینی بات ثابت نہیں۔ لیکن ہر رمضان میں جو لیلۃ القدر آتی ہے اس کے بارہ میں احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ آخری عشرہ میں سے کسی رات میں آتی ہے (بخاری کتاب فضل لیلۃ القدر باب تحرّی لَیْلَۃَ القدر فی الوتر من العشر الاواخر) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر سے مراد معین طور پر وہ رات نہیں جس میں قرآن کریم اترا بلکہ صرف ایک ایسی رات مراد ہے جو نزول قرآن کی یاد میں خدا تعالیٰ نے بطور علامت مقرر فرمائی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ جو رات بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے نزول کی علامت کے طور پر مقدر کی ہے کیا وہ ایک معین رات ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں وہ بھی کوئی معین رات نہیں بلکہ رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں چکر لگاتی رہتی ہے۔ اس رات کی نسبت مختلف احادیث سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

لیلۃ القدر کے متعلق مختلف احادیث اور اقوال

ابوداؤد طیالسی کی روایت ہے کہ عَنۡ اَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ اِنَّھَا لَیۡلَۃٌ سَابِعَۃٌ اَوۡتَاسِعَۃٌ وَّعِشۡرُوۡنَ (مسند ابو داؤد طیالسی مسند ابو میمونۃ عن ابی ھریرۃ) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے متعلق فرمایا وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات کو ہوتی ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں عبادۃ الصامتؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ فِی الۡعَشۡرِ الۡبَوَاقِیۡ مَنۡ قَامَھُنَّ ابۡتِغَاءَ حِسۡبَتِھِنَّ فَاِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِہٖ وَمَا تَأَخَّرَ وَھِیَ لَیۡلَۃُ وِتۡرٍ تِسۡعٍ اَوۡسَبۡعٍ اَوۡ خَامِسَۃٍ اَوۡ ثَالِثَۃٍ اَوۡ اٰخِرِ لَیۡلَۃٍ۔ (مسند احمد بن حنبل عن عبادۃ الصامت) یعنی لیلۃ القدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہوتی ہے انتیسویں یا ستائیسویں یا پچیسویں یا تئیسویں یا رمضان کی آخری رات۔

امام احمد بن حنبل نے ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے لیلۃ القدر کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اَفِیۡ رَمَضَانَ ھِیَ اَوۡ فِیۡ غَیۡرِہٖ یا رسول اللہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے یا اس کے سوا کسی اور مہینہ میں؟ اس پر آپؐ نے فرمایا ھِیَ فِیۡ رَمَضَانَ۔ وہ رمضان میں ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا صرف انبیاء کے زمانہ میں ہوتی ہے جب وہ فوت ہو جائیں تو پھر نہیں ہوتی یا قیامت کے دن تک قائم رہے گی قَالَ بَلۡ ھِیَ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیَامَۃِ۔ فرمایا نہیں وہ قیامت تک ہے۔ میں نے پوچھا رمضان کے کس حصہ میں ہوتی ہے؟ اس پر فرمایا اِلۡتَمِسُوۡھَا فِی الۡعَشۡرِ الۡاُوَلِ وَالۡعَشۡرِ الۡاَوَاخِرِ لَا تَسۡأَلۡنِیۡ عَنۡ شَیۡءٍ بَعۡدَھَا۔ یعنی یا تو پہلے دہاکہ میں اس کی تلاش کیا کرو یا آخری دہاکہ میں۔ اس کے بعد مجھ سے اس بارہ کوئی سوال نہ کرنا۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر باتیں کرتے رہے میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ میرا جو آپ پر حق ہے اسی کی قسم دیتے ہوئے کہتا ہوں کہ رمضان کے کون سے دہاکہ میں لیلۃ القدر ہوتی ہے؟ اس پر آپ ناراض ہوئے اور فرمایا اِلۡتَمِسُوۡھَا فِیۡ سَبۡعِ الۡاَوَاخِرِ لَا تَسۡأَلۡنِیۡ عَنۡ شَیۡءٍ بَعۡدَھَا یعنی آخری سات راتوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو اور دیکھنا اس کے بعد اس بارہ میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کی آخری سات راتوں میں سے کسی رات میں وہ ہوتی ہے (مسند احمد بن حنبل عن ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ)۔

ابوداؤد نے اپنی سنن میں عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لیلۃ القدر کے بارہ میں سوال کیا گیا اور میں بھی سن رہا تھا۔ اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ لیلۃ القدر ہر رمضان میں آتی ہے۔ (سنن ابی داؤد باب تفریع ابو اب شھر رمضان باب من قال ھی فی کل رمضان)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور آپ کے شاگردوں کا خیال تھا کہ لیلۃ القدر سارے سال میں آ سکتی ہے رمضان سے اس کی خصوصیت نہیں۔(تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)

ابی رزین کا قول ہے کہ لیلۃ القدر ہر رمضان کے مہینہ کی پہلی رات میں ہوتی ہے۔(تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)

بعض نے کہا ہے کہ سترہ تاریخ کو لیلۃ القدر ہوتی ہے اور ابوداؤد نے ابن مسعودؓ سے بھی ایک موقوف روایت اس بارہ میں نقل کی ہے اور کچھ صحابہ وتابعین اور امام شافعی سے بھی یہ روایت منقول ہے۔(تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)

حسن بصری کا قول ہے کہ قرآن کریم لیلۃ القدر میں نازل ہوا تھا اور قرآن کریم میں لکھا ہے کہ بدر کا دن اور قرآن کریم کے نزول کا دن ایک ہی ہے اور بدر کا دن سترہ رمضان جمعہ کے دن تھا اس لئے لیلۃ القدر بھی سترہ رمضان کو ہونی چاہیے۔(تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)

بعض نے کہا ہے کہ انیس رمضان کو لیلۃ القدر ہوتی ہے اور یہ قول حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ سے روایت کیا جاتا ہے۔(تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)

بخاری اور مسلم نے ابوسعید خدری سے روایت نقل کی ہے اِعْتَكَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ مِنْ رَّمَضَانَ وَاعْتَكَفْنَا مَعَهٗ فَاَتَاهُ جِبْرِيْلُ فَقَالَ الَّذِيْ تَطْلُبُ اَمَامَكَ فَاعْتَكَفَ الْعَشْرَ الْاَوْسَطَ وَاعْتَكَفْنَا مَعَهٗ فَاَتَاهُ جِبْرِيْلُ وَقَالَ الَّذِيْ تَطْلُبُ اَمَامَكَ ثُمَّ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطِيْبًا صَبِيْحَةَ عِشْرِيْنَ مِنْ رَّمَضَانَ فَقَالَ مَنِ اعْتَكَفَ مَعِيْ فَلْيَرْجِعْ فَاِنِّيْ رَاَيْتُ لَيْلَةَ الْقَدْرِ وَاِنِّيْ اُنْسِيْتُهَا وَاِنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ فِيْ وِتْرٍ وَّاِنِّيْ رَئَيْتُ كَاَنِّيْ اَسْجُدُ فِيْ طِيْنٍ وَّمَاءٍ وَكَانَ سَقْفُ الْمَسْجِدِ جَرِيْدًا مِّنَ النَّخْلِ وَمَا نَرٰى فِي السَّمَاءِ شَيْئًا فَجَاءَتْ قَزَعَةٌ فَمُطِرْنَا فَصَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى رَئَيْتُ اَثَرَ الطِّيْنِ وَالْمَاءِ عَلٰى جَبْهَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصْدِيْقُ رُؤْيَاهُ وَفِيْ لَفْظٍ فِيْ صُبْحِ اِحْدٰى وَّعِشْرِيْنَ وَ قَالَ الشَّافِعِيْ وَهٰذَا الْحَدِيْثُ اَصَحُّ الرِّوَايَاتِ۔

(بخاری کتاب الاذان باب السجود علی الانف فی الطین)

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اور ہم نے بھی رمضان کی پہلی دس تاریخوں میں اعتکاف کیا اس کے خاتمہ پر حضرت جبریل آئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ جس چیز (لیلۃ القدر) کی آپ کو تلاش ہے وہ آگے ہے اس پر آپ نے اور ہم سب نے درمیانی دس دنوں کا اعتکاف کیا اس کے خاتمہ پر پھر حضرت جبریل نے ظاہر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جس چیز کی آپ کو تلاش ہے وہ آگے ہے اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے بیسویں رمضان کی صبح کو تقریر فرمائی اور فرمایا کہ مجھے لیلۃ القدر کی خبر دی گئی تھی مگر میں اسے بھول گیا ہوں اس لئے اب تم آخری دس راتوں میں سے وتر راتوں میں اس کی تلاش کرو۔ میں نے دیکھا ہے کہ لیلۃ القدر آئی ہے اور میں مٹی اور پانی میں سجدہ کر رہا ہوں اس وقت مسجد نبوی کی چھت کھجور کی شاخوں سے بنائی ہوئی تھی اور جس دن آپ نے یہ تقریر فرمائی بادل کا نشان تک نہ تھا پھر اچانک بادل کا ایک ٹکڑا آسمان پر ظاہر ہوا اور بارش شروع ہوگئی پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی تو میں نے دیکھا کہ آپ کی پیشانی پر مٹی اور پانی کے نشانات ہیں۔ ایسا خواب کی تصدیق کے لئے ہوا اور ابوسعید کی ایک روایت میں یہ واقعہ اکیس[۲۱] رمضان کو ہوا تھا۔ امام شافعی کہتے ہیں اس بارہ میں یہ سب سے پختہ روایت ہے۔

عبداللہ بن انیس سے مسلم نے روایت کی ہے کہ تیس رمضان لیلۃ القدر ہے (مسلم کتاب الصیام باب فضل لیلة القدر) اور ابو داؤد طیالسی نے ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیلۃ القدر چوبیسویں رات کو ہوتی ہے (مسند ابی داؤد الطیالسی عن ابی سعید رضی اللّٰہ عنہ)۔ مسند احمد بن حنبل نے بھی حضرت بلال ؓ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لیلۃ القدر چوبیسویں رات کو ہوتی ہے۔ امام بخاری نے بلال ؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آخری سات راتوں میں سے پہلی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے یعنی یا تیئیسویں یا چوبیسویں۔

مسند احمد کی یہ روایت پہلے درج ہو چکی ہے کہ قرآن چوبیسویں رمضان میں نازل ہونا شروع ہوا تھا۔

بخاری نے عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس تاریخوں میں تلاش کرو۔ جب نو باقی ہوں یا سات باقی ہوں یا پانچ باقی ہوں (بخاری کتاب فضل لیلة القدر باب تحری لیلة القدر فی الوتر)۔ گویا اکیسویں تیئیسویں اور پچیسویں رمضان میں لیلۃ القدر ظاہر ہوتی ہے۔

مسلم نے ابی ابن کعب سے روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر ستائیسویں رمضان کو ہوتی ہے (مسلم کتاب الصیام باب فضل لیلة القدر)۔ عبداللہ بن عباس ؓ اور معاویہ ؓ اور عبداللہ بن عمر ؓ سے بھی روایت ہے کہ لیلۃ القدر ستائیسویں رمضان کو ہوتی ہے (تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر) عبداللہ بن عباس ؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمر ؓ نے صحابہ کو جمع کیا تو سب نے اتفاق کیا کہ وہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کسی میں ہوتی ہے (تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)۔

عبادۃ ابن الصامت کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں سے کسی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے یا رمضان کی آخری رات میں ہوتی ہے۔(مسند احمد بن حنبل عن عبادہ بن صامت)

بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے وتر راتوں میں لیلۃ القدر کی تلاش کرو (بخاری کتاب فضل لیلۃ القدر باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر)۔

بخاری نے عبادۃ الصامت سے روایت کی ہے کہ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُخْبِرَنَا بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ خَرَجْتُ لِاُخْبِرَكُمْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ خَيْرًا لَّكُمْ فَالْتَمِسُوْهَا فِي التَّاسِعَةِ وَالسَّابِعَةِ وَالْخَامِسَةِ (بخاری کتاب فضل لیلۃ القدر باب رفع معرفۃ لیلۃ القدر) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لیلۃ القدر کی خبر دینے باہر نکلے۔ باہر دو آدمی لڑ رہے تھے آپ نے تقریر کی اور فرمایا میں تو لیلۃ القدر کی خبر دینے نکلا تھا مگر فلاں فلاں کی لڑائی کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے حافظہ سے اس کا علم اٹھا لیا اور شاید اسی میں بہتری ہو۔ اب تم اسے انتیسویں یا ستائیسویں یا پچیسویں رات میں تلاش کرو۔

لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ میں ان روایات میں جن میں سے اکثر صحاح کی ہیں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ رمضان کی پہلی تاریخ سترھویں، انیسویں، اکیسویں، تیئیسویں، چوبیسویں، پچیسویں، ستائیسویں، انتیسویں اور تیسویں ساری ہی تاریخوں کو لیلۃ القدر قرار دیا گیا ہے اور عبداللہ بن مسعودؓ کے ایک قول کے مطابق تو سارے سال میں کوئی سی رات بھی لیلۃ القدر ہو سکتی ہے (تفسیر ابن کثیر زیر سورۃ القدر)۔ لیکن حدیثوں پر مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے صحیح قول یہی ہے کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کوئی رات اور خصوصاً طاق راتوں میں سے کوئی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے۔

ان روایتوں کو ملا کر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے اترنے کی خواہ کوئی رات ہو لیلۃ القدر اس رات کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ بدلتی رہتی ہے اور رمضان کی آخری راتوں میں سے کسی رات کو اس کا ظہور ہو سکتا ہے کیونکہ اگر قرآن کریم کے اترنے کی رات ہی لازماً لیلۃ القدر قرار دی جاتی۔ تو اوّل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ مجھے لیلۃ القدر کا علم دیا گیا تھا مگر فلاں فلاں کی لڑائی کی وجہ سے بھول گیا ہے آخر قرآن کریم آپ

پر اترا تھا آپ کو وہ رات یاد ہوگی اور اگر یاد نہ بھی ہوگی تو آپ کو اس آیت سے یہ تو علم ہو گیا تھا کہ لیلۃ القدر صرف قرآن کریم کے نازل ہونے کی رات ہے اور یہ راتیں کئی نہیں ہوسکتیں ایک ہی رات ایسی ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں آپ یہ کیوں فرمایا کرتے کہ فلاں راتوں میں اس کی تلاش کرو۔

دوسرے یہ کہ ایک دفعہ آپ کو لیلۃ القدر بتائی گئی اور وہ اکیسویں رات کو ظاہر ہوئی باوجود اس کے آپ لوگوں سے یہی کہتے رہے کہ آخری عشرہ میں اس کی تلاش کرو۔ حالانکہ اگر وہ ایک معین رات ہوتی تو اس کے بعد اسے ہمیشہ رمضان کی اکیسویں رات بتاتے رہتے۔ پس معلوم ہوا کہ (۱) آپ قرآن کریم کے نزول کی رات کو لازماً ہمیشہ کے لئے لیلۃ القدر نہیں قرار دیتے تھے (۲) آپ اس کے سوا دوسری راتوں میں سے بھی کسی کو ہمیشہ کے لئے معین لیلۃ القدر نہیں قرار دیتے تھے بلکہ آپ کے نزدیک تو یہ رات قرآن کریم کے نزول کی یاد میں مقرر کی گئی تھی اور گو اس یادگار کو رمضان کے آخری عشرہ سے مخصوص کر دیا گیا تھا مگر نزول کی رات سے مخصوص نہیں کیا گیا تھا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گو یہ رات نزول قرآن کی یاد میں ہے مگر قرآنی طریق کے مطابق اس سے مزید فائدہ بھی اٹھالیا گیا ہے۔ کسی واقعہ کی یاد کے لئے کسی آس پاس کے دن کو مقرر کر دیا جائے تو وہ دن وہی فائدہ دیتا ہے جو فائدہ نزول کے دن اس یادگار کو منانا۔ لیکن اگر ایک ہی رات ہمیشہ کے لئے مخصوص کر دی جائے تو عبادت کی وہ کثرت نہیں ہوسکتی جو غیر مخصوص صورت میں ہوسکتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یاد کو آخری عشرہ میں کسی رات میں مقرر کر کے یہ فائدہ مسلمانوں کے لئے پیدا کر دیا کہ بجائے ایک دن کے وہ دس دن جوش وخروش سے عبادت کریں۔ اگر وہ ایک دن کو لیلۃ القدر مقرر کر دیتا تو کمزور آدمی صرف ایک رات عبادت کر کے خوش ہو جاتا لیکن اس صورت میں کم سے کم دس راتیں تو وہ عبادت میں لگا رہے گا کیونکہ اسے خیال ہوگا کہ شاید یہ رات لیلۃ القدر ہو یا شاید وہ ہو اور اس طرح ایک رات کی جگہ دس راتیں متواتر قرآن کریم کے نزول کی نسبت اور اس کی برکات کی نسبت سے غور کرنے کا موقعہ ملتا رہے گا اور ان راتوں میں سے ہر رات کو لیلۃ القدر کا خیال آتا رہے گا اور لیلۃ القدر کا خیال آتے ہی قرآن کریم کے نزول اور اس کی برکات کی طرف اس کا ذہن چلا جائے گا اور یہ ایک بہت بڑی برکت اور روحانی فائدہ والی بات ہے۔

آخری عشرہ میں لیلۃ القدر کو مقرر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ خدمت کے ایام کا آخری وقت ہی انعام کا وقت ہوتا ہے۔

اس وقت تک میں نے یہ بتایا ہے کہ احادیث میں مذکورہ لیلۃ القدر بھی ایک جہت سے اسی لیلۃ القدر سے تعلق

رکھتی ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اور یہ کہ ان معنوں کے رو سے اصل لیلۃ القدر وہی رات ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اور صرف اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اور اس عہد کو تازہ کرنے کے لئے جو نزول قرآن کریم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت سے باندھا تھا اس نے لیلۃ القدر مقرر کی ہے اور اس فائدہ کو مدنظر رکھ کر کہ امت کے کمزور لوگ بھی کم سے کم دس راتیں تو خوب عبادت کر لیں اس نے رمضان کی آخری دس راتوں میں اسے چھپا دیا ہے اور معین رات مقرر نہیں کی۔ تا کہ اس کا قیام صرف ایک رسم ہو کر نہ رہ جائے جسے اسلام بہت ناپسند کرتا ہے۔ اب جو چاہے رمضان کی آخری راتوں میں اسے تلاش کر سکتا ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے فضل کو دس راتوں میں تلاش کرے گا اسے دین کے ساتھ پہلے سے زیادہ لگاؤ ہو جائے گا اور اس کے دل میں دین کی محبت پیدا ہو جائے گی اور اس سے یہ امید کی جا سکے گی کہ پہلی غلطیوں کو چھوڑ کر پورے طور پر خدا تعالیٰ کی طرف جھک جائے اور کسی وقت اس کی ہر رات ہی لیلۃ القدر ہو جائے گی۔

انفرادی لیلۃ القدر عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے بزرگان دین سے جو یہ روایت ثابت ہے کہ لیلۃ القدر سال میں سے کسی رات کو ظاہر ہو سکتی ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ انفرادی لیلۃ القدر سال میں کسی وقت آ سکتی ہے ورنہ ان کا یہ منشاء نہیں کہ رمضان میں یہ لیلۃ القدر نہیں ہوتی۔ کیونکہ خود ان کی دوسری روایات میں رمضان کے آخری عشرہ میں لیلۃ القدر کے ظاہر ہونے کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ وہ روایات اوپر نقل کی جا چکی ہیں۔ ہم یہ تو خیال بھی نہیں کر سکتے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو رد کر دیا۔ صحابہؓ سے اس بات کی ہرگز امید نہیں کی جا سکتی ہے۔ پس ان کے اس قول کے کہ سال کے کسی حصہ میں بھی لیلۃ القدر آ سکتی ہے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ فردی لیلۃ القدر سال کی کسی رات کو آ سکتی ہے نہ یہ کہ جماعتی لیلۃ القدر جسے وہ خود بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت سے رمضان کی آخری راتوں میں قرار دے چکے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر مومن پر روحانیت کی بلوغت کا زمانہ آتا ہے آخر ہر شخص پیدائش کے وقت سے تو روحانیت میں کامل نہیں ہوتا۔ اکثر لوگوں پر جسمانی بلوغت کے بعد ہی کسی وقت روحانی بلوغت کا زمانہ آتا ہے۔ بعض کو جوانی میں بعض کو ادھیڑ عمر میں اور بعض کو بڑھاپے میں اور بعض کو بڑھاپے کے آخر میں۔ جس رات بھی کسی مومن کی نسبت اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اب سے یہ ہمارا قطعی جنّتی بندہ ہے وہی اس کی لیلۃ القدر ہے اور اس کے لئے رمضان کی کوئی شرط نہیں سارے سال میں کسی وقت کسی کی لیلۃ القدر آ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمان رحیم ہے اور اس کی یہ دونوں صفات ہر وقت ظاہر ہوتی رہتی ہیں پس ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضلوں کے معیّن اوقات

کے علاوہ کوئی اور سلسلہ بھی اس کے فضلوں کا ہوتا جو ہر وقت اور ہر لحظہ ظاہر ہوتا رہتا اور یہ انفرادی فضلوں کا ہی سلسلہ ہے کسی مومن بندہ کی لیلۃ القدر کسی دن آ جاتی ہے کسی کی کسی دن۔ اور اس طرح روزانہ سارے سال میں اللہ تعالیٰ کے فضل اس کے نیک بندوں پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ پھر سال میں ایک دفعہ قرآن کریم کے نزول کی یاد میں ساری امت پر ایک ہی رات رمضان کے آخری عشرہ میں اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کا فضل نازل ہوتا ہے اور وہ لیلۃ القدر کبریٰ ہوتی ہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ بے شک آخری عشرہ رمضان میں لیلۃ القدر کا مقرر کرنا ایک احسن طریقہ مومنوں کو انعام دینے اور ان کی عبادت کی روح کے قائم رکھنے کا تھا لیکن پھر یہ کیوں ہوا کہ کبھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخری عشرہ میں اس کی تلاش کرو اور کبھی فرمایا کہ ۲۱ کو ہوتی ہے کبھی ۲۴ کو اور کبھی کئی طاق راتوں کا ذکر کر دیا۔ آپ نے تعیین کرنے کی کیوں کوشش کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل قانون تو لیلۃ القدر کے بارہ میں یہی ہے کہ آخری عشرہ میں بدل بدل کر آتی ہے لیکن مومن کو اللہ تعالیٰ اس کا خاص علم دے دیتا ہے چنانچہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم دیا گیا کہ لیلۃ القدر کی رات کو بارش ہوگی اور آپ کی مسجد ٹپک پڑے گی چنانچہ رمضان کی ۲۱ کو ایسا ہو گیا۔ جن صحابہ کو اس کا علم ہوا انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید لیلۃ القدر ہوتی ہی ۲۱ کو ہے۔ حالانکہ اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ اس رمضان میں لیلۃ القدر ۲۱ کو تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر آپ کو لیلۃ القدر بتائی گئی اور بھول گئی تو آپ نے آخری طاق راتوں میں سے کوئی اور خصوصاً ۲۷ کو لیلۃ القدر قرار دیا۔ پس جہاں تک آخری عشرہ میں لیلۃ القدر ہونے کا سوال ہے یہ ایک قانون ہے اور جہاں تک اس عشرہ کی کسی خاص رات کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ یا دوسرے آئمۂ امت کا اشارہ ہے وہ خاص خاص رمضانوں میں ان کے آسمانی یا وجدانی علم کا نتیجہ ہے یہ قانون نہیں بتایا گیا کہ ہمیشہ اسی رات کو لیلۃ القدر ہوا کرے گی۔

لیلۃ القدر کی ایک علامت ایسے موقعہ پر طبعاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسی علامت ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ فلاں رات اس رمضان میں لیلۃ القدر تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض احادیث میں یہ آتا ہے کہ کچھ بجلی چمکتی ہے ہوا ہوتی ہے اور ترشح ہوتا ہے ایک نور آسمان کی طرف جاتا یا آتا نظر آتا ہے (شرح الزرقانی، النوع الخامس فی ذکر اعتکافہ صلی اللہ علیہ وسلم) مگر اوّل ذکر علامات ضروری نہیں گو اکثر ایسا تجربہ کیا گیا ہے کہ ایسا ہوتا ہے اور آخری علامت نور دیکھنے کی صلحاء کے تجربہ میں آئی ہے یہ ایک کشفی نظارہ ہے ظاہری علامت نہیں جسے ہر اِک شخص دیکھ سکے۔ خود میں نے بھی اس کا تجربہ کیا ہے لیکن جو کچھ میں نے دیکھا ہے دوسروں نے نہیں دیکھا۔

اصل طریقہ یہی ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ سے سارے رمضان میں دعائیں کرتا رہے اور اخلاص سے روزے رکھے پھر اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی رنگ میں اس پر لیلۃ القدر کا اظہار کر دیتا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۳

اور (اے مخاطب) تجھے کیا معلوم ہے کہ (یہ عظیم الشان) تقدیر والی رات کیا شے ہے۔

تفسیر۔ تجھے کس نے بتایا ہے کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہاں جو منشاء ہے اور جس بات کی طرف اشارہ کرنا ہمارے مدنظر ہے عقلی طور پر تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یعنی انسانی ذہن تو لیلہ سے زیادہ سے زیادہ تاریکی کی طرف جاتا ہے مگر ہماری مراد اس لیلۃ القدر سے ہے جو بے انتہاء برکتوں پر مشتمل ہے اور جس کی عظمت کی طرف عام طور پر انسانی ذہن جا ہی نہیں سکتا۔ اس طرح وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ کہہ کر معنوں کو بہت وسعت دے دی کیونکہ اس کے معنے ہیں حدِ قیاس وفہم سے بالا۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۴

(یہ عظیم الشان) تقدیر والی رات تو ہزار مہینے سے بھی بہتر ہے۔

حلّ لُغات۔ **شَهْرٌ کے معنے** شَهْرٌ کے معنے عربی زبان میں اظہار کے بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ شَهَرَ کا مصدر بھی بن سکتا ہے۔ نیز شَهْرٌ قمر کو بھی کہتے ہیں جب وہ اپنے کمال کے قریب ہو۔ اسی طرح شَهْرٌ مہینہ کو بھی کہتے ہیں اور شَهْرٌ کے معنے عالم کے بھی ہیں کیونکہ وہ مشہور ہوتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے ہم جس لیلۃ القدر کا ذکر کر رہے ہیں گو اس کا نام لیلہ ہے مگر درحقیقت وہ خَيْرٌ ہزار شَهْر سے بھی زیادہ اچھی ہے۔

خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ کے پہلے معنے شَهْرٌ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے اظہار کے بھی ہوتے ہیں اور شَهْرٌ قمر کو بھی کہتے ہیں جب وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے اور شَهْرٌ مہینہ کو بھی کہتے ہیں اور اس کے معنے مشہور عالم عالِم کے بھی ہیں۔ پس خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ کے ایک یہ معنے ہوئے کہ یہ لیلۃ القدر ہزار اظہار سے بھی بہتر ہے۔ لَیل کے متعلق یہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ تاریکی پیدا کر دیتی اور اشیاء کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا دیتی ہے

مگر فرماتا ہے کہ جس رات کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ ایک لحاظ سے تو رات ہے کہ اس میں ہزاروں قسم کے فتنے پائے جاتے ہیں اور بے دینی اور الحاد کا زور ہے لیکن اس کے ساتھ اس رات اللہ تعالیٰ کے جلال کے اظہار اور انسانی فطرۃ کی پوشیدہ نیکیوں کے نمود کے بھی اتنے سامان پیدا ہو رہے ہیں کہ وہ اپنے وقت پر دنیا کو محو حیرت کر دیں گے اس لئے اس رات کی مخفی طاقتوں پر ہزار اظہار اور نمود قربان ہے کیونکہ جس اظہار اور جس نمود کی بنیاد اس میں رکھی جا رہی ہے اس کے مقابلہ پر کوئی اور اظہار اور نمود نہیں ٹھہر سکتا۔ پس گو یہ رات ہے مگر نیکی کی عظیم الشان بنیاد رکھے جانے کی وجہ سے ہزاروں ترقیوں کا زمانہ اس پر قربان ہے۔

دوسرے معنے دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ یہ مومنوں کے لئے رات کا زمانہ ہے کہ انہیں ہر قسم کی تکالیف دی جاتی ہیں، مارا جاتا ہے، پیٹا جاتا ہے۔ قتل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ رات چونکہ قدر کی رات ہے اس لئے اس زمانہ کی تکالیف اور دکھ آئندہ کے آرام اور سکھ سے زیادہ قیمتی ہیں۔ آج وہ زمانہ ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے وہ اپنی تمام عزتوں کو کھو بیٹھتا ہے۔ ہر قسم کے طعن و تشنیع کا ہدف بن جاتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ اس جیسا برا شخص اور کوئی نہیں۔ مگر اس ذلت میں جو مزا ہے، ان قربانیوں میں جو راحت ہے اور ان تکالیف میں جو سرور ہے وہ ان ہزار عزتوں میں نہیں جو اسلام کی ترقی کے زمانہ میں لوگوں کو حاصل ہوں گی۔ چنانچہ دیکھ لو ابوبکرؓ اپنی قوم میں بڑا نیک نام تھا سارا عرب اس کی عزت کرتا تھا، اس کا ادب اور احترام کرتا تھا مگر جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرید بن گیا تو وہی لوگ جو اس کی عزت کرتے تھے اسے گالیاں دینے لگ گئے، اسے برا بھلا کہنے لگے، اسے مارنے پیٹنے لگے اور کہنے لگے کہ ابوبکرؓ اچھا تھا مگر اب خراب ہو گیا ہے۔ علیؓ بڑا نیک بچہ تھا اس کا باپ عرب کے سرداروں میں سے تھا مگر جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا تو لوگ کہنے لگے وہ واجب القتل ہے۔ اس کا مقاطعہ کیا گیا اس کے منہ پر گالیاں دی جاتیں۔ اسے ذلیل اور رسوا کیا جاتا ہے اور لوگ خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑا اچھا کام کیا۔ عمرؓ اپنی مجالس میں بڑی عزت رکھتا، اہل عرب کے نسب نامہ کے لئے وہ بہترین مؤرخ سمجھا جاتا، نوجوانی کی حالت میں بڑے بڑے سرداروں کی مجلس میں جاتا تو لوگ اسے ادب کے مقام پر بٹھاتے، اس کے ساتھ عزت سے پیش آتے مگر جب وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا تو سب لوگ اسے برا بھلا کہنے لگ گئے۔ اس کی مدح سرائی کی بجائے عیب چینی کی جاتی اور اس کو دکھ دے کر خوشی محسوس کی جاتی۔ عبداللہ بن سلامؓ ایمان لائے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کا امتحان لینے کے لئے ان کو جمع کیا اور فرمایا بتاؤ عبداللہ بن سلام کیسا ہے؟ انہوں نے کہا عبداللہ بن سلام کا کیا کہنا ہے نیکوں کا بیٹا،

اچھوں کی اولاد، خود بھی شریف اور باپ دادا بھی شریف اس کی نیکی کی کوئی حد ہے! رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اچھا سنو! وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی کہنے لگے بڑا خبیث ہے، خبیثوں کا بیٹا تھا اسی لئے خبیث نکلا۔ (البدایۃ والنہایۃ زیر باب فصل فی اسلام عبد اللہ بن سلام)

غرض فرمایا ہم نے قرآن کریم کو ایک قدر والی رات میں نازل کیا ہے۔ یہ رات لوگوں کی ظاہری عزتوں کو بالکل چھپا ڈالے گی لوگ نیک ہوں گے، معزز ہوں گے، اچھی شہرت رکھنے والے ہوں گے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ان کی عزت اور شہرت اور نیک نامی پر رات چھا جائے گی وہ لوگوں کے مطاعن کا ہدف بن جائیں گے اور لوگ کہیں گے کہ وہ بہت برے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ تاریک زمانہ ان کے لئے ذلت کا موجب ہوگا بلکہ نبی کی خاطر اور اس کی معیت میں یہ تکالیف اٹھانا شہرتوں سے اچھا اور زیادہ مبارک ہے۔

اس زمانہ کے بعد شہرتوں کا زمانہ آئے گا۔ لوگ اسلام کی وجہ سے بڑی بڑی شہرتیں پائیں گے، بڑی عزتوں سے دیکھے جائیں گے، بے انتہاء دنیا کمائیں گے مگر ان کی ظاہری عزتیں اور شہرتیں ان مار کھانے والوں کے مقابل ہیچ ہوں گی۔ چنانچہ دیکھ لو اسلام کے طفیل اور اس کے حلقۂ اثر میں لوگوں نے کتنی کتنی عزت پائی۔ کتنا رتبہ پایا دینداروں نے بھی اور دنیا داروں نے بھی۔ مگر وہ اس رات میں پیدا ہونے والے لوگوں کا بھلا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دین میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل۔ حضرات سید عبد القادر جیلانی، معین الدین چشتی، شہاب الدین سہروردی، محی الدین ابن عربی نقشبندی، امام غزالی نے اپنے زمانہ میں کتنی عزت پائی۔ بادشاہ جوتیاں سامنے رکھنے میں اپنی عزت خیال کرتے تھے یہ عزت ان کی اسلام ہی کی وجہ سے تھی۔ اس کے مقابل پر ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ بلکہ ان کے اور ہمارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے زمانے میں ماریں کھائیں گالیاں سنیں۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کے بعد کے بزرگوں کی ترقی کا زمانہ سابق بزرگوں کے تاریک زمانہ سے بہتر تھا۔ خدا گواہ ہے کہ اگر ان بزرگوں سے کہا جاتا کہ تمہاری عمر بھر کی شہرت چھین کر ایک گھنٹہ کے لئے تم کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر مار کھانے کے لئے کھڑا کیا جا سکتا ہے تو ان پر شادی مرگ کی حالت طاری ہو جاتی اور وہ کہتے کہ بخدا اس سے بہتر اور کوئی سودا نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں پر کیا برا زمانہ آیا ہے مگر اے سننے والے سن! کہ یہ برا زمانہ تو ضرور ہے تاریکی اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے مگر یہ تاریک رات لیلۃ القدر ہے۔ جو عزت اس رات میں پیدا ہونے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ عزت ہزار شہرتوں اور عزتوں سے بالا ہے اور

آئندہ زمانہ میں بڑی بڑی عزتوں والے لوگ اس تنگی اور دکھ کی رات کے ایک گھنٹہ کو اپنی باعزت زندگیوں کے سوسال پر ترجیح دیں گے اور دیکھ لو ایسا ہی ہوا قرآن کریم کی یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ ہم میں سے کس کا دل نہیں کرتا کہ کاش وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر اسلام کی خاطر کفار کی ماریں کھا رہا ہوتا۔ کاش وہ ان کی سخت سے سخت گالیاں سن کر مزے لے رہا ہوتا۔ اصدق الصادقین خدا کا یہ فقرہ کیسا سچا ہے کہ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ۔

یہی حال دنیوی لوگوں کا ہوتا ہے۔ نبی کے زمانہ کے لوگ تو تکالیف اور مصائب برداشت کرتے ہیں اور بعد میں آنے والے ان کے بوئے ہوئے بیجوں کے پھل کھاتے ہیں۔ بنوعباس اور بنوامیہ اپنے تختوں پر بیٹھ کر کیا کیا بڑائیاں کرتے ہوں گے۔ کس طرح فخر سے کہتے ہوں گے تم جانتے ہو ہم کون ہیں ہم عرب کے سردار ہیں۔ ہمارے فلاں فلاں حقوق ہیں۔ ہمارے مقابلہ میں تم کیا حیثیت رکھتے ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ بنوعباس اور بنوامیہ کو بادشاہت کہاں سے ملی؟ ان بیجوں سے ملی جو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے بوئے۔ ان لوگوں نے بے شک اپنی قربانیوں کے پھل نہیں کھائے مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک کون بڑا ہے کیا عبدالملک بڑا ہے یا ہارون الرشید بڑا ہے؟ خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ لوگ بڑے نہیں بلکہ ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ طلحہؓ اور زبیرؓ بڑے ہیں۔ بلکہ یہ تو الگ رہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ابوہریرہؓ بڑا ہے جسے بعض دفعہ سات سات وقت تک کا کھانا بھی میسر نہیں آتا تھا بلکہ ابوہریرہؓ تو کیا ان سے بلالؓ بھی بڑا ہے وہ خواہ غلام تھا مگر اسلام سے پہلے اس کی پھر بھی کچھ عزت تھی جب وہ اسلام لایا تو اس کے اعمال اور اس کی نیکی اور اس کی خصلتوں پر بھی ایک پردہ پڑ گیا اور لوگوں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا مگر انہی تکالیف نے اسے وہ رتبہ بخش دیا کہ ہارون الرشید اور عبدالملک کو اگر اس کے دروازے کی جاروب کشی کی خدمت دی جاتی تو یہ بادشاہت سے زیادہ اعزاز ہوتا۔

یہ سیدھی بات ہے کہ جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے یا کسی اور نبی پر ان کو ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی آخر ان میں کوئی نہ کوئی خوبی پائی جاتی تھی ورنہ جب تک انسان کی فطرت میں نیکی نہ ہو قربانی پر کون تیار ہو سکتا ہے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ جب بھی کسی نبی پر لوگ ایمان لاتے ہیں ان کی نیکیاں لوگوں کو بھول جاتی ہیں اور ان کے اخلاق سب نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور وہ دنیا کی نگاہ میں بالکل ذلیل ہو جاتے ہیں۔

ہمارے سلسلہ میں بھی جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے ایک زمانہ میں بادشاہ بھی شامل ہوں گے اور جماعت احمدیہ ترقی کرتے کرتے وہ مقام حاصل کر لے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب

اس کے مقابلہ میں بالکل بے حقیقت رہ جائیں گے۔ اس وقت جماعت احمدیہ کے علماء کو خواہ کتنی بڑی عزت حاصل ہو اگر ان کے دلوں میں ایمان کا ایک ذرہ بھی پایا جاتا ہوگا تو وہ اپنی ساری عزت اس ذلت کے مقابلہ میں ہیچ سمجھیں گے جو موجودہ زمانہ میں احمدیت کو قبول کرنے کی وجہ سے ہماری جماعت کو دیکھنی پڑتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور امام مالک وغیرہ سے اس زمانہ میں جب دنیا میں چاروں طرف ان کا نام گونج رہا تھا یہ کہا جاتا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم سے یہ ساری عزت لے لی جائے اور تمہیں ابوہریرہؓ کی جگہ کھڑا کر دیا جائے تو وہ بلاتوقف یہی جواب دیتے کہ ہمیں منظور ہے حالانکہ ابوہریرہؓ جو بسا اوقات فاقہ کی وجہ سے بے ہوش ہو جایا کرتے تھے اور لوگ یہ سمجھ کر کہ انہیں مرگی کا دورہ ہو گیا ہے ان کے سر پر جوتیاں مارا کرتے۔ غرض فرماتا ہے لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ ہزار عزتیں جو لوگوں کو آئندہ زمانہ میں حاصل ہوں گی اس ایک لیلۃ پر قربان ہیں۔ ہم بے شک گمنامی کے لحاظ سے اس زمانہ کو لیلۃ قرار دے رہے ہیں مگر یہ لیلۃ وہ ہے کہ ہزار ظہور اس ایک گمنامی پر قربان ہوگا۔

(۲) شَهْرٌ کے معنے عالم کے بھی ہیں ان معنوں کے رو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اس لیلۃ القدر میں جو معارف اور علوم کھلے ہیں وہ ہزار عالم سے بہتر ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ زمانۂ نبوی میں جو تاریکی اور بے دینی میں سارے زمانوں سے بڑھا ہوا تھا قرآن کریم کے ذریعہ سے جو علوم ظاہر ہوئے اور خدا تعالیٰ نے عرفان کے جو دریا اس وقت بہا دیئے ان کے مقابل پر ہزار عالم بھی تو کچھ بیان نہیں کرسکتا۔ مسیحی لوگ کہا کرتے ہیں کہ قرآن پہلی کتب کی نقل ہے اور میں انہیں جواب میں کہا کرتا ہوں کہ وہ کتب جن کی قرآن نے نقل کی ہے اور خود قرآن بھی جو ان کی نقل ہے تم سب مسیحی علماء مل کر اس نقل اور جن کتابوں کی وہ نقل ہے ان سب سے استنباط کر کے اب ایک اور مکمل کتاب کیوں نہیں بنا دیتے۔ آخر وہ کتب بھی موجود ہیں قرآن کریم بھی موجود ہے اور اس کے بعد جو علوم لوگوں کے نزدیک نئے نکلے ہیں وہ بھی موجود ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ان لوگوں کے لئے زیادہ موقعہ ہے وہ کیوں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ایک اور کتاب امور دینیہ اور احکام شریعیہ کے بارہ میں ایسی نہیں بنا دیتے جو قرآن کریم سے افضل ہو۔ اگر وہ ایسا کر دیں تو بغیر کسی اور دلیل کے اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر منہ سے رطب و یابس باتیں کرتے جانا اور امر ہے اور کچھ کر کے دکھانا اور بات ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس لیلۃ القدر میں جو علوم اللہ تعالیٰ نے ظاہر کئے اس کے مقابل پر دنیا کے علماء مل کر بھی کچھ نہیں کر سکتے اور قرآن کریم نے جو یہ کہا کہ ہزار عالم سے بھی وہ لیلۃ القدر اچھی ہے تو اس کے یہ معنے نہیں کہ ڈیڑھ ہزار اس سے اچھا ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ عربوں میں ہزار

سے اوپر کوئی ہندسہ نہ ہوتا تھا۔ جب انہوں نے انتہاء کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تھا تو وہ ہزار کا ہندسہ بولتے تھے۔ (الجامع لاحکام القراٰن زیر آیت لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ) اس عربی محاورہ کے مطابق قرآن کریم نے ہزار کا لفظ بولا ہے اور مطلب یہ ہے کہ دنیا کے زیادہ سے زیادہ عالم مل کر بھی وہ علوم بیان نہیں کر سکتے جو اس لیلۃ القدر میں نازل ہونے والے کلام یا نازل ہونے والے نبی نے بیان کئے ہیں۔ یا آئندہ ایسے ہی تاریک زمانوں میں خدا تعالیٰ کے مامور بیان کریں گے۔

اس مضمون سے مسلمانوں کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جب جب بھی اسلام پر کوئی مصیبت کا زمانہ آئے انہیں علماء ظاہر کی امداد پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ انہیں چاہیے کہ ایسے تاریک زمانوں میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اترنے والی امداد کی طرف نظر رکھا کریں کہ جو کچھ آسمانی امداد اور ہدایت سے انہیں حاصل ہوگا وہ ظاہری علماء کی مجموعی کوششوں سے حاصل نہ ہو سکے گا۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہ زمانہ اسلام کے گزشتہ زمانوں سے زیادہ تاریک ہے۔ بعد زمانہ نبوی ایسا سخت زمانہ اسلام پر کبھی نہیں آیا۔ لیکن مسلمان اس بلاء کے دور کرنے کے لئے انسانوں پر زیادہ نظر رکھتے ہیں بہ نسبت خدا کے۔ خدا تعالیٰ نے ان دنوں میں بھی حسب بشاراتِ قرآنیہ اور حسب وعدہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ اپنا ایک معمور بھیجا ہے۔ لیکن لوگوں کی اس طرف توجہ نہیں بلکہ خود ساختہ علاجوں کی طرف مائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کی حالت پر رحم فرمائے۔

تیسرے معنے (۳) تیسرے معنے شَهْرٌ کے مہینہ کے بھی ہیں۔ ان کے رو سے لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ کہ یہ معنے بھی ہیں کہ وہ زمانہ جس میں قرآن کریم نازل ہوا یا جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نازل ہوئے یا وہ زمانہ جس میں آپ کے بروزِ کامل نازل ہوں گے ہزار مہینوں سے اچھا ہے۔ یعنی تمام زمانوں سے اچھا ہے۔ کیونکہ میں اوپر بتا آیا ہوں کہ عربوں میں ہزار کے معنے ان گنت کے ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کے اندر ہزار سے بڑھ کر کسی گنتی کا رواج نہ تھا۔ جب انہوں نے یہ بتانا ہوتا کہ فلاں چیز تو ان گنت ہے تو وہ کہتے تھے کہ وہ تو ہزار ہے۔ پس اسی محاورہ کے مطابق قرآن کریم نے کہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یا قرآن کریم کا زمانہ یا ان کے بروز کا زمانہ ہزار مہینہ سے اچھا ہے یعنی ان گنت مہینوں سے اچھا ہے۔ کوئی دوسرا زمانہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا خواہ آئندہ کا زمانہ ہو یا گزشتہ زمانہ ہو۔

عربوں کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے جس سے اَلْفِ شَهْرٍ کے معنے خوب روشن ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ نے ایک بدوی سے پوچھا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ اس نے کہا ہزار دینار دے دیں۔ بادشاہ نے کہا بس اس سے زیادہ مانگو۔ اس پر وہ بدوی حیرت سے بولا کیا ہزار سے اوپر بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟

چوتھے معنے (۴) چوتھے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ہزار سے مراد ہزار ہی کے لئے جائیں۔ یہ معنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقص اظلال کے متعلق صحیح اترتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے اپنے ناقص اظلال یا مجددوں کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ ہر صدی کے سر پر آئیں گے اور ہزار مہینے کا عرصہ تراسی سال اور چار مہینہ کا ہوتا ہے اور اتنی مدت صدی سے گزر جائے تو صدی کا سر آ جاتا ہے۔ پس ہزار کے مہینے لفظاً ہزار کے لے کر اس آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ ہم قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مجددوں اور آپ کی تعلیمات کے وجود میں ہر صدی کے سر پر نازل کرتے رہیں گے اور ان مجددوں کا زمانہ باقی تراسی سال سے بہتر ہوگا۔ یعنی امت ان کی نگرانی میں جو برکات حاصل کرے گی ان کی عدم موجودگی میں وہ برکات حاصل نہ کر سکے گی۔

پانچویں معنے (۵) پانچویں معنے اس کے یہ ہیں کہ اسلام کی تعلیم جس زمانہ میں رائج ہو وہ زمانہ دوسرے سب زمانوں سے مقدم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کے تنزل اور ان کے ادبار کو دیکھ کر بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ تم جس اسلامی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور کہتے ہو کہ اسلامی حکومت دنیا میں مساوات قائم کرتی ہے۔ اسلامی حکومت غرباء کو ان کے حقوق دلاتی ہے۔ اسلامی حکومت ہر قسم کے جھگڑوں اور مناقشات کا سدباب کرتی ہے۔ اسلامی حکومت دنیا میں بین الاقوامی صلح کی داغ بیل ڈالتی ہے۔ اسلامی حکومت دولت کو چند محدود ہاتھوں میں نہیں رہنے دیتی۔ اسلامی حکومت غرباء کو آگے بڑھنے کے مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ وہ حکومت گئی کہاں؟ اگر تیس سال تک وہ دنیا میں رہی اور پھر اس کا خاتمہ ہو گیا تو اس اسلامی حکومت کا فائدہ کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیس سال نہیں اگر وہ ایک رات کے لئے بھی قائم ہو تب بھی وہ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ہے کیونکہ وہ دنیا میں آ کر ایک بیج تو بو گئی ہے، ایک نمونہ تو قائم کر گئی ہے۔ اگر اس کی شکل اب قائم نہیں رہی تو کیا ہوا۔ جب دنیا میں بیداری پیدا ہوگی وہ مجبور ہوگی کہ حکومت کو ان بنیادوں پر قائم کرے جو اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پہلے کھڑی کی تھیں۔ اگر یہ نمونہ دنیا میں قائم نہ ہو چکا ہوتا تو دنیا اپنی ترقی کے لئے کیا کر سکتی تھی۔ وہ اندھیروں میں بھٹکتی پھرتی اور اپنی مشکلات کے حل کے لئے کوئی راستہ نہ پاتی۔ اب بے شک دنیا میں اسلامی حکومت نہیں مگر اسلامی حکومت کا ایک نقشہ تو اس کے سامنے ہے۔ جب کبھی دنیا کو اپنی حالت بدلنے کا فکر ہوگا، جب کبھی تبدیلی کا احساس رونما ہوگا لوگوں کے سامنے ایک نمونہ موجود ہوگا۔ وہ کہیں گے آؤ ہم اس اسلامی حکومت کی نقل کریں جو آج سے تیرہ سو سال پہلے قائم کی گئی تھی۔ اس طرح پھر اس نمونہ کے ذریعہ دنیا میں روشنی نمودار ہوگئی اور اس کی مشکلات کا خاتمہ ہوگا۔ پس اللہ فرماتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد مسلمانوں میں خرابی پیدا ہو جانے سے اس رات

کی قدر کم نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک رات ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے۔ ہزار مہینوں میں چونکہ تیس ہزار راتیں ہوتی ہیں اس لئے لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ کے یہ معنے ہوئے کہ تم اس زمانہ کا کیا ذکر کرتے ہو، یہ زمانہ تو تیس ہزار زمانوں سے بڑھ کر ہے۔ اگر بعد میں تاریکی کے تیس ہزار دور بھی آ جائیں تب بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بے قیمت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تب بھی یہی کہا جائے گا کہ وہ زمانہ آئندہ آنے والے سب زمانوں سے بڑھ کر تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں اسلامی حکومت کا وہ ڈھانچہ قائم کر دیا گیا تھا جو قیامت تک آنے والے لوگوں کی صحیح راہنمائی کرنے والا اور ان کی مشکلات کو پورے طور پر دور کرنے والا ہے۔

جو معنے اوپر کئے گئے ہیں ان کے رو سے لیلۃ القدر بمعنے زمانۂ نبوت کی تو تشریح ہوجاتی ہے مگر یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر لیلۃ القدر سے اشارہ معروف لیلۃ القدر سے ہے تو پھر اس آیت کے کیا معنے ہوئے کہ لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے اچھی ہے کیونکہ ہزار مہینوں میں تو تراسی اور لیلۃ القدریں آ جائیں گی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لیلۃ القدر آتی تو ہر سال ہے مگر ہر شخص کو وہ رات میسر تو نہیں آ جاتی۔ جو لوگ سچے تقویٰ اور سچی نیکی سے خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں انہیں خاص توجہ اور خاص خشوع وخضوع کی حالت میں وہ میسر آتی ہے۔ یعنی گو اس کی عام برکات تو عام مسلمانوں کو ہر سال ہی مل جاتی ہیں لیکن اس کا کامل ظہور جبکہ انسان کو یہ معلوم بھی ہوجاتا ہے کہ آج لیلۃ القدر ہے، خاص خاص آدمیوں کو اور کبھی کبھی ہی نصیب ہوتا ہے۔ یہ تجربہ درمیانہ درجہ کے مومنوں کو اپنی عمر میں کبھی ایک دفعہ یا دو دفعہ نصیب ہوتا ہے۔ پس اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس شخص کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں لیلۃ القدر مل جائے اسے سمجھنا چاہیے کہ اس کی ساری عمر کامیاب ہوگئی۔ اور عمر کا اندازہ تراسی سال لگا کر بتایا ہے کہ ایسے شخص کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ رات اس کی باقی عمر سے افضل ہے اور اسی رات کی خاطر اس کی زندگی گزری ہے اور یہ رات اس کی زندگی کا نچوڑ ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ

(ہر قسم کے) فرشتے اور (اخلاص کی) روح اس (رات) میں اپنے رب کے حکم سے

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۛ ﴿۵﴾

تمام (دینی ودنیوی) امور (کی خرابی کو درست کرنے) کے لئے اترتے ہیں۔

تفسیر۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا میں اللہ تعالیٰ ایک زائد بات یہ بتاتا ہے کہ اس کی طرف سے

صرف کلام نہیں اترتا بلکہ ملائکہ اور روح دونوں کا اس کے ساتھ نزول ہوتا ہے۔ روح کے معنے کلام کے بھی ہوتے ہیں اور روح کلام الٰہی لانے والے فرشتے کو بھی کہتے ہیں (اقرب)۔ گویا ملائکہ سے مراد عام فرشتے ہیں اور روح سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کلامِ الٰہی لانے والے ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ پہلے الٰہی کلام اور اس کے نازل ہونے کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے یہاں روح سے کلام الٰہی لانے والے فرشتے مراد نہیں ہو سکتے بلکہ اس سے کچھ اور مراد ہے جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

فرماتا ہے ہماری سنت یہ ہے کہ جب کسی مامور پر ہم اپنا کلام نازل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی اپنے ملائکہ کو بھی زمین پر نازل کر دیتے ہیں۔ یہاں ملائکہ سے وہی فرشتے مراد ہیں جن کو آدم کے وقت سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ہم نے صرف اپنا کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں کیا بلکہ ملائکہ کی فوج بھی اس کی تائید کے لئے زمین پر نازل کر دی ہے یا آئندہ زمانہ میں قرآن کریم کی خدمت اور اسلام کے احیاء کے لئے جو مامورین آئیں گے.......... وہ اکیلے نہیں آئیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ان کی تائید اور نصرت کے لئے اور ان کے کام کو چلانے کے لئے ہمیشہ آسمان سے اترتے رہیں گے۔ پس مت سمجھو کہ اپنی تدابیر سے تم ہمارے مامورین کو مغلوب کر لو گے تم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ایسا کر سکو کیونکہ ملائکہ ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے کی کسی انسان میں طاقت نہیں ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو بھیجا تو ساتھ ہی فرشتوں کو حکم دے دیا کہ جاؤ اور اس کو سجدہ کرو۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ فرشتوں کے ماتحت جس قدر چیزیں تھیں وہ آدمؑ کے تابع کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح جب بھی خدا تعالیٰ کسی مامور کو مبعوث فرماتا ہے فرشتوں کا لشکر اس کی تائید میں اتار دیتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ جاؤ اور زمین میں ایسے تغیرات پیدا کرو جو ہمارے مامور کی ترقی کے لئے مفید ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم اپنے مامور کی تائید کے لئے صرف فرشتے ہی آسمان سے نازل نہیں کرتے بلکہ روح بھی نازل کرتے ہیں۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ میں روح سے مراد روحانیت یہاں روح سے مراد وہ روحانیت اور نئی زندگی ہے جو اہل عالم کے قلوب میں پھونکی جاتی ہے۔ فرماتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے لوگوں میں روح نہیں تھی وہ بظاہر زندہ نظر آتے تھے مگر مردوں سے بدتر تھے۔ نہ ان میں قوت فاعلی تھی نہ ان میں ترقی کا احساس تھا نہ ان میں شرافت اور انسانیت کا کوئی جذبہ پایا جاتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ملائکہ کی تحریک کے ذریعہ سے انسان کی خوابیدہ فطرت کو بیدار کرنا شروع کر دیا اور دوسری طرف مردہ انسانوں میں زندگی کی روح پھونکنی شروع کر دی۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے

مردہ زندہ ہو گئے، بے جان لاشے چلنے پھرنے لگے۔ صدیوں سے محکوم اور مغلوب قوم کے افراد دنیا کے فاتح اور حکمران بن گئے۔ عرب جس کی دنیا میں کوئی عزت نہیں تھی، جسے متمدّن اور مہذب ممالک کی نگاہ میں کوئی وقعت حاصل نہیں تھی اس نے جس رنگ میں اسلام پر ایمان لانے کے بعد ترقی کی ہے اسے دیکھ کر حیرت آتی ہے۔ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے ان میں بیداری پیدا ہوگئی تھی اور ان کی مردہ رگوں میں بھی زندگی کا خون دوڑنے لگا تھا اس لئے وہ دنیا میں ایسے عظیم الشان تغیرات پیدا کرنے کا موجب بن گئے جنہوں نے اس کی کایا پلٹ دی۔ اسی طرح فرماتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جب کلام الٰہی نازل ہوگا ہمیشہ اس کے ساتھ ملائکہ اترتے رہیں گے جو قلوب میں ایسی روحانیت، ایسی بیداری، ایسی قربانی اور ایسا اخلاص پیدا کریں گے کہ دنیا اسے دیکھ کر محو حیرت رہ جائے گی۔ زندگی کی ایک نئی روح لوگوں میں پیدا ہوجائے گی اور وہ اپنے ایمان کے نہایت اعلیٰ نمونے دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ اس زمانہ میں بھی جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے ایسا ہی ہوگا یہاں تک کہ وہ مسلمان جو کثیر ہونے کے باوجود قلیل ہیں، عالم ہونے کے باوجود جاہل ہیں، زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہیں ان میں بھی ایک نئی روح ڈال دی جائے گی۔ یہی روح ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ ناصری مردوں میں پھونکا کرتے تھے اور یہی روح ہے جس کی طرف قرآن کریم میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (الانفال:۲۵) اے ایمان والو! تم خدا اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کیا کرو جب وہ تمہیں اس غرض کے لئے بلاتا ہے کہ تمہیں زندہ کرے یعنی تم میں زندگی کی ایک نئی روح پیدا کردے۔ غرض فرماتا ہے اس زمانہ میں ایک طرف ملائکہ اتریں گے تا کہ وہ دنیا میں ایسے تغیرات پیدا کریں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں ہوں اور دوسری طرف ان تغیرات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں میں روح ڈالیں گے تا کہ ادھر دنیا میں تغیرات ہوں اور ادھر وہ دنیا پر قبضہ کرلیں۔ یہی حال آئندہ بھی ہوگا یعنی ملائکہ بھی اتریں گے اور تقدیر خاص بھی نازل ہوگی اور اس طرح مومنوں کے اندر ایک نئی بیداری اور نئی زندگی، نیا جوش اور نیا عزم پیدا کردیا جائے گا۔

حضرت مسیح موعودؑ کی نبوت کے متعلق ایک دلیل میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میرے اردگرد ایک بہت بڑا ہجوم ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس کے سامنے تقریر کرتا ہوں اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی نہیں ہیں تو مجھے کوئی ایک ہی غیر نبی ایسا بتادو جو اپنے بعد علماء کی

اس قسم کی جماعت پیدا کر گیا ہو جن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے علم لدُنّی حاصل ہوتا ہو اور جو اس کے کلام کو سمجھانے والے ہوں۔ میں رؤیا کی حالت میں اس خصوصیت پر زور دیتا ہوں اور کہتا ہوں یہ نبی ہی کی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنے بعد ایسی جماعت قائم کر دیتا ہے جس میں نئی زندگی اور نئی روئیدگی کی طاقت ہوتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھ کر اور اس کے کلام کے علوم کو سیکھ کر دنیا میں پھیلاتی اور ان کی اشاعت کرتی ہے (الفضل ۹ رمارچ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱)

یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ جب کوئی نبی دنیا میں آتا ہے وہ اپنی جماعت میں ایک ایسی روح پیدا کر دیتا ہے جس کی مثال دوسروں میں نہیں ملتی۔

بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ کے دو معنے بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ کے دو معنے ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ وہ اذن الٰہی کو لے کر اترتے ہیں اور یہ بھی کہ ان کا اترنا اذن الٰہی سے ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں باء کا تعلق تَنَزَّلُ کے ساتھ ہوگا یعنی تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ فِیۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اور معنے یہ ہوں گے کہ وہ اذن الٰہی کو لے کر اترتے ہیں یعنی کلام الٰہی کی تائید کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے لوگوں کی طرف خدا تعالیٰ کا حکم لاتے ہیں۔ دوسری صورت میں یہ جملہ حال ہوگا اور مراد یہ ہوگی کہ ان کا نزول اذن الٰہی سے ہوتا ہے یعنی اس قسم کا تغیر بغیر اذن الٰہی کے نہیں ہوتا جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے تب پیدا ہوتا ہے۔ علماء کا یہ کام نہیں کہ جب قوم بے جان ہو جائے اور اس میں سے زندگی کی روح بالکل نکل جائے تو وہ دوبارہ اس کو زندہ کر سکیں۔ ملائکہ بھی اور روح بھی ہمیشہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اس کے حکم سے آتے ہیں اس لئے جب بھی مذہبی قومی احیاء ہوگا خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگا انسانی تدبیروں سے مذہب کا احیاء نہیں ہو سکتا۔

مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ کے دو معنے مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ کے معنے ہیں مِنۡ اَجۡلِ کُلِّ اَمۡرٍ اَوۡ لِکُلِّ اَمۡرٍ۔ یعنی ہر امر کی خاطر۔ یا اس کے معنے ہیں بِکُلِّ اَمۡرٍ ہر امر کو ساتھ لے کر اترتے ہیں۔

مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ ہر امر جو اسلام کی ترقی کے لئے ضروری ہوگا اس کو پورا کرنے اور ہر ایک روک جو اسلام کی ترقی میں حائل ہوگی اس کو دور کرنے کے لئے آسمان سے فرشتے نازل ہوں گے اور وہ کام جو بظاہر ناممکن نظر آتا ہوگا اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسے سرانجام دے دے گا۔ لیکن اس آیت کے ایک اور بھی معنے ہیں اور وہ یہ کہ وہ زمانہ گذر گیا جب ناقص اور جزوی شریعتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا کرتی تھیں۔ اب وہ زمانہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے وہ کامل شریعت نازل کر دی ہے جو تمام ضروری امور پر حاوی ہے۔ اس طرح ابتدائے زمانہ میں ہی قرآن کریم سے کامل ہونے کا دعویٰ کر دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ وہ تمام ضروری علوم جو انسان کی ترقی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو پوری تفصیل کے ساتھ قرآن کریم میں

بیان کر دیا ہے۔تم اس شریعت کے بعد یہ نہیں کہہ سکو گے کہ بنی نوع انسان کی فلاں ضرورت پوری ہونے سے رہ گئی یا فلاں مسئلہ جس کا حل ضروری تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے حل نہیں کیا۔شریعت اپنے کمال پر پہنچ گئی ہے اور ہر ضروری امر جس کا انسان کی اصلاح اور روحانی ترقی کے ساتھ تعلق تھا اسے اس کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

مِنْ کُلِّ اَمْرٍ کے معنے اس لحاظ سے کہ لیلۃ القدر سے مراد مجدّدین کا زمانہ ہے اگر مجددین پر اس پیشگوئی کو چسپاں کیا جائے تو پھر مِنْ کُلِّ اَمْرٍ کا استعمال ایسا ہی ہوگا جیسے ملکۂ سبا کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ (النمل: ۲۴) کہ اس کو سب ایسی چیزیں دی گئی تھیں جن کی اس کو ضرورت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ مجددین کے کام کا حلقہ محدود ہوتا ہے اور وہ محض اپنے علاقہ یا اپنی قوم یا اپنے ملک کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے آتے ہیں اور اس وقت آتے ہیں جب خرابی وسیع اور شدید نہیں ہوتی۔ پس ان کا دائرہ عمل ایسا وسیع نہیں ہوتا کہ ساری دنیا کی اصلاح ان کے ذمہ ہو یا ہر قسم کی اصلاح ان کے ذمہ ہو۔پس مجددین پر جب اس پیشگوئی کو چسپاں کیا جائے گا تو مِنْ کُلِّ اَمْرٍ کے معنے سب امور کے نہیں ہوں گے بلکہ سب وقتی ضرورت کے امور کے ہوں گے یعنی جس جس خرابی کی اصلاح کے لئے انہیں ملائکہ کی مدد کی ضرورت ہوگی ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے ملائکہ نازل کر دیئے جائیں گے یا اسلام کی ترقی کے لئے جن امور کی انہیں ضرورت ہوگی ان امور میں انہیں ملائکہ کی مدد حاصل ہوگی گویا مِنْ کُلِّ اَمْرٍ کے معنے ہوں گے کل ضروری امور۔لیکن وہ موعود جو بروز کامل کے طور پر ظاہر ہوں گے چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل بروز ہوں گے اس لئے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس آیت کے یہ معنے تھے کہ قرآنی شریعت کو ہر لحاظ سے کامل کیا جائے گا اسی طرح ان کے متعلق اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اس زمانہ میں قرآن کریم کی ساری خوبیاں مخفی ہو جائیں گی تب اللہ تعالیٰ آسمان سے اپنے ملائکہ کو نازل فرمائے گا اور قرآن کریم کی تمام خوبیوں کو دنیا پر دوبارہ ظاہر کرے گا۔اس صورت میں مِنْ کُلِّ اَمْرٍ کے معنے صرف ضروری امور کے نہیں ہوں گے بلکہ تمام امور کے ہوں گے یعنی کوئی امر ایسا نہیں ہوگا جس کے لئے آسمان سے فرشتوں کا نزول نہ ہو۔

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۶ ع

(پھر فرشتوں کے اترنے کے بعد تو) سلامتی (ہی سلامتی ہوتی) ہے (اور) یہ (حال) صبح کے طلوع ہونے تک (رہتا) ہے۔

حلّ لُغات۔ سَلٰمٌ علماء لغت لکھتے ہیں کہ یہاں سَلٰمٌ مُسَلِّمَۃٌ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی

سلام بھیجنے والے۔ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے مومنوں کو یا مومن آپس میں سلام کرتے ہیں۔مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سَلٰمٌ کا لفظ یہاں سلامتی کے معنوں میں بھی استعمال ہوسکتا ہے۔پھر آگے چل کر اوراختلاف ہوجاتا ہے بعض لوگ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ پر پہلی آیت کو ختم سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں سَلٰمٌ ایک علیحدہ لفظ ہے۔بعض کے نزدیک سَلٰمٌ کو ھِیَ کے ساتھ لگانا چاہیے یعنی سَلٰمٌ ھِیَ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ سَلٰمٌ کا مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ سے تعلق ہے یعنی آیت یوں ہے مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ سَلٰمٌ ۔اور ھِیَ۔حَتّٰی کے ساتھ لگے گا اور معنے یہ ہوں گے کہ یہ حالت مطلع الفجر تک رہے گی۔وہ لوگ جو سَلٰمٌ کو بالکل علیحدہ لفظ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں کہ سَلَامٌ سَلَامٌ یعنی یہ زمانہ سلامتی ہی سلامتی کا ہوتا ہے یا لیلۃ القدر میں خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہی سلامتی نازل ہوتی ہے۔لیکن وہ لوگ جو مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ کے ساتھ اس کا تعلق بتاتے ہیں ان کے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں کہ ہر امر جو اس رات میں فرشتے لاتے ہیں سلامتی کا موجب ہوتا ہے اور جو لوگ ھِیَ کا سَلٰمٌ کے ساتھ تعلق بتاتے ہیں ان کے نزدیک معنے یہ ہیں کہ فرشتوں کا نزول سلامتی ہی سلامتی ہوتا ہے۔ابن عباسؓ کا یہی آخری قول ہے اور درحقیقت یہ سب ہی معنے اس آیت پر چسپاں ہوتے ہیں۔(البحر المحیط زیر سورۃ القدر۔البغوی زیر سورۃ القدر۔ فتح البیان زیر آیت سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ)

تفسیر ۔ قرآن مجید کا اپنی تعلیم کے مکمل اور سلامتی والا ہونے کا دعویٰ دیکھو ابھی اسلام شروع ہی ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں یہ اعلان فرما دیا کہ قرآن کریم میں ہماری طرف سے جو تعلیم پیش کی جارہی ہے اپنے اندر محض سلامتی رکھتی ہے کوئی تمدنی یا عائلی یا اخلاقی یا روحانی ضرر نہیں جو اس تعلیم پر عمل کرنے والے کو پہنچ سکتا ہو۔ان معنوں کے رو سے تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ فِیۡھَا بِاِذۡنِ رَبِّھِمۡ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ سَلٰمٌ پر جملہ ختم ہوگا اور مفہوم یہ ہوگا کہ اس وقت ہماری طرف سے فرشتے جو تعلیم لے کر نازل ہو رہے ہیں وہ نہ صرف تمام امور پر مشتمل ہے بلکہ اپنے اندر کامل سلامتی رکھتی ہے۔ہر قسم کے ضرر سے پاک، ہر قسم کے نقصان سے محفوظ اور ہر قسم کے عیب سے منزہ ہے اور دنیا یہ طاقت نہیں رکھتی کہ اس تعلیم میں کوئی نقص ثابت کر سکے اور اس صورت میں کہ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ سَلٰمٌ کو الگ جملہ سمجھا جائے آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر نازل ہوتے ہیں اور ادھر دنیا کی ہر تدبیر اور ہر سعی سے انہیں سلامتی کا پیام دیا جاتا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ دو تغیّرات اس وقت دنیا میں پیدا کرتا ہے۔ایک تو یہ کہ فرشتے اور روحانیت آسمان سے اترتے ہیں اور ایک یہ کہ قانون طبعی اس تحریک کی تائید میں لگ جاتا ہے آسمان سے زمین کا پانی مل جاتا ہے اور نبی کی کامیابی یقینی ہوجاتی ہے اور اگر پہلی آیت کو

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ تک ختم سمجھا جائے تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ملائکہ اور روح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر قسم کی شریعت لے کر آتے ہیں اور اس زمانہ میں طلوع فجر تک سلامتی ہی سلامتی رہتی ہے یعنی یہ ایام خاص نصرتوں اور فضلوں کے ہوتے ہیں۔

اور اگر سَلٰمٌ کو دوسرا جملہ اور هِيَ حَتّٰى کو ایک مستقل تیسرا جملہ قرار دیا جائے تو ان آیات کے یہ معنے ہوں گے کہ ملائکہ اور روح ہر قسم کے احکام لے کر اس رات میں اترتے ہیں اے لوگو یہ زمانہ سلامتی ہی سلامتی کا ہے اور یہ تمام فرشتوں کا اترنا اور روح کا آنا اور سلامتی کا پھیل جانا طلوع فجر تک رہے گا۔ غرض نحوی طور پر جس قدر معنے اس آیت کے بنتے ہیں وہ سب کے سب اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں۔

مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے مراد اسلام کا غلبہ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے کیا مراد ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے مراد وہ وقت ہے جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے اور یہ غلبہ ہمیشہ نبی کی وفات کے وقت ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ’’الوصیت‘‘ میں تحریر فرمایا ہے کہ ’’اے عزیزو! خدا تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت چلی آئی ہے کہ وہ اپنی دو قدرتیں دکھلاتا ہے تا کہ دشمنوں کی دو جھوٹی خوشیوں کو پامال کرے۔ ایک قدرت تو وہ ہوتی ہے جس کا نبی کے ذریعہ اظہار ہوتا ہے جب وہ اس راست بازی کا بیج بو دیتا ہے جس کو وہ دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور دوسری قدرت وہ ہوتی ہے جس کا اس کے خلفاء کے ذریعہ تکمیل کے رنگ میں اظہار ہوتا ہے۔‘‘

پس یہاں مَطْلَعِ الْفَجْرِ سے نبی کی وفات کا زمانہ مراد ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تمہاری تمام سلامتی اس بات میں ہے کہ تم اس رات کی عظمت کو پہچانو اور وہ قربانیاں کرو جن کا اس وقت تم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے جب فجر کا طلوع ہو گیا اور نبوت کا زمانہ ختم ہو گیا اس وقت آسمان کی نعمتیں آسمان پر رہ جائیں گی اور زمین ان برکات سے حصہ نہیں لے سکے گی جن سے اس وقت حصہ لے رہی ہے۔

نبی کا زمانہ ایک لحاظ سے دن اور ایک لحاظ سے رات اس جگہ یہ نکتہ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبی کے زمانہ کو بار بار دن بھی کہا گیا ہے اور نبی کو سورج۔ پھر اس کے زمانہ کو لیلۃ القدر یعنی رات بھی کہا گیا ہے وہی دن اور وہی رات کس طرح ہوا۔ سو یاد رہے کہ دو الگ الگ نسبتوں کی بناء پر ایک ہی زمانہ کو دن بھی کہا گیا ہے اور رات بھی۔ نبی کا زمانہ رات ہوتا ہے بوجہ اس سے پہلی ظلمت کے۔ اور نبی کا زمانہ رات ہوتا ہے بوجہ اس کے کہ

جب وہ اس ظلمت کو دور کر دیتا ہے تو اس کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے کہا جاتا ہے کہ اب تمہارے جانے کا وقت آ گیا۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب گمراہی اور ضلالت کی تاریکیوں کو دور کر دیا تو اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا (النصر: ۲ تا ۴) کے ذریعہ آپ کو وفات کی خبر دی گئی اور بتایا گیا کہ اب ہم تمہیں اپنے پاس بلانے والے ہیں پس چونکہ نبی اس زمانہ میں آتا ہے جب چاروں طرف ظلمت چھائی ہوئی ہوتی ہے اور جب وہ اس ظلمت کو دور کر دیتا اور امن اور ترقی اور کامیابی کا زمانہ آجاتا ہے تو وہ فوت ہو جاتا ہے اس لئے اس کے زمانہ کو رات قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا سارا کام رات میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ مشکلات کے زمانہ میں آتا اور مشکلات کا دور ختم ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے پاس چلا جاتا ہے۔ پس چونکہ ظاہری بڑی ترقی نبی کی وفات کے بعد آتی ہے اور کامیابیوں کا سورج ہمیشہ مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ کے بعد نکلتا ہے اس لئے نبی کے زمانہ کو رات کہا جاتا ہے اگلا زمانہ جو مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ سے شروع ہوتا ہے اور جس میں الٰہی سلسلہ کو دنیا میں غیر معمولی عروج حاصل ہوتا ہے وہ اسی وقت آتا ہے جب فجر کا طلوع ہو جاتا ہے یعنی نبی اپنے رب کے پاس جا چکا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں تک روحانی ترقیات کا سوال ہے نبی کا زمانہ روشنی کا زمانہ ہوتا ہے اور نبی کی وفات کے بعد کا زمانہ تاریکی کا زمانہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے اس زمانہ میں آسمان سے نزول وحی کا ایک عجیب سلسلہ شروع ہوتا ہے، برکات وانوار کی بارش ہوتی ہے، معجزات ونشانات کا ظہور ہوتا ہے، روحانیت کی منازل سالوں اور مہینوں کی بجائے دنوں میں طے ہونے لگتی ہیں اور ایمان واخلاص اور محبت باللہ میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے اس بناء پر اس زمانہ کو دن کہا جاتا ہے اسے روشنی اور نور کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے اور اس زمانہ کو رات قرار دیا جاتا ہے جس میں نبی موجود نہیں ہوتا۔

غرض زمانہ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر نسبتوں کے فرق کی وجہ سے اسے رات بھی کہا جاتا ہے اور دن بھی۔ وہ رات ہوتا ہے بوجہ اپنی پہلی ظلمت کے اور بوجہ اس کے کہ نبی کے زمانہ میں دنیوی ترقیات پوری طرح نہیں ہوتیں۔ کامیابیوں اور ترقیات کا زمانہ نبی کی وفات کے بعد آتا ہے مگر بلحاظ خاص افضال الٰہی کے یعنی نزول وحی اور نزول برکات اور تکمیل روحانیت کے اس کا زمانہ دن کا زمانہ ہوتا ہے اور اس کے بعد کا زمانہ رات کا زمانہ۔ کیونکہ اس زمانہ میں دنیا ان برکات سے محروم ہو جاتی ہے جن سے وہ پہلے متمتع ہوا کرتی تھی۔ پس روحانی برکات کے لحاظ سے نبی کا زمانہ دن ہوتا

ہے اور بعد کا زمانہ رات اور اس وجہ سے کہ اس کی تعلیم کی دنیوی شوکت ابھی پورے طور پر نہیں ظاہر ہوئی ہوتی کہ نبی اٹھا لیا جاتا ہے اس کا زمانہ رات کا ہوتا ہے کیونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ مَطْلَعِ الْفَجْرِ تک نبی اپنی قوم میں رہتا ہے۔ چونکہ کوئی بھی نبی دنیوی انعامات حاصل کرنے کے لئے نہیں آتا اس لئے جب اس کی قربانیوں کے مادی نتائج نکلنے کا وقت آتا ہے اور وہ بیج اپنا پھل دینے لگتا ہے جو اس نے بویا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے فرماتا ہے تم ہمارے پاس آ جاؤ اور یہ انعام ان دوسروں کے لئے رہنے دو جن کی نگاہ اسے زیادہ قیمتی سمجھتی ہے۔ اسی امر کو مدنظر رکھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو نجوم قرار دیا ہے کیونکہ نجوم ہمیشہ رات کو ظاہر ہوتے ہیں آپ فرماتے ہیں اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اقْتَدَیْتُمْ اهْتَدَیْتُمْ (تشیید المبانی فی تخریج احادیث مکتوبات الامام الربانی) یعنی میرے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے جو برکات نازل کی ہیں ان سے حصہ لے کر میرے صحابہؓ نجوم بن گئے ہیں اب تو دن کا وقت ہے اور سورج اپنی شعاعوں سے دنیا کو منور کر رہا ہے لیکن میرے بعد دنیا پر رات کا زمانہ آ جائے گا اس وقت میرے صحابہؓ ستارے بن کر لوگوں کی رہنمائی کریں گے اس لئے میرے بعد وہی لوگ کامیاب ہوں گے جو رات کی تاریکیوں میں میرے صحابہؓ سے روشنی حاصل کریں گے۔ اس حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کو دن قرار دیا ہے اور بعد میں آنے والے زمانہ کو رات کہا ہے۔ لیکن دوسری طرف جہاں تک ظاہری کامیابیوں اور فتوحات کا تعلق ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ رات سے مشابہت رکھتا تھا اور بعد میں آنے والا زمانہ دن سے مشابہت رکھتا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وفات پا گئے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ظاہری رنگ میں غلبہ دینا شروع کر دیا یہاں تک کہ اسلام کو ایسی طاقت حاصل ہوگئی کہ ابوبکرؓ کی آواز جب قیصر سنتا تو وہ اس کو رد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ حالت تھی کہ آپؐ کا خط جب اس کے پاس گیا تو گو اس پر اثر بھی ہوا مگر پھر اپنی قوم سے ڈر گیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو آپ کو ابوبکرؓ سے بھی زیادہ رعب حاصل ہوا۔ قیصر صرف ان کی بات کو سنتا نہیں تھا بلکہ ساتھ ہی وہ ڈرتا بھی تھا کہ اگر میں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو میرے لئے اچھا نہیں ہوگا اور کسریٰ تو اس وقت تک بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ عثمانؓ کا زمانہ آیا تو ان کو بھی ایسا دبدبہ اور رعب حاصل ہوا کہ چاروں طرف ان کا نام گونجتا تھا اور ہر شخص سمجھتا تھا کہ مجھے امیر المومنین کے حکم کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اب جہاں تک دنیوی اعزاز کا سوال ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ عزت حاصل نہیں ہوئی جو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کو حاصل ہوئی مگر پھر بھی یہ لوگ روحانی دنیا کے نجوم تھے شمس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔

غرض نبی کی وفات کے معاً بعد سے روحانی لحاظ سے رات کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے لیکن جسمانی لحاظ سے نبی کی وفات طلوع فجر پر دلالت کرتی ہے اور معاً بعد سے طلوع آفتاب یعنی ظاہری کامیابیوں کا نظارہ نظر آنا شروع ہو جاتا ہے ایسا ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا۔ ایسا ہی مسیح ناصریؑ اور موسیٰؑ کے زمانہ میں ہوا اور ایسا ہی اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا۔ آپ کے زمانہ میں جو آخری جلسہ ہوا اس میں سات سو آدمی جمع ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے آپ سیر کے لئے باہر تشریف لے گئے تو ریتی چھلہ میں جہاں بڑ کا درخت ہے وہاں لوگوں کی کثرت اور ان کے اژدہام کو دیکھ کر آپ نے فرمایا معلوم ہوتا ہے ہمارا کام ختم ہو چکا ہے کیونکہ اب غلبہ اور کامیابی کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں پھر آپ بار بار احمدیت کی ترقی کا ذکر کرتے اور فرماتے اللہ تعالیٰ نے احمدیت کو کس قدر ترقی بخشی ہے اب تو ہمارے جلسہ میں سات سو آدمی شامل ہونے کے لئے آ گئے ہیں یہ اتنی بڑی کامیابی ہے کہ میں سمجھتا ہوں جس کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا تھا وہ پورا ہو چکا ہے اب احمدیت کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔

احمدیت کی ترقی حضرت مسیح موعودؑ کی وفات کے بعد غرض سات سو آدمیوں کے آنے پر آپ اس قدر خوش ہوئے کہ آپ نے سمجھا جس کام کے لئے مجھے کھڑا کیا گیا تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے مگر اب خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ حالت ہے کہ صرف درس میں ہی آٹھ آٹھ سو آدمی جمع ہو جاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہیں باہر سے نہیں آتے بلکہ قادیان میں رہنے والے ہیں اور جلسہ سالانہ پر تو خدا تعالیٰ کے فضل سے پچیس تیس ہزار آدمی باہر سے اکٹھا ہو جاتا ہے۔ غرض ہمارا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی پر ترقی کر رہا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جس میں کوئی نہ کوئی شخص بیعت میں شامل نہ ہو۔ ترقی اور عروج اور طاقت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر اس غلبہ کے باوجود کون کہہ سکتا ہے کہ یہ زمانہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے بہتر ہے بے شک ہمیں کامیابیاں زیادہ حاصل ہو رہی ہیں، ترقیات زیادہ حاصل ہو رہی ہیں، غلبہ زیادہ حاصل ہو رہا ہے مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کو یاد کر کے دل تڑپ اٹھتا ہے اور یہ ساری کامیابیاں بالکل حقیر نظر آنے لگتی ہیں۔

سَلٰمٌ کے لفظ پر ایک پرانا نوٹ میرے قرآن پر ایک چھوٹا سا پرانا نوٹ ہے جو ان قلبی کیفیات کو خوب ظاہر کرتا ہے جو نبی کا زمانہ دیکھنے والوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔ میں نے سَلٰمٌ پر نوٹ لکھا ہے۔

”یعنی اس رات میں سلامتی ہی سلامتی ہے آہ مسیح موعود کا وقت! اس وقت تھوڑے تھے مگر امن تھا“

بعد میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بڑی بڑی ترقیات دی ہیں مگر یہ ترقیات اس زمانہ کا کہاں مقابلہ کر سکتی ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا تھا۔ بے شک آج دنیوی لحاظ سے جو رتبہ ہم کو حاصل ہے وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کو حاصل نہیں تھا۔ جتنے لوگ ہماری باتیں ماننے والے موجود ہیں اتنے لوگ باتیں ماننے والے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں موجود نہیں تھے جتنا خزانہ ہمارے ہاتھ میں ہے اتنا خزانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اب بعض دفعہ خدا تعالیٰ ایک ایک دن میں پچیس پچیس تیس تیس ہزار روپیہ چندے کا بھجوا دیتا ہے حالانکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں اتنا چندہ سارے سال میں بھی جمع نہیں ہوتا تھا مگر اس تمام ترقی کے باوجود کون کہہ سکتا ہے کہ یہ زمانہ اس زمانہ سے بہتر ہے۔

مجھے یاد ہے جب لنگر خانہ کا خرچ بڑھا اور کثرت سے قادیان میں مہمان آنے شروع ہو گئے تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو خاص طور پر یہ فکر پیدا ہو گیا کہ اب ان اخراجات کے پورا ہونے کی کیا صورت ہو گی مگر اب یہ حالت ہے کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک ایک احمدی لنگر خانہ کا سارا خرچ دے سکتا ہے۔

جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے زلزلہ کے متعلق اپنی پیشگوئیوں کی اشاعت فرمائی تو قادیان میں کثرت سے احمدی دوست آ گئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی دوستوں سمیت باغ میں تشریف لے گئے اور وہاں خیموں میں رہائش شروع کر دی۔ چونکہ ان دنوں قادیان میں زیادہ کثرت سے مہمان آنے لگ گئے تھے ایک دن آپ نے ہماری والدہ سے فرمایا کہ اب تو روپیہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی میرا خیال ہے کہ کسی سے قرض لے لیا جائے کیونکہ اب اخراجات کے لئے کوئی روپیہ پاس نہیں رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ ظہر کی نماز کے لئے تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو اس وقت آپ مسکرا رہے تھے۔ واپس آنے کے بعد پہلے آپ کمرہ میں تشریف لے گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلے اور والدہ سے فرمایا کہ انسان باوجود خدا تعالیٰ کے متواتر نشانات دیکھنے کے بعض دفعہ بدظنی سے کام لے لیتا ہے میں نے خیال کیا تھا کہ لنگر کے لئے روپیہ نہیں اب کہیں سے قرض لینا پڑے گا مگر جب میں نماز کے لئے گیا تو ایک شخص جس نے میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ آگے بڑھا اور اس نے ایک پوٹلی میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے اس کی حالت کو دیکھ کر سمجھا کہ اس میں کچھ پیسے ہوں گے۔ مگر جب گھر آ کر اسے کھولا تو اس میں سے کئی سو روپیہ نکل آیا۔

اب دیکھو وہ روپیہ آج کل کے چندوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا تھا۔ آج اگر کسی کو کہا جائے کہ تمہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ کا ایک دن نصیب کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ تم لنگر کا ایک دن کا خرچ دے دو تو وہ کہے گا کہ ایک دن کا خرچ نہیں تم مجھ سے سارے سال کا خرچ لے لو لیکن خدا کے لئے مجھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ کا ایک دن دیکھنے دو۔ مگر آج کسی کو وہ بات کہاں نصیب ہو سکتی ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کے زمانہ میں قربانی کرنے والوں کو نصیب ہوئی۔

جماعت احمدیہ کا فرض افسوس کے لوگوں کے سامنے قربانی کے مواقع آتے ہیں تو وہ ان سے منہ پھیر لیتے ہیں اور جب وقت گزر جاتا ہے تو حسرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کاش! ہم نے فائدہ اٹھایا ہوتا۔ کاش! ہم نے وقت کو ضائع نہ کیا ہوتا۔ اب بھی خدا تعالیٰ نے ان کے لئے ایک بڑا موقعہ پیدا کیا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ کا موعود ان میں موجود ہے اگر وہ چاہیں تو صحابہ کی سی خدمات کر کے صحابہ کے سے انعامات حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر کتنے ہیں جو اس نعمت کی قدر کرتے ہیں۔ ہاں بہت لوگ اس وقت روئیں گے اور آہیں بھریں گے جب وہ زمانہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ غرض انبیاء دنیا میں ایک بیج بونے کے لئے آتے ہیں وہ بیج بظاہر ایسے حالات میں بویا جاتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں وہ ضائع چلا جائے گا مگر اللہ تعالیٰ اپنی قدیم اور ازلی سنت کے مطابق اس بیج کو بڑھاتا اور اپنے سلسلہ کو ممتد کرتا چلا جاتا ہے۔ اس دوران میں الٰہی سنت کے مطابق قربانی کے کچھ اور مواقع پیدا ہو جاتے ہیں تب وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی محبت رکھتے ہیں اپنی حسرتوں کو پورا کرنے کے لئے آگے بڑھتے اور قربانیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پھر بھی سوئے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ زمانہ بھی گزر جاتا ہے اور وہ کف افسوس ملنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہ کیا۔ آج لوگ حسرتیں کرتے ہیں کہ ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نہ ملا مگر اس حسرت کے باوجود وہ موجودہ قربانیوں میں پوری طرح حصہ نہیں لے رہے۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہی کہ وہ اس زمانہ کو بھی کھو دیں گے اور حسرت کریں گے کہ کاش! انہیں مصلح موعود کے زمانہ میں خدمت کا کوئی موقعہ مل جاتا۔ حالانکہ ان حسرت کرنے والوں میں بہت لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اس زمانہ کو پایا مگر ان کی آنکھیں بند رہیں انہوں نے وقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی اور حسرت اور افسوس کے سوا ان کو اور کچھ حاصل نہ ہوا۔

سُورَۃُ الْبَیِّنَۃِ مَدَنِیَّۃٌ

سورۃ بیّنہ ۔ یہ سورۃ مدنی ہے۔

وَھِیَ ثَمَانِیَ اٰیَاتٍ دُونَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ

اوراس کی بسم اللہ کے سوا آٹھ آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

سورۃ البینہ مدنی ہے جمہور مفسّرین کے نزدیک یہ سورۃ مدنی ہے ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ مدنی ہے اور ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ یہ سورۃ مکّی ہے (فتح البیان زیر سورۃ البیّنۃ)۔ ابو حیّۃ بدری سے روایت ہے کہ جب سورۃ لَمْ یَکُنِ سب کی سب نازل ہوئی ہے (یعنی یہ اکٹھی نازل ہوئی ہے) تو جبریل نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ یہ سورۃ ابی بن کعبؓ کو یاد کرادیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابی بن کعبؓ سے کہا کہ جبریل نے مجھے حکم دیا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا یہ حکم مجھے پہنچایا ہے کہ میں یہ سورۃ تم کو یاد کرادوں ابی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا بھی خدا تعالیٰ کے حضور میں ذکر آیا تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس پر ابی بن کعبؓ خوشی کے مارے رو پڑے (مسند احمد بن حنبل مسند ابی حبۃ البدری)۔ یہ روایت مسند احمد میں اور طبرانی میں اور ابن مردویہ میں مروی ہے۔ بخاری اور مسلم نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے لیکن بخاری اور مسلم کی روایت میں الفاظ نہیں کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی اُس وقت آپ نے یہ فرمایا۔ دوسرے بخاری اور مسلم کی روایت میں جبریل کا بھی ذکر نہیں۔ صرف اتنا ذکر آتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں یہ سورۃ تم کو پڑھادوں (بخاری کتاب مناقب الانصار باب مناقب ابیّ بن کعب ۔مسلم کتاب فضائل الصحابۃ باب من فضائل ابیّ بن کعب)۔ گو بخاری اور مسلم کی روایت میں یہ ذکر نہیں آتا کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی اُس وقت آپ نے ابی بن کعبؓ سے یہ فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ تمہیں یاد کرانے کا حکم دیا ہے مگر چونکہ دوسری روایت میں یہ ذکر آ گیا ہے جو مسند احمد بن حنبل جیسی مستند کتاب نے بھی نقل کی ہے اِس لئے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ صحیح روایات کی بناء پر یہ سورۃ مدنی ہی ہے کیونکہ ابی ابن کعبؓ انصاری تھے اور مدینہ میں مسلمان ہوئے پس جو سورۃ اُن کے زمانہ میں نازل ہوئی وہ مدنی ہی ہوسکتی ہے مسیحی مستشرق بھی مانتے ہیں کہ یہ سورۃ مدنی ہے............ چنانچہ

ریورنڈ وہیری اس سورۃ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ مدنی ہے اور جرمن مستشرق نولڈکے نے اِسے سورۂ بقرہ کے معاً بعد کے زمانہ میں نازل شدہ قرار دیا ہے۔

(A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry vol:4 p:365)

اس جگہ ایک لطیفہ بھی بیان کرنے کے قابل ہے ریورنڈ ویری اس سورۃ کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس سورۃ کو مکی قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر روایت بیان ہو چکی ہے بعض لوگوں سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں کیونکہ اُنہی کی نسبت روایت ہے کہ انہوں نے اسے مکّی قرار دیا۔ ریورنڈ ویری کہتے ہیں کہ ایسا کرنے کی یعنی اُسے مکی قرار دینے کی اُن کے پاس سوائے اس کے کوئی وجہ نہیں کہ یہ سورۃ مکی سورتوں میں شامل کی گئی ہے۔ تعجب ہے ایک طرف تو عیسائی مؤرخ شیعوں کی ہمنوائی میں قرآن کریم کی کو بیاضِ عثمانی قرار دیتے ہیں کم سے کم ترتیبِ سُوَر کو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور دوسری طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کو کہ یہ سورۃ مکّی ہے اس بات کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے کہ یہ سورۃ مکّی سورتوں میں رکھی ہوئی ہے حالانکہ اگر یہ قول دوسری یا تیسری صدی کے کسی شخص کا ہوتا تو پھر ان کے قول کے مطابق یہ کہا جا سکتا تھا کہ اُس نے اس سورۃ کو مکّی سورتوں میں رکھا ہوا دیکھ کر اُسے مکّی قرار دے دیا۔ لیکن یہ قول تو اُس کا ہے جو خلافتِ عثمان سے بہت پہلے سے مسلمان تھیں۔ پس اگر یہ اعتراض درست ہے تو اُن کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ ترتیب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی ہے تبھی اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دھوکا کھایا ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی عمر گذاری تھی وہ عثمانؓ کی ترتیب سے دھوکا کھا جاتیں۔ قرآن کریم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نظریے یقیناً عثمانی جمعِ قرآن سے پہلے قائم ہو چکے تھے پس اگر حضرت عائشہؓ نے اس کے مکّی ہونے کا عقیدہ اس لئے قائم کیا کہ یہ مکّی سورتوں میں رکھی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ کے ہوش سنبھالنے سے پہلے یہ سورۃ مکّی سورتوں میں رکھی جا چکی تھی۔ پس ترتیب قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ثابت ہوئی نہ کہ عیسائی مؤرخین کے مطابق عثمانؓ کی؟

پھر ایک اور لطیفہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ریورنڈ ویری نے آخری سب سورتوں کو مکّی قرار دیا ہے اور حضرت عائشہؓ پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اس سورۃ کو محض اس لیے مکّی کہہ دیا ہے کہ یہ مکّی سورتوں میں رکھی ہوئی ہے۔ حالانکہ ریورنڈ ویری کی یہ لاعلمی ہے کہ انہوں نے آخری سب سورتوں کو مکّی قرار دیا ہے۔ اس سورۃ کو تو خیر صرف حضرت عائشہؓ نے مکّی قرار دیا ہے لیکن اس سورۃ سے اگلی سورۃ کو یعنی سورۂ زلزال کو اکثر لوگوں نے مدنی قرار دیا ہے (فتح البیان زیر سورۃ الزلزال) اور قرآن کریم کے مروّج مطبوعہ نسخوں میں اس کے اُوپر مدنی ہی لکھا ہوا ہے پھر

اس آخری مجموعہ سُوَر میں سورۃ والنصر بھی ہے جو نہ صرف بالاتفاق مدنی ہے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام کی نازل شدہ ہے۔ بعض صحابہؓ نے اسے غزوۂ خیبر سے واپسی کے وقت کی نازل شدہ قرار دیا ہے اور بعض نے اسے حجۃ الوداع میں منٰی کے مقام پر نازل شدہ قرار دیا ہے (فتح البیان زیر سورۃ النصر۔ روح المعانی زیر سورۃ النصر) جس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسّی دن زندہ رہے۔ پس جب اس مجموعہ میں یقیناً مدنی سورتیں موجود ہیں تو سوائے ایک جاہل انسان کے کون شخص حضرت عائشہؓ پر یہ الزام لگا سکتا ہے کہ انہوں نے اس سورۃ کو آخری سورتوں میں رکھے جانے کی وجہ سے مکّی قرار دے دیا ہاں اصل واقعہ سے ہمیں انکار نہیں کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ جیسا کہ اکثر صحابہؓ اور تابعین کی روایات سے ثابت ہے اور جمہور مفسرین کا عقیدہ ہے ہمیں صرف اس بات پر اعتراض ہے کہ مسیحی مصنف بغیر دلیل کے تعصب کی بناء پر اسلامی تاریخ پر حملہ کر دیتے ہیں۔

ترتیب اس کا تعلق پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ پہلی دو سورتوں میں قرآن کریم کے نزول کا ذکر تھا اور اُس کی ذاتی خوبیاں بیان کی گئی تھیں اب اس سورۃ میں قرآن کریم کے اُس اثر کو بیان کیا گیا ہے جو غیر اقوام سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ فرمایا کہ اگر یہ قرآن نہ آتا تو اہلِ کتاب اور غیر اہل کتاب اپنے غلط رویہ سے باز نہ آ سکتے تھے۔ اس سورۃ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بَیِّنَہ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ آپ قرآن کریم لائے اور اصلاحِ عالم کے لئے آپ نے قرآن کریم کے نزول کو ضروری قرار دیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۱

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ (شروع کرتا ہوں)

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے یعنی اہل کتاب اور مشرک (دونوں ہی) کبھی (اپنے کفر سے)

مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۲

باز رہنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس واضح دلیل نہ آ جاتی۔

حلّ لُغات۔ مُنْفَكِّيْنَ مُنْفَكِّيْنَ اِنْفَكَّ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اور اِنْفَكَّ فَكَّ سے باب انفعال

انفعال کا صیغہ ہے فَکَّ کے اصل معنے کھولنے یا جدا کرنے کے ہوتے ہیں۔ پس اِنْفَکَّ کے معنے ہوئے کُھل گیا یا جُدا ہو گیا۔ علاوہ ازیں عربی زبان میں اِنْفَکَّ کے مندرجہ ذیل معانی استعمال ہوتے ہیں (۱) کہتے ہیں اِنْفَکَّتْ قَدَمُہٗ: زَالَتْ اُس کا قدم اپنی جگہ سے ہٹ گیا (۲) اِنْفَکَّتْ اِصْبَعُہٗ: اِنْفَرَجَتْ انگلی کھل گئی (۳) اِنْفَكَّ وَرِکُہٗ: زَاغَ عَنْ مَّوْضِعِہٖ۔ جوڑ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ (۴) اِنْفَكَّ الشَّیْءُ الْمُشْتَبِكُ: اِنْفَصَلَ۔ جُڑی ہوئی چیز الگ ہو گئی (۵) اِنْفَکَّتِ الْعُقْدَۃُ: اِنْحَلَّتْ گرہ کھل گئی (۶) اِنْفَکَّتِ الرَّقَبَۃُ مِنَ الرِّقِّ: اُعْتِقَتْ گردن کھل گئی یعنی غلام آزاد کر دیا گیا (اقرب) اور جب محاورہ میں مَا انْفَكَّ یَفْعَلُ کَذَا کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں مَا زَالَ وہ کوئی کام کرتا چلا گیا۔ ان معنوں میں مَا انْفَكَّ کَانَ کے اخوات میں شمار ہوتا ہے چونکہ اِنْفَكَّ کے معنے الگ ہو جانے کے ہیں اس لئے جب اس سے پہلے نفی آ جائے تو اس کے معنے اثبات کے بن جاتے ہیں اور اس صورت میں وہ کسی چیز کے تسلسل کے ساتھ ہونے کے معنے دیتا ہے۔ (اقرب)

بَیِّنَۃٌ بَیِّنَۃٌ بَیِّنٌ کی مونث ہے اور ان معنوں کے رُو سے یہ لفظ کسی واضح اور جلی چیز کے معنے دیتا ہے لیکن علاوہ اس کے کہ یہ بَیِّنٌ کی مونث ہے اس کے مستقل معنے بھی ہیں اور وہ دلیل اور حجت کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ قرآنی اصطلاح میں دو قسم کے لوگ اہل کتاب اور مشرک قرآن کریم کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے تمام بنی نوع انسان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصے کا نام اُس نے اہل کتاب رکھا ہے اور دوسرے حصے کا نام اُس نے مشرک رکھا ہے۔ قرآنی اصطلاح کے مطابق دنیا کا کوئی حصہ ان دو قسموں سے باہر نہیں یا تو بنی نوع انسان اہلِ کتاب میں سے ہوں گے یا بنی نوع انسان مشرکین میں سے ہوں گے اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ بظاہر بعض لوگ ایسے بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ جنہیں نہ تو اہل کتاب میں سے کہا جا سکتا ہے نہ مشرکوں میں سے۔ جیسے دہریہ ہیں۔ دہریہ بظاہر نہ اہل کتاب میں سے نظر آتے ہیں نہ مشرکوں میں سے۔ لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں وہ دونوں میں سے ایک گروہ میں ضرور شامل ہیں اور قرآنی اصطلاح سے نتیجہ نکالتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مشرکوں میں شامل ہیں۔ درحقیقت اس اصطلاح میں ایک لطیف اشارہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم اس بات کا مدعی ہے کہ توحید بغیر الہام کے نہیں آ سکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اہل کتاب میں سے ہو اور مشرک ہو لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اہلِ کتاب میں سے نہ ہو اور موحد ہو۔ پس جو اہل کتاب میں سے نہیں وہ ضرور مشرک ہے اور جو اہلِ کتاب میں سے ہے وہ یا موحّد ہے یا مشرک ہے۔ کیونکہ توحید نام ہے صفاتِ الٰہیہ کو خدا تعالیٰ کی طرف صحیح طور پر منسوب کرنے کا اور یہ مقام سوائے اہلِ کتاب کے اور کسی کو حاصل نہیں

ہوسکتا کیونکہ خدا تعالیٰ کی صفات کوصحیح طور پر وہی شخص خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرسکتا ہے جس کی الہام ِالٰہی نے راہنمائی کی ہو یا جسے ایسے الہامِ الٰہی کا علم حاصل ہو۔ ایک دہریہ بظاہر خدا تعالیٰ کا منکر ہے لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ وہ صفتِ خلق کو یا قانونِ قدرت کی طرف منسوب کرتا ہے یا اتفاق کی طرف منسوب کرتا ہے اور گو وہ خدا تعالیٰ کا قائل نہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کے ماننے والے کے نزدیک تو اُس نے شرک ہی کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفت کسی اور کی طرف منسوب کردی۔ پس خود دہریہ کے نقطہ نگاہ سے وہ منکر ہے مگر مذہبی آدمی کے نقطہ نگاہ سے وہ مشرک ہے کیونکہ اُس نے خدائی صفات کو دوسرے کی طرف منسوب کردیا۔ بہرحال قرآن کریم نے دنیا کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ایک اہلِ کتاب اور دوسرے مشرک۔ جب قرآن کریم اہلِ کتاب اور مشرک کے الفاظ اکٹھے استعمال کرے تو اُس کی اصطلاح کے رُو سے اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ سب غیر مسلم دنیا۔ یہ تمہید میں نے اس لئے اٹھائی ہے کہ اگلا مضمون اس کے بغیر سمجھ نہیں آ سکتا۔

مسیحی مصنفین کا قرآن مجید کو غیر اہل کتاب کے لیے مخصوص کرنا اور اس کی تردید یاد رکھنا چاہیے کہ اِس سورۃ میں ایک بہت بڑے مسئلہ کا حل کیا گیا ہے اور یہ آیت اُس مسئلہ کے بارے میں بطور نص واقعہ ہوئی ہے۔ مسیحی مصنّفین ہمیشہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کریم کا دعویٰ (جہاں تک ایمان کا سوال ہے) صرف غیر اہل کتاب سے متعلق ہے اور وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں یہود کی نسبت آتا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدة:۴۵) جو شخص اُس کلام کے مطابق حکم نہیں دیتا جو خدا تعالیٰ نے اُتارا ہے وہ کافر ہے۔ اور مسیحیوں کی نسبت فرماتا ہے وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدة:۴۸) اِن آیات سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ اپنی کتابوں پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک تورات اور انجیل اب تک قابلِ عمل ہیں اور جب تورات اور انجیل اب تک قابلِ عمل ہیں تو معلوم ہوا کہ کم سے کم اہلِ کتاب کے لئے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ پس وہ کہتے ہیں کہ ہمیں قرآن کریم کے دعویٰ پر غور کرنے کی ضرورت نہیں اگر وہ جھوٹا ہے تو جھوٹا ہی ہے اور اگر سچا ہے تو ہمیں ماننے کا پابند نہیں کرتا اور جب ہم اس کو ماننے کے پابند نہیں تو ہمیں اس پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت کیا؟ (The Coran by William Muir, p:204,205) اِس کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے یہ آیات پیش کی جاتی ہیں۔

اوّل۔ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (الاعراف:۱۵۹) یعنی اے نبی تُو لوگوں سے کہہ دے میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

(۲) مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (سبا:۲۹) ہم نے تجھے سب لوگوں کے لئے بشیر و نذیر کی حیثیت سے بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

پھر قرآن مجید میں آتا ہے وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ (الانعام:۲۰)

یہ قرآن میرے اُوپر اس لئے نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تم کو بھی اور جس شخص تک یہ کلام پہنچے اُس کو بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراؤں۔

اِن آیتوں کا جواب مسیحیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ اَلنَّاس سے مراد قرآن کریم میں ہر جگہ مشرکین مکہ ہوتے ہیں اس لئے سب لوگوں سے مراد سب مکہ والے ہیں نہ کہ اہلِ کتاب۔ یہ خیال کہ اَلنَّاس جہاں بھی قرآن کریم میں آیا ہے اس سے مراد مکہ کے مشرکین ہوتے ہیں گو غلط ہے لیکن خود بعض مسلمان مفسّرین نے ہی پیدا کیا ہے اور یہ خیال عیسائی مصنفین کے دل میں اس قدر گھر کر گیا ہے کہ سورۂ بقرہ ع۳ کی آیت یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ (البقرۃ:۲۲) کا ترجمہ سیل نے یوں کیا ہے۔ ’’اے مکّے والو! اپنے رب کی عبادت کرو‘‘

پس اس خیال کی موجودگی میں جس کو خود بعض مسلمان مفسّرین نے قوی کر دیا ہے ہمارے لئے صرف یہ لمبا طریق باقی رہ جاتا ہے کہ ہم پہلے اُن کی یہ غلطی دُور کریں اور یہ ثابت کریں کہ اَلنَّاس میں اہل کتاب بھی شامل ہیں۔

تیسری آیت میں گو مَنْۢ بَلَغَ کے الفاظ ہیں مگر عیسائی پہلی دو آیتوں کے تابع اس کے بھی یہی معنے کر لیتے ہیں کہ موجودہ مکہ والے اور آئندہ زمانہ کے مکہ والے۔

باقی آیات جو اہل کتاب کو ایمان لانے کی طرف بلاتی ہیں مثلاً (۱) وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (اٰل عمران:۱۱۱) یعنی اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو یہ اُن کے لئے بہتر تھا اُن میں سے بعض مومن ہیں اور اکثر فاسق۔ اسی طرح (۲) وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ (ھود:۱۸) کہ مختلف گروہوں میں سے جو لوگ اِس قرآن کا انکار کرتے ہیں اُن کا ٹھکانہ آگ ہے۔ اور پھر (۳) قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ (اٰل عمران:۲۱) تُو اہل کتاب اور اُمیوں سے کہہ دے کہ کیا تم اسلام لاتے ہو یا نہیں اگر

وہ اسلام لے آئیں تو سمجھ لو کہ وہ ہدایت پا گئے اور اگر پھر جائیں تو تیرا کام صرف ہدایت پہنچانا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کو خوب دیکھنے والا ہے۔ (۴) قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (الانعام:۹۱) تو کہہ دے کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا یہ تو جہانوں کے لئے ایک نصیحت ہے یہ اور اسی قسم کی دوسری آیات جن میں جہانوں کے الفاظ قرآن کریم کے لئے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اُن کے متعلق مسیحی مبلّغ یہ کہہ دیتے ہیں کہ احزاب کا لفظ خود تمہارے قرآن میں عرب کے قبائل کے متعلق آتا ہے اس لئے احزاب سے کُل دنیا کس طرح مراد لی جاسکتی ہے اور عَالَمِیْن کا لفظ جب حضرت مریمؑ اور بنی اسرائیل کے دوسرے لوگوں کے متعلق آتا ہے تو تم اس کے معنے صرف بنی اسرائیل کے کرتے ہو اگر وہاں عَالَمِیْن کے معنے صرف بنی اسرائیل کے ہو سکتے ہیں تو یہاں عَالَمِیْن کے معنے صرف عرب کے قبائل کے کیوں نہیں ہو سکتے؟ اور جو باقی آیتیں ہیں اُن میں صرف ایمان کے لئے بُلایا گیا ہے ایمان لانا ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ اِن آیتوں کے یہ معنے لئے جاسکتے ہیں کہ اگر اہل کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مان لیں تو زیادہ اچھا ہے مگر اہل کتاب کو نہ ماننے کی وجہ سے مجرم تو نہیں قرار دیا گیا۔ گو یہ استدلال مسیحیوں کا کچّا بلکہ غلط ہے لیکن ایک لمبا راستہ ہمیں اُن کو منوانے کے لئے اختیار کرنا پڑتا ہے بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کریم کی وہ آیات جو اس بات کی تائید میں ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب دنیا کی طرف رسول ہیں اور قرآن کریم سب دنیا کے لیے کتاب ہے اس کے متعلق بعض شبہات (جو گو غلط ہیں) پیدا کرنے اور مسیحیوں کو اس ٹھوکر میں مبتلا کرنے کے سامان خود مسلمان مفسّرین نے کئے ہیں اور بعض شبہات ایسے ہیں جو اپنی نافہمی اور پورا تدبر نہ کرنے کی وجہ سے غیر مسلموں کو اپنے طور پر پیدا ہو گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کو ایمان لانے کی جو دعوت قرآن کریم میں دی گئی ہے اُس کو وہ صرف ایک زائد خیر قرار دیتے ہیں لازمی اور قطعی قرار نہیں دیتے حالانکہ قرآن کریم نے نہ صرف اُن آیات میں جن کو اُوپر درج کیا گیا ہے اہل کتاب کا ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے بلکہ جیسا کہ آگے چل کر ثابت کیا جائے گا صاف اور کھلے الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اہلِ کتاب کفر میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اب اُن کی نجات کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں اور آپ کی غلامی اختیار کریں۔

قرآن کریم کے بعد جب ہم کتب احادیث کو دیکھتے ہیں تو اُن میں بھی ایسی بہت سی روایات پائی جاتی ہیں جن سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب جہان کی طرف مبعوث ہوئے

ہیں چنانچہ مسند احمد میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ (مسند احمد بن حنبل مسند عبد اللہ بن عباس)۔ میں گورے اور کالے سب لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ اسی طرح مسند احمد میں عَنْ عَمْرِو ابْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ روایت ہے کہ اَمَّا اَنَا فَاُرْسِلْتُ اِلَی النَّاسِ کُلِّهِمْ عَامَّةً وَّکَانَ مَنْ قَبْلِیْ اِنَّمَا یُرْسَلُ اِلٰی قَوْمِهٖ (مسند احمد بن حنبل مسند عبد اللہ بن عمرو بن العاص) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میری یہ خصوصیت ہے کہ میں تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں اور مجھ سے پہلے جو رسول تھے صرف اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اس حدیث میں بھی بے شک اَلنَّاس کا لفظ ہے اور میں نے اوپر کی آیات پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ عیسائی کہتے ہیں قرآن کریم اَلنَّاس سے مراد ہمیشہ مکہ کے لوگ ہوتے ہیں یہودی اور عیسائی نہیں ہوتے مگر ایک تو یہاں دلیل موجود ہے کہ آپ نے اپنی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ کَانَ مَنْ قَبْلِیْ اِنَّمَا یُرْسَلُ اِلٰی قَوْمِهٖ۔ مجھ سے پہلے جو رسول گزرے ہیں وہ صرف اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا کرتے تھے۔ چونکہ یہاں قوم کے مقابلہ میں اَلنَّاس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لئے اَلنَّاس کے معنے ساری دنیا کے ہوں گے ورنہ مکہ کے لوگ تو آپ کے ہم قوم ہی تھے اور اگر اَلنَّاس سے مراد یہاں صرف اہلِ مکہ ہوتے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی خصوصیت باقی نہ رہتی کیونکہ جس طرح پہلے انبیاء اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے اسی طرح اگر آپ بھی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہو گئے تو اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اصل بات یہی ہے کہ یہاں اپنا اور سابق انبیاء کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ پہلے انبیاء تو اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے مگر میں اَلنَّاس کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی غرض یہ ہے کہ میں صرف اپنی قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا بلکہ قوم سے زائد لوگوں کی طرف بھی بھیجا گیا ہوں پس اُرْسِلْتُ اِلَی النَّاسِ کُلِّهِمْ عَامَّةً سے مراد یہاں ساری دنیا ہے محض قوم مراد نہیں۔

دوسرے حدیثوں میں صراحتاً اَلنَّاسُ کا لفظ غیر مشرکوں کے لئے بھی بولا گیا ہے گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محاورہ سے ثابت ہے کہ اَلنَّاسُ کا لفظ بولا جاتا ہے اور اُس سے مراد مکہ کے مشرک نہیں ہوتے بلکہ دوسرے لوگ ہوتے ہیں چنانچہ حدیث بدر میں آتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ طلب فرمایا اور مہاجرین یکے بعد دیگرے اُٹھ اُٹھ کر مشورہ دینے لگے تو ہر مہاجر جب مشورہ دے کر بیٹھ جاتا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اَشِیْرُوْنِیْ اَیُّهَا النَّاسُ اے لوگو مجھے مشورہ دو۔ اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نَاسُ کا

لفظ استعمال کیا مگر اس سے مکہ کے مشرک مراد نہیں تھے بلکہ انصار مراد تھے چنانچہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار یہ فرمایا کہ اے لوگو مجھے مشورہ دو تو سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کی مراد ہم سے ہے کہ اس موقعہ پر ہم بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام زیر عنوان غزوہ بدر الکبریٰ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی شہادت اس امر کی تائید میں موجود ہے کہ اَلنَّاسُ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے مراد مشرکین مکہ کے علاوہ اور لوگ بھی ہوتے ہیں یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلنَّاسُ کا لفظ استعمال کیا اور آپ کی مراد اس سے انصار تھے۔ پھر اس حدیث میں تو وضاحت موجود ہے کہ قوم کے مقابلہ میں ناس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہاں اَلنَّاسُ سے قوم مراد نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان مراد ہیں خواہ وہ دنیا کی کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے مَنْ سَمِعَ بِیْ مِنْ اُمَّتِیْ اَوْ یَھُوْدِیٌّ اَوْ نَصْرَانِیٌّ فَلَمْ یُؤْمِنْ بِیْ لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّۃَ (مسند احمد بن حنبل مسند الکوفیین، حدیث ابی موسیٰ اشعری)

اس حدیث کے الفاظ میں کچھ غلطی ہے جس کو آگے ظاہر کیا جائے گا موجودہ صورت میں اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے میری اُمت میں سے میرے متعلق بات سُنی یا کسی یہودی یا نصرانی نے میرا ذکر سُنا اور پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لایا وہ جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔ اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُمّت اور ہے اور یہودی اور نصرانی اور ہیں مگر درحقیقت یہ راوی کی غلطی ہے کہ اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو صحیح طور پر نہیں سمجھا اور یہودی اور نصرانی کے ساتھ ''اَوْ'' کا لفظ بڑھا دیا۔ اس کی وجہ درحقیقت یہ ہے کہ عام طور پر لوگ اُمت کے معنے ایمان لانے والے لوگوں کے سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اُمت کے لفظ کا اطلاق انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو کسی نبی پر ایمان رکھتے ہوں اس محاورہ کی وجہ سے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہوتا ہے راوی نے سمجھا کہ شاید مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ صحیح طور پر یاد نہیں رہے ورنہ یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ آپ اپنی اُمّت میں کسی یہودی یا نصرانی کو بھی شامل سمجھتے اس لئے اُس نے حدیث بیان کرتے وقت ''اَوْ'' ''اَوْ'' کا لفظ بڑھا دیا اور سمجھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہوگا کہ مَنْ سَمِعَ بِیْ مِنْ اُمَّتِیْ اَوْ یَھُوْدِیٌّ اَوْ نَصْرَانِیٌّ مگر یہ ہے غلط۔ خود مسند احمد کی بعض اور روایات ہیں جو اس غلطی کو واضح کرتی ہیں۔ درحقیقت حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ مَنْ سَمِعَ بِیْ مِنْ اُمَّتِیْ یَھُوْدِیٌّ اَوْ نَصْرَانِیٌّ فَلَمْ

يُؤْمِنْ بِيْ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ جس شخص نے میری اُمت سے میری بابت سنا۔ یہ صاف بات ہے کہ اگر اُمَّتِیْ سے مراد ماننے والے لوگ ہیں تو کیا کوئی ماننے والا ایسا بھی ہوسکتا ہے جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ سنا ہو؟ یہ بات عقل کے بالکل خلاف ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے تو ہو مگر اس نے آپ کا ذکر نہ سنا ہو۔ پس خود اُمت کا لفظ جو اس حدیث میں استعمال کیا گیا ہے بتا رہا ہے کہ یہاں اُمت سے مراد صرف ماننے والے نہیں بلکہ ہر وہ شخص ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا مخاطب ہے چنانچہ مسلم کی ایک روایت جو ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے اس غلطی کو واضح کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل منشاء کیا تھا۔ مسلم نے ابوموسیٰ اشعری سے یہ روایت اس طرح نقل کی ہے وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِيْ رَجُلٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَّلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ لَا يُؤْمِنُ بِيْ اِلَّا دَخَلَ النَّارَ (مسلم کتاب الایمان باب وجوب الایمان برسالۃ نبیّنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم الی جمیع الناس) یعنی ابوموسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اُس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میری اُمّت میں سے کوئی شخص میرا ذکر نہیں سُنے گا خواہ یہودی ہو یا نصرانی ثُمَّ لَا يُؤْمِنُ بِيْ پھر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا اِلَّا دَخَلَ النَّارَ تو وہ ضرور آگ میں داخل کیا جائے گا۔

یہ روایت صحتِ الفاظ کے لحاظ سے زیادہ درست ہے کیونکہ اِس میں اُمّت اور یہود و نصاریٰ کو الگ الگ بیان نہیں کیا گیا بلکہ یہود و نصاریٰ کو اُمّت کا ایک حصہ بتایا گیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحتاً یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ اگر آپ پر ایمان لائیں تو یہ نہیں کہ اُن کا ایمان لانا صرف ایک زائد خیر کا رنگ رکھے گا بلکہ اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ میں ڈالے گا۔

اس حدیث سے یہ وضاحت ہوگئی کہ پہلی روایت میں بھی درحقیقت یہودی اور نصرانی کے الفاظ اُمّت کے بدل کے طور پر استعمال کئے گئے تھے مگر راوی نے غلطی سے ''اَوْ''، ''اَوْ'' بڑھا کر فقرہ اس طرح بنا دیا کہ مَنْ سَمِعَ بِيْ مِنْ اُمَّتِيْ اَوْ يَهُوْدِيٌّ اَوْ نَصْرَانِيٌّ۔

امام احمد بن حنبل کی ایک دوسری روایت بھی انہی الفاظ کی تصدیق کرتی ہے چنانچہ اُس روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِيْ اَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ اَوْ نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَا يُؤْمِنُ بِالَّذِيْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ۔ (مسند احمد بن حنبل مسند ابی ہریرۃ) یعنی حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ

فرمایا مجھے اُسی ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ وتصرّف میں میری جان ہے کہ اس اُمت میں سے کوئی شخص میرا ذکر نہیں سنے گا خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی اور پھر وہ ایسی حالت میں مرجائے کہ اُس پیغام پر ایمان نہ لائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے دیا گیا ہے اِلَّا کَانَ مِنۡ اَصۡحَابِ النَّارِ مگر وہ یقیناً دوزخی ہوگا یہ حدیث بالصراحت اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو اپنی اُمّت میں شامل کیا ہے پس اُوپر کی احادیث میں بھی اُمت سے مراد صرف ماننے والے نہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کے مخاطب ہیں۔ درحقیقت اُمت کے دو مفہوم ہوا کرتے ہیں۔ ایک مفہوم کے لحاظ سے اُمت میں صرف وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو نبی پر ایمان لاتے اور اُس کے حلقۂ غلامی میں اپنے آپ کو شامل کر لیتے ہیں اور دوسرے مفہوم کے لحاظ سے اُمت سے مراد وہ تمام لوگ ہوتے ہیں جو کسی نبی کے مخاطب ہوتے ہیں جن کے لئے نبی پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے خواہ اپنی عملی حالت کے لحاظ سے وہ منکروں میں ہی شامل ہوں۔ اس جگہ اُمّت سے مراد یہی دوسرا مفہوم ہے یعنی اُمت سے ایمان لانے والے مراد نہیں بلکہ وہ لوگ جن کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے وہ سب کے سب اُمت کے دائرہ میں شامل ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صاف طور پر فرماتے ہیں کہ اس اُمت میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہوسکتا جو میرا ذکر سنے خواہ وہ یہود ہو یا نصرانی (گویا یہودی بھی آپ کی اُمت میں شامل ہیں اور نصاریٰ بھی آپ کی اُمت میں شامل ہیں) مگر وہ ایسی حالت میں مرجائے کہ اُسے مجھ پر ایمان لانا نصیب نہ ہو تو وہ دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننا صرف مستحب و مرجّح ہی نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ پر واجب اور فرض ہے اور اس کی تعمیل نہ کرنا اُنہیں دوزخی بنا دیتا ہے۔ لیکن چکڑالویوں، معتزلیوں اور حنفیوں نے احادیث کا انکار اور تخفیف کر کے مسیحیوں کے لئے اس میں شک پیدا کرنے کا راستہ کھول دیا ہے۔

گو مومنوں کے لئے اوپر کی آیات اور احادیث واضح الدلالۃ ہیں لیکن چونکہ ہمیں ایسے دشمن سے واسطہ پڑنا تھا جو مسلمانوں کے اختلافات کے متعلق وسیع معلومات رکھنے والا تھا اور ان قوموں سے اسلام کا مقابلہ ہونے والا تھا جو اپنے آپ کو اعلیٰ درجہ کی منقّد بتاتی ہیں اس لئے ضروری تھا کہ قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی نصِ صریح آجاتی تا کہ دشمن کو اس بارہ میں اعتراض کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ نہ آتا۔

اب پیشتر اس کے کہ میں آیت زیر تفسیر کے مضمون کی طرف آؤں اُن احادیث کے متعلق جو اوپر بیان ہوئی ہیں دو باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اوّل اِن احادیث میں جو مَنْ سَمِعَ بِیْ کے الفاظ آتے ہیں اِن سے مراد محض سماع نہیں بلکہ سماعِ حُجّت ہے کیونکہ سزا بغیر حُجّتِ قاطعہ کے نہیں ہوتی۔ یعنی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حدیث میں جو مَنْ سَمِعَ بِیْ یا لَا یَسْمَعُ بِیْ کے الفاظ آتے ہیں اُن کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی کو محض اتنا علم ہو جائے کہ بانیٔ اسلام نبوت کے مدعی ہیں اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے تو وُہ دوزخی ہو جائے گا کیونکہ خود احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو کوئی سزا نہیں ملے گی مثلاً پاگل کے متعلق آتا ہے کہ اُسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اب جہاں تک سننے کا تعلق ہے اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ سنتا ایک پاگل بھی ہے مگر اس کے باوجود اُسے سزا نہیں ہوگی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالی سماع کافی نہیں اگر خالی سماع کافی ہوتا تو ایک مجنون اور فاتر العقل کو بھی سزا ملنی چاہیے مگر احادیث بالصراحت بتاتی ہیں کہ پاگل مرفوع القلم ہوتا ہے اور اُسے اپنے مجنونانہ افعال کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سزا نہیں ملے گی (بخاری کتاب الطلاق باب الطلاق فی الاغلاق والکرہ والسکران والمجنون وامرھما)۔ یہ امتیاز اِسی لئے رکھا گیا ہے کہ پاگل سنتا تو ہے مگر سمجھتا نہیں۔ اِسی طرح جس شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف ذکر سُنا ہے اُس پر حجت تمام نہیں ہوئی۔ وہ بھی سزا کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ سزا اتمام حُجّت یا حقیقت کو پورے طور پر سمجھ لینے کے بعد وارد ہوتی ہے اور جب اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کو سمجھا ہی نہیں تو وہ سزا کا مستحق کس طرح ہو سکتا ہے؟

دوسرے اِن احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر اور سزا کو الگ الگ امور قرار دیا ہے یہ ایک اہم مسئلہ ہے جو ہمارے اور پیغامیوں کے درمیان ایک مدّت سے مابہ النّزاع چلا آ رہا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ کیا وہ شخص جس نے مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سُنا کافر ہے؟ اور ہم جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں جس نے مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر ہے تو وہ شور مچانے لگ جاتے ہیں کہ دیکھو یہ کتنے بڑے ظلم کی بات ہے کہ جس شخص نے مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سنا اُسے جہنمی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ کافر اور جہنمی میں فرق ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس حدیث میں صاف طور پر بیان فرما دیا ہے کہ کفر اور سزا یہ دو الگ الگ امور ہیں یہ تو ہر مسلمان تسلیم کرے گا کہ جس شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر ہے۔ میں سمجھتا ہوں مسلمانوں میں سے کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں جو اس بارہ میں اختلاف رکھتا ہو اور ان لوگوں کو جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام بھی نہیں سُنا مومن قرار دیتا ہو۔ مثلاً وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب کو کافر قرار نہیں دیا اور جو اتنا قلیل طبقہ ہے کہ کسی اعتناء کے قابل نہیں اُن کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جمہور مسلمانوں کا قطعی طور پر یہ فیصلہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں یا مسلمان یا کافر۔ اب جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا میں دو ہی گروہ سمجھے

جا سکتے ہیں یا مسلمان یا کافر۔ وہ ان مسیحیوں یا ان یہودیوں یا ان ہندوؤں یا ان زرتشتیوں یا ان شنٹوازم کے ماننے والے جاپانیوں یا کنفیوشس کے ماننے والے چینیوں کو جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی نہیں سُنا کیا قرار دیں گے؟ کیا یہ کہیں گے کہ وہ مسلمان ہیں؟ یہ تو صاف بات ہے کہ مسلمان کے نام سے وہی بلوائے جاتے ہیں جنہوں نے کلمہ طیّبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھا اور جنہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حقیقی طور پر یا ظاہر میں ایمان لانا نصیب ہوا۔ جب مسلمان کی ظاہری تعریف یہ ہے کہ وہ کلمہ طیّبہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ظاہر کرتا ہو تو یہ بات واضح ہو گئی کہ جنہوں نے کلمہ طیّبہ نہیں پڑھا اور جنہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا نصیب نہیں ہوا اُنہیں بہر حال ہم کافر ہی کہیں گے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کے کفر کے باوجود اُن کو سزا نہیں ملے گی۔ سزا صرف اُن لوگوں کو ہو گی جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنا یعنی ان کے کانوں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا اُن پر حُجت تمام ہوئی اور پھر بھی وہ اپنے کفر پر قائم رہے، اسلام میں داخل ہونے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور انبیاء تو الگ رہے اپنی ذات کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ مجھے نہ ماننا (بشرطیکہ کسی پر حُجت تمام نہ ہوئی ہو) انسان کو دوزخی نہیں بناتا ہاں اسے کافر ضرور بنا دیتا ہے چاہے دنیا کے وہ کسی کونہ میں رہنے والا ہو اور چاہے اُس نے سات پشت سے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ سُنا ہو وہ کافر ہو گا اور ضرور ہو گا مگر سزا اتمام حُجت کے بعد ہوتی ہے اس سے پہلے نہیں۔ گویا یہ قاعدہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے سزا کے متعلق ہے کفر کے متعلق نہیں۔ چنانچہ صریح طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دو الگ الگ تقسیمیں کر دی ہیں کفر کو الگ قرار دیا ہے اور سزا کو الگ قرار دیا ہے۔ یہی عقیدہ ہمارا حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے متعلق ہے کہ جس شخص نے حضرت مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سُنا وہ کافر ہے مگر ہم اسے دوزخی قرار نہیں دے سکتے نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس شخص نے حضرت مرزا صاحب کا نام بھی نہیں سُنا وہ جہنمی ہے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ اگلے جہان میں اُس کا دوبارہ امتحان لے اور ممکن ہے فطرتی ایمان پر ہی اُس کو بخش دے۔ بہر حال ہم اُس کی سزا کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے مگر ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اُسے کافر قرار دیں کیونکہ اسلام میں دو ہی اصطلاحیں ہیں۔ ایک اصطلاح مومن کی ہے اور ایک اصطلاح کافر کی ہے جس نے کسی نبی کو مان لیا وہ مومن ہے اور جس نے کسی نبی کو نہیں مانا وہ کافر ہے۔ چاہے اُس کا نہ ماننا عدمِ علم کی بناء پر ہو اور چاہے اُس کا نہ ماننا کسی شرارت کی بناء پر ہو۔ اگر اُس نے عدمِ علم کی وجہ سے کسی نبی کو نہیں مانا تو وہ کافر یعنی نہ ماننے والا تو ہے مگر دوزخی نہیں اور اگر کسی نے شرارت سے نہیں مانا تو وہ کافر

یعنی نہ ماننے والا بھی ہے اور دوزخی بھی ہے۔

افسوس کہ اس نکتہ کو نہ سمجھ کر آج کل پیغامی گمراہ ہو رہے ہیں اور جب وہ مجھ پر حملہ کرتے ہیں تو دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ کفر وسزاء کا یہ فرق خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور متعدد احادیث میں کفر اور جہنمی ہونے کو الگ الگ رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیغامیوں کے لئے دو ہی راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ یہ کہیں کہ جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں سنا وہ کافر نہیں مسلمان ہے۔ اگر وہ یہ کہہ دیں تو ہمارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے ہم بھی ان کی اصطلاح میں کہہ دیں گے کہ جس شخص نے حضرت مرزا صاحب کا نام نہیں سنا وہ کافر نہیں مسلمان ہے۔ اس صورت میں وہ ایک نئی اصطلاح قائم کر دیں گے اور ہمارا اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا کہ ہم اُن سے خطاب کے وقت شر کو دُور کرنے کے لئے اس اصطلاح کو اُن کے مقابلہ میں تسلیم کر لیں اور یا پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ یہ کہیں کہ کافر وقابلِ سزا لازم وملزوم نہیں ایک گروہ کو کافر تو کہا جائے گا مگر قابلِ سزا نہیں۔ اس صورت میں بھی ہمارا اور اُن کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں بتاتا ہوں کہ آیت زیرِ تفسیر میں اُن لوگوں کا جو اہل کتاب کو کافر قرار نہیں دیتے یا جو سمجھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا قرآن کریم کے رُو سے اہل کتاب کے لئے ضروری نہ تھا، ردّ ہے۔ اور صاف بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننا اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں کے لئے ضروری تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں کو کافر قرار دیتا ہے اور اسلام (یعنی دینِ حق قبول کرنا) صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے پر موقوف ظاہر کرتا ہے۔

یہ جو میں نے کہا ہے کہ اس آیت میں اُن لوگوں کا ردّ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا قرآن کریم کے رُو سے اہلِ کتاب کے لئے ضروری نہ تھا۔ اس فقرہ میں ان لوگوں سے میری مراد عیسائی مؤرخ ہیں۔ اس اعتراض سے اُن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی عدمِ ضرورت کو واضح کریں اور ثابت کریں کہ قرآن کریم ایسی کتاب نہیں ہے جس پر ایمان لانا اہل کتاب کے لئے بھی ضروری ہو اُن کے لئے تورات اور انجیل پر ایمان رکھنا ہی کافی ہے۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اِس آیت میں اُن لوگوں کا بھی ردّ ہے جو اہل کتاب کو کافر قرار نہیں دیتے یہ بعض معتزلیوں کا خیال ہے جو اہل کتاب کو ایک تیسرا گروہ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح یوروپین مستشرقین کے اعتراضات سے ڈر کر نیچری خیالات رکھنے والے مسلمان بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ اہلِ کتاب کو قرآن کریم نے کہیں کافر نہیں کہا اِس سے ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کہیں عیسائی چِڑ نہ جائیں اور وہ اسلام پر

اور زیادہ اعتراضات نہ کرنے لگیں۔ بہرحال اس آیت میں ان دونوں خیالات کا ردّ کیا گیا ہے اور واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننا اہل کتاب اور مشرکین دونوں کے لئے ضروری ہے کیونکہ فرماتا ہے لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ کافروں کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مشرک کہ وہ اپنے کفر سے الگ ہو سکتے تاوقتیکہ اُن کے پاس بیّنہ نہ آ جاتی۔ اس آیت میں لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب کافروں اور مشرک کافروں کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے کفر کو چھوڑ سکتے۔

اِنْفَكَّ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے جُدا ہونے کے ہیں۔ پس مُنْفَكِّيْنَ کے معنے ہوئے جدا ہونے والے یا الگ ہونے والے۔ سوال یہ ہے کہ اُن کے لیے کس چیز سے انفکاک ناممکن تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی کفر سے جس کا اس آیت میں ذکر آتا ہے یعنی اہل کتاب کافر اور مشرک کافر کفر کو چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے اور کوئی صورت ایسی نہیں تھی کہ وہ کفر سے آزاد ہو سکتے سوائے اس کے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آتے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بغیر نہ اہل کتاب کفر سے نکل سکتے تھے نہ مشرک کفر سے نکل سکتے تھے۔ گویا اہل کتاب اور مشرکین دونوں کے متعلق صراحتاً، وضاحتاً اور دلالۃً بتا دیا کہ وہ کافر ہیں اور یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہی شخص خدا تعالیٰ کا مقبول ہوسکتا ہے یا وہی شخص سچے دین پر قائم سمجھا جا سکتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔

اس آیت میں مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کے الفاظ آتے ہیں اور مِنْ کے اصل معنے ابتدائے غایت کے سمجھے جاتے ہیں لیکن چونکہ کثرت سے مِنْ بعضیہ بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے ممکن ہے یہ شبہ کسی شخص کے دل میں پیدا ہو کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ میں بھی مِنْ بعضیہ ہی استعمال ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کافروں کا گروہ گویا ہر اہل کتاب کے متعلق یہ بیان نہیں کیا گیا کہ وہ کافر ہے بلکہ یہ آیت صرف بعض اہل کتاب کی نسبت ہے جو کافر تھے ہر اک اہل کتاب کافر نہیں تھا۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کا مفہوم یہ لیا جائے کہ اہل کتاب میں سے جنہوں نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا یا مشرکوں میں سے جنہوں نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تو یہ درست ہے ہم بھی اس قسم کے بعض کو ماننے کے لئے تیار ہیں یعنی جو اب تک اہل کتاب ایمان نہیں لائے وہ کافر ہیں یا جو اب تک مشرک ایمان نہیں لائے وہ کافر ہیں۔ لیکن اگر مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کے یہ معنے لئے جائیں کہ جو اہل کتاب مسلمان نہیں ہوئے اُن میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ نہیں تو یہ اس لئے

بالبداہت باطل ہیں کہ اہل کتاب پر وَالْمُشْرِكِيْنَ کا عطف ہے۔ اگر تو یہ ہوتا کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكُوْنَ تو پھر سمجھا جا سکتا تھا کہ مِنْ صرف اہل کتاب کے ساتھ لگتا ہے مشرکوں کے ساتھ نہیں لگتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے وَالْمُشْرِكُوْنَ کی بجائے وَالْمُشْرِكِيْنَ فرمایا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ جو حکم اہل کتاب کے لئے ہے وہی حکم مشرکوں کے لئے بھی ہے پس اگر اس آیت کے یہ معنے لئے جائیں کہ اہل کتاب میں سے جو ایمان نہیں لائے اُن میں سے بھی کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر تو پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی معنے کرنے پڑیں گے کہ مشرک جواب تک ایمان نہیں لائے اُن میں سے بھی کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر۔ اور آیت کو یُوں سمجھنا پڑے گا کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُشْتَمِلِيْنَ عَلٰى بَعْضِ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَبَعْضِ الْمُشْرِكِيْنَ اور یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ عیسائی بھی باوجود شدید دشمنِ اسلام ہونے کے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے رُو سے سب غیر اہل کتاب مشرک کافر ہیں اور اس میں کوئی استثنٰی نہیں۔ بہر حال اگر اس آیت میں مِنْ کو بعضیہ قرار دیا جائے تو چونکہ وَالْمُشْرِكِيْنَ کا عطف اہل کتاب پر ہے اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کچھ مشرک مومن ہیں اور کچھ مشرک کافر۔ حالانکہ یہ بالبداہت باطل ہے۔ پس یہ غلط ہے کہ اس آیت میں مِنْ بعضیہ استعمال ہوا ہے۔ یہاں مِنْ بعضیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے اور اس آیت کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُشْتَمِلِيْنَ عَلٰى اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ چونکہ مشرکین مجرور ہے اس لئے مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ کے سوا کسی اور پر اس کا عطف نہیں ہو سکتا اگر اَلَّذِيْنَ پر عطف ہوتا تو یہ مرفوع ہوتا پس کسی صورت میں بھی یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ بعض اہل کتاب کافر ہیں اور بعض نہیں۔ بلکہ لازماً اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ کفار خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک سب کے سب کافر ہیں اور اس کفر سے بچ نہیں سکتے تھے جب تک کہ رسول اُن کے پاس نہ آتا۔

غرض كَفَرُوْا سے مراد اہل کتاب اور مشرکین دونوں ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں قرآن کریم کا یہ محاورہ ہے کہ جب وہ اہل کتاب اور مشرکین کا ذکر کرتا ہے تو اُس سے مراد ساری غیر مسلم دنیا ہوتی ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے مسلمانوں کے سوا دنیا میں دو ہی گروہ ہو سکتے ہیں یا اہل کتاب ہوں گے یا مشرک ہوں گے۔ پس اہل کتاب اور مشرکین سے مراد قرآنی محاورہ کے مطابق تمام غیر مسلم دنیا ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ کفار میں سے یعنی غیر مسلموں میں سے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مشرک (اس میں کوئی استثنٰی نہیں) اپنے کفر سے اُس وقت تک نہیں نکل سکتے تھے جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہ ہوتی۔

قرآن کریم میں بعض اور مقامات پر بھی مِنْ بیانیہ استعمال ہوا ہے مثلاً ایک جگہ فرماتا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ

مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج:۳۱) اس کے یہ معنے نہیں کہ کچھ بُت پاکیزہ ہوتے ہیں اور کچھ گندے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ اَیِ الْاَوْثَانِ تم گندگی یعنی بتوں کی پرستش اور ان کی عبادت سے بچو۔ یہاں بھی مِنْ بیانیہ ہی استعمال ہوا ہے اور چونکہ یہ حال ہے اس لئے اگر ہم عربی میں اس آیت کا ترجمہ کریں تو یوں ہوگا کہ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا حَالَ کَوْنِهِمْ مُشْتَمِلِیْنَ عَلٰی جَمِیْعِ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَ جَمِیْعِ الْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ۔ چنانچہ دوسری قرأت اِن معنوں کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے اور وہ قرأت عبداللہ بن مسعود کی ہے اُن کی قرأت یہ ہے لَمْ یَکُنْ اَهْلُ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکُوْنَ مُنْفَکِّیْنَ (فتح البیان زیر آیت لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا) پس علاوہ اس کے کہ خود فقرہ کی بناوٹ اور وَالْمُشْرِکِیْنَ کے الفاظ جن کا عطف اہل کتاب پر ہے۔ اس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں کہ یہاں مِنْ بعضیہ نہیں ہوسکتا ابن مسعودؓ کی قرأت نے مزید تصدیق کر دی کہ یہاں کسی صورت میں بھی مِنْ کو بعضیہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

نبی کافر گر نہیں ہوتا بلکہ کفر کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے دوسری بات جو نہایت اہم اور موجودہ زمانہ کے جھگڑوں میں بہت کام آنے والی ہے اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ کُفر پہلے ہوتا ہے اور نبی بعد میں آتا ہے۔ یہ بات ایسی واضح ہے کہ اس آیت پر ذرا سا غور بھی انسان پر اس حقیقت کو روشن کر دیتا ہے کہ نبی پیچھے آتا ہے اور کفر پہلے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ کفار خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک کبھی بھی اپنے کفر کو چھوڑ نہیں سکتے تھے جب تک اُن کے پاس بیّنہ نہ آجاتی۔ مِنْ کو بیانیہ تسلیم کرنے کی صورت میں ''خواہ'' کا لفظ گو اُس کے معنوں کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتا مگر چونکہ اُردو میں ''خواہ'' کا لفظ اُس مضمون کو قریب الفہم کر دیتا ہے جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اس لئے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ کفار خواہ اہل کتاب میں سے ہوں اور خواہ مشرکوں میں سے، کبھی بھی اپنے کفر کو چھوڑ نہیں سکتے تھے جب تک اُن کے پاس بیّنہ نہ آتی۔ ''جب تک'' کے الفاظ جب کسی فقرہ میں استعمال کئے جائیں تو اُس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ''جب تک'' سے پہلے بیان شدہ چیز ''جب تک'' کے بعد بیان ہونے والی شے سے پہلے ہے یا اُس کا اِس سے پہلے ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ وہ شخص اپنے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا جب تک میرا پیغام اُس کے پاس نہ پہنچ جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پیغام پیچھے جائے گا اور وہ گھر میں پہلے بیٹھا ہوا ہوگا۔ اسی طرح لَمْ یَکُنْ اور حَتّٰی کے الفاظ جب کسی فقرہ میں استعمال ہوں گے تو اُس کے معنے یہ ہوں گے کہ لَمْ یَکُنْ میں بیان شدہ بات حَتّٰی سے پہلے واقع ہو چکی ہے۔ اس سے صاف پتہ لگا کہ بَیِّنَة کے آنے سے پہلے وہ لوگ کافر ہو چکے تھے۔ بَیِّنَة

یعنی رسول نے اُن کو کافر نہیں بنایا بلکہ بَیِّنَۃ کے آنے سے پہلے ہی وہ کافر بن چکے تھے۔ غرض کفر پہلے ہوتا ہے اور نبی بعد میں آتا ہے نبی کافر گر نہیں ہوتا بلکہ کفر کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی نبی دنیا میں آتا ہے اُس کا انکار کرنے کے بعد لوگ کافر نہیں بنتے بلکہ پہلے ہی وہ کافر بن چکے ہوتے ہیں نبی صرف ان کے کفر کا اظہار کرتا ہے پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ نبی کا انکار کر کے لوگ کافر بنتے ہیں یہ ایک غیر محتاط کام ہے جسے ہم بھی زبان کے عام محاورہ کے مطابق بعض دفعہ استعمال کر لیتے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی عام رواج کے مطابق اس کو استعمال کیا ہے مگر حقیقتاً نہ ہمارا یہ مفہوم ہوتا ہے نہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ مفہوم تھا کہ نبی کافر بناتا ہے بلکہ ہمارا مفہوم بھی یہ ہوتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بھی مفہوم یہی ہوتا ہے کہ نبی لوگوں کے کفر کا اظہار کرتا ہے گو عرف عام کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ نبی کا انکار کر کے لوگ کافر بنتے ہیں بہر حال حقیقت یہ ہے کہ نبی کافر نہیں بناتا نبی کا انکار کر کے لوگ کافر نہیں ہوتے بلکہ نبی کے انکار سے ان کا کفر ظاہر ہو جاتا ہے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک شخص جس نے کبھی خربوزہ نہیں دیکھا یہ کہے کہ میں نے خربوزہ کھایا ہے۔ اب جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے یہ ایک واضح امر ہوگا کہ اُس نے جھوٹ سے کام لیا ہے مگر اس کا یہ جھوٹ اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتا جب تک ہم خربوزہ اس کے سامنے لا کر نہ رکھ دیں اور پھر اس سے پوچھ نہ لیں کہ بتاؤ یہ کیا چیز ہے؟ اگر ہم ایک خربوزہ اس کے سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں اور پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ یہ کیا چیز ہے اور وہ جواب میں کہتا ہے کہ مجھے علم نہیں تو یہ اس بات کا ایک واضح ثبوت ہوگا کہ جب اس نے کہا تھا کہ میں نے خربوزہ کھایا ہے تو اس نے جھوٹ اور کذب بیانی سے کام لیا تھا مگر اس کے جھوٹ بولنے کے باوجود اور پھر خربوزہ کے آنے پر اُس کا جھوٹ ظاہر ہونے کے باوجود دنیا میں یہ کبھی نہیں کہا جائے گا کہ خربوزے نے اس کو جھوٹا بنایا ہے خربوزے نے اس کو جھوٹا نہیں بنایا بلکہ خربوزے نے اس کے جھوٹ کو آ کر ظاہر کیا ہے ورنہ جھوٹا تو وہ پہلے ہی تھا۔ اسی طرح لوگ کہتے ہیں ہم موسیٰؑ کو مانتے ہیں لوگ کہتے ہیں عیسیٰؑ کو مانتے ہیں اور جب وہ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہم موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتے ہیں تو اس سے ان کی کیا مراد ہوتی ہے؟ یہ مراد تو نہیں ہوتی کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ آدمی تھے یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ آدمی تھے پس ان کا یہ کہنا کہ ہم موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتے ہیں اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ ہم مانتے ہیں کہ موسیٰؑ ایک آدمی تھا یا ہم مانتے ہیں کہ عیسیٰؑ ایک آدمی تھا بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ موسیٰؑ نبی کی نبوت کو ہم شناخت کرتے ہیں عیسیٰؑ نبی کی نبوت کو ہم شناخت کرتے ہیں اور جب وہ انبیاء کی نبوت کو شناخت کرنے کا ملکہ اپنے اندر رکھتے ہیں تو یہ لازمی بات ہے کہ جب بھی کوئی نبی دنیا میں ظاہر ہوگا وہ اس کو فوراً پہچان لیں گے کیونکہ جو شخص ایک جنس کی کسی چیز کو شناخت کرنے کا ملکہ رکھتا

ہے وہ اُسی جنس کی دوسری چیز کو بھی شناخت کر سکتا ہے جو شخص آم کو پہچانتا ہے اُس کے سامنے جب بھی آم رکھا جائے گا فوراً کہہ اٹھے گا کہ یہ آم ہے یا جو شخص خربوزہ پہچانتا ہے اُس کے سامنے جب بھی خربوزہ لایا جائے گا اُسے شناخت میں کوئی دقت واقعہ نہیں ہوگی۔ وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ خربوزہ ہے اسی طرح وہ شخص جس نے نبوت کو شناخت کر لیا ہے اس کو کسی نبی کے پہچاننے میں کوئی دقّت ہی پیش نہیں آ سکتی۔ نوحؑ آئے گا تو اُس کے متعلق وہ کہے گا کہ میں نے اسے پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کا سچا نبی ہے ابراہیمؑ آئے گا تو اس کے متعلق وہ کہے گا کہ میں نے اُسے پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کا سچا نبی ہے۔ موسیٰؑ آئے گا تو اس کے متعلق وہ کہے گا کہ میں نے پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کا سچا نبی ہے۔ عیسیٰؑ آئے گا تو اس کے متعلق وہ کہے گا میں نے اسے پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کا سچا نبی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئیں گے تو ان کے متعلق وہ کہے گا کہ میں نے انہیں پہچان لیا یہ خدا تعالیٰ کے سچے نبی ہیں لیکن اگر اس نے واقعہ میں نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شناخت نہیں کیا ان کی نبوت کو اس نے نہیں پہچانا اور صرف جھوٹے طور پر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو پہچانا ہوا ہے تو گو وہ منہ سے اس امر کا دعویدار ہوگا کہ میں نوحؑ کو بھی مانتا ہوں، ابراہیمؑ کو بھی مانتا ہوں، موسیٰؑ کو بھی مانتا ہوں، عیسیٰؑ کو بھی مانتا ہوں مگر جب محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کا جامہ پہن کر اس کے سامنے آئیں گے تو کہہ دے گا کہ آپ نعوذ باللہ جھوٹے ہیں اس سے صاف پتہ لگ جائے گا کہ اس کا یہ کہنا کہ میں نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو پہچانتا ہوں محض جھوٹا اِدّعا تھا ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہی جُبّہ جو نوحؑ نے پہنا، وہی جُبّہ جو ابراہیمؑ نے پہنا، وہی جُبّہ جو موسیٰؑ نے پہنا، وہی جُبّہ جو عیسیٰؑ نے پہنا، وہی جُبّہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہن کر آتے تو وہ آپ کی شناخت سے محروم رہتا؟ اس کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت سے محروم رہنا اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ پہلے بھی نبوت کی حقیقت کو نہیں سمجھتا تھا اور اُس کا یہ کہنا بالکل دھوکا اور فریب تھا کہ میں نوحؑ کو مانتا ہوں، میں ابراہیمؑ کو مانتا ہوں میں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو مانتا ہوں کیونکہ جب ویسی ہی نبوت اُس کے سامنے آئی تو وہ اُس کو پہچان نہ سکا جس سے پتہ لگ گیا کہ اُس نے نہ موسیٰؑ کو پہچانا تھا، نہ عیسیٰؑ کو پہچانا تھا اور نہ دنیا کے کسی اور نبی کو پہچانا تھا۔ پس اس آیت نے بتا دیا کہ دنیا میں جب بھی کوئی نبی ظاہر ہوتا ہے وہ لوگوں کو کافر نہیں بناتا بلکہ اُن کے کفر کا صرف اظہار کرتا ہے ورنہ کافر وہ اس سے پہلے ہی بن چکے ہوتے ہیں اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ کتنی فضول بحث بن جاتی ہے کہ فلاں نبی کا انکار کفر ہوتا ہے اور فلاں نبی کا انکار کفر نہیں ہوتا حالانکہ کفر کسی نبی کے انکار کے بعد پیدا نہیں ہوتا بلکہ پہلے ہی لوگوں کے اندر پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ کفر نوحؑ کے انکار کا نام نہیں۔ کفر ابراہیمؑ کے انکار کا نام نہیں۔ کفر موسیٰؑ کے انکار کا نام نہیں۔ کفر عیسیٰؑ

کے انکار کا نام نہیں۔ بلکہ اصل کفر نام ہے نبوت کے انکار کا۔ یہ جو ہم کہہ دیا کرتے ہیں کہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ یا کسی اور نبی کا انکار کفر ہے یہ صرف اصطلاحی طور پر ہم کہا کرتے ہیں۔ چونکہ موسیٰؑ نبی ہے اور اُس کا انکار نبوت کے انکار کے مترادف ہے اس لئے موسیٰؑ کا انکار کفر ہے ورنہ موسیٰ آدمی کا انکار کفر نہیں یا عیسیٰ آدمی کا انکار کفر نہیں یا محمدِ عربیؐ کا انکار کفر نہیں۔ بلکہ موسیٰؑ نبی کا انکار کفر ہے یا عیسیٰؑ نبی کا انکار کفر ہے یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کفر ہے اور یہ کفر بھی ان معنوں میں نہیں کہ اس نے کسی شخص کا انکار کیا ہے بلکہ اِن معنوں میں ہے کہ اس نے تمام انبیاء کی نبوت سے انکار کیا ہے ورنہ اگر وہ کسی ایک نبی کی نبوت کو بھی صحیح معنوں میں پہچاننے والا ہوتا تو یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ اس کے سامنے ایک دوسرا شخص وہی نبوت کا جامہ پہن کر آتا تو وہ اس کا انکار کر دیتا اور کہہ دیتا کہ وہ کافر ہے۔ جو شخص نبوت کو پہچانتا ہے اس کے سامنے تو جو شخص بھی نبوت کا جامہ پہن کر آئے گا وہ فوراً اس کو پہچان لے گا لیکن جو شخص نبوت کے متعلق جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے اس کے سامنے جب کوئی شخص نبوت کا جامہ پہن کر آئے گا تو بجائے اس کے کہ وہ اس پر ایمان لائے اسے کافر اور بے دین قرار دینے لگ جائے گا اور اس طرح اس بات کا ثبوت مہیا کر دے گا کہ اس کا پہلے انبیاء کی نبوت پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی محض ایک دھوکا تھا۔ اگر وہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن یہی جامہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دیکھتا ہے تو آپ کو کافر کہنے لگ جاتا ہے تو یہ صاف اور واضح ثبوت اس بات کا ہے کہ اُس نے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی نبوت کو بھی نہیں پہچانا مگر چونکہ اُس کے ماں باپ کہتے تھے کہ موسیٰؑ نبی ہے اس لئے اس نے بھی موسیٰؑ کو مان لیا یا چونکہ اس کے ماں باپ کہتے تھے عیسیٰؑ نبی ہے اِس لئے اُس نے عیسیٰؑ کو بھی مان لیا ورنہ درحقیقت نہ وہ موسیٰؑ پر ایمان رکھتا تھا نہ عیسیٰؑ پر ایمان رکھتا تھا اور نہ کسی اور نبی پر ایمان رکھتا تھا۔

پس حقیقت یہ ہے کہ نبوت کا انکار کفر ہے نہ کہ زید یا بکر یا خالد کا انکار۔ چونکہ آنے والا اسی قسم کا جامہ پہن کر آتا ہے جس قسم کا جامہ پہلے انبیاء پہن کر آئے اس لئے جب لوگ اُس کا انکار کر دیتے ہیں تو اُن کے متعلق یہ نہیں سمجھا جاتا کہ انہوں نے کسی ایک شخص کا انکار کیا بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے نبوت کا انکار کیا ہے۔ اب یہ سیدھی بات ہے کہ حضرت مرزا صاحب کا کوئی نام رکھ لو جو باتیں انہوں نے لوگوں کے سامنے پیش کی ہیں وہ وہی ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے پیش کیں اور جو سلوک لوگوں نے آپ سے کیا وہ ویسا ہی ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اور انبیاء سے دنیا نے کیا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا پیغامی بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اور تو اور خود مولوی محمد علی صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت مرزا صاحب کی صداقت پر منہاجِ نبوت کو

مدنظر رکھتے ہوئے غور کرنا چاہیے(ریویو آف ریلیجنز جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۹۲، ۲۹۷)۔جس کے معنے یہ ہیں کہ آپ نے ویسی ہی باتیں پیش کی تھیں جیسی باتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیں یا جیسی باتیں موسیٰؑ نے پیش کی تھیں یا جیسی باتیں عیسیٰؑ نے پیش کی تھیں اور جو سلوک دنیا نے آپ سے کیا ویسا ہی سلوک اُس نے پہلے انبیاء سے بھی کیا تھا۔اور اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر ویسی ہی باتوں پر جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیں یا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے پیش کیں جو شخص آپ کو کافر کہتا ہے وہ نعوذ باللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کافر کہتا ہے موسیٰؑ کو بھی کافر کہتا ہے، عیسیٰؑ کو بھی کافر کہتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ فلاں نبی کا انکار انسان کو کافر بناتا ہے اور فلاں کا نہیں ایک بے تعلق بحث ہے۔ نبی تو صرف کفر کو ظاہر کرتا ہے اُس کا کسی کو کافر بنانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ یہ بحث کی جائے کہ فلاں قسم کے نبی کا انکار کفر ہوتا ہے اور فلاں قسم کے نبی کا انکار کفر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بحث ہوسکتی ہے تو یہ کہ فلاں نبی اُس وقت آتا ہے جب دنیا مومن ہوتی ہے اور فلاں نبی اُس وقت آتا ہے جب دنیا کافر ہوتی ہے اور یہ بات بالبداہت باطل ہے۔ پس درحقیقت اس آیت کو سمجھ لینے کے بعد کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ کفر و اسلام کے متعلق کوئی بحث ہی نہیں رہتی کیونکہ اس آیت سے یہ پتہ لگتا ہے کہ لوگ پہلے کافر ہوتے ہیں اور مامور پیچھے آتے ہیں اگر یہ بات نہیں تو ہمارا پیغامیوں سے یہ مطالبہ ہے کہ تم ثابت کر دو کہ فلاں قسم کے نبی اُس وقت آتے ہیں جب لوگ مومن ہوتے ہیں اور فلاں قسم کے نبی اُس وقت آتے ہیں جب لوگ کافر ہوتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں وہ اِس طرف کبھی بھی آنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ پس جو لوگ یہ شور مچاتے ہیں کہ مرزا صاحب نے کروڑوں کو کافر بنا دیا محض قرآن کریم کی تعلیم سے ناواقفیت اور جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے اہل کتاب اور مشرک اپنے کفر سے باز نہیں آسکتے تھے جب تک کہ اُن کے پاس رسول نہ آتا جس سے معلوم ہوا کہ نبی کافر نہیں بناتا بلکہ نبی تب آتا ہے جب لوگ کافر ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ فلاں نبی کافر بناتا ہے اور فلاں نہیں ایک بے تعلق بحث ہے۔ نبی تو کفر کو ظاہر کرتا ہے اُس کا کافر بنانے سے کوئی تعلق ہی نہیں کہ ہم کہیں اِس نے کافر بنایا ہے اور اُس نے نہیں۔ اگر کوئی بحث ہوگی تو یہ ہوگی کہ فلاں نبی اُس وقت آتا ہے جب لوگ مومن ہوتے ہیں اور فلاں نبی اُس وقت آتا ہے جب لوگ کافر ہوتے ہیں اور یہ بحث جیسا کہ میں بتا چکا ہوں بالبداہت باطل ہے۔

آیت لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ الخ کے مفہوم پر ایک اعتراض اور اس کا جواب یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ اہل کتاب اور مشرک کبھی اپنے کفر کو چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے جب تک اُن کے پاس بیّنہ یعنی اللہ تعالیٰ کا رسول نہ آجاتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بیّنہ کے آنے سے اہل کتاب اور مشرکین نے کفر چھوڑ دیا؟ یا قرآن کریم کے آنے کی وجہ سے اہل کتاب اور مشرک بچ گئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اِس فقرہ کی بناوٹ اِس قسم کی نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ سب کے سب اہل کتاب یا سب کے سب مشرک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کوئی ایک شخص بھی مسلمان نہیں ہوسکتا تھا جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے۔ پس اِس آیت کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اہل کتاب اور مشرک اُس وقت تک سَو فی صدی مسلمان نہیں ہو سکتے تھے جب تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے بلکہ معنے یہ ہیں کہ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے ایک فی صدی بھی صداقت پر قائم نہیں ہو سکتے تھے جب تک ان کے پاس بیّنہ یعنی اللہ تعالیٰ کا رسول نہ آجاتا۔ پس یہ کہنا کہ یہودی اب تک موجود ہیں یا عیسائی اب تک موجود ہیں یا مشرک اب تک موجود ہیں اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے ویسا ہی اعتراض ہے جیسے مولوی ثناء اللہ صاحب کہہ دیا کرتے ہیں کہ مرزا صاحب کے آنے کا فائدہ کیا ہوا جبکہ عیسائی بھی موجود ہیں، یہودی بھی موجود ہیں، ہندو بھی موجود ہیں، سکھ بھی موجود ہیں اور غیر احمدی بھی موجود ہیں، حالانکہ نبی آنے کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ سب لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور کوئی ایک شخص بھی ایسا باقی نہیں رہتا جو کفر وشرک میں مبتلا رہے۔

نبی کے آنے کی غرض نبی آنے کے صرف اتنے معنے ہوتے ہیں کہ وہ الٰہی قرب کا ایک راستہ کھول دیتا ہے اور بنی نوع انسان کے لئے شیطان سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کی رضا حاصل کرنے کے مواقع پیدا ہوجاتے ہیں اس کے بعد خواہ ایک شخص نبی پر ایمان لائے یا دس آدمی ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جب ہزاروں یا لاکھوں آدمی ابھی کفر وشرک میں مبتلا ہیں تو نبی کے آنے کا فائدہ کیا ہوا۔ نبی کے آنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا دروازہ بنی نوع انسان کے لئے کھول دیتا ہے اگر وہ دروازہ نہ کھولے تو کوئی ایک شخص بھی مسلمان نہیں ہوسکتا۔ کوئی ایک شخص بھی اللہ تعالیٰ کا مقرب اور اُس کا پیارا نہیں بن سکتا۔ پس یہ کہنا کہ باوجود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے کفر کیوں موجود ہے حقیقت سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور سنتوں کو نہ جاننے سے پیدا ہوا ہے اور درحقیقت یہ اعتراض ہر نبی پر ہی کیا گیا ہے اور جب تک دنیا میں مصلح آتے رہیں گے ہوتا رہے گا کیونکہ ایک مصلح ربّانی بھی دنیا میں نہیں آیا جسے سب دنیا نے قبول کرلیا

ہو یا جس کے نہ ماننے والے شروع میں غالب نہ رہے ہوں۔ ہمیشہ کچھ مدت تک (جو موقع کے مطابق بدلتی رہتی ہے کبھی لمبی ہو جاتی ہے اور کبھی چھوٹی) ہر نبی کے دشمن اُس کے اتباع پر غالب رہتے ہیں اس کے بعد نبی کے لئے غلبہ کا زمانہ آتا ہے اور اُسے غلبہ نصیب ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کے نہ ماننے والے دنیا سے مٹ جائیں بلکہ بسا اوقات ماننے والے ہی نہ ماننے والے بن جاتے ہیں یعنی جب نبی کا دورِ افاضہ ختم ہو جاتا ہے یا تجدید کا مستحق ہوتا ہے تو اُس کے ماننے والے اس کی طرف منسوب تو ہوتے ہیں مگر ایماناً اور عقیدۃً اُس کے دشمنوں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہوتے ہیں۔ گویا اِس دَور میں شیطان اور فرشتے ایک ہی وقت میں اُس کے اتباع پر حکومت کر رہے ہوتے ہیں فرشتوں کی حکومت زبان پر ہوتی ہے اور شیطان کی دل پر۔ تب خدا تعالیٰ کی غیرت پھر جوش میں آتی ہے اور وہ پھر کوئی شریعت والا نبی یا اگر شریعت محفوظ ہو تو احیاءِ روحِ شریعت کے لئے بغیر شریعت کے نبی مبعوث فرما کر پھر اپنے بندوں کے لئے روحانی ترقی کا راستہ کھول دیتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ وہ رحمٰن اور رحیم خدا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ الٰہی سلسلوں کو سَو فی صدی لوگ تو مانا نہیں کرتے لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کا یہ راستہ ایسے شاندار طریق پر کھولا کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کروڑوں کروڑ لوگ آپ پر ایمان لائے اور اس طرح انہوں نے اپنے کفر سے نجات پائی۔ چنانچہ اہل کتاب میں سے مصر قریباً سارا مسلمان ہو گیا، فلسطین قریباً سارا مسلمان ہو گیا، شام قریباً سارا مسلمان ہو گیا، عرب کے نصاریٰ قریباً سارے مسلمان ہو گئے۔ اِسی طرح دوسرے اہل کتاب مجوس تھے وہ قریباً سب مان گئے اور اُن کا ۹۵ یا ۹۶ فی صدی حصہ مسلمان ہو گیا۔ ہندوستان اور چین کے اہل کتاب میں سے بھی کروڑوں مسلمان ہو گئے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے اگر ان میں سے ایک کروڑ بھی باہر سے آئے ہوئے سمجھ لئے جائیں تب بھی نَو کروڑ ایسے لوگ رہ جاتے ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوئے۔ اسی طرح چین میں قریباً آٹھ کروڑ مسلمان ہیں اِن میں سے شاید دو چار یا دس لاکھ مسلمان عرب سے آیا ہوا ہو باقی سب وہ لوگ ہیں جو کنفیوشس کے پیرو تھے بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ غرض اہل کتاب میں سے ایک بڑی تعداد جو کروڑوں پر مشتمل ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی اور اُس نے کفر سے نجات حاصل کی۔ پس یہ کہنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا فائدہ کیا ہوا کیا سب اہل کتاب آپ پر ایمان لے آئے؟ تاریخی لحاظ سے نہایت بودا اعتراض ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کے لئے نہیں، دو کے لئے نہیں، کروڑوں کروڑ لوگوں کے لئے یہ راستہ کھولا اور کروڑوں کروڑ اہل کتاب کو آپ پر ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اِسی طرح مشرکوں میں سے عرب کے مشرک تو

ننوفی صدی مسلمان ہو گئے اور باقی ممالک پر بھی اسلام کی توحید کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے شرک کو خود بخود ترک کر دیا۔ چنانچہ اب حقیقی معنوں میں مشرک صرف ہندوستان یا افریقہ کے قبائل ہی رہ گئے ہیں باقی سب مشرکین میں سے نکل کر اہل کتاب میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس سورۃ کی اوّلین مخاطب عرب کی قوم ہو سکتی تھی مگر وہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں وہ ساری کی ساری مسلمان ہو گئی تھی۔ ایسا تغیّر اس سے پہلے دنیا کی کسی الہامی کتاب نے پیدا نہیں کیا۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لانے سے اِس وقت تک محروم ہیں اُن کے متعلق اِسی سلسلہ میں ایک اور خبر دی گئی ہے مگر اس سورۃ میں نہیں بلکہ اگلی سورۃ میں۔

آیت لَمْ یَکُنْ کا ترجمہ سیل اور ویری کے نزدیک اور اس کی تغلیط اس جگہ اس امر کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَ الْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ میں ’’لَمْ یَکُنْ‘‘ کا ترجمہ سیل اور ویری دونوں نے غلط کیا ہے۔ اُنہوں نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ ’’وہ ہٹے نہیں‘‘

(A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry vol:4 p:266-

The Koran by Sale vol:1 p:494)

اور معنے یہ کئے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ جو ایک آنے والے رسول کی امید لگائے بیٹھے تھے وہ اس امید پر قائم رہے جب تک کہ رسول نہ آ گیا یعنی جب وہ رسول آ گیا جس کی وہ امید کیا کرتے تھے تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہمیں تو کسی رسول کی امید نہیں تھی حالانکہ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی کے معنے سوائے اس کے ہو ہی نہیں سکتے کہ پہلا مضمون دوسرے سے معلّق ہے جب تک دوسری حالت نہ ظاہر ہو جائے پہلی حالت بدل ہی نہ سکتی تھی۔ پس رسول کے آنے تک رُکے نہ تھے اِس آیت کے معنے ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ اِن معنوں میں تعلیق مشروط نہیں پائی جاتی بلکہ صرف ایک واقعہ کا اظہار ہے جو اِس قسم کی عبارت کے منافی ہے۔

آیت لَمْ یَکُنْ الخ کا ترجمہ کرنے میں بعض مفسرین کو ٹھوکر تعجب ہے کہ پرانے مفسرین میں سے بھی بعض نے یہی معنے کئے ہیں حالانکہ وہ عربی زبان کے بڑے ماہر تھے اُن کا اس عربی عبارت میں سے یہ معنے نکال لینا ایک حیرت کی بات ہے مگر پھر خود ہی اُن کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ اگر اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ آنے والے نبی کے اظہار سے یعنی اس عقیدہ کے اظہار سے کہ ایک موعود رسول آنے والا ہے وہ نہیں رکے جب تک کہ نبی نہیں آ گیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں تو اہل کتاب کے ساتھ مشرکین کا بھی ذکر آتا ہے کیا مشرک بھی یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ایک رسول دنیا میں آنے والا ہے۔ پھر اس کا خود ہی انہوں نے یہ جواب دیا ہے کہ کچھ مشرک

لوگ اہل کتاب کے اثر کے ماتحت یہ امیدیں رکھتے تھے کہ ایک رسول آنے والا ہے۔ حالانکہ یہ عبارت ایسی ہے کہ اس سے ’’کچھ‘‘ کا استنباط ہو ہی نہیں سکتا۔ تمام مشرکوں کو اہلِ کتاب کے ساتھ شریک کیا گیا ہے اس لئے یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہاں بعض مشرکوں کا ذکر ہے اور بعض کا نہیں۔

آیت لَمْ یَکُنِ الخ کا صحیح ترجمہ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ سب اہل کتاب اور مشرک رُکنے والے نہیں تھے۔ پس اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ اس اعلان سے نہیں رکے کہ ایک موعود آنے والا ہے تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ ہر مشرک یہ امید رکھتا تھا کہ ایک رسول آئے گا حالانکہ یہ امر بالبداہت باطل ہے۔ مشرکوں میں تو ایسے لوگ بھی تھے جو نزولِ الہام کے بھی قائل نہیں تھے کجا یہ کہ وہ کسی مامور کی بعثت کا انتظار کر رہے ہوتے۔ پھر اگر یہی معنے کئے جائیں کہ وہ ایک مامور کی اُمید سے نہیں رُکے جب تک کہ رسول اُن کے پاس نہیں آ گیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں لَمْ یَکُنْ مُنْفَکِّیْنَ کے کیا معنے ہوئے؟ اس فقرہ کے تو یہ معنے ہیں کہ وہ رسول کے آنے کے بغیر اپنے مقام سے اِدھر اُدھر ہل نہیں سکتے تھے اور رسول کے آنے پر یہ کہنا کہ ہم کسی رسول کے منتظر نہیں تھے یا ہمیں کسی مامور کی امید نہیں تھی۔ اس میں ہٹ نہ سکنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رسول کی آمد کا انکار تو جو چاہے اپنے ارادہ سے کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امر اوّل کا بدلنا منشاء الٰہی کے ماتحت ہے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے کیونکہ لَمْ یَکُنْ فَاعِلًا حَتّٰی کے معنے عربی زبان میں قائل کی اس خواہش کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ بہتر ہے کہ ایسا تغیر ہو جائے۔ لیکن جو معنے اُن مفسروں نے کئے ہیں اُن سے خدا تعالیٰ کی خواہش نہیں بلکہ عدم خواہش ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا تعالیٰ چاہتا تھا کہ یہ لوگ رسول کی آمد کا انتظار چھوڑ دیں کیونکہ ایسا کرنا گمراہی ہے اور خدا تعالیٰ کسی کے گمراہ ہو جانے کو پسند نہیں کرتا۔ اُردو زبان میں بھی اس قسم کی عبارات کے معنوں پر غور کرو تو حقیقت کھل جائے گی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جب تک اُستاد نہ رکھا اس لڑکے نے پڑھا ہی نہیں۔ اس کے بے شک یہ معنے ہیں کہ اُستاد رکھنے سے اُس نے پڑھا لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی ظاہر ہے کہ کہنے والے کی خواہش بھی اس میں مخفی ہے کہ لڑکے کے پڑھ جانے کو وہ پسند کرتا تھا یہ نہیں کہ وہ پسند نہیں کرتا تھا اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ان مفسرین کے معنوں کو دیکھو تو اس آیت کا ترجمہ اُن کے خیال کے مطابق یہ ہوگا کہ رسول آیا تب کہیں جا کر ان لوگوں نے رسول کی آمد کا انتظار چھوڑا اور ظاہر ہے کہ اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ کہنے والا چاہتا تھا کہ یہ رسول کی آمد کا انتظار چھوڑ دیں اور ایسا خیال اللہ تعالیٰ کی نسبت سخت گستاخانہ خیال ہے۔

علامہ واحدی کہتے ہیں کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر ضلالت وکفر کو ظاہر نہیں کیا اہل کتاب اور مشرک اپنے کفر سے بعض نہ آئے (فتح البیان زیر آیت لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا) اور چونکہ اس مقام پر ان کے دل میں بھی یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ یہاں تو سب اہل کتاب اور مشرکین کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ایمان لانے والے اہل کتاب اور مشرکوں کے بارہ میں ہے یعنی اہل کتاب میں سے کافر اور مشرکوں میں سے کافر نہ رکے یعنی ایمان لے آئے حالانکہ یہاں صاف طور پر کَفَرُوْا کا لفظ آتا ہے اگر ان کا خیال درست ہو تو یوں کہنا چاہیے تھا اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی پھر لکھتے ہیں وَھٰذِہِ الْاٰیَۃُ مِنْ اَصْعَبِ مَا فِی الْقُرْاٰنِ نَظْمًا وَّ تَفْسِیْرًا وَّقَدْ تَخَبَّطَ فِیْہِ الْکِبَارُ مِنَ الْعُلَمَاءِ وَ سَلَکُوْا فِیْ تَفْسِیْرِھَا طُرُقًا لَا تُفْضِیْ بِھِمْ اِلَی الصَّوَابِ (فتح البیان زیر آیت لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا) یعنی یہ آیت عبارت اور تفسیر کے لحاظ سے قرآن کریم کی مشکل ترین آیتوں میں سے ہے اور بڑے بڑے علماء اس میں ٹھوکریں کھاتے رہے ہیں اور انہوں نے اس کے معنے کرتے ہوئے ایسے طریق اختیار کئے ہیں جو انہیں صحیح نتیجہ پر پہنچانے سے قاصر رہے۔

جہاں یہ بات درست ہے کہ بعض علماء نے اس کے معنوں میں ادبی غلطیاں کی ہیں یعنی جو معنے نہیں ہو سکتے تھے وہ کر دیئے ہیں مثلاً یہ کہ یہود نے انتظارِ نبی نہ چھوڑا جب تک نبی نہ آ گیا وہاں علامہ واحدی کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے صحیح مطلب سمجھا ہے یہ بھی غلط ہے کیونکہ ان کے معنے بھی درست نہیں لَمْ یَکُنِ مُنْفَکِّیْنَ کے معنے ''وہ نہیں رُکے'' کسی صورت میں بھی درست نہیں اس کے معنے ہمیشہ ''وہ رُکنے والے نہ تھے'' کے ہوتے ہیں بہرحال اس آیت کے معنے سمجھنے میں دقتیں ضرور پیش آئی ہیں مگر یہ دقتیں خود پیدا کردہ ہیں کیونکہ مُنْفَکِّیْنَ کے حقیقی معنوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اگر سیاق عبارت سے اس کا مفہوم نکال لیا جاتا تو بات آسان ہو جاتی کَفَرُوْا کا لفظ پہلے گزر چکا تھا۔ اس لئے مُنْفَکِّیْنَ کے معنے یہی ہو سکتے تھے کہ مُنْفَکِّیْنَ عَنْ کُفْرِھِمْ۔ اگر عَنْ کُفْرِھِمْ کو محذوف نکال لیا جاتا تو معنوں کی دقتیں پیش نہ آتیں اور مضمون بالکل ظاہر ہو جاتا۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً ۳

یعنی اللہ (کی طرف) سے آنے والا ایک رسول جو (اُنہیں ایسے) پاکیزہ صحیفے پڑھ کر سناتا۔

حلّ لُغات۔ طَھَّرَۃً طَھَّرَہٗ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَہٗ طَاھِرًا۔ اُس کو پاک کر دیا (اقرب) اس لحاظ

سے مُطَهَّرَةٌ کے معنے ہوئے ایسے صحیفے جو پاک کئے گئے ہیں اور چونکہ عربی زبان میں تَطْهِیْر کا لفظ ختان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس ذریعہ سے زائد چیزیں نکال دیتے ہیں اِس لئے مُطَهَّرَةٌ کے یہ بھی معنے ہوئے کہ ایسی چیز جس میں سے زوائد نکال دیئے گئے ہوں۔ پس مُطَهَّرَةٌ کے دو۲ معنے ہوئے ایک یہ کہ جس میں سے گند نکال دیا گیا ہو اور دوسرے یہ کہ جس میں سے زوائد نکال دیئے گئے ہیں۔ اِسی طرح طَهَّرَ الشَّیْءَ بِالْمَاءِ کے معنے ہوتے ہیں غَسَلَهٗ اس کو پانی سے دھودیا (اقرب)۔ اس لحاظ سے مُطَهَّرَةٌ کے معنے ہوں گے دُھلے دُھلائے۔

مُطَهَّرَةٌ کے معنے امام راغب کے نزدیک مفردات راغب میں لکھا ہے اَلطَّهَارَةُ ضَرْبَانِ طہارت دو قسم کی ہوتی ہے طَهَارَةُ جِسْمٍ وَطَهَارَةُ نَفْسٍ ایک جسم کی طہارت اور ایک نفس کی طہارت۔ وَحُمِلَ عَلَیْهَا عَامَّةُ الْاٰیَاتِ اور قرآن کریم کی وہ تمام آیات جن میں طہارت کا لفظ آیا ہے وہاں یہ لفظ انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وَقَوْلُهٗ فِیْ صِفَةِ الْقُرْاٰنِ مَرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ وَقَوْلُهٗ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ۔ یعنی قرآن کریم میں دوسری جگہ سورۂ عبس میں جو مَرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (عبس:۱۵) کے الفاظ آتے ہیں یا سورۂ مدثر میں وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر:۵) کے الفاظ آتے ہیں قِیْلَ مَعْنَاهُ نَفْسَكَ۔ فَنَقِّهَا مِنَ الْمَعَائِبِ۔ ان دونوں کے معنے یہ ہیں کہ معائب سے اپنے نفس کو پاک کر۔ مفردات والے چونکہ اختصار سے کام لیتے ہیں اس لئے انہوں نے دونوں آیتوں کے یکجا معنے کر دیئے ہیں اور ان کی مراد یہ ہے کہ یہی معنے مَرْفُوْعَةٍ مُطَهَّرَةٍ کے بھی ہیں یعنی بلند شان والا اور عیبوں سے پاک۔ وَقَوْلُهٗ وَطَهِّرْ بَیْتِیَ وَقَوْلُهٗ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ فَحَثٌّ عَلٰی تَطْهِیْرِ الْكَعْبَةِ مِنْ نَّجَاسَةِ الْاَوْثَانِ یعنی قرآن میں جو آتا ہے کہ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَ الْقَآئِمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (الحج:۲۷) یا دوسری جگہ فرمایا ہے وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرۃ:۱۲۶) ان ہر دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کو ترغیب دلائی ہے کہ وہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کر دیں۔ پس تطہیر کے ایک معنے شرک سے پاک کرنے کے ہوئے گویا لغت کی ان دونوں کتابوں کی رُو سے نجاست ظاہری اور نجاست باطنی دونوں کو دور کرنے کے لئے تطہیر کا لفظ استعمال ہوتا ہے ان معانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مُطَهَّرَةٌ کے پانچ معنے ہوئے۔

مُطَهَّرَةٌ کے پانچ معنے

اوّل۔ نجاست ظاہری سے پاک

دوم۔ زوائد سے پاک

سوم۔ دُھلے دُھلائے

چہارم۔طہارت باطنی رکھنے والے

پنجم۔شرک سے پاک

عربی زبان میں صفائی اور پاکیزگی کے معنے ادا کرنے کے لئے سات الفاظ اور ان کے استعمال میں فرق

عربی زبان میں پاکیزگی کے مفہوم کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ یہ ہیں

نَظَافَۃٌ۔طَھَارَۃٌ۔طِیْبَۃٌ۔نَقَاءٌ۔زَکَاءٌ۔صَفَاءٌ۔نَزَاھَۃٌ

ان میں سے طہارت جسمی اور نفسی ہوتی ہے یعنی نجس کے مقابل پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔قرآن کریم میں پانی کو طہور کہا گیا ہے لیکن اس کے مقابل میں مٹی کو طیّب کہا گیا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَھُوْرًا(الفرقان:۴۹) لیکن مٹی کے متعلق فرماتا ہے کہ فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا(المائدۃ:۷) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ تو فرمایا ہے کہ طَھِّرْ بَیْتِیَ(الحج:۲۷) لیکن عربی محاورہ کے مطابق یہ نہیں کہا جائے گا کہ طَیِّبْ بَیْتِیَ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ(۱) طہارت میں خارجی نجاست کے دُور کرنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے اسی طرح تَطْھِیْر کے معنے خارجی نجاست خواہ جسمانی ہو یا روحانی اس کو دُور کرنے کے بھی ہوتے ہیں لیکن طِیْبَۃٌ کا لفظ ذاتی جوہر کی طرف اشارہ کرتا ہے خارجی نجاست کی طرف نہیں۔چنانچہ طَھِّرْ کے معنے تو صاف کرنے کے ہوتے ہیں لیکن طَیِّبْ کا لفظ جب ایک عرب بولے گا تو خارجی نجاست کو دُور کرنے کے معنوں میں وہ اسے کبھی استعمال نہیں کرے گا بلکہ اس کے معنے مزیدار یا اچھا بنانے یا مزیدار یا اچھا پانے کے ہوتے ہیں چنانچہ طَیَّبَ الشَّیْءَ کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ اُس نے نجاست ظاہری دُور کر دی بلکہ طیّب ہمیشہ مزیدار یا اچھا بنانے یا مزیدار یا اچھا پانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً طَیَّبَ اللَّحْمَ کے معنے ہوتے ہیں اس نے گوشت اچھا پکایا اور اسے مزیدار بنایا۔یا اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اُس نے گوشت کو اچھا پایا یا کھانا کھایا تو کہا کہ کھانا بڑا اچھا پکایا گیا تھا یا خوب مزیدار تھا۔اگر زمین پر بوٹی گر جائے تو ہم یہ تو کہیں گے کہ طَھِّرْ اس بوٹی کو صاف کرو لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ طَیِّبْ۔لیکن اچھا پکانے یا اچھا پانے کے مفہوم کو جب ہم ادا کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے طَھِّرْ کا لفظ استعمال نہیں کریں گے۔اسی طرح طَیِّبْ کے معنے امن یا سکون دینے کے بھی ہوتے ہیں یعنی اصلاحِ نفس کے۔

پس طَھَارَۃٌ اور طِیْبَۃٌ میں یہ فرق ہے کہ طہارت نجاست خارجی سے حفاظت پر دلالت کرتی ہے۔مگر طیبہ صرف ذاتی خوبی پر دلالت کرتی ہے جیسے مزا، خوبصورتی، مٹھاس یا کسی چیز کا فائدہ بخش ہونا۔ایک میٹھی اور مزیدار شے کو ہم طیّب کہیں گے طاہر نہیں کہیں گے یا مثلاً کوئی چیز خوبصورت ہو یا مفید ہو تو ہم اس کو طیّب تو کہیں گے مگر طاہر

نہیں کہیں گے۔ اسی طرح کسی چیز کو نجاست لگ جائے تو اس کو صاف کرنے کے لیے طَھِّرْ کہیں گے طَیِّب نہیں۔ بہر حال طاہر تب کہیں گے جب نجاست ظاہری سے کسی چیز کو بچایا جائے۔ خواہ یہ نجاست جسمانی ہو یا روحانی۔ مثلاً ایک طاہر القلب انسان ہو یعنی وساوس شیطانی سے پاک ہو تو اسے بھی ہم طاہر کہہ دیں گے اور اگر کوئی شخص نہا دھو کر نکلا ہو تو اُسے بھی طاہر کہا جائے گا۔

نظافت بھی خارجی نجاست سے پاکیزگی کا نام ہے جیسے میل وغیرہ سے یا حسن و خوبصورتی کا مالک ہونے پر یہ لفظ دلالت کرتا ہے۔ کہتے ہیں نَظُفَ الشَّیْءُ میل کچیل سے پاک تھی یا خوبصورت تھی لیکن کبھی یہ لفظ باطنی نجاست سے پاک ہونے کے لیے بھی بول لیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں فُلَانٌ نَظِیْفُ الْاَخْلَاقِ یعنی فلاں شخص مہذب ہے مگر یہ لفظ اخلاق کے لیے بولا جائے گا یا میل کچیل کے لیے۔ مزیدار یا لطیف کے لئے نہیں بولا جائے گا اور صفائی کے لیے زیادہ تر ظاہر قسم کی صفائی کے لیے بولا جائے گا نہ کہ باطنی صفائی پر۔ اسی طرح اخلاق کے لیے تو بولا جائے گا روحانی صفائی کے لیے نہیں اس وجہ سے اس کے معنے طاہر سے مختلف ہیں کہ وہ رُوحانی پاکیزگی اور نفسیاتی پاکیزگی پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ کو طیّب سے اس امر میں مشارقت ہے کہ حسن و بہا کے لیے بھی نظافت کا لفظ آتا ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا مگر احادیث میں اصل معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور استعارۃً بھی استعمال ہوا ہے جیسے حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نَظِّفُوْا اَفْوَاھَکُمْ (کنز العمال الفصل الثالث فی آداب التلاوۃ حدیث نمبر ۲۸۰۴) اپنے مُونہوں کو پاک کیا کرو۔ اس جگہ پاک کرنے کے معنے یہ ہیں کہ جھوٹ فریب اور دغا وغیرہ سے اپنے آپ کو بچاؤ اور کہیں کوئی ایسی بات اپنی زبان سے نہ نکالو جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو۔ یہاں نظافت کا لفظ استعارۃً استعمال ہوا ہے نہ کہ اصل ظاہری معنوں میں۔

نِقَاءٌ کا لفظ بھی قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا حدیث میں ہوا ہے۔ اس کے اصل معنے مغز نکالنے کے ہوتے ہیں (اقرب) اور ان معنوں کے رُو سے استعارۃً صفائی کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگ گیا ہے جیسے چھلکے کو دُور کر کے مغز نکالتے ہیں یا ہڈی کو توڑ کر گودہ نکالتے ہیں۔ انہیں معنوں سے استدلال کر کے محاورہ میں نظیف حسین اور خالص کے معنے دینے لگ گیا ہے۔

زَکٰوۃٌ کے اصل معنے اندرونی نجاست کے دُور کرنے کے ہوتے ہیں لیکن کبھی ظاہری صفائی کے معنوں میں بھی استعارۃً استعمال ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

صَفَاءٌ کے معنے ملاوٹ سے نجات پانے کے ہوتے ہیں یا منتخب ہونے کے ہوتے ہیں استعارۃً ظاہری صفائی

کے لیے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

نَزَاهَةٌ کے معنے اصل میں تو دُور ہونے کے ہوتے ہیں لیکن محاورہ میں جو چیز گندگی اور فساد سے دُور ہو اُس کے لیے بھی یہ لفظ بولا جانے لگا ہے۔

ان سب لفظوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طاہر سب سے اعلیٰ اور کامل لفظ ہے جو صفائی کے مفہوم کے لیے عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے وسیع ہیں اور یہ ظاہر و باطن دونوں حالتوں کی صفائی پر بیک وقت دلالت کرتا ہے۔ اور طیّب کی نسبت جو معنوں میں اس کے بہت زیادہ قریب ہے یہ زیادہ مضبوط ہے کیونکہ قرآن کریم نے اصل کے لیے طہارت اور نائب کے لیے طیّب کا لفظ استعمال کیا ہے جیسے پانی کے متعلق تو یہ فرمایا ہے کہ مَآءً طَهُوْرًا (الفرقان:۴۹) لیکن مٹی کی نسبت فرمایا ہے صَعِيْدًا طَيِّبًا (المائدة:۷)

تفسیر۔ بَيِّنَةٌ کے معنے اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ اہل کتاب اور مشرک کفر کو کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے جب تک ان کے پاس بیّنہ نہ آ جاتی۔ بیّنہ کے معنے جیسا کہ بتائے جا چکے ہیں۔ واضح اور جلی کے ہوتے ہیں پس حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ کے معنے یہ تھے کہ جب تک ایک واضح اور روشن چیز ان کے پاس نہ آ جاتی وہ کفر سے نکل نہیں سکتے تھے اور چونکہ بیّنہ کے ایک معنے دلیل اور حجت کے بھی ہوتے ہیں اس لیے اس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ جب تک اُن کے پاس دلیل اور حجت نہ آ جاتی وہ اپنے کفر سے باز رہنے والے نہیں تھے۔ اب اس آیت میں یہ بتاتا ہے کہ بیّنہ سے مراد ہر دلیل نہیں کہ تم یہ خیال کر لو کہ دلائل اور براہین سے وہ اپنے کفر کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ اسی حکمت کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے حَتّٰى تَاْتِيَهُمْ بَيِّنَةٌ نہیں فرمایا بلکہ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ فرمایا ہے۔ یعنی بیّنہ پر الف لام داخل کیا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے کفر و شرک کے زمانہ میں جب چاروں طرف معصیت کی تاریک گھٹائیں چھائی ہوں ہر دلیل کام نہیں آیا کرتی۔

حضرت مسیح موعودؑ کی بعثت کی ضرورت جیسے اس زمانہ میں بھی بعض لوگوں سے سامنے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دعویٰ پیش کیا جاتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں آپ پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے لیے قرآن کریم کافی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بالکل غلط ہے ایسے زمانہ میں اَلْبَيِّنَة کی ضرورت ہوتی ہے اور اَلْبَيِّنَة سے ہماری مراد رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ ہے یعنی ایسے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کا رسول ہی دنیا کی اصلاح کر سکتا ہے کوئی کتاب لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہو سکتی جب چاروں طرف کفر پھیل جائے، جب لوگ خدا تعالیٰ سے غافل ہو جائیں، جب اس سے محبت اور پیار کے تعلقات منقطع کر لیں تو خواہ وہ اہل کتاب ہی ہوں اُس وقت

کوئی الہامی کتاب بھی ان کے کام نہیں آتی صرف رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کام آتا ہے۔ ایسا شخص ہی لوگوں کی نجات کا باعث بن سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت و رسالت کے مقام پر کھڑا ہو اور اپنی قوت قدسیہ سے نفوس کو پاکیزہ کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔ اگر یہاں صرف بیّنہ کا لفظ ہوتا تو لوگ کہتے کہ بیّنہ سے مراد کتاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ کتاب لوگوں کی اصلاح کے لیے کافی ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا ذکر کرنے کے بعد بیّنہ کا ذکر کیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے پاس کتاب موجود تھی مگر وہ ان کو کفر سے نہ بچا سکی۔ باوجود اہل کتاب ہونے کے ایسے گرے کہ کفار میں شامل ہو گئے اس لیے یہ سمجھنا کہ کتاب لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی ہوتی ہے بہت بڑی غلط فہمی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسے موقعہ پر وہی دلیل کام آتی ہے جو رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کی شکل میں ہو دوسری کوئی دلیل کام نہیں آیا کرتی خواہ کتاب موجود ہو، تحریف و الحاق سے مبرّا ہو پھر بھی ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ پر تازہ ایمان پیدا ہو، اس سے تازہ تعلق ہو، اس کی محبت اور پیار کے تازہ کرشمے ظاہر ہوں اور یہ بات بغیر نمونہ اور بغیر اللہ تعالیٰ کے تازہ نشانات کے حاصل نہیں ہو سکتی بے شک اس وقت کتاب تو ہوتی ہے مگر وہ بولتی نہیں لوگوں کے لیے اس کا وجود اور عدم وجود بالکل یکساں حیثیت رکھتا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے تو اُس کے ذریعہ وہ کتاب پھر بولنے لگتی ہے، پھر اس کے انوار لوگوں کے قلوب کو گرماتے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار کرتے ہیں اور پھر ان کے ایمانوں میں ایک نئی تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

آیت لَمْ یَکُنْ میں چکڑالویوں اور پیغامیوں کا ردّ اس آیت نے چکڑالویوں کا بھی ردّ کر دیا جو کہتے ہیں کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی ہمیں ضرورت نہیں اسی طرح پیغامیوں کا بھی ردّ کر دیا جو کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن لے آئے ہیں تو اس کے بعد کسی رسول کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارے یہ خیالات بالکل غلط ہیں وسیع فساد کے وقت میں وہی دلیل کام آیا کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے رسول کی شکل میں ظاہر ہو کتاب لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اُس وقت وہ بیّنہ کام آتی ہے جو رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کی شکل میں ظاہر ہو کیونکہ یہ وقت محتاج ہوتا ہے کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک زندہ وجود ظاہر ہو جو خدا تعالیٰ کے تازہ نشانات کو ظاہر کرنے والا ہو اس کی طرف سے نئے نئے نشانات دکھانے والا ہو اُس کی محبت اور پیار کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے والا اور قلوب میں عشقِ الٰہی کی آگ کو بھڑکانے والا ہو اور وہ دنیا پر یہ ظاہر کر سکتا ہو کہ ہمارا خدا آج بھی ویسا ہی زندہ ہے جیسے پہلے زندہ تھا اب بھی ویسا ہی کلام کرتا ہے جیسے پہلے کلام کیا کرتا تھا اور اب بھی اپنے پیاروں کی تائید میں

ویسے ہی نشانات دکھاتا ہے جیسے پہلے دکھایا کرتا تھا۔تب لوگوں کے دلوں کے تالے کھلتے اور ان کے اندر زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں اس کے بغیر ان کی روحانی زندگی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔مُطَهَّر کے معنے حل لغات میں آ چکے ہیں جو یہ ہیں ۔

اوّل ۔عیبوں سے پاک

دوم ۔زوائد سے پاک

سوم ۔ دُھلا دھلایا

چہارم ۔ظاہری نقص سے پاک

پنجم ۔ شرک سے پاک

صحف کے مُطَهَّرَةً ہونے کا مطلب

پس یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً کے یہ معنے ہوئے کہ وہ ایسے صحیفے پڑھ کر سناتا ہے جو عیبوں سے پاک کئے ہوئے ہیں ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ (۱) پہلی کتابوں میں بعض باتیں غلط اور اللہ تعالیٰ کے الہام کے خلاف مل گئی تھیں اور وہ کتب اُس صورت میں باقی نہیں رہی تھیں جس صورت میں کہ وہ نبی پر اتاری گئی تھیں اب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ اُن تعلیمات کو جو درحقیقت خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہوئی تھیں بلکہ بعد میں لوگوں نے ان کتابوں میں ملا دی تھیں دُور کر دیا اور اتنا حصہ تعلیم کا قران کریم میں نازل فرما دیا جو واقعہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔گویا عیب سے پاک کیا ہوا کے معنے یہ ہیں کہ جو نقائص پہلی کتب میں پیدا ہو گئے تھے انہیں اس کتاب میں دُور کر دیا گیا ہے یا جو باتیں مل گئی تھیں ان کی اصلاح کی گئی ہے۔

ایک معنے اس لحاظ سے یہ بھی بنیں گے کہ گو بعض حصے پہلی کتابوں کے واقعہ میں الہامی ہیں لیکن موجودہ زمانہ کے لحاظ سے وہ قابل عمل نہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو بھی چھوڑ دیا کیونکہ گو منبع کے لحاظ سے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں ۔مگر حالات کے لحاظ سے اب خدا تعالیٰ نے انہیں منسوخ قرار دے دیا ہے ۔پس کامل کتاب میں اب اُن کا کوئی مقام نہیں ہے۔

دوسرے معنے مُطَهَّرَة کے زوائد سے پاک کے تھے ان کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ ایسی باتیں جنہیں گو خراب تو نہیں کہا جا سکتا مگر وہ زوائد میں سے ہیں اُنہیں بھی قرآن کریم نے ترک کر دیا ہے پہلی چیز کی مثال ایسی ہے جیسے پہلے زمانہ میں شراب حرام نہ تھی اسلام نے شراب کو حرام قرار دے دیا۔ یا پہلے زمانہ میں سود کلیۃً حرام

نہ تھا لیکن قرآن کریم میں سُود کو کلیۃً حرام قرار دے دیا گیا اور زوائد کی مثال ایسی ہے جیسے پہلے زمانہ میں عبادت کے لیے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ خاص طور پر پاک کئے گئے مقام پر ہی عبادت ہوسکتی ہے اور اس قسم کی شرطیں بھی تھیں کہ ایسے پردے ہوں، ایسا مکان ہو۔ یہ باتیں اپنی ذات میں بری تو نہیں لیکن عبادت کے لحاظ سے زوائد ہیں۔ ان سب قیود کو اسلام نے اُڑا دیا۔ بے شک اسلام نے بھی ایک سیدھی سادی مسجد عبادت کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ لیکن اُس کو عبادت کے لیے ضروری قرار نہیں دیا۔ اگر مسجد نہ ہو تب بھی مسلمان کی عبادت ہو جاتی ہے۔ مگر یہود ونصاریٰ کی عبادت کے لیے ایک خاص مقام اور ایک خاص قسم کی تیاری کی قید تھی جو اسلام میں نہیں کیونکہ قرآنی تعلیم مختون ہے یعنی اس میں سے زوائد کاٹ دیئے گئے ہیں صرف ضروری امور کو لے لیا گیا ہے۔

تیسرے معنے مطہر کے دھلے ہوئے کے ہیں۔ دھلی ہوئی چیز اصل چیز سے علیحدہ نہیں ہوتی صرف اصل چیز پر جو خارجی اثرات ہوتے ہیں ان میں تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے۔ ان معنوں کے لحاظ سے مُطَهَّرَةً کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ فقہی پیچیدگیاں جو یہودیوں یا عیسائیوں نے پیدا کر دی تھیں ان سے قرآن کریم نے نجات دلائی ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب بھی کسی مذہب پر لمبا زمانہ گزر جاتا ہے اُس کے ساتھ فقہی پیچیدگیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ فقہ کی اصل غرض تو یہ ہوتی ہے کہ جو مسائل الٰہی کتاب میں نص کے طور پر نہیں آئے ان کا استخراج کیا جائے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب فقہ میں ضعف آتا ہے خود اصل مسائل میں بھی تصرّف شروع ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے نقائص کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اباحت کی طرف لے جاتے ہیں اور کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو ظاہر کی طرف انتہا درجہ کی شدت کے ساتھ بلاتے ہیں یہی حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کا تھا اگر یہودیوں نے سزا کی تعلیم پر بے انتہا زور دیا تھا۔ تو عیسائیت نے نرمی کی تعلیم پر بے انتہا زور دے دیا۔ اب یہ دونوں مسائل ہی ضروری تھے لیکن یہودی فقہ اور عیسائی فقہ نے ان دونوں کو الگ الگ احکام کی شکل میں بدل دیا۔ جب اسلام آیا تو اس نے اس پیچیدگی کو بالکل دور کر دیا اور غلط فقہ کا تعلیم پر جو اثر تھا اس کو دھو دیا مثلاً اسلام نے بھی کہا ہے کہ دانت کے بدلے دانت آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان (المائدۃ:۴۶)۔ مگر اسلام نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ عفو بڑی اچھی چیز ہے تمہیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے اسی طرح اسلام نے بھی یہی کہا کہ نرمی اور عفو بڑی اچھی چیز ہے مگر ساتھ ہی کہا کہ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ:۴۱) اُسی وقت عفو جائز ہے جب عفو کے نتیجہ میں مجرم کی اصلاح کی امید ہو اگر یہ خیال ہو کہ عفو مجرم کو اور بھی بگاڑ دے گا اور اُسے بُرے اعمال پر اور زیادہ جرأت دلا دے گا تو اس وقت عفو سے کام

لینا تمہارے لیے جائز نہیں غرض یہودی تعلیم میں یہ زور کہ ضرور دانت کے بدلہ میں دانت توڑو۔ آنکھ کے بدلہ میں آنکھ پھوڑو اور کان کے بدلہ میں کان کاٹو (احبار باب ۲۴ آیت ۱۹، ۲۰) فقہ کا ہی نتیجہ تھا ورنہ موسیٰؑ کی تعلیم میں یہ بات نہ تھی اسی طرح عیسائیت کی تعلیم میں یہ بات کہ تم ضرور معاف کرو اور اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو (متی باب ۵ آیت ۳۹) فقہ کی وجہ سے ہی تھی۔ ورنہ حضرت مسیحؑ تو صاف کہتے ہیں کہ میں تورات کو بدلنے کے لیے نہیں آیا۔ جب وہ تورات کو بدلنے کے لیے نہیں آئے تو اُس کے قانون سزا کو وہ کلیتہً کس طرح مٹا سکتے تھے۔

غرض وہ فقہی پیچیدگیاں جو یہودیوں اور عیسائیوں نے پیدا کر دی تھیں اور غلط فقہ کی وجہ سے جو نقائص رونما ہو گئے تھے قرآن کریم نے ان سب کو دُور کر دیا ہے اور یہی قرآن کریم کا مطہّر یعنی دُھلا دُھلایا ہونا ہے۔ کہ اس نے ایسی تعلیم دی جو ہر قسم کی پیچیدگیوں سے پاک ہے۔

چوتھے معنے مُطَهَّرَةً کے ہیں ظاہری نقصوں سے پاک۔ ظاہری نقائص میں سے سب سے بڑا نقص زبان کا ہوتا ہے کیونکہ کتاب کا ظاہر اُس کی زبان ہی ہوتی ہے اس لحاظ سے مُطَهَّرَةً کے معنے یہ بنیں گے کہ قرآن کریم زبان کے نقصوں سے پاک ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا انکار دشمنانِ اسلام نے بھی نہیں کیا شاذ و نادر کے طور پر کوئی غبی دشمن یا ایسا دشمن جو انصاف کو بالکل نظر انداز کر چکا ہو قرآن کریم کی زبان پر اعتراض کر دے تو اور بات ہے ورنہ بالعموم اُن عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی جو عرب کے رہنے والے تھے قرآن کریم کی زبان کی تعریف کی ہے اور یوروپین مصنف جو غیر متعصّب ہیں انہوں نے بھی اس کی زبان کی داد دینے سے گریز نہیں کیا پس مُطَهَّرَةً میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم زبان کے نقصوں سے پاک ہے نہایت لطیف اور فصیح زبان میں نازل ہوا ہے اور پڑھنے والے کو حسنِ کلام سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

ظاہری نقصوں سے پاک کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ زبان میٹھی اور دلکش ہو یعنی ظاہری نقص سے پاک ہونا ایک تو یہ ہے کہ زبان میں کوئی نقص نہ ہو ثقیل الفاظ نہ ہوں۔ غیر طبعی محاورات نہ ہوں۔ دوسرے یہ بھی ظاہری نقص سے پاک ہونے کی علامت ہے کہ زبان شیریں اور دلکش ہو۔ یہ خوبی بھی قرآن کریم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اُس کی عبارت ایسی لطیف ہے کہ پڑھنے والا یہ نہیں سمجھتا کہ میں نثر پڑھ رہا ہوں یا نظم پڑھ رہا ہوں۔ ایک عیسائی مصنف نے قرآن کریم کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ایک بڑی لطیف بات لکھی ہے وہ کہتا ہے قرآن کریم کا ترجمہ جب ہماری زبان میں کیا جاتا ہے۔ تو عام طور پر لوگ اس کے متعلق کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا

وہ کہتا ہے قرآن کریم کا ترجمہ سمجھ میں آ کس طرح سکتا ہے اُس کا سٹائل ایسا ہے کہ نہ اُسے نثر کہا جا سکتا ہے نہ نظم۔ جب تک اس کے سٹائل کو مدِّ نظر نہ رکھا جائے اُس وقت تک اُس کے معنے کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔
(New Age Encyclopedia by Belinda Whitworth:under the word Koran)
پھر ایک ظاہری نقص فحش کلامی کا ہوتا ہے مگر قرآن کریم اِس نقص سے بھی کلیۃً پاک ہے۔ اُسے مضامین وہ ادا کرنے پڑتے ہیں کہ بعض دفعہ بغیر الفاظ کے ننگا ہونے کے اُن کو ادا نہیں کیا جا سکتا مگر قرآن کریم ان تمام مقامات پر سے ایسی عمدگی سے گذر جاتا ہے کہ مطلب بھی ادا ہو جاتا ہے اور طبعِ نازک پر گراں بھی نہیں گذرتا۔ اس کے مقابلہ میں ویدوں اور بائیبل وغیرہ میں بعض دفعہ ایسی باتیں آ جاتی ہیں کہ اُن کا پڑھنا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے ویدوں میں ایک منتر آتا ہے کہ فلاں بزرگ پیدا ہونے لگا تو چونکہ گندی جگہ سے گزرنے سے اُس نے انکار کر دیا پیٹ پھاڑ کر اُسے نکالا گیا۔ اِس قسم کے الفاظ انسان کی طبیعت پر سخت گراں گذرتے ہیں مگر اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ویدوں میں ایسے منتر موجود ہیں جن میں فحش کلامی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح بائبل کے متعلق خود عیسائیوں نے اعتراف کیا ہے کہ اُس کے بعض حصے ایسے گندے ہیں کہ اُن کا پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو تو وہ حصے پڑھا ہی نہیں سکتے مگر قرآن کریم میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے حسِ لطیف کو کوئی صدمہ پہنچتا ہو۔

پھر ایک ظاہری نقص کلام میں دل آزاری کا پایا جانا ہوتا ہے۔ پڑھنے والا جب کسی ایسی کتاب کو پڑھتا ہے جس میں دوسروں کی دل آزاری سے کام لیا گیا ہو تو وہ بُرا مناتا اور اُس کا قلب سخت اذیت محسوس کرتا ہے مگر قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس میں کسی قوم کی دل آزاری نہیں کی گئی اور اگر کسی جگہ مجبوراً قرآن کریم کو بعض سخت الفاظ استعمال بھی کرنے پڑے ہیں تو وہاں اُس نے کسی کا نام نہیں لیا صرف اصولاً ذکر کر دیا ہے کہ بعض انسان ایسے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ مکہ والے ایسے ہیں یا یہودی ایسے ہیں یا عیسائی ایسے ہیں۔ اس کے مقابل پر جب دوسری الہامی کتب کو دیکھا جاتا ہے تو اُن میں یہ نقص نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ہی انجیل میں آتا ہے کہ اُنہوں نے فریسیوں اور فقیہوں سے جب انہوں نے نشان کا مطالبہ کیا تو کہا کہ اس زمانہ کے بد اور حرام کار لوگ مجھ سے نشان مانگتے ہیں اُنہیں یاد رکھنا چاہیے کہ یونس نبی کے نشان کے سوا اَور کوئی نشان نہیں دکھایا جائے گا (متی باب ۱۲ آیت ۳۹) اِن الفاظ کو آج بھی یہودی پڑھتے ہوں گے تو سمجھتے ہوں گے کہ بدکار اور حرام کار وغیرہ الفاظ ہمارے باپ دادوں کے متعلق ہی استعمال کئے گئے ہیں یا مثلاً حضرت مسیحؑ نے اپنے دشمنوں کو سانپ اور سانپوں کے بچے قرار دیا ہے (متی باب ۱۲ آیت ۳۴) اور انجیل میں یہ الفاظ آج تک موجود ہیں۔ یہودی جب بھی یہ

الفاظ پڑھتے ہوں گے اُن کے دل دُکھتے ہوں گے کہ یہ سخت الفاظ ہمارے آباء کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں لیکن قرآن کریم نے جہاں مجبوراً بعض سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وہاں کسی کا نام نہیں لیا بلکہ اشارۃً ذکر کر دیا ہے کہ بعض لوگوں میں یا بعض قوموں میں یہ یہ نقائص پائے جاتے ہیں یا فلاں فلاں اخلاقی خرابیاں اُن میں موجود ہیں۔ دشمن اِن الفاظ کو پڑھتا ہے تو اُس کے دل پر چوٹ نہیں لگتی وہ فوراً کہہ دیتا ہے کہ میں تو ایسا نہیں یہ اور لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے پس قرآن کریم کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ اُس میں دل آزاری کی کوئی بات نہیں۔

مُطَهَّرَةً کے لفظ سے باطنی خوبی کی طرف بھی اشارہ ہے ایک کتاب کی بڑی باطنی خوبی یہی ہو سکتی ہے کہ جن مطالب کا بیان کرنا ضروری ہو اُس میں اُن کو پوری طرح بیان کر دیا جائے کسی قسم کا نقص اُن کے بیان کرنے میں نہ رہ جائے۔ یہ خوبی بھی قرآن کریم میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ اُس نے جس مضمون کو بھی لیا ہے ایسی عمدگی سے ادا کیا ہے کہ اُس میں کسی قسم کا نقص ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

غرض قرآن کریم مطالب مقصودہ کے بیان کرنے سے قاصر نہیں۔ جو مطلب اُس نے لیا ہے اُس پر سیر کن بحث ایسی زبان میں کر دی ہے کہ ہر پڑھنے والا اسے سمجھتا ہے اور ہر مضمون کو ایسا کھول دیا ہے کہ حد ہی کر دی ہے۔ یہ خوبیاں بظاہر معمولی ہیں لیکن قوموں کی اصلاح اور اُن کی بیداری کے لئے اتنی اہم ہیں کہ ان کے بغیر مقصد میں کامیابی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے زیادہ دنیا کی اصلاح کی ہے۔

باطنی گند سے پاکیزگی کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اُس کی تعلیم پاک ہو۔ کوئی خلافِ فطرت بات اس میں شامل نہ ہو۔ یہ امر بھی قرآن کریم میں انتہاء درجہ تک پایا جاتا ہے اور ہر شخص جو قرآنی تعلیم پر ادنیٰ سا بھی تدبّر کرے اُسے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں جو خلافِ فطرت ہو۔ دوسری کتابوں کو پڑھو تو اُن میں کئی ایسی باتیں آجاتی ہیں جو خلافِ فطرت ہوتی ہیں۔

پھر قرآن کریم کی ایک یہ بھی خوبی ہے کہ اُس میں ہر فطرت کے مطابق تعلیم پائی جاتی ہے۔ کسی قسم کا انسان ہو جب بھی قرآنی تعلیم اُس کے سامنے پیش کی جائے وہ اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے کئی قسم کے مادے رکھے ہیں کہیں غصے کا مادہ اُس میں پایا جاتا ہے، کہیں رحم کا مادہ اُس میں پایا جاتا ہے، اور یہ دونوں مادے اپنی اپنی جگہ پر نہایت اہم اور ضروری ہیں پس کامل کتاب وہی ہو سکتی ہے جو ہر قسم کی فطرت کو ملحوظ رکھ کر تعلیم دے۔ اگر وہ ہر فطرت کو ملحوظ نہیں رکھتی تو یہ لازمی بات ہے کہ سب انسانوں کی پیاس اُس کتاب سے نہیں بجھے گی اور جس فطرت کے خلاف اُس کتاب میں کوئی تعلیم پائی جائے گی وہ فطرت اُس سے بغاوت کرے گی۔

مثلاً وہ شخص جس کی طبیعت میں غصے کا مادہ زیادہ ہے جب وُہ انجیل میں پڑھتا ہے کہ اگر کوئی شخص تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے تو وہ ناک بھوں چڑھا کر کہتا ہے یہ بھی کوئی کتاب ہے یہ تو زنخوں کی کتاب ہے اِس پر کون عمل کر سکتا ہے۔ اس کے مقابل میں جب ایک رحم دل انسان بائیبل کی یہ تعلیم پڑھتا ہے کہ دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان تو وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے یہ خدا کی کتاب نہیں ہوسکتی جس میں اس قدر سخت دلی کی تعلیم دی گئی ہے۔ مگر قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس میں ہر فطرت کے تقاضا کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ سخاوت کا مضمون آتا ہے تو ایک سخی کا دل اُس سے تسلی پا کر اُٹھتا ہے۔ اگر اقتصادیات سے دلچسپی رکھنے والا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اپنے مال کو اس طرح نہیں لٹانا چاہیے کہ قوم کمزور ہو جائے تو وہ جب قرآن کریم میں پڑھتا ہے کہ مال بھی خدا تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے تو اقتصادی آدمی بھی تسلی پا کر اُٹھتا ہے اور وہ کہتا ہے ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تعلیم کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ کتابِ مکنون میں ہے یعنی گو اس کی ایک کاپی ظاہری کاغذوں پر لکھی جاتی ہے لیکن اس کی ایک نقل آسمانی کاتبوں نے انسانی دماغوں پر بھی لکھ دی ہے۔ فطرت انسانی جن چیزوں کا تقاضا کرتی ہے وہ سب قرآن میں ہیں اور قرآن جن چیزوں کا حکم دیتا ہے وہ سب انسانی فطرت میں موجود ہیں گویا اِس کی ایک کاپی انسانی دماغ پر لکھی ہوئی ہے اور ایک کاپی قرآن کریم کے اوراق پر لکھی ہوئی ہے۔ اِسی لئے جب کوئی شخص سمجھ کر اور عقل سے کام لے کر قرآن کریم پڑھتا ہے تو اُسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کہیں باہر سے حکم نہیں مل رہے بلکہ اُس کے دل کی آواز کو خوبصورت لفظوں میں پیش کیا جا رہا ہے گویا قرآن کریم کوئی نئی شریعت بیان نہیں کرتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گراموفون کی سوئی انسان کے دماغ پر رکھ دی گئی ہے اور وہ انسانی فطرت کی تحریروں کو لفظوں کی زبان میں بدل کر رکھتی جاتی ہے۔ کوئی حکم گراں نہیں گذرتا، کوئی تعلیم نامناسب معلوم نہیں ہوتی۔ کوئی لفظ طبیعت میں خلجان پیدا نہیں کرتا بلکہ ہر لفظ اور ہر حرف ایک حکیم ہستی کی طرف سے نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر مُطَهَّرَةً کے دونوں معنوں کے لحاظ سے یعنی صفائی کے لحاظ سے اور شرک سے پاک ہونے کے لحاظ سے ایک اور بھی لطیف مناسبت اِس آیت میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس سورۃ میں دو قوموں کا ذکر ہے۔ ایک اہل کتاب کا اور دوسرے مشرکین کا۔ اہل کتاب کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں اہل کتاب کی کتابوں کے نقائص دُور کئے گئے ہیں اور مشرکوں کے لحاظ سے اِس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس کتاب میں شرک کی بیخ کنی کر دی گئی ہے گویا ظاہری صفائی کے معنے اہل کتاب کے لحاظ سے ہیں اور باطنی صفائی

کے معنے مشرکوں کے لحاظ سے ہیں۔ پس دوسرے معنے اس کے اہل کتاب اور مشرکین کی نسبت سے ہیں اور وہ یہ کہ جس طرح اہل کتاب اور مشرکوں کی اصلاح کے لئے یہ کتاب آئی ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کے لئے اِس میں اُن کی کتب کو پاک وصاف کر کے بیان کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم جس طرح شرک سے پاک ہے اُس کی مثال دنیا کی اور کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی اور یہی اصلاح کا صحیح طریق ہے۔ حقیقی اصلاح کبھی بھی دوٹوک اعلان کے بغیر نہیں ہوا کرتی۔ یہ ایک عام فلسفیانہ مسئلہ ہے کہ جب کبھی نقص بڑھ جاتا ہے اس کے لیے ریڈیکل چینجز Radical changes یعنی غیر معمولی انقلاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ شرک کے خلاف غیر مصالحانہ رنگ جیسا قرآن کریم نے اختیار کیا ہے اور کسی کتاب نے اختیار نہیں کیا۔ وہ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا اسی وجہ سے دوسری سب اقوام شرک کے ازالہ میں ناکام رہی ہیں صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کے ماننے والے ہی شرک سے نہیں بچے بلکہ اُس کی تعلیم کے زور کی وجہ سے اُس کی ہمسایہ قومیں بھی شرک سے نفرت کا اظہار کرنے لگی ہیں عیسائیت کیسا مشرکانہ مذہب ہے لیکن اسلامی تعلیم کے اثر کے نیچے مشرک سے مشرک عیسائی بھی کہتا ہے کہ ہمارے مذہب میں کوئی شرک نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنے مذہب کو تو نہیں چھوڑتا مگر کم سے کم شرک کا لفظ اب اُسے بھیانک نظر آنے لگ گیا ہے اور وہ اتنا کہنے پر ضرور مجبور ہو گیا ہے کہ ہم مشرک نہیں ہیں۔ اسلام ہندوستان میں آیا تو اُس نے بتیس کروڑ دیوتا ماننے والے لوگوں کو برہموؤں اور آریہ سماج کی شکل میں تبدیل کر کے ایک خدا کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا پس حق یہی ہے کہ صُحُفِ مُطَهَّرَہ ہی اہل کتاب اور مشرکوں کی اصلاح کر سکتے تھے اور یہ اُنہی کا کام تھا کہ ایک طرف سابق نبیوں کی اُمتوں کو ان کی پاک شدہ تعلیم دے کر پاک کریں اور دوسری طرف غیر مصالحانہ انداز میں توحید کی تعلیم پیش کر کے شرک کو دُور کریں۔ پس قرآن کریم کا یہ دعویٰ بالکل سچ ہے کہ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ - رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ اہل کتاب اور مشرکین اپنے کفر سے باز آتے یہاں تک کہ ان کے پاس ایک روشن دلیل آجاتی کیسی روشن دلیل؟ اللہ کی طرف سے آنے والا ایک رسول جو ایک طرف تو اپنے عمل سے خدا تعالیٰ پر ایمان پیدا کرتا اور دوسری طرف ایسے صحیفے پڑھتا جو یہودیوں اور عیسائیوں اور دوسرے اہل کتاب کے سامنے اُن کی مسخ شدہ تعلیموں کو پاک کر کے رکھ دیتے اور تیسری طرف مشرکوں کے مشرکانہ عقیدوں کو سخت حملوں کے ساتھ کچل ڈالتا۔

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۴

جن میں قائم رہنے والے احکام ہوں۔

حلّ لُغات۔ قَیِّمَۃ قَیِّمَۃ ۔ قَیِّمٌ کے معنے متولّی کے ہوتے ہیں چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْقَیِّمُ عَلَی الْاَمْرِ مُتَوَلِّیْہِ یعنی جب یہ کہا جائے کہ فلاں کام پر فلاں شخص قَیِّم ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ اُس کا متولّی ہے۔ وَھِیَ قَیِّمَۃٌ اور اگر کوئی عورت متولّیہ ہو تو اُسے قَیِّمَۃٌ کہا جائے گا۔

وَالْقَیِّمَۃُ: اَلدِّیَانَۃُ الْمُسْتَقِیْمَۃُ ۔ اور قَیِّمَۃٌ کے ایک معنے ایسے مذہب کے بھی ہوتے ہیں جس میں کوئی کجی نہ پائی جاتی ہو۔ (اقرب)

قَیِّمَۃ کے معنے امام راغب کے نزدیک مفردات میں لکھا ہے دِیْنًا قَیِّمًا اَیْ ثَابِتًا مُقَوِّمًا لِاُمُوْرِ مَعَاشِھِمْ وَ مَعَادِھِمْ یعنی دِیْنِ قَیِّم کے معنے ہیں ثابت رہنے والا دین، غیر متزلزل دین جو لوگوں کی معاش اور اُن کی معاد کو ٹھیک کر دینے والا ہو۔ پھر کہتے ہیں یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ فَقَدْ اَشَارَ بِقَوْلِہٖ صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً اِلَی الْقُرْاٰنِ وَبِقَوْلِہٖ کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ اِلٰی مَا فِیْہِ مِنْ مَعَانِیْ کُتُبِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ مَجْمَعُ ثَمَرَۃِ کُتُبِ اللّٰہِ تَعَالَی الْمُتَقَدِّمَۃِ یعنی یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ اِن الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے اِس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ سابق الہامی کتب کے جس قدر مطالب ہیں وہ اس میں آ گئے ہیں کیونکہ قرآن کریم گذشتہ تمام الٰہی کتب کی تعلیمات کا مجموعہ ہے گویا فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ سب تعلیمیں جو گذشتہ انبیاء کے زمانہ میں نازل ہوئی تھیں اُن میں سے ایسی تعلیمیں جو قائم رہنے کی مستحق تھیں اور بنی نوع انسان کی معاش اور اُن کے معاد کو درست کرنے والی تھیں وہ ساری کی ساری تعلیمیں قرآن کریم میں آ گئی ہیں۔

تفسیر۔ قَیِّمَۃٌ کے معنے متولّی اور مستقیم کے بیان کئے جا چکے ہیں اُن معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

قرآن مجید میں کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ہونے سے مراد اوّل اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم میں ایسے احکام ہیں جو انسان کے متولّی ہیں۔ متولّی اُس کو کہا کرتے ہیں جو دوسرے کی اصلاح کرتا ہے، اُس کی نگرانی کا فرض ادا کرتا ہے، اُس کی حفاظت کرتا ہے اور اُس کی قوتوں کو صحیح کاموں پر صرف کرتا ہے۔ پس فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ کے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم میں ایسے احکام پائے جاتے ہیں جن سے بنی نوع انسان کو ہر قسم کی ذلّت اور خرابی اور نقص سے بچایا جاتا ہے۔ اُن کی صحیح تربیت کی جاتی ہے اور اُنہیں اپنے قویٰ کو بہتر سے بہتر طور پر استعمال کرنے کا

طریق بتایا جاتا ہے گویا فطرتِ انسانی کو ہر قسم کے نقص سے بچانے اور اپنی طاقتوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر ظاہر کرنے کا کام وہ سکھاتا ہے۔

(۲) اِسی طرح فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ ایسا مذہب پیش کرتا ہے جو ہر قسم کی کج رویوں اور خرابیوں سے پاک اور سیدھے راستے پر لے جانے والا ہے۔

(۳) اور فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ کے یہ بھی معنے ہوں گے کہ وہ انسان کی تمام ضرورتوں کو خواہ اِس دنیا سے تعلق رکھنے والی ہوں خواہ مرنے کے بعد کی زندگی سے تعلق رکھنے والی ہوں پورا کرتا ہے اور اس میں ایسی تعلیم پائی جاتی ہے جو بدلنے والی نہیں قائم رہنے والی اور ثابت رہنے والی تعلیم ہے۔ گویا صحفِ مطہرہ میں تو زیادہ زور پچھلی تعلیموں کی خرابیوں کو دور کرنے اور شرک سے بچانے پر تھا اور فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ میں اس بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ اس میں ایسی تعلیم ہے جو آئندہ دائمی طور پر انسان کے لئے ضروری ہوگی اور غیر متزلزل اور اور غیر متبدل ہوگی۔

مفردات راغب کے معنوں کے لحاظ سے فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ کے ایک یہ بھی معنے ہوں گے کہ اس میں وہ تمام تعلیمات آ گئی ہیں جو مستقل اور ہر زمانہ کے لئے تھیں اور پہلی کتب میں بیان ہو چکی ہیں۔ گویا گذشتہ تعلیموں میں سے جس قدر اچھی تعلیمیں تھیں وہ سب کی سب اس میں آ گئی ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا

اور (عجیب بات یہ ہے کہ) جن لوگوں کو (قرآن مجید جیسی مکمل) کتاب دی گئی ہے۔[1] وہ اس واضح دلیل

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنَةُ ؕ ۝۵

(یعنی رسول) کے آنے کے بعد ہی (مختلف گروہوں میں) تقسیم ہوئے ہیں۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی متفرق نہیں ہوئے مگر اُس وقت جب اُن کے

---

[1] نوٹ: تفسیر میں اِس آیت کی جو تشریح کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ اس سورۃ کی پہلی آیت میں جو یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اہل کتاب اور مشرک کبھی اپنے کفر کو چھوڑ کر توحید پر قائم نہ ہو سکتے تھے جب تک کہ اُن کے پاس آنحضرت صلعم مبعوث ہو کر نہ آ جاتے۔ اس دعویٰ کی دلیل میں اس آیت کو پیش کیا گیا ہے۔ یعنی بتایا گیا ہے کہ دیکھو آنحضرت صلعم کی بعثت کے بعد مشرکین اور اہل کتاب میں سے دو فریق ہو گئے۔ ایک گروہ تو اپنے کفر اور شرک کو چھوڑ کر توحید پر قائم ہو گیا اور ایک مخالف راہ اختیار کر کے پہلی حالت پر قائم رہا۔ گویا قرآن مجید جس مقصد کے لئے آیا تھا کہ ایک حصہ اہل کتاب اور مشرکین کا اس کے ذریعہ کفر سے نکل آئے وہ واقع ہو گیا۔

پاس بیّنہ آئی یعنی جب وہ رسول آ گیا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تب انہوں نے تفرقہ کیا یہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے مخاطب اہل کتاب کی یعنی قرآن کریم کے نازل ہونے کے وقت جو اہل کتاب دنیا میں موجود تھے اُن کی ایک عجیب حقیقت بیان کی ہے فرماتا ہے قرآن کریم آیا تو اس لئے تھا کہ اُن کو غلط رستوں اور غلط تعلیموں سے بچا کر ایک نقطہ پر لا کر جمع کردے مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ قرآن کریم کی تعلیم سے فائدہ اٹھاتے، اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرتے، اپنی کتابوں میں شامل ہو جانے والی غلط تعلیموں سے متنبہ ہو جاتے الٹا قرآن کریم کی مخالفت شروع کردی اور صداقت سے اَور بھی زیادہ بدکنے لگ گئے یعنی جب تک یہ تعلیم نہیں آئی اس وقت تک اگر یہ غلطی میں مبتلا رہے تو خیر معذور بھی سمجھے جا سکتے تھے جب اُنہیں سچائی مل گئی تھی تب تو انہیں صحیح راستے پر چل پڑنا چاہیے تھا مگر تعلیم آنے کے بعد یہ اور زیادہ سچائی کے مخالف ہو گئے۔ قرآن کریم سے پہلے تو یہ لوگ کہہ دیا کرتے تھے کہ الہام بھی ہوسکتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا مقرب بھی ہوسکتا ہے۔ نبی اور رسول بھی بن سکتا ہے مگر جب قرآن آیا تو اس بات پر زور دینے لگ گئے کہ موسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا حالانکہ پہلے یہودی خود زور دیا کرتے تھے کہ موسیٰؑ کی پیشگوئی کے مطابق ابھی ایک ایسا وجود آنے والا ہے جو آتشی شریعت اپنے ساتھ رکھتا ہوگا۔ یہی حال عیسائیوں کا تھا عیسائی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پہلی اور دوسری بعثت کے درمیانی عرصہ میں فارقلیط آئے گا۔ (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱ تا ۱۵۔ لوقا باب ۲۴ آیت ۴۹۔ Black's Bible Dictionary under the word "Paraclete") مگر جب وہ موعود آ گیا جس کی موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی پیشگوئیوں میں خبر دی گئی تھی تو انہوں نے کہہ دیا کہ کوئی فارقلیط نہیں آئے گا بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اِس انعام پر کہ اس نے گذشتہ انبیاء کی پیشگوئیوں کو پورا کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا صداقت اور ہدایت کے قریب آتے، جو صداقتیں پہلے مانتے تھے ان کو بھی انہوں نے چھوڑ دیا۔

بیّنہ آنے کے بعد اہل کتاب کے متفرق ہونے کا مطلب

ایسا ہی نقشہ موجودہ زمانہ میں نظر آ رہا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے قریب زمانہ میں مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی جو مدرسۂ دیوبند کے بانی تھے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے لکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد غیر تشریعی نبی آسکتا ہے (تحذیر الناس صفحہ ۳۴ از مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی) مگر جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہی بات پیش کرتے ہیں تو مولوی محمد قاسم صاحب کے شاگرد دیوبندی علماء کہتے ہیں کوئی نبی نہیں آسکتا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کے بعد دروازہ نبوت کلیۃً مسدود ہو چکا ہے اب نہ شرعی نبی آ سکتا ہے نہ غیر شرعی نبی آ سکتا ہے۔ غرض اُنہی کے شاگرد اور انہی کے مدرسہ میں پڑھے ہوئے ان باتوں کا انکار کرنے لگ جاتے ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمائیں اور جن کی تصدیق خود ان کی اپنی کتب سے ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعویٰ سے پہلے بڑے بڑے مولوی منبروں پر کھڑے ہو کر ایسے اشعار پڑھا کرتے تھے جن میں یہ ذکر ہوتا تھا کہ عیسیٰؑ بھی مر چکا اور موسیٰؑ بھی۔ مگر جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وفاتِ مسیحؑ کا مسئلہ پیش کیا تو تمام علماء کو اپنی باتیں بھول گئیں اور وہ یہ شور مچانے لگ گئے کہ عیسیٰ زندہ ہے عیسیٰ زندہ ہے۔

اسی طرح یا تو ایک زمانہ میں سارے مسلمانوں کی غفلت اور ان کی سستی کا اصل باعث یہ تھا کہ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور تمام کفار کے اموال لوٹ کر ہمارے سپرد کر دیں گے اور ہم بڑے آرام سے زندگی بسر کریں گے اور اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی مسیح موعود ہوں اور میں ہی وہ مامور ہوں جس کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی تو مسلمانوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ کسی عیسیٰ اور مسیح نے نہیں آنا قرآن میں تو اِس قسم کی کوئی خبر ہی نہیں اور اگر حدیثیں کہتی ہیں تو وہ غلط ہیں۔ غرض یا تو پہلے تمام قوم کی بنیاد ہی اس امر پر تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور ہمارے گھروں کو زر و جواہر سے بھر دیں گے اور یا آج یہ حالت ہے کہ وہ اُن تمام پیشگوئیوں سے منکر ہو گئے ہیں جو مسیح موعود کے متعلق پائی جاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں کسی مسیح کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ چاہیے تھا کہ قرآن کریم کے نازل ہونے پر وہ اُن تعلیموں پر غور کرتے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ جتنا حق وہ پہلے مانتے تھے اُس کو بھی انہوں نے چھوڑ دیا اور صداقت سے اور بھی دُور چلے گئے۔

وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ۬

حالانکہ (جولوگ ایمان نہیں لائے) انہیں (اس رسول کے ذریعہ بس) یہ ہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ اطاعت صرف

حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ

اُسی کے لئے رہ جائے (اس حال میں کہ) وہ اپنے نیک میلانوں میں ثابت قدم رہنے والے ہوں اور (پھر صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ)

وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ [1] ؕ۝۵

نماز باجماعت ادا کرتے رہیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی (ہمیشہ صداقت پر) قائم رہنے والی جماعت کا دین ہے۔

حلّ لُغات۔ مُخْلِصِيْنَ مُخْلِصِيْنَ: اَخْلَصَ سے اسم فاعل کا جمع کا صیغہ ہے اور اَخْلَصَ خَلَصَ سے باب اِفْعَال ہے۔ خَلَصَ الشَّیْءُ خُلُوْصًا وَ خَلَاصًا کے معنے ہیں صَارَ خَالِصًا کوئی شے خالص ہوگئی۔ خالص کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جس میں کوئی غیر چیز ملی ہوئی نہ ہو اور جب خَلَصَ مِنَ التَّلَفِ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں نَجَا بچ گیا وَسَلِمَ اور سلامت رہا اور خَلَصَ الْمَاءُ مِنَ الْكَدَرِ کے معنے ہوتے ہیں صَفَا پانی گدلے پن سے بچ گیا مگر یہ یادرکھنا چاہیے کہ یہاں صَفَا کے جو معنے ہیں وہ حقیقی نہیں یعنی جب خَلَصَ الْمَاءُ مِنَ الْكَدَرِ کہتے ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ کدر کو اس سے دور کر دیا گیا بلکہ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ پانی میں کدر آیا ہی نہیں اور خَلَصَ اِلَيْهِ وَ بِهِ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں وَصَلَ وہ چیز اس تک پہنچ گئی۔ یعنی جب یہ کہیں کہ خَلَصَ فَلَانٌ اِلَيْهِ یا خَلَصَ فُلَانٌ بِهٖ تو دونوں کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ پہنچ گیا۔ انہی معنوں میں عربی زبان کا یہ فقرہ ہے کہ خَلَصْتُ بِمُسْتَوِیْ مِنَ الْاَرْضِ میں صاف میدان میں پہنچ گیا (اقرب) اسی طرح اَخْلَصَ السَّمْنَ کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَ خُلَاصَتَهٗ گھی کا خالص حصہ الگ کرلیا اور اَخْلَصَ فِی الطَّاعَةِ کے معنے ہوتے ہیں تَرَكَ الرِّيَاءَ اُس نے ریاء چھوڑ دیا۔ اور اَخْلَصَ لَهُ النَّصِيْحَةَ وَالْحُبَّ کے معنے ہوتے ہیں خَلَّصَهُمَا عَنِ الْغِشِّ۔ اُس نے نصیحت اور محبت میں کسی قسم کا فریب یا کھوٹ نہیں رکھا اور اَخْلَصَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں اِخْتَارَهٗ اس کو چُن لیا (اقرب)

---

[1] ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ میں الْقَيِّمَةِ کا جو حرف محذوف ہے یعنی اَلْمِلَّةُ الْقَيِّمَةُ یعنی قائم رہنے والی جماعت چونکہ محذوف کو ظاہر کئے بغیر ترجمہ درست نہ ہوتا تھا اس لئے محذوف کو ظاہر کر دیا گیا۔

مفردات والے لکھتے ہیں اَلْخَالِصُ کَالصَّافِیْ۔ خالص کے معنے بھی وہی ہوتے ہیں جو صافی کے ہوتے ہیں اِلَّا اَنَّ الْخَالِصَ ھُوَ مَا زَالَ عَنْہُ شَوْبُہٗ بَعْدَ اَنْ کَانَ فِیْہِ ہاں خالص اور صافی میں یہ فرق ہے کہ خالص اُس کو کہتے ہیں جس میں سے ملاوٹ کو الگ کر لیا گیا ہو بَعْدَ اَنْ کَانَ فِیْہِ ایسی حالت میں جب کہ اُس کے اندر پہلے ملاوٹ موجود ہو۔ وَالصَّافِیْ قَدْ یُقَالُ لِمَا لَا شَوْبَ فِیْہِ اور صافی دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اُس کے لئے بھی جس میں پہلے ملاوٹ تھی اور پھر اسے نکال دیا گیا اور اس کے لئے بھی جس میں ملاوٹ کبھی ہوئی ہی نہیں پھر لکھتے ہیں کہ یہ جو قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ اس کا مطلب ہے اِخْلَاصُ الْمُسْلِمِیْنَ اَنَّھُمْ قَدْ تَبَرَّءُوْا مِمَّا یَدَّعِیْہِ الْیَھُوْدُ مِنَ التَّشْبِیْہِ وَ النَّصَارٰی مِنَ التَّثْلِیْثِ۔ ہم ہر شرک اور تشبیہ سے بچے ہوئے ہیں نہ شرک جلی کرتے ہیں اور نہ شرکِ خفی اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ اس کے معنے بھی یہی ہیں جو نَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ کے ہیں اور آیت اِنَّہٗ کَانَ مُخْلَصًا الخ میں اِخْلَاص کا مطلب ہے اَلتَّبَرِّیْ عَنْ کُلِّ مَا دُوْنَ اللہِ تَعَالٰی یعنی کامل توحید کے سوا ہر چیز سے جب انسان تبرّی کر لے اور کہے کہ میں اُس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تو وہ مخلص کہلاتا ہے۔ (مفردات)

اَلدِّیْنُ اَلدِّیْنُ: دَانَ کا مصدر ہے اور دَانَ (یَدِیْنُ دِیْناً وَ دَیَانَۃً) الرَّجُلُ کے معنے ہیں عَزَّ۔ وہ عزت پا گیا اور دَانَ الرَّجُلُ کے یہ بھی معنے ہیں کہ ذَلَّ وہ ذلیل ہو گیا یا ماتحت ہو گیا اور دَانَ کے معنے اَطَاعَ کے بھی ہیں اور عَصٰی کے بھی ہیں گویا یہ حروفِ اضداد میں سے ہے یعنی اُلٹ معنے بھی اس میں پائے جاتے ہیں اس کے معنے اطاعت کے بھی ہیں اور اس کے معنے نافرمانی کے بھی ہیں۔ جس طرح اس کے معنے عزت کے بھی ہیں اور ذلت کے بھی یا بڑے کے بھی ہیں اور چھوٹے کے بھی۔ اسی طرح اس کے ایک معنے اطاعت کے بھی ہیں اور نافرمانی کے بھی اور دَانَ کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ اِعْتَادَ وہ عادی ہو گیا۔ یہاں بھی اس کے معنے اپنے اندر اضداد کا رنگ رکھتے ہیں یعنی اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ اِعْتَادَ خَیْرًا وہ خیر کا عادی ہو گیا اور اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ اِعْتَادَ شَرًّا وہ شر کا عادی ہو گا۔ اور دَانَ کے معنے بیمار ہو جانے کے بھی ہیں چنانچہ لُغت میں اس کے ایک معنے یہ لکھے ہیں کہ اَصَابَہُ الدَّاءُ اُسے بیماری لگ گئی اور دَانَ فُلَانٌ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں خَدَمَہٗ اُس کی خدمت کی یعنی دوسرے کا خادم بن گیا اور دَانَ فُلَانٌ کے معنے اَحْسَنَ اِلَیْہِ کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس پر احسان کیا اور دَانَ فُلَانٌ کے معنے مَلِکَہٗ کے بھی ہیں یعنی اُس کا مالک ہو گیا اور دَانَ کے معنے حَمَلَہٗ عَلٰی مَا یَکْرَہُ کے بھی ہوتے ہیں یعنی جس چیز کو وہ پسند نہیں کرتا اُس پر اسے مجبور کیا اور دَانَ فُلَانٌ کے معنے اِسْتَعْبَدَہٗ کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس کو غلام بنا لیا اور یہ بھی

معنے ہیں کہ حَکَمَ عَلَیْہِ اُس پر حکم چلایا اور دَانَ فُلَانٌ کے معنے اَذَلَّہٗ کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس کو اپنے ماتحت کر لیا چنانچہ حدیث میں آتا ہے اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ۔ ہوشیار وہ ہے جس نے اپنے نفس کو تابع کر لیا اور موت کے بعد کے زمانہ کے لئے عمل کیا (اقرب)

ان معنوں کے بعد اب میں یہ بتاتا ہوں کہ دِیْنٌ جو مصدر ہے اس کے اُوپر کے مصدری معنوں کے علاوہ اور کیا معنے ہیں

لُغت میں دِیْنٌ کے کئی معنے لکھے ہیں جو نیچے درج کئے جاتے ہیں

(۱) اَلْجَزَاءُ وَالْمُکَافَأَۃُ۔ بدلہ (۲) اَلطَّاعَۃُ۔ اطاعت اور فرمانبرداری (۳) اَلْحِسَابُ۔ محاسبہ کرنا (۴) اَلْقُھْرُ وَالْغَلَبَۃُ وَ الْاِسْتِعْلَاءُ۔ یہ تینوں الفاظ عربی زبان میں غلبہ کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان تینوں میں بہت تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ (۵) اَلسُّلْطَانُ وَ الْمُلْکُ وَ الْحُکْمُ۔ بادشاہت اور حکومت۔ (۶) اَلسِّیْرَۃُ۔ طبیعت (۷) اَلتَّدْبِیْرُ۔ تدبیر کرنا۔ (۸) اِسْمٌ لِجَمِیْعِ مَا یُعْبَدُ بِہٖ اللہُ۔ دین نام ہے ان تمام طریقوں کا جن کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں نماز پڑھنا یا حج بیت اللہ کے لئے جانا اللہ تعالیٰ کی عبادت سمجھا جاتا ہے یہ طریق عبادت عربی زبان کے لحاظ سے دین کہلائے گا اسی طرح ہندوؤں کے طریق عبادت کی جو بھی شکل ہو وہ دین کہلائے گی عیسائیوں کے طریق عبادت کی جو بھی شکل ہو وہ دین کہلائے گی یہودیوں اور زرتشتیوں وغیرہ کے طریق عبادت کی جو بھی شکل ہو وہ دین کہلائے گی۔ گویا عبادتِ الٰہی خواہ کسی طریق سے کی جائے اُس کا نام دین ہوتا ہے۔ (۹) اَلْمِلَّۃُ۔ طریقہ (۱۰) اَلْوَرَعُ۔ بزرگانہ اعمال جن سے روحانیت کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ (۱۱) اَلْحَالُ۔ حال (۱۲) اَلْقَضَاءُ۔ فیصلہ (۱۳) اَلْعَادَۃُ۔ عادت (۱۴) اَلشَّأْنُ۔ اس کے معنے بھی حالت کے ہی ہوتے ہیں مگر اچھی حالت کے (اقرب)۔ قرآن کریم میں بھی شَأن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (الرحمٰن: ۳۰) کہ ہر روز اللہ تعالیٰ ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔

حُنَفَآءَ حُنَفَآءَ: حَنِیْفٌ کی جمع ہے جو حَنَفَ سے صفت مشبہ ہے اور حَنَفَ الشَّیْءُ حَنَفًا کے معنے ہوتے ہیں مَالَ کوئی چیز اپنی جگہ سے جُھک گئی اور حَنِیْفٌ کے معنے ہیں اَلصَّحِیْحُ الْمَیْلِ اِلَی الْاِسْلَامِ، الثَّابِتُ عَلَیْہِ۔ خدا تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرادری کی طرف سچا ذوق اور اُس پر ثابت قدمی گویا اس کے صرف اتنے معنے نہیں کہ انسان کے اندر نیکی کی طرف میلان پایا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اُسے نیکی پر ثبات حاصل ہو اور اُس کے اندر استقلال کا مادہ پایا جاتا ہو۔ محاورہ میں کُلُّ مَنْ کَانَ عَلٰی دِیْنِ اِبْرَاھِیْمَ کے معنوں میں حنیف کا لفظ استعمال

ہوتا ہے یعنی ہر وہ شخص جو دینِ ابراہیم پر ہو محاورہ میں اُسے حنیف کہا جاتا ہے اور حماسی کا قول ہے کہ اَلْحَنِیْفُ اَلْمَائِلُ عَنْ دِیْنٍ اِلٰی دِیْنٍ۔ یعنی ایک دین سے دوسرے دین کی طرف جو شخص مائل ہو اُسے حنیف کہتے ہیں وَاَصْلُہٗ مِنَ الْحَنَفِ فِی الرِّجْلِ اور اصل میں وہ کجی جو کسی بیماری یا چوٹ کے نتیجہ میں بعض دفعہ انسانی پاؤں میں واقعہ ہو جاتی ہے اُس پر یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے مگر پھر اسی بناء پر جو شخص اپنے جدّی دین کو بدلنے کی طرف مائل ہو جائے اُسے بھی حنیف کہہ دیا جاتا ہے وَفِی الْکُلِّیَّاتِ فِیْ کُلِّ مَوْ ضِعٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ الْحَنِیْفُ مَعَ الْمُسْلِمِ فَھُوَ الْحَآجُّ نَحْوُ وَلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا۔ کلیاتِ ابوالبقاء میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی حنیف کا لفظ مسلم کے لفظ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے وہاں اس کے معنے حاجی کے ہوتے ہیں جیسے کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا کے یہ معنے ہیں کہ کَانَ حَآجًّا مُّسْلِمًا وہ حج کرنے والا مسلم تھا۔ وَ فِیْ کُلِّ مَوْ ضِعٍ ذُکِرَ وَحْدَہٗ فَھُوَ الْمُسْلِمُ نَحْوُ حَنِیْفًا لِلّٰہِ اور ہر موقع پر جہاں اکیلا یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے وہاں اس کے معنے مسلم کے ہوتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے حَنِیْفًا لِلّٰہِ یعنی مُسْلِمًا لِلّٰہِ پھر لکھا ہے وَالْحَنِیْفُ اَیْضًا : اَلْمُسْتَقِیْمُ یعنی حنیف کے ایک معنے سیدھے راستہ پر چلنے والے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)

حنیف کے معنے ابوالبقاء کے نزدیک کلیات نے جو یہ معنے کئے ہیں کہ جہاں حنیف کا لفظ مسلم کے ساتھ استعمال ہو وہاں اس کے معنے حاجی کے ہوتے ہیں یہ محض زبردستی ہے۔ جہاں تک میں نے آیات قرآنیہ پر غور کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ قرآنی محاورہ کے مطابق حنیف اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو سارے نبیوں کو ماننے والا ہو اور شرک کا کسی رنگ میں بھی ارتکاب کرنے والا نہ ہو۔ قرآن کریم کے الفاظ پر غور کرنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِن دو معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی اُس شخص کو بھی حنیف کہا گیا ہے جو سب انبیاء پر ایمان رکھتا ہو اور اس شخص کو بھی حنیف کہا گیا ہے جو شرک سے کامل طور پر مجتنب ہو۔ گویا حُنَفَآءَ وہ ہیں جو سارے نبیوں کو ماننے والے اور کسی سچائی کا انکار کرنے والے نہ ہوں اور مشرک نہ ہوں ان میں سے ایک معنے مثبت کے لحاظ سے ہیں اور ایک معنے منفی کے لحاظ سے۔ سارے نبیوں کو ماننا مثبت پہلو ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات اور اُس کے صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانا یہ منفی پہلو ہے غرض میرے نزدیک قرآن کریم میں جہاں کَانَ حَنِیْفًا مُسْلِمًا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہاں حنیف کا لفظ حاجی کے معنوں میں نہیں بلکہ تمام انبیاء پر ایمان رکھنے والے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور مسلم کا لفظ اعمالِ صحیحہ کو بجالانے والے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے درحقیقت قرآن کریم پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں اسلام کا لفظ دو معنوں کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے اسلام بمعنے ایمان ظاہر بھی اور اسلام

بمعنے اعمالِ صحیحہ بھی۔ پس قرآن کریم میں جہاں حنیف اور مسلم کے الفاظ اکٹھے استعمال ہوئے ہیں وہاں میرے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں کہ عقیدہ میں بھی راسخ اور عمل میں بھی کامل۔ گویا ساری صداقتوں کو ماننے والا اور پھر تمام نیک باتوں پر عمل کرنے والا۔

تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ۔ اور اُن کو کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ۔ دین کو اُسی کے لئے خالص کرتے ہوئے دین کے ایک معنے جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے اطاعت کے ہوتے ہیں اور یہاں علاوہ دوسرے معنوں کے جن کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی ایک یہ معنے بھی چسپاں ہوتے ہیں کہ وہ اپنی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کے لئے ہی خالص کر دیں یعنی اُن کے پیر، ان کے پنڈت، ان کے پادری، ان کے کاہن، ان کے راہب اور اُن کے بڑے بڑے عالم اُن سے اپنی غلامی کرا رہے تھے اور اس طرح دنیا میں انسانیت کی انتہائی تذلیل ہو رہی تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر یہ نہیں کیا کہ انہیں اپنی غلامی کی طرف بلایا ہو یا کہا ہو کہ اپنے پنڈتوں اور پادریوں اور مولویوں کو چھوڑ کر تم میرے غلام بن جاؤ بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صرف اتنا کہا کہ تم اِن غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر خالص اللہ تعالیٰ کے غلام بن جاؤ۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر ان کو غصہ آتا یا اُن کی طبائع میں اشتعال پیدا ہو جاتا۔ اُنہی کی بہبودی کے لئے محبت اور پیار کے ساتھ ان کے سامنے ایک بات پیش کی گئی تھی مگر بجائے اس کے کہ وہ اس پر غور کرتے اور اپنے اندر نیک تغیر پیدا کرتے انہیں غصہ آ گیا اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کی تدابیر سے کام لینے لگ گئے۔ دنیا میں جب کوئی شخص کسی کے فائدہ کی بات کہتا ہے تو دوسرا ممنون احسان ہوتا ہے کہ میں غلطی میں مبتلا تھا مگر فلاں نے مجھے آگاہ کر کے ہلاکت سے بچا لیا۔ مگر ان نادانوں کی یہ حالت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آ کر کہا کہ آؤ میں تمہیں اس غلامی سے نجات دُوں جس کا تم مدّتوں سے شکار ہو چکے ہو۔ وہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ جو تم نے بنائے ہوئے ہیں اُن سے تمہارے جسموں اور روحوں کو آزاد کراؤں تم اپنے پیروں کو سجدہ کرتے ہو، تم اُن کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہو، تم اُن کو اپنی حاجات کا پورا کرنے والا سمجھتے ہو اور اس طرح نہ صرف انسانیت کے شرف اور اُس کی عظمت کو بٹّہ لگاتے ہو۔ بلکہ اس خدا کی بھی توہین کرتے ہو۔ جو تمہارا خالق اور مالک ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس لئے مبعوث فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس غلامی سے نجات دوں اور تمہیں خالص اللہ تعالیٰ کا غلام بنا دوں تو بجائے اس کے کہ وہ اس نصیحت سے فائدہ اٹھاتے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ڈنڈے لے کر کھڑے ہو گئے کہ تم ہمارے دین کو خراب کرتے ہو۔

وَ مَآ اُمِرُوْٓا کے معنے بعض نے یہ کئے ہیں کہ ان لوگوں کی کتب میں ہی حکم دیا گیا تھا مگر اس جگہ یہ معنے چسپاں نہیں ہوتے اِن الفاظ سے اس جگہ یہ مراد ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم پیش کی اُس میں سوائے اس کے کیا حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور خالص اُسی کی اطاعت کرو اور اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی غلامی کو ترک کر دو۔ کیا یہ حکم ایسا تھا کہ وُہ بُرا مناتے یا ایسا تھا کہ وہ اس پر خوش ہوتے اور دوڑتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو جاتے؟ اس حکم کے ذریعہ عیسائیوں کو اپنے پادریوں سے آزادی حاصل ہو رہی تھی، یہودیوں کو اپنے رہبانوں سے آزادی حاصل ہو رہی تھی اور مشرکین کو اپنے کاہنوں سے آزادی حاصل ہو رہی تھی مگر بجائے اس کے کہ وہ خوش ہوتے اُلٹا ناراض ہو گئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو کچلنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

نبوت کی ضرورت درحقیقت اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبوت کی ضرورت بتائی ہے کہ جب تمہارے عقلی اور ذہنی قویٰ میں اس درجہ انحطاط رُونما ہو چکا ہے کہ تم یہ بھی سمجھ نہیں سکتے کہ تمہارا اپنا فائدہ کس بات میں ہے تو اگر ایسی گری ہوئی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری اصلاح کے لئے کوئی نبی نہیں آئے گا تو کب آئے گا؟ نبی آنے کا وہی وقت ہوتا ہے جب قومی تنزّل اِس قدر بڑھ چکا ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کو برے بھلے کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم:۴۲) کی کیفیت دنیا میں پورے طور پر رونما ہو جاتی ہے اور روحانی اور اخلاقی قوتیں بالکل مردہ ہو جاتی ہیں۔ مگر باوجود اس قدر تنزل اور ادبار کے وہ سمجھتے یہ ہیں کہ ہمیں کسی مصلح کی ضرورت نہیں۔ پس فرماتا ہے جب تمہاری حالت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگر تمہارے فائدہ کی بھی کوئی بات کرتے ہیں تو تم اُن سے لڑنے لگ جاتے ہو۔ تو یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نبی کے آنے کی اشد ضرورت ہے اگر اب بھی نبی نہ آتا تو تم لوگ بالکل تباہ ہو جاتے۔ پس وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ اُنہیں سوائے اس کے کیا حکم دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے دین کو خالص کرو۔ یعنی اس سے پہلے یہ اقوام رہبان اور کہّان اور اَساقف کی غلامی کر رہی تھیں، امراء کی فرمانبرداری میں جانیں گنوا رہی تھیں۔ اسلام نے آکر انہیں نجات دی مگر بجائے شکرگزار ہونے کے اور دُور چلے گئے اور اپنے محسن سے لڑنا شروع کر دیا۔

اب میں تفصیل کے ساتھ ان معنوں کے لحاظ سے جن کو اُوپر بیان کیا گیا ہے اِس آیت کا الگ الگ مفہوم بیان کرتا ہوں۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کا مطلب مختلف معانی کے مطابق جو لُغت میں بتائے گئے ہیں یہ ہوا کہ اُنہیں صرف یہ

حکم دیا گیا تھا کہ

اوّل۔ اطاعت اللہ تعالیٰ کی کریں (کیونکہ دِیْن کے ایک معنے اطاعت کے بھی ہیں) دوسروں کی اطاعت کا اِس میں کوئی شائبہ نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی اطاعت جائز نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کے پہلے معنے خدا تعالیٰ کی اطاعت خدا تعالیٰ کی خاطر کرنا

(الف) خدا تعالیٰ کی اطاعت بندوں کی خاطر نہ کریں بلکہ خدا تعالیٰ کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کر دیں یعنی وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت خدا ہی کی خاطر کریں بندوں کی خاطر نہ کریں۔ دُنیا میں بہت لوگ ایسے ہیں جن کی اطاعتِ الٰہی محض لوگوں کے ڈر سے ہوتی ہے۔ وہ احکام الٰہی پر اس لئے عمل نہیں کرتے کہ خدا یوں فرماتا ہے بلکہ اس لئے اُن پر عمل کرتے ہیں کہ اُن کی قوم یا رسم و رواج اس کا مطالبہ کرتا ہے مثلاً عیسائی گرجے جاتا ہے اِس لئے نہیں کہ خدا نے حکم دیا ہے بلکہ اس لئے کہ اگر وہ گرجے میں نہ جائے تو اُس کی قوم برا مناتی ہے یا اگر یہودی اپنی عبادت گاہ میں جاتا ہے یا ہندو مندر میں جاتا ہے یا مسلمان مسجد میں جاتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُس کا عبادت گاہ میں جانا یا مندر میں جانا یا مسجد میں جانا اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ خدا کا حکم ہے عبادت کرو بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ اُس کی قوم اُس سے یہ امید رکھتی ہے۔ اِسی طرح بہت سے احکام پر انسان رواجاً عمل کرتا ہے یا اپنی نفسانی خواہش کے مطابق عمل کرتا ہے مثلاً خدا نے کہا ہے کمزور پر رحم کرو اور اپنے ساتھ تعاون کرنے والے کو نیک بدلہ دو۔ یہ دونوں حکم ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں اور ان دونوں حکموں کے ماتحت بچوں سے نیک سلوک اور بیویوں سے حُسنِ معاملت یا دوستوں کے ساتھ نیک معاملہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مگر کتنے لوگ ہیں جو اس لئے اپنے دوست کے ساتھ نیک معاملہ کرتے ہیں یا بچوں کی تربیت کرتے ہیں۔ یا عورتوں سے حسنِ معاملہ کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے اکثر لوگ یا تو طبعی جذبات کے ماتحت ایسا کرتے ہیں یا دوسرے لوگوں کی نیک رائے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اسی طرح غریبوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے۔ یا یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے یہ ہر مذہب میں ہے مگر کتنے عیسائی یا یہودی یا ہندو یا آج کل کے مسلمان ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ایسا کرتے ہیں اکثر ایسے ہی ہیں جو لوگوں میں نیک نامی حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں جب تک انسان اس مرض میں مبتلا ہوتا اور جتنا جتنا حصہ اس مرض میں مبتلا رہتا ہے اُس وقت تک اور اُسی حد تک اُس کا دین ناقص ہوتا ہے کیونکہ اُس کا دل روز مرہ کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کی طرف جھکا رہتا ہے اور وہ حقیقی محبت جو انابت الی اللہ سے پیدا ہوتی ہے اُس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی اور پھر وہ سمجھے نہ سمجھے،

مانے نہ مانے مشرک بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کا حصّہ لوگوں کو دیتا ہے۔ اِسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے منہ میں بھی ایک لقمہ اِیْمَانًا وَاِحْتِسَابًا ڈالتا ہے تو وہ لقمہ ڈالنا خدا تعالیٰ کی کتاب میں اُس کے لئے صدقہ کے طور پر لکھا جاتا ہے (بخاری کتاب النفقات باب فضل النفقة علی الاھل) بیوی الگ خوش ہوگئی، اُس کی محبت کا جذبہ الگ پورا ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کے رجسٹر میں اُس کا نام نیک اعمال بجالانے والوں میں الگ لکھا گیا۔ یہی اصل تمام دوسرے کاموں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ اسلام دین کو دنیا پر مقدّم کرنے کا حکم دیتا ہے خدا ہی کا ہوجانے کی تعلیم دیتا ہے لیکن اکثر لوگ دنیوی کام کرنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں پھر یہ حکم کس طرح پورا ہوسکتا تھا؟ اُسی طریق سے جس کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُوپر کے حکم میں اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی اپنے دنیوی کاموں کو بھی خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق اور اُس کی خوشنودی کے لئے کرے۔ اِس طرح اس کا ہر کام عبادت بن جائے گا اور جبکہ وہ ظاہر میں دنیا کا کام کرتا ہوا نظر آئے گا اس کا ہر کام عبادت ہو جائے گا یہی نکتہ تصوف کی جان ہے اور تصوف کی بنیاد کلّی طور پر اسی نکتہ پر کھڑی ہے اس پر عمل کر کے انسان روحانیت کی اعلیٰ منازل کو آسانی سے طے کرسکتا ہے اور لحظہ بہ لحظہ خدا تعالیٰ کے قرب میں ترقی کرسکتا ہے۔

بندوں کی اطاعت خدا تعالیٰ کی خاطر کرنا

(باء) دوسرا مفہوم اِن معنوں کے رو سے اس کا یہ ہے کہ بندوں کی اطاعت خدا تعالیٰ کے لئے کریں۔ پہلا مفہوم تو یہ تھا کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت بندوں کی خاطر نہ کریں اور دوسرا مفہوم یہ بنے گا کہ بندوں کی اطاعت خدا تعالیٰ کے لئے کریں پہلے معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ تھا کہ مُخْلِصِيْنَ لِلّٰهِ اِطَاعَةَ اللّٰهِ۔ اور دوسرے پہلو کے لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ مُخْلِصِيْنَ لِلّٰهِ اِطَاعَةَ الْعِبَادِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کی اطاعت ہر صورت میں ناجائز نہیں کی بلکہ بعض دفعہ خود حکم دیا ہے کہ اُن کی اطاعت کرو جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء:۶۰) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور اُولی الامر کی اطاعت کرو پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا رسول اور اولی الامر کی اطاعت بھی ضروری قرار دی گئی ہے لیکن شرط یہ رکھی ہے کہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ جب تم بندوں کی اطاعت کرو تو خدا کی وجہ سے کرو یعنی مومنوں کے لئے ضروری ہے کہ اُسی حد تک اور اُسی شخص یا اُسی قوم کی اطاعت کریں جس حد تک اور جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے جب لوگوں نے ٹیکس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا قیصر کی چیز قیصر کو دو اور خدا تعالیٰ کی چیز خدا تعالیٰ کو دو (مرقس باب ۱۲ آیت ۱۷)۔ اِس کا یہی مطلب تھا کہ خدا تعالیٰ کی خالص اطاعت کے

یہ معنے نہیں کہ دوسرے کسی کی اطاعت جائز نہیں بلکہ جس حد تک اور جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اُس حد تک اور اُس شخص کی اطاعت کرنا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایسا کیا جائے تو خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت کہلاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت کو خالص کرنے کے معنے یہ ہیں کہ انسان جب خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے تو بندوں کی خاطر نہ کرے اور جب بندوں کی اطاعت کرے تو خدا تعالیٰ کی خاطر کرے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ انگریزوں کے مطیع تھے حالانکہ آپ جس حد تک بھی انگریزی حکومت کی اطاعت کرتے تھے اسلام کی اور خدا تعالیٰ کی تعلیم کے ماتحت کرتے تھے اس لئے انگریز کی اطاعت میں آپ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حاکمِ وقت کی اطاعت کا حکم دیا ہے یا اُس کے ملک سے نکل جانے کا۔ اس لئے اگر آپ ایسا نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکلنے والے قرار پاتے۔ مگر جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے کہ انگریز کی اطاعت جائز نہیں پھر انگریزوں کے ملک میں رہتے ہیں اور اُن کے قانون کی پابندی کرتے ہیں اُن کا ایک ایک منٹ گناہ میں گذر رہا ہے۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ انگریز کی اطاعت جائز نہیں پھر انگریز کی اطاعت کرتے ہیں حالانکہ اگر اُن کا عقیدہ صحیح ہے تو انہیں انگریزوں کی حکومت سے فوراً باہر نکل جانا چاہیے تھا۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے دوسرے معنے کہ غلبہ اور استعلاء ملنے کے بعد اس کو اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیں

(۲) دوسرے معنے دِیْن کے جو اس جگہ لگتے ہیں قہر اور غلبہ اور استعلاء کے ہیں اِن معنوں کے رُو سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مخاطبین رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صرف اتنا مطالبہ کیا گیا تھا کہ جب غلبہ اور استعلاء تم کو ملے تو اس غلبہ اور استعلاء کو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے وقف کر دیا کرو کیونکہ غلبہ اور استعلاء اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ١ٞ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ١ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ١ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اٰل عمران: ۲۷)

یعنی جب غلبہ اور استعلاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے تو اُسے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خرچ کرنا چاہیے نہ کہ اپنے نفس کی بڑائی اور تکبر اور ظلم اور دوسروں کو اپنی غلامی میں لانے کے لئے۔ اِسی حکم کے نہ سمجھنے اور نہ ماننے کی وجہ سے تمام سیاسی نظام تباہ ہوتے ہیں۔ لوگ غلبہ کے وقت خدا تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور غلبہ دینے کی غرض کو بھول کر بندوں کو بھی بھول جاتے ہیں اور اُن پر ظلم کرنے لگ جاتے ہیں۔ جب کبھی کوئی قوم دنیا پر غالب ہوئی اُس نے خدا تعالیٰ کو بھلا دیا اور اُس کے بندوں کے حقوق کو بھی جنہیں ادا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اُسے غلبہ دیا تھا بھلا دیا

مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ بادشاہت کے بعد بھی کبھی اپنے آپ کو بادشاہ نہیں سمجھا اور کسی کو بادشاہ نہیں کہنے دیا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا بندہ اپنے آپ کو غلبہ سے پہلے سمجھتے تھے اسی طرح غلبہ کے ملنے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہی سمجھتے رہے وہی نمازیں رہیں، وہی روزے رہے، وہی ذکر الٰہی رہا بلکہ اگر کوئی فرق پڑا تو یہی کہ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ جب دنیوی جنگوں اور لڑائیوں میں کمی آئے تو خدا تعالیٰ کی عبادت میں اور زیادہ بڑھ جاؤ۔ اسی طرح غلبہ ملنے سے پہلے جس طرح آپ اپنے آپ کو بندوں کا خادم سمجھتے رہے اِسی طرح غلبہ ملنے کے بعد بھی آپ اپنے آپ کو خادم سمجھتے رہے اور جوانی کی عمر میں مکہ میں جب آپ کے پاس کچھ نہ تھا تب بھی غریبوں، یتیموں اور مسکینوں کی مدد اپنے ہاتھ سے کرتے تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت عطا فرمادی۔ یعنی شادی کے بعد حضرت خدیجہؓ نے اپنا سارا مال آپ کے سپرد کر دیا تو آپ نے یہ نہیں کیا کہ اُس مال کو اپنی ذات پر استعمال کر لیں۔ آپ نے یہ نہیں سمجھا کہ میری بیوی نے یہ مال مجھے دیا ہے تو اب میں یہ مال اُس کے آرام اور آسائش کے لئے خرچ کروں بلکہ اس مال کو غریبوں اور مسکینوں پر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ جب آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکومت عطا فرمائی اور عرب اور اُس کی تمام اقوام کو آپ کے تابع کر دیا اور عرب کا تمام ٹیکس اور جزیہ آپ کے ہاتھوں میں آنے لگا تب بھی آپ نے اُس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اُٹھایا اور وفات کے وقت جب کہ لوگ اپنے اہل وعیال کی نسبت لوگوں کو ہدایتیں دیتے ہیں آپ نے آخری وصیت اپنی قوم کو یہی فرمائی کہ میں تمہیں عورتوں اور کمزوروں سے نیک سلوک کے بارہ میں آخری نصیحت کرتا ہوں (ابن ماجہ کتاب النکاح باب حق المرأۃ علی الزَّوج) اور وفات کے وقت سخت کرب اور تکلیف کی حالت میں آپ بار بار فرماتے تھے کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا (بخاری کتاب المغازی باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)۔ یہ سخت الفاظ اتنے یہود و نصاریٰ کی نسبت نہیں تھے جتنا اِن میں اس طرف اشارہ تھا کہ اگر میری قوم نے بھی میری قبر کو عبادت گاہ بنایا تو صرف خدا تعالیٰ کی لعنت اُن پر نہیں پڑے گی بلکہ میری لعنت بھی اُس کے ساتھ شامل ہوگی۔

غرض غلبہ کے وقت بھی آپ نے نہ خدا تعالیٰ کے حق کو تلف کیا اور نہ بندوں کے حقوق کو تلف ہونے دیا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

آپؐ کے صحابہؓ نے بھی اس تعلیم پر اعلیٰ سے اعلیٰ عمل کر کے دکھایا۔ خلفاء اربعہ حقوق العباد کے ادا کرنے کی ایک بے نظیر مثال گذرے ہیں۔ ایک طرف خدا تعالیٰ کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑے رکھا اور دوسری طرف بندوں

کے حقوق بھی خوب ادا کئے ایسے کہ اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ وہ بادشاہ نہ تھے پریذیڈنٹ تھے مگر پہلا سوال تو یہ ہے کہ اُنہیں پریذیڈنٹ بننے پر مجبور کس نے کیا؟ آخر یہ عہدہ اُن کو اسلام نے ہی دیا اور اس عہدہ کی حیثیت کو انہوں نے اسلامی احکام کے ماتحت ہی قائم رکھا مگر یہ بات بھی تو نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ خواہ اُنہیں پریذیڈنٹ ہی قرار دیا جائے مگر اُن کا انتخاب ساری عمر کے لئے ہوتا تھا نہ کہ تین یا چار سال کے لئے۔ جیسا کہ ڈیماکریسی کے پریذیڈنٹوں کا آج کل انتخاب ہوتا ہے یقیناً اگر ان کو صرف صدر جمہوریت کا ہی عہدہ دیا جائے تو بھی یہ بات علم النفس کے ماتحت اور سیاسی اصول کے ماتحت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تین چار سال کے لئے چنے جانے والے صدر اور ساری عمر کے لیے چُنے جانے والے صدر میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ تین چار سال کے لئے چنے جانے والے صدر کے سامنے وہ دن ہوتے ہیں جب وہ اس عہدہ سے الگ کر دیا جائے گا اور پھر ایک معمولی حیثیت کا انسان بن جائے گا لیکن ساری عمر کے لئے چُنا جانے والا صدر جانتا ہے کہ اب اس مقام سے اُترنے کا کوئی امکان نہیں اور اُس کے اہل ملک بھی جانتے ہیں کہ اس حیثیت کے سوا اور کسی حیثیت میں اب وہ اُن کے سامنے نہیں آئے گا۔ پس جس شان وشوکت کا وہ مستحق سمجھا جاتا ہے اس شان وشوکت کا مستحق تین سالہ یا چار سالہ صدر نہیں سمجھا جا سکتا۔ مگر اس ڈیماکریسی اور جمہوریت کے زمانہ میں سہ سالہ اور چار سالہ میعاد کے لئے چُنے جانے والے صدروں کی زندگیوں کو دیکھ لو ملک کا کتنا روپیہ اُن پر صرف ہوتا ہے۔ صدر جمہوریت امریکہ پر ہر سال جو روپیہ خرچ ہوتا ہے انگلستان کے بادشاہ پر بھی اتنا خرچ نہیں ہوتا۔ مگر اس کے مقابل میں خلفاء اربعہ کس طرح پبلک کے روپیہ کی حفاظت کرتے تھے وہ ایک ایسا تاریخی امر ہے کہ اپنے اور بیگانے اُس سے واقف ہیں صرف نہایت ہی قلیل رقوم اُنہیں گذارے کے لئے ملتی تھیں اور خود اپنی جائیدادوں کو بھی وہ بنی نوع انسان کے لئے خرچ کرتے رہتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اُن خلفاء میں سے ہیں جن پر اپنوں اور بیگانوں نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں جب اُن کی عمر کے آخری حصہ میں کچھ لوگوں نے بغاوت کی اور اُن کے خلاف کئی قسم کے اعتراضات کئے تو اُن میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انہوں نے بہت سے روپے فلاں فلاں اشخاص کو دیئے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ اسلام کے خزانہ پر سب ہی مسلمانوں کا حق ہے اگر میں قومی خزانہ سے ان لوگوں کو دیتا تو بھی کوئی اعتراض کی بات نہ تھی مگر تم قومی رجسٹروں کو دیکھ لو میں نے اُن کو قومی خزانہ سے روپیہ نہیں دیا بلکہ اپنی ذاتی جائیداد میں سے دیا ہے گویا اُن کی ذاتی جائیداد قومی خزانہ کے لئے ایک منبعِ آمد تھی۔ پس ان لوگوں نے اپنے غلبہ اور استعلاء کو محض خدا تعالیٰ کے لئے خرچ کیا نہ کہ اپنی شان بڑھانے کے لئے اور یہی وہ چیز

ہے جوقوموں کو دوام بخشتی ہے اگر مسلمان اس تعلیم پر عمل کرتے تو کبھی زوال کا منہ نہ دیکھتے۔

مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کے تیسرے معنے (۳) تیسرے معنے دِیْن کے جو یہاں لگتے ہیں ملک وحکم کے ہیں۔ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ ہم نے یہی حکم دیا تھا کہ حکم اللہ تعالیٰ کے لئے رہے۔ جو وہ کہتا ہے اُسے جاری کیا جائے جس سے وہ روکتا ہے اُس سے رُکا جائے اپنی نفسانی خواہشات اور ارادوں کو شریعت میں دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اسلام جس وقت نازل ہوا ہے۔اس موٹی صداقت کا بُری طرح سے انکار کیا جارہا تھا۔ ہر شخص جو اس بات کو مانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی کلام اُس کی اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے آیا ہے اُسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ایسے کلام کو کلی طور پر انسانی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہیے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس وقت نازل ہوا ہے ہر قوم نے اپنی شریعت کی چادر کو پارہ پارہ کردیا تھا اور خدا تعالیٰ کے دین کا ایک تولہ اُن کے خیالات کے منوں میں باقی رہ گیا تھا اب تک جو برا حال ان شریعتوں کا ہو رہا ہے وہ عبرت کے لئے کافی ہے مسیحؑ جن کی ساری عمر کی کمائی صرف اتنا فقرہ ہے کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُو دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے (متی باب ۵ آیت ۳۹) اس تعلیم کی مسیحیوں نے کتنی مٹی پلید کی ہے۔ اگر مسیحی حکومتوں کے دشمنوں نے ڈائنامیٹ کے بم اُن کے علاقوں پر پھینکے ہیں تو انہوں نے صبر نہیں کیا جب تک اٹومک بم ایجاد نہیں کرلیا۔

پھر یہ سب امور شریعت کے مطابق بتائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں انگلستان کے گرجوں کے سب سے بڑے پادری نے اپنے ایک ماتحت پادری کے منہ پر یہ کہہ کر تھپڑ مارا ہے کہ اٹومک بم بھی خدائی نشانوں میں سے ایک نشان ہے کیونکہ ایک ماتحت پادری نے یہ کہا تھا کہ میری فطرت اس بم کے استعمال سے حاصل کی ہوئی فتح پر گرجے میں خوشی منانے پر تیار نہیں۔ مسیحؑ نے کہا تھا میں موسیٰؑ کی شریعت کو پورا کرنے آیا ہوں مگر مسیحیت نے موسوی شریعت کو سرتا پا لعنت بنا کر چھوڑا۔ یہی حال دوسری کتابوں کا ہے کہ اُن کے اندر بھی اس قدر تحریف اور تبدیلی کردی گئی ہے اور اس قدر انسانی خیالات اُن میں ملا دیئے گئے ہیں کہ اُن کی شکل مسخ ہوگئی ہے۔ آج ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر موسیٰؑ عیسیٰؑ۔ کرشنؑ اور زرتشتؑ دنیا میں آئیں تو وہ قرآن کریم کی طرف دوڑیں گے کہ یہ ہماری ہی تعلیم ہے جسے زیادہ جلا دے دیا گیا ہے اور جو تعلیمات اُن کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ اُن کے پاس سے منہ موڑ کر گذر جائیں گے کہ یہ گندی تعلیمیں معلوم نہیں کس نے دنیا میں پھیلا دیں۔

اسلام زیر تفسیر آیت کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے سامنے پُرزور احتجاج کرتا ہے کہ شریعتوں کے بارہ

میں انسانی دست اندازی کے سلسلہ کو بند کیا جائے۔ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اور خدا تعالیٰ کے کلام میں دخل اندازی نہ کی جائے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان بھی بعد کے زمانہ میں بگڑے اور بہت بگڑے مگر انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی مدد اور اُس کے منشاء کے ماتحت آج بھی محفوظ ہے۔ بے شک فقہ میں مسلمانوں نے بھی خوب کتر بیونت کی مگر خدا کا کلام چونکہ محفوظ ہے اِس لئے اس کتر بیونت سے مستقل نقصان اسلام کو نہ پہنچا ہے اور نہ پہنچ سکتا ہے۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے چوتھے معنے

(۴) چوتھے معنے دین کے جو یہاں لگ سکتے ہیں سیرت کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اُنہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اپنی سیرت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے یعنی اپنی سیرت کے بنانے میں کسی اور کو شریک نہ کرو بلکہ اپنے اخلاق کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی صفات کے مطابق بناؤ۔ گو یا وہ حدیث جو رواۃ کے لحاظ سے ایسی مضبوط نہیں سمجھی جاتی جیسی دوسری حدیثیں ہیں یعنی تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (التعریفات لعلی بن محمد الجرجانی باب الفاء صفحہ ۱۱۳) کہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو، اِس آیت کے رو سے بالکل درست ثابت ہوتی ہے اور مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے معنے یہ بنتے ہیں کہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ السِّيْرَةَ۔ اپنی سیرت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کر دو یعنی جب تک الٰہی صفات کے مطابق دنیا اپنے اخلاق کو نہ بنائے امن قائم نہیں ہوسکتا۔ فرماتا ہے اپنی سیرت کو ایسا بناؤ کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی صفات کے اور کسی کا عکس اُس پر نہ پڑے جس طرح خدا تعالیٰ رب ہے تم بھی رب بنو جس طرح وہ رحمان ہے تم بھی رحمان بنو۔ جس طرح وہ رحیم ہے تم بھی رحیم بنو جس طرح وہ مالک یوم الدّین ہے تم بھی اندھے قاضی نہ بنو۔ بلکہ مالک یوم الدّین بنو۔ اصلاح اور درستی اصل غرض تمہارے سامنے رہے۔ خدا تعالیٰ کی طرح رازق بنو، غفار بنو، ستار بنو، نیک باتوں اور قوموں اور مُردوں کے لئے مُحی بنو اور بری باتوں اور برے افراد کے لیے ممیت بنو۔ اسی طرح حفیظ بنو۔ باسط بنو۔ قیوم بنو وغیرہ وغیرہ۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے پانچویں معنے

(۵) پانچویں معنے دِین کے جو یہاں چسپاں ہوتے ہیں تدبیر کے ہیں۔ ہر فرد دنیا میں کچھ نہ کچھ جدوجہد کرتا ہے اور ہر فرد سے میری مراد ہر معقول فرد ہے۔ ورنہ دنیا میں ایسے احمق بھی ہوتے ہیں جو سونے اور کھانے پینے میں ہی اپنی عمریں گذار دیتے ہیں وہ درحقیقت انسان نہیں حیوان ہیں۔ ان کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہ وہ درحقیقت انسانیت کے دائرہ میں ہی شمار نہیں کئے جا سکتے۔ ہر شریف انسان کچھ جدوجہد کرتا ہے۔ اور ہر زندہ دل انسان کسی نہ کسی فن کی رغبت رکھتا ہے کسی کو سائنس سے دلچسپی ہوتی ہے کوئی حساب میں

شغف رکھتا ہے کوئی سیاست کی طرف مائل ہوتا ہے کوئی تجارت میں انہماک رکھتا ہے کوئی زراعت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اوران سب امور کا حصول کئی وجوہ سے ہوتا ہے بہر حال دنیا میں جو یہ نظارہ نظر آتا ہے۔ کہ کوئی سائنس کی طرف توجہ کر رہا ہے، کوئی حساب کی طرف توجہ کر رہا ہے، کوئی تجارت کی طرف مائل ہے کوئی زراعت سے دلچسپی رکھتا ہے، کوئی سیاسیات میں اپنی عمر بسر کر رہا ہے۔ اس پر جب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگوں کی تدابیر یا اپنے نفس کے فائدہ کے لئے ہوتی ہیں یا اپنی قوم کے غلبہ اور نفوذ کے لئے۔ یعنی دنیا میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو محض اپنے نفس کے فائدہ کے لئے ان امور کی طرف توجہ کرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے سائنس میں ترقی کر لی تو کئی قسم کی ایجادیں کریں گے۔ کارخانے جاری کریں گے اور مالی لحاظ سے بہت کچھ نفع اُٹھائیں گے۔ یا حساب میں شغف رکھتے ہیں تو اس لئے کہ ترقی کر کے ہم انجینئر بن جائیں گے اور دنیا میں اعزاز حاصل کریں گے یا تجارت کرتے ہیں تو اس لئے کہ اپنے لئے اور اپنے خاندان کے افراد کے لئے ہمارے پاس بہت سا روپیہ اکٹھا ہو جائے گا۔ یا زراعت کریں گے تو اس فن میں بھی اُن کے مدّنظر محض اپنا فائدہ ہوگا۔ اِسی طرح سیاسیات میں اُن کی دلچسپی کسی قومی مفاد کے لیے نہیں ہوتی بلکہ ذاتی اعزاز کا حصول اس تمام جدوجہد کا بنیادی نقطہ ہوتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ذاتیات سے بہت بالا ہوتے ہیں ان کے مدّنظر اپنے ذاتی مفاد اس قدر نہیں ہوتے جس قدر قومی مفاد ان کے مدّنظر ہوتے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک سائنس دان سائنس میں شغف رکھتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میری قوم کو اس ذریعہ سے طاقت حاصل ہو جائے اگر کوئی حساب کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کی غرض بھی اس علم سے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر کوئی تجارت کرتا ہے تب بھی اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تجارت سے میری قوم مضبوط ہو جائے غرض یہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کرنے والے ہوتے ہیں ان میں سے کچھ لوگ اگر زراعت کی طرف توجہ کرتے ہیں تو اُن کے مدّنظر محض یہ غرض نہیں ہوتی کہ ہم ہل چلائیں گے کھیتی باڑی کریں گے اور نفع کمائیں گے بلکہ وہ فنِ زراعت اس لئے سیکھتے ہیں تا کہ اُن کی قوم ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکل جائے۔ اسی طرح جب اُن میں سے بعض لوگ سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں تو اِس لئے نہیں کہ اُن کو ذاتی طور پر غلبہ اور نفوذ حاصل ہو جائے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ سیاسیات میں حصہ لینے کے نتیجہ میں اُن کی قوم کو غلبہ حاصل ہو۔ غرض دنیا میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جن کی تمام جدّ وجہد کا مرکزی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کو ذاتی طور پر کوئی فائدہ حاصل ہو جائے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محض قومی مفاد کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کرتے ہیں اُن کا علوم کی طرف توجہ کرنا مختلف فنون میں مہارت حاصل کرنا اور مختلف قسم کے شعبوں میں کام کرنا اس لئے

نہیں ہوتا کہ وہ شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں یا عزت کے متلاشی ہوتے ہیں یا مال و دولت کے شائق ہوتے ہیں بلکہ وہ اِس لئے اپنی عمریں ان کاموں میں صرف کر دیتے ہیں کہ اُن کی قوم سربلند ہو اور اُسے دنیا میں عزت کا مقام حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ اِس آیت میں یہ فرماتا ہے کہ جب بھی دنیا میں ایسا طریق عمل جاری ہوگا غلط قسم کی رقابت پیدا ہوگی اور تباہی اور بربادی اس کے نتیجہ میں آئے گی پس انسان کو چاہیے کہ اپنی سب جدوجہد اللہ تعالیٰ کے لئے کر دے۔ اگر اُسے حساب کا شوق ہے اور وہ اس علم میں ترقی کرنا چاہتا ہے تو بے شک کرے اور خوب کرے۔ اگر اُسے سائنس کا شوق ہے اور وہ نئی نئی ایجادات کرنا چاہتا ہے تو بے شک سائنس کی طرف توجہ کرے اور دنیا میں نئی سے نئی ایجادیں کرے۔ اگر اُسے تجارت کا شوق ہے تو بے شک وہ تجارت کرے اور خوب مال و دولت کمائے۔ اگر اُسے زراعت کا شوق ہے اور وہ اس علم پر غور کرتے ہوئے نئے نئے امور دریافت کرنا چاہتا ہے تو بے شک ایسا کرے کیونکہ خود خدا نے یہ فطرت پیدا کی ہے اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کام کرے بے کار نہ بیٹھے مگر چاہیے کہ اُس کی سب تدبیریں اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے جدوجہد کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندوں کو اپنی جدوجہد کے ثمرات سے محروم نہیں کرے گا۔ جب وہ خدا کے لئے ایسا کرے گا تو اُس کی یہ غرض نہیں ہوگی کہ انگلستان کو کچل دے، نہ انگلستان کی یہ غرض ہوگی کہ فرانس کو کچل دے، نہ امریکہ کی یہ غرض ہوگی کہ رُوس کو کچل دے۔ جب ہر شخص اللہ تعالیٰ کے لئے کوشش کرے گا تو اس کی کوششیں تمام بنی نوع انسان کے لئے مفید ہوں گی اور غلط قسم کی رقابت اور عداوت دنیا میں پیدا نہیں ہوگی۔ تمام تباہی اسی وجہ سے واقعہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے ذاتی یا قومی مفاد کے لئے دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس امر کو کلی طور پر نظر انداز کر دیتا ہے کہ اسے اپنی جدوجہد کے ثمرات میں تمام بنی نوع انسان کو شریک کرنا چاہیے۔ یہ تو علمی زمانہ ہے مگر پھر بھی دیکھا جاتا ہے کہ باپ دادا کی دولت سے ذرا بھی حصہ مل جائے تو لوگ غافل ہو جاتے ہیں ہر قسم کے کاموں کو چھوڑ کر اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں اب ہمیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے باپ دادا سے ہمیں بہت بڑی جائیداد مل گئی ہے اور اب ہمارا کام یہی ہے کہ ہم کھائیں پئیں اور سور ہیں یہ قطعاً خیال نہیں کیا جاتا کہ انسان کی پیدائش اِس لئے نہیں ہوئی کہ وہ کھائے پیئے اور سو رہے بلکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرۃ: ۳۱) سے ظاہر ہے اور جب انسان اِس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے تو اُسے غور کرنا چاہیے کہ اُس کے لئے نکما پن کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ نکما بیٹھا ہوا ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کوئی کام نہیں کرتا اس لئے اگر انسان بھی کوئی کام نہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر ہم

دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نکما نہیں بیٹھا بلکہ وہ اپنی تمام صفات سے کام لے رہا ہے، کہیں بنی نوع انسان کو رزق دے رہا ہے کہیں ان کو زندہ کر رہا ہے کہیں اُن کو مار رہا ہے کہیں اُن کی مغفرت کے سامان کر رہا ہے۔ کہیں اُن پر رحمت نازل کر رہا ہے، کہیں اُن پر عذاب بھیج رہا ہے، کہیں اُن کو ترقی دے رہا ہے۔ کہیں تنزّل کے سامان کر رہا ہے۔ غرض دن رات وہ کام میں لگا ہوا ہے اور یہی وہ انسانوں سے چاہتا ہے کہ جس طرح میں کام میں لگا ہوا ہوں اسی طرح تم بھی کام میں لگ جاؤ اور کبھی غفلت اور سستی کو اپنے قریب بھی نہ آنے دو۔ مگر افسوس کہ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ ان کو ذرا بھی سہولت کے سامان میسّر آ جائیں تو وہ سست ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہمیں کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ملک میں تو عام محاورہ ہے کہ جب کسی آسودہ حال سے پوچھا جائے کہ سُناؤ کیا حال ہے تو وہ کہتا ہے اللہ کا بڑا فضل ہے کھانے پینے کو بہت کچھ ہے اب کام کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ کام تو سامانوں کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کے پاس کم سامان ہوں وہ کم کام کرتا ہے اور جس کے پاس زیادہ سامان ہوں وہ زیادہ کام کرتا ہے۔ پس اگر اُنہیں زیادہ سامان میسر آ گئے تھے تو اُن کا فرض تھا کہ وہ کام بھی دوسروں سے زیادہ کرتے نہ یہ کہ سامانوں کے میسر آ جانے کی وجہ سے اپنی کمر ہمت کو بالکل توڑ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ اب ہمیں کام کی ضرورت نہیں۔ کھانے پینے کا سامان خدا تعالیٰ نے بہت کچھ دے دیا ہے۔ اب ہمارا کام اتنا ہی ہے۔ کہ کھائیں پئیں عیش و آرام میں اپنا وقت گزاریں اور سو جائیں۔ یہ ایک لعنت ہے جو ہندوستانیوں کے سروں پر مسلّط ہے اور جس نے اُن کو ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے کر دیا ہے۔ وہ جدوجہد اور عمل صرف اس بات کا نام سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کو فائدہ پہنچ جائے یا اپنے خاندان کو فائدہ پہنچ جائے بنی نوع انسان کو اپنی جدوجہد کے ثمرات میں شریک کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔ اس کے مقابل میں یورپ کے لوگوں میں جہاں اور کئی قسم کے نقائص ہیں وہاں اِس نقص کو انہوں نے قومی طور پر بالکل دور کر دیا ہے۔ وہاں امیر اور غریب سب کام کرتے ہیں اور باوجود بڑے بڑے اُمراء کی موجودگی کے اُن میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو کام نہ کر رہا ہو اِلّا ماشاء اللہ ہر قوم میں کچھ نہ کچھ گندے اور خراب افراد بھی ہوتے ہیں اُن کو مستثنیٰ کرتے ہوئے اکثریت ایسے ہی لوگوں کی نظر آتی ہے جو اربوں ارب روپیہ کے مالک ہیں مگر خود بھی کام کرتے ہیں اُن کی بیویاں بھی کام کرتی ہیں اُن کے بچے بھی کام کرتے ہیں اسی طرح اُن کے خاندان کے دوسرے افراد بھی کام کرتے ہیں اور وہ کبھی کام کرنا اپنے لئے ننگ اور عار کا موجب نہیں سمجھتے مگر اس کے باوجود وہ یا تو اپنے نفس کے لئے سب کچھ کرتے ہیں یا اپنے ملک کی ترقی اور اُس کی خوشحالی کے لئے کام کرتے ہیں یا قومی برتری کا احساس اُن کے مدّنظر ہوتا ہے یا نفسانی خواہشات اُن کے پیش نظر ہوتی ہیں اسی لئے باوجود کام کرنے

کے خرابیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں بھی باپ دادا کی جائیداد پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے بعض لوگ کام نہیں کرتے تھے مگر خرابیاں کم ہوتی تھیں کیونکہ قومی برتری کا احساس اُن کے دلوں میں نہیں ہوتا تھا وہ صرف اپنے ذاتی مفاد کو مدنظر رکھا کرتے تھے مگر اب چونکہ ذاتی مفاد کی بجائے قومی مفاد کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے اور دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے تمام اعمال اس لئے بجالاتا ہے کہ اُس کی قوم کو دوسروں پر تفوق حاصل ہو، اُس کی قوم کو دوسروں پر غیر معمولی اقتدار اور غلبہ میسر ہو، اُس کی قوم کو بہت بڑی طاقت حاصل ہو۔ اس لئے کام کرنے کے باوجود اس زمانہ میں خرابیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم تدبیریں کرو اور ضرور کرو کیونکہ ہم نے تم کو پیدا ہی اسی لئے کیا ہے کہ تم کام کرو مگر دیکھو ہماری نصیحت یہ ہے کہ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ اپنی ساری تدبیریں خدا تعالیٰ کے لئے وقف کر دو۔ ذاتی آرام یا قومی مفاد تمہارے مدنظر نہ ہو بلکہ تمہاری تمام جدوجہد محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہو۔ غور کرو یہ کیسا سنہری اصل ہے اور کس طرح اس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں دنیا میں امن قائم ہو جاتا ہے اس ذریعہ سے ایک طرف اللہ تعالیٰ نے نکماپن دور فرما دیا اور بنی نوع انسان سے کہہ دیا کہ دیکھو ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ تم بے کار رہو اور دنیا میں آکر کوئی کام نہ کرو اور دوسری طرف کہہ دیا کہ ہم یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ تم جھوٹی رقابتیں پیدا کرنی شروع کر دو۔ تم کام کرو اور خوب کرو مگر جھوٹی رقابتیں پیدا نہ کرو۔ دوسرے ملکوں یا قوموں کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ ہر کام اللہ تعالیٰ کی خاطر کرو۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے ہر کام کرے گا ذاتی یا قومی برتری کا احساس اس کے دل میں نہیں ہوگا وہ دوسروں کے حقوق کو کچلنے کے لئے بھی کوئی قدم نہیں اٹھائے گا یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کے زمانہ میں (یعنی جب جب اور جہاں اسلامی اصول پر حکومت کی گئی) کبھی غیر قوموں کو کچلنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ سات آٹھ سو سال تک مسلمانوں کو حکومت کرنے کا موقع ملا ہے اور یہ ایک بہت بڑا عرصہ ہے اس قدر لمبے عہد حکومت کے باوجود کسی مسلمان حکومت نے ہمسایہ ممالک کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس بہت کچھ طاقت تھی اور وہ اگر چاہتے تو آسانی سے ان کی اقتصادی حالتوں کو تباہ کر سکتے تھے۔ مگر باوجود طاقتور ہونے کے، باوجود بادشاہ ہونے کے، باوجود آٹھ سو سال تک برسر اقتدار رہنے کے، باوجود ہمسایہ ممالک کی کمزوری کے کبھی ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کو کچلنے کے لئے مسلمانوں نے کوئی اقدام کیا ہو ایبے سینیا اس کی واضح مثال ہے تیرہ سو سال وہ مسلمانوں کی ہمسائیگی میں رہا مگر اُس کی آزادی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں میں صرف ایک صدی افریقہ میں غلبہ ہوا تو انہوں نے ایبے سینیا کو کچل دیا حالانکہ ایبے سینیا والے اُن کے ہم مذہب تھے اور اس لحاظ سے وہ اس بات کا زیادہ حق رکھتے

تھے کہ اُن کے ملک پر ڈاکہ نہ ڈالا جائے۔مگر عیسائیوں نے کسی بات کی پروا نہ کی، نہ انصاف کو مدنظر رکھا، نہ دیانت اور رواداری کی پروا کی اور اپنے غلبہ کے گھمنڈ میں کمزور ممالک پر حملہ کر کے اُن کو اپنا ماتحت بنالیا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ مسلمان قرآنی احکام کے مطابق اپنی تمام کوششیں محض اللہ تعالیٰ کی رضا کو مدنظر رکھتے ہوئے عمل میں لاتے تھے۔ چونکہ ایبے سینیا، یوگنڈا اور ایسٹ افریقہ وغیرہ نے مسلمانوں کو چھیڑا نہیں اس لئے باوجود زبردست مسلمان حکومتوں کے پہلو میں بیٹھے ہونے کے کسی نے اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا اور یہ حالت برابر چلتی چلی گئی یہاں تک کہ انتہائی مُردہ اور گری ہوئی حالت میں بھی اُن کے اندر یہ خوبی قائم رہی اور انہوں نے غیر اقوام کو کچلنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔لیکن یوروپین قوموں نے جہاں بھی سر نکالا انہوں نے غیر ممالک کو کچل ڈالا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ یوروپین قوموں کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے بچوں کو کھیلتے ہوئے جب کوئی چیز مل جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں ’’لبّھی چیز خدا دی نہ دھیلے دی نہ پا دی‘‘ یہ بھی غیر ملکوں پر قبضہ کرتے چلتے جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں یہ تو ایک گری پڑی چیز تھی جو ہمیں مل گئی۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ اخلاق کے بھی دعویدار بنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے یہ قبضہ امن قائم کرنے اور لوگوں کو تہذیب و شائستگی کے اصول سکھانے کے لئے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ دعویٰ بالکل غلط ہے اگر واقعہ میں تمہارے اندر اخلاق پائے جاتے تھے اور تمہارے مدنظر ذاتی یا قومی مفاد نہیں تھا تو تمہارا فرض یہ تھا کہ تم بجائے غیر ممالک پر قبضہ کرنے اور اُس کی دولت سے فائدہ اُٹھانے کے ان ممالک میں جاتے، لوگوں کی تربیت کرتے، ان کو علم سکھاتے اور پھر واپس آ جاتے۔ گویا جو کچھ کرتے اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کرتے نفسانیت کا اُس میں کوئی شائبہ نہ ہوتا۔مگر تم نے تو جو کچھ کیا اپنے نفس کے لئے کیا اور یہ وہ چیز ہے جو دنیا میں امن قائم نہیں کرتی بلکہ بدامنی اور ظلم کے دَور دَورہ کا موجب بن جاتی ہے اگر انگریز افریقہ میں جاتے اور بجائے اُس پر قبضہ کرنے کے لوگوں سے کہتے کہ ہم تمہاری ترقی کے لئے آئے ہیں۔ پھر ان کو تعلیم دلاتے، اُن کو کاشت کے اصول سکھاتے۔ مدرسے اور کارخانے قائم کرتے، مال و دولت کو ترقی دینے کے ذرائع بتاتے تہذیب اور شائستگی کے اُصول سکھاتے اور جب وہ یہ سب کچھ سیکھ جاتے تو کہتے لو اب ہم واپس جاتے ہیں۔ یہ ملک تمہارا ہے ہم تو محض تمہاری خدمت کرنے کے لئے آئے تھے تو یقیناً وہ اپنے دعوے میں سچے سمجھے جا سکتے تھے اور کہا جا سکتا تھا کہ اُن کی کوششیں اپنے لئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے تھیں۔مگر یہ کیا طریق ہے کہ افریقن لوگوں کو الگ بٹھا دیا۔ اُن کی زمینوں اور جائیدادوں پر قبضہ کر لیا اور پھر یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ ہم نے تو یہ قبضہ افریقن لوگوں کی ترقی اور اُن کے فائدہ کے لئے کیا ہے اور یہی ہمدردی کا جذبہ اِس کا محرک ہوا ہے۔

مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کے چھٹے معنے (۶) چھٹے معنے اس کے عبادت کے ہیں۔ یہ معنے بھی یہاں لگتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ شرک نہ کرو سب قسم کی عبادات اللہ تعالیٰ کے لئے کرو۔

مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کے ساتویں معنے (۷) ساتویں مناسب معنے اس کے وَرَع کے ہیں یعنی نیکی اور نیک اعمال اِن معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ ریاء اور سُمْعَة کو بالکل ترک کر دو اور سب زہد وتعبد صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے ہو۔ یہ نہ ہو کہ تمہارے جُبّے اور دستاریں اور کہانت اور پادری کا عہدہ لوگوں میں عزت حاصل کرنے اور اُن سے اطاعت کرانے کے لئے ہو بلکہ تمہارا زہد وتعبد محض خدا تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لئے ہو۔ یہ بات ایسی ہے جس کی طرف غیر قومیں تو الگ رہیں خود مسلمانوں کو بھی بہت کم توجہ ہے اور وہ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے اور زکوٰۃ دینے اور حج کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رضا مدّ نظر نہیں رکھتے بلکہ اُن کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ لوگوں میں ہماری عزت قائم ہوجائے اور وہ ہمیں بڑا نمازی یا بڑا عابد کہنے لگ جائیں۔ اِسی طرح حج بھی زُہد کی علامت ہوتی ہے مگر ہمارے ملک میں عام طور پر حج کو بھی اپنی شہرت کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص جو حج کر آئے وہ اپنے نام کے ساتھ حاجی لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ میں جب حج کے لئے گیا تو ایک اور مسلمان نوجوان بھی میرے ساتھ جہاز میں سوار تھا۔ وہ اپنے آپ کو دین کے متعلق اس قدر غیرت مند سمجھتا تھا کہ جب اُسے معلوم ہوا کہ میں احمدی ہوں تو وہ بار بار اپنا ہاتھ مار کر کہتا کہ وہ جہاز بھی نہیں ڈوبتا جس میں ایسا شخص سفر کر رہا ہے۔ حالانکہ اِسی جہاز میں وہ خود بھی سفر کر رہا تھا اور اگر جہاز ڈوبتا تو اس کا ڈوبنا بھی یقینی تھا۔ بہر حال ایک طرف تو دین کے متعلق وہ اس قدر غیرت کا اظہار کرتا تھا اور دوسری طرف اس کی حالت یہ تھی کہ میں نے اسے مکہ سے منیٰ جاتے ہوئے جو عین حج کا وقت ہوتا ہے اردو کے نہایت گندے عشقیہ اشعار پڑھتے سنا۔ ایک دن باوجود اس کے بُغض اور کینہ کے میں اُس کے قریب چلا ہی گیا اور میں نے اُسے کہا کہ آپ کو دین کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے مگر یہ کیا بات ہے کہ منیٰ میں مَیں نے آپ کو بہت گندے اشعار پڑھتے سنا ہے کہنے لگا بات اصل میں یہ ہے کہ ہم سورت کے تاجر ہیں اور ہمارے علاقہ میں حاجیوں کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ہماری ہول سیل دوکان ہے اور اردگرد کے علاقوں سے اکثر لوگ ہماری دوکان سے ہی مال خرید کر لے جاتے ہیں مگر گذشتہ سال ہمارے پاس کی دوکان والا حج کر آیا اور اس نے اپنے نام کے ساتھ حاجی کا ٹائٹل لگا کر دوکان پر بورڈ آویزاں کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے گاہک بھی اُدھر جانے شروع ہو گئے کیونکہ لوگوں نے خیال کیا کہ حاجی صاحب سے سودا خریدنا چاہیے اس میں ثواب بھی ہوگا یہ دیکھ کر میرے باپ نے مجھے کہا کہ کم بخت تو بھی حج کر آ ورنہ اگر یہی حالت رہی تو ہماری دوکان

بالکل تباہ ہوجائے گی۔ چنانچہ میں اسی لئے حج کے لئے آیا ہوں اب یہاں سے جانے کے بعد میں بھی اپنے نام کے ساتھ حاجی لکھ کر بورڈ لٹکا دوں گا اور ہمیں تجارت میں جو گھاٹا ہوا ہے وہ جاتا رہے گا۔ اُس وقت اُسے تو میں نے کچھ نہ کہا مگر دل میں مجھے اُس کی حالت پر سخت افسوس آیا کہ کُجا اس کی غیرت کی یہ کیفیت تھی کہ وہ بار بار اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہتا ہائے وہ جہاز بھی غرق نہیں ہوجاتا جس میں ایسا شخص سوار ہے اور کجا یہ حال ہے کہ وہ حج کرنے کے لئے آیا ہے مگر اُسے ذرا بھی یہ احساس نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر حج کرے بلکہ اُس کے مدنظر محض اتنی بات ہے کہ میں حاجی کہلاؤں۔ لوگ میری عزت کریں اور وہ دوکان پر کثرت کے ساتھ سودا خریدنے کے لئے آنے لگیں۔ تو دنیا میں بہت لوگ ایسے ہیں جو زُہد وتعبد میں لوگوں کی خوشنودی اور اُن کی واہ واہ حاصل کرنے کے لئے حصہ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی محبت سے اُن کا دل بالکل خالی ہوتا ہے مثلاً عیسائیوں میں پادریوں کی بہت بڑی عزت سمجھی جاتی ہے اور جتنے یوروپین اُمراء خاندان ہیں وہ ایک ایک لڑکا ضرور چرچ کی خدمت میں لگا دیتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ اُن کے دل میں عیسائیت کی کوئی عظمت ہے یا وہ سمجھتے ہیں کہ پادری بن کر ہمارا لڑکا اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے گا بلکہ صرف اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں اس کے بغیر ہمارے خاندانوں کا سیاسی لحاظ سے کوئی اثر قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے علماء کی عزت نہیں کی جس کی وجہ سے امراء کی توجہ علم دین کی طرف سے بالکل ہٹ گئی مگر یوروپین قومیں اپنے پادریوں کی بڑی عزت کرتی ہیں اس وجہ سے امراء کو ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ ہمیں سیاسی رنگ میں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے ورنہ عوام میں ہمارے خلاف جوش پیدا ہوجائے گا اور وہ رسوخ جو ہمیں حاصل ہے جاتا رہے گا پس چونکہ زُہد وتعبد کے اعمال بسا اوقات لوگ اس لئے بجالاتے ہیں کہ اُن کو قوم میں عزت اور رسوخ حاصل ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تم ریاء اور سمعت کے خیالات کو اپنے دل کے کسی گوشہ میں بھی داخل نہ ہونے دو اور جس قدر نیک اعمال بجالاؤ ان کی تہ میں صرف یہی جذبہ کارفرما ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوجائے مخلوق سے توجہ ہٹا کر صرف خالق پر اپنی نظر رکھو اور اپنے اعمال صالحہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کردو کہ وہی اعمال اُس کی درگاہ میں مقبول ہوتے ہیں جو اس کی رضا کے لئے کئے جائیں۔ جن اعمال پر ریاء کا داغ لگ جاتا ہے وہ انسان کے منہ پر مارے جاتے ہیں اور ثواب کی بجائے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا موجب بن جاتے ہیں۔

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کے آٹھویں معنے (۸) آٹھویں مناسب معنے جو یہاں لگ سکتے ہیں عادت کے ہیں اِن معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ایسے فرمانبردار بنو کہ تمہاری عادات بھی اللہ تعالیٰ

کے تابع ہو جائیں ۔ بظاہر عادت کی عبادت بُری ہوتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص صرف عادت کی نماز پڑھتا ہے یعنی اُسے ماں باپ نے نماز پر لگا دیا تھا جس کی وجہ سے اُسے نماز کی عادت ہوگئی یا اُس کے ماں باپ نے اُسے روزے رکھنے پر مجبور کیا تھا جس کی وجہ سے اُسے روزوں کی عادت ہوگئی یا کسی اور نیک کام پر اُس کے ماں باپ نے اُسے مجبور کیا اور رفتہ رفتہ اُس نیک کام کی اُسے عادت ہوگئی تو یہ عادت بُری سمجھی جاتی ہے۔لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ عادتیں دو قسم کی ہوتی ہیں وہ عادت کی عبادت بُری ہوتی ہے جس کی ابتدا بھی عادت سے ہو۔یعنی جب کسی نے کوئی کام بغیر سمجھے بوجھے کیا ہو اور رفتہ رفتہ وہ کام اس کی طبیعت میں داخل ہوگیا ہو تو یہ عادت اچھی نہیں سمجھی جا سکتی۔مثلاً کسی شخص نے زید کو کوئی بات کہی اور اُس نے بغیر سوچے سمجھے اُس کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اُس بات کی اُسے عادت ہوگئی یا کسی اور کے کہنے کی بجائے اُس نے خود ہی کسی کام کی آہستہ آہستہ عادت اختیار کر لی تو یہ عادت قطعاً کوئی قیمت نہیں رکھتی۔لیکن ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے لیے اور اس کی محبت اور اُس کے عشق سے عبادات اور نیک اعمال میں حصہ لینا شروع کرتا ہے اور عمل کرتے کرتے وہ اُس کا جزوِ بدن ہو جاتے ہیں اور آپ ہی آپ بغیر کسی ارادہ کے وہ افعال اس سے ظاہر ہونے لگتے ہیں ایسے شخص کی عادت کی عبادت رسمی عبادت نہیں کہلا سکتی۔کیونکہ اُس نے خلوص کے ساتھ، محبت کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا اور متواتر کرتا چلا گیا یہاں تک کہ عبادت اُس کا جزوِ بدن بن گئی۔اب جو فعل اس عادت کے نتیجہ میں ظاہر ہوگا وہ یقیناً خوبی کہلائے گا کیونکہ اُس نے دیدہ و دانستہ اپنے نفس پر جبر کر کے خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے ایک فعل اتنی بار کیا کہ وہ اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگیا یہ جبری عادت نہیں ہوتی کہ اُسے بُرا قرار دیا جا سکے نہ بے دھیان کی عادت ہوتی ہے کہ اسے لغو کہا جا سکے۔یہ ایک نیک عادت ہوتی ہے جو جانتے بوجھتے ہوئے محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اختیار کی جاتی ہے اور چونکہ خدائی قانون یہ ہے کہ جب ایک شخص لذّت اور شوق سے متواتر کوئی فعل کرے تو وہ کام اُس سے آپ ہی آپ سرزد ہوتا جاتا ہے۔اِس لئے ایسے شخص کی عادت کی عبادت رسمی عبادت نہیں کہلاتی بلکہ وہ اطاعت کا منتہیٰ کہلاتی ہے۔

(۲) دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ انسان کو کئی قسم کی عادات خاص خاندانوں یا قوموں میں رہنے کی وجہ سے پڑ جاتی ہیں۔مثلاً چائے نوشوں میں چائے کی عادت ہوتی ہے، اچھے خوش خور لوگوں میں اچھا کھانا کھانے کی عادت ہوتی ہے خوش لباسوں میں رہنے کی وجہ سے انسان کو خوش لباسی کی عادت ہو جاتی ہے۔اس لئے ایک معنے اِس آیت کے یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو اس طرح اللہ تعالیٰ کا بناؤ کہ اگر تم کو کوئی عادت پڑے تو وہ اللہ کی ہو نہ کہ

اپنے گردوپیش کے لوگوں کے اثر سے تم نے وہ عادت اختیار کی ہو۔ گویا اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تمام لغو عادات سے مومن کو بچنا چاہیے۔ یوں تو عادتیں انسان کو ضرور پڑ جاتی ہیں کوئی انسان دنیا میں ایسا نہیں ہوتا جسے کچھ نہ کچھ عادت نہ ہو۔ مگر کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے گردوپیش کے لوگوں سے صرف اتنا اثر لیتے ہیں کہ اُنہیں اچھا کھانا کھاتے دیکھتے ہیں تو خود بھی اچھا کھانا کھانے لگ جاتے ہیں۔ اُنہیں اچھا لباس پہنتے دیکھتے ہیں تو خود بھی اچھا لباس پہننے لگ جاتے ہیں۔ اُنہیں آرام کی زندگی بسر کرتے دیکھتے ہیں تو خود بھی آرام کی زندگی بسر کرنے لگ جاتے ہیں لیکن ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو لوگوں سے صرف نیکی اور تقویٰ اور عبادت کا اثر قبول کرتا ہے۔ اب جہاں تک دوسروں سے اثر قبول کرنے کا سوال ہے دونوں نے اثر قبول کیا ہے فرق صرف یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے نفس کے آرام کے لیے گردوپیش کا اثر قبول کیا اور دوسرے نے خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے صرف وہ اثر قبول کیا جس کا نیکی اور تقویٰ کے ساتھ تعلق تھا۔ گویا وہ شخص جس نے اچھا کھانے یا اچھا پینے یا اچھا پہننے کا اثر قبول کیا تھا اُس نے اپنے دل کے آئینے کو غیروں کے سامنے کیا اور وہ شخص جس نے اپنے اندر نماز اور روزہ اور صدقہ وخیرات کی عادتیں پیدا کیں اُس نے اپنا آئینہ خدا کے سامنے کر دیا۔ پس فرماتا ہے تمہیں دنیا میں رہ کر عادتیں تو ضرور پڑنی ہیں مگر تم ایسی کوشش کرو کہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے اعمال کا تواتر ہو۔ بنی نوع انسان کے اعمال کا تواتر نہ ہو جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی نظریں نیچی رکھو اگر اتفاقیہ طور پر کسی غیر عورت پر تمہاری نگاہ پڑ جاتی ہے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر تم دوسری نگاہ اس پر ڈالو گے تو گنہگار بن جاؤ گے۔ اس ممانعت میں بھی یہی حکمت ہے کہ اگر انسان دوسری بار نگاہ ڈالے گا تو اُس کا یہ نگاہ ڈالنا بالا ارادہ ہوگا اور جب وہ ایک کام بالا رادہ کرے گا تو یہ لازمی بات ہے کہ وہ کام آہستہ آہستہ عادت میں داخل ہونا شروع ہو جائے گا پس مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ تو بُرے افعال کا تکرار نہ کر بلکہ اُن اعمال کا تکرار کر جو تجھے خدا تعالیٰ تک پہنچانے والے ہوں یعنی جن کاموں کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے اُن کا تکرار کرو اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اُن کے گردوپیش کے اثرات کی وجہ سے عادت پیدا نہ کرو۔ گویا اس کے معنے یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو گردوپیش کے برے اثرات سے بالکل آزاد کر لو حتی کہ تم کو دوسروں کے بداثرات سے کوئی عادت نہ پڑے بلکہ صرف نیک اثرات کو قبول کرو۔

عادات بھی ایک بہت بڑی ظلمت ہوتی ہیں بعض دفعہ یہ انسان کو دوسرے کا خوشامدی بنا دیتی ہیں۔ بعض دفعہ ڈرپوک بنا دیتی ہیں۔ بعض دفعہ سُست بنا دیتی ہیں اور انسان بڑے بڑے کاموں میں حصہ لینے سے محروم ہو جاتا ہے۔ مثلاً حُقہ کی عادت ہے، افیون کی عادت ہے یا چائے یا نسوار کی عادت ہے ایسے لوگوں کو اگر جہاد کے لئے جانا

پڑے تو اُن کے قدم ڈگمگا جائیں گے کیونکہ جہاد میں یہ چیزیں میسر نہیں آ سکتیں۔ لڑائی میں بسا اوقات انسان کو کئی کئی وقت کا فاقہ کرنا پڑتا ہے۔

بسا اوقات جنگلوں میں راتیں گذارنی پڑتی ہیں، بسا اوقات نہایت معمولی اور ردّی غذا کھا کر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ شخص جسے شراب کی عادت ہو یا افیون کی عادت ہو یا حقہ اور نسوار کی عادت ہو کبھی دلیری سے آگے نہیں آ سکتا کیونکہ اُس کی عادات اِس قربانی میں دیوار بن کر حائل ہو جائیں گی اور وہ سمجھے گا کہ اگر میں اس جنگ میں شامل ہوا تو مجھے سخت تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔

موجودہ جنگ میں سپاہیوں کی سب سے بڑی شکایت یہی تھی کہ ہمیں شراب نہیں ملتی ہمیں سگرٹ نہیں ملتے اور یہ شکایت اس قدر بڑھ گئی کہ انگریز افسروں کے لئے اس کا ازالہ کرنا بالکل ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ کے موجودہ انتخابات میں مسٹر چرچل کی شکست کی وجہ بھی یہی ہوئی کہ فوجیوں کے ووٹ سب اُن کے خلاف تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ایسی گورنمنٹ ہرگز قائم رہنے کی مستحق نہیں جس نے لڑائی میں ہمارے لئے شراب مہیا نہیں کی، جس نے کثرت سے ہمیں سگرٹ نہیں پہنچائے اور اس طرح وہ ہماری تکلیف کا موجب ہوئی ہے۔ حالانکہ انگریز افسر بھی سچے تھے وہ لڑائی کا سامان جمع کرتے یا شرابیں اور سگرٹ تیار کر کر کے فوجیوں کو بھجواتے؟ پس اس آیت میں مومنوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ سوائے ذکر الٰہی اور نیکی کے کاموں کے جو خدا تعالیٰ کی رضا کا موجب ہیں اور کسی چیز کی عادت نہ پڑنے دو تا کہ تم کو کبھی غیر کے آگے جھکنے یا قومی خدمات میں سستی کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔

حُنَفَآءَ کے معنے نیک میلانوں پر ثابت قدم رہنا حُنَفَآءَ۔ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ کے جو معنے اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن میں چونکہ حَنِیۡف کے وہ معانی بھی آ جاتے ہیں جو حل لغات میں بیان کئے جا چکے ہیں اِس لئے میں اِس جگہ حَنِیۡف کے صرف اتنے معنے لیتا ہوں کہ ''نیک میلانوں پر ثابت قدم رہنا'' میں سمجھتا ہوں کہ اوپر کی تشریحات کے بعد صرف یہی ایک معنے باقی رہ جاتے ہیں جن کا الگ بیان کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم تمہیں اوپر کا حکم اس مزید ہدایت کے ساتھ دیتے ہیں کہ تم اپنے آپ میں نیک باتوں پر استقلال پیدا کرو یعنی ہم چاہتے ہیں کہ ایک تو مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ کے جو معنے ہیں وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں اور دوسرے تم میں استقلال پیدا ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ نیکیوں پر چند دن تو بڑے جوش وخروش سے عمل کرو اور پھر تھک کر بیٹھ جاؤ۔ درحقیقت بڑی غلطی انسان کی یہ ہوتی ہے کہ وہ نیکیوں پر دوام اختیار نہیں کرتا صرف چند دن عمل کرتا اور

پھر اُن کو چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے حضور وہی نیکی مقبول ہوسکتی ہے جس پر دوام اختیار کیا جائے اور یہ دوام پیدا نہیں ہوسکتا جب تک انسان کے اندر استقلال کا مادہ نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دینے کے بعد کہ تمہاری اطاعت اور تمہارا غلبہ اور تمہارا حکم اور تمہاری سیرۃ اور تمہاری تدابیر اور تمہاری عبادات اور تمہاری نیکی اور تمہاری عادات سب کی سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہونی چاہئیں۔

حُنَفَآءَ کہہ کر یہ مزید حکم دے دیا کہ جب ایسے میلانات تمہارے اندر پیدا ہوجائیں تو پھر اُن پر ثابت قدم رہو ایسا نہ ہو کہ سستی کر کے اس مقام پر سے تمہارا قدم لڑکھڑا جائے اور تمہاری نیکیاں سب ضائع چلی جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور وہی عبادت نفع رکھتی ہے جس میں دوام پایا جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ آپ کی ایک بیوی نے چھت سے ایک رسّہ لٹکا رکھا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ کیسا رسّہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ یہ اس لئے ہے کہ جب عبادت کرتے کرتے اُونگھ آنے لگے تو اس سے سہارا لے لیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِسے کھول دو۔ اللہ تعالیٰ کو وہی عبادت پسند ہے جس میں دوام پایا جائے اگرچہ وہ کتنی ہی قلیل ہو۔ وہ عبادت پسند نہیں جس کے نتیجہ میں انسان کی طبیعت میں ملال پیدا ہوجائے اور چند دن کے بعد وہ اس کو ترک کرنے پر مجبور ہوجائے۔ (بخاری کتاب التہجد باب مایکرہ من التشدید فی العبادۃ)

بعض لوگ غلطی سے اس کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دن کم اور کسی دن زیادہ عبادت نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمیشہ ایک جیسی عبادت کرنی چاہیے مگر یہ معنے بالبداہت باطل ہیں۔ کیونکہ انسان بعض دفعہ بیماری کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے زیادہ عبادت نہیں کرسکتا اور بعض دفعہ تو اُس کے چھوڑنے پر بھی مجبور ہوجاتا ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ثابت ہے کہ بعض دفعہ آپ رات کو پورے آٹھ نفل نہیں پڑھ سکے (مسلم کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا باب جامع صلاۃ اللّیل و من نام عنہ او مرض) پس اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ تم نفلی عبادات کو کم و بیش نہ کرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تم کوئی عبادت شروع کرو تو پھر اُسے کرتے چلے جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ چند دن نفل پڑھو اور پھر چھوڑ دو۔ یا بعض دفعہ تو ساری ساری رات تہجد پڑھتے رہو اور بعض دفعہ دو نفل بھی نہ پڑھو۔ یہ عدم استقلال کا مرض ہے جس سے ہر مومن کو کلّی طور پر محفوظ ہونا چاہیے اور اُسے سمجھ لینا چاہیے کہ نیکی وہی ہے جس پر دوام اختیار کیا جائے۔

اقامتِ صلوٰۃ سے مراد با جماعت نماز ادا کرنا اور نماز کا رواج دینا

وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ۔

لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے بعد وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا ذکر کرنا صاف بتا رہا ہے کہ اس جگہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد محض عبادت نہیں۔ اگر محض عبادت اس جگہ مراد ہوتی تو اُس کے علیحدہ ذکر کرنے کے کوئی معنے ہی نہیں تھے لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ میں یہ مفہوم بڑی وضاحت سے آ چکا تھا اور بتایا جا چکا تھا کہ مومنوں کا فرض ہے کہ وہ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اُسی کی پرستش کریں یعنی نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ میں اپنی عمر بسر کریں پس جب وہاں عبادت کا وضاحتہً ذکر آ چکا تھا تو اس کے بعد وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کہنا کہ مومن وہ ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں صاف بتاتا ہے کہ اس جگہ اقامتِ صلوٰۃ عبادت کے علاوہ کوئی اور مفہوم رکھتی ہے اور وہ وہی مفہوم ہے جو میں نے اپنے خطبات اور تقاریر میں بارہا بتایا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد با جماعت نماز ادا کرنا ہے یوں اقامتِ صلوٰۃ کے یہ بھی معنے ہوتے ہیں کہ عبادت کو کھڑا کرنا یعنی نماز کو اُس کی تمام شرائط کے ساتھ ادا کرنا۔ مگر اقامت کے معنوں کو اگر ہم کلّی طور پر دیکھیں تو پھر نماز کو کھڑا کرنے کے معنے یہ بن جائیں گے کہ وہ دنیا میں قائم ہو جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اقامتِ صلوٰۃ کے ایک یہ معنے بھی لئے ہیں کہ مومن اپنی نمازوں کو بار بار کھڑا کرتے ہیں۔ نماز گرتی ہے تو وہ اُسے کھڑا کرتے ہیں پھر گرتی ہے تو وہ پھر کھڑا کرتے ہیں پھر گرتی ہے تو وہ پھر کھڑا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُنہیں نماز میں خشوع وخضوع پیدا نہیں ہوتا یا اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ نہیں ہوتی تو وہ بار بار اپنی نمازوں کو سنوارنے اور اُن کو پورے طور پر درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس آیت میں یہ معنے مراد نہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ کے ایک یہ معنے بھی ہوتے ہیں اور ان معنوں پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بڑا زور دیا ہے کہ نماز گرتی ہے تو مومن اُس کو کھڑا کرتا ہے پھر گرتی ہے تو پھر کھڑا کرتا ہے (ملفوظات جلد ۴ صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵)۔ مگر چونکہ یہ مضمون وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ میں آ چکا ہے اس لئے وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے یہاں کوئی زائد معنے ہوں گے جو میرے نزدیک دو ہیں۔

اوّل نماز کا کھڑا کرنا اپنے اندر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ دنیا میں نماز کا رواج قائم کر دیا جائے جیسے ہماری زبان میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے یہ رسم جاری کر دی ہے اِسی طرح اللہ تعالیٰ مومنوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وہ لوگوں میں نماز قائم کریں یعنی صرف خود ہی نماز نہ پڑھیں بلکہ تمام لوگوں میں نماز کی خوبیاں بیان کریں۔ اُنہیں نماز پڑھنے کی تحریک کریں اگر انہیں نماز پڑھنی نہیں آتی تو انہیں نماز پڑھنا سکھائیں۔ اگر کوئی شخص نماز کا ترجمہ نہیں

جانتا تو اُسے نماز کا ترجمہ پڑھائیں غرض ہر شخص نماز کی ترویج اور اس کو دنیا میں قائم کرنے میں مشغول ہو جائے۔ کوئی شخص نماز کی خوبیاں بیان کر رہا ہو، کوئی شخص نماز کا ترجمہ پڑھا رہا ہو، کوئی شخص نمازیں ادا کرنے کی لوگوں کو تحریک کر رہا ہو، کوئی شخص نماز پڑھنے والوں میں نماز کی مزید رغبت پیدا کر رہا ہو۔ اس طرح کوئی مومن ایسا نہ ہو جو یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے حکم پر عمل نہ کر رہا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارا صرف یہی کام نہیں کہ تم خود نمازیں پڑھو بلکہ تمہارا یہ بھی کام ہے کہ تم لوگوں کو نماز کی تحریک کر کے، اَن پڑھوں کو نماز کا ترجمہ سکھا کے، نماز پڑھنے والوں کو نماز کی مزید رغبت دلا کے دنیا میں پوری مضبوطی کے ساتھ نمازوں کا رواج قائم کر دو۔ یہ سب امور ایسے ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہیں۔

دوسرے معنے جو اقامتِ صلوٰۃ کے یہاں چسپاں ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمہارا صرف یہی فرض نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو بلکہ یہ بھی فرض ہے کہ تم جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں صرف عبادت کا حکم نہیں دیتے بلکہ باجماعت عبادت کا حکم دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام فردی مذہب نہیں بلکہ قومی مذہب ہے۔ باقی سارے مذاہب میں اگر افراد الگ الگ عبادت کرتے ہیں تو وہ بڑے زاہد، بڑے عابد، بڑے پرہیزگار اور بڑے عارف سمجھے جاتے ہیں۔ لوگ اُن کی نیکی اور تقدّس کے قائل ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کا قرب اور اُس کا وصال حاصل ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص باجماعت نماز ادا نہیں کرتا تو خواہ وہ علیحدگی میں کتنی عبادتیں کرتا رہتا ہو وہ ہرگز نیک اور پارسا نہیں سمجھا جا سکتا اور اُسے ہرگز قوم میں عزت کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک بہت بڑا فرق ہے جو اسلام اور غیر مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ باقی سب مذاہب پر غور کر کے دیکھ لو وہ انفرادی عبادات کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں یہاں تک کہ بسا اوقات بڑی بڑی دُور سے پنڈت اور پادری اور راہب اور عوام الناس کے جوق در جوق یہ سُن کر کہ فلاں سادھو چالیس سال سے غار میں عبادت کر رہا ہے اُس کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں، اُسے نذریں دیتے ہیں، اُس کے آگے سجدے کرتے ہیں، اُسے اپنا حاجت روا سمجھ کر اُس سے بڑی عاجزی سے التجائیں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سادھو سے بڑا اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ وہ ہے جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چالیس سال سے پہاڑ کی ایک غار میں بیٹھا اللہ اللہ کر رہا ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے ایسا شخص ہرگز خدا تعالیٰ کا مقرب نہیں۔ وہ تو بہت بڑا بے دین ہے جس نے اقامتِ صلوٰۃ کے حکم کو نظر انداز کر دیا ہے جس نے یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے حکم کو پس پشت پھینک دیا ہے۔ جو شخص قوم سے کٹ گیا ہے۔ جس نے قوم کی بہتری اور اس کی فلاح و بہبود کی کبھی فکر نہیں کی، جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت سزا کا مستحق ہے۔

کجا یہ کہ اُسے نیک اور خدا رسیدہ سمجھا جائے۔

پس وہ لوگ جن کو دوسری قومیں محض علیحدگی میں عبادت کرنے کی وجہ سے بزرگ قرار دیتی ہیں اسلام اُن کو مرتد اور مردود قرار دیتا ہے۔ دنیا اُن کو خدا رسیدہ سمجھتی ہے اور اسلام اُن کو اللہ تعالیٰ کے قرب سے راندہ ہوا سمجھتا ہے۔ کیونکہ اسلام کہتا ہے۔ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ہم نے تمہیں صرف اتنا حکم نہیں دیا کہ تم نمازیں پڑھو بلکہ ہمارا حکم یہ ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ مل کر نمازیں پڑھو اور اپنی ہی حالت کو درست نہ کرو بلکہ ساری قوم کو سہارا دے کر اُس کی روحانیت کو بلند کرو اور قوم سے دُور نہ بھاگو بلکہ اس کے ساتھ رہو اور ہوشیار چوکیدار کی طرح اُس کے اخلاق اور اُس کی روحانیت کا پہرہ دو۔

اقامتِ صلوٰۃ کے بعد ایتاء زکوٰۃ کا حکم دینے کی حکمت اس آیت میں دوسرا حکم زکوٰۃ کا دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں جہاں بھی ایتاء زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے۔ ہمیشہ اقامتِ صلوٰۃ کے بعد آتا ہے۔ اس میں ایک نہایت ہی لطیف اشارہ اس امر کی طرف پایا جاتا ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنی قوم کی شکستہ حالی سے واقف نہیں ہوتا اُس وقت تک وہ اُن کی کوئی خدمت بھی نہیں کر سکتا۔ وہ شخص جو کسی پہاڑ کی کھوہ میں جا کر بیٹھ رہا ہے اور دن رات سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہتا ہے اُسے کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں یا غُرباء ننگے پھر رہے ہیں یا مساکین پیسہ پیسہ کے لئے دربدر خاک چھان رہے ہیں یا روپیہ کی کمی کی وجہ سے وہ علم سے محروم ہو رہے ہیں۔ اُسے اِن میں سے کسی بات کا بھی علم نہیں ہو سکتا اور جب علم نہیں ہو گا تو وہ اپنی قوم کے لئے کوشش کیا کرے گا۔ غرباء کے لئے جدوجہد یا مساکین کی ترقی کے لئے کوشش اُسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان کو علم ہو کہ اُس کی قوم میں غرباء پائے جاتے ہیں، اُس کی جماعت میں مساکین موجود ہیں اور اُس کا فرض ہے کہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلائے، پیاسوں کو پانی پلائے، ننگوں کو کپڑے دے اور بیماروں کا علاج کرے اور یہ علم اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسان مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کا عادی نہ ہو۔ جب وہ مسجد میں آئے گا تو دیکھے گا کہ اُس کے پاس ہی ایک طرف تو ایسا شخص کھڑا ہے جس نے اعلیٰ درجہ کا لباس پہنا ہوا ہے، قیمتی عطر لگایا ہوا ہے، باصحت اور تنومند ہے اور دوسری طرف ایک ایسا شخص کھڑا ہے جس کے پھٹے پُرانے کپڑے ہیں، اُس کے لباس اور جسم کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا ہے اور اُس کے چہرہ پر جُھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ یہ نظارہ دیکھے گا تو اُس کا دل تڑپ اُٹھے گا اور کہے گا میرا فرض ہے کہ میں قوم کے غرباء کے لئے اپنا روپیہ خرچ کروں اور اُن کی تکالیف کو دور کروں۔ یا وہ مسجد میں جائے گا تو دیکھے گا کہ وہاں ایک نوجوان بیٹھا ہے۔ بیس پچیس سال اُس کی عمر ہے، اُٹھتی جوانی کا زمانہ ہے۔ مگر اُس کی حالت یہ ہے کہ کلے پچکے ہوئے ہیں،

آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں، کپڑوں کا بُرا حال ہے اور ضعف اُس کے جسم سے ظاہر ہے۔ وہ یہ حالت دیکھ کر لازماً پوچھے گا کہ میاں! تمہارا کیا حال ہے، تم اتنے خستہ حال کیوں نظر آ رہے ہو؟ اس کے جواب میں یا تو وہ کہے گا کہ میں بیمار ہوں علاج کے لئے میرے پاس کوئی پیسہ نہیں اور یا کہے گا کہ بیمار تو نہیں مگر کھانے پینے کا میرے پاس کوئی سامان نہیں۔ اس پر دوسرا شخص اُسے کہہ سکتا ہے کہ تم جوان آدمی ہو کماتے کیوں نہیں؟ وہ کہے گا میں کیا کروں نجاری کا کام مجھے آتا ہے مگر نجاری کے آلات وغیرہ خریدنے کی مجھ میں استطاعت نہیں یا معماری جانتا ہوں یا کپڑا بُننا جانتا ہوں یا لوہارے کا کام جانتا ہوں مگر سامانوں سے تہیدست ہونے کی وجہ سے بے کار بیٹھا ہوں۔ اس پر اُسے فکر پیدا ہوگا کہ میرا فرض ہے میں اِس کی مدد کروں اور اِسی طرح قوم کے جو دوسرے غرباء ہیں اُن کی تکالیف دُور کرنے میں حصہ لوں تا کہ یہ بھی باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ پس حقیقت یہ ہے کہ ایتاءِ زکوٰۃ کی تحریک اقامتِ صلوٰۃ سے ہی ہوتی ہے اور اسلام نے پانچ وقت نماز باجماعت کی ادائیگی کا حکم دے کر ایک ایسا اعلیٰ درجے کا راستہ کھول دیا ہے کہ اگر اس حکم پر عمل کیا جائے تو قوم کے حالات سے نہایت آسانی کے ساتھ واقفیت ہو سکتی ہے۔ بھلا ایک انگریز لارڈ کو اپنی قوم کے حالات کی کیا واقفیت ہو سکتی ہے۔ وہ گھر میں رہتا ہے تو وردیاں پہنے ہوئے نوکر اُس کی خدمت کے لئے موجود ہوتے ہیں جو اُس کے دسترخوان سے اپنا پیٹ ضرورت سے زیادہ بھر کر موٹے ہو رہے ہوتے ہیں۔ کلب میں جاتا ہے تو اُس کی سوسائٹی کے لوگ اُس کے دائیں بائیں ہوتے ہیں۔ اُسے کچھ علم نہیں ہو سکتا کہ غرباء پر کیا کچھ گذر رہی ہے۔ لیکن ایک مسلمان جو پانچ وقت مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتا ہے اور ہر روز پانچ دفعہ لوگوں کی شکلیں دیکھتا ہے اُسے بڑی آسانی سے پتہ لگتا رہتا ہے کہ اُس کی قوم کا کیا حال ہے اور اُسے قومی ترقی کے لئے کن امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کا مفہوم وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کے یہ معنے ہیں کہ ’’یہ ہے قائم رہنے والی قوم کا دین۔‘‘ یہاں مضاف حذف کر دیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ذٰلِكَ دِيْنُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ۔ یعنی دنیا میں جو اُمّت قائم رہنا چاہے اُسے ایسا ہی طریق اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس جگہ دین کے معنے طریق کے ہیں یا حال کے ہیں یا شان کے ہیں اور اس طرح اوپر کے بیان کردہ سب معنے اس میں آ جاتے ہیں یعنی دنیا میں قائم رہنے والی اُمت کا یہی طریق اور یہی حال ہوتا ہے اور چونکہ قَيِّمَةٌ کے معنے مُتَوَلِّيْ کے بھی ہیں اس لئے ان معنوں کے رُو سے اِس آیت کا یہ مطلب بھی ہے کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ دنیا میں متولی بنائے اُسے ایسا ہی طریق اختیار کرنا چاہیے ورنہ وہ اپنے فرض کو پورا کرنے والی نہ ہوگی۔ بہر حال اس آیت کے دو معنے ہوئے ایک یہ کہ قائم رہنے والی قوم کے یہ آثار

ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ متولی بنائے اُسے ایسے ہی خصائل اپنے اندر پیدا کرنے چاہئیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جس قوم میں یہ علامات پیدا ہو جائیں اللہ تعالیٰ اُسے دنیا کا متولّی بنا دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ میں اللہ تعالیٰ نے دو امور کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ اقامتِ صلوٰۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مومن اللہ تعالیٰ سے صلح رکھتے اور اس کے حقوق کو پوری دیانتداری کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور ایتاءِ زکوٰۃ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مومن بنی نوع انسان سے حسنِ سلوک کرتے، اُن کی خدمت میں پورے جوش سے حصہ لیتے اور اُن کے حقوق کو پوری تندہی سے ادا کرتے ہیں۔ اب فرماتا ہے ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ جو اُمت دنیا میں قائم رہنا چاہے اُسے ایسا ہی طریق اختیار کرنا چاہیے یعنی اگر انسان اللہ تعالیٰ سے بھی صلح رکھیں اور بنی نوع انسان سے بھی صلح رکھیں تو اُن پر کبھی تباہی نہیں آ سکتی۔ بگاڑ ہمیشہ اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب لوگ یا تو خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر ناراض کر لیتے ہیں اور اُس کی طرف سے عذاب اور تباہیاں آنے لگتی ہیں یا پھر بنی نوع انسان کو اپنے خلاف بھڑکا لیتے ہیں اور اِس کے نتیجہ میں بغاوت، ڈاکے، قتل اور خونریزیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں عذاب آخر کیوں آتا ہے۔ طاعون دنیا میں کیوں آئی۔ زلازل کیوں آ رہے ہیں؟ اسی لئے کہ لوگوں نے خدا تعالیٰ سے اپنے تعلقات بگاڑ لئے۔ اس کے مقابل میں لوگ آپس میں کیوں لڑتے ہیں؟ اسی لئے کہ کچھ لوگ دوسروں پر ظلم کرتے اور اُن کے حقوق کی ادائیگی میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں جب یہ بات لوگوں کی قوتِ برداشت سے بڑھ جاتی ہے تو وہ لڑائی شروع کر دیتے ہیں۔ یہی فساد کی دو وجوہ ہیں یا اللہ تعالیٰ سے بگاڑ۔ یا بنی نوع انسان سے بگاڑ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر کوئی قوم اقامت الصلوٰۃ اور ایتاءِ زکوۃ پر عمل کر لے خدا تعالیٰ سے بھی صلح رکھے اور اُس کے بندوں سے بھی۔ تو اُس پر کبھی تباہی نہیں آ سکتی۔ تباہی کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ سے اپنے تعلقات بگاڑ لیتے ہیں اور اُن پر عذاب آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بندوں سے اپنے تعلقات بگاڑ لیتے ہیں اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے لئے کیا پیغام لائے تھے؟ یہی کہ خدا تعالیٰ سے بھی صلح کر لو اور اُس کے بندوں سے بھی صلح کر لو تا کہ تم ہر قسم کے زوال سے محفوظ رہو۔ اس میں بھلا کون سی چیز تھی جس کی بناء پر لوگوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت شروع کر دی؟ یہ بات تو سراسر اُن کے فائدہ کے لئے کہی گئی تھی مگر اُنہوں نے اُلٹا اپنے محسن کے خلاف جنگ شروع کر دی۔

دوسرے معنوں کے لحاظ سے اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ دنیا میں متولی بنائے اُسے ایسا طریق اختیار کرنا چاہیے ورنہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں سخت کوتاہی سے کام لینے والی سمجھی جائے گی۔ ایک معنوں کے لحاظ سے قوم کی ذاتی خوبی بیان کی گئی ہے اور دوسرے معنوں کے لحاظ سے اس کی نسبتی خوبی بیان کی

گئی ہے یہ معنے کہ صحیح راستہ پر چلنے والی، دنیا میں قائم رہنے والی اور تباہی سے بچنے والی قوم کی یہ علامات ہوا کرتی ہیں اُس کی ذاتی خوبی پر دلالت کرتے ہیں اور یہ معنے کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ دنیا کا متولی اور حاکم بنائے اور اُسے اپنے اندر تمام بیان کردہ خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں ورنہ وہ حکومت کی ذمہ واریوں کو صحیح طور پر ادا کرنے والی نہیں سمجھی جاسکتی، اُس کے نسبتی کمالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

افسوس کہ مسلمانوں نے اُن اخلاق کو جو یہاں بیان ہوئے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تھوڑے عرصہ بعد ہی چھوڑ دیا اور جوں جوں وہ ان اخلاق کو چھوڑتے چلے گئے اللہ تعالیٰ بھی اُن کو چھوڑتا چلا گیا۔اب احمدیت کے لئے موقعہ ہے کہ وہ اِن اخلاق کو دوبارہ قائم کرے۔مگر یہ اخلاق کبھی مستقل طور پر قائم نہیں رہیں گے جب تک کہ قرآن کریم لوگوں کے دماغوں میں بار بار اور زور سے داخل نہ کیا جائے گا اور اُسے ساری قوم میں زندہ نہ کیا جائے گا۔

ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ پرویری کا بودا اعتراض ویری نے اس جگہ ایک عجیب اعتراض کیا ہے وہ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کا ترجمہ کرتا ہے۔"یہ سچا دین ہے" اور پھر اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے کہ محمد صاحب سمجھتے تھے۔ اسلام یہودیت اور مسیحیت ایک ہی مذہب ہے یعنی انہوں نے ان تینوں مذاہب کی ایک ہی تعلیم بتائی اور کہہ دیا کہ یہودی، عیسائی اور مسلمان سب کا یہی مذہب ہے۔گویا دائمی مذہب کے معنے اُنہوں نے یہ لئے کہ آدم سے لے کر آج تک دنیا کا ایک ہی مذہب رہا ہے (مسلمانوں میں سے بھی بعض بے وقوف یہی عقیدہ رکھتے ہیں) اور چونکہ یہ بات غلط ہے اس لئے اُنہوں نے اپنے جھوٹا نبی ہونے کا آپ ہی ثبوت مہیا کر دیا ہے۔

(A Comprehensive Commentary On The Quran by Wherry vol:4 p:266)

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو پادری صاحب نے اس آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے (ترجمہ توسیل کا ہے مگر چونکہ انہوں نے اس ترجمہ کو قبول کر کے اعتراض کیا ہے اس لئے یہ ترجمہ انہی کی طرف منسوب ہوگا)

(The Koran by Sale vol:2 p:494)

اس کا ترجمہ "سچا دین" نہیں بلکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "یہ قائم رہنے والی قوم کا دین ہے" یا "قائم رہنے والی قوم کی حالت ہے" کیونکہ قَيِّمَة دین کی صفت نہیں ہے اور عربی زبان کے قواعد کے مطابق ایسا ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ دین مذکر ہے اور قیّمۃ مؤنث ہے اور مذکر کی صفت مؤنث نہیں بن سکتی۔پس عربی زبان کے قواعد کے رو سے قَيِّمَة کا موصوف محذوف سمجھنا ہوگا اور وہ سیاق وسباق عبارت سے اَلْمِلَّة یا ایسا ہی کوئی لفظ ہوسکتا ہے اور اسی عربی قاعدہ کو

ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس آیت کی یہ تشریح کی ہے کہ ذٰلِكَ دِيْنُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ۔

دوسرے اِس آیت سے ایک دین ماننا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس جگہ پر تو باقی تمام مقامات سے زیادہ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا دین مختلف ہے تبھی تو قرآن کریم کے متعلق صُحُفًا مُّطَهَّرَةً اور فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کہا گیا ہے تعجب ہے کہ جس جگہ قرآن کریم نے اختلاف پر زور دیا ہے وہیں ویری صاحب کو یہ اعتراض سوجھا ہے کہ اسلام مسیحیت اور یہودیت سب کو ایک ہی مذہب قرار دیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ

اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کفر پر قائم رہنے والے لوگ یقیناً جہنم کی آگ میں (داخل) ہوں گے

جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ۝۷

(اور وہ) اُس میں رہتے چلے جائیں گے۔ وہی لوگ (ہاں وہی لوگ) بدترین خلائق ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

(اس کے مقابل پر) وہ لوگ جو (اہل کتاب اور مشرکوں میں سے) ایمان لے آئے اور انہوں نے (ایمان کے)

اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ؕ۝۸

مناسب حال عمل بھی کئے وہ لوگ ہاں وہی لوگ بہترین خلائق ہیں۔

تفسیر۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ میں مِنْ بعضیہ میں نے جہاں لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ میں مِنْ کو بیانیہ قرار دیا تھا وہاں میرے نزدیک اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا میں مِنْ بعضیہ ہے اور كَفَرُوْا سے ناواقفیت کا کفر مراد نہیں بلکہ وہ کفر مراد ہے جو جانتے بوجھتے ہوئے اختیار کیا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ایسے لوگوں کی یہ سزا ہو گی کہ وہ جہنم کی آگ میں داخل کئے جائیں گے اور اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ سزا بتلا رہی ہے کہ یہاں اہل کتاب اور مشرکین میں سے ایسے کفار کا ہی ذکر کیا جا رہا ہے جنہوں نے جان بوجھ کر کفر کیا۔ جن پر حُجت کا اتمام ہو گیا اور جن کا اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی عُذر قابلِ شنوائی نہ رہا۔ ایسے لوگوں کے متعلق

اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ وہ جہنم کی آگ میں داخل کئے جائیں گے اور اُس میں رہتے چلے جائیں گے پھر فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ یہی وہ لوگ ہیں جو تمام مخلوق میں سے بدترین ہیں۔ اس کے مقابل میں مومنوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ وہ لوگ تمام مخلوق میں سے بہتر ہیں۔

شر اور خیر کے الفاظ ایسے ہیں جو ہیں تو اِسم تفضیل مگر کثرتِ استعمال کی وجہ سے اُن کا ہمزہ اُڑ گیا ہے اس لئے اشر اور اخیر کی شکل میں استعمال نہیں ہوتے۔

شَرُّ الْبَرِيَّةِ اور خَيْرُ الْبَرِيَّةِ کا مطلب شَرُّ الْبَرِيَّةِ کے معنے ہیں بنی نوع انسان میں سب سے بدتر یعنی یہ لوگ صرف بُرے نہیں بلکہ تمام مخلوق میں سے بدترین ہیں اور خَيْرُ الْبَرِيَّةِ کے یہ معنے ہیں کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے وہ تمام مخلوق میں سے بہترین ہیں۔ گویا کفار سب سے بُرے ہیں اور مومن سب سے اچھے ہیں یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین کن دوسرے لوگوں سے بُرے ہیں۔ جبکہ اہل کتاب اور مشرکین کے علاوہ غیر مسلم دنیا میں اور کوئی قوم ہی نہیں؟ میں بتا چکا ہوں کہ قرآن کریم میں جب بھی اہل کتاب اور مشرکین کا ذکر کیا جائے تو اُس سے مراد تمام غیر مسلم دنیا ہوتی ہے کیونکہ غیر مسلم دو حلقوں میں ہی تقسیم کئے جا سکتے ہیں یا وہ اہل کتاب ہوں گے یا وہ مشرک ہوں گے۔ پس جب کہ دنیا میں صرف دو ہی گروہ پائے جاتے ہیں۔ اہل کتاب اور مشرک۔ تو سوال یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرک بُرے کن سے ہوئے۔

اسی طرح جب مومنوں کے سوا دنیا میں اور کوئی ایماندار جماعت ہی نہیں تو وہ اچھے کن سے ہوئے؟ بے شک ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جب الگ الگ قوموں کی طرف الگ الگ انبیاء مبعوث ہوا کرتے تھے اور ہر قوم صرف اپنے نبی پر ایمان لانے کی پابند تھی اُسے یہ ضرورت نہیں تھی کہ وہ دوسری قوم کے نبی پر بھی ایمان لائے اُس وقت اگر یہ کہا جاتا کہ مومن تمام مخلوق میں سے بہترین ہیں تو خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ زرتشتی مومنوں سے اچھے ہیں یا کرشنی مومنوں سے اچھے ہیں یا موسوی مومنوں سے اچھے ہیں مگر جب مومنوں کا ایک ہی گروہ ہے تو وہ اچھے کس سے ہوئے۔ اسی طرح جب اہل کتاب اور مشرکین کے سوا اور کوئی کافر ہی نہیں تو وہ بُرے کس سے ہوئے؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جو اس مقام پر پیدا ہوتا ہے کہ جب کافروں کے سوا اور کوئی کافر ہی نہیں تو وہ بُرے کس سے ہوئے اور جب مومنوں کے سوا اور کوئی مومن ہی نہیں تو وہ اچھے کس سے ہوئے؟

درحقیقت ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا پہلے انبیاء کی اُمتوں سے مقابلہ کیا گیا ہے اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کا مقابلہ پہلے انبیاء کے دشمنوں سے کیا گیا ہے اور اسی بناء

پر شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ اور خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا ہے وہ پہلے تمام انبیاء کے دشمنوں سے بدتر ہیں اور وہ لوگ جنہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے وہ پہلے تمام انبیاء کی اُمتوں سے اچھے ہیں۔ پس شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ اور خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ کے الفاظ موجودہ زمانہ کی مخلوق کے لحاظ سے نہیں کہ یہ سوال پیدا ہو کہ جب مومنوں کے سوا اور کوئی مومن ہی نہیں تو وہ اچھے کس سے ہوئے؟ اور جب کفار کے سوا اور کوئی کافر ہی نہیں تو وہ برے کس سے ہوئے؟ بلکہ یہ الفاظ پہلے زمانہ کے لوگوں کے مقابل میں ہیں۔ اور اُولٰٓئِکَ ھُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ کے معنے یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر موسیٰؑ کے منکروں سے بھی بدتر ہیں۔ عیسیٰؑ کے منکروں سے بھی بدتر ہیں۔ کرشنؑ کے منکروں سے بھی بدتر ہیں۔ زرتشتؑ کے منکروں سے بھی بدتر اور اُولٰٓئِکَ ھُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ کے معنے یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مومن موسیٰؑ کے مومنوں سے بھی اچھے ہیں۔ عیسیٰؑ کے مومنوں سے بھی اچھے ہیں کرشنؑ کے مومنوں سے بھی اچھے ہیں۔ زرتشتؑ کے مومنوں سے بھی اچھے ہیں۔ غرض اُن کا مقابلہ پہلی اقوام کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس مقابلہ کی بناء پر ہی کفار کو شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ اور مومنوں کو خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ کہا گیا ہے کیوں؟ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ تعلیم لائے تھے جو فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ کی مصداق تھی، جو صحفِ مطہّرہ پر مشتمل تھی اور جس میں تمام انبیاء سابقین کی اعلیٰ تعلیم شامل تھی۔ پس نوحؑ کی اُمّت نے صرف نوحؑ کی تعلیم پر عمل کیا، موسیٰؑ کی اُمت نے صرف موسیٰؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ عیسیٰؑ کی اُمّت نے صرف عیسیٰؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ کرشنؑ کی اُمّت نے صرف کرشنؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ زرتشتؑ کی اُمّت نے صرف زرتشتؑ کی تعلیم پر عمل کیا۔ مگر فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ کے ماتحت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت نے نوحؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا، موسیٰؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا، عیسیٰؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا، کرشنؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا، زرتشتؑ کی تعلیم پر بھی عمل کیا۔ جس قوم نے سب نبیوں کی تعلیم پر عمل کر لیا وہ پہلی تمام اقوام سے اچھی نہیں ہوگی تو کیا ہوگی۔ فرض کرو زید کے پاس آنہ ہے، بکر کے پاس دوّنی ہے، عمرو کے پاس چوّنی ہے، خالد کے پاس اٹھنّی ہے، سلیم کے پاس روپیہ ہے۔ اِسی اثناء میں ایک اور آدمی باہر سے آجاتا ہے اُس کا نام عبداللہ ہے اور اُس کے پاس روپیہ بھی ہے، اٹھنّی بھی ہے، چوّنی بھی ہے، دوّنی بھی ہے اور اکنّی بھی ہے تو لازماً عبداللہ، زید سے بھی مالدار ہوگا، بکر سے بھی مالدار ہوگا، عمرو سے بھی مالدار ہوگا، خالد سے بھی مالدار ہوگا اور سلیم سے بھی مالدار ہوگا۔ پس چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً اور قرآن کریم کے متعلق یہ بتایا گیا تھا کہ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ اس لئے فرمایا کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ وہ قوم جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والی ہے باقی تمام اقوام سے اچھی ہے کیونکہ ساری قوموں کی تعلیموں پر اس نے عمل کیا ہے اس کے مقابل میں دشمن کو شَرُّ الْبَرِيَّةِ کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ نوحؑ کے دشمن نے صرف نوحؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا موسیٰؑ کے دشمن نے صرف موسیٰؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا۔ عیسیٰؑ کے دشمن نے صرف عیسیٰؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا۔ کرشنؑ کے دشمن نے صرف کرشنؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا زرتشت کے دشمن نے صرف زرتشتؑ کی تعلیم کا انکار کیا تھا مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن نے نوحؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ موسیٰؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ عیسیٰؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ کرشنؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا زرتشتؑ کی تعلیم کا بھی انکار کیا۔ اِسی طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء جو مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے اُن سب کی تعلیم کا اُس نے انکار کیا۔ پس وہ شَرُّ الْبَرِيَّةِ یعنی تمام مخلوق میں سے بدتر ہے۔ گویا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً اور فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کا لازماً یہ نتیجہ تھا کہ منکر شَرُّ الْبَرِيَّةِ ہوں اور مومن خَيْرُ الْبَرِيَّةِ۔

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

اُن کا بدلہ اُن کے رب کے حضور میں قائم رہنے والے باغات ہوں گے جن کے تلے نہریں بہتی ہوں گی۔

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا

وہ اُن میں ہمیشہ ہمیش رہتے چلے جائیں گے اللہ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اُس (اللہ) سے راضی ہو گئے۔

عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۹ ع

یہی (جزا) اس کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

تفسیر ۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ سے مراد ہمیشہ کی جنات جَنّٰتُ عَدْنٍ کے معنے بعض تفاسیر میں یہ لکھے ہوتے ہیں کہ ’’عدن کی جنتیں‘‘۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ عربی زبان میں عدن کے معنے ’’ہمیشہ‘‘ کے ہوتے ہیں۔ پس جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے معنے یہ ہیں کہ اُن کو ہمیشہ قائم رہنے والی جنتیں ملیں گی جن کے ساتھ نہریں بھی متعلق ہوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ جیسے لائل پور اور سرگودھا وغیرہ میں زمیندار نہروں سے پانی حاصل کرتے ہیں اسی طرح جنتیوں کو بھی دوسروں کی نہروں سے پانی لینا پڑے بلکہ ہر جنت کی اپنی نہر ہوگی اور جنتیوں کو ان پر

تصرف کا پورا حق حاصل ہوگا۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ۔ ’’اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگئے‘‘ اللہ تعالیٰ اُن سے کیوں راضی ہوا؟ اس لئے کہ لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ پر انہوں نے پوری طرح عمل کیا۔ جب یہ صفات اُن کے اندر پائی جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن سے کیوں راضی نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ سے کیوں راضی ہوگئے؟ اس لئے کہ جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ایک معاملہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے کیا اور ایک معاملہ خدا تعالیٰ نے اُن سے کیا۔ دنیا میں تمام مذہبی لڑائیاں اور فسادات اِس وجہ سے واقعہ ہوتے ہیں کہ لوگ غلطی سے ایک جہت کا نام مذہب رکھ لیتے ہیں حالانکہ اصل مذہب نام ہے اِس بات کا کہ بندے اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے راضی ہو اُن کے اعمال ایسے ہوں کہ خدا تعالیٰ کی رضا اُن کو حاصل ہو رہی ہو اور خدا تعالیٰ کا سلوک اُن سے یہ ہو کہ وہ اُن پر اپنے انوار اور برکات کی بارش برسا رہا ہو۔ یہ بھی کیا مذہب ہے کہ نماز پڑھ رہے ہیں، روزے رکھ رہے ہیں، زکوٰۃ دے رہے ہیں، حج کر رہے ہیں اور خدا ہے کہ بولتا ہی نہیں وہ چُپ کر کے بیٹھا ہوا ہے۔ کسی نے کہا ہے

؎ اُلفت کا تب مزا ہے کہ دونوں ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ میں اللہ تعالیٰ نے یہی نکتہ بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ہم اِس مذہب کے قائل نہیں کہ بندہ محبت کی آگ میں پُھنکا جا رہا ہو، فرقت کی گھڑیاں اس کو تڑپا رہی ہوں، وصلِ یار کی آرزو اس کے دِلِ بے تاب میں جذبات کا ایک تلاطم برپا کر رہی ہو، اُس کے دن تڑپتے اور راتیں جاگتے گذر رہی ہوں اور خدا ہو کہ آسمان پر خاموش بیٹھا ہوا ہو اور اُس کی طرف سے کوئی محبت کی آواز اُس کے کانوں میں نہ آتی ہو۔ یا خدا تعالیٰ تو بُلا رہا ہو اور بندہ اُس کی محبت کے ہاتھ کو پرے کر رہا ہو۔ حقیقی عشق اور محبت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ حقیقی محبت اِسی کو کہتے ہیں جب

ع دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

اِدھر بندہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں گداز ہو رہا ہو اور اُدھر عرش پر اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی محبت کے لئے بے قرار ہو۔ یہی وہ مقام ہے جو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ کا ہے۔

حصہ آیت رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ سے دینِ اسلام کی فضیلت

پس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ

وَ رَضُوْا عَنْهُ ایک معیار ہے جو ہر سچے مذہب میں پایا جاتا ہے۔ جو مذہب صرف ایک طرف کی چیز پیش کرتا ہے دوسری طرف کی نہیں وہ مذہب کچھ بھی چیز نہیں۔ جیسے عیسائی ہیں کہ وہ شریعت کو لعنت قرار دے رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ اُن کو خواہ کتنا بُلائے وہ اس سے کبھی نہیں بولیں گے کیونکہ انہوں نے شریعت کو لعنت قرار دیا ہوا ہے۔ جب شریعت اُن کے نزدیک لعنت ہے تو وہ اُس پر عمل کس طرح کر سکتے ہیں اور عمل کے نتائج اُن کو کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔ اِس کے مقابل میں یہودیوں کو دیکھ لو یا موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر ہی نظر دوڑاؤ تمہیں دکھائی دے گا کہ وہ تسبیح پھیر رہے ہیں، ناکیں رگڑ رہے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حرکت ہی نہیں ہوتی۔ مذہب یہی ہے کہ اِدھر بندہ کی طرف سے عبادت ہو اور اُدھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہو۔ بندہ اپنے رب سے راضی ہو اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ سے راضی ہو۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ۔ یہ آیت اس غرض کے لئے نازل کی گئی تھی کہ آئندہ زمانہ میں مسلمان یہ نہ سمجھ لیں کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ کا مقام صرف صحابہؓ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے باوجود اِس واضح آیت کے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ کا انعام صرف صحابہؓ کے ساتھ مختص تھا اب آئندہ یہ انعام کسی اور شخص کو نہیں مل سکتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ۔ اس میں صحابہؓ کی کوئی خصوصیت نہیں اُنہوں نے چونکہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کر لی تھیں جو ہم چاہتے تھے اِس لئے اُنہیں یہ مقام حاصل ہو گیا اب اگر کوئی اور شخص یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لے تو ہم اسے بھی یہ مقام دینے کے لئے تیار ہیں۔ یہ انعام کسی خاص قوم کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ صفاتِ حسنہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ جو لوگ اپنے اندر ہماری بیان کردہ صفات پیدا کر لیں ہم انہیں فوراً اپنا انعام دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کسی خاص فرد یا کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ہماری یہ بات ہر اُس شخص کے متعلق پوری ہو جائے گی جو اپنے رب کی خشیت دل میں پیدا کرے۔ یہ سوال نہیں کہ زید کرے گا تو اُسے یہ انعام ملے گا اور بکر کرے گا تو اُسے نہیں ملے گا بلکہ ہمارا دروازہ اور ہماری رضا کے مقام کا حصول ہر شخص کے لئے کھلا ہے جو شخص اِس انعام کا طالب ہے وہ آئے اور ہماری رضا حاصل کر لے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ میں ذٰلِكَ سے مراد رضا ذٰلِكَ کا اشارہ رضا کی طرف ہے اور مراد یہ ہے کہ ہماری رضا

کا دروازہ ہر ایسے شخص کے لئے کھلا ہے جو اپنے قلب میں اللہ تعالیٰ کی خشیت رکھتا اور اُس کے احکام پر مستعدی سے عمل کرتا ہے۔ ہم اپنے کام کے ذمہ وار ہیں اور تم اپنے کام کے ذمہ وار ہو۔ تم اپنے اندر خشیت پیدا کرو اور ہم سے راضی ہو جاؤ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم بھی تم سے راضی ہو جائیں گے۔ گویا پہلا قدم تمہاری طرف سے اُٹھنا چاہیے پھر ہمارے قدم کا اٹھنا تو بالکل لازمی اور یقینی ہے۔ تم اپنے اندر خشیت پیدا کرو گے تو یہ یقینی بات ہے کہ ہم تم سے خوش ہو جائیں گے۔ یہ بات نہیں کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ کا انعام صرف صحابہؓ کے لئے تھا بلکہ جو شخص بھی اپنے اندر ہماری خشیت پیدا کر لے گا ہمارا یہ دروازہ اُس کے کھلا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا۔

انڈیکس

جلد سیزدہم

۞۞۞۞۞۞

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اشاریہ کلید مضامین

☆☆☆☆☆

کلیدِ مضامین

مرتبہ: سید عبدالحیٔ ایم۔اے

ب

☆☆☆☆☆

اسماء

پ

ت

ث

ج

ص

ض

ط

ع

ل

م

صداقت

واقعات

صحابہؓ اور متبعین

☆☆☆☆☆

مقامات

س

ش

ص

ط

ع

☆☆☆☆☆

حل اللغات

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

الجامع لاحکام القرآن
تفسیر البحر المحیط
تفسیر روح المعانی
تفسیر البغوی
التفسیر الکبیر
تفسیر ابن کثیر
تفسیر فتح البیان
تفسیر الکشاف للزمخشری
معارف القرآن
بیان القرآن
حقائق الفرقان
روح البیان
الدر المنثور
- A Comprehensive Commentary on the Quran
- The Coran by William Muir
- The Koran by Sale

حدیث

جامع صحیح البخاری
صحیح مسلم
سنن ابی داؤد
الموضوعات الکبریٰ
کنز العمال
سنن ابن ماجه
مشکاة المصابیح
مسند احمد بن حنبل
تشیید المبانی
مجمع الزوائد
التعریفات
فتح الباری
معجم الکبیر
البداية والنهاية

سیرت

مناقب امیر المومنین عمر بن الخطاب
السیرة النبویة لابن هشام
السیرة الحلبیة
سیرت المہدی
حیاتِ احمد جلد سوم
- Life of Muhammad by Sir William Muir
- The Life and Work of Sigmund

اسلامیات

تعطیر الانام

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام

اسلامی اصول کی فلاسفی

حقیقۃ الوحی
کشتی نوح
الوصیت
تذکرہ مجموعہ الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام
چشمہ مسیحی
براہین احمدیہ

تاریخ

جمھرۃ نسب قریش واخبارھا
تاریخ الخلفاء للسیوطی
أُسد الغابۃ
تاریخ احمدیت
الطبقات الکبریٰ

اخبارات ورسائل

بدر ۱۱/ جنوری ۱۹۱۲ء
اشاعۃ السنۃ ایڈیٹر مولوی محمد حسین بٹالوی
الفضل ۹/ مارچ ۱۹۴۵ء
ریویو آف ریلیجنز جولائی ۱۹۰۸ء
مکتوباتِ احمد

لغت وادب

لسان العرب
فقہ اللغۃ
اقرب الموارد
تاج العروس
کلیات لابی البقاء
المفردات فی غریب القرآن للامام راغب الاصفھانی
المنجد

متفرق

- Black`s Bible Dictionary
- The Jewish Encyclopedia
- Encyclopedia of Religion and Ethics
- Apocrypha
- New Age Encyclopedia

نسخہ خبط احمدیہ
سفرنگ دساتیر
میزان الحق
ستیارتھ پرکاش

☆☆☆☆☆